پسِ مرگ زندہ

مولانا نور عالم خلیل امینی

استاذ ادب عربی و رئیس تحریر "الداعی" عربی

دار العلوم دیوبند



ادارۂ علم وادب، افریقی منزل قدیم، نزد چھتہ مسجد، دیوبند، یوپی، انڈیا

11/06/2010

۲۷ / جمادی الآخرۃ ۱۴۳۱ھ

210/=

ص ۳۸۸ محمد بن ۳ نہیں ہے

(الحمد اللہ علی ذلک)

ص ۵۹۳ - مدرسہ امدادیہ

ص ۵۹۴ مولانا قاسم مظفر پوری

ص ۶۰۶ صلح دار العلوم

852

غلطی: ص ۱۸۱
۱۸۳
۹۰۱
ص ۳۸
۳۹
۴۱
۵۵
۶۰
۶۴
۷۷
۸۶
۹۱
۱۱۰
۱۱۱
۱۲۴
۱۲۷
۱۲۷
۱۴۰
۲۱۲
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۳۲
۲۴۰
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۷۳

ص ۵۴۳
ص ۵۶۱
ص ۵۸۷
ص ۵۸۹
ص ۵۹۰
ص ۵۹۸
ص ۵۶۵
ص ۵۷۹ ؟
ص ۷۲۹
ص ۷۳۱
ص ۷۳۲ دیہاتیوں
ص ۷۴۰
ص ۷۳۹
ص ۶۶۱
ص ۸۱۴
ص ۲۷۰
ص ۲۷۶
ص ۲۹۵
ص ۲۹۷
ص ۲۹۸
ص ۳۱۴
ص ۳۴۰
ص ۳۴۳
ص ۳۵۰
ص ۳۷۳
ص ۳۸۲
ص ۳۹۰
ص ۳۹۱
ص ۳۹۹-۳۶۷

ص ۴۰۵
ص ۴۷۴
ص ۴۱۶
منکرم ۲
ص ۴۵۷
ص ۴۶۲
ص ۴۷۱
ص ۴۷۴
ص ۴۷۶
ص ۴۷۹
ص 487
ص 488
ص ۵۱۶
ص ۵۱۸
ص ۵۲۳
ص ۵۲۴
ص ۵۲۸

ص ۸۲۳
ص ۸۲۵
ص ۸۳۴
ص ۸۳۷
ص ۷۹۵
ص ۷۱۴
ص ۷۷۰
ص ۷۷۵
ص ۶۹۵

پسِ مرگ زندہ

پسِ مرگ زندہ

مولانا نور عالم خلیل امینی

(18-12-1952 : پ)
(P465)

استاذ ادبِ عربی و رئیس تحریر "الداعی" عربی

دار العلوم دیوبند



اِدارۂ علم وادب، افریقی منزل قدیم، نزدِ چھتہ مسجد، دیوبند، یوپی، انڈیا

Pas -e- Marg Zindah
By: Maulana Noor Alam Khalil Amini

نامِ کتاب : پسِ مرگ زندہ
نام مؤلف : مولانا نور عالم خلیل امینی
ناشر : اِدارۂ علم وادب، دیو بند، یو پی
طباعت بہ ذریعہ : فرید بک ڈپو، دریا گنج، نئی دہلی۲
پہلا ایڈیشن : جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ = مئی ۲۰۱۰ء

ملنے کے پتے

۱- ادارۂ علم وادب، افریقی منزل قدیم، نزدِ چھتہ مسجد، دیو بند ۲۴۷۵۵۴، یو پی

IDARA-E-ILM-O-ADAB
AFRIQI MANZIL QADEEM
NEAR CHHATTA MASJID
DEOBAND-247554 (UP) INDIA
Ph: 01336-222188
Mob: 09412508283

۲- کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد، دیو بند، یو پی، انڈیا
۳- کتب خانہ حسینیہ، نزد مسلم فنڈ، دیو بند، یو پی، انڈیا
۴- دگر کتب خانہ ہاے دیو بند
۵- فرید بک ڈپو، ۲۱۵۸، ایم پی. اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون: 011-23289786, 23289159

موت ، تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں، بیداری کا اِک پیغام ہے
(علامہ اقبالؒ)

فہرست مضامین

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ ۱۰۸-۱۷۶

ادیب، شاعر، نقاد، محقق، عالِمِ دین اور مفتی

حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلویؒ ۱۷۷-۲۱۳

جلیل القدر عالم و قائد امیرِ شریعت

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی ۲۱۴-۲۳۸

حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ ۲۳۹-۲۵۴

ایک استاذ، ایک تاریخ

اُستاذ الاساتذہ

حضرت مولانا محمد حسین ''ملا بہاریؒ'' ۲۵۵-۲۷۴

یکتائے زمانہ

حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ ۲۷۵-۲۹۸

مؤرخ، محقق، مصنف، صحافی اور مشہور عالم

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اَطہر مبارک پوریؒ ۲۹۹-۳۲۹

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ ۳۳۰-۳۶۳

علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغُدّہ حلبی شامیؒ ۳۶۴-۳۹۴

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہلِ قلم

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ۳۹۵-۴۶۴

داعی اِلی اللہ

مولانا محمد عمر پالن پوریؒ ۴۶۵-۴۸۰

عارف باللہ حضرت مولانا

قاری سیّد صدّیق احمد باندویؒ ۴۸۱-۴۹۸

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندیؒ ۴۹۹-۵۲۳

یکتاے زمن حضرت مولانا سیّد ابوالحسنؒ ۵۲۴-۵۶۲

بےلوث خادم ملک وملت

مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ ۵۶۳-۵۸۵

منفرد عالمِ دین

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی ۵۸۶-۶۲۲

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی.. ایک عظیم فقیہ

اسلامی عربی اہلِ قلم

مولانا فصیح الدین دہلویؒ ۶۲۳-۶۳۵

مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوریؒ

ایک نوجوان اور فعّال عالمِ دین ۶۳۶-۶۴۷

خادمِ علم ودین
مولانا محمد تسلیم سِدھولوی دربھنگویؒ ۶۴۸-۶۶۰

منفرد اَدیب وخطیب
مولانا محمد رضوان القاسمی ۶۶۱-۶۸۹

مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ ۶۹۰-۶۹۶

حضرت مولانا شاہ اَبرارالحق حقیؒ

شخصیت اور شانِ امتیاز ۶۹۷-۷۲۷

داعیِ اسلام وعاشقِ رسول ادیب

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ ۷۲۸-۷۴۱

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ

ایک قد آور قائد ۷۴۲-۷۶۵

مولانا سید اسعد مدنیؒ.. یعنی مردِ آہن

مردِ صالح مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ ۷۶۶-۷۷۶

مفتیِ دارالعلوم دیوبند

مولانا کفیل الرحمٰن نشاط عثمانی دیوبندیؒ ۷۷۷-۷۸۹

عالمِ صالح وبافیض مدرس

مولانا سید محمد شمس الحق ویشالویؒ ۷۹۰-۷۹۷

منفرد عالم و مقرر و محدث
حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ ۷۹۸-۸۱۸

پروفیسر ڈاکٹر مولانا سیّد محمد اجتبا ندویؒ ۸۱۹-۸۲۶

خدا کا ایک قدرے گم نام، لیکن انتہائی نیک نام بندہ
حافظ محمد اِقبال گونڈویؒ ۸۲۷-۸۳۵

مولانا فضیل احمد قاسمی گورکھپوریؒ ۸۳۶-۸۴۹

نیک بخت، نیک نام اور نیکو کار تاجر

الحاج محمد اجمل علی آسامیؒ ۸۵۰-۸۵۸

مولانا عبدالحنّان قاسمی مظفر پوری سیتامڑھویؒ ۸۵۹-۸۷۶

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام
مولانا سید عبداللہ بخاریؒ ۸۷۷-۸۹۳

مولانا حکیم عزیز الرحمٰن مئویؒ ۸۹۴-۹۱۲

نیک دل عالم، سہل نگار اہلِ قلم اور بہت اچھے انسان

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ ۹۱۳-۹۳۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ ناگزیر

راقم السطور، پندرہ روزہ اور ماہ نامہ ''الداعی'' عربی دارالعلوم دیوبند میں، ۱۹۸۲ء/ ۱۴۰۲ھ میں، اُس کی اِدارت کی ذمّے داری سنبھالنے کے بعد سے، تادمِ تحریر ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ/ مارچ ۲۰۱۰ء، ہندو بیرونِ ہند کی وفات پاجانے والی اہم اِسلامی شخصیات میں سے، تقریباً تین سو (۳۰۰) شخصیتوں پر، تاثُّراتی مضامین سپردِ قلم کرچکا ہے۔

اِن میں سے جن شخصیتوں کی غیر معمولی اہمیّت، یا راقم کی اُن سے کسی وجہ سے زیادہ وابستگی کا اُس پر دباؤ ہوا، اُن پر عربی میں لکھنے کے بعد ہی، اُس نے خود اپنے قلم سے، عربی مضامین کو اُردو کا جامہ پہنادیا؛ تاکہ اُردو کے قارئین بھی اُن سے بروقت مستفید ہوسکیں؛ لیکن اکثر شخصیتوں کے تذکرے، عربی سے اُردو میں منتقل نہیں ہوسکے۔ جن چند شخصیتوں کے تراجم اپنے اپنے وقت پر اُردو اخبارات یا رسالوں میں شائع ہوے، اُنھیں قارئین نے بہت پسند کیا۔ اُن قارئین میں بعض اہلِ نظر علما اور اُردو اور اُس کی اُسلوبیّات کا مذاق رکھنے والے پڑھے لکھے حضرات بھی تھے، جن کا خطوط کے ذریعے یا بہ وقتِ ملاقات بالمُشافَہہ بہت تقاضا رہا کہ اُنھیں کتابی شکل میں ضرور اور بہ عجلت شائع کردیا جائے؛ تاکہ وہ محفوظ ہوجائیں اور جو قارئین اخبارات ورسال میں نہ پڑھ سکے ہوں، اُن کے لیے بھی پڑھنا آسان ہوجائے۔

لیکن بہ وجوہ یہ راقم اُن کی خواہش بروقت پوری نہیں کرسکا۔ بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ عاجز چاہتا تھا کہ اپنے قلم سے، یا کسی اور کے ذریعے اُن تذکروں میں سے اکثر یا سب کا اُردو ترجمہ ہوجائے، تبھی اُنھیں بالترتیب شائع کیا جائے؛ لیکن اُن حضرات کا اِصرار بڑھتا رہا

کہ جتنے تذکرے، اردو میں آچکے ہیں، اُنھیں تو ضرور شائع کردیا جائے، اور دگر تراجم (تذکروں) کو اردو میں منتقل کرنے کی سعی جاری رکھی جائے۔

اُن کے پیہم تقاضوں کے پیشِ نظر تاثّراتی مضامین کا یہ مجموعہ نذرِ قارئین کیا جارہا ہے۔ توقّع ہے کہ یہ مضامین اُن قارئین کو بھی اُسی طرح پسند آئیں گے، جنھوں نے اِنھیں اخبارات و رسائل میں پڑھا نہیں تھا، جس طرح اُن قارئین کو پسند آئے، جنھوں نے اِنھیں اخبارات و رسائل میں پڑھا تھا۔



اِن مضامین میں سے اکثر کو بہ وقتِ اِشاعت بڑی حد تک مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور شخصیّات کے سوانحی خاکوں کو لاحقے کے طور پر ہم رشتہ کردیا گیا ہے۔ جن شخصیّات کے سوانحی خاکے، کوشش کے باوجود نہیں مل سکے، اُن کے سلسلے میں، صرف تاثّراتی مضامین پر اِکتفا کیا گیا ہے۔

اِن مضامین میں سے زیادہ تر مضامین، متعلّقہ شخصیّتوں کے سوانح بھی ہیں، اُن کے سلسلے میں بھرپور تاثّرات بھی اور اُن کے مکمل یا نامکمل خاکے بھی اور اُن کے عہد اور ماحول کے تذکرے بھی؛ اِس لیے یہ ہر طرح کے قارئین کے لیے، اپنے اندر دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ زبان کی چاشنی، شخصیّتوں کے پیش کرنے کا خوب صورت انداز اور اُن کے حوالے سے سچائی نگاری، تحلیل و تجزیے میں دقیقہ رسی، فکر انگیزی اور خیال آفرینی کے اُسلوبِ جمیل کی وجہ سے، یہ کتاب تذکرہ نویسی کے فن میں، اپنی مثال آپ بن گئی ہے۔ مُصنّف کی سابقہ تحریروں کی طرح اُس کی یہ کتاب بھی اِن شاءاللہ قاری کے حسنِ ظن کے معیار پر نہ صرف مکمل اُترے گی؛ بل کہ اُس سے سوا ثابت ہوگی۔

اِملا نویسی، اردو نگاری کے عصری انداز اور طباعت و اِشاعت کے جمال و کمال اور خوش نمائی و دل رُبائی کے حوالے سے، مُؤلّف کی یہ کتاب بھی اِن شاءاللہ قابلِ تقلید

نمونہ ثابت ہوگی، طلبہ اور نَو وَارِدانِ بساطِ تحریر کے لیے، مؤلف کی دگر کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مُعلِّم اور راہ نما کا درجہ رکھتی ہے۔ عربی کے جو الفاظ اُردو میں مستعمل ہیں، اُن کے تَلَفُّظ میں اکثر غلطی کی جاتی ہے؛ اِس لیے اُن میں سے اکثر کو بااِعراب لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔



شخصیتوں کے پیش کرنے کی ترتیب میں تاریخ وسنہٴ وفات کا لحاظ رکھا گیا ہے، اُن کی عظمت اور قدر وقیمت کو معیار نہیں بنایا گیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اِن میں سے سارے مضامین اصلاً عربی میں لکھے گئے اور دارالعلوم دیوبند کے عربی ترجمان: ''الداعی'' میں شائع ہوے، پھر وہ اُردو میں ترجمہ ہوکر، اردو رسالوں اور روزناموں میں شائع ہوے، اردو کا قالب راقم السطور نے خود ہی دیا ہے، چند مضامین کے اردو ترجمے، میرے بعض تلامذہ نے کیے ہیں اور میں نے اُن میں حکّ واِضافہ کیا ہے؛ لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ دوسروں کے ترجموں کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ تغیّر وتبدّل کے باوجود، اُن میں کسی نہ کسی درجے میں ترجمے کا رنگ باقی رہ جاتا ہے۔ راقم نے دوسروں کے کیے ہوے ترجموں کی حاشیے میں نشاں دہی کردی ہے اور مُترجمین کے نام بھی درج کردیے ہیں۔ ایک دو مضامین ایسے ہیں، جنھیں راقم نے بہ راہِ راست اُردو ہی میں لکھے ہیں، جیسے حضرت الاستاذ مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی دہلویؒ اور حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ پر راقم نے جو کچھ اِس کتاب میں پیش کیا ہے، وہ بہ راہِ راست اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔ حضرت کیرانویؒ پر راقم کی مستقل کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' میں جو کچھ ہے، وہ اس کتاب کے مضمون کے علاوہ ہے، اُس میں سے کوئی اقتباس حرفِ مُکَرَّر کے طور پر یہاں پیش نہیں کیا گیا ہے۔

یہ سارے مضامین مرحومین پر ہیں، جو اُن کی وفات کے بعد، اُن پر لکھے گئے،

صرف ایک مضمون زندہ شخصیت پر تحریر ہوا تھا، یعنی حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی مدظلہ العالی سابق مفتی دار العلوم دیوبند وحال صدر فقہ اکیڈمی انڈیا پر، جو اِفادۂ عام کے لیے شاملِ کتاب کردیا گیا ہے۔ جس تقریب سے یہ مضمون معرضِ تحریر میں آیا تھا، مضمون کے اِبتدائیے میں، اُس کا تذکرہ کردیا گیا ہے۔



کتاب میں پیش کردہ شخصیتیں، راقم کی صرف شنیدہ نہیں؛ بل کہ دیدہ اور برتی ہوئی ہیں؛ اِس لیے اُن کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، اُس میں خواہی نہ خواہی اپنا تذکرہ اور اپنے احوال وواقعات گھل مل گئے ہیں۔ بعض دفعہ راقم نے اُنھیں قلم اَنداز کرنے کی کوشش کی؛ لیکن وہ اِس میں ناکام رہا؛ کیوں کہ یہ واقعات وحالات، صاحبِ تذکرہ کے حالات وواقعات سے اِس طرح ہم رشتہ تھے جیسے دوجان ویک قالب۔

اِس کتاب میں ۳۷ شخصیتوں کا تذکرہ ہے، جن میں سے اکثر مشہور اور ہر ایک کے لیے معروف ہیں؛ لیکن چند شخصیتیں گم نام نہیں، تو بہت نام آور اور عام قارئین کے لیے معروف نہیں ہیں؛ لیکن راقم کے فکر ونظر اور علم وعمل پر وہ کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوئی ہیں؛ اِس لیے اُن کا اِحسان بھی اُن کے تذکرے کا مُتقاضی ہوا اور یہ بھی کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں بہت معروف اور لائقِ تذکرہ تھیں؛ نیز یہ کہ اصل تذکرہ نویسی تو یہی ہے کہ بالکلیہ گم نام یا قدرے نام آور ہی کو معروف ومشہور کیا جائے؛ تاکہ صحرائے فضل وکمال کے مُختفی ذرّے بھی چمک اُٹھیں اور لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ کیسے کیسے اہل کمال ہیں جنھیں وہ اب تک نہیں جانتے تھے، مشہور کو مزید مشہور کرنا اور چمکتے ہوؤں کو چمکانا، بہ نظرِ غائر دیکھا جائے، تو تحصیلِ حاصل اور فعلِ عبث ہے، یا زیادہ مفید کام نہیں ہے۔

لیکن دنیا والے اِسی روشِ عام پر گام زن ہیں کہ مشہور کو ہی اور مشہور کرتے رہتے ہیں اور گم نام پر خامہ فرسائی نہیں کرتے۔ غالباً اُنھیں یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ گم ناموں یا

نسبتاً کم معروف لوگوں پر لکھنے سے، وہ خود بھی گم نام اور بے نام ہو جائیں گے۔



بہ ہر کیف، ''وہ کوہ کن کی بات'' کے بعد راقم کی یہ پہلی کتاب ہے، جو تذکرے کے موضوع پر، پیش کی جارہی ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب بھی پہلی ہی کتاب کی طرح ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اور اللہ پاک اِسے بھی اُسی مقبولیت سے نوازے گا، جس سے اُس نے مذکورہ کتاب کو نوازا ہے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ قارئینِ کرام سے گزارش ہے کہ ان شخصیتوں کی محبّت کے طفیل، راقم الحروف، اُس کے اَساتذہ، اُس کے والدین اور اُن کرم گستروں کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں، جو کسی طرح بھی، اِس کتاب کی تیاری، طباعت اور اِشاعت کا ذریعہ بنے۔

نور عالم خلیل امینی

استاذ ادبِ عربی

و رئیس تحریر ''الداعی'' عربی

دار العلوم دیو بند

۱۱ بجے صبح دوشنبہ:

۱۲/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

۲۹/مارچ ۲۰۱۰ء

موت کے ہاتھوں سے، مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اُس کو نہ کر دیتا، نظامِ کائنات

(علامہ اقبالؒ)

سید الملّت حضرت مولانا

سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلویؒ

۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء — ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء

کبھی حیرت ، کبھی مستی، کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ ، میرا دردِ مہجوری

نحیف الجسم ، دراز قد، سرخ وسفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں جو نیم باز رہتی تھیں، کشادہ پیشانی، گھنیریں بھنویں، کھڑی ستواں ناک، کتابی چہرہ، ہاتھ میں چھڑی، پاؤں میں سادے جوتے جو عموماً علما وصلحا استعمال کرتے ہیں، بدن پر معمولی سوتی کپڑے کا کرتا پاجامہ، عموماً کھدّر کے کپڑے کا۔ پاجامہ مغلئ ہوتا —— جو صالح علما کا شعار رہا ہے —— جوانی اور اُدھیڑ عمری تو راقم نے نہیں دیکھی، بڑھاپے میں، اُنھیں چھڑی کے سہارے آہستہ روی سے چلتے ہوے دیکھا، گفتگو میں ٹھہراؤ، عالمانہ وقار اور شریفانہ شرمیلا پن۔ شخصیّت کی ہیئتِ کذائی سے ہر دیکھنے والے کو نہ صرف ضعیف الجسم؛ بل کہ ضعیف الارادہ ہونے کا احساس ہوتا؛ لیکن اُنھیں ذرا بھی برتنے والے کو فوراً ہی اُن کے غیر معمولی آہنی اِرادے والے ہونے کا یقین ہوجاتا تھا۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں کاغذات سے بھرا پرس، یا برہنہ کاغذات ہوتے، کبھی خالی نہ بیٹھتے یا تو مطالعہ کرتے یا لکھتے رہتے، مطالعہ اور تحریر اُن کا لازمہ تھی۔ چہرے سے مُترشّح تمام تر حلم وبردباری، مکمل خاکساری، ہر رویّے سے اُبلتی ہوئی شرافت ومروّت کے باوجود ایسا

رُعب کہ اُن کی خواہش؛ بل کہ ''تمنّا'' کے باوجود، یہ راقم اُن سے بے تکلّف ہوسکا نہ کھل کے بات کرسکا، ہاں مراسلت میں اپنی کسی ضرورت کا کوئی پہلو، قدرے بے تکلفی سے اُن کے سامنے پیش کر پاتا تھا؛ لیکن اُس میں بھی یہ خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا کہ اردو زبان کے کسی ''لب و لہجے'' میں ذراسی غلطی ہوئی کہ وہ ضرور روک ٹوک کریں گے۔ اُن کی صورت سے شب بیداری، زہد و اِتّقا، عفاف وقناعت اور صلاح وتقویٰ کے اثرات از خود ہویدا ہوتے تھے۔

تہذیب وشائستگی گھُٹّی میں پڑی تھی، درس گاہ میں طلبہ کو کسی مسئلے پر گفتگو کے بعد ہمیشہ کہتے: ''خیال فرمایا مولانا!'' اپنے شاگردوں کو ہمیشہ ''مولانا'' ہی کے لفظ سے مخاطب کرتے، کسی طالب علم کو ''مولوی'' کہتے نہ ''تم'' سے خطاب کرتے؛ بل کہ ہر ایک کو ''آپ'' ہی کہتے، حال آں کہ وہ مغربی یوپی کے تھے، جہاں ''پنجاب'' سے قربت کی وجہ سے باپ کو بھی بیٹا ''تم'' ہی کہتا ہے اور کوئی باپ بُرا نہیں مناتا۔ اُن کے حلم وشرافت سے ہم لوگ اتنے مُتاثّر تھے کہ اُنھیں مدرسے کے ماحول میں ہمیشہ ''مولانا شریف'' ہی کہتے تھے۔ ہماری طالبِ علمی میں وہ ستّر کے پیٹے میں تھے، بواسیر کی شدّت رہتی تھی، خلقتاً کم زور اور نازک تھے، بڑھاپے نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی، ایسے میں جھنجھلاہٹ چڑچڑاپن اور غصّہ آنا عام سی بات ہوجاتا ہے؛ لیکن وہ میری طالبِ علمی کے مکمل یک سالہ دورانیے میں کبھی ہم لوگوں سے بے مزہ ہوے، نہ ناراض، نہ کبھی سخت لہجے میں ڈانٹا، نہ کسی بیہودگی پر جو طالب علموں سے ضرور سرزد ہوتی رہتی ہے، آزردہ ہوے نہ افسردہ۔ اُن کے مکان (جو کرایے کا تھا) واقع اندرون اِحاطہ کالے صاحب، گلی قاسم جان، بلیماران، دہلی، اور مدرسہ امینیہ واقع ''کشمیری گیٹ'' دہلی ۶ کے درمیان کم از کم ۲ کلومیٹر کا فاصلہ ضرور ہوگا۔ حضرت اس فاصلے کو روزانہ آمد ورفت دونوں صورتوں میں پیدل طے کرتے تھے۔ یہ راستہ انتہائی بھیڑ والا اور دہلی کے اہم بازاروں سے گزرتا ہے، خود ''گلی قاسم جان'' کی گھنیری آبادی اور بھیڑ والی گلی، پھر ''چاندنی چوک'' تک کا

''بلی ماران'' کا علاقہ جو ہمیشہ سے انسانوں کا جنگل معلوم ہوتا ہے۔ وہاں سے ٹاؤن ہال کی عمارتوں کو عبور کر کے پرانی دہلی کے ریلوے اسٹیشن تک کے علاقے کا یہی حال ہے۔ اب تو پرانی دہلی کے اسٹیشن کے سامنے کی بڑی شاہ راہ پر سڑک پار کرنے کے لیے پل بن گیا ہے، اُس زمانے میں یہ پل نہیں تھا، سڑک کو عبور کرنا ہم جیسے لڑکوں کے لیے بھی مشکل تھا؛ لیکن حضرت اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے آہستہ روی سے ہی اُس سڑک کو پار کر کے، دوسری طرف جانبِ جنوب آتے، پھر مشہور ''کوڑیا'' پل کو پار کرنے کے لیے (۱) اُس کے زینوں پر اپنے ڈنڈے کے سہارے چڑھتے، اِس پل پر ہمیشہ آنے جانے والوں کی دورویہ بہت بھیڑ ہوتی؛ لیکن وہ اپنی آہستہ خرامی کے ساتھ ''کشمیری گیٹ'' کی طرف اُتر جاتے، وہاں سے مزید جانبِ شمال تقریباً ۲۰۰ قدم کے فاصلے پر مدرسہ امینیہ کی عمارت واقع ہے۔ یہاں بھی اگر دفتر میں جاتے تو دوسری منزل تک چڑھنا ہی تھا اور اگر درس گاہ میں جاتے تو وہ تیسری منزل پر واقع تھی؛ لہٰذا یہ سارے زینے وہ آہستہ آہستہ طے کر کے جہاں جانا ہوتا وہاں پہنچ جاتے۔ صبر، تحمل، قناعت اور سادگی اُن کی شناخت تھی۔ یہ وصف اُن کی زندگی کے ہر رنگ میں سب سے زیادہ شوخ نظر آتا تھا۔ اُن کی عمر کے ہم ایسے لوگ ہوتے، تو ایسے کٹھن راستے کو، روزانہ پیدل عبور کرنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور حضرت میرے آگے آگے میری نظروں کے سامنے چلتے ہوئے مجھے دِکھ رہے ہیں، لگتا ہے یہ ماضی کا واقعہ نہیں، یہ اِسی وقت کی تازہ اور زندہ حقیقت ہے۔

---

(۱) نہ معلوم اُس کا یہ نام کیوں اور کس نے رکھا تھا۔ یہ پل پرانی دہلی کے اسٹیشن سے جانبِ شرق میں جمنا کے پل، شاہدرہ اور غازی آباد کی اُور جاتی ہوئی ریلوے کی گھنیری لائنوں کو عبور کر کے فوّارے کے علاقے سے سیدھا کشمیری گیٹ کو جوڑتا ہے اور لوگ بہ عجلت اِس ''کوریا کے پل'' کے ذریعے فوّارے کی طرف سے پانچ یا سن رسیدہ ہونے کی صورت میں ۷-۸ منٹ میں کشمیری گیٹ اور اُدھر سے فوّارے کی طرف پہنچ جاتے ہیں۔ یہ پل انگریزی حکومت نے ۱۹۰۳ء میں تعمیر کیا تھا۔ اب ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ مطابق اپریل ۲۰۱۰ء میں اخبارات میں یہ خبر چھپی ہے کہ ۱۰۷ سال پرانے اِس پل کو ریلوے انتظامیہ نئے ٹریفک پلان کے تحت عن قریب توڑنے کو ہے۔

ہمہ جہت عالم دین

حضرت مولانا سید محمد میاں دیو بندی دہلویؒ ہمہ جہت عالمِ دین تھے۔ وہ بڑے بافیض و باتوفیق مدرس تھے۔ اُن کا درس صرف مغز کا حامل ہوتا، وہ بہت مختصر گفتگو کرتے، جس سے فائدہ اٹھانا اور متعلق موضوع کو سمجھنا اور سمیٹنا طلبہ کے لیے آسان ہوتا۔ کبھی لایعنی گفتگو کرتے، نہ دراز کلامی کرتے، نہ بیجا مزاح کرتے، نہ کبھی زور سے ہنستے، نہ ہنسانے کے لیے کسی چٹکلے کا سہارا لیتے۔ اُن کا طرزِ کلام مفکرانہ، مدبرانہ اور مؤرخانہ ہوتا، درسِ حدیث میں اِسی کے ساتھ محدثانہ وفقیہانہ ہوتا۔ اُن کے اکثر جملوں میں غیر معمولی غور وفکر کی دعوت چھپی ہوتی۔ اُن کے اِن تدریسی صفات وخصوصیّات کی وجہ سے، ذہین اور ہوش مند طلبہ کے لیے، اُن کے درس سے ایک ہمہ صفات عالم وداعی اِلی اللہ بننے کی راہ ہم وار ہوتی۔ زبان اور لب ولہجہ بہت پاکیزہ ہوتا، لفظ لفظ سے شرافت ٹپکتی، ہر تعبیر سے دین کا درد، ایک زاہد شب بیدار کا کرب، ایک مؤرخِ اسلام کی بے قراری، ایک پرسوز عالِم کا اضطراب اور عالَم کے لیے ہدایت کا ذریعہ بننے والی امت کی زبوں حالی کا بے کراں دُکھ چھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ درس گاہ کے سارے طلبہ، اُن کے درس کی اِن ساری خوبیوں کو یکساں طور پر محسوس نہیں کر پاتے تھے؛ بل کہ ہر طالبِ علم، اپنے ظرف اور مبلغِ فہم وذکا کے مطابق ہی اُن سے فائدہ اٹھاتا تھا۔

بلند پایہ محدث وفقیہ ومفتی

وہ بلند پایہ مُحدِّث تھے اور حدیث میں اپنے عصر کے سب سے بڑے مُحدِّث علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے۔ کم وبیش ۳۲ سال تدریسی خدمت انجام دی (۳ سال مدرسہ حنفیہ آرا میں، جہاں سے آپ نے تدریس کا آغاز کیا، ۱۶ سال مدرسہ شاہی مراد آباد میں اور ۱۳ سال مدرسہ امینیہ دہلی میں)، جس میں حدیث شریف کی اعلیٰ کتابوں: صحیح

بخاری اور صحیح مسلم کی تدریس سرفہرست رہی۔ وہ اعلیٰ پایے کے فقیہ و مفتی تھے، فقہ و فتاویٰ کی اُمّہات الکتب کا نہ صرف عرصۂ دراز تک درس دیا؛ بل کہ مدرسہ شاہی مراد آباد اور مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی میں مدرسی کے سارے دورانیے میں جو کم از کم ۲۹ سالوں پر محیط ہے، ہمیشہ فتاویٰ بھی تحریر فرماتے رہے۔ فقہ و فتویٰ میں وہ اپنے زمانے میں علماے برِ صغیر کے درمیان ایک اہم ستون سمجھے جاتے تھے اور بڑے بڑے پیچیدہ مسائل میں عموماً، علماے کرام آپ ہی سے رجوع فرماتے تھے، آپ کے فرعی اجتہاد و نقطۂ نظر کو اُن اہم مسائل میں بڑی اہمیّت دی جاتی تھی۔

شان دار و پیغام رساں اہلِ قلم

وہ بہت بڑے اہلِ قلم اور مؤلّف تھے۔ اُن کی چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد ستّر تک پہنچتی ہے۔ بعض کتابیں متعدد جلدوں میں ہیں۔ مختلف علمی و دینی و قیع رسالوں میں جو لاتعداد علمی و تحقیقی فکر انگیز مقالات لکھے، وہ اِن کے علاوہ ہیں، جنھیں جمع کر دیا جائے تو متعدد الاَجزا دسیوں کتابیں تیار ہو جائیں گی۔ اُن کے قلم میں عالم کا وقار، فقیہ و مفتی کی جزرسی، مؤرخ کی دیدہ وری و پختہ کاری، ادیب کی فن کاری، چاشنی اور فصاحت و بلاغت و جاذبیت کے ساتھ، دہلوی اردو کا بانکپن اور ممتاز رنگ و آہنگ، ہر قاری کو محسوس ہوتا ہے۔ دردمند عالم کا سوز اُن کی ہر تحریر کا امتیاز ہے۔ ”علماے ہند کا شان دار ماضی“ اُن کی ساری تصنیفات میں بالخصوص شان دار مقام کی حامل ہے۔ اُن کی یہ تصنیفِ لطیف اُن کی جوانی اور توانائی کے دور کی تصنیف ہے، اُس میں قلم کی جولانی، اِنشاپردازی کے خوب صورت رنگ، سوانح نویسی کے خاص انداز، تاریخ نگاری کی طرح داری، مجاہدانہ کارناموں کی جمع و ترتیب کے نرالا پن، ماضی کی تاب ناکیوں سے مستقبل کے لیے نتیجہ خیز اُجالا اخذ کرنے کی دُھن، علماے سلف کے مجاہدانہ حالات سے حاضر کے کم ہمّت مسافرانِ راہ کے لیے، بھرپور توشۂ راہ بہم پہنچانے کی لگن اَور قوسِ قزح کی خوش رنگی اور

غیر معمولی جاذبیت، قاری کو اپنی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتی ہیں، ویسے اُن کی ہر تحریر کا تقریباً یہی رنگ ہے، جو کسی کسی تحریر میں زیادہ نمایاں اور شوخ نظر آتا ہے۔

حیوانِ کاتب

جمعیّت علماے ہند کی تاریخ، کارناموں، طریقۂ فکر و عمل اور آزادی سے قبل اور اُس کے بعد مسلمانوں کی مختلف الانواع خدمات اور قوم و وطن کی ٹھوس راہ نمائی کے حوالے سے، اُنھوں نے اِتنا کچھ لکھا، جو بعد کے سارے مؤرِّخین کے لیے زبردست اور بھرپور سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جمعیّت نہ صرف اِس حوالے سے؛ بل کہ بہت سارے حوالوں سے، اُن کے اِحسان کے بار سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ پُرنویسی و کثرتِ تالیف کی وجہ سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اُنھیں "حیوانِ کاتب" کہا کرتے تھے، نہ صرف جمعیّت؛ بل کہ دارالعلوم دیوبند اور علما کے ماحول میں یہ لقب زبان زدِ خاص و عام ہوگیا تھا۔ وہ علماے دیوبند میں کثرتِ نگارش کے تعلّق سے گنے چنے سعادت نصیبوں میں تھے۔

ممتاز مؤرخ و سوانح نگار

وہ ممتاز مؤرِّخ اور سوانح نگار تھے۔ "علماے ہند کا شان دار ماضی"، "علماے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے"، "حیات شیخ الاسلام"، "مجاہد جلیل"، "اسیرانِ مالٹا"، "تحریکِ شیخ الہند" وغیرہ اُن کی تاریخ نگاری اور ساتھ ہی سوانح نویسی کا بہترین نمونہ ہیں اور اُن کی خوب صورت و چاشنی بھری نثر کا نقشِ دوام بھی۔ اِن کتابوں سے جہاں فرنگی سامراج کی چیرہ دستیاں اَلم نشرح ہوتی ہیں، وہیں پچاسوں علماے حق کی سرفروشیوں کی ولولہ انگیز داستانوں کی شعور خیز جان کاری بھی ہوتی ہے اور یہ سبق بھی ملتا ہے کہ علما نے ہر زمانے میں، اُس زمانے کے تقاضے کے مطابق، سیاسی سرگرمیوں میں نہ صرف حِصّہ لیا

ہے؛ بل کہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور دار و رسن کو بھی بہ خوشی لبیک کہا ہے؛ اِس لیے زمانۂ حال میں، اُس کے تقاضے کے مطابق سیاسی تحریک میں، دین وملت کی خدمت کے لیے، مخلصانہ طور پر حصّہ لینا، علُما کی شان کے خلاف ہے، نہ کوئی بدعت ہے؛ بل کہ اصحابِ دعوت وعزیمت علُما کی سنہری روایات کو زندہ کرنا ہے۔

شب بیدار و خوش اوقات عالم

وہ شب بیدار اہلِ دل اور خوش اوقات عالمِ دین تھے، مشاغل کی بے پناہی، کبھی با جماعت نماز میں خلل انداز ہوتی تھی نہ شب بیداری، تہجّد گزاری اور آہِ سحر گاہی میں، وہ صحیح معنی میں فارس بالنّہار اور راہب باللیل تھے؛ کیوں کہ وہ جن اَساتذہ کے شاگرد تھے، وہ صرف حرفِ علم کے پجاری نہ تھے؛ بل کہ وہ علم وعمل دونوں کے شہ سوار تھے؛ اِس لیے اُن کی گود میں پلا بڑھا ہر عالم صحیح معنی میں علم وعمل کا جامع ہوتا تھا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی اِس کی نمایاں مثال تھے۔ اِس راقم نے اُن کی انتہائی کم زوری، پیرانہ سالی اور بیماریوں کی مسلسل یلغار سے، اُنھیں زار ونزار رہنے کا دور دیکھا ہے؛ لیکن وہ جہاں ہوتے، جس حال میں ہوتے، موسم جاڑے کا ہو یا لُو کا، برسات کی جھری ہو یا رات کی تاریکی وہ اپنی چھڑی ٹیکتے ہوے مسجد پہنچتے اور با جماعت نماز ادا کرتے۔ عبادت کا ذوق، ذکرِ الٰہی کا شوق، تلاوت اور اوراد ووظائف کی پابندی، اُن کی ذات کا امتیازی وصف تھا۔ مدرس وفقیہ ومفتی ومحدث، ومؤلف وسیاسی میدان کے سرگرم قائد مولانا سید محمد میاں، دراصل ایک متقی، خدا ترس اور زاہد اَوّاب عالمِ دین تھے، اُن کی زندگی کا یہی وصف درحقیقت سب سے زیادہ نمایاں اور اُن کی عظمت کے ہار کا سب سے قیمتی موتی ہے کہ اِس کے بغیر سارے کارنامے لفظِ بے معنی اور نقشِ ناتمام؛ بل کہ سعیِ ناکام ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال نے صحیح کہا ہے:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا ، بے آہِ سحر گاہی

شیخ الاسلام کے خوانِ سلوک و اِحسان کے خوشہ چیں

وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دست گرفتہ اور اُن کے خوانِ سلوک و اِحسان کے ممتاز خوشہ چینوں میں تھے۔ اُنھوں نے اپنے شیخ کی اِحسانی تعلیم وتربیت اور اِیمانی حرارت وعبادتی ذوق وشوق سے صرف خانقاہ کی خلوتوں ہی میں فائدہ نہیں اُٹھایا؛ بل کہ ملک وملّت کی بھرپور خدمتوں اور جمعیّتِ علماے ہند کی بے پناہ سرگرمیوں کی جلوتوں میں بھی، اُن کے نفسِ گرم کی تاثیر کو جذب کیا تھا۔ اُن کی خاک ساری اور تواضع اور فروتنی ہوسکتا ہے کہ اُن کے موروثی ساداتی رنگ کی عکّاس ہو؛ لیکن اُس کی شوخی وگہرائی، بالیقین شیخ الاسلامؒ کی صحبتِ اِکسیری کی رہینِ منّت تھی۔ شیخ الاسلامؒ کی خاک ساری ضرب المثل تھی؛ لیکن اِس راقم آثم کو اِس کے تجربے کی سعادت حاصل نہیں؛ لیکن حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاںؒ کی خاک ساری میں نے دیکھی اور برتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں چند ہی خداترسوں کو، اُن کے ایسا خاک سار اور منکسر المزاج پایا ہے۔

میدانِ سیاست کے تکان ناآشنا شہ سوار

اِسی کے ساتھ وہ میدانِ سیاست کے پُرجوش اور تکان ناآشنا شہ سوار تھے۔ آزادیِ وطن کی سرگرمیوں میں، اُنھوں نے سرفروشانہ حصّہ لیا اور علمی وتدریسی مشاغل کے گم بھیر بوجھ کے باوجود، زبان وقلم اور حرکت وعمل کی ساری توانائیوں سے، تحریکِ آزادی کے انتہائی فعال، مخلص اور سچّے سپاہی کا بے مثال کردار ادا کیا۔ اِس سلسلے میں وہ ساحل کے تماشائی نہ تھے؛ بل کہ طرح طرح کی سختیوں، آزمایشوں، چکی کی مشقّتوں اور جیل کی

سلاخوں، حوالات کے عذابوں، گرفتاریوں کی دردناکیوں اور خوف ودہشت کی تلاطم خیزیوں سے دیوانہ وار مقابلہ کیا، جس کی کچھ تفصیل اِن شاءاللہ آئندہ صفحات میں بالخصوص مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خودنوشت بہ شکل مضمون میں قاری کے سامنے آئے گی، جس سے اندازہ ہوگا کہ فرنگی سامراج کے خلاف نفرت وعداوت کا جو بیج، اُن کے عظیم اساتذہ اور پیش روعلمانے بویا تھا، وہ اِس باشعور تاریخ کے مزاج آشنا اور اُمّت کے عروج وزوال کے اسباب کا اِدراک رکھنے والے دردمند عالم کے دل میں کیسا تناور اور بارآور درخت بن گیا تھا۔ اِس حوالے سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ غالب کے اِس شعر کا مصداق تھے:

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا

وہ منحنی الجسم، دبلے پتلے اور چھریرے بدن کے تھے، اُنھیں دیکھ کر کسی کو قطعاً اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ نسبتاً ایسے کم زور ڈھانچے میں شیر دل شخصیت چھپی ہوگی اور وہ تحریکِ آزادی کے میدان کے فولادی اِرادے کے سپاہی رہے ہوں گے، جن کی عزیمت کو استعماری حکومت کی کوئی تدبیر کبھی چیلنج کرسکی نہ راہ کی سختیاں اور حالات کی دھوپ چھاؤں اُن کے پائے استقلال میں لرزش پیدا کرسکی۔ عربی شاعر نے بہت صحیح کہا ہے:

تَرَی الرَّجُلَ النَّحِيفَ فَتَزْدَرِيهِ
وَفِي أَثْوَابِهٖ أَسَدٌ مَزِيرٌ

تم ایک نحیف الجسم انسان کو دیکھ کر اُس کو ہیچ سمجھوگے، حال آں کہ اُس کے اندر ایک پختہ دل شیر چھپا ہوگا (جس کا صحیح اندازہ تجربے کے بعد ہی ہوسکے گا)

ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں

سیاسی میدان میں آپ کی تگ ودو اور جمعیۃ علمائے ہند سے وابستگی، دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ فراغت کے بعد ہی مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ علما کے ساتویں

اِجلاس کلکتہ میں دارالعلوم کے اکابر کے ساتھ آپ نے شرکت فرمائی(۱) لیکن سیاسی سرگرمیوں کا اصل دور "مدرسہ شاہی" مرادآباد آمد کے بعد شروع ہوا، جو تاحیات باقی رہا۔ سب سے پہلے آپ جمعیۃ علما مرادآباد کے نائب ناظم منتخب ہوے، پھر جمعیۃ علماے ہند کے ناظم اعلیٰ چنے گئے اور دگر بڑی بڑی ذمے داریاں انجام دیں۔

جمعیۃ علما کے تاریخی اِجلاس منعقدہ امروہہ کی معنویّت اور حضرت کا بہ حیثیت ذمے دار انتخاب

مئی ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ علما کا تاریخی اِجلاس شہر "امروہہ" میں منعقد ہوا، اِس کی بڑی اہمیت یہ تھی کہ اِس میں کانگریس کے ساتھ شراکتِ عمل کی قرارداد پاس کی گئی۔ اِس اجلاس سے کچھ پہلے جمعیۃ علما شہر مرادآباد کی مجلس منتظمہ کے اِجلاس میں آپ کو شہر مرادآباد کی جمعیت کا نائب ناظم منتخب کیا گیا، کچھ دنوں بعد با قاعدہ ناظم بنادیا گیا، پھر جمعیۃ علما صوبہ آگرہ کا ناظم تبلیغ بنایا گیا؛ کیوں کہ اُس وقت جمعیۃ علما، تبلیغ کی سرگرمیاں بھی انجام دیتی تھی۔ پھر آگرہ اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے ناظمِ جمعیۃ بنادیے گئے، پھر اجلاس جمعیۃ سہارنپور ۴ تا ۷ رمئی ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علماے ہند کے ناظم منتخب ہوے، اِسی اجلاس میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ؒ (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۱ء-۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) جمعیۃ کے ناظمِ اعلیٰ منتخب ہوے۔ مولانا حفظ الرحمٰن ؒ کی وفات کے بعد ایک سال جمعیۃ کے ناظم اعلی رہے۔ آپ جمعیۃ کی نظامت کے عہدے پر تقریباً ۳۵ سال فائز ہے۔ نظامتِ علیا سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی، آپ جمعیۃ کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور اُس کے ادارے "ادارہ مباحثِ فقہیہ" کے ناظم اور جمعیۃ ٹرسٹ کے سکریٹری رہے۔

قید و بند کی آزمایشیں اور حفظِ قرآن پاک

جدو جہد آزادی کے دوران آپ پانچ مرتبہ قید و بند کی آزمایشوں سے گزرے،

(۱) ماہ نامہ "ندائے شاہی" شمارہ اپریل-مئی ۱۹۹۰ء، ص: ۱۳۰۔

جس کے دوران آپ نے قرآنِ پاک حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی؛ کیوں کہ بچپن میں آپ قرآن پاک حفظ نہیں کر سکے تھے۔ مرادآباد، دہلی، میرٹھ، بریلی اور فیض آباد کی جیلوں میں آپ قید رہے۔ جیل میں آپ نے چکی کی مشقت بھی سہی اور طرح طرح کی سختیاں بھی جھیلیں؛ لیکن اپنے اسلاف و مشائخ سے صبر و استقلال کا جو سبق سیکھا تھا، اُس کی وجہ سے آپ کے عزم و استقلال میں کبھی کوئی تزلزل پیدا نہ ہوا۔

ارتداد کے خطرے کا سدِّ باب اور مجاہدانہ سرگرمیاں

ملک کی آزادی کے بعد، جہاں مسلمان تھوڑی تعداد میں رہ گئے تھے، وہاں ارتداد کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ان مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنا بڑا نازک مسئلہ بن گیا تھا، آپ نے اِس سلسلے میں بڑا بنیادی کردار ادا کیا، راجستھان، میوات، ہماچل پردیش اور مشرقی پنجاب کے دور دراز علاقو میں شب و روز دورے کیے، دینی مکاتب قائم کیے، اُن مسلمانوں کو دینی معلومات بہم پہنچائیں، اُنھیں حکمتِ عملی سے اسلام کی قیمت و اہمیت بتائی، اِس سلسلے میں بعض ایسی جگہوں کا سفر کیا، جہاں جانا بڑی ہمت اور عزیمت کا کام تھا، اُن کے کم زور جسم میں آہنی اِرادے کا ایک بہت طاقت ور انسان نہ ہوتا، تو وہ ہرگز یہ مہم انجام نہیں دے سکتے تھے۔ اُنھوں نے اس سلسلے میں متعدّد رفقاے کار کو کام پر لگایا اور اُن کی علمی وفکری تربیت کی۔ اِس طرح اَن گنت مسلمانوں کو ارتداد سے بچایا۔ یہ اُن کے دینی و ملی کارناموں میں بڑا تاریخی کارنامہ ہے۔

آزادی کے بعد نسلِ نو کے لیے اِیمانی وعقائدی حفاظتی دیوار کی تعمیر میں بنیادی کردار

اِسی طرح آزادی کے بعد کے مرحلے میں مسلمانوں کی نئی نسلوں میں دین کی حفاظت اور عقیدۂ اسلام پر اُنھیں برقرار رکھنا بھی دینی و ملی فریضے میں بنیادی حیثیت کا کام

تھا، جمعیۃ علماے ہند نے اپنے سولھویں اِجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۶ تا ۱۸/اپریل ۱۹۴۹ء میں دینی تعلیم پر ارتکاز کو اپنا بنیادی پروگرام قرار دیا اور اِس مہم کو انجام دینے کی ذمے داری آپ ہی کے ذمے کی گئی، آپ نے نہ صرف اُسے مطلوبہ معیار پر انجام دیا؛ بل کہ اِس کے لیے نصابی رسالے بھی مرتب فرمائے، جو دینی ''تعلیم کے رسالے'' کے نام سے بہت مشہور ومقبول ہوے اور آپ کی میزانِ حسنات میں گراں قدر اِضافے کا باعث بنے۔

اِدارۂ مباحثِ فقہیہ کا قیام اور اُس کی ذمے داری

آپ ہی کی تحریک وترغیب پر جمعیۃ علما نے ''ادارہ مباحثِ فقہیہ'' قائم کیا؛ تا کہ بدلتے ہوے حالات میں، پیدا شدہ مسائل پر تحقیق اور غور وخوض کر کے، ملت کی اُن کے سلسلے میں رہ نمائی کی جائے۔ اِس کے تحت متعدد اہم موضوعات پر آپ نے تحقیقی کام کیے، جو ملک کے نام وَرْ علما وفقہا کے نزدیک بنیادی اہمیت کی نظر سے دیکھے گئے۔

الجمعیۃ کا اِحیاے نو اور اس کی اِدارت

جمعیۃ علما نے ۲۳/دسمبر ۱۹۴۷ء سے روزنامہ ''الجمعیۃ'' دوبارہ جاری کیا تو اُس کی اِدارت کی ذمے داری آپ ہی نے انجام دی، اِس تاریخ سے ۹ سال پہلے برطانوی حکومت نے اسے بند کر دیا تھا، اس وقت وہ سہ روزہ نکلا کرتا تھا۔

جمعیۃ علما کی تاریخ ودستاویزات کے تعلّق سے، آپ کی تحریریں ہی اصل سرمایہ ہیں، آپ نے اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا اور تاریخ نویسوں کے لیے بنیادی مواد فراہم کر دیا۔

راقم السطور کے لیے، حضرت کی حیثیت

میرے لیے وہ شفقتِ پدری اور مہر مادری کا مجموعہ تھے۔ میں تین ماہ کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا؛ اِس لیے میں نے اپنے باپ کی شفقت نہیں دیکھی، البتہ ماں کی

مہربانی اور پیار کا تسلسل الحمدللہ آج بھی (بہ روز یک شنبہ ۱۷؍شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۹؍ اگست ۲۰۰۹ء) قائم ہے، جب کہ میری عمر کی چھٹی دہائی کی تکمیل میں صرف ۳ سال رہ گئے ہیں۔ اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ میرے لیے ذاتی طور پر والدین کی ساری خوبیوں کا پیکر تھے۔ یادش بہ خیر کہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ (سابق مفتی و مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند و مشہور اہلِ قلم) نے ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ/ دسمبر ۱۹۷۰ء میں دہلی کے اپنے سفر کے دوران، جو اُنھوں نے میری درخواست پر، میری خاطر کیا تھا اور مدرسہ امینیہ ہی میں قیام فرمایا تھا، مدرسہ امینیہ کی مسجد میں جانبِ شمال کے گوشے میں، جہاں اُس وقت حضرت الاستاذؒ بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس دیا کرتے تھے؛ کیوں کہ شدید ٹھنڈک کی وجہ سے اپنی درس گاہ میں، جو تیسری منزل پر واقع تھی، اُن کے لیے جانا دشوار ہوتا تھا؛ حضرت الاستاذ سے ملاقات کی، میرا نام لے کر تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ اپنی دارالعلوم دیوبند کی خادمانہ زندگی میں جن چند طلبہ سے میں بے حد مُتاثّر ہوا، اُن میں سے ایک یہ مولوی نور عالم مظفر پوری ہیں۔ یہ اِن کی بے حد سعادت کی بات ہے کہ یہ آپ کے تلمُّذ میں آگئے ہیں۔ اِن شاء اللہ آپ اِن سے خوش ہوں گے۔ صرف یہ کہنا ہے کہ یہ بہت نادار ہیں، شیر خوارگی سے ہی سایۂ پدری سے محروم ہیں، بے مایہ والدہ کے سوا کوئی اِن کا کفیل نہیں۔ بے سروسامانی اور محرومی کے تکلیف دہ اِحساس کے باوجود، الحمدللہ اِنھوں نے اپنے وقت کی قدر کرنا سیکھا ہے۔

محرومی کی تلخی اور دست گیری کی شیرینی

یہ چند جملے جو عاجلانہ طور پر حضرت الاستاذ کے کان میں پڑے، میں دل ہی دل میں اُن کے تعلّق سے سوچتا رہا کہ یہ بہ جلد کافور ہو جائیں گے۔ یہ بزرگ سال حضرت بھلا اِنھیں کہاں یاد رکھ سکیں گے اور یاد رہے بھی تو اِن جملوں کا اُن کی طرف سے مجھے کیا

فائدہ ہوسکتا ہے؟ لیکن دسمبر کا نصفِ آخر آیا اور شدید ٹھنڈک نے دہلی اور مغربی یوپی کے اس پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، شب و روز جیسا کہ یہاں اِس موسم میں ہمیشہ ہوا کرتا ہے، یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ میرے پاس یہاں کی ٹھنڈک سے بچنے کے لیے ہمہ وقت پہننے کے کپڑے تھے یا کھدّر کی چادر، جو اُس زمانے میں ہمارے وسیع تر اَطراف کے سارے طلبہ کے جسم پر نظر آتی تھی؛ کیوں کہ اُس وقت ہر گھر میں خواتین چرخے پر سوت کاتتیں اور کھادی بھنڈاروں میں، جو ہر ممتاز گاؤں بالخصوص بلاک والے گاؤں میں ہوا کرتے تھے، فروخت کرتیں، اُس کے بدلے میں کچھ نقد روپے اور کھادی کے کپڑے، اوڑھنے کی چادریں اور بیڈشیٹس حاصل کرتیں۔ اِس طرح نادار خواتین کسی نہ کسی طرح روزمرہ کے مصارف کے لیے پندرہ روز یا ایک ماہ کے بعد کچھ نہ کچھ نقد پالیتیں۔ صبح اور شام کے وقت بالعموم اور چلّے کی سردی میں بالخصوص جسم کے مُجرَّد کپڑے اور یہ بے چاری چادر جسم کے اندر پیوست ہوتی ہوئی برفیلی ہواؤں کو نہیں روک پاتی تھی؛ لیکن یہ سمجھ کر میں برداشت کرتا تھا کہ اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لڑکپن کی مدافعانہ قوت، قناعت کی طاقت اور یہ سوچ کہ سردی کا بہ ہر صورت اِسی ناتواں ہتھیار سے مقابلہ کرنا ہے، ایک طرح کی بھرپور قوّتِ مدافعت کو جنم دیتی تھی۔

اِسی حال میں، مَیں ایک روز صبح کے گھنٹے میں حضرت الأستاذ کے سامنے سِمٹا، سکُڑا ہوا ٹھنڈک کی بھرپور جارحانہ و تمام تر بے رحمانہ یلغار کا مقابلہ کرتے ہوئے بیٹھا ہوا تھا کہ درس کی تقریر کے دوران، اچانک حضرت الأستاذ کی نگاہ میرے کپکپاتے ہوئے جسم پر پڑگئی۔ میں قدرے شرم سار ہوا کہ شاید آج میری بے مایگی اِن کے سامنے برہنہ ہوگئی ہے۔ اِنسان بڑے سے بڑے مشفق کے سامنے بھی اگر وہ بے تکلف اور دیرینہ دردآشنا نہ ہو، تو اپنے کسی زخم کی ٹیس کے آشکارا ہوجانے سے بہت شرمندہ ہوتا ہے؛ حال آں کہ اُس کا علاج اُسی وقت ہوسکتا ہے جب اُس کو کسی چارہ ساز پنبہ نہاد کے سامنے بیان کیا جائے، یا از خود اُس کو اِس کا علم ہوجائے؛ لیکن انسانی فطرت اگر وہ

خارجی عوامل کے ہاتھوں مسمار نہ ہو چکی ہو، اپنے دکھ کا حال، درد آشنائے ہم راز کے سامنے کہنے سے بھی اِبا کرتی ہے۔

دوسرے روز صبح کے گھنٹے کے ختم پر حضرت الاستاذ نے مسجد ہی میں مجھے روک لیا۔ اور دیگر طلبہ کو اپنے اپنے کمروں میں جانے دیا۔ جب تنہائی سی ہوئی، تو اخبار کے کاغذ میں لپٹی ہوئی نرم سی ایک چیز میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ آپ اِس کو استعمال کریں، یہ جرسی ہے، ہے تو مستعمل لیکن ابھی درست حالت میں ہے اور آپ کے پاس کچھ نہ ہونے سے بہتر ہوگا کہ یہ پُرانی جرسی ہی سہی بدن پر رہے۔ میں نے حضرت الاستاذ کے ہدیے کو جہاں اپنی سعادت سمجھا وہیں شرمندگی اور محرومی کے ملے جلے جذبات نے میرے زخمی دل کے تاروں کو بُری طرح چھیڑ دیا، کافی دیر تک میرے آنسو کسی طرح نہیں تھمے۔ حضرت نے فرمایا: تم اِس قدر مُتأثّر کیوں ہو؟ مجھے کوئی جواب اِس کے سوا نہ بن پڑا کہ شکستہ اور لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ میں، میں نے جزاک اللہ کہا اور کمرے میں جا کے آنکھیں پوچھ، دوسرے گھنٹے کی تیاری کر مسلم شریف کے لیے، حضرت مولانا سیّد محمد مشہود الحسن امروہوی مدظلہ (۱) کی درس گاہ میں حاضر ہو گیا۔

حضرت کی عنایتوں کا تسلسل

اِس کے بعد حضرت کی عنایتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ درس گاہ میں سبق کی تفہیم کے دوران، اکثر مجھے ہی مخاطب کرتے، شاید اُنھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سبق کو زیادہ غور سے سنتا، اُس سے دلچسپی لیتا اور اُس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے: لٰہذا میری تقریر و تفہیم کی امانت کا یہی زیادہ حق دار ہے۔ مُدرّس اور مُقرّر، مُخاطبین میں سے عموماً اُنھی

(۱) اور اب اِس مضمون کے کتابی شکل میں طباعت کے لیے لاسٹ ٹچنگ سے گزارے جانے کے وقت رحمۃ اللہ علیہ؛ اِس لیے کہ اُنھوں نے ۲۵ر صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۰ر فروری ۲۰۱۰ء کو داعیِ اجَل کو لبیک کہا۔ اُن کی تاریخ پیدائش ۲۹ر مئی ۱۹۲۷ء مطابق ۲۶ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ ہے۔

لوگوں کی طرف زیادہ روئے سخن مرکوز کرتا ہے، جن کے چہرے سے دلچسپی، توَجُّہ، سمجھ داری اور پیش کی جارہی باتوں کی قدردانی آشکارا ہوتی ہے۔ مدرس اور مقرر کسی جانب روئے سخن کے ارتکاز کے حوالے سے مجبور ہوتا ہے؛ کیوں کہ اِس سلسلے میں اُس کے اِرادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ حاضرین وسامعین کی توَجُّہات میں، خدائے حکیم نے مقناطیسی جاذبیّت رکھی ہے۔

مدرسوں میں عموماً سنہ ہجری کی پہلی دوسری تاریخ کو مدرسین وملازمین کو تنخواہیں ملا کرتی ہیں۔ پہلی یا دوسری تاریخ کو جب حضرت الاستاذ کو تنخواہ ملتی، تو ہر مہینے تو نہیں؛ لیکن دوسرے تیسرے مہینے وہ اپنے سبق کے ختم پر، تیسری منزل پر واقع اپنی درس گاہ سے نیچے اترنے کے لیے زینے پر قدم رکھنے سے قبل، مجھے بلاتے اور دس یا پندرہ روپے عنایت فرماتے۔ چوں کہ جب بھی وہ یہ رقم ہدیہ فرماتے تو اِسی جگہ فرماتے تھے؛ اِس لیے مجھے اِس جگہ سے ایک طرح کی انسیّت سی ہوگئی تھی، مُتَنَبِّی نے سچ کہا ہے:

وَكُلُّ امْرِئٍ يُولِي الْجَمِيلَ مُحَبَّبٌ
وَكُلُّ مَكَانٍ يُنْبِتُ الْعِزَّ طَيِّبٌ

ہر اِحسان کنندہ انسان، انتہائی محبوب ہوتا ہے اور عزت دہندہ ہر جگہ خوش گوار اور مسرت انگیز ہوتی ہے۔ یہاں پہلے مصرع کے حوالے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُس کا مضمون ہر ایک کے لیے عیاں ہے؛ لیکن دوسرے مصرع کو ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ پڑھ دیا جائے، تو وہ تمام تر میرے مطلب کا ہو جائے گا:

وَكُلُّ مَكَانٍ يُنْبِتُ النَّقْدَ طَيِّبٌ

یعنی ہر وہ جگہ جہاں رقم یا روپے پیسہ ملا کرتا ہے وہ جائے خوشی ہوتی ہے۔

علمی ہدیے اور تاریخی یادیں

حضرت کی اُس زمانے میں ایک سے زائد تصنیفات شائع ہوئیں۔ ''حضرت

عثمانِ ذی النورین کے شواہدِ تقدس'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی، تو بانس کے کاغذ میں پیک کر کے با قاعدہ میرا نام لکھ کے ہدیہ کیا، جیسے میں بھی کوئی اہلِ علم واہلِ قلم ہوں۔ اُن کے الطاف کے سامنے مجھے بہت شرمندگی ہوتی تھی؛ لیکن اُن کا رُعب نہ صرف میری عقل وخرد پر؛ بل کہ میری زبان پر بھی ایسا مُسلّط رہتا تھا کہ میں تایید یا تردید میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ پاتا تھا۔ یہ کتاب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۹ء- ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) کی مشہور کتاب ''خلافت وملوکیت'' کے اُس حصّے کو جواب میں لکھی گئی تھی، جس میں اُنھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ پر نازیبا اعتراضات کیے ہیں، جن کے جواب میں علمائے دیوبند میں سے مُتعَدّد اہلِ علم وقلم نے مُحقِّقانہ کتابیں لکھیں۔ حضرت الاستاذ کی یہ کتب جب منظرِ عام پر آئی، تو مولانا مودودیؒ کے مُعتَقِدین میں سے کئی اہلِ قلم نے اِس کے ردّ میں تیز وتند لہجے والی کتابیں تصنیف کیں، جن میں انتہائی سخت کتاب مولانا مودودیؒ کے ایک پُرجوش دیوبندی اہلِ قلم وشاعر وصحافی مولانا عامر عثمانیؒ (پ: ۱۵/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء، متوفی شب ۳۰/ربیع الاول- یکم ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ=۱۲-۱۳/اپریل ۱۹۷۵ء) کی تھی، جس میں دُریدہ دہنی کی حد کردی گئی تھی۔ مجھے یاد ہے، اُن کے یہ مضامین جو پہلے اُن کے ماہ نامہ ''تجلّی'' میں چھپے اور پھر کتابی شکل میں شائع ہوے، جب حضرت الاستاذ کے مُطالعے میں آئے، تو آپ کو سخت قلبی اذیت ہوئی؛ کیوں کہ مولانا عامر عثمانی کا سوقیانہ اور تمسخر کا انداز دل کو چھلنی کرنے والا تھا۔ مولانا عثمانیؒ چوں کہ مزاحیہ نگار بھی تھے اور اُنھیں کسی بڑے سے بڑے اہلِ فضل کے خلاف انتہائی نُکیلے الفاظ کے استعمال میں کوئی باک نہ ہوتا تھا؛ اِس لیے یہی اندازِ تحریر اُنھوں نے حضرت الاستاذ کے خلاف بھی استعمال کیا تھا۔ آج دونوں حضرات اِس دنیا میں نہیں؛ لیکن حضرت مولانا سیّد محمد میاں کا ذکرِ حسن بہت بڑے دینی وعلمی حلقے کی زبان پر رہا کرتا ہے اور اِن شاء اللہ رہے گا؛ جب کہ مولانا عامر عثمانیؒ کا نام، اُن کی تحریروں کی تمام تر چاشنی اور شاعری کے سارے نرالے پن کے باوجود، شاید وباید ہی کوئی لیتا ہوگا۔

یہ صورتِ حال باعثِ عبرت بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

اِسی کے کچھ عرصے بعد حضرت الاستاذ کی ''سیرتِ مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ'' شائع ہوئی، تو حضرت نے اسی اہتمام سے ناچیز کو ہدیہ کیا اور فرمایا کہ مطالعے کے بعد اگر طباعت وغیرہ کی غلطیاں نظر آئیں، تو ضرور بتایئے گا؛ تاکہ آیندہ اِشاعت کے وقت اُن کی تصحیح ہوجائے۔

دہلی کی دل بَری و دل ستانی

کئی بار حضرتؒ کے ساتھ اُن کی مسجد ''مسجدِ نواب قاسم جان'' (جو ''اِحاطہ کالے صاحب'' کے باہر گلی قاسم جان کی سڑک پر واقع ہے) یا اُن کے مکان واقع اندرون ''اِحاطہ کالے صاحب'' جانے کا موقع ملا۔ عموماً وہ کسی تحریر کو اُس وقت صاف کرنے کی خدمت میرے سپرد کرتے، جب اُن کے اِس کام کے لیے مخصوص تبییض کنندہ بڑے میاں موجود نہ ہوتے یا دگر تبییضی کاموں میں لگے ہوتے۔ حدیث شریف کی موٹی موٹی کتابیں صرف تعلیمی گھنٹوں کے محدود دورانیے میں عموماً ختم نہیں ہو پاتیں؛ اِس لیے اِن کتابوں کے مدرسین بالخصوص صحاحِ ثلاثہ: صحیح بخاری شریف، صحیح مسلم شریف، اور جامع ترمذی شریف کے اساتذہ اِنھیں فرصت کے دگر اوقات میں پڑھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔
ہم لوگ بھی صحیح بخاری اور جامع ترمذی پڑھنے کے لیے، جمعہ کے دن علی الصباح اور دگر ایام میں مغرب سے ذرا پہلے ''مسجد نواب قاسم جان'' قاسم جان اسٹریٹ، بلّی ماران آتے اور مذکورہ کتابوں کے اسباق حضرت الاستاذؒ سے پڑھتے۔ ایک بزرگ تاجر مسجد کے پڑوس کے حضرتؒ کے بے حد معتقد تھے، اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے، وہ ہم سارے طلبہ کو کبھی لسّی اور کبھی پھلوں کا رس پلاتے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ دہلی کا گلی کوچہ ویسے بھی ہر مسلمان کو محبوب ہے؛ کیوں کہ بہ قول علامہ حالی (مولانا الطاف حسین انصاری شمس العلما ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء-۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۵ء):

چپے چپے پہ ہے یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اور بہ قول شاعرِ اسلام علامہ محمد اقبال (ڈاکٹر سر محمد اِقبال ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء-۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء):

سرزمیں دِلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے
ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اِس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیوں کر زمیں
خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اِس خاک میں خیرالامم کے تاج دار
نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل؛ مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

دہلی.. آئی جب اُس کی یاد تو آتی چلی گئی

یہاں کے گلی کوچوں میں چلیے تو ایسا لگتا ہے، جیسے روحانیت اور ایک خاص قسم کی دینی کیفیّت نہ صرف مصافحہ ومعانقہ؛ بل کہ ہر سانس کے ساتھ روح کی گہرائیوں میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس کی لذّت کا جس ہمہ گیر طور پر ایک باشعور مسلمان کو اِدراک ہوتا ہے، اُس کو وہ زبان وبیان کی ساری صلاحیتوں کے باوجود، صحیح طور پر بیان نہیں کرسکتا۔ ذرّے ذرّے میں دینی کیف اور اَن گنت خاصانِ خدا وشب زندہ دار علما وصلحا اور ہر فن کے باکمال اِنسانوں کی آہِ سحرگاہی کے اثرات اور اُن کی بوسیدہ ہڈیوں کے سفوف کی جاں فزا وکیف آور ویقین افروز خوشبوئیں مشامِ جاں کو مُعطّر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری (رگھوپتی سہائے ۱۸۹۶ء-۱۹۸۲ء)

نے سچ کہا تھا:

دل جلے روئے ہیں شاید اس جگہ، اے کوئے یار!
خاک کا اتنا چمک جانا ، ذرا دشوار تھا

لیکن بلّی ماران کا یہ بڑا علاقہ اور گلی قاسم جان کا نسبتاً چھوٹا خطّہ، جہاں ۱۹۷۰-۱۹۷۱ء میں ان گنت بار آنا جانا ہوا، اِتنا پیارا اور بھلا معلوم ہونے لگا تھا کہ جب اگست ۱۹۸۲ء / شوال ۱۴۰۲ھ میں مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں، بہ حیثیت استاذ و مدیر ''الداعی'' عربی تقرر ہوا اور اللہ پاک کی تقدیر سے اِنھی گلی کوچوں میں (جمعیت بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دہلی میں) قیام کے لیے ''الداعی'' کے کاموں سے لاتعداد مرتبہ دہلی آنے جانے کے موقع سے، آنے جانے کا موقع ملا، تو وہ خوب صورت دن یاد آئے، جب حضرت الاستاذؒ کی حیات میں، اُن سے استفادے کے لیے، بار بار یہاں آتا تھا، شروع شروع میں کئی بار خوشی کے اِحساس سے آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ ''مسجد نواب قاسم جان'' میں بھی ''جمعیۃ بلڈنگ'' میں واقع دفتر ''الکفاح'' (۱) پندرہ روزہ عربی کے دفتر میں قیام کے دوران کئی مرتبہ جمعہ کی نمازیں اور بہت سی مرتبہ پنج وقتہ نمازیں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، کئی سال تک مسجد ہو بہ ہو وہی تھی، جو حضرت الاستاذؒ کے زمانے میں تھی، اُس میں کسی طرح کی ترمیم نہیں ہوئی تھی، اِسی مسجد کے ایک کمرے میں حضرت الاستاذ کا ذاتی تجارتی کتب خانہ ''کتابستان'' تھا؛ لیکن ۱۹۹۰ء اور ۲۰۰۰ء کے عرصے میں یہ مسجد شہید ہوکر دوبارہ بہت خوب صورت، کئی منزلہ آر سیسی کی انتہائی مضبوط بن گئی ہے۔

---

(۱) ''الکفاح''، ''جمعیۃ علماے ہند'' کا پندرہ روزہ عربی ترجمان تھا، جو ۱۹۷۲ء (۱۳۹۲ھ) سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ یکم دسمبر ۱۹۸۷ء (۸/ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ) کا شمارہ شائع ہونے کے ساتھ ہی بند ہوگیا۔ اس کے بانی اور چیف ایڈیٹر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) تھے اور نائب ایڈیٹر حضرت کے شاگرد مولانا مزمل الحق قاسمی میرٹھی ثم الدہلوی، ٹیچر سینئر سکنڈری اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی تھے۔

جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان کا ذکر قلم کی زبان پر آ ہی گیا ہے، تو یہ بھی کیوں نہ ذکر کر دیا جائے کہ اِسی جمعیۃ بلڈنگ میں اُس زمانے میں پابندی سے شائع ہونے والے جمعیۃ کے اردو ترجمان روزنامہ ''الجمعیۃ'' کا دفتر بھی تھا اور اُس وقت ۱۹۷۱ء-۱۹۷۲ء میں، اُس کے ایڈیٹر مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء - ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) تھے، جن سے بہتر اِداریے اور تبصرے کوئی اردو صحافی نہیں لکھ پاتا تھا، اِسی جمعیۃ بلڈنگ میں ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' کا دفتر بھی تھا، اِس ہفت روزہ کے ایڈیٹر اُس وقت مولانا وحیدالدین خاں تھے، جن کی رہائش بھی اِسی بلڈنگ میں تھی۔ اِسی ''جمعیۃ بلڈنگ'' میں ''جمعیۃ علما'' کا مشہور فقہی و تحقیقی ادارہ ''إدارة المباحث الفقهية'' تھا، جس کے حضرت الاستاذ ہی مُحرِّک اور مُؤسِّس تھے۔ یادش بہ خیر کہ اِسی اِدارہ مباحث فقہیہ کے دفتر میں، ۱۹۷۱ء (۱۳۹۱ھ) کی کسی تاریخ کو ملتِ اسلامیۂ ہندیہ کے بے باک قائد، دور بیں عالم اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس کے مُحرِّک و اولین جنرل سکریٹری امیرِ شریعت سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء - ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء) حضرت الاستاذ کے مہمان کی حیثیت سے قیام پذیر ہوئے اور اِس راقم کی خوش قسمتی کہ حضرت الاستاذ کے حکم سے یہی اُنھیں پرانی دہلی کے اسٹیشن سے اپنے ساتھ لاکر یہاں رکایا اور جب تک وہ دہلی رہے اُن کی خدمت کی۔

دہلی سے دوری کی ناگزیر وجہ

مدرسہ امینیہ میں شوال ۱۳۹۰ھ سے شعبان ۱۳۹۱ھ تک کا تعلیمی سال اِس طرح گزر گیا کہ کچھ زیادہ اِحساس نہ ہوا، شعبان کے بعد رمضان آیا، میں نے رمضان کے ابتدائی ایّام مدرسہ امینیہ ہی میں گزارے۔ ایک روز صبح کو ۸-۹ بجے کے قریب مسجد کے حوض پر، جو مدرسے کے صدر دروازے کے مدخل پر مسجد کے صحن کے کنارے شمالاً

وجنوباً لمبائی اور شرقاً وغرباً چوڑائی میں واقع ہے، وضو کررہا تھا کہ روز کی طرح رمضان کے آج کے مبارک دن کی ابتدا بھی تلاوتِ قرآنِ پاک سے کروں کہ اچانک صدر گیٹ سے حضرت الاستاذ کو اپنی چھڑی ٹیکتے مدرسے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا؛ کیوں کہ میں مشرق کی طرف ہی رخ کر کے بیٹھا ہوا تھا، جدھر مدرسے کا صدر دروازہ ہے۔ میں نے وضو کو ناتمام چھوڑ آگے بڑھ کر حضرت کو سلام کیا اور ان کے دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات کے بوجھ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، تو حضرت نے منع فرمادیا۔ خبر خیریت دریافت فرماتے ہوئے استفسار فرمایا کہ آپ رمضان میں یہیں رہیں گے یا کہیں جانے کا اِرادہ ہے؟ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو یہیں رکوں گا؛ کیوں کہ میں نے سنا ہے کہ حال ہی میں مدینۂ منورہ میں کوئی جامعہ ''جامعہ اسلامیہ'' کے نام سے قائم ہوئی ہے(۱)۔ مجھے وہاں داخلہ لینے اور تعلیم حاصل کرنے کی بڑی خواہش ہے۔ اِس سلسلے میں حضرت کی خصوصی دعا اور مدد کا طلب گار ہوں۔ یہ سن کر حضرت حوض کے چبوترے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: یہ آپ نے بہت مشکل معاملہ میرے سامنے رکھ دیا ہے۔ بیرونِ ملک مجھے کوئی جانتا نہیں، سعودی عرب کے کسی عالم سے میرے تعلقات نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہاں داخلے کا طریقۂ کار کیا ہے؟ پھر معاً فرمایا: ہاں ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء-۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۴ء) سے اِس سلسلے میں معلوم کیا جائے۔ اُن کے تعلقات عُلما اور مشاہیرِ وقت سے میری بہ نسبت زیادہ ہیں۔ وہ شاید اِس سلسلے میں دست گیری اور راہ نمائی کریں۔ ایسا ہے کہ کل فجر کی نماز آپ میرے ساتھ ''مسجد نواب قاسم جان'' میں پڑھیں۔ میں آپ کو حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کے ہاں لے چلوں گا اور اِس مسئلے میں اُن سے مدد کی درخواست کروں گا۔

(۱) یہ جامعہ، مدینۂ منورہ میں بہ روز منگل ۱۳۸۱/۳/۲۵ھ مطابق ۱۹۶۱/۸/۸ء کو قائم ہوئی تھی۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے اُن کے دفتر میں ملاقات

راقم نے حضرت کے حکم کے مطابق، فجر کی نماز مسجد نواب قاسم جان، گلی قاسم جان میں ادا کی، دعا کے بعد حضرت سے ملا، حضرت نے فرمایا کہ ابھی تو بہت سویرا ہے، میں تلاوت کے معمول سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد چلتے ہیں۔ حضرت اپنی چھڑی ٹیکتے ہوے آگے آگے اور میں پیچھے پیچھے چلتا رہا، چاوڑی بازار کے راستے ہم جامع مسجد اردو بازار میں "ندوۃ المصنّفین" کے دفتر پہنچے، اندر داخل ہوے، بھاری بھرکم سی دو منزلہ چوڑی چوڑی دیواروں والی دو منزلہ عمارت۔ ہم کشادہ گیلری میں جو خوب صورت خوب صورت گول گول پُرشکوہ کھمبوں پر قائم تھی، لکڑیوں کے پُرانے طرز کی شان دار کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہاں موجود خادم سے حضرت نے فرمایا کہ مفتی صاحب ہیں کہ نہیں؟ اُس نے کہا: ہیں؛ لیکن اِس وقت گھر ہوں گے، میں خبر کیے دیتا ہوں کہ مہمان آئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ کہنا کہ مدرسہ امینیہ سے محمد میاں آیا ہے۔ چند منٹ بعد مفتی صاحب تشریف لے آئے، علیک سلیک کے بعد، مفتی صاحب نے حضرت سے تشریف لانے کی وجہ معلوم کی۔ حضرت نے فرمایا: یہ مولوی نور عالم ہیں، ذی استعداد ہیں، عربی زبان سے خاصا شغف ہے، یہ کہتے ہیں کہ مدینۂ منورہ میں کوئی جامعہ اِسلامیہ قائم ہوئی ہے اور وہاں دوسرے ملکوں کے طلبہ بھی لے لیے جاتے ہیں۔ یہ بھی وہاں داخلے کی خواہش رکھتے ہیں۔ مجھے تو یہ نہیں معلوم کی وہاں داخلے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اِنھوں نے کل مجھ سے اپنی خواہش کا اِظہار کیا، تو میں نے اِن سے کہا کہ مفتی صاحب ہی کو اِس سلسلے میں کچھ معلوم ہوسکتا ہے؛ لہٰذا اُن سے مل کے کوئی صورت نکل سکتی ہے؛ میں صبح سویرے اِس لیے آگیا کہ آپ کہیں نکل نہ جائیں۔

مفتی صاحب نے فرمایا: میری معلومات کے مطابق یہاں ہندوستان سے حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی اور پاکستان سے مولانا سید ابوالاعلی مودودی کو اُس کی

مجلسِ شوریٰ یا مجلسِ منتظمہ میں لیا گیا ہے، میرا اندازہ ہے کہ اگر مولانا ندوی نے سفارش لکھ دی، تو اِن کا داخلہ بالضرور وہاں ہو جائے گا، میں اُنھیں خط لکھے دیتا ہوں، یہ اپنی درخواست کے ساتھ اِس کو اُن کے پاس رجسٹری بھیج دیں۔ اِن شاء اللہ وہ ضرور سفارش لکھ دیں گے۔ حضرت نے فرمایا: آپ تو خط تحریر فرما ہی دیں، میں بھی اُنھیں لکھوں گا؛ تاکہ مزید تاکید ہو جائے۔ ایک اچھی تقریب یہ بھی بن گئی ہے کہ ابھی چند روز قبل مولانا نے اپنی کتاب ''مختارات'' کی جلدیں میرے پاس رائے جاننے کے لیے بھیجی ہیں۔ میں کتاب پر اپنی رائے کے ساتھ ساتھ؛ اِن کے لیے سفارش کی درخواست بھی کر دوں گا۔

اُسی چاوڑی بازار، جو جامع مسجد کے جانبِ غرب میں واقع ہے، کے راستے سے ہم لوگ گلی قاسم جان کے لیے روانہ ہوے۔ حضرت نے راستے میں اِس ناچیز سے کہا: آپ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کی درخواست عربی میں تیار کرلیں اور اپنے خطِّ نسخ میں، جسے آپ خوب صورت لکھتے ہیں، اُس کو خوش خط لکھ لیں۔ میں آج ہی مولانا ندوی کے نام خط لکھ رکھتا ہوں، اِن شاء اللہ کل ہم رجسٹری بھیج دیں گے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے، درخواست

اردو بازار جامع مسجد میں اُن دنوں خوش نویسی کے لوازمات کی ایک دُکان تھی۔ راقم نے چند ہی روز قبل اُس دکان سے جرمنی کا بنا ہوا قلم کا ایک پرس نما بکس خریدا تھا، جس میں خطِّ نستعلیق وخطِّ نسخ وخطِّ رقعہ لکھنے کے لیے، کئی طرح کے موٹے اور باریک قلم اور لکیر کھینچنے کے بھی دو تین قلم تھے۔ میں اُنھیں لے کر بیٹھ گیا۔ میرے پاس بہت اچھا سفید قدرے دبیز کاغذ تھا، ''سن لائٹ'' میں نے اُس میں سے فلس کیپ (Foolscap) سائز کے دو تین صفحات علاحدہ کیے۔ پہلے فاؤنٹین پن (Fountain pen) سے ایک صفحے پر عربی میں درخواست لکھی، پھر اُنھی مذکورہ قلموں سے دوسرے صفحے پر خطِّ نسخ میں، جیسے

full scape

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) نے ٹائپ رائٹر (Type writer) کی تحریر کی طرح کٹے کٹے انداز میں لکھنا سکھایا تھا، اُسے بڑے اہتمام سے خوش خط لکھا اور دوسرے دن ۸-۹ بجے صبح کو مدرسہ امینیہ میں حضرت کی آمد کے وقت، اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت کا معمول تھا کہ وہ رمضان المبارک میں بھی پابندی سے ۸-۹ بجے مدرسے آتے اور ۱۲ بجے کے قریب تشریف لے جاتے؛ کیوں کہ وہ شیخ الحدیث وصدر مدرس کے ساتھ ساتھ، صدر مفتی بھی تھے اور رمضان المبارک میں بھی لوگ کثرت سے فتویٰ لینے آیا کرتے تھے؛ اِس لیے کہ مفتیِ اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہؒ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء - ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء) کی ذاتِ گرامی کی وجہ سے فقہ وفتویٰ کے حوالے سے، مدرسہ امینیہ کو جو شہرت ملی تھی، وہ ہنوز قائم تھی۔ دہلی کا کوئی اور مدرسہ اِس حوالے سے مدرسہ امینیہ کا ہم سر نہ تھا۔

حضرت کچھ دیر تک تحریر کو دیکھتے رہے۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ شاید حضرت کو حسنِ تحریر پسند آیا ہے؛ اِسی لیے اسے بار بار اُلٹ پلٹ کے دیکھ رہے ہیں؛ لیکن زبان سے میرے سامنے پسندیدگی کی غمازی کرنے والا کوئی لفظ نہیں کہا۔ دوسرے روز صبح کو اِرشاد فرمایا کہ میں نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کو لکھا ہے کہ ہم رشتہ درخواست کی عربی زبان اور اُس کی کتابت دونوں ہی درخواست دہندہ کی ہیں، اگر اِن سے اُس کی کسی صلاحیت کا اندازہ ہو، تو آں محترم اُس کے لیے ضرور سفارش تحریر فرمادیں، بہ صورتِ دگر میں آپ کو مجبور نہیں کرسکتا۔ اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ حضرت کو نہ صرف میری خوش خطی؛ بل کہ درخواست کی عربی زبان بھی، اِس حد تک پسند آئی کہ آپ نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو پر اعتماد لہجے میں سفارش تحریر فرمادینے کی بات کہی، گویا آپ کو یقین تھا کہ عربی زبان کے مولانا علی میاں جیسے رمز آشنا فاضلِ بے بدل، ایک نو عمر طالبِ علم کی اِس تحریر کے ''ظاہر'' و ''باطن'' سے اِتنا مُتأثر تو ضرور ہوں گے کہ وہ ایسی سفارش لکھ دیں گے کہ جامعہ اِسلامیہ مدینہ منورہ میں اُس کا داخلہ یقینی ہوجائے گا۔

درخواست پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی تصدیق

یہ درخواست اور ہم رشتہ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، حضرت الاُستاذؒ، نیز حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ (۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء - ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء) مہتمم مدرسہ امینیہ کے خطوط اواخرِ رمضان میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجے گئے، جو یقیناً حضرت مولاناؒ کو شوال میں موصول ہوے ہوں گے۔ رمضان کے معمولات کی وجہ سے، شوال میں بھی علمی وتالیفی کاموں کی بھیڑ رہی ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ ضروری اَسفار بھی رہے ہوں، جو وہ کثرت سے کیا کرتے تھے؛ اِس لیے میری درخواست پر اُن کی سفارش اور حضرت الاستاذؒ کے نام اُن کا مکتوب گرامی، حضرت الاستاذؒ کو ذی قعدہ کے اواخر میں ملا۔ یہ ناچیز اُن دنوں دیوبند گیا ہوا تھا، جہاں عیدالاضحیٰ کے ایّام اپنے ہم درسوں اور ہم قریہ دوستوں کے ساتھ گزرے۔ یہاں ایک ماہ کے قریب قیام رہا۔ میں احتیاطاً حضرت کو دو ایک لفافے دے آیا تھا، جن پر دیوبند کا میرا پتہ درج تھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا اگر اِس اثنا میں جواب آئے اور حضرت مجھے اُس سے بروقت مطلع کرنا ضروری سمجھیں، تو مطلع فرمادیں۔

عیدالاضحیٰ ۱۳۹۱ھ کے نصف اور فروری ۱۹۷۲ء کے اوائل کی کسی تاریخ کو میں اپنے دیرینہ حجرے ۳۰/۳ دارجدید (جو مدنی گیٹ اور باب الظاہر سے آتی ہوئی دارجدید کے کمروں کی دونوں لائنوں کے سنگم پر دوسری منزل پر واقع تھا اور اُس کے سامنے نسبتاً کم اونچا ایک کمرہ بنا ہوا تھا، جس کی چھت اُس کمرے ۳۰/۳ کے لیے صحن کا کام دیتی تھی) کے صحن میں بیٹھا غسلِ آفتابی کررہا تھا؛ کیوں کہ یہ جاڑے کے دن تھے، کہ ۱۱ بجے کے قریب ''پیارے'' ڈاکیہ نے ''نورعالم مظفرپوری'' کہہ کر صحن میں میرے نام کا لفافہ اُچھال دیا۔ لفافے کی پشت پر جیسے ہی میں نے محمد میاں، کتابستان، گلی قاسم جان، دہلی ٦ لکھا ہوا دیکھا کہ میں سمجھ گیا کہ حضرت الاستاذؒ نے، حضرت مولانا علی میاںؒ کے جواب کے تعلق

سے کوئی بات لکھی ہوگی۔ میں نے جلدی میں لفافے کو چاک کیا، تو حضرتؒ کی اِس مضمون کی تحریر میرے سامنے تھی:

عزیز محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ عزیز؟۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے آپ کی درخواست پر بہت اچھی سفارش لکھی دی ہے، ساتھ ہی اُنھوں نے میرے نام اپنے مکتوبِ گرامی میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کی تحریر کی زبان اور حسنِ خط سے بہت متأثّر ہوئے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ میں عرصے سے ندوۃ العلما کا ناظم ہوں، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کسی نوعمر طالب علم کا اِتنا پاکیزہ خط میری نظر سے گزرا ہو۔ درسِ نظامی میں میرے علم کے مطابق عموماً عربی تحریر وانشا کی مشق کماحقہٗ نہیں کرائی جاتی؛ لیکن اِس طالب علم کی عربی درخواست میں، جو اُس نے آں محترم کی تحریر کے مطابق، خود تیار کی ہے، زبان اور صرف ونحو کے حوالے سے کسی طرح کی فروگزاشت نہ ہونا، خوش آیند بات ہے۔ توقّع ہے کہ جامعہ اِسلامیہ، مدینۂ منورہ میں اُنھیں قبول کرلیا جائے گا۔ اِس کارروائی میں عموماً خاصا وقت لگ جاتا ہے اور گنجایش نہ ہونے کی صورت میں جامعہ کی انتظامیہ امیدوار طالبِ علم کے داخلے کو آیندہ تعلیمی سال کے لیے معلّق کردیتی ہے۔ ہندوستان میں، میں بھی عربی زبان کا طالب علم ہوں، آپ کے تلمیذِ رشید اگر مجھ سے یہاں لکھنؤ یا رائے بریلی میں ملیں، تو مجھے خوشی ہوگی۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب کے اِس انتہائی حوصلہ افزا خط کے بعد، اب آپ کا کام اِس وقت یہ ہے کہ آپ بہ عجلت تمام دہلی آجائیں اور مولانا سے ملنے کے لیے لکھنؤ چلے جائیں۔ کرایے کے لیے روپے شاید آپ کے پاس نہیں ہوں گے، تو وہ میں دوں گا۔

دعا گو ودعا جو

محمد میاں

حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں

دو تین دن کے اندر میں دہلی آیا، حضرتؒ سے ملا اور لکھنؤ کے سفر کی ترتیب قائم کی۔ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کے اواخر اور فروری ۱۹۹۲ء کے اواسط میں، میں دہلی لکھنؤ میل سے، نئی دہلی سے لکھنؤ کے لیے ۹-۱۰ بجے رات میں روانہ ہوا۔ صبح کو ۷-۸ بجے لکھنؤ ''چار باغ اسٹیشن'' اور وہاں سے گومتی ندی کے ساحل پر، ٹیگور مارگ پر واقع دار العلوم ندوۃ العلما پہنچا، دہلی کے ایک طالبِ علم (جو دار العلوم ندوۃ العلما میں زیرِ تعلیم تھے) جس کا حضرت نے ہی نام و پتا دیا تھا، سے ملا، خیر خیرت معلوم کرنے کے بعد وہ مجھے لے کر مہمان خانہ آئے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب ابھی صبح کو یہیں تھے؛ لہٰذا اُن سے بروقت ملاقات ہو جائے گی؛ لیکن وہاں موجود ایک صاحب نے بتایا کہ حضرت مولانا ابھی چند منٹ پہلے رائے بریلی روانہ ہو گئے ہیں۔ آپ فوراً اسٹیشن ''چار باغ'' چلے جائیے، آپ کو فلاں گاڑی مل جائے گی اور آپ ظہر کے وقت تک مولانا کے گاؤں ''تکیہ کلاں'' رائے بریلی پہنچ جائیں گے۔

الغرض میں اسٹیشن آیا، رائے بریلی کا ٹکٹ لیا، گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ چل پڑی رائے بریلی اسٹیشن پر اُتر کر میں نے رکشا لیا اور مولانا کے گاؤں ''تکیہ کلاں'' پہنچا۔ مہمان خانے میں اپنا سامان رکھا، وہاں موجود ایک صاحب سے میں نے کہا کہ مجھے حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ملنا ہے۔ اُنھوں نے کہا: وہ بھی ابھی ابھی لکھنؤ سے آئے ہیں، چوں کہ ظہر کی اذان ہو چکی ہے؛ اِس لیے وہ مسجد تشریف لے گئے ہیں، آپ بھی مسجد ہی چلے جائیے، وضو وغیرہ کا وہیں نظم ہے، وہیں حضرت مولانا سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ میں مسجد آیا، تو حضرت مولانا سنّت پڑھ رہے تھے۔ اُن کے خادم عبد الرزاق صاحب (اور اب الحاج عبد الرزاق صاحب) نے مجھے اجنبی جان کر فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے اپنا نام بتایا اور یہ کہ میں دہلی سے آیا ہوں، حضرت مولانا سید محمد میاں دہلوی کا شاگرد ہوں، اُنھوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کی فرمائش

کے مطابق مجھے اُن سے ملنے کے لیے بھیجا ہے۔ میں وضو کر کے آیا، تو حضرت مولانا سنّت سے فارغ ہو چکے تھے اور بھائی عبدالرزاق میری بابت اُنھیں بتا چکے تھے۔ میں نے حضرت کو سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو اُنھوں نے فرمایا کہ آپ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کے صرف شاگرد ہیں یا عزیز قریب؟ میں نے عرض کیا: صرف ایک ادنیٰ شاگرد۔ حضرت نے فرمایا اِس زمانے میں کوئی استاد اپنے شاگرد سے شاید و باید ہی اتنی محبت کرتا ہوگا، جتنی مولانا آپ سے کرتے ہیں۔ اِس سال مختلف تقریبوں سے اُن کے میرے پاس جتنے خطوط آئے، ہر ایک میں اُنھوں نے آپ کا ذکرِ خیر ضرور کیا اور یہ کہ آپ کو عربی زبان سے بہت تعلق ہے۔

دنیا میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی کے تعلّق سے کرتے کم ہیں اور کہتے زیادہ ہیں؛ بل کہ بعض لوگ تو ایسے ستم ظریف بھی ہوتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں کرتے؛ لیکن جَتاتے بہت ہیں۔ اور اگر تھوڑا بہت بھولے بھٹکے میں واقعی کچھ کر دیں، تب تو اِتنا اِحسان دھرتے ہیں کہ وہ بیچارہ شرم سے گٹھری ہو جاتا ہے۔ حضرت الأستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی شرافت ورحم دلی اور بے کسوں کی تاحدِّ اِمکان دست گیری کی صفات کا مجھے اُن کی یک سالہ صحبت میں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا؛ لیکن مجھے یہ قطعاً اندازہ نہ تھا کہ وہ مجھے اپنے لختِ جگر کی طرح سمجھتے اور میری ذات کی تعمیر اور مستقبل کو سنوارنے کے لیے، اُسی طرح کوشاں رہتے ہیں جیسے کوئی دردمند باپ اپنے سپوت اور اِنتہائی فرماں بردار بیٹے کے لیے ہی ہوا کرتا ہے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ جس وقت مذکورہ بالا اَلفاظ اِرشاد فرما رہے تھے، حضرت الاستاذؒ کے تئیں شکر وسپاس کے بے طرح جذبات سے میرا سینا اِس طرح لبریز ہو رہا تھا کہ لگتا تھا کہ وہ شق ہو جائے گا۔

تکیے کا قیام

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا معمول تھا کہ دوپہر کا کھانا وہ مہمانوں اور اپنے

خدام واَعِزّہ کے ساتھ، اپنے مہمان خانے میں ظہر کی نماز کے بعد تناول فرماتے تھے، چناں چہ دستر خوان بچھا اور حضرت کے ساتھ سارے حاضرین کھانے پر بیٹھ گئے، حضرت نے مجھے اپنے سامنے بٹھایا، کھانے کے دوران میرا اور حضرت الأستاذ کا اَحوال معلوم کرتے رہے۔ کھانے کے بعد قیلولے کے لیے گھر جانے سے قبل، مہمان خانے کی اَلماریوں میں سے ایک اَلماری سے مشہور اہلِ قلم وادیب ومؤرخ ڈاکٹر احمد اَمین مصریؒ (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء-۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء) کی خودنوشت سوانحِ عمری ''حَیاتِي'' نکال کر مجھے دی اور فرمایا کہ آپ یہ کتاب پڑھیے، آپ کا جی بھی لگے گا اور بہت فائدہ ہوگا۔ دوسرے روز صبح ناشتے پر حضرت نے فرمایا: آپ نے یہ کتاب کتنی سمجھی؟ میں نے عرض کیا: ۶۵-۷۰ فی صد سمجھ میں آتی ہے اور ۳۰-۳۵ فی صد الفاظ وتعبیرات میرے لیے یکسر نامعلوم ونامانوس ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ آپ کی بہت بڑی کام یابی ہے؛ کیوں کہ آپ جس نصابِ تعلیم کے فارغ ہیں، عموماً وہاں آج کی عربی نثر ونظم کا چلن نہیں ہے؛ اِس لیے آپ کا اِتنا سمجھ لینا، آپ کی ذاتی محنت اور عربی سے تعلق کی دلیل ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ آپ دہلی میں اِس وقت کیا کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: بس یوں ہی آزاد مطالعہ کرنے کے لیے، ٹھکانے کے طور پر فراش خانہ دہلی ۶ کے ''کٹرہ ہِنّچی'' کی ایک مسجد میں امام کے طور پر ذمے داری لے رکھی ہے۔ حضرت نے فرمایا: آپ چاہیں تو میرے ساتھ رہیے۔ میں رائے بریلی رہوں تو یہیں رہیے، لکھنؤ جاؤں تو وہاں ساتھ رہیے اور اگر اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک میرا طویل سفر ہو، تو آپ دار العلوم ندوۃ العلما میں رہیے، وہاں کتب خانے سے فائدہ اٹھائیے، میں وہاں آپ کے قیام وطعام کا نظم کردوں گا۔ آپ کا خط بہت پاکیزہ ہے، میں بھی آپ سے فائدہ اُٹھاؤں گا، بالخصوص عربی تحریر کے حوالے سے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو صرف تین دنوں کے لیے بہ حیثیت مہمان آیا تھا؛ کیوں کہ حضرت الأستاذؒ کا حکم تھا کہ صرف تین دن رہنا، اِس سے زیادہ قیام کی شکل میں آدمی مہمان نہیں رہتا؛ بل کہ میزبان کا کھانا صدقے کا کھانا ہوجاتا

ہے؛ چناں چہ میں نے کل کا ٹکٹ لے رکھا ہے، آج حضرت کے ہاں قیام کا دوسرا دن ہے، اب آپ کا حکم ہو، تو میں لکھنؤ جا کر خود یا کسی کو بھیج کر ٹکٹ از لکھنؤ تا دہلی واپس کروادوں اور حضرت الأستاذ کو رجسٹری جوابی خط لکھ کے اُن کا عندیہ معلوم کرلوں؟ حضرت نے فرمایا: ہاں آپ حضرت مولانا سے اُن کی رائے معلوم کرلیں، اُن کی اِجازت کے بغیر آپ کا اپنے تئیں کوئی فیصلہ ناروا ہوگا۔ ٹکٹ واپس کرنے کے لیے آپ خود نہ جائیے، ہمارے ہاں سے کوئی نہ کوئی ابھی تھوڑی دیر میں یا شام کو لکھنؤ ضرور جائے گا، میں اُس کے ذریعے مولوی طاہر(۱) کو آپ کا ٹکٹ بھجوادوں گا، وہ واپس کرادیں گے۔

تکیے پر قیام کے لیے حضرت کی منظوری

ہفتہ عشرہ میں حضرت الأستاذ کا جواب آیا کہ آپ حضرت مولانا علی میاں کی فرمایش کی ضرور تعمیل کریں، یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ اُنھوں نے ازخود اپنے پاس رُکنے کا مشورہ دیا، وہاں کے قیام سے آپ کی علمی صلاحیت پختہ ہوگی۔ البتہ روز مرّہ کے مصارف کے لیے آپ کو پریشانی ہوسکتی ہے، اِن شاء اللہ میں وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱) مولانا طاہر حسینی مظاہری بن سید محمد یوسف حسینی منصور پوری مظفر نگری ثم اللکھنوی، اصلاً منصور پور ضلع مظفر نگر کے باسی تھے؛ لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحب کی برادر زادی، یعنی مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنیؒ (۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء-۱۳۸۰ھ/۱۹۶۱ء) کی صاحب زادی کے اُن کی زوجیت میں آجانے کے بعد، وہ لکھنؤ کے باسی ہوگئے، پھر ندوۃ العلما کے دفتر نظامت کے ذمّے دار اعلیٰ کی حیثیت سے تاحینِ حیات وصحت ذمے داری ادا کی۔ کبار علماے صالحین کے صحبت وتربیت یافتہ تھے، بڑے نیک، عبادت گزار اور شب بیدار تھے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء-۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) کے نہ صرف دست گرفتہ؛ بل کہ اُن کے خلیفۂ مجاز تھے۔ مشہور عالم دین وداعی الی اللہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی اُنھی کے فرزندِ اکبر ہیں۔ تقریباً ۷۲ سال کی عمر میں بہ روز سموار، بہ وقتِ فجر ۸/ شوال ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۴/دسمبر ۲۰۰۲ء کو "خاتون منزل" گولا گنج لکھنؤ میں وفات پائی اور حضرت مولانا علی میاں کے وطن "تکیہ کلاں" رائے بریلی میں تدفین عمل میں آئی۔

چناں چہ میں حضرت مولانا علی میاں کی خدمت میں رہ گیا۔ اکثر تو تکیہ ہی پر قیام رہا اور بیچ بیچ میں کچھ دنوں کے لیے دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں۔ اُن دنوں حضرت مولانا، عربی خطوط یا عربی مضامین اور کتابیں، عموماً مجھے ہی اِملا کراتے تھے اور عربی تحریر سے مسرت کا اظہار فرماتے تھے۔ دگر کئی طرح کے علمی کاموں میں حضرت مجھ سے خدمت لیتے رہے۔ مجھے اِس قیام سے جو بے پناہ فائدہ ہوا، اُس کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت الاستاذؒ نے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں تکیہ کلاں اور لکھنؤ قیام کے دوران، نہ صرف اپنے مکتوبات کے ذریعے میری راہ نمائی کی، ڈھارس بندھائی اور ہم دردی و غم گساری کی؛ بل کہ دو تین دفعہ مادی مدد بھی کی، جس کی وہاں کے قیام کے دوران سخت ضرورت تھی؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے وطن ''تکیہ کلاں'' میں خورونوش اُن کے ساتھ ہوتا تھا اور لکھنؤ میں قیام کے دوران دار العلوم ندوۃ العلما کے مطبخ سے اُنھی کے حکم سے ناشتہ دان میں صبح و شام کا کھانا آجاتا تھا؛ لیکن دگر ضرورتوں کے لیے مجھے نقد رقم کی سخت ضرورت رہتی تھی، سچ یہ ہے کہ میں نے یہ دن بڑی کس مپرسی کے عالم میں گزارے، حضرت الأستاذ کی دو تین دفعہ کی اِمداد بھی کئی ماہ کے قیام کے دوران ناکافی ہوتی تھی؛ لیکن اللہ اُنھیں اپنی جنت میں بہترین بدلہ دے کہ اُنھوں نے میری دیکھ ریکھ اور خبر گیری میں اپنی حد تک کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لکھنؤ آمد کے دو تین روز بعد ہی میں نے حضرتؒ کو جو خط لکھا، اُس کے جواب میں آپ نے ۱۵ روپے کا منی آرڈر اِرسال فرمایا اور اُس کے کوپن پر تحریر فرمایا کہ:

عزیز محترم! زادتْ مزایاکم وفُزْتُمْ بمقاصدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لفافہ پہنچا، حالات معلوم ہوئے، اللہ تعالیٰ آپ کو اَعلیٰ مقاصد میں کام یابی بخشے۔ مبلغ پندرہ روپیے، ضروریات کے لیے اِرسال ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ آپ کے قیامِ لکھنؤ تک ماہانہ پیش کرتا رہوں۔ دعا فرمائیے۔ حضرت

مولانا (علی میاں) کا خط ساجد سلمہ کو مل گیا تھا، سفیر صاحب سے تو ملاقات نہیں ہوئی، اُن کے سکریٹری نے ایک انگریزی مضمون کا عربی ترجمہ کرایا، تقرر کی اطلاع وہ بہ ذریعہ ڈاک دیں گے، پتہ لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کام یابی بخشے۔ دعا کیجیے(۱)۔ حضرت مولانا کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام پیش کر دیں۔

محمد میاں

۱۵/محرم الحرام ۱۳۹۲ھ = ۴/مارچ ۱۹۷۲ء

مذکورہ بالا مکتوب میں حضرت الاستاذؒ نے، صاحب زادۂ گرامی کے سعودی سفارت خانے میں ملازمت کے لیے ٹیسٹ دینے اور اُنھیں انتخاب میں ترجیح دینے کے لیے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے سفارشی مکتوب کے موصول ہوجانے کی طرف جو اِشارہ فرمایا ہے، تو دوسرے مکتوب میں، جس پر تاریخِ تحریر درج نہیں ہے، اُن کا وہاں تقرر کر لیے جانے اور اُن کے وہاں سرگرم کار ہوجانے کی اِن اَلفاظ میں خوش خبری دی اور حضرت مولانا علی میاںؒ کا اپنی طرف سے شکریہ ادا کرنے کا، اِس ناچیز کو مُکلَّف فرمایا:

عزیز محترم! زادت معالیکم

سلام مسنون۔ عرصے سے خط نہیں آیا، خیریت نہیں معلوم ہوئی۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب زادمجدہم کا گرامی نامہ ہتھورا، باندہ

(۱) سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں ملازمت کے لیے، حضرت الاستاذؒ کے صاحب زادے: محترم مولانا ساجد میاں صاحب درخواست دینی چاہتے تھے، حضرت الاستاذؒ نے یہ سوچ کر کہ صلاحیت کے باوجود بعض دفعہ کسی اہم شخصیت کی سفارش سے نسبتاً کم صلاحیت کے آدمی کو لے لیا جاتا ہے۔ مولانا سید ساجد میاں کا جس جگہ تقرر ہونا تھا اُس کے لیے کئی امیدوار تھے اور گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے حضرات اُن کے سفارشی تھے؛ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے اِس ناچیز کی وساطت سے سفارشی تحریر لینی مناسب سمجھا۔ اِس خط میں اُسی کی طرف اِشارہ ہے۔ الحمد للہ کہ اُن کا اُس جگہ پر تقرر کر لیا گیا۔ وہ اِس تحریر کے بہ روز شنبہ: ۷/رمضان ۱۴۳۰ھ = ۲۹/اگست ۲۰۰۹ء، لکھے جانے کے وقت بھی، سعودی سفارت خانے میں برسرِ عمل ہیں۔ اِس وقت وہ وہاں کے اہم اہل کاروں اور دیرینہ ذمے داروں میں سے ایک ہیں۔

سے آیا تھا، وہ واپس تشریف لے آئے ہوں گے، تو اُن کی خدمت میں سلام عرض کردیجیے۔ ساجد سلمہ کا تقرر فرمالیا گیا ہے، الحمد للہ۔ وہ بھی بھرپور کام کررہا ہے، اگرچہ دن بھر کھانے سے محروم رہتا ہے، صبح ۸ بجے جاتا ہے، کھانا لے جانا خلافِ شان ہے؛ مگر الحمد للہ وہ مطمئن ہے اور کام سے بھی بفضلہٖ تعالیٰ مطمئن ہے۔ پہلے جو صاحب تھے، اُن کا مشاہرہ ۵۰۰ روپے تھا اور اس کا مشاہرہ ۷۰۰ سات سو روپے تحریر فرمایا ہے اور وہ ماہِ محرم کا ۱۲ دن کام کرنے کا ادا بھی کردیا ہے۔ حضرت مولانا کا مزید شکریہ اور درخواست دعا۔ ''مشکاۃ الآثار'' (۱) حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچ چکی ہے؟ اُس کا تذکرہ فرمادیجیے۔

والسلام

نیاز مند محتاجِ دعا

محمد میاں

حضرت کا مکتوب کہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اِس سال راقم کا داخلہ نہیں ہوسکا

اپریل ۱۹۷۲ء کے اواخر میں حضرت الاستاذؒ کا خط ملا، جس سے معلوم ہوا کہ جامعہ اِسلامیہ مدینہ منورہ سے میری درخواست کے حوالے سے یہ اِطّلاع دی گئی ہے کہ اِس سال داخلہ نہ ہوسکے گا، جگہ پُر ہوچکی ہے؛ لیکن آئندہ سال ضرور لے لیا جائے گا؛ لیکن میں اپنی شدید بے مایگی کی وجہ سے، آئندہ سال کے لیے اِنتظار نہیں کرسکتا تھا؛ کیوں کہ میرے گھر پر کوئی میرا سہارا نہ تھا، صرف والدہ محترمہ ــــ اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے ــــ تھیں؛ اِس لیے وہاں داخلہ نہ ہونے کی صورت میں، اب ضروری تھا کہ میں تدریس وغیرہ کی خدمت کے ذریعے، روزی روٹی کی کوئی سبیل پیدا کروں۔ میرے

(۱) یہ حضرت الاستاذؒ کی حدیث کے موضوع پر کتاب ہے، جس میں آپ نے منتخب حدیثیں جمع فرمادی ہیں، جن کی روزمرہ کی ضروریات میں مسلمانوں کو ضرورت ہوتی ہے، بہت سے مدرسوں بالخصوص دارالعلوم دیوبند میں داخلِ نصاب ہے۔

ایسے بے بس و بے کس اِنسان کے لیے زندگی کے اِس مرحلے میں محض صلاحیت کی پختہ کاری ایک بے سود عمل تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے یہ سارا اَحوال تفصیل سے، حضرت الاستاذؒ کو لکھا اور گزارش کی کہ حضرت میرے لیے بہ عجلتِ ممکنہ کوئی راہ پیدا فرمادیں۔ حضرت نے اُس کے جواب میں یہ والا نامہ تحریر فرمایا:

عزیزِ محترم مولانا نورعالم صاحب مظفرپوری زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ عزیز؟

نامۂ عزیز مؤرخہ ۸؍ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ = ۲۲؍مئی ۱۹۷۲ء، کاشفِ حالات ہوا۔ آپ کی پریشانیوں کا علم ہوکر سخت افسوس اور قلق ہوا۔ آپ کو بالواسطہ والدہ محترمہ کے حالات کا علم ہوا۔ کیا آپ نے والدہ محترمہ کو موجودہ پتے کی خبر نہیں دی۔ آپ نے تحقیقِ حال کے لیے، مکان خط لکھا ہوگا۔ خدا کرے خیرت کی اِطّلاع آگئی ہو اور آپ مطمئن ہوں۔

کسی مشغلے کا نہ ہونا واقعی بہت تکلیف دہ اور باعثِ پریشانی ہے، اِس سے اِنسان کی صلاحیتوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی بہتر مشغلہ عنایت فرمادے۔ جہاں تک دہلی یا دیوبند کا تعلق ہے، اگر کوئی صورت نکل سکتی، تو آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں تھی، احقر خود کوشش کرتا؛ مگر اِن دونوں جگہ تو فی الحال کوئی صورت ہے، نہ مستقبل قریب میں کوئی توقع ہے۔

کلکتے کے ایک صاحب ہیں شیخ غلام رسول، بہت دولت مند آدمی ہیں، تبلیغی جماعت کے اہم ترین کارکن؛ بل کہ بنیادی رکن، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ مولانا علی میاں کا تعلق بھی بہت مؤثر ہے۔ اُن کا کلکتے میں ایک مدرسہ ہے، معلوم ہوا ہے کہ اُس مدرسے میں ایک استاد کی ضرورت ہے، احقر نے اُن کو آپ کے متعلق لکھا ہے، عربی کے

سلسلے میں آپ کی خصوصیات بھی تحریر کردی ہیں۔ احقر نے اُن کو لکھا ہے کہ اگر بالفرض کوئی جگہ نہ بھی ہو تب بھی مولوی نور عالم صاحب کے لیے، جو عربیّت سے خاص شغف رکھتے ہیں اور عربیّت میں اُن کو خاصی دسترس ہے، کوئی جگہ پیدا کریں۔ خدا کرے احقر کی تحریر کام یاب ہو اور آپ کے لیے کوئی مشغلہ نکل آئے۔ جواب آنے پر آپ کو مطّلع کروں گا؛ لیکن یہ نہیں معلوم کہ اب آپ کہاں ہیں؟ لکھنؤ ہیں یا مکان چلے گئے ہیں؟ احقر کے خیال میں آپ کو مکان چلا جانا چاہیے اور وہاں سے بہ ذریعہ مراسلت کسی جگہ کام یابی کی کوشش کرتے رہتے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب بھی اُن کو خط تحریر فرمادیں، تو امید ہے کہ وہ احقر کے خط سے زیادہ مؤثّر ہوگا۔ مناسب سمجھیں تو احقر کا یہ عریضہ مولانا کو سنادیں۔

باقی حالات بہ دستور ہیں، دعاؤں کا محتاج ہوں۔ ساجد (۱) اور اُن کے بہن بھائی وغیرہ سب خدا کے فضل سے خیرت سے ہیں۔ والسلام

نیاز مند محتاجِ دعا

محمد میاں

۱۵؍ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ

حضرت مولانا علی میاںؒ کو، حضرت الاستاذ کے خط کے مضمون سے آگاہی

حضرت الأستاذؒ کے مشورے کے مطابق، ناچیز نے مذکورہ بالا مکتوبِ گرامی کے مضمون سے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو آگاہ کیا اور اپنے طور پر بھی گزارش کی کہ

(۱) مولانا سید ساجد میاں صاحب (جن کا پہلے بھی تذکرہ آچکا ہے) حضرت الاستاذ کے صاحب زادے ہیں، جو مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی کے فاضل اور عربی میں دہلی یونیورسٹی سے ایم اے ہیں، سعودی سفارت خانہ نئی دہلی میں اہم عہدے پر فائز ہیں۔

حضرت! یہ ناچیز یہاں حضرت کی خدمت میں کئی ماہ سے مقیم ہے، اِطمینان کی صورت ہوتی تو وہ جتنا حضرت کی خدمت میں رہتا، اُس کے لیے دینی و علمی ہر اعتبار سے بہت مفید تھا؛ لیکن اُس کی بے مائیگی اِس بات کی متقاضی ہے کہ وہ بغیر کسی تاخیر کے، کسی جگہ تدریسی یا غیر تدریسی مشغلے میں لگ جائے۔ حضرت نے سنتے ہی فرمایا: مولوی نور صاحب(۱) میں نے تو اپنے رفقائے کار سے مشورے سے طے کرلیا ہے کہ مئی کی چھٹی (۲) کے بعد آپ کو اِن شاء اللہ دار العلوم ندوۃ العلما میں تدریسی خدمت کے لیے رکھ لیں گے، آپ کہیں اور جگہ کے لیے تگ ودو چھوڑ دیجیے۔ میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب کو بھی، اُن کی رائے جاننے کے لیے، آج کل میں عریضہ لکھنے والا ہوں۔ توقّع ہے کہ وہ آپ کی یہاں تدریس کے لیے رضامند ہو جائیں گے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے یہ فرمانے کے بعد میں یک سو ہو گیا اور اُسی دن حضرت کو لکھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب دار العلوم ندوۃ العلما میں تدریسی خدمت کی انجام دہی کے لیے تقرر فرمانے کی بات کہہ رہے تھے، شاید آپ کو بھی حضرت نے بہ راہِ راست لکھا ہوگا، جیسا کہ وہ فرما رہے تھے؛ لیکن حضرت کے مشورے اور رضامندی کے بغیر ظاہر ہے کہ یہ ناچیز کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا؛ اِس لیے حضرت بہ عجلت تمام، اپنی رائے گرامی سے مطّلع فرمائیں۔ حضرت کا ۸-۹ روز کے اندر ہی جواب آ گیا کہ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا علی میاں نے، آپ کو اپنے دار العلوم کے لیے منتخب فرمالیا ہے۔ آپ بے چون وچرا یہ پیش کش قبول فرمالیں، اِن شاء اللہ آپ کے لیے ہر طرح باعثِ خیر و برکت ہوگا اور عربی زبان سے آپ کو جو شغف ہے، اُس کا دار العلوم ندوۃ العلما بہترین میدان ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہ کا گرامی نامہ بھی، اِس

---

(۱) حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اِس ناچیز کو ہمیشہ ''مولوی نور صاحب'' کے لفظ سے ہی مُخاطَب کرتے تھے، البتہ تحریراً خط وکتابت میں ''عزیز گرامی مولوی نور عالم صاحب'' سے خِطاب کرتے تھے یا ان سے ملتے جلتے الفاظ سے۔

(۲) دار العلوم ندوۃ العلما میں عصری تعلیم گاہوں کی طرح، مئی کے مہینے میں گرمی کی چھٹی ہوا کرتی تھی۔

مضمون کا موصول ہوا تھا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ آپ پر بہت اعتماد کرتے ہیں، یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔

ندوۃ العلما میں تدریسی خدمت اور حضرت کو اِس کی اطلاع

تقرّر کے بعد جب میں نے اوئلِ جون ۱۹۷۲ء (اواخر جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ) سے تدریسی کام شروع کردیا، تو حضرت کو اِس کی اِطلاع دینے، نیز یافت کی مقدار بتانے کے لیے، عریضہ اِرسال کیا تو حضرت کا اُس کے جواب میں عاجلانہ شفقت نامہ موصول ہوا، جس میں حضرت نے اِظہارِ مَسَرَّت کے ساتھ دعا اور نصیحتوں سے نوازا تھا:

عزیز گرامی قدر! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاجِ گرامی؟

نامۂ عزیز باعثِ صد مَسَرَّت ہوا۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے، عارض کو مستقل اور زہید کو کثیر بھی بنادے گا۔ محنت شرط ہے اور ایسی لگن گویا آپ کو ہمیشہ یہیں رہنا اور یہیں کام کرنا ہے۔ مطالعہ پوری توجّہ سے کیجیے، طلبہ کو مانوس رکھیے، ہر ایک کا احترام کیجیے، کسی کی بُرائی نہ کیجیے، مطالعہ وسیع کیجیے، ہر مضمون کو خود حل کیجیے، البتہ ضرورت کے وقت ارشادِ ربّانی فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ کی تعمیل کیجیے، کما قالوا: "شِفَاءُ العِيِّ السُّؤَالُ"۔

والدہ محترمہ کی دعائیں حاصل کرنے کی کوشش کیجیے، اِس کے بغیر برکت مُیَسَّر نہیں آسکتی۔

والسلام

محتاجِ دعا، محمد میاں

۸/ جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ

۲۰/ جون ۱۹۷۲ء

ایک دو ماہ تدریسی خدمت میں گزارنے کے بعد، اپنی کارکردگی کی تفصیل

حضرت الأستاذ کو لکھی، تو حضرت نے مندرجہٗ ذیل عنایت نامہ تحریر فرمایا اور اِداروں اور اجتماعی کام کی جگہوں میں، برسرِ عمل رہنے کے دوران، جس اُصول پر مضبوطی سے کار بند رہنا چاہیے، اُس کی طرف راہ نمائی فرمائی:

۹/شعبان ۱۳۹۲ھ = ۱۹/ستمبر ۱۹۷۲ء

عزیز محترم! زادت مزایاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔ مزاج شریف؟

طویل انتظار کے بعد، نامۂ عزیز کاشفِ حالات اور موجبِ تسکین و طمانینتِ قلب ہوا۔ میری مَسَرَّت یہ ہے کہ آپ تدریسی مشاغل میں منہمک ہیں، طلبہ اور حضراتِ اربابِ اِدارہ آپ سے مطمئن ہیں۔ یہ سب بڑی کام یابی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اِس کام یابی سے بہرہ اندوز فرمائے۔

حضرت الأستاذ شیخ الادب (مولانا محمد اعزاز علیؒ) نے احقر کو ہدایت فرمائی تھی کہ مدرس کا فرض درسی مشاغل میں اِنہماک ہے، اُس کو اِدارے کی سیاسیّات میں دخل دینا چاہیے نہ اندرونی معاملات میں۔ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی کام یابی بھی یہی ہے۔ ان سے منقول ہے کہ ہمارے لیے (اور تمام مسلمانوں کے لیے) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت یہ تھی "لَا تُنَازِعِ الْأَمْرَ أَهْلَهُ" امید ہے کہ آپ بھی یہی مسلک اختیار کریں گے۔

والسلام

نیاز مند محتاجِ دعا

محمد میاں

۲۶/ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ کے عریضے میں ناچیز نے یہ لکھا تھا کہ بعض دفعہ یہ حقیر چاہنے کے باوجود حضرت کو خط نہیں لکھتا کہ اُس کے جواب کی زحمت میں مبتلا نہ کروں؛ کیوں کہ پیرانہ سالی، بیماری اور کثرتِ مشاغل کی وجہ سے، حضرت ویسے ہی بوجھل

رہتے ہیں؛ اِس لیے جب بھی کوئی عریضہ تحریر کرتا ہوں، تو ڈرتے ڈرتے ہی کرتا ہوں۔ اُس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا:

عزیز محترم! زادت مزایاکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاجِ عزیز؟

احقر کو خطوطِ موصولہ کے جوابات سے اِتنی فرصت نہیں ملتی کہ از خود کسی کو خط لکھ سکوں؛ مگر آپ کے خط کا انتظار اور خیریت کا اشتیاق مسلسل رہتا ہے۔ الحمد للہ مکتوبِ سامی مؤرخہ ۲۶؍ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ سے اشتیاق نے انبساط وابتہاج حاصل کیا۔ جزاکم اللہ

عید الاضحیٰ کے بعد سے، طبیعت خراب چل رہی ہے، ۴؍ فروری ۱۹۷۳ء کو خونی بواسیر کے شدید دورے نے صاحبِ فراش بنادیا۔ الحمد للہ اب دورہ نہیں رہا؛ لیکن صحت کی رفتار شافی الامراض صحیح رکھے، تو کم از کم ایک مہینے کے بعد، مدرسے جانے کی بحث ہوسکے گی۔ دعا کی ضرورت ہے۔ احباب اور اکابر سلام قبول فرمائیں۔ الحمد للہ سب خیریت سے ہیں۔ مشفق محترم مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں سلام عرض کردیں۔

نیاز مند محتاجِ دعا

محمد میاں

یومِ شنبہ: ۶؍ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ

حضرت الاستاذ کا ایک خط جو راقم کے لیے وثیقۂ سعادت ہے

۲۲؍ شعبان ۱۳۹۳ھ = ۲۱؍ ستمبر ۱۹۷۳ء کے مکتوبِ گرامی میں، حضرت الاستاذؒ نے ناچیز کے حوالے سے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے خط کا ایک اقتباس نقل فرمایا،

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ نے ہمیشہ کی طرح، اپنے کسی مکتوب میں حضرت مولاناؒ کی مزید توجّہ میری طرف مبذول کرائی ہوگی۔ حضرت الاستاذ کا یہ خط اور حضرت مولاناؒ کے خط کا مضمون، جو حضرت الاستاذؒ نے اپنے گرامی نامے میں درج فرمایا ہے، اِس ناچیز کے لیے سعادت و برکت کا بہترین وثیقہ ہیں:

عزیز محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

حضرت مولانا کا مکتوبِ گرامی صادر ہوگیا ہے، تحریر فرمایا ہے:

(عزیزی مولوی نور عالم صاحب سے مجھے خود تعلقِ خاطر ہے۔ آپ نے اُن کو یہاں بھیج کر ہم کو ایک اچھا تحفہ دیا ہے۔ میں اِن شاء اللہ اُن کے معاملے پر جلد توجّہ کروں گا اور جو کچھ اُن کی مدد ہو سکے گی، اُس سے اِن شاء اللہ دریغ نہ ہوگا۔ اُن کو کسی موقع سے باہر بھیجنے کا بھی اِنتظام ہو جائے گا؛ تا کہ وہ زیادہ مفید بن سکیں۔ رمضان وہ اپنے وطن کرنا چاہتے ہیں، شادی کا بھی ارادہ ہے، اِس سلسلے میں جو خدمت کی جا سکے گی، کی جائے گی۔)

حضرت مولانا کی اس تحریر کے بعد احقر کا کام تو یہ رہ جاتا ہے کہ دعا کروں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کے اعتماد کو زیادہ کرے اور آپ کو اللہ تعالیٰ توفیق بخشے کہ آپ زیادہ سے زیادہ مفید اور قابلِ اعتماد ہوں۔

مولانا کو جواب، اس لیے نہیں لکھا کہ اُنھوں نے ایک رسالہ بھیجا ہے: "إِسْمَعِيْ يَا إِيْرَانُ!" اس کے مطالعے کے بعد جواب لکھوں گا، اِن شاء اللہ۔

دوسری بات: احقر کی صحت روبہ تنزّل ہے، چند تالیفی کام ادھورے باقی ہیں، دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ اُن کی تکمیل کی توفیق بخشے۔

والسلام

نیاز مند، محمد میاں

۲۲ر شعبان ۱۳۹۳ھ = ۲۱ر ستمبر ۱۹۷۳ء

حضرت الاستاذ کی میرے لیے مسلسل دل سوزی

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ناچیز کی شادی کی طرف جو اِشارہ فرمایا ہے، وہ اُس وقت بہ وجوہ ٹلی، تو کئی سال کے لیے مؤخّر ہوگئی اور بالآخر وہ شنبہ - یک شنبہ: ۱۵-۱۶/شوال ۱۳۹۹ھ مطابق ۸-۹/ستمبر ۱۹۷۹ء کی شب میں انجام پذیر ہوسکی۔

پیرانہ سالی، جسمانی کم زوری اور اَمراض و مشاغل کی کثرت کے باوجود، کبھی ایسا نہ ہوا کہ حضرت الاستاذؒ نے میرے کسی عریضے کا جواب نہ دیا ہو۔ اُن کے ہر مکتوب سے، اُن کی میرے لیے دل سوزی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا۔ مجھے بے حد قلق ہے کہ اُن کے چند خطوط ہی محفوظ رہ سکے۔ اللہ پاک اُن کی شفقتوں کا بہترین بدلہ اُنھیں عطا کرے اور جنّت الفردوس میں حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کا جوار نصیب کرے۔

ایک بار میں شدید طور پر کافی دنوں تک بیمار رہا، میں نے حضرت کو اپنا احوال لکھا اور دعا کی درخواست کی، تو حضرت نے نصیحتوں اور ہم دردیوں بھرا ذیل کا مکتوب اِرسال فرمایا:

۲۱/صفر ۱۳۹۴ھ = ۱۶/مارچ ۱۹۷۴ء

عزیز محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاجِ عزیز؟

ایک عرصے کے بعد، دستی مکتوب موصول ہوا، حالات کا علم ہوا۔ آپ کی علالت سے تشویش ہے۔ اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے۔ علاج کی طرف پوری توجّہ کیجیے۔ بہ ظاہر نزلے کا اثر ہے اور تنقیے کی ضرورت ہے، طبیعت کا علاج ہی اِن شاء اللہ مفید ہوگا۔ غذا میں احتیاط کی ضرورت ہے، بڑا گوشت تو استعمال نہ ہونا چاہیے اور گوشت کے بہ جائے سبزی ترکاری کا استعمال زیادہ مفید ہوگا اور بیماری کی اصل علّت احقر کے خیال میں یہ ہے کہ آپ ورزش

نہیں کرتے، اِس عمر میں ورزش ضروری ہے اور بہترین ورزش یہ ہے کہ نمازِ صبح سے پہلے یا فوراً بعد کم از کم دو میل کا گشت کریں اور کچھ دور دوڑا کریں۔ یہ آپ کے لیے بہت آسان ہے، ندوہ شہر سے باہر ہے، کھلی ہوا میں آپ صبح کی گشت کرلیں، تو چند روز ہی میں آپ صحت میں نمایاں فرق دیکھیں گے۔ احقر اب چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا ہے؛ ورنہ آپ کی عمر میں جب تھا تو ڈنڈ لگایا کرتا تھا، پھر دہلی آ کر اِس ورزش کا موقع نہیں ملا؛ مگر صبح کو ایک ڈیڑھ گھنٹہ گشت کا معمول رہا۔

دین وملت کی خدمت اگر اہمیّت رکھتی ہے، تو تحفّظ صحت بھی اُتنی ہی اہم ہے؛ کیوں کہ خدمت کے لیے صحّت شرط ہے اور فرض کا مقدمہ بھی فرض ہوتا ہے۔

والسلام

نیاز مند ومحتاجِ دعا

محمد میاں

حضرت کی احقر کو حسنِ خط کی داد

ایک خط میں حضرت الاستاذؒ نے، اِس ناچیز کو حسنِ خط کی بہت داد دی، خط کا آغاز ہی تحسین آفریں الفاظ سے فرمایا:

عزیز محترم! زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی؟

نامۂ عزیز سے محظوظ ومسرور ہوا۔ باطن کی طرح آپ کے خط کا ظاہر بھی دل کش ہوتا ہے، یعنی قلم نفیس اور دیدہ زیب، تحریر میں روانی بھی بہت

ہوتی ہے......

والسلام

دعا گو ومحتاجِ دعا

محمد میاں

یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ = ۳؍جولائی ۱۹۷۳ء

مذکورہ بالا خط بہت لمبا ہے اور ''انتر دیشی پتر کارڈ'' (Inland letter card) کے تینوں صفحات پر حضرت کی باریک تحریر میں لکھا ہوا ہے، طوالت کی وجہ سے میں یہاں پورا خط نقل نہیں کرسکا۔ حضرتؒ نے اِس خط میں سابقہ دِگر کئی خطوں کی طرح تنخواہ کی قلّت پر تشویش کا اِظہار کرتے ہوے میری بہت سی گھریلو ذمّے داریوں کے پیشِ نظر کئی طرح کے مشورے دیے تھے۔ ایک مشورہ یہ بھی تھا کہ آپ چاہیں تو لکھنؤ سے آجائیں ''میوات'' کے ''نوح'' کے مدرسے میں جو مولانا نور محمد صاحبؒ (شاگرد وخلیفہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ) کی سرپرستی میں چلتا ہے، صدر مدرس کی جگہ خالی ہے اور وہاں کے ذمّے دار حضرات اِس جگہ کو پُر کرنے کے لیے، مجھ سے مسلسل رابطے میں ہیں۔ دوسرا مشورہ یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے چند فضلا ایک مدرسے میں کام کررہے ہیں، اُنھوں نے وہاں اچھا تعلیمی معیار قائم کیا ہے، وہ آپ جیسے عربی داں کی تلاش میں ہیں، تنخواہ حسبِ طلب دیں گے؛ لیکن یہ ناچیز بہ وجوہ حضرت کے اِن مشوروں پر اُس وقت عمل نہ کرسکا اور یافت کی قلّت اور ضروریات کی کثرت کے باوجود، لکھنؤ میں تدریس کو ترجیح دی؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی صحبت تمام پریشانیوں کو برداشت کرنے پر آمادہ کرتی رہتی تھی۔

راقم کے درد کو اپنا درد بنالینے کی حضرت کی سعی

حضرت الاستاذؒ نے جس طرح میرے درد کو اپنا درد بنالیا تھا، اُس کی مثال اِس

زمانے میں مولانا رومؒ (۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء-۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کا چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی ملے گی۔ یوں تو ہر اُس آدمی کا یہ ناچیز بے پناہ اِحسان مانتا ہے اور روزانہ اُس کے لیے دعائیں کرتا ہے، جس نے ایک لفظ کا بھی اُس کو فائدہ پہنچایا؛ لیکن چند اَساتذہ جنھوں نے مجھے ذرّے سے آفتاب بنانا چاہا اور میری راہ کے سارے کانٹوں کو اپنے ہاتھوں سے چننے کی کوشش کی؛ اُن میں حضرت الأُستاذ مولانا سیّد محمد میاںؒ سرِ فہرست ہیں۔ اکثر دفعہ آدمی کسی مُحسن کے اِحسان کی ہمہ گیری، اُس کی اِفادیّت کی بے شمار سمتوں اور اُس کے دُوررَس اثرات کا بروقت اِحساس نہیں کر پاتا، بالخصوص نوعمری اور ناتجربہ کاری کی حالت میں، جب مُحسن کے اِحسان کے اَتھاہ پن کا اُسے قطعاً اندازہ نہیں ہوتا۔ حضرت الأُستاذؒ کے اِحسانات کے حوالے سے، اُس وقت جب یہ میرے اوپر ہو رہے تھے، اِس کم عمر، کم عقل اور ناتجربہ کار کا یہی رویّہ رہا۔ آج جب اُن اِحسانات کی وُسعتوں اور گہرائیوں پر غور کرتا ہوں تو بے حد شرمندگی اور افسوس ہوتا ہے کہ اگر حضرت کی حیات میں، اُن کے اِحسانات کی قدر ہوتی، تو میں اُن کی تمناؤں پر پورا اُترنے کی اپنی سی کوشش تو ضرور کرتا، اِس طرح اُن کا دل خوش ہوتا اور وہ مزید دعائیں دیتے۔

لکھنؤ سے دہلی کا ایک سفر اور حضرت کی زیارت سے شرف یابی

اَواخرِ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ = اَواسطِ فروری ۱۹۷۲ء میں، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں آمد اور تکیہ اور لکھنؤ میں کئی مہینے قیام کے بعد، اَوائلِ جون ۱۹۷۲ء (اواخرِ جمادی الأولیٰ ۱۳۹۲ھ) میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں اُستاذ مقرر کیے جانے کے بعد، حضرت الأُستاذؒ کی حیات میں صرف ایک بار: جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ/مئی ۱۹۷۳ء میں دہلی کے سفر کا موقع ملا اور حضرت سے ملاقات اور کئی روزہ صحبت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اُس کے بعد اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے، چاہنے کے باوجود، دہلی کا سفر ہوا نہ حضرت کی

زیارت کی سعادت حاصل ہوسکی۔ یہ سفر اِس لیے بھی یادگار تھا کہ حضرت نے ایک روز دوپہر میں اپنے گھر واقع اندورنِ "اِحاطہ کالے صاحب" گلی قاسم جان، اِس ناچیز کی دعوت کی اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ کچھ تو حضرت کا رعب جو ہمیشہ میرے اوپر طاری رہتا تھا اور کچھ یہ بات کہ زندگی میں پہلی بار میں نے دیکھا کہ روٹیاں ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی ڈھکی ہیں اور حضرت ایک ایک نکال کے دے رہے ہیں؛ اِس لیے ایک آدھ چپاتی ہی لے سکا۔ ہمارے دیارِ بہار میں اُس وقت تک روٹیوں کو ڈھک کر دسترخوان پر رکھنے کا چلن نہیں ہوا تھا، اب آمدورفت کی کثرت اور مختلف علاقوں کے لوگوں کے آپسی اختلاط کی وجہ سے، تہذیب وتمدن کا لین دین زیادہ ہوگیا ہے؛ اِس لیے ہمارے ہاں کے لوگ بھی اِس کلچر کو برتنے لگے ہیں۔ بہ ہرکیف میں نے روٹیوں کے ڈھکی ہونے اور ایک ختم ہونے کے بعد دوسری نکال کے دیے جانے کی وجہ سے یہ سمجھا کہ شاید حضرت کے ہاں کسی وجہ سے روٹیاں کم پکی ہیں، اِس لیے اُنھیں ڈھک دیا گیا ہے اور اُن میں سے ایک ایک نکال کے دی جارہی ہے؛ اِس لیے مجھے کم کھانا چاہیے، چناں چہ میں نے بہ مشکل ایک چپاتی لی اور ذرا سا چاول، حضرت نے جھڑکنے کے انداز میں فرمایا بھی کہ مولانا! آپ اور کھالیں؛ لیکن مزید لینے کے لیے میں کسی طرح بھی ہمت جٹا نہیں سکا۔ شام کو لال کنواں کے کوچہ پنڈت کی ایک مسجد کے، طالبِ علمی کے زمانے سے امام، اپنے ایک رفیقِ درس مولانا برہان احمد سہارنپوری سے، اُن کی مسجد میں ملاقات ہوئی، تو میں نے اُن سے کہا: بھئی! آج دوپہر میں حضرت الاُستاذؒ نے کھانے پر بلایا تھا، دسترخوان پر روٹیا ڈھکی ہوئی تھیں، میں نے سمجھا کہ کسی وجہ سے کم پکی ہوں گی؛ اِس لیے ڈھک دی گئی ہیں؛ تاکہ مہمان احتیاط سے کھائیں اور تھوڑی بہت چھوڑ دیں۔ مولانا برہان بہت کھلکھلا کے ہنسے اور کہا: بھئی! یہ تو ہمارے خطے: مغربی یوپی اور دہلی کا عام رواج ہے کہ روٹیوں کو خواتین پکانے کے دوران ہی ڈھک دیتی ہیں؛ تاکہ گرم رہیں؛ کیوں کہ ٹھنڈی روٹیاں کھائی نہیں جاتیں، بے مزہ سی لگتی ہیں؛ بل کہ عموماً عورتیں، اگر کوئی مجبوری یا

معذوری نہ ہو، دسترخوان پر لوگوں کے بیٹھ جانے کے بعد پکانا شروع کرتی ہیں؛ تاکہ گرم گرم روٹیاں تازہ تازہ دسترخوان پر پہنچتی رہیں۔

سیاسی واقتصادی مسائل کے بعض ابواب کا عربی ترجمہ

اِسی سفر میں، ناچیز نے حضرت الأستاذ کو اُن کی مشہور کتاب ''سیاسی واقتصادی مسائل اور اِسلامی تعلیمات وارشادات'' کے ایک معتد بہ حصّے کا عربی ترجمہ دکھایا، جو اُس نے دار العلوم ندوۃ العلما کے عربی ترجمان ''البعث الاِسلامی'' میں قسط وار شائع ہونے کے لیے دیا تھا، وہی شائع شدہ صفحات حضرت کی خدمت میں پیش کیے، جنھیں دیکھ کر اُنھیں خوشی ہوئی اور دعائیں دیں، لیکن فرمایا کہ اِس عربی ترجمے کو کتاب کی شکل میں چھاپنے کی کیا صورت ہوگی؟ میں تو اِس کی قدرت نہیں رکھتا۔ ناچیز نے عرض کیا کہ ''البعث الاسلامی'' میں شائع کرنے کا مقصد اصلاً تو یہ ہے کہ اِس طرح ترجمے کی میری صلاحیّت پختہ ہوگی اور فی الجملہ علماے عرب آپ جیسے علما سے واقف ہوں گے، اب اگر یہ ترجمہ کتاب کی شکل میں کسی طرح چھپ جاتا ہے، تو وہ ایک مستقل فائدے کی چیز ہوگی؛ لیکن اِس کی کیا صورت ہوگی؟ یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی؟

اِس کتاب کے بعض مباحث کا میں اُس وقت ترجمہ نہ کرسکا، تو اِس وقت تک بھی نہ ہوسکا؛ ورنہ عربی کے کسی ناشر سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔

حضرت کی وفات پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی راقم سے تعزیت

دار العلوم ندوۃ العلما میں ۸۵ سالہ جشنِ تعلیمی کے انعقاد کی تیاری شباب پر تھی، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے، حضرت سے نہ صرف اُس میں شرکت؛ بل کہ علمی وفکری مشارکت کی فرمایش کی تھی کہ اچانک ایک روز یہ اطّلاع ملی کہ چہار شنبہ: ۶؍شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۴؍اکتوبر ۱۹۷۵ء کی شام کو ساڑھے ۶؍بجے حضرت کا انتقال ہوگیا۔ اِس

ناچیز کے لیے یہ، خبر بڑی صاعقہ اثر ثابت ہوئی۔ کئی ماہ تک کسی کام میں جی نہ لگا، ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی سایۂ ہما میرے سر سے اٹھ گیا ہے۔ ایک روز حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، اپنے نائب وشاگردِ عزیز مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ (متوفی ۱۱؍ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۳؍ اگست ۱۹۹۹ء) نائب ناظم ندوۃ العلما کے ساتھ میرے کمرے میں، جو سلیمانیہ ہاسٹل کی بالائی منزل پر تھا، تشریف لائے، میں بہت اچنبھا ہوا کہ حضرت نے کیسے اِتنی زحمت کی؟ بیٹھے نہیں کھڑے کھڑے فرمایا: عزیزم! یہاں حضرت مولانا سید محمد میاں کا تمھارے سوا کوئی قریب اور عزیز نہیں، تم اُن کے لیے قریب ترین عزیز سے عزیز تر تھے۔ اُنھیں تم سے جو تعلق تھا وہ بہت کم اساتذہ کو اپنے شاگردوں سے ہوتا ہے؛ اِس لیے اُن کی وفات پر ہم دونوں تم سے دلی تعزیت کرتے ہیں۔ اللہ اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یہ کہہ کر دونوں حضرات واپس ہو گئے، میری گزارش کے باوجود نہیں رکے۔ اُن کے تشریف لے جانے کے بعد اور شدّت کے ساتھ غم کا سایہ میرے اوپر دراز ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اِس کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب نے کئی موقعوں سے میرے سامنے، حضرت الاستاذ کی مدح سرائی کی اور فرمایا: حضرت مولانا سید محمد میاں، علم وعمل کے صحیح معنی میں جامع تھے، زہد واستغنا اور دنیا سے بے نیازی میں وہ ممتاز تھے۔ اپنے علم وقلم سے ملّت کی بے لوث خدمت کی، وہ بڑے قد کے عالم تھے؛ لیکن خلوت نشینی اور شہرت ونمود سے دوری کی وجہ سے، کم لوگ اُن کے مقام ومرتبے سے واقف ہیں۔

اہم تالیفات

حضرت کے صاحب زادے مولانا سید ساجد میاں دہلوی مدظلہ کے مخطوطہ مضمون جو اُنھوں نے والد ماجد پر لکھا ہے، میں تحریر ہے کہ حضرت نے اپنے کسی مضمون میں خود تحریر فرمایا ہے کہ اُن کی تالیفات کی تعداد کم وبیش ستّر ہے، جن میں ضخیم کتابیں بھی ہیں اور مختصر رسالے بھی، بعض تحریریں وقت کی ضرورت کے تحت لکھی گئیں، جو بعد میں ناپید

ہوگئیں، بعض کتابیں اور نگارشات کسی مصلحت کے تحت دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں۔اہم کتابوں کی ایک فہرست اور مختصر تعارف درجِ ذیل ہے:

۱- سیرت مبارکہ: سیرت مبارکہ محمد رسول اللہ ﷺ، چھ سو صفحات کی اِس کتاب کے مضامین کا اصل ماخذ قرآنِ مجید کی آیات ہیں، جن کی مزید تشریح احادیثِ صحیحہ اور اَقوالِ صحابہؓ کے ذریعے کی گئی ہے، اِس وجہ سے سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی وہ شخصیت سامنے آئی ہے جو قرآنِ مجید نے پیش کی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں رسول اکرمؐ کی تشریف آوری سے پہلے عرب معاشرے کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ تاریخی حقائق کے دلچسپ تذکرے کے ساتھ، مصنفؒ کی زبان کی ادبی چاشنی نے کتاب کو بار بار مطالعہ کرنے اور ساتھ رکھنے کے قابل بنادیا ہے۔

۲- صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا عہدِ زرّیں اور مثالی حکومتیں: اِس کتاب کا اصل ماخذ "إزالة الخفا عن خلافة الخلفا" مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہے، جس کا اردو ترجمہ مصنفؒ نے زمانۂ اِسارت میں شروع کیا تھا؛ لیکن بعد میں مضامین کے پھیلاؤ اور کثرت کی وجہ سے ایک مستقل کتاب بن گئی ہے۔ دو جلدوں اور تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل اِس کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ حضراتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم واجب الاحترام کیوں ہیں، صحابۂ کرامؓ کائنات کی آنکھ کا تارا ہیں، یہ محض ایک عقیدت ہے یا حقیقت؟ کلامِ اِلٰہی نے اِس جماعت کے کیا فضائل بتائے ہیں؟ خلافتِ راشدہ اور اُس کے مراتب، تاریخِ اسلام میں خلافتِ راشدہ اور خلفاے راشدین کی اہمیت اور قرآن وحدیث سے اُس اَہمّیت کے دلائل وشواہد، بلاشبہ یہ کتاب جس کا نام "عہدِ زرّیں" ہے مصنفؒ کی زندگی کے عہدِ زریں کی بہترین علمی صلاحیتوں کا نچوڑ اور شاہ کار ہے اور کتاب کا بنیادی مقصد حضرات صحابہؓ کی مُقدّس جماعت پر تنقید وتنقیص کے دروازے کو بند کرنا ہے، جو تحقیق کے نام پر کھول دیا گیا ہے۔ مصنف کا طرزِ تحریر نہ

صرف حقائق کو بیان کر کے، حضراتِ صحابہ کی مبارک شخصیات سے غبار کو صاف کرتا ہے؛ بل کہ قاری کے دل کو، اُن کی محبت وعقیدت سے سرشار کر دیتا ہے۔

۳- تاریخ الاسلام: غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے۔ بچوں کے لیے سوال وجواب کے انداز میں لکھی گئی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے: پہلا حصہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی مکی زندگی، دوسرا مدنی زندگی اور تیسرا حصہ رسول اکرم ﷺ کے اَخلاق وعادات کے ذکر میں ہے۔ یہ کتاب مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ زبان انتہائی سادہ اور انداز دلچسپ ہے۔

۴- ہمارے پیغمبر ﷺ: بچوں کے لیے لکھی گئی اِس مختصر کتاب میں سیرت مبارکہ کو آسان انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی داخلِ نصاب ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں اِسلامی عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔ اِس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

۵- حضرت عثمان ذی النورین کے شواہدِ تقدس: علمی تحقیق وجستجو کے نام پر، جن صحابۂ کرام کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے، اُن میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا اسمِ مبارک سرفہرست ہے۔ اِس کتاب میں ناقدین کے حوالوں اور دعووں کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور حضرت ذی النورینؓ کی مقدس شخصیت کے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔

سیاسی تاریخ اور تحریک آزادی

۶- علمائے ہند کا شاندار ماضی: مصنفؒ کی شہرۂ آفاق اور بے نظیر کتاب ہے، جس کی اِشاعت پر کتاب ضبط ہو گئی، پریس بند کر دیا گیا اور مصنف پر مقدمہ چلا، چار جلدوں پر مشتمل اِس کتاب کے پہلے حصّے میں مجددالفِ ثانیؒ کے دور پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن کی زندگی میں تین مغل بادشاہ، اکبر، جہانگیر اور عالم گیر سریرآرائے سلطنت ہوئے اور بادشاہ اکبر کے زمانے میں ''دینِ الٰہی'' کی شکل میں جو کفر واِلحاد کا فتنہ اٹھا تھا

اُس کا سدِّ باب کیا اور اس جد وجہد میں قید وبند کی مصیبت برداشت کی، حضرت مجدد الفِ ثانیؒ کی جد وجہد وقربانیوں کے نتیجے میں، بادشاہ عالم گیرؒ کے زمانے تک، اِس فتنہ کا قلع قمع ہو چکا تھا۔ حضرت مجدد الفِ ثانیؒ، اُن کے خلفا اور خلفا کے خلفا کی سوانح، اُن کے معاصرین کے حالات اور سیاسی کارنامے اور اُس زمانے کا سیاسی وحکومتی نظام، نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا حصہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سیاسی نظریات، اُن کی تعلیم وتربیت کے مراکز، حضرت سیّد احمد شہیدؒ، اُن کے رفقا کے مجاہدانہ کارنامے اور قربانیاں وغیرہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

تیسرا حصہ: علمائے "صادق پور" اور اُن کے پُر اَسرار مجاہدانہ کارنامے، سکھوں کی حکومت کا زوال وغیرہ، کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

چوتھا حصہ: جو برطانوی استعمار کے خلاف علمائے کرام کی جد وجہد کی تاریخ پر مشتمل ہے، علما کی جد وجہد کی چار سو سالہ تاریخ کا سب سے خونیں دور سے متعلق معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہ تمام واقعات انتہائی مستند اور قابلِ اعتبار حوالوں سے ماخوذ ہیں۔ مصنفؒ کی یہ کتاب بہت مشہور ہے اور اپنے موضوع پر ایک ریفرنس (حوالہ) مانی جاتی ہے۔

۷- علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے: اس کتاب میں تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی حکومت کے دوران، علما کا کردار اور جد وجہد اور اُس کے نتیجے میں ہونے والی قربانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے دوسرے حصے میں ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد کے حالات اور اس دور میں جمعیۃ علمائے ہند کی خدمات کا ذکر ہے۔

۸- ہندوستان شاہانِ مغلیہ کے عہد میں: بہ قول مصنف، یہ علمائے ہند کا شان دار ماضی، کا تتمہ ہے دوسرے الفاظ میں وہ شان دار ماضی کی داستان تھی اور یہ

داستانِ بربادی ہے۔

۹- پانی پت اور بزرگانِ پانی پت: حضرت شاہ قلندرؒ اور آپ کے معاصرین اور پانی پت کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب ہے۔

۱۰- دور حاضر کے سیاسی واقتصادی مسائل اور اسلامی تعلیمات وارشادات۔

۱۱- ہمارا وطن اور اُس کی شرعی حیثیت۔

۱۲- اِسلام اور حفاظتِ جان۔

۱۳- مسلم سوشلسٹ۔

۱۴- صالح جمہوریت اور معتبر جمہوریت۔

۱۵- اقسام حکومت: (ترجمہ أنواع الدول)

۱۶- سورۂ فاتحہ کی سیاسی تفسیر: اِمامتِ امت کا دستورِ اساسی۔

۱۷- اِسلام کیا اور اِسلامی فکر کیا ہے؟

۱۸- دین ودنیا کا سنگم۔

۱۹- حیاتِ مسلم: مسلمان کی زندگی، مہد سے لحد تک۔

۲۰- اِسلام کیوں؟

۲۱- قرآن حکیم اور تفسیرِ انسانیت۔

۲۲- اِنسان اور اِنسانیت، منزل بہ منزل۔

۲۳- مراد آباد جیل میں: درسِ قرآن کی سات مجلسیں۔ (شیخ الاسلامؒ کی تقاریر)

۲۴- آنے والے انقلاب کی تصویر۔

۲۵- خطرناک نعرے۔

۲۶- درر منثورہ (مولانا مودودیؒ کے افکار کے رد میں)

۲۷- حواشی بر ''تقریر دل پذیر'' از حضرت مولانا نانوتویؒ۔

۲۸- حواشی بر اختصار ''تقریر دل پذیر'' از حضرت نانوتویؒ۔

۲۹- مشکاۃ الآثار: احادیثِ مبارکہ کا ایک مختصر مجموعہ، جو درس نظامی میں مشکاۃ سے پہلے پڑھایا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیو بند کے نصاب میں داخل ہے۔

۳۰- اسلامی تعلیمات کا مرقع: ایک چارٹ کی شکل میں ابتدائی تعلیمات درج کی گئی ہیں۔

۳۱- مسنون دعائیں: دعاؤں کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جس کے شروع میں ایک مفید مقدمہ ہے۔

۳۲- اربعین: چالیس اَحادیث کا مجموعہ مع ترجمہ وشرح۔

۳۳- مجموعہ خطبات ماثورہ ومنقولہ: جمعہ وعیدین کے لیے، خطبات کا مجموعہ، جس کا ترجمہ، تقریر کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۳۴- روزہ وزکاۃ۔

۳۵- اسلامی تقریبات بچوں کے لیے۔

۳۶- رویت ہلال رمضان وعید: رویت ہلال کے بارے میں، جمعیۃ علماے ہند کا فتویٰ۔

۳۷- چاند تارے، زمین وآسمان: تسخیرِ کائنات کی کوششوں کے ساتھ، جو سوالات پیدا ہوتے ہیں، اُن کے بارے میں شرعی رہ نمائی۔

۳۸- حیاتِ آدم: دنیا کی پہلی آبادکاری۔

دینی تعلیم وتربیت

بہ طور معلم اور ماہر تعلیم، مولانا سید محمد میاںؒ کا ایک بڑا کارنامہ، وہ تعلیمی نصاب ہے، جو آپ نے مرتب فرمایا، جس میں نہ صرف طلبا کے لیے ٹیکسٹ بکس ہیں؛ بل کہ استادوں کی تربیت کے لیے بھی مواد موجود ہے۔

۳۹- دینی تعلیم کا رسالہ: ۱۲ر حصوں میں، جمعیۃ علماے ہند کے مکاتب میں رائج ہے۔

۴۰- طریقۂ تقریر: دو حصوں میں۔

۴۱- تعلیمی چارٹ اور تعلیمی کارڈ۔

۴۲- مسئلہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم۔(۱)

حضرت کے پس ماندگان

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کے ایک بھائی تھے: احمد میاں اور دو بہنیں تھیں: صغیرہ خاتون اور سعیدہ خاتون۔ مولاناؒ کی پہلی اہلیہ سے صرف ایک صاحب زادے تھے: مولانا سید حامد میاں، تاریخ پیدائش: بہ روز جمعرات: ۱۰ر جمادی الاخری ۱۳۴۵ھ۔ تاریخ وفات: بہ روز جمعرات شام ۴ بجے ۱۳ر رجب ۱۴۰۸ھ۔ مولانا حامد میاں جلیل القدر عالم، عظیم المرتبہ شیخ و مربی اور بڑے مقبول، محبوب صاحبِ نسبت بزرگ تھے، وہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے خلیفہ و مجاز تھے اور چاروں سلسلوں میں اُنھیں خرقۂ خلافت عطا ہوا تھا۔ ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں وہ پاکستان کے مشہور ثقافتی شہر لاہور منتقل ہو گئے اور وہیں کی سکونت اختیار کی، وہاں اُنھوں نے ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء میں جامعہ مدنیہ کے نام سے ایک اِدارہ قائم کیا، جس نے بڑی ترقی کی اور پاکستان کے چند مدرسوں میں سے ایک شمار ہونے لگا۔ شروع میں اِس مدرسے کا نام ''مدرسہ اِحیاء العلوم'' تھا۔

مولانا حامد میاں کی پہلی شادی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء میں مرادآباد میں ہوئی اور دوسری شادی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں لاہور پاکستان میں ہوئی۔ اُن کے ۵ لڑکے ہیں: حافظ مولانا سید رشید میاں، مولانا سید وحید میاں، مولانا سید محمود میاں، مولانا سید مسعود

(۱) کتاب کے تعارف و فہرست کے سلسلے میں، حضرت کے صاحب زادے، محترم مولانا سیّد ساجد میاں مدظلہ کی تحریر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

میاں، حافظ سید مقصود میاں۔

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی دوسری اہلیہ محترمہ سے تین صاحب زادے ہوئے:
حافظ سید خالد میاںؒ، جنھوں نے حضرت کی تالیفات کی اِشاعت کے لیے ''علماے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے'' کی نئی اِشاعت کے ساتھ، ایک اِدارہ ''کتابستان'' قائم کیا، اس اِدارے کا مقصد حضرتؒ کی کتابوں کو بالخصوص اور دیگر علماے مصنّفین کی تصنیفات کو بالعموم جدید معیاری انداز میں شائع کرنا تھا۔ ۱۹۶۳ء میں وہ جرمنی چلے گئے، جہاں کمپیوٹر کی تربیت حاصل کی اور ایک لائق پروگرامر بنے، حضرتؒ کی حیات میں وہ کئی بار وطن دہلی آئے۔ آخری بار وہ رمضان المبارک گزارنے ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳ء میں دہلی آئے، دو ہی روز تراویح میں شریک ہوئے کہ ہارٹ اٹیک ہوا اور ۲۹/رمضان مطابق ۳۰/مارچ کی شب میں اللہ کو پیارے ہوگئے اور تیس سال والد ماجد سے دور رہنے کے بعد موت کے بعد اُنھی کے قدموں میں مدفون ہوئے۔

دوسرے صاحب زادے مولانا سید ساجد میاں ہیں، جو مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی سے فارغ ہیں، اُس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۷۲ء سے سعودی سفارت خانے میں اہم عہدے پر فائز ہیں۔ اپنی نیکی، دیانت داری اور مفوضہ کاموں کی صلاحیت کے ساتھ محنت ولگن کی وجہ سے سارے ذمے داروں اور رفقاے کار میں محبوب ہیں۔ اُن کے ۴ لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکوں کے نام یہ ہیں: سید ارشد میاں، حافظ مولانا علی میاں، سید اَطیب میاں، سید حسن میاں۔

حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کے تیسرے صاحب زادے سید شاہد میاں ہیں، جو گریجویٹ ہیں اور کمپیوٹر کے ایک ماہر پروگرامر ہیں اور اِسی لائن میں برسرِ ملازمت ہیں۔ اُن کے ۴ لڑکیاں ہیں۔

حضرت کے ۳ صاحب زادیاں ہوئیں: خالدہ خاتون، عائشہ خاتون اور میمونہ خاتون۔ اول الذکر مولانا قاری قاضی سعید عالم (محلّہ قاضیان مظفر نگر) کے نکاح میں

تھیں۔ قاری سعید عالم مرحوم دارالعلوم وقف میں استاذ تھے۔ دوسری صاحب زادی حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کے منجھلے صاحب زادے مولانا محمد اسلم قاسمی کے نکاح میں ہیں، تیسری صاحب زادی ''ڈھکا'' سنبھل کے جناب بذل الرحمٰن فاروقی کو منسوب ہیں۔ ساری بچیاں صاحبِ اولاد ہیں۔

اشتات سوانح (مولانا سید) محمد میاںؒ

خودنوشت سوانح حضرت مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت الاستاذؒ کا اپنے سلسلے میں اپنے قلم سے لکھا ہوا مضمون، مکمل طور پر درج کردیا جائے، جس میں حضرتؒ کے سلسلے میں اصل اور بنیادی معلومات آگئی ہیں، اِس کی حیثیت دستاویز کی ہے؛ کیوں کہ اُن کی سیرت اور سوانح کے سلسلے میں، جتنا اعتماد اِس پر کیا جاسکتا ہے کسی اور تحریر پر نہیں کیا جاسکتا۔ حضرت نے اِس کا عنوان اپنے قلم سے ''اشتاتِ سوانح محمد میاں'' رکھا تھا، اُن کی وفات کے بعد، اُن کے صاحب زادۂ گرامی مولانا سیّد ساجد میاں مدظلہ نے دارالعلوم دیوبند کے اردو ترجمان رسالہ ''دارالعلوم'' میں اِشاعت کے لیے بھیجا تھا اور وہ مئی ۱۹۷۶ء کے شمارے میں ۱۱ تا ۱۷ اصفحات پر شائع ہوا تھا، ذیلی عناوین کا اضافہ راقم نے کیا ہے تاکہ قاری کے لیے پڑھنے میں سہولت ہو:

خاندان اور ولادت:

محمد میاں ولد سید منظور محمد صاحب عرف ''اچھے میاں'' مرحوم، والدہ محترمہ کا نام ''اِکرام النساء'' بنت سید ریاض احمد، تاریخ پیدائش ۱۲ر رجب ۱۳۲۱ھ مطابق ۴ر اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ مسقط راس: محلّہ پیرزادگان، دیوبند، ضلع سہارنپور۔

تعلیم کی بسم اللہ

والد صاحب محکمۂ نہر میں ملازم تھے، قیام دیہات میں رہتا تھا، احقر بھی مع والدہ محترمہ اُنھی کے ساتھ رہتا تھا۔ پانچ یا چھ برس کی عمر ہوئی تو احقر کی تعلیم کی فکر ہوئی، موضع ''بچولہ'' ضلع ''بلند شہر'' جو والد صاحب کا ہیڈ کوارٹر تھا چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں کوئی تعلیمی اِدارہ نہیں تھا، تو محترمہ نانی صاحبہ نے شفقت فرمائی اور والدین کی درخواست پر اُنھوں نے بسم اللہ کرادی، نانی صاحبہ بہت صالحہ وصابر وشاکر خاتون تھیں، میری والدہ اور میرے ماموں سید بشیر احمد (مولانا حافظ سید محمد اعلیٰ صاحب کے والد) یہ دو بچے ہی ہوے تھے کہ نانا صاحب کا انتقال ہوگیا، بیوگی کے دور میں بھی، اُن دونوں بچوں کی پرورش کی، صوم وصلاۃ کے علاوہ اوراد کی بھی پابند تھیں، سونے سے پہلے سورۂ ملک اور غالباً سورۂ واقعہ کے علاوہ ایک طویل مناجات پڑھنے کا معمول تھا، جس میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں۔

آگے کی تعلیم اور دار العلوم سے فراغت

والد صاحب مرحوم، اس تاریک قریہ میں تھوڑے عرصے رہے، پھر موضع ''ٹنڈ ھیڑہ'' ضلع مظفر نگر اُن کا تبادلہ ہوگیا، جہاں دینی تعلیم کا مکتب تھا، احقر مکتب میں داخل کردیا گیا، پھر والد صاحب کا قصبہ ''بسونہ'' تبادلہ ہوا وہاں ایک صاحب تھے، خلیل احمد صاحب اُن کا اسم گرامی تھا، پیشہ چرم دوزی تھا؛ مگر فارسی کی قابلیّت بہت عمدہ تھی، یہ احقر قرآن شریف ختم ہونے پر موصوف کے حوالہ کیا گیا کہ فارسی پڑھائیں؛ مگر یہ عارضی انتظامات تھے اور چوں کہ تقریباً چھ ماہ بعد والد صاحب کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، تو یہ انتظامات بھی ناکافی رہتے تھے، تو اَب والد صاحب مرحوم نے متعلقین کو دیوبند ہی بھیج دیا کہ احقر کی تعلیم کا انتظام ہو سکے، خاندان کے نئے رواج کے مطابق، احقر کو انگریزی

پڑھانے کے لیے سرکاری اسکول میں داخل کرانا چاہیے؛ مگر انگریزی تعلیم کے مصارف ناقابلِ برداشت سمجھے گئے اور احقر دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی میں داخل کر دیا گیا، جہاں تعلیم مفت تھی، یہ غالباً ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے، درجاتِ فارسی کی تکمیل کے بعد احقر درجاتِ عربی میں داخل ہوا ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۵ء میں احقر فارغ ہوا۔ دورۂ حدیث میں میرے گرامی قدر استاذ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جن کے فیوضِ علمی سے مجھ پر علم و حقیقت کی راہ کھلی۔

تدریسی سلسلہ اور اُس کی تقریب

مارچ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ میں جمعیۃ علماے ہند کا دوسرا اجلاس زیرِ صدارت علامہ سیّد سلیمان ندوی(۱) رحمۃ اللہ علیہ ہوا تھا، حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کے جملہ اکابر اِس میں شامل ہوے، واپسی پر ''آرہ شاہ آباد'' کے اسٹیشن پر مدرسہ حنفیہ آرہ شاہ آباد کے ارکان نے صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند: حضرت علامہ کشمیری سے ایسے مدرس کی فرمایش کی، جو عربی تقریر و تحریر کی مشق اور خصوصاً فنِ ادب کی اونچی کتابیں پڑھا سکے، حضرت موصوف دیوبند واپس ہوے، تو حضرت شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علی صاحب کے مشورے سے اِس خدمت کے لیے احقر کو منتخب کیا گیا، احقر نے تقریباً ساڑھے تین سال آرہ میں قیام کیا، اول اول کچھ مشکلات پیش آئیں، پھر نہ صرف مدرسے کے حضرات؛ بل کہ شہر کے بھی بہت سے حضرات احقر سے مانوس ہو گئے، صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کے علما اور بزرگوں سے بھی کچھ تعارف ہو گیا؛ مگر احقر اس مدرسے سے خاطر برداشتہ رہا؛ کیوں کہ اِس مدرسے کو سرکاری ایڈ ملتی تھی اور بہار یونیورسٹی کے درجاتِ فاضل وغیرہ کی تیاری بھی یہاں کرائی جاتی تھی، یہ دونوں باتیں دارالعلوم دیوبند کے اصول کے خلاف تھیں، احقر کے اکابر جو

(۱) پیدایش: ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء۔ وفات: ۱۴؍ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲؍ نومبر ۱۹۵۳ء۔

دارالعلوم کے بااثر اور بارسوخ حضرات تھے، اُنھوں نے اگر چہ وقتی طور پر احقر کا انتخاب فرمادیا تھا اوراس میں شک نہیں کہ اگر احقر وہاں کچھ عرصے اور قیام کرتا تو "شمس الہدیٰ" پٹنہ میں پروفیسر ہوسکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ پروفیسر ہونے کے بعد پرنسپل بھی ہوجاتا؛ کیوں کہ احقر کے تعلقات وسیع ہوگئے تھے اور وہاں پرنسپل شپ کے لیے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں تھی، اُس زمانے میں مولانا محمد سہول صاحبؒ (۱) پرنسپل تھے جو صرف دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور دیوبند وغیرہ میں بااثر استاذ رہ چکے تھے، اُن کے پاس کوئی ڈگری تو کیا ہوتی، وہ بہ ظاہر انگریزی کے حروف سے بھی واقف نہ تھے؛ لیکن احقر کسی ایسے مدرسے کی خدمت کا خواہاں تھا، جو دارالعلوم دیوبند کی طرح سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک ہو۔

مدرسہ شاہی مرادآباد میں

حسنِ اتفاق کہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد میں ایک ایسے استاذ کی ضرورت ہوئی، جو درجاتِ علیا کی تعلیم دے سکے اور دیوبند کے اکابر خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم (۲) دارالعلوم دیوبند نے احقر کی سفارش فرمادی، حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب نے، اِس سفارش کی تایید فرمائی اور مجھے تحریر فرمایا کہ اب ایسے مدرسے میں بھیجا جارہا ہے، جو علم کا مرکز ہے۔

احقر ۱۹۲۸ء کے مارچ میں مدرسہ شاہی پہنچا، یہ وہ زمانہ تھا کہ سائمن کمیشن ہندوستان پہنچ کر ناکام واپس ہوا تھا (۳)۔ مدرسہ شاہی کی فضا احقر کے مزاج کے مطابق

---

(۱) مولانا مفتی محمد سہول بھاگل پوریؒ شیخ الہند کے شاگرد تھے، دارالعلوم میں بھی تین سال صدر مفتی رہے تھے، وفات ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء۔ (امینی)

(۲) متوفی ۴/ رجب ۱۳۴۸ھ۔

(۳) برطانوی حکومت کا یہ کمیشن ۳/ فروری ۱۹۲۸ء کو ممبئی کے ساحل پر اُترا، اور ۳۱/ مارچ ۱۹۲۸ء کو ناکام واپس ہوا۔

تھی، دارالعلوم دیوبند کی طرح یہ مدرسہ بھی سرکاری امداد اور سرکاری اثرات سے پاک تھا، اِس مدرسے کے صدر المدرسین حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱) تھے جو بعد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماے ہند کے صدر ہوے۔

مولانا موصوف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے خاص شاگرد اور سیاسی خیالات میں اُن کے پختہ معتقد تھے (آپ کو حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے بھی شرف تلمذ حاصل تھا اور حضرت علامہ کی تحقیقات علمیہ کا بڑا ذخیرہ آپ کے سینے میں محفوظ تھا) تحریکِ خلافت میں اگرچہ جیل نہیں گئے؛ مگر کام بہت کیا، زیادہ تر آپ ہی کی خدمات تھیں، جن کی وجہ سے مدرسہ شاہی نے، سیاسی تحریک کے سلسلے میں خاص امتیاز حاصل کیا۔

سیاسی تحریک میں شرکت کی ابتدا

یہی وہ زمانہ تھا جب تقریباً سات سال کی خاموشی کے بعد تحریک نے پھر کروٹ لینی شروع کی تھی "بارڈولی" (۲) میں ولبھ بھائی پٹیل (۳) نے لگان نہ ادا کرنے کی تحریک چلائی ۱۹۲۹ء شروع ہوا تو بیداری اور بڑھی، کلکتے میں بدیشی کپڑوں کو اکٹھا کر کے آگ لگائی گئی اور مارچ کے مہینے میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک کا اِعلان کر دیا اور "ڈانڈی" (۴) کے مشہور مارچ سے تحریک میں تازہ روح پھونک دی، اُس وقت سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ جمعیۃ علماے ہند نے اِس سوال پر غور کرنے اور مسلمانوں کی صحیح رہ نمائی کے لیے، امروہہ میں اجلاس کیا، مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ

(۱) پیدائش: ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء، وفات: ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ مطابق ۵ اپریل ۱۹۷۲ء۔ (امینی)
(۲) گجرات کے "سورت" ضلع کا ایک قصبہ۔
(۳) سردار ولبھ بھائی پٹیل (۱۸۷۵-۱۹۵۰ء)
(۴) ضلع "نوساری" صوبہ گجرات کا ایک قصبہ۔

اللہ علیہ اِس اجلاس کے صدر تھے۔
مسلمانوں میں ایک جماعت وہ تھی جو تحریکِ آزادی میں شرکت سے پہلے ہندو مسلم معاہدہ کو ضروری سمجھتی تھی؛ لیکن دوسری جماعت، جن کی سربراہ جمعیۃ علماے ہند تھی، اُس کا یقین یہ تھا کہ جدوجہد آزادی ایسا فرض ہے، جو دوسرے برادرانِ وطن سے زیادہ مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، برادرانِ وطن اِس کو صرف سیاسی مسئلہ سمجھتے تھے؛ مگر مسلمانوں کے لیے اِس کی نوعیّت مذہبی مسئلے کی بھی ہے، جس کا مدار کسی معاہدے پر نہیں ہے، علاوہ ازیں وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ برطانیہ کے سیاسی اقتدار؛ بل کہ اُس کی سیاسی جبروت کے دور میں کسی متفقہ معاہدے کا تصور جوے شیر کے تصور سے کم نہیں ہے؛ چناں چہ جیسے ہی جمعیۃ علماے ہند نے امروہہ میں اِجلاسِ عام کا اِعلان کیا، دوسری جماعت، جمعیۃ علماے اسلام کے نام سے کھڑی ہوگئی اور اُس نے بھی اُنھی تاریخوں میں امروہہ میں اپنی جمعیۃ کا اِجلاس کیا۔
بہ ہر حال اِجلاسِ امروہہ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ وہ کانگریس کے دوش بہ دوش تحریکِ آزادی میں گرم جوشی سے حصہ لیں اور اِس کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

جمعیۃ علما مرادآباد کی ذمے داری

احقر کو مدرسہ شاہی مرادآباد میں کام کرتے ہوے، ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ سیاسی فضا میں یہ گرمی پیدا ہوگئی، اُس سال جمعیۃ علما مرادآباد کا بھی انتخاب ہوا تو احقر نائب ناظم بنایا گیا، کچھ دنوں بعد جمعیۃ علماے ہند نے شاردا ایکٹ کی تحریک چلائی، تو احقر نے پوری سرگرمی سے اُس میں حصہ لیا، حتی کہ موٹو وغیرہ خود اپنے ہاتھ سے لکھے، ضابطہ کے لحاظ سے احقر جمعیۃ علماے ہند کے اِجلاس میں شریک نہیں ہوسکتا تھا؛ کیوں کہ اُس کا رُکن نہیں تھا؛ مگر احقر نے سفارشوں کے ذریعے پاس حاصل کرلیا اور اِجلاس میں شریک ہوکر علما کی بحث سنی، کچھ قانون داں، وکیل اور ایک بیرسٹر صاحب اور ایک بڑے

عالم جو سرکار کے حامی تھے، صدر کی اِجازت سے وہ بھی اِجلاس میں شریک ہوے اور جناب صدر نے اُن کو بھی بحث میں حصہ لینے کی اِجازت دی، اُنھوں نے کانگریس کے خلاف تقریریں کیں اور یہ کہ مسلمانوں کو اُس میں حصہ لینا نہیں چاہیے، اُن کے پیش کردہ دلائل اُن کی نظر میں مضبوط ہوں گے؛ مگر احقر کو نہایت لچر معلوم ہوے، جمعیۃ علما کے ارکان میں سے حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب(۱)، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی تقریروں نے احقر کو مُتاَثّر کیا، سید صاحب کی تقریر تاریخی اور سیاسی نوعیت کی تھی اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے مذہبی حیثیت سے روشنی ڈالی تھی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس تجویز کے محرک تھے، آخر میں اُن کی تقریر بھی ہوئی؛ مگر وہ اُس وقت اتنے اونچے درجے کے مُقَرِّر نہیں تھے، رات کو جلسۂ عام ہوا جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کی تقریر ہوئی، غالباً تین گھنٹے تک وہ تقریر جاری رہی، معلوم ہوتا تھا کہ آگ کے شعلوں کی بارش ہو رہی ہے، چیئرز نہیں ہوتے تھے؛ بل کہ مضطربانہ نعرے بلند ہوتے تھے، کچھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، بہ ہر حال احقر جذباتی لحاظ سے اُس تقریر سے مُتاَثّر ہوا۔

اِجلاسِ امروہہ کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ

اِجلاس ختم ہوا اور احقر مرادآباد واپس ہوا اور حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ بھی مرادآباد تشریف لائے، احقر نے چاہا کہ اِجلاس اور جلسہ کی ہماہمی کے علاوہ سکون اور اِطمینان کی صورت میں بھی حضرت شیخ سے استصواب کرے، چناں چہ احقر نے تنہائی میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ کیا مجھے کانگریس میں شریک ہو جانا چاہیے اور تحریک میں حصہ لینا چاہیے؟ مولانا کا جواب لامحالہ اِثبات میں تھا، مزید فرمایا: یورپ خصوصاً گورنمنٹ برٹش نے، دنیا کے بہت سے ممالک کو اپنے تسلط اور چیرہ دستی کے شکنجے میں کس رکھا ہے اور

(۱) پیدائش: ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء، وفات: ۱۳؍ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱؍ دسمبر ۱۹۵۲ء۔

برٹش کی یہ طاقت ہندوستان کی وجہ سے ہے، ہندوستان پر برٹش کی گرفت کچھ بھی ڈھیلی پڑتی ہے، تو اُن کم زور ممالک پر بھی اِس کا اثر پڑتا ہے اور اُنھیں سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔

حضرت شیخ کے اِس ارشاد کے بعد احقر کو پوری طرح انشراح ہو گیا؛ چناں چہ حضرت مولانا فخر الدین صاحب کا دست و بازو بن کر تحریک میں کام شروع کر دیا۔ چند روز میں پورے مراد آباد پر تحریک چھا گئی اور صوبہ سرحد کے بعد صرف شہر مراد آباد کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں کانگریس پر مسلمان چھائے ہوئے تھے، کچھ عرصے بعد مراد آباد میں یوپی کونسل کا ضمنی الیکشن ہوا، تو اس سے بائیکاٹ کی تجویز منظور کی گئی، اُس وقت انتخاب جداگانہ ہوتے تھے امیدوار ایک مسلمان صاحب تھے، تو ووٹر بھی مسلمان ہی تھے، جب پولنگ شروع ہونے کا وقت آیا تو ٹاؤن ہال کے راستوں پر ایک طرف مسلح پولیس کے پیادہ اور سوار جوان تھے دوسری جانب جمیعۃ علما کے رضا کار۔

احقر نے نمازِ فجر کے وقت سے شہر کا گشت کر کے اُن رضا کاروں کو بھیجا تھا، پولنگ شروع ہوا، تو دو گھنٹے بھی نہیں گزر رہے تھے کہ ہڑبونگ شروع ہو گئی، بے قابو مجمع میونسپلٹی کے دفتر میں گھس گیا، پولیس کو بہانہ مل گیا، اُس نے فائرنگ شروع کر دی، پھر لاٹھی چارج کے بہ جائے گھوڑے دوڑا دیے، احقر میدان میں تھا اور آخر تک وہاں رہا اور عجیب وغریب طرح سے گھوڑوں کی ٹاپوں اور فائرنگ کے چھروں سے بچا، فائرنگ بند ہو گئی، تو زخمیوں کو اُٹھوایا، عبدالنبی ایسا مجروح ہوا کہ جاں بر نہ ہو سکا، دوسرے زخمی اچھے ہو گئے، پشاور میں قصہ خوانی بازار کی فائرنگ کے بعد، یہ یوپی میں پہلی فائرنگ تھی، اِس کے تقریباً دو ہفتے بعد احقر کو نیز حضرت مولانا فخر الدین صاحب کو گرفتار کر لیا گیا، ایک ایک سال کی سزا ہوئی؛ مگر مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی، اروِن پیکٹ ہو گیا، جس کی ایک شرط عام رہائی بھی تھی، چناں چہ تمام سیاسی اسیر رہا کر دیے گئے، ہم بھی سال ختم ہونے سے پہلے صرف ساڑھے پانچ ماہ بعد رہا ہو گئے۔

معاہدے کے بعد صرف ایک سال تک سیاسی فضا خاموش رہی؛ لیکن گول میز

کانفرنس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی ابھی تک ہندوستان پہنچنے نہیں پائے تھے کہ نئے وائسرائے لارڈ لنگلڈن کی تشدد پسند پالیسی کی وجہ سے تحریک پھر شروع ہوگئی، کانگریس کی طرح جمعیۃ علماے ہند کے ذمہ دار حضرات مولانا محمد کفایت اللہ صاحب مفتیِ اعظم ہند وصدر مولانا احمد سعید صاحب ناظم عمومی وغیرہ بھی گرفتار کر لیے گئے، کانگریس خلاف قانون قرار دی گئی، جمعیۃ علماے ہند خلاف قانون تو نہیں قرار دی گئی؛ مگر معاملہ اُس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا، دفتر پر بار بار چھاپا مارا گیا۔ تلاشی لی گئی، کانگریس نے ورکنگ کمیٹی اور صدر کے بہ جائے ڈکٹیٹر شپ جاری کی تھی، اِسی طرح مرکزی جمعیۃ علما نے بھی ڈکٹیٹر بنانے کا سلسلہ شروع کردیا، مرکزی جمعیۃ علما کے آٹھ ڈکٹیٹر گرفتار ہو چکے، تو احقر کو بھی اِس منصبِ جلیل پر فائز کیا گیا، ادھر پراونشل کانگریس کمیٹی نے صوبائی کانگریس کا ڈکٹیٹر احقر کو بنا دیا۔

مرادآباد سے دہلی آکر جامع مسجد میں ہر جمعہ کو تقریر کی ڈیوٹی کی انجام دہی اور گرفتاری

اُس زمانہ میں ڈیوٹیاں مقرر کردی گئی تھیں، جمعیۃ علما کے ہائی کمانڈ حضرت مولانا سجاد صاحب نے احقر کی ڈیوٹی یہ مقرر کی تھی کہ ہر جمعہ کو مرادآباد سے آکر نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد (دہلی) میں تقریر کرے اور فوراً واپس ہو جائے۔ کئی ہفتے اِسی طرح کرتا رہا، بالآخر پولیس نے قابو پالیا اور احقر کو کوتوالی کے سامنے سے گرفتار کر کے حوالات میں بند کردیا، یہ اگست کا مہینہ تھا، بارشیں ہو رہی تھیں، مگر تب بھی گرمی سخت تھی بالخصوص اُس ہال میں جس میں صرف ایک طرف دروازہ تھا، احقر کے علاوہ ۸ مولوی صاحبان اور طلبۂ عربی اور بھی تھے جو اس ہال میں بند کردیے گئے تھے، صرف ایک گھنٹے کے لیے صبح کو ضروریات کے لیے باہر لایا جاتا تھا، وضو وغیرہ سب اندر کرنا ہوتا تھا، نالی نہیں تھی، تو آدھے ہال میں پانی بھر گیا، آدھے ہال میں فرشِ زمین پر آٹھ آدمیوں کے بستر ے تھے،

اس وقت مقدمہ نہیں چلایا گیا؛ بل کہ ایک ہفتہ بعد نوٹس تعمیل کرایا گیا کہ چھ ماہ تک دہلی نہیں آسکتے اور پولیس کی حراست میں شاہدرہ پہنچادیا گیا، رہائی کے بعد احقر مرادآباد پہنچا اور چند روز بعد کانگریس اور جمعیۃ علما کے پروگرام کے بہ موجب ایک ہاتھ میں کانگریس کا اور دوسرے میں جمعیۃ علما کا جھنڈا لگاکر دفعتاً چوک میں نمودار ہوا، کانگریس اور جمعیۃ علما کے ممبر اور رضا کار جو اِدھر اُدھر مکانوں اور دوکانوں میں چھپے ہوے تھے، وہ بھی نکل آئے اور جلوس بنا کر مارچ شروع کردیا، یہ جلوس تقریباً دوفرلانگ چلا تھا کہ پولیس نے آکر قائدِ جلوس (احقر) کو گرفتار کرلیا، پھر لاٹھی چارج کرکے جلوس کو منتشر کردیا؛ لیکن اگلے روز سترہ کارکن گرفتار کرلیے، جو کانگریس کے لیڈر تھے۔ مقدمہ جیل میں بھی چلا؛ مگر پالیسی یہ تھی کہ پیروی نہ کی جائے؛ لہٰذا کیدار ناتھ صاحب بیرسٹر جو از راہِ ہمدردی پیروی کے لیے تشریف لے آئے تھے، اُن کو بھی ہم نے واپس کردیا، اِس کے بعد جب رہائی ہوئی، تو تحریک نے نیا رنگ اختیار کرلیا تھا، اُس وقت جو اختیارات ہندوستان کو دیے گئے تھے، اگرچہ وہ اطمینان بخش نہیں تھے؛ مگر کانگریس کی اکثریت نے الیکشن میں حصہ لینا طے کرلیا تھا، چناں چہ اِسی کے نتیجے میں غالباً ۱۹۳۷ء میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوگئیں؛ لیکن تقریباً دوسال بعد ہٹلر نے حملہ کرکے یوروپ میں جنگ شروع کردی، برٹش اس کا حریف تھا، برطانیہ عظمیٰ نے ہندوستان کی رائے لیے بغیر، ہندوستان پر بھی جنگ مسلط کردی، کانگریس اور جمعیۃ علماے ہند دونوں جماعتوں نے اِس کی مخالفت کی اور عملی طور پر گاندھی جی نے، انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام تجویز فرمادیا۔

''علماے ہند کا شان دار ماضی'' کی اِشاعت اور ضبطی

اُسی زمانے میں احقر کی کتاب ''علماے ہند کا شان دار ماضی'' طبع ہوئی، جو ضبط کی گئی، پریس بھی ضبط کرلیا گیا، مصنف کو گرفتار کرکے معمولی ضمانت پر رہا کردیا گیا، احقر محمد میاں انفرادی ستیہ گرہ کے سلسلے میں نہیں؛ بل کہ اُس کتاب کے سلسلے میں گرفتار ہوکر

سزایاب ہوا۔ مرادآباد کانگریس نے احقر کی سزایابی کو تحریک کے سلسلے میں شمار کیا۔

''شان دار ماضی'' کی تصنیف کے مقصد دو تھے: اول یہ کہ سیاسی تحریک میں علما کی شرکت کو علما کی شان کے خلاف ایک طرح کی بدعت قرار دیا جارہا تھا۔ اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے کہ علما نے ہر دور میں اُس دور کی سیاست کے مطابق عملی حصہ لیا اور سزائیں بھگتی ہیں؛ لہٰذا اِس دور میں اِس دور کے تقاضے کے مطابق، تحریک میں حصہ لینا علما کی شان کے خلاف نہیں؛ بل کہ اُن کی تاریخی روایات کو زندہ کرنا ہے، دوسرا مقصد تحریک آزادی کو تقویت دینا تھا؛ اِسی لیے اُن مظالم کی تاریخ بیان کی گئی تھی، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے آغاز سے اِس وقت تک انگریزوں نے کیے تھے، اِس مقدمہ میں، طویل سزا ہوسکتی تھی مگر چوں کہ جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ شائع شدہ کتابوں کے حوالے سے لکھا گیا تھا اور وکلا صاحبان نے مجسٹریٹ صاحب کو یہ ذہن نشین کرادیا تھا کہ مطبوعہ اور شائع شدہ مستند حوالے سے جو بات بیان کی جائے وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، وہ قابلِ اعتراض نہیں۔ اِس کے علاوہ چند الفاظ جو فی الواقع مُہذّب تصنیف میں آنے کے قابل نہیں تھے اور جذبات کی رو میں احقر سے لکھ گئے تھے، اُن الفاظ سے احقر نے تحریری معذرت پیش کردی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف تا برخواست اجلاس احقر کو سزا دی گئی، اِس طرح پولیس کی بات بھی رہ گئی۔

۱۹۴۲ء میں گرفتاری اور جیل اور ۱۹۴۴ء میں رہائی

۸/اگست ۱۹۴۲ء کو وہ تحریک شروع ہوئی، جس کا نام کوئٹ انڈیا، والی تحریک مشہور ہوا۔ اُس وقت پالیسی یہ تھی کہ کام خفیہ طور سے کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، اپنے آپ کو بچایا جائے، چناں چہ جیسے ہی احقر کو معلوم ہوا کہ مرادآباد میں گرفتاریاں ہورہی ہیں، احقر مرادآباد سے باہر نکل آیا، اول ایک گاؤں میں رہا، پھر دہلی پہنچ کر مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی، پھر مجلس عاملہ کی تجویز جس میں تحریکِ

آزادی میں شرکت کے لیے مسلمانوں کو اُبھارا گیا تھا، چھپوا کر اُس کی تقسیم کرنے کے لیے، یو پی کا دورہ کیا، بہار جانے کا ارادہ تھا؛ مگر بارش اور تحریک کے کارکنوں نے ریلوے لائن کو اِس درجہ خراب کر دیا تھا کہ مغل سرائے سے آگے گاڑیاں نہیں جا رہی تھیں، مجبوراً واپس ہوا، دہلی میں قیام مشکل تھا خصوصاً اِس بنا پر کہ یہاں کی پولیس کو احقر کے متعلق خیال ہو گیا تھا کہ بم بنانے والی پارٹی سے میرا تعلق ہے؛ لہٰذا دوسرے مقامات سے گم نام ہینڈ بل اور پمفلٹ شائع کرنے شروع کیے، کچھ کاربن سے لکھ کر خاص خاص مرکزوں میں بھیجا کرتا تھا، اِسی طرح کا ایک پمفلٹ پشاور پہنچ گیا، وہاں کالج کے نوجوانوں نے میرے نام کے حوالے سے، اس کو چھپوا کر تقسیم کیا، وہ مضمون یو پی کی پولیس کو مل گیا، یا صوبہ سرحد کی پولیس نے بھیجا، بہ ہر حال اِس طرح کی سرگرمیوں کی بنا پر اکتوبر۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لیا گیا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ایک تقریر کی بنا پر جو آپ نے بچھراؤں، ضلع مراد آباد میں کی تھی، اپریل ۱۹۴۲ء میں گرفتار کر لیے گئے تھے، اُس وقت کانگریس کی پالیسی یہ تھی کہ گرفتاری کے خلاف مقدمہ کی پیروی کی جائے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مراد آباد جیل کی حوالات میں تھے، نہ صرف اِس مقدمہ؛ بل کہ اِس طرح کے تمام مقدمات کی پیروی احقر نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، اِس پیروی کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا تھا؛ کیوں کہ جج حکومت کی منشا کے مطابق فیصلہ کیا کرتے تھے؛ مگر یہ نتیجہ ظاہر تھا اور مقصود تھا کہ لوگوں میں جذبات پیدا ہوں اور بڑھیں۔ حضرت مولانا کے مقدمے میں بحث کے لیے مسٹر آصف علی سے احقر نے درخواست کی، اُنھوں نے منظور فرمالی اور مراد آباد پہنچ کر کٹہرۂ عدالت میں تقریباً چار گھنٹے مسلسل تقریر کی، مراد آباد کے تمام وکلا اس بحث کو سننے کے لیے، اس عدالت میں سمٹ آئے تھے، بہ ہر حال اس شان دار بحث کے باوجود فیصلہ میں چھ ماہ کی سزا بامشقت تجویز کی گئی۔ ابھی حضرت شیخ کی یہ سزا ختم نہیں ہوئی تھی کہ ۸/ اگست آ گیا اور مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن

صاحب، حافظ محمد ابراہیم صاحب نگینوی (جو کانگریس گورنمنٹ کے وزیر رہ چکے تھے اور آیندہ وزیر ہونے والے تھے) قاری عبداللہ صاحب مرحوم مولانا محمد اسماعیل سنبھلی، منشی معین الدین صاحب سنبھلی، محمد ابراہیم صاحب مالک کارخانہ بیڑی مراد آباد وغیرہ، حضرت شیخ کے پاس پہنچ گئے، پھر احقر حاضرِ خدمت ہو گیا، تھوڑے دنوں یہ مجمع مراد آباد جیل میں رہا، پھر کچھ کو رہا کر دیا گیا، جو باقی رہے اُن کو منتشر کر دیا گیا، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی کو نینی سینٹرل جیل اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور احقر محمد میاں کو بریلی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا، تقریباً دو سال گزارنے کے بعد ۱۹۴۴ء کے اکتوبر میں رہائیاں شروع ہوئیں، پہلے احقر پھر مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب، پھر حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ رہا ہوے، اِس کے بعد گرفتاری کی نوبت نہیں آئی، تقریباً دو سال تک صوبائی کونسلوں پھر مرکزی اسمبلی کے انتخابات رہے، جو مسلم لیگ کے شدید مقابلے کی بنا پر نہایت سخت تھے، مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے جمعیۃ علما اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا، جس میں جمعیۃ علما کے علاوہ مجلسِ احرار اسلام، مسلم مجلس، صوبہ سرحد کے خدائی خدمت گار، مومن کانفرنس وغیرہ آزادی پسند جماعتیں شریک تھیں۔ احقر کبھی کسی سیٹ کا امیدوار تو نہیں بنا؛ مگر تمام امیدواروں کی خدمت دفتری حیثیت میں احقر کی زیرِ نگرانی تھی، یہ ہنگامے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کے یومِ آزادی پر ختم ہو گئے، جس کے بعد فرقہ واریت کے وہ ہنگامے شروع ہو گئے، جو آج تک ختم نہیں ہوے، اُن کی داستان طویل بھی ہے اور دردناک بھی، اُن ہنگاموں نے خدمات کا ایک نیا باب قائم کیا، جس کا عنوان ریلیف ہے، یعنی کشتگانِ ستم کو دفنانا، مجروحوں کے جسم پر دوا کی پٹیاں باندھنا اور زخمی دلوں پر تسکین اور دل داری کا مرہم لگانا، اُجڑے ہوؤں کو بسانا اور ان کاموں کے لیے لوگوں سے بھیک مانگنا، پھر مظلوموں اور اُن کی ضرورتوں کو پہنچانا اور بہ تقاضاے حالات، اُن کی امداد کرنا۔ احقر نے ان خدمات میں بھی حصہ لیا؛ مگر ان کو کہاں تک بیان کیا جائے:

عمر بگذشت وحدیثِ دردِ ما آخر نہ شد
شب آخر شد اکنوں کوتاہ کنم افسانہ را

مختصر تذکرہ خدمات جمعیۃ علمائے ہند کے متعدد نمبروں میں، اس کے علاوہ علمائے حق جلد دوم میں اِن سب واقعات کا تذکرہ ہے، جو ملاحظہ فرمایا جائے۔

سوانحی نقوش

❁ اسم گرامی: (مولانا) سیّد محمد میاں بن سیّد منظور محمد بن سیّد یوسف علی بن سیّد محمد علی بن سیّد ظہور ولی بن سیّد محمد فردوس بن سیّد شاہ شبلی بن حضرت بندگی محمد اسماعیل بن حضرت سیّد محمد ابراہیم قدس اللہ سرہ بن سیّد سعد اللہ بن سیّد محمود قلندر بن سیّد احمد بن سیّد فرید بن وجیہ الدین بن علاء الدین بن سیّد احمد کبیر بن سیّد شہاب الدین بن حسین علی بن عبدالباسط بن ابوالعباس بن اسحاق عندلیب المکی بن القاری حسین علی ہادی بن لطف اللہ بن تاج الدین احمد بن حسین بن علاء الدین بن ابی طالب بن ناصر الدین احمد بن نظام الدین حسین بن موسیٰ بن محمد الاعرج بن ابی عبداللہ احمد بن موسیٰ المبرقع بن محمد تقی بن موسیٰ علی رضا بن موسیٰ کاظم بن جعفر صادق بن محمد باقر بن زین العابدین بن ابی عبداللہ الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ و سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا بنتِ سرورِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ۔ (۱)

گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں خاندانِ سادات کے ایک بزرگ سید محمد ابراہیم (متوفی ۵/شوال ۱۰۳۴ھ مطابق ۲۲/جون ۱۶۲۵ء نے بعض اہل اللہ کے مشورے سے، اسلام کی دعوت وتبلیغ اور رشد وہدایت کے لیے دیوبند کا انتخاب فرمایا۔ دیوبند میں سیّد صاحب کے قیام کے لیے دہلی کی مغلیہ حکومت کی طرف سے مسجد اور وسیع خانقاہ تعمیر کرائی گئی، جس میں اِفادۂ باطنی کے حلقے کے ساتھ ساتھ، علومِ ظاہری کی تعلیم وتعلم کی مسند بھی بچھی ہوئی تھی۔ (۲)

❁ ولادت: ۱۲/رجب ۱۳۲۱ھ = ۴/اکتوبر ۱۹۰۳ء۔

❁ جائے ولادت: محلّہ ''سرائے پیرزادگان'' دیوبند، سہارنپور، یوپی۔

---

(۱) تذکرہ سادات رضویہ دیوبند، ص:۳۰ وص:۲۵۔ مصنفہ سیّد محبوب رضوی (متوفی ۲۵/مارچ ۱۹۷۹ء) شائع کردہ علمی مرکز دیوبند۔

(۲) تذکرہ سادات رضویہ، ص:۳۰۔

❁ تعلیم: تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا، نانی صاحبہ سے قرآن پاک وغیرہ پڑھا، اردو اور فارسی کی بعض کتابیں ''ٹنڈھیڑہ''، ضلع مظفر نگر اور قصبہ ''بسونہ'' میں خلیل احمد سے پڑھیں۔ ۱۹۱۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں درجۂ فارسی میں داخل ہوئے، اُس کو عبور کرنے کے بعد درجات عربی میں داخل ہوئے ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے، دورۂ حدیث میں آپ کے استاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء) تھے۔ اُن کے علاوہ آپ کے اساتذہ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء-۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ (۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء-۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندیؒ (۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء-۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۴ء) مولانا غلام رسول ہزارویؒ (متوفی ۱۸ر محرم ۱۳۳۷ھ = ۲۵ر ستمبر ۱۹۱۸ء) جیسے اَساطین رُوزگار بھی تھے۔

❁ بچپن میں قرآن پاک حفظ نہیں کر سکے تھے، یہ سعادت جدوجہدِ آزادی کے زمانے میں قید و بند کی صعوبتوں کے دوران حاصل کی۔

❁ اصلاحی تعلق: تزکیۂ نفس کے لیے، آپ نے شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی سے تعلق قائم فرمایا اور اُن سے بیعت ہو کر اِحسان کی منزلیں طے کیں اور اِجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

❁ درس وتدریس: تدریس کی ابتدا آپ نے ''مدرسہ حنفیہ'' شہر ''آرہ'' سے کیا، یہاں آپ نے یہ خدمت ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک انجام دی۔ مارچ ۱۹۲۸ء (شوال ۱۳۴۷ھ) سے مدرسہ شاہی مراد آباد میں درس وتدریس کی خدمت انجام دینی شروع کی۔ یہاں سے آپ مدرس، مفتی، منتظم، مہتمم اور رکن شوریٰ ورکن عاملہ کی حیثیت سے تاحیات وابستہ رہے، حتی کہ دہلی میں جمعیۃ علما کے ناظم اور مدرسہ امینیہ کے شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران بھی۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں آپ نے بہ حیثیت مدرس و مفتی و منتظم ۱۶ر سال با قاعدہ قیام فرمایا۔

❁ جمعیۃ علمائے ہند کی خدمت کے لیے دہلی آمد: ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ کی خدمت کے لیے دہلی آئے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ آزادی و تقسیم ملک کے بعد مستقلاً دہلی میں قیام فرمالیا، دہلی آمد کے بعد، مدرسہ شاہی کے رکن شوریٰ منتخب ہوئے، ۱۳۸۰ھ میں اِعزازی مہتمم ہوئے، ۱۳۹۵ھ میں صدر مہتمم بنائے گئے۔ ۱۹۳۰ء میں جمعیۃ مراد آباد کے ناظم بنے، پھر ناظم ہوئے، پھر ناظم شعبۂ تبلیغ جمعیۃ صوبہ آگرہ ہوئے، پھر ناظم جمعیۃ آگرہ، پھر ناظم صوبہ آگرہ واودھ منتخب ہوئے۔ ۴-۷ر مئی ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ کے اجلاس سہارنپور میں جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم منتخب ہوئے، مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے انتقال کے معا بعد، ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند منتخب کیے گئے، مگر صرف ایک سال ہی اِس عہدے پر فائز رہ کر اِس سے سبک دوش ہو گئے، پھر رکن عاملۂ جمعیۃ منتخب ہوئے اور جمعیۃ ٹرسٹ کے ناظم اور اِدارۂ مباحثِ فقہیہ کے مدیر کے عہدوں پر تا

حیات فائز رہے۔

❁ **شیخ الحدیث وصدر مفتی مدرسہ امینیہ دہلی:** ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں دہلی کی مشہور عالم درس گاہ اور علامہ مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ کی یادگار مدرسہ امینیہ دہلی میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی کے عہدے پر فائز ہوے اور تا حیات یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

❁ **جدوجہد آزادی میں حصہ:** آزادیِ وطن کی سرگرمیوں میں آپ نے سرگرم حصہ لیا اور مرادآباد، دہلی، میرٹھ، بریلی، فیض آباد کی جیلوں میں قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں۔

❁ **مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے کی سعیِ مشکور:** ہنگامۂ آزادی کے دوران، جہاں جہاں سے مسلمان ہجرت کر گئے تھے، وہاں ارتداد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور بہت سے مسلمان ایمان کے حوالے سے متزلزل ہو گئے تھے۔ مشرقی پنجاب، ہماچل پردیش اور راجستھان کا ایک بڑا علاقہ، اِس صورت حال سے دوچار ہو گیا تھا، آپ نے وہاں شبانہ روز محنت کی اور گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو ڈھارس بندھائی اور ایمان پر اُنھیں قائم رکھنے کی ٹھوس جدوجہد کی اور مکاتب کے جال کے ذریعے، وہاں دینی تعلیم وتبلیغ کا باقاعدہ نظام قائم فرمایا۔

❁ **وفات:** بہ روز چہار شنبہ: ۶ر شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء شام ساڑھے چار بجے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ غفر له الله وأدخله فسيح جنّاته۔ ''گورِ غریباں'' قبرستان میں (جو آج کل کے آئی ٹی او کے علاقے میں، جمعیۃ علماے ہند کے مرکزی دفتر واقع مسجد عبد النبی کے قریب واقع ہے) تدفین عمل میں آئی (۱)۔



(۱) اِس مضمون کو، راقم الحروف نے بہ راہِ راست اردو میں یک شنبہ: ۱۷ر شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق ۹ر اگست ۲۰۰۹ء کو لکھنا شروع کیا تھا۔ رمضان المبارک میں اس کا اکثر حصہ تحریر ہو گیا تھا؛ لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی وجہ سے، اِس کی تکمیل سہ شنبہ: ۲۹ر ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۶ر مارچ ۲۰۱۰ء کو ہو سکی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ

۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء—۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء

یاد سے تیری ، دلِ دردآشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں ، دعاؤں سے فضا معمور ہے

یک شنبہ: ۶ رشوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ٹھیک پونے ۱۲ بجے، میں ''الداعی'' کے دفتر میں بیٹھا، حسبِ معمول تحریری کاموں میں منہمک تھا کہ دارالعلوم دیوبند کی مسجدِ قدیم (جو صدر گیٹ پر اِحاطۂ دفتر میں واقع ہے) کے مناروں پر نصب مائک کے بھونپوؤں سے اچانک، پہلے کسی گھبرائے ہوے اِنسان کی سانسوں کی آہٹ محسوس ہوئی، پھر اُس نے عجیب وغریب منفرد لہجے اور غم والم انگیز وبھرائی ہوئی آواز میں یہ اِعلان کرکے، سارے اساتذہ وطلبہ وحلقۂ علم وعلما پر بجلی گرادی کہ ابھی ابھی ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم، ملّتِ اسلامیّہ کی آبرو، برِّصغیر کے سب سے بڑے عالم، ترجمانِ دین، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ اِعلان کنندہ شخص، تقریباً دس منٹ تک اِن الفاظ کو بار بار دہراتا رہا؛ لیکن جیسا کہ ہر بڑے اور غیر معمولی اِنسان کی موت پر ہوا کرتا ہے کہ لوگوں کو تادیر اُس کی وفات کا یقین نہیں آتا اور وہ یہ تمنّا کرتا ہے کہ کاش اِس اِعلان کنندہ اور موت کی خبر دینے والے کی خبر غلط ثابت ہو اور بعد میں یہ ثابت ہو کہ اُس نے غلط فہمی سے، اُس کی موت کا اعلان کردیا تھا، الحمدللہ وہ حسبِ سابق صحیح سالم ہے، بیہوشی کو لوگوں نے موت باور کرلیا تھا۔

دارالعلوم میں، شہر دیوبند میں اور قرب وجوار کے تمام شہر و دیہات میں جس نے،

جہاں یہ خبر سنی وہ حیرت زدہ رہ گیا، ہر طرف سناٹا چھا گیا اور غم و اَلم کی شدید لہر دوڑ گئی۔ سارے انسانوں کا رُخ حکیم الاسلامؒ کے دولت کدے کی طرف تھا، جو اُنھیں موت کے بعد ایک نظر دیکھنے اور اُن کے پس ماندگان بالخصوص اُن کے صاحب زادوں سے تعزیت کے لیے بے تاب نظر آرہے تھے۔ انتقال کے دو ہی گھنٹے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی نے اِس عظیم اِنسان کی وفات کی خبر نشر کردی اور ہندو بیرونِ ہند کے کونے کونے میں لوگوں کو، اُسی دن معلوم ہوگیا کہ بلبلِ اِسلام، جو برسوں اِسلامی شریعت وحکمت اور علم وعرفان کی اپنی شیریں اور مشک وعنبر سے دھلی ہوئی زبان سے حدی خوانی کرتا رہا، وہ اب اِس دنیا میں نہیں رہا۔

یک شنبہ و دوشنبہ: ۶-۷ شوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷-۱۸ر جولائی ۱۹۸۳ء کی درمیانی شب میں آل انڈیا ریڈیو نے تفصیل سے اُن کی زندگی پر روشنی ڈالی اور اُن کے متعدّد مُعاصِرین کے، اُن کے حوالے سے ذاتی تأثُّرات نشر کیے، نیز ریڈیو پاکستان اور برِّصغیر کے تمام اَخبارات ورسائل نے، جلی عنوان کے ساتھ حکیم الاسلام کے انتقالِ پُر ملال کی خبر شائع کی اور بہت سے اہلِ قلم کے تأثُّراتی اور سوانحی مضامین بھی چھاپے۔

یک شنبہ و دوشنبہ: ۶-۷ شوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷-۱۸ر جولائی ۱۹۸۳ء کی شب میں عشا کی نماز کے فوراً بعد، دارالعلوم دیوبند کے مشہور اِحاطۂ مولسری میں، اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں ہزاروں اساتذہ وطلبہ وعلما و باشندگانِ شہر اور مختلف اَطراف سے آئے ہوئے علما و صلحا اور عام مسلمانوں نے شرکت کی اور مقبرۂ قاسمیہ میں تدفین عمل میں آئی، جس میں بانیِ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ اکثر اکابرِ دارالعلوم تا روزِ حشر محوِ خواب ہیں، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُمْ وارْحَمْهُمْ وَأَدْخِلْهُمْ فَسِيْحَ جنَّاتِكَ مَعَ الأَنْبِيَاءِ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ وَحَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيْقًا .

اسبابِ، اُٹھائے

رختِ ہستی خاک، غم کی شعلہ اَفشانی سے ہے

بہ وقتِ وفات حضرت کی عمر ۸۸ سال تھی؛ اِس لیے کہ آپ کا سنۂ ولادت ۱۳۱۵ھ/

۱۸۹۷ء ہے۔ شدید بڑھاپے اور اُس کے مختلف الانواع عوارض کی وجہ سے خاصے نحیف وناتواں ہوگئے تھے۔ رہی سہی کسر ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء تک جاری رہنے والے دارالعلوم کے قضیۂ نامرضیہ نے پوری کردی تھی، جس کی وجہ سے آپ ہڈیوں کا ڈھانچہ محسوس ہوتے تھے؛ لیکن تادمِ وفات آپ کے ذہنی قویٰ علی حالہ کام کرتے رہے، جو آپ کے صلاح وتقویٰ، علومِ شریعت کی تاحیات خدمت کی برکت اور عنداللہ مقبولیت کی دلیل ہے۔ وفات والے دن آپ حسبِ معمول بیدار ہوئے، حوائجِ بشریّہ سے فراغت اور وضو کے بعد آپ نے نمازِ فجر ادا کی، روزانہ کی طرح قرآنِ پاک کی اُتنی ہی تلاوت کی جتنی آپ کرتے تھے، دگر بعض وہ کام بھی آپ نے کیے، جو آپ کے معمولات میں داخل تھے۔ صبح دس بجے آپ نے ایک بڑے ڈاکٹر کو بلوایا اور موت سے ذرا پہلے پیش آمدہ اَحوال اُس کو بتایا، ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا، ابھی چند منٹ بھی گزرے نہ تھے کہ نبض کی رفتار ازخود کم زور پڑتی گئی، اور دو چار منٹ کے اندر ہی روح قفصِ عنصری سے پرواز کرگئی، ایسا لگا جیسے اللہ نے اپنے اس نیک اور وارثِ علم وعمل بندے کو بہت آرام کی نیند روزِ محشر تک کے لیے سلادی اور سکرات کی بہ ظاہر اُن سختیوں سے نہیں گزارا، جن سے عموماً نہ صرف ہر فردِ بشر؛ بل کہ نیک لوگوں اور علومِ شریعت کے حاملین کو بھی گزرنا پڑتا ہے۔

برِّصغیر کی دینی ریاست کا اَمیر

حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو برِّصغیر میں بلا اختلاف دینی سرداری اور ریاست حاصل تھی، دین وملت کی کوئی مجلس بپا ہو، اُمتِ اسلامیہ ہندیہ کی کوئی تنظیم تشکیل پائے، علم ودانش کی کوئی بزم سنواری جائے، مذہب وملت کی بقا وترقی کے لیے کوئی منصوبہ بنایا جائے، اسلام اور مسلمانوں پر آنے والی کسی آنچ کو بجھانے کی کوئی اجتماعی تدبیر کی جائے؛ ہر موقع سے اُس کی صدارت وقیادت کے لیے نظرِ انتخاب اُسی علم کے پتلے، حکمت کی

شبیہ، روحِ شریعت کے اپنے وقت کے ممتاز جان کار اور سب سے بڑے شارح اور اِسلام کی ناطق زبانِ فیض ترجمان پر پڑتی اور لوگ بالاتفاق، اُسی کو صدر نشین بناتے۔ وہ اپنے چہرے بشرے، اپنی ہیئتِ کذائی، فطری وقار، طبعی شرافت، ہر سمت سے پھوٹتی ہوئی علمی کرنوں، علم وصلاح وزہدِ تقویٰ کی بے پایاں روشنی سے منوّر مکھڑے، جس سے اُن کا پورا وجود روشن دِکھتا تھا اور اپنی ملکوتی معصومیت؛ کی وجہ سے وہ از خود ہر مجلس کے صدر اور ہر بزم کے سرپرست لگتے تھے۔

مثالی سراپا

گورا چٹا سرخی گھلا ہوا اور صباحت کی مثال کتابی وبیضوی آمیزے کا چہرا، کھڑی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، گھنیریں بھنویں، متوسط القامت، نحیف الجسم، مستقیم القد وجود، گھنیری داڑھی، سر پر دو پلّی ممتاز طور پر کھڑی ٹوپی، جو اُن کی شانِ امتیاز تھی، جاڑے اور گرمی دونوں موسموں میں بہ وقتِ ضرورت وخواہش خوب صورت جاذب رنگ کی شیروانی، ہاتھ میں اُن کے ذوقِ لطیف کی غماز خوب صورت سی چھڑی، ہونٹوں پر ہلکی گلابی جو قدرتی گلابی سے گھل مل کر مزید پر کشش ہو جاتی تھی، اوپر کی جیب میں نستعلیق سا قلم، چال میں عالمانہ شان، نشست وبرخاست میں دین دارانہ امتیاز، حرکات وسکنات سے صالحانہ عظمت ووقار کا ترشّح، بات میں متوازن دھیما پن، عام مجلس ہو یا بزمِ خاص ہر جگہ علم وفضل کی بارش۔ بیٹھے ہوں، یا چل رہے ہوں یا کھڑے ہوں، لوگ اُن کی دید سے اِتنے محظوظ ہوتے کہ جس کی نظیر، مَیں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ سلوک وبرتاؤ میں نرمی اور دل میں اُس سے زیادہ نرمی وبردباری، جوش میں آتے، نہ بلند آواز سے بولتے، اس کے ساتھ ظرافت وبذلہ سنجی میں بھی ممتاز تھے۔ نثر ونظم دونوں پر قدرت تھی، اُن کا بڑا علمی سرمایہ تو نثر ہی میں ہے؛ لیکن اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعری میراث بھی چھوڑی ہے۔ اُن کی تقریر ہی کی طرح اُن کی تحریر بھی، بڑی سہل اور اُن کے زبردست علم

وفکر کی ترجمانی کے باوجود، اِنتہائی رواں، سلیس اور شگفتہ ہوتی تھی، جو بہ ذاتِ خود اُن کا وجہِ امتیاز تھی۔

ذوقِ عبادت وریاضت

وہ عبادت وریاضت کے رسیا تھے، لگتا تھا کہ واقعی اِسی کے لیے مخلوق ہوے ہیں، سنن ونوافل اور قیام باللیل کی اَسفار میں بھی ایسی پابندی کہ جواں سال حوصلہ مند صالح جوانوں کی ہمت بھی اُس کے سامنے جواب دے دیتی تھی۔ مغرب کے بعد نوافل اور وقتِ تہجد کی نمازوں میں کئی کئی پارہ تلاوت کا معمول رہا، جس میں موت تک کبھی خلل نہیں پڑا۔ وہ عبادت وتلاوت میں اِنہماک کے حوالے سے بھی اپنے اَسلاف کے اَمانت دار وارث تھے۔ دار العلوم جیسے عظیم اِدارے کی اِتنے طویل عرصے تک قیادت کے لیے جو باطنی جوہر، قلبی کیفیات اور روحانی واردات درکار تھیں اُن کے معیار پر نہ صرف وہ مکمل طور پر اُترتے تھے؛ بل کہ پوری جماعت کے لیے، اِس حوالے سے بھی قائد وداعی تھے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اِس ادارے کی اس طویل دور لیے تک سربراہی کے لیے خداے حکیم نے ہی اُنھیں بنایا اور منتخب کیا تھا۔ تاریخ کے ہر طالب علم کا اِس سچائی پر اِیمان ہے کہ موزوں انسان جب جب کسی موزوں جگہ پر فائز رہا ہے، اِنسانی معاشرہ، فکر وعمل کے بے طرح نتائج سے مستفید ہوا ہے، جن کے برکات وثمرات کا اِحاطہ بعض دفعہ، بڑے بڑے بصیرت نگاہ مؤرخ کے لیے ایک مشکل عمل ثابت ہوا ہے۔ اُس کے برعکس ہونے کی صورت میں، اِنسانوں کو دیرپا اور دُوررَس نتائج بھگتنے پڑے ہیں۔ حکیم الاسلام خدا کی تقدیر وانتخاب سے اس کے سربراہ ہوے اور خداے قدیر نے اُنھیں اُن تمام خوبیوں سے نوزا جو اِس اِلہامی اِدارے کی کشتی کو صحیح سمت میں بہ سلامت کھینے کے لیے ناگزیر تھیں۔

با ہمہ و بے ہمہ

انتظام وانصرام کے مشاغل اور ذمے داریاں، خواہ وہ کسی نوعیت کی ہوں اور کسی بھی اِدارے، تنظیم یا جماعت کی ہوں، اپنے انجام دینے والوں کو علمی مشاغل سے دور کر کے، اُن کا مذاقِ علمی سلب کر لیتی ہیں، اِسی طرح اَسفار کی کثرت، زیارتوں وملاقاتوں اور چلت پھرت کی بہتات بھی انسان کو علمی وفکری کام کے لائق نہیں رہنے دیتی؛ لیکن مولانا قاری محمد طیبؒ دارالعلوم جیسے عظیم الشان اِدارے کے عرصہ ساٹھ سال تک مہتمم بالشان مہتمم رہے اور سفر و آمد ورفت اُنھوں نے، اندرون ملک و بیرونِ ملک گاؤں گاؤں اور شہر شہر اِس کثرت سے کی کہ شاید اُن کے زمانے میں ہندوستان میں، اُن سے زیادہ سفر کرنے والا کوئی نہ رہا ہوگا، اُن کی زندگی کا بیش تر حصہ سفر ہی میں گزر گیا، اِس کے باوجود اُن کی علمی شادابی اور فکری زرخیزی میں کوئی کمی نہ آئی، اُن کی تقریریں اُن کے علمِ غزیر اور غیر معمولی استحضار کی گواہ ہیں، ساتھ ہی اُنھوں نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں مختلف اِسلامی موضوعات پر لکھیں، جو زبان کی چاشنی کے ساتھ، اُن کی علمی بے پناہی اور فکری تخلیق کی بہترین مثال ہیں۔

یہ امتیاز حکیم الاسلامؒ کے دگر امتیازات کی طرح غور اور جائزے کا مُتقاضی ہے کہ وہ اپنے بے طرح مشغول اور کاموں سے بوجھل اوقات میں سے علمی تخلیقات کے لیے، کس طرح وقت بچا لیتے تھے اور مطالعہ اور غور وفکر کے لیے، کیسے گنجایش پیدا کر لیتے تھے۔ ایک ایسا با ہمہ انسان بے ہمہ رہنے کا کون سا گُر جانتا تھا؟ وہ واقعی غیر معمولی انسان تھے۔

کمال و یکتائی کے عناصر

حکیم الاسلامؒ میں، خدائے قادر و وَہّاب نے عظمت و عبقریت وکمال و یکتائی کے بہت سے عناصر جمع کر دیے تھے، وہ ہند میں سرمایۂ ملت کے دورِ آخر کے سب سے

بڑے نگہبان اور اِسلامی علوم وثقافت و اِیمانی میراث کے اولوالعزم و بیدار مغز پاسبان، بانیِ دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء-۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے پوتے یعنی سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حافظ محمد احمد (۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء-۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) کے بیٹے اور صدیقی النسب شیخ تھے؛ اِس لیے اُنھوں نے علمی اور نسبی عظمت، وراثت میں پائی تھی، تقویٰ شعار وشب بیدار صُلحا کی صلبی اولاد تھے؛ اِس لیے اُن کی آہِ سحرگاہی، نسلی پاکیزگی، سیرت وکردار کی طہارت اور شبانہ روز کی دعاؤں کا فیضان، اُن کے وجود کا حصہ اور اُن کے خمیر کا اصلی عنصر تھا۔

وقت کے رازی وغزالی اَساتذہ

وہ وقت کے بخاری ومسلم اور رازی وغزالی کے شاگرد تھے۔ برِّصغیر کے دورِ آخر کی تاریخ ایسے اَساتذۂ باکمال، مردانِ مردم ساز اور علم وعمل کے یک ساں طور پر جامع علما ورجالِ تربیت کی مثال سے یکسر خالی نظر آتی ہے۔

اُن کے اساتذۂ گرامی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء-۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) (۱) محدّثِ کبیر وعلامۃ العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء - ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء) علامہ شبیر احمد عثمانیؒ دیوبندی ثم الپاکستانی (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء-۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء-۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۵ء) مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ (۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء-۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء-۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) جیسے اِمام علم وفضل شامل ہیں۔

(۱) کیوں کہ آپ کی بسم اللہ حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن اور آپ کے والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد نے ہی کرائی تھی۔

اُنھوں نے تزکیۂ و اِحسان کے باب میں، اپنے گرامی قدر استاذ حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کی، حضرت کی وفات کے بعد اپنے استاذِ حدیث علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ سے رجوع ہوے اور اُن سے تربیت حاصل کی، پھر حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوے اور ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں خلافت سے سرفراز ہوے۔

علمی و عملی سرسبزی وشادابی کا ماحول

آپ نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف دین داری، علمی و عملی سرسبزی وشادابی، سادگی وقناعت پسندی کے ماحول کا دبیز سایہ، گھر سے تعلیم گاہ تک خیمہ زن نظر آیا؛ اِس لیے اُن عظیم صفات اور غیر معمولی کمالات پر، پروان چڑھنے میں، آپ کا ماحول آپ کے لیے بے حد مددگار ثابت ہوا، جن کے نتائج واثرات سے برِّ صغیر کا چپہ چپہ بالخصوص اور عالمِ اسلام کا بڑا حصہ بالعموم تقریباً پون صدی تک بہرہ ور رہا۔ یہ سب کچھ خدا کی توفیق کی بات تھی وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ شَيْئًا هَيَّأَ أَسْبَابَهُ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کو معرضِ وجود میں لانا چاہتا ہے، تو وہ خود اُس کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ خود فرماتے ہیں:

> چودھویں صدی ہجری کے شروع اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں میری پیدائش ایسے ماحول میں ہوئی کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب وتمدن کے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور ایک نئی تہذیب وتعلیم کا غلغلہ تھا۔ میری پیدائش میرے جدِّ امجد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانیِ دارالعلوم دیوبند کے گھرانے میں ہوئی ہے، جو اپنے وقت میں علم ودین کے مُجدِّد تھے اور اُن کی زندگی سادہ، توکل پسندی، کم سے کم اسبابِ معیشت اور جفاکشی کا نمونہ تھی۔ اُن کی اہلیہ محترمہ میری دادی صاحبہ حضرت نانوتویؒ کے فیضانِ صحبت اور رفاقت سے بہ راہِ راست مستفید تھیں۔ دادی صاحبہ اپنی عبادت وریاضت، سخاوت وکشادہ دلی،

شعائرِ دین پر پختگی، نماز روزہ ذکر و شغل کی پابندی میں اپنی مثال آپ تھیں۔

میرے والد مرحوم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور اُن کی والدہ صاحبہ میری دادی مرحومہ کے زیرِ سایہ مجھے تعلیم و تربیت نصیب ہوئی۔ اُن کی ساری ضروریاتِ زندگی میں بے حد سادگی، مزاجوں میں انکساری اور تواضع کے ساتھ، اُن سیکڑوں طلبۂ دارالعلوم کے لیے، جو ملک و بیرونِ ملک سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے آتے اور دارالعلوم میں جمع ہوتے تھے، میری دادی صاحبہ، والد مرحوم اور سارے گھرانے کی طرف سے، غیر معمولی شفقت اور ہر وقت اُن کی تعلیمی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی دھن تھی، بس یہی ماحول تھا جس میں مَیں نے آنکھ کھولی۔

والد مرحوم کا یہ ایک قصہ ضرور قابلِ ذکر ہے کہ دارالعلوم کے ایک طالبِ علم نے دھلے ہوئے گیلے کپڑے سکھانے کے لیے، دارالعلوم کی مسجد میں ڈالے۔ والد صاحب مرحوم نے دیکھا، تو خفا ہوئے اور ڈانٹ ڈپٹ کی؛ مگر بعد میں آپ نے جذبۂ ترحم سے اپنی سخت گیری پر جو صرف مسجد کی حرمت کے لیے تھی اِتنے مُتأسِّف ہوئے کہ اُس طالبِ علم کو بلا کر اُس سے معذرت کی اور کئی ہفتے اپنے ساتھ کھانے میں شریک رکھا۔ یہ گویا طلبۂ دارالعلوم کے حق میں، اُن کی پدرانہ شفقت کا ایک بے اختیارانہ جذبہ تھا۔ جو طلبہ میں معروف تھا۔

یہاں ایک واقعہ یہ بھی بیان کرنا مناسب ہوگا کہ میری دادی صاحبہ ایک دفعہ ''امروہہ'' ضلع ''مرادآباد'' تشریف لے گئیں۔ جہاں میرے دادا صاحب کے ممتاز شاگرد حضرت مولانا احمد حسن صاحب محدّثِ امروہی(۱) تشریف فرماتھے، وہ ''امروہہ'' ہی کے باشندے تھے۔ حضرت مولانا امروہی، مرحومہ دادی اماں کو اسٹیشن سے پالکی میں، اِس شان سے گھر لائے کہ کہاروں کے ساتھ پالکی کو اٹھانے والوں میں خود بھی شریک تھے۔ یہ تھا اُس دور میں

(۱) پ: ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۰ء، وفات: شبِ ۲۸-۲۹ر ربیع الاول ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۷-۱۸ر فروری ۱۹۱۲ء۔ (امینی)

اپنے اساتذہ اور اُن کے متعلقین کے ساتھ اور اُن کی اولاد کے ساتھ، شاگردوں کا ادب واحترام۔ میرا تعلق ایک ایسے ماحول سے رہا ہے، جس میں دین کے سب ہی شعبوں، بالخصوص دینی تعلیم اور دین کے نادار طلبہ سے محبت وشفقت کو زندگی کا ایک بہت بڑا فرض سمجھا جاتا تھا۔ میرے آبا واجداد نے طلبہ علومِ دینیہ کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے اور یہاں تک کہ بعضوں کی شادی کی تقریبات بھی خود ہی انجام دیں۔ کتنے ہی علما وفضلا ہیں جن کی مجالسِ نکاح، ہمارے گھر پر آراستہ ہوئیں۔ حضرت قبلہ مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ کی شادی بھی، میرے والد صاحب کے اہتمام سے ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی مہتممِ مدرسہ شاہی مرادآباد جامعہ قاسمیہ(۱)، خود دیوبند کے ایک اونچے خاندان کے فرد تھے، اُن کی تقریبِ شادی بھی میرے والد صاحبؒ نے کی۔ غرض کہ میرا گھرانہ علما وفضلائے عصر کا مَورِدْ تھا۔ دوسرے متعدِد علما وفُضلا نے سال ہا سال تک میری دادی صاحبہ اور والدہ صاحبہ کے زیرِ سایہ، راحت وآرام سے وقت گزارا۔ تعلیمی زندگی میں مجھے وقت کے یگانۂ روزگار علما وفضلائے کرام سے استفادے کا موقع ملا۔

حفظِ قرآن اور تجویدِ قراءت میں مولانا قاری عبدالوحید صاحبؒ، فارسی میں مولانا محمد یٰسین صاحب (والدِ ماجد مفتی محمد شفیع صاحب) فنون میں ابوالاساتذہ حضرت مولانا غلام رسول ہزارویؒ اور علومِ کتب وسنت میں علامہ ویگانۂ روزگار الاستاذ الاکبر مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی، فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحب، مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ، مولانا رسول خان ہزارویؒ اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین میرے اساتذہ رہے۔ اپنے رفقائے درس میں

(۱) پ: ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء، وفات: ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء۔ (اتقیٰ)

بڑے بڑے فُضَلا کو جمع پاتا ہوں؛ لیکن جن رُفَقا کے ساتھ تعلیمی دور کا اکثر وقت گزرا، اُن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتیِ اعظم پاکستان، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا سید بدر عالِم میرٹھی مہاجر مدنیؒ اور مولانا میرک شاہ کشمیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ حضرات بھی اپنے علم وفضل میں بے نظیر ہیں۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی، یہ سب حضرات میرے بعد کے فُضَلاے دار العلوم میں سے ہیں۔ اساتذہ نے کس قدر غیر معمولی شفقت کا ثبوت دیا، اِس کے بارے میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حدیث شریف کے اُستاذِ اعلیٰ تھے، مگر بے حد نازک مزاج اور حسّاس طبیعت کے بزرگ تھے، طلبہ کی ذرا سی غفلت پر خفا ہو جاتے۔ ایک دفعہ طلبہ کی کسی غلطی پر خفا ہو کر، گھر میں بیٹھ گئے اور دار العلوم میں سبق پڑھانا موقوف کر دیا۔ طلبہ پر استاذ کی خفگی کا بڑا اثر ہوا۔ مشوروں کی مجلس منعقد ہوئی، اور طلبہ نے یہ طے کیا کہ حضرت مولانا عثمانی کے منانے کے لیے، اُن کے سامنے مجھے پیش کیا جائے۔ حال آں کہ میں خود بھی اُس سال حضرت کے ہاں ایک طالب علم ہی تھا۔

چناں چہ میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں جا کر عرض معروض اور طلبہ کی طرف سے ندامت کا اِظہار کیا، تو حضرت مولانا نے خندہ پیشانی سے میری سفارش قبول فرمائی اور فوراً ہی تشریف لے آئے اور اَسباق کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میرے ساتھ بزرگوں کی یہ شفقت وعنایت دیکھ کر، اکابر کی کشیدگیوں کو دور کرنے کے لیے، اساتذہ کی طرف سے مجھے ہی منتخب کیا جاتا تھا۔

وہ خدائے کریم کے فضلِ خاص سے غیر معمولی فطری صلاحیّت کے ساتھ، اِس عالَمِ رنگ وبو میں آئے۔ علم وعمل کی دنیا میں، اُنھوں نے جو نئے نئے نقش ونگار بنائے،

علمی اکتسابات اور فکری حصول یابیوں کے جو غیر معمولی نقش ثبت کیے، انفرادیت کا جو جادو جگایا، عظمت و اِفتخار کا جو تاجِ زرّیں اُن کے سر سجا، اِسلامی شریعت کی روح، علومِ کتاب وسنت پر بھرپور عبور اور اِسلامی احکام وقوانین کے غیر معمولی استحضار سے کشیدہ نصف صدی سے زائد عرصے تک دنیا کے کونے کونے میں جو تقریریں کیں اور اسلام کی صحیح ترجمانی کا جو بے مثال فریضہ انجام دیا، نسبتاً بہت کم سنی میں جس طرح دارالعلوم جیسے اِلہامی واِلٰہی اِدارے کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں دی گئی، پھر اُنھوں نے نصف صدی سے زائد عرصے تک جس طرح اُس کی شان دار قیادت کی، ترقی کے بامِ عروج پر پہنچایا اور پوری دنیا میں اُس کا غلغلہ بلند ہوا اور قریہ بہ قریہ اور کوبہ کو اُس کی آواز پہنچی، یہ سب کچھ اور اِس کے سوا بہت کچھ، اُن کی وہبی صلاحیت اور خداداد لیاقت کی روشن دلیل ہے۔

کم سنی میں منصبِ اہتمام سپرد کیے جانے کی وجہ

جس وقت اُنھیں نائب مہتمم کا عہدہ سپرد کیا گیا، اُس وقت اُن کی عمر صرف ۲۵-۲۶ سال تھی؛ کیوں کہ اُن کا سنۂ پیدائش ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء ہے۔ ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۴ء میں، دارالعلوم جیسے عظیم تاریخی بین الاقوامی اِدارے کے اِس اہم منصب کے لیے، اِس نوعمر کو اُس دور میں کیوں ترجیح دی گئی، جو دارالعلوم کے اولین بانیوں اور سرپرستوں کے حوالے سے گویا ”ثم الذین یلونھم“ کا دور تھا۔

رجسٹر تجاویز مجلس شوریٰ ۱۳۴۰ھ میں اِس سوال کے جواب کے لیے اُس وقت کے اَعلامِ علم وفضل وصلاح اَرکانِ شوریٰ کی حضرت حکیم الاسلام کو نائب مہتمم منتخب کیے جانے کے تعلق سے، تجویز کے مندرجۂ ذیل متن پر نگاہ ڈال لینی کافی ہے:

”حضرت مہتمم صاحبؒ (۱) اور نائب مہتمم صاحبؒ (۲) سلّمہما کی جو کچھ

(۱) یعنی حکیم الاسلام کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ احمد بن الامام محمد قاسم نانوتویؒ۔

(۲) یعنی حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی۔

خدمات ہیں، وہ اَظہر من الشمس ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات، بہ وجہِ تقاضاے عمر و نیز بہ سببِ امراضِ گونا گوں، ضعیف ہوگئے ہیں، اگرچہ خدماتِ دارالعلوم میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیتے ہیں؛ لیکن مجلسِ شوریٰ کا فرض ہے کہ وہ اِس بات کا اِحساس کرکے، ایسے وسائل پیدا کرے، جس میں دونوں حضرات کو خاص طور سے اپنے کاموں میں اِمداد ملے؛ لہٰذا ایک عہدہ نائب دوم کا تجویز کرنا ضروری ہے اور اِس خدمت پر ایسا شخص تجویز کرنا ضروری ہوگا، جو صاحبِ علم، عالی خاندان اور باا ثر ہو، دارالعلوم کے ساتھ سچّی اور دلی ہم دردی مثل اُن ہر دو حضرات کے رکھتا ہو، پس میں اپنی راے میں، اِس عہدے کے لیے مولانا قاری محمد طیّب صاحب سَلَّمَہ اللہ تعالیٰ کو، تجویز کرتا ہوں۔ مولانا موصوف، نوجوان، صالح، صاحبِ علم اور عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسلاً بعد نسل سچّی و دلی ہم دردی رکھنے والے ہیں۔

حضرت مہتمم صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے فرزندِ اکبر ہیں، مولانا محمد طیب صاحب پوتے۔ حضرت مہتمم صاحب کے زمانے میں دارالعلوم کو جس قدر ترقیات آمدنی میں ہوئیں اور جس قدر درجاتِ تعلیم المُضاعَف ہوے، جس قدر طلبہ کی تعداد بڑھی اور جس قدر ہندوستان سے باہر دور دراز اَقالیم وممالک میں، اِس دارالعلوم کی قدر و منزلتِ قلوب میں عامۃً روز افزوں پیدا ہوئی، اس کے ثبوت میں، خود دارالعلوم ایک مُجسّم شہادت موجود ہے؛ لہٰذا تمام مسلمانانِ بہی خواہانِ دارالعلوم پر عموماً اور مجلسِ شوریٰ پر خصوصاً، روحانی طور سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُس خاندان کے کسی فرد کے ہاتھ میں بہ شرطِ قابلیّت وصلاحیّت، نظامِ دارالعلوم تفویض کر دیا جاے؛ تاکہ وہ روحانی فیض جو ترقّیاتِ دارالعلوم کے لیے باطنی طور پر مُمِد و مُعاوِن ہے، برابر جاری رہے"۔

مجلسِ شوریٰ کی اِسی تجویز کی رو سے، حکیم الاسلام کو ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم

بنایا گیا؛ اپنے علمی رجحان کی وجہ سے بہ جلد آپ نے اِس انتظامی عہدے سے اپنے آپ کو تعلیمی وتدریسی شعبے میں منتقل کروالیا؛ لیکن اکابرِ دارالعلوم کے اِصرار پر دوبارہ نیابتِ اہتمام پر واپس آنا پڑا۔ ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۸ء تک اپنے والد ماجدؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ کے زیرِ نگرانی ومشورہ، اِدارۂ اہتمام کے انتظامی امور میں حصّہ لیتے رہے۔

ممبرانِ مجلسِ شوریٰ کی منصبِ اہتمام کے تئیں اُن کی غیر معمولی لیاقت کی شہادت

۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء کے وسط میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ کے انتقال کے بعد حکیم الاسلام کو قائم مقام مہتمم بنایا گیا اور کچھ ہی عرصے بعد جب اِس بات کا اندازہ کرلیا گیا کہ اِس منصبِ جلیل کو سنبھالنے کی صلاحیت اُن میں بہ درجۂ اتم موجود ہے تو مجلس شوریٰ نے اپنے ذیل کے فیصلے کے ساتھ، اُنھیں مستقلاً اِس پر فائز کردیا:

> ''ہم سب ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے ۱۸/شوال ۱۳۴۸ھ سے ۲۱/شوال ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم کے تمام شعبوں کا غور سے معاینہ کیا، جو اُمورِ بحث طلب مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ میں پیش کیے، اُن کا بلارورعایت تصفیہ کیا، ہم ممبران اِس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب سے مولوی قاری محمد طیّب صاحب نے زمامِ اہتمام، اپنے ہاتھ میں لی ہے، اُن کے ہر طریقِ عمل سے صدق واِخلاصِ نیت، حُب وبُغض فی اللہ اور اَداے حقوق وفرض شناسی میں، عزم قوی اور ثبات واستقلال بوجہِ اَحسن ثابت ہوتا ہے، وللّٰہ حمدًا کثیرًا طیبًا مبارکًا فیہ، ہم سب حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے قوی امید رکھتے ہیں کہ اس تھوڑی سی مدت میں، جن خوبیوں کا مہتمم صاحب سے ظہور ہوا ہے، اِن شاء اللہ تعالیٰ آیندہ اس سے اَضعافاً مضاعفۃً ظاہر ہوگا، "وما ذلك علی

اللّٰہِ بعزیز" یہ الفاظ بے اختیار قلب سے نکلے ہیں، اِس میں نہ تصنّع کو دخل ہے اور نہ مہتمم صاحب کی خدمات کی داد ہے۔(۱)

حکیم الاسلام کا طویل دورِ اہتمام اور اُس کے ثمرات و برکات

حکیم الاسلامؒ کا دورِ اہتمام نہ صرف سب سے زیادہ طویل تھا؛ بل کہ دار العلوم کی ہمہ گیر ترقی، عالمی شہرت اور اُس کے ایک مدرسہ سے واقعی جامعہ بننے کا عمل، اُنھی کے سعادت مندانہ دور میں پایۂ انجام کو پہنچا۔ دار العلوم کی اکثر قابلِ ذکر عمارتیں، اُنھی کے زمانے میں بنیں، دار العلوم کے نئے نئے اور مفید سے مفید تر ضروری شعبے، اُنھی کے دور میں قائم ہوے، اندرونِ ملک و بیرونِ ملک کے بے شمار ممتاز علما و فضلا و مشاہیرِ وقت اور سرکاری و غیر سرکاری سربراہوں کے وفود کی دار العلوم میں آمد اور اُس کی دینی و علمی و مظہری ترقی سے اپنے غیر معمولی تأثّر کا اظہار، اُنھی کے دورِ اہتمام میں سب سے زیادہ رو بہ عمل آیا۔ ملک کی آزادی اور اُس کے بعد ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے کشت و خون کا طویل و شدید اَلم ناک واقعہ، اُنھی کے زمانے میں پیش آیا اور آزادی سے پہلے کے حالات سے، یکسر مختلف آزادی کے بعد کے حالات سے، دار العلوم کو ہم آہنگ کرنے اور اپنی سمتِ سفر میں کسی تردّد کے بغیر محوِ سفر رہنے کا یارا؛ اُنھی نے دیا اور اپنی علمی لیاقت، اِسلامی ذہانت اور ہمہ گیر فکری صلاحیت کی وجہ سے اُس کی رفتارِ کار میں نہ صرف کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہیں ہونے دیا؛ بل کہ بہ ظاہرِ اَحوال پہلے سے زیادہ تازہ دمی، تیز گامی، اور اُولوالعزمی کے ساتھ آگے بڑھنے اور علومِ شریعت اور خدمتِ دین وملت کے میدان میں، نئے نئے نقش ہاے عمل ثبت کرنے کا حوصلہ دیا۔ اِس طویل دورِ اہتمام میں دار العلوم کے لیے بہت سے نازک موڑ آئے، جن سے، حکیم الاسلامؒ اپنی علمی و فکری

(۱) رجسٹر تجاویز مجلس شوریٰ ۱۳۴۰ھ، نیز روداد دار العلوم دیو بند ۱۳۴۸و۱۳۴۹ھ ص:۵۔

ودینی بصیرت اور دور اندیشی کے ذریعے، بہ خوبی گزر گئے اور دارالعلوم کی رفتارِ عمل میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

تاریخی صد سالہ اِجلاس

حکیم الاسلامؒ کی وفات سے دو تین سال قبل، آپ کی فکر و کوشش کے طفیل، دارالعلوم کا عظیم الشان صد سالہ اِجلاس ۲۱-۲۳/ مارچ ۱۹۸۰ء (۳-۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ) کو ہوا، جو ہر اعتبار سے بے نظیر تھا، ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا اتنا بڑا دینی و علمی اجتماع اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، جس میں ہندوستان و پاکستان و بنگلہ دیش کے علاوہ دنیا کے گوشے گوشے سے، علما و فضلا و مفکرین و دعاۃ اور اخبار نویس و ذرائعِ اِبلاغ کے لوگ، اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک جگہ جمع ہوے ہوں۔ اِس عظیم مجمع میں تقریر کرتے ہوے ہندوستان کے عظیم عالم و داعی و مفکر (جنھوں نے دنیا کا گوشہ گوشہ دیکھا اور دنیا کے بڑے سے بڑے مسلمانوں کے اجتماع کو جنھیں خطاب کرنے کا موقع ملا تھا) یعنی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء - ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء) نے اِسی اِجلاس کی تیسری نشست بہ روز شنبہ بہ وقت ۹ بجے صبح تا ۱:۳۰ ظہر ۲۲/ مارچ ۱۹۸۰ء (۴/ جمادی الاخری ۱۴۰۰ھ) میں فرمایا تھا کہ میں نے میدانِ عرفات کے بعد دنیا میں مسلمانوں کا اِتنا بڑا مجمع اپنی آنکھوں سے اب تک کہیں نہیں دیکھا ہے۔ سعودی عرب کے روز نامہ ''المدینۃ'' اخبار کے نمایندے استاذ اِبراہیم محمد سرسیق نے اپنے اخبار میں ہندوستان سے واپسی کے بعد، شنبہ: ۱۹/۵/۱۴۰۰ھ کو اِس اِجلاس کے تعلق سے اپنی تفصیلی رپورٹ میں لکھا:

> ''اِس یونیورسٹی کے ساتھ میں نے لوگوں کے اِکرام کا جو معاملہ دیکھا، اِس سے واقعتاً میرے دل کو ٹھنڈک محسوس ہوئی، لوگوں کو اِس اِدارے سے جو ہم دردی ہے، محبت ہے، ہم آہنگی اور روحانی و قلبی تعلق ہے، اُس کی مثال دنیا کے کسی علمی اِدارے کے حوالے سے مشکل ہی سے ملے گی۔

اِس ادارے کے ساتھ ایسے جذباتی لگاؤ اور وارفتگی کی وجہ سے، میں نے
ایسا منظر دیکھا، جو میں نے صرف میدانِ عرفات میں حجِ اکبر میں دیکھا تھا"۔

اِس اجلاس کے لیے (٦٠٠٠٠٠) چھ لاکھ مُربّع فٹ میں پنڈال نصب کیا گیا تھا، مختلف صوبوں اور ملکوں کے نمایندوں اور وفود کے لیے، اِس کے علاوہ الگ الگ خیمے نصب کیے گئے تھے، صرف اسٹیج کی پیمایش ۵۰+۱۵۰ فٹ تھی۔ اِجلاس کی تیاری اور اُس کو بہ خیر وخوبی انجام تک پہنچانے کے لیے ماہرین اور محبّین واساتذۂ دار العلوم کی ۲۱ کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں۔

ہفتہ عشرہ تک دیوبند کا اسٹیشن عملاً صرف مسلمان مسافروں ہی کے لیے مخصوص رہا، ایسا لگتا تھا کہ پورے برِصغیر کا رُخ، صرف قصبۂ دیوبند کی طرف ہے۔ ملک کے اکثر اسٹیشنوں، بس اڈوں اور پبلک ٹرانسپورٹ کے مرکزوں پر صرف دیوبند آنے والے مسلمانوں اور علما کے لباس میں نظر آنے والے انسانوں کی بھیڑ نظر آتی تھی، ہندوستان کی حکومت نے ملک کے مختلف شہروں سے دیوبند اور دیوبند سے اُن شہروں کے لیے، بہت سی اسپیشل گاڑیاں چلائیں۔ دنیا کے اسلامی ملکوں بالخصوص عربی ملکوں کی حکومتوں نے، اِس بے مثال تاریخی اِسلامی جشن کے لیے اپنے وفود بھیجے، بالخصوص سعودی عرب، مصر، کویت، عراق، اردن، عمان اور پاکستان کی حکومتوں نے۔

ہندوستان کے اُس وقت کے صدر جمہوریہ "نیلم سنجیوا ریڈی" (۱۹۱۳ء — ۱۹۹٦ء) نے پرجوش پیغام بھیجا، اُس وقت کی وزیرِاعظم مسز اندرا گاندھی (۱۹۱۷ء — ۱۹۸۴ء) بہ ذاتِ خود اِس اِجلاس میں حاضر ہوئیں اور جمعہ ۲۱/ مارچ ۱۹۸۰ء (۳/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ) کو اُس کے اِفتتاحی اجلاس کو خطاب بھی کیا، وہ مسلمانوں کے اِتنے بڑے مجمع کے، جس میں کم از کم ۱۵-۲۰ لاکھ مسلمان شریک تھے، پرسکون وپروقار رہنے پر، بہت حیرت زدہ تھیں۔ ہندوستان کے محکمۂ ڈاک نے اِس موقع سے دار العلوم کی مرکزی عمارت کی تصویر والا یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔ ہندوستان کے ذرائع اِبلاغ کے نمایندوں کے

علاوہ عرب ممالک کے اخبار ورسائل کے اہم نمایندے بھی رپورٹنگ کے لیے موجود رہے، جن میں ''البلاغ'' و ''عرب ٹائمز'' و ''الوعی الاسلامی'' کویت، ''اخبار العالم الاسلامی'' مکہ مکرمہ، ''صوت الشرق'' ورسالہ ''منبر الاسلام'' قاہرہ، ''الشریعۃ'' اردن، ''المدینۃ'' سعودی عرب، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دہلی میں تعینات عرب ممالک کے اکثر سفرا نے اجلاس میں شرکت کی اور اپنے اپنے ملکوں کے وفود کی رہ نمائی کی۔

اِس ملک کے مسلمان برسوں تک اِس اِجلاس کا مزے لے لے کر تذکرہ کرتے رہے، ہر اس آدمی کو اِس میں کسی وجہ سے شریک نہ ہونے کا بے حد افسوس رہا، جو کسی درجے میں بھی اِسلامی شعور سے بہرہ ور تھا۔ ہندی مسلمانوں کے لیے بلاشبہہ اِس اِجلاس کے دن یادگار اور تاریخی تھے، جن کی یادوں کی شمع اب تک دیکھنے والوں کے دلوں میں روشن ہے۔

صد سالہ اجلاس کے بعد اختلاف کا ماحول اور حکیم الاسلام کا کرب واَلم

بدقسمتی سے شاید دار العلوم کو یہ اِجلاس راس نہ آیا، یا شاید اُسے کسی کی نظر لگ گئی، چناں چہ اِجلاس کے کچھ ہی دنوں بعد، بعض مرئی وغیر مرئی وجوہ واسباب کی وجہ سے، دار العلوم میں شورش، خلفشار اور شدید اختلاف کا ماحول بن گیا، جس سے سن رسیدہ ونرم وگرم چشیدہ وجہاں دیدہ مہتمم حضرت حکیم الاسلام کا نہ صرف دل بُری طرح شکستہ ہوگیا؛ بل کہ اُن کا پورا وجود اندر سے بُری طرح مسمار ہوگیا، اپنے جدِ امجد حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم اور اُن کے رفقا کے بوئے ہوے پودے کو اپنی پوری زندگی خونِ جگر سے سینچا تھا، اب وہ اپنے بڑھاپے کی زندگی میں، جو سن وسال کے اَن گنت واقعات وحادثات سے ویسے ہی بوجھل ہوچکی تھی، اُس کے خدانہ خواستہ برگ وبار لانے کے عمل کے (۱) محدود

(۱) جیسا کہ اِس طرح کے اختلاف کے اِداروں اور جماعتوں میں رونما ہونے کے وقت عام طور پر اِس کا خطرہ رہتا ہے۔ دار العلوم کے مشائخ واکابر کے اِخلاصِ بے پایاں کی وجہ سے الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی اور وہ اِس طوفان کو بھی اسی طرح بہ خیر وخوبی جھیل گیا، جس طرح ماضی میں کئی طوفانوں سے گزر گیا تھا۔

ہو جانے کے ماحول کو، رو بہ عمل آتے ہوئے دیکھ رہے تھے، اُن کا دل بُری طرح زخمی تھا کہ ابھی کل کی بات ہے کہ اِس ادارے کا اُنھوں نے جشن بہاراں منایا اور ابھی اُس کی گرد بیٹھی بھی نہ تھی کہ اختلاف کی آندھی نے آ گھیرا۔ اپنے پچاس ساٹھ سالہ دور اِہتمام میں اُنھوں نے بڑے بڑے نازک حالات دیکھے اور کٹھن سے کٹھن مرحلوں سے گزرے، اپنے حسنِ تدبیر اور وہبی حکمتِ عملی سے اُن سے بہ حسن وخوبی پار اُتر گئے اور دار العلوم کو کسی جھمیلے کے نتائجِ بد کا شکار نہ ہونے دیا؛ لیکن صد سالہ اِجلاس کے معاً بعد، جو باہمی اختلاف کا طوفان اٹھا، وہ نہ صرف پوری جماعت کے لیے سوہانِ روح بنا؛ بل کہ حضرت قاری محمد طیبؒ کے لیے، موت سے پہلے لاتعداد موت کا باعث بنا۔

صَبا سے ہر سحر مجھ کو، لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ گل چیں نے، یہ کس بُلبل کا دل توڑا

(سوداؔ)

اُنھوں نے اُس وقت کی مجلسِ شوریٰ کے سب سے نمایاں رکن عالمِ جلیل وداعی اِلی اللہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء - ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء) کے نام جو کچھ اُس وقت لکھا تھا، اُس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا دل اس دل خراش واقعے سے کس طرح چھلنی ہو گیا تھا، اُس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ اُنھیں دار العلوم سے کیسا عشق تھا؛ بل کہ اُن کے لیے سرمایۂ حیات تھا اور وہ اس ناگفتہ بہ واقعے سے کتنے درد وکرب میں مبتلا تھے:

محترم المقام مولانا محمد منظور نعمانی! زید مجدکم

السلام علیکم

گرامی نامہ مؤرخہ ۲۸/ اپریل ۱۹۸۳ء باعثِ شرف اور موجبِ تسلّی ہوا۔ یہ میرے لیے روح کی غذا اور صحت مندی کی علامت ہے، آج کا دور کرب کا دور ہے، اخلاقی انتشار عالمی پیمانے پر بڑھ رہا ہے، ۹۹ فی صد غلط فہمیاں چھائی ہوئی ہیں اور ایک فی صد حقیقت پر حاوی ہیں۔ دار العلوم دیوبند

صرف ایک مدرسہ نہیں؛ بل کہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، آج کے لادینی دور میں دین کے ہر شعبے میں، اُمّت کی راہ نمائی اور عوامِ اُمّت کی خدمت؛ اُس کا نصب العین رہا ہے۔ آج اُس کا کیا حال ہے؟ ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے مسئول ہیں۔

یہ ہے وہ سوز جس سے میرا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے، میں دہلی میں پنت ہسپتال میں رہا، اب دیوبند میں ہوں۔ میرا کھانا پینا صرف دوا ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کوئی مرض نہیں اور حال یہ ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں میں ہوں۔ نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا؛ بل کہ غم دار العلوم کا ہے۔ جماعت جو ایک سو سولہ (۱۱۶) برس تک اوروں کے لیے ہدایت، تقویٰ اور توحید کی علامت تھی، بکھر کر رہ گئی۔ یہی میری بیماری ہے، ویسے یہ عمر کا تقاضا ہے۔ اِس عالمِ بے چارگی میں آپ کا مکتوبِ گرامی ملا، جسے میں اپنے لیے اور دار العلوم کے لیے روحانی صحت مندی کی علامت سمجھتا ہوں۔ آں محترم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میں نے اپنے چھوٹوں کو بھی خطاوار نہیں سمجھا کہ اُن کی زبان پر معافی کی بات آئے، معاملہ ہم میں سے کسی کی ذات کا نہیں، نہ معافی کا ہے؛ بل کہ ہمارے اسلاف کی یادگار دار العلوم کا ہے۔ ہم سب اپنی خطاؤں کی معافی اللہ تعالیٰ سے مانگیں اور کچھ مانگیں تو دعا مانگیں۔ ہم سب کو توفیق نصیب ہو اور آخرت کی جواب دہی سے نجات ملے۔

من وتو ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم

اُس دن سے، جس نے دار العلوم اور جماعتِ دار العلوم کو یہ دن دکھائے، میں نے تین الفاظ اختیار کر لیے ہیں: السُّکُوتُ والصَّبْرُ وَالْغِنَی اِنھی تینوں پر اب بھی قائم ہوں۔ زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دار العلوم کا پہلا رنگ، جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور

فیصلے ایک راے سے ہوتے تھے، پھر بہ حال ہو جائے۔ آں محترم سے دعا کی درخواست ہے۔ و الأمرُ بیدِ اللّٰہِ الکریم۔

والسلام

محمد طیب غفرلہ

۱۹۸۳/۵/۷ء

اختلافِ دارالعلوم اور بابصیرت علما کی راے

برِّ صغیر کے چوٹی کے علما و مفکرین، جنھیں اِن اختلافات سے دلی دکھ ہوا، اُن میں سے ہر ایک کی دلی آرزو تھی کہ کاش یہ دل گداز واقعہ، قاری محمد طیبؒ کی اِس بڑھاپے کی عمر میں رونما نہ ہوا ہوتا، اُن کی وفات (جو اِس واقعے کے دوران ہی دو ایک سال کے اندر ہی واقع ہو گئی اور کہنا چاہیے کہ شاید یہی واقعہ، اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا) کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ ہوتا؛ لیکن مُقدَّرات کو کسی تدبیر سے ٹالا نہیں جا سکتا تھا، چناں چہ یہ واقعۂ جاں گداز، حکیم الاسلامؒ کی آخری زندگی میں پیش آ کر رہا اور اُنھوں نے ایسی تلخ کامیاں دیکھیں، جن سے اُنھیں اپنی زندگی میں کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

اُن کے لیے، زیادہ دُکھ کی بات یہ تھی کہ وہ اِس جھگڑے میں اَصلاً بالکل ہی فریق نہ تھے؛ کیوں کہ جھگڑا انٹنا اُن کی فطرت کے یکسر خلاف تھا۔ مجھ سے کئی ثقہ عالم نے یہ بات کہی کہ حضرت حکیم الاسلام نے کئی بار اپنی جماعت کے لوگوں سے فرمایا کہ بھئی! اگر تمھیں لڑنا ہے تو قائد اور سپہ سالار بدل لو، میں دارالعلوم کے حوالے سے کسی اختلافی جھگڑے کی قیادت کا کسی طرح بھی اہل تھا نہ ہوں۔

البَلَایَا لِلْمُجْرِمِیْنَ عُقُوْبَاتٌ، وَلِلْأَبْرَارِ مُکَفِّرَاتٌ، وَلِلْمُقَرَّبِیْنَ دَرَجَاتٌ (مصائب گنہ گاروں کے لیے سزا، نیکوں کے لیے گناہوں کا کفارہ اور مقربین بارگاہِ الٰہی کے لیے رفعِ درجات کا ذریعہ ہوتے ہیں) کی روشنی میں تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ انسان ہونے کی وجہ سے حکیم الاسلامؒ سے جو خطائیں ہوئی ہوں گی، اُن کی تکفیر اور اُن کے درجات کی بلندی کے لیے، ربِّ کریم نے، اِن روح فرسا واقعات سے اُنھیں

گزارا؛ تاکہ وہاں اُنھیں اپنی کسی تقصیر کا کوئی مشکل حساب نہ دینا پڑے اور اپنے رب کی اعلیٰ جنت کے مکین بنیں، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهُ وارْحَمْه وارْفَعْ دَرَجَته فِي جنّتِك .

قاری صاحبؒ کی وفات کے سال ہا سال بعد تاخیر سے سہی، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کے جگر گوشہ حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ اور حکیم الاسلام کے صاحب زادۂ گرامی قدر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ نے بہت اچھا کیا کہ، دارالعلوم کی تاریخ پر بدنما داغ کی حیثیت رکھنے والے اس اِختلاف کو از خود ختم کرلیا اور نہ صرف یہ دونوں؛ بل کہ دونوں کی جماعتوں، اہل خاندان اور رفقاے کار نے بھی ایک دوسرے کے حوالے سے اپنا دل صاف کرلیا اور آخرت تک دلوں کی کدورت کو دراز ہونے نہیں دیا۔ فَجزَاهُمَا اللّٰهُ خَيْرًا۔

حکیم الاسلام اور دفاعِ دین وملت

قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اُن تمام صفات سے بہرہ ور کیا تھا، جن سے دین کی ترجمانی، اسلام کے دفاع، کتاب وسنت کی عملی و علمی شرح اور امتِ مسلمہ ہندیہ کی علمی وفکری ودینی رہ نمائی کے لیے، وقت کا اُن کے ایسا مطلوبہ عالم تشکیل پاسکتا تھا۔ وہ انتہائی وجیہ الشکل، روشن رو، مردانہ حسن کی مثال، نرم خو، خوش خصال، کریم النفس، حلیم ومتواضع، خندہ رو، کشادہ نفس اور پرکشش موہنی صورت کے حامل ہونے کے ساتھ، کتاب وسنت کے علوم پر نہ صرف بصیرت مندانہ گہری وہمہ گیر نظر رکھتے تھے؛ بل کہ علمی استحضار، فکری بیداری، استنتاجی صلاحیّت اور شریعت کے اُصول ونصوص کو عصرِ حاضر کے حالات وواقعات پر منطبق کرنے کا اپنے اَکابر ومشایخ کی طرح بے نظیر کمال رکھتے تھے۔ اِمام غزالیؒ (ابوحامد محمد ۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء-۵۰۵ھ/ ۱۱۱۱ء) امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (احمد بن عبدالرحیم ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۳ء-۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) اور اپنے جدِّ امجد امام محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء-۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کی کتابوں اور اسرارِ شریعت کے حوالے سے اُن کے افکار وخیالات کو کماحقُّہ پی چکے تھے، اِسی کے ساتھ وہ بڑے ذہین، ذکی الحس، حاضر

جواب، ظریف الطبع تھے۔ خدائے حکیم ووہاب نے اُنھیں شیریں بیانی، ترتیبِ مضامین اور مشکل سے مشکل مضمون کو عام فہم اور بڑے خوب صورت انداز میں پیش کرنے کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔ وہ جس جگہ ہوتے، اُن کی معصومیت اور علم وعمل کی جامع پرکشش شخصیت دعوتِ نظارہ دیتی اور لوگ ٹوٹ کے اُن سے محبت کرتے، ایسا لگتا تھا کہ خلقِ خدا کے دل، اُن کے لیے مسخر کردیے گئے ہیں، لوگ اُن سے صرف محبت کرتے تھے اور اُن سے محبت کے لیے اپنے کو مجبور پاتے تھے، اُن کو دیکھنے اور سننے اور اُن سے ملنے والا شاید ہی کوئی ''عجوبہ'' انسان رہا ہوگا، جس کا دل اُن کی طرف مائل نہ ہوا ہوگا۔ زندگی کے اُن کے سارے رویّوں میں محبوبیت تھی، وہ ہر جگہ مرکزِ توجّہ ہوتے اور لوگ اُنھیں ایک نظر دیکھ لینے کے لیے بے تاب نظر آتے۔

اِسی کے ساتھ وہ عالی نسب صدیقی خاندان کے چشم وچراغ تھے، وہ نصف صدی سے زائد عرصے یعنی تقریباً ساٹھ سال تک برّصغیر کے سب سے بڑے اور سب سے بابرکت اور تقویٰ اساس اِدارہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے، جو اِس وسیع تر دیار میں جسمِ اسلامی میں دھڑکتے ہوئے دل کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس کو اللہ نے اِس دیار میں جو مقبولیت ومحبوبیت ومرجعیت عطا کی ہے، اپنی سی ساری کوششوں کے باوجود کوئی دینی اِدارہ اُس کو، اِس کے حوالے سے تادمِ تحریر چیلنج نہیں کرسکا؛ کیوں کہ اُس کو یہ سعادت خدائے بخشندہ کی بخشی ہوئی ہے، اُس کے اپنے ''زورِ بازو'' کا نتیجہ نہیں۔

قاری محمد طیبؒ کو دیکھ کر دل گواہی دیتا تھا کہ اِس غیر معمولی اِدارے کے لیے، اِسی طرح کا غیر معمولی مہتمم اور ذمّے دارِ اعلیٰ ہونا چاہیے تھا، گویا وہ اِس اِدارے کے لیے خدائی انتخاب تھے، اِسی لیے پورے برِصغیر میں جہاں بھی وہ جاتے، لگتا تھا کہ پورا دارالعلوم وہاں آگیا ہے۔ برِصغیر میں جہاں بھی صرف ''مہتمم صاحب'' کہا جاتا تھا، تو از خود ذہن مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ ہی کی طرف جاتا تھا، گویا اُن کا دوسرا عرفی نام ''مہتمم صاحب'' ہی ہوگیا تھا۔ جیسے پورے برِصغیر میں سیکڑوں دارالعلوموں کے

بیچ اگر صرف ''دارالعلوم'' استعمال کیا جائے، تو ہر کسی کا ذہن ''دارالعلوم دیوبند'' ہی کی طرف جاتا ہے۔ میرے پاس ''الداعی'' کی بہت سی ڈاک ایسی آئی، جس پر صرف ''دارالعلوم انڈیا'' لکھا ہوا تھا اور وہ مجھے مل گئی۔

برِّصغیر میں اگر کوئی دینی اِدارہ مسلمانوں کے دل ونگاہ کے لیے واقعی مرکزِ توجّہ ہے، تو وہ دارالعلوم دیوبند ہی ہے کہ اگر اُن پر کوئی دینی واجتماعی افتاد پڑے؛ اُن کے شعائر پر عمل کی راہ میں کسی طرح کی رکاوٹ کھڑی کی جائے، یا کوئی حل طلب پیچیدہ دینی مسئلہ آن کھڑا ہو، تو ہندی مسلمان سب سے پہلے دارالعلوم کی طرف دیکھتا ہے اور ہر نازک وقت میں اُسی کا سہارا لیتا ہے اور دین وعقیدہ وعبادت واحکام پر آنے والی کسی بھی آنچ کو فرو کرنے کے لیے، وہ دفعتاً اُسی سے مدد کا طالب ہوتا ہے۔

دفاعِ دین کے تئیں دارالعلوم کا دیرینہ کردار

انگریزی استعمار کے دور میں بھی نومبر ۱۹۱۷ء (صفر ۱۳۳۶ھ) میں جب یہ خطرہ درپیش تھا کہ استعماری حکومت مسلمانوں کے عائلی قانون میں تغیر وتبدّل کا اِرادہ رکھتی ہے، تو اُس وقت دارالعلوم دیوبند نے، دس دفعات پر مشتمل ایک میمورنڈم تیار کیا، جو اُس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد (بن امام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء - ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء والدِ ماجد حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کی سربراہی میں ایک موقر وفد دہلی میں برطانوی وزیرِ ہندوستان سے ملا۔ اِس میمورنڈم میں واضح کیا گیا کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل سے، برطانوی گورنمنٹ چھیڑ چھاڑ نہ کرے؛ کیوں کہ مسلمانوں کو یہ کسی طرح بھی گوارا نہ ہوگا۔ اِس میمورنڈم میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلم پرسنل لا کو برپا کرنے کے لیے عہدۂ قضا قائم کیا جائے، نیز مسلمانوں کے مذہبی شعائر: مساجد، مدارس، مقابر، اوقاف، خانقاہوں اور دوسرے دینی رفاہی اِداروں کے تحفظ کے لیے، شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا جائے۔ ان مطالبات پر دارالعلوم نے، اس دور کے ہر فکر وخیال کے پانچ سو علما کے توثیقی

دستخط حاصل کیے تھے۔

۱۹۲۹ء (۱۳۴۸ھ) میں عہدِ استعمار میں مسلم اوقاف کا مسئلہ اٹھا جو مسلم پرسنل لا ہی کا ایک حصہ تھا، برطانوی استعماری حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے، اُس وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء-۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی نگرانی میں وقف بل کے مُسوّدے پر، شریعت کی روشنی میں تنقید کرتے ہوئے حکومت کی طرف سے پیش کردہ اِشکالات کا تحریری حل پیش کیا گیا اور ایک تحریر بہ عنوان "الإنصاف في قانون الأوقاف" مرتب کی گئی، جس پر سارے لائقِ ذکر علما کے دستخط ثبت ہوئے اور اِس سلسلے میں ساری ممکنہ مساعی عمل میں لائی گئیں۔

۱۹۴۷ء (۱۳۶۶ھ) سے کچھ پہلے، علماے دیوبند کی طرف سے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے ایک کتاب "الحيلة الناجزة" شائع کی، جس میں ظالم خاوندوں کی پسی ہوئی بے بس عورتوں کی گلوخلاصی کی شرعی صورتیں پیش کی گئی تھیں۔ اِس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند نے، علما کی ایک کمیٹی قائم کی، جس نے اُن ہی شرعی اُصولوں کی روشنی میں فیصلے کیے اور سیکڑوں عورتوں کو ظالم شوہروں سے رہائی ملی۔

۱۹۴۷ء (۱۳۶۶ھ) میں آزادیِ وطن کے کچھ ہی دنوں بعد، حکومت کی طرف سے تنسیخِ زمین داری کا مسئلہ اُٹھا، جس کا اثر اوقاف کی زمینوں پر بھی پڑتا تھا، جو مسلم پرسنل لا ہی کا بنیادی جزو تھا، اِس سلسلے میں مسلمانوں کا ایک وفد، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیادت میں مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء-۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) سے ملا، دوبارہ یہی وفد لکھنؤ میں یوپی کے وزیرِ اعلیٰ پنڈت گووند ولبھ پنتھ (۱۸۸۷ء-۱۹۶۱ء) سے ملا اور یوپی کونسل میں وزرا کی موجودگی میں اوقاف کے چیرمین کے ساتھ اِس مسئلے پر غور وخوض ہوا۔ الغرض دارالعلوم اور اُس کے اکابر نے، ہمیشہ دین وملت کی بھلائی کے لیے، اِس ملک میں وہ سب کچھ کیا جو اُس کے بس میں تھا۔

قاری محمد طیبؒ کے سر
عظمت وتقدس کے تاج کے سجنے کی ایک بڑی وجہ

اِس عظیم اِدارے کا اِتنے عرصے تک لیاقت واستحقاق کے ساتھ انتظام وانصرام کی باگ ڈور سنبھالنے کی وجہ سے بھی قاری محمد طیب کو وہ عزت واحترام ملا، جو کسی عالمِ دین کو نہ مل سکا۔ دارالعلوم کے سر پر، عظمت وتقدس کا جو تاج سجا ہوا ہے، اُسی کی وجہ سے، اُس کے ہر اُستاذ وملازم کو بے مثال احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور محض اُس کی طرف انتساب کی وجہ سے بھی، کسی بھی فرد کی بڑی عزت وتکریم کی جاتی ہے، خواہ وہ اپنی جگہ پر بے استعداد اور معمولی انسان، ہی کیوں نہ ہو۔ اب اگر قاری محمد طیب جیسا آدمی، اُس کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہو تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے لیے عزت واحترام کا کیسا جذبہ مَوجْ زَن رہا ہوگا۔

اِسی لیے عہدے، مناصب اور اِعزازات اُن کے قدموں میں ازخود آ کر گرتے رہے، اُنھوں نے یا اُن کے لوگوں نے اُن کے حصول کے لیے خواہش کی نہ کوشش، کیوں کہ اُن کے حیات ہوتے ہوے کسی بڑے دینی منصب کے لیے، ازخود سبھوں کی نظریں اُنھی کی طرف اُٹھتی تھیں، وہ گویا ہر دینی منصب اور عہدے کے لیے بنے بنائے صدر تھے۔

قاری محمد طیب صاحبؒ کو اِس برگزیدہ اِدارے کے اِس عظیم منصب پر فائز ہونے کا ہمیشہ ذمّے دارانہ اِحساس رہا، چناں چہ اُنھوں نے خدا کی توفیق سے، ہمیشہ اُن ذمّے داریوں سے بہ خوبی اور ثمرآور طور پر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی، جو اُن پر دارالعلوم جیسے کعبۂ مقصود اِدارے کا مہتمم ہونے کی وجہ سے عائد ہوتی تھیں۔ اُنھوں نے "اسلام اور مسلمانوں کے دفاع" کے ہمہ گیر محاذ پر قائدانہ رول ادا کیا؛ کیوں کہ اُن کے اسلاف ومشائخ بھی اِس حسّاس محاذ کے غیرت مند سپاہی وقائد تھے، انگریزی سامراج کے خلاف اُن کے سر بہ کف میدان میں اُترنے کے طفیل ہی ہمارا ملک، اُس کی غلامی سے آزاد ہوا، نیز اُنھوں نے باطل فرقوں اور

تخریب پسند تحریکوں اور دعوتوں کے خلاف بھی کام یابی سے محاذ چھیڑا اور اُس کو جیتا۔ عیسائی مبلّغین سے لوہا لیا، قادیانیت کو کفر ثابت کیا اور برِ صغیر میں، اُس کی تلبیسی دعوت کا پردہ چاک کیا اور یہاں مسلمانوں کو مسلمان باقی رہنے کی کام یاب تدبیریں کیں۔

مولانا قاری محمد طیبؒ نے، اپنے اساتذۂ کبار کے ساتھ، ان باطل فرقوں کے تعاقب میں اپنی نوجوانی سے حصّہ بٹایا اور بعد کے دور میں ہندو اِحیا پرستی کے خطرات سمیت اہل بدعت اور اسلامی تعلیمات کے خلاف اُٹھنے والی ہر انتہا پسندی کے توڑ کے لیے، قائدانہ کردار ادا کیا۔ اُن کی زبان اور علمی بے پناہی، دونوں اُن کی پوری زندگی میں صحیح اسلام کے لیے ڈھال ثابت ہوئیں، وہ سچے دین کی سچی تعبیر کے حوالے سے؛ اپنی مثال آپ تھے، اِس سلسلے میں اُن کا اندازِ کار بھی اُن کی ذات ہی کی طرح بے مثال اور نرالا تھا کہ وہ اسلام کی حقانیّت کی اِس طرح تشریح کرتے تھے کہ اُس کے کسی شدید سے شدید معاند کو بھی، اُس سے کوئی دشمنی نہ ہوتی تھی اور نہ مسلمانوں کے خلاف کوئی منفی جذبہ، اُن کے دل میں بیدار ہوتا تھا، وہ "كَلِّموا النَّاسَ عَلَى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" کا بہترین نمونہ تھے، قول و فعل میں حکمتِ عملی پر کار بندی، اُن کی فطرتِ ثانیہ تھی، اُنھوں نے اپنے کسی کردار سے، مسلمانوں کے لیے لاشعوری طور پر بھی کبھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا اور نہ مخالفینِ اسلام و مسلمین کو اِس کا کوئی موقع بہم پہنچایا۔ وہ اِس حوالے سے بھی سیرتِ نبوی پر کار بندی کا قابلِ تقلید نمونہ تھے۔ وہ کبھی مشتعل ہوتے تھے نہ کسی کو مشتعل ہونے کا موقع دیتے تھے، وہ پھول کی طرح کھلتے اور مہکتے تھے، خوشبو کی طرح پاکیزگی بکھیرتے تھے، بلبل کی طرح چہکتے تھے۔ دھیما پن، سنجیدگی، ہر گوشۂ زندگی میں عالمانہ رویّہ اور صالحانہ انکسار، اُن کی ذات و صفات کا طرّہ امتیاز تھا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کی جدّ و جہد

آزادی کے بعد کے ہندوستان میں، اِسلامی شرائع کی حفاظت کا مسئلہ انگریزوں

کے دور سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ثابت ہوا، اِس حوالے سے دارالعلوم کے اکابر ومشائخ نے اپنا قائدانہ کردار اُسی طرح ادا کیا، جس طرح استعماری عزائم کے خلاف ادا کیا تھا۔ حالات وواقعات نے اندازِ کار کو بدل دینے کی دعوت دی، تو وہ نئی صورتِ حال سے بڑی چابک دستی سے بہ عجلت تمام ہم آہنگ ہوگئے۔ اِس حوالے سے اپنے اَساتذہ واسلاف کے بعد قاری محمد طیبؒ کا کردار بڑا نمایاں اور ممتاز رہا۔

اِس ملک میں آزادی کے بعد سے ہندو اِحیا پرستی اور سرکاری وغیر سرکاری تعصب وتنگ نظری کے ہاتھوں مسلمانوں کو اپنی دینی شناخت کے ساتھ جینے کے لیے، بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ اُن کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ہر سَمت سے کھڑی کی جاتی رہی ہیں، جس کا سلسلہ دن گزرنے کے ساتھ اور شدّت اختیار کرتا رجارہا ہے۔ اِتنے مسائل پیدا کیے جاتے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی تعمیر کے لیے کوئی موقع نہیں ملا، وہ ہمیشہ اُن مسائل سے نمٹنے ہی میں اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بہ طورِ خاص مسلمانوں کے پرسنل لا پر زور شور سے حملہ کیا گیا۔ ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء میں شاہ بانو کیس کا فتنہ کھڑا کیا گیا اور مسلمانوں کے نام نہاد مغرب زدہ روشن خیال دانش وروں کے ذریعے، یہ شور مچوایا گیا کہ اِسلامی شریعت عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، تو اُس کا علمی جائزہ لینے اور اُس کے بارے میں پیش کردہ شبہات کی جواب دہی کے لیے، حضراتِ اساتذہ واَربابِ اِفتا دارالعلوم دیو بند کی ایک مسلم پرسنل لا کمیٹی بنائی گئی؛ تاکہ وہ اُن مسائل کے سلسلے میں مدلّل دفاع کا فریضہ انجام دے، چنانچہ کمیٹی نے خاطر خواہ طریق پر اپنا کام انجام دیا، اِس سلسلے میں اولاً حضرت حکیم الاسلامؒ نے ممتاز فضلاے دیو بند کا ایک اجتماع ۱۴؍ مارچ ۱۹۷۲ء (۲۶؍ صفر ۱۳۹۲ھ) کو دارالعلوم میں طلب کیا، جس میں ملک کے دوسرے دانش وروں کو بھی دعوت دی گئی، وجہ یہ تھی کہ اِس مسئلے کے بارے میں ہر چند حضرات علماے کرام نے بلاشبہہ کافی توجّہ فرمائی، مضامین ومقالات اور رسائل شائع کیے؛ لیکن یہ ساری جدوجہد انفرادی اور شخصی

طور پر ہوئی، ضرورت تھی کہ اجتماعی طور پر، اس مسئلے کا شرعی موقف سامنے آئے اُسی پر گورنمنٹ بھی توجّہ دے سکتی تھی، اِس نقطۂ نظر سے، حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ نے اولاً علماے دیوبند کے منتخب حضرات اور ملک کے دوسرے مشاہیر اہلِ دانش کو دارالعلوم میں جمع ہونے کی دعوت دی، چناں چہ مُتعَدّد مقامی اور غیر مقامی مفکّرینِ ملت شریک ہوے؛ تاکہ پرسنل لا کے بارے میں شرعی موقف متعین کیا جائے۔ اِس اجتماع میں بحث وتمحیص کے بعد، ایک مشترکہ بیان اور سوال نامہ مُرتَّب کیا گیا، ساتھ ہی اِس اجتماع نے ایک آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کی تجویز منظور کی اور اُس کی تیاری کے لیے اجتماع نے ایک تیاری کمیٹی بنائی، جس میں مقامی کمیٹی کے متعدد ممبران، اَراکینِ شوریٰ، ماہرینِ قانون اور دانش وروں کو بہ حیثیت رکن تیاری کمیٹی شامل کیا گیا، اِس کمیٹی کے کئی اِجلاس دارالعلوم میں ہوے، تیاری کمیٹی کا ایک اجتماع اوائلِ مئی ۱۹۷۲ء میں ہوا، جس میں متعلقہ سوال نامہ زیرِ بحث آیا، جسے طبع کرا کر ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے علما ومفتیانِ کرام، مفکّرین اور دانش وروں کے پاس بھیجا گیا اور اُن سے درخواست کی گئی کہ جولائی تک جوابات روانہ کردیے جائیں، اُن جوابات پر غور کرنے کے لیے مقامی تیاری کمیٹی کا اِجلاس، دارالعلوم میں ۲ر جمادی الاُخری ۱۳۹۲ھ (۱۴ر جولائی ۱۹۷۲ء) کو منعقد ہوا اور اُس میں طے کیا گیا کہ اُن جوابات پر مزید غور وفکر کرنے اور مجوّزہ اجتماعِ عام کی تاریخیں مقرر کرنے کے لیے، تیاری کمیٹی کا اِجلاس ۵، ۶ر رجب ۱۳۹۲ھ (۱۵، ۱۶ر اگست ۱۹۷۲ء) کو دارالعلوم دیوبند میں بلایا جائے، چناں چہ مقررہ تاریخوں میں یہ اِجلاس منعقد ہوا، اِس موقع پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء-۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء) حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء-۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء) حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء-۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء) حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب (۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء-۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء-۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء) جناب ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی صاحب لکھنویؒ، جناب مولانا عبدالقادر صاحب

مالیگاؤنویؒ، حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب امارتِ شرعیہ بہار (۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء-۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء) جناب مولانا برہان الدین صاحب مدظلہ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ (۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۸ء-۰۰۰۰/۰۰۰۰) اور اَراکینِ مسلم پرسنل لا کمیٹی دارالعلوم دیوبند نے شرکت کرکے بحث میں حصہ لیا۔

اِس جلسے میں شریک علما و اکابر نے مطبوعہ سوال نامے کے جوابات سننے کے بعد جو دارالعلوم کے اساتذہ اور فضلا نے مرتب کیے تھے اور جن کے لیے حضرت حکیم الاسلام نے اُن کے پاس چند رہنما اُصول پہلے ہی سے اِرسال کردیے تھے، سب نے اِس پر اظہارِ مسرّت کیا کہ وقت کے اِن اہم ترین مسائل پر علما کے جوابات محققانہ اور عقلی ونقلی دلائل سے مزیّن ہیں، جن سے مسائل زیرِ بحث میں اسلامی موقف پوری طرح کھل کر سامنے آ گیا ہے اور یہ ثابت کردیا گیا ہے کہ شریعتِ اسلامی کے ناقابل تبدیل اُصول، ہر دور کے مسائل کا خاطر خواہ حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انسانیت کی فلاح کے ضامن ہیں۔

تیاری کمیٹی کے فیصلے کے مطابق مجوّزہ عام اجتماع کی تاریخ اور مقام طے کرنے کے لیے پانچ افراد کے ایک وفد نے، جو حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ، مولانا سیّد منّت اللہ رحمانی (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء) مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ اور مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلّہ (۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء-۰۰۰۰/۰۰۰۰) پر مشتمل تھا، بمبئی (اب ممبئی) کا دورہ کیا، بمبئی کے مخلص اور حوصلہ مند مسلمانوں نے بڑی خوشی اور گرم جوشی سے اِس کا ذمہ لیا کہ یہ آل انڈیا کنونشن بمبئی میں منعقد ہو، چناں چہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کے لیے ۲۰، ۲۱، ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ (۲۷، ۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء) کی تاریخیں طے ہوگئیں، مقصد کی اہمیّت کے پیشِ نظر یہ مناسب اور مفید سمجھا گیا کہ ہندوستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے اکابر اور معروف و مسلم تنظیموں کے سربراہوں کی طرف سے مشترکہ دعوت نامہ جاری کیا جائے، چناں چہ ۲۷، ۲۸/دسمبر ۱۹۷۲ء = ۲۰-۲۱/ذی قعدہ

۱۳۹۲ھ کو یہ عظیم کنونشن، اپنی غیر معمولی خصوصیات کے ساتھ، بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں ہندوستان کی تمام مسلم جماعتوں نے حصہ لیا۔

مسلمانانِ ہند کے مختلف مکاتبِ فکر کے اجتماع اور نمایندگی کے لحاظ سے یہ کنونشن جس قدر غیر معمولی تھا، اُسی حد تک خدا تعالیٰ نے اُسے کام یاب بھی کیا، کنونشن کے داعیوں اور مندوبین کی متفقہ رائے سے، جن میں سنی، شیعہ، مہدوی، بریلوی، اہلِ حدیث اور جماعتِ اِسلامی کے علاوہ، دوسری سیاسی غیر سیاسی جماعتوں کے رہنما موجود تھے، حکیم الاسلام قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم کو کنونشن کا صدر منتخب کیا گیا، ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف مذہبی مکاتبِ فکر اور طبقات میں سے کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں رہا، جس کے اکابر علما وزعما کنونشن کے پلیٹ فارم پر جمع نہ ہوگئے ہوں، اِس کنونشن نے اور دوسرے لفظوں میں ہندوستان کے تمام مکاتبِ فکر کے مسلمانوں نے، متحدہ آواز کے ساتھ اپنے ریزولیوشن کے ذریعے اِعلان کردیا کہ وہ کسی حالت میں بھی، مسلم پرسنل لا میں تغیر وتبدّل کو گوارا نہیں کرسکتے، یہ شریعتِ اسلامی کا ایک حصہ ہے، اِس متحدہ آواز کا اثر ملک اور حکومت دونوں پر پڑا اور اِس ذریعے سے ہندوستان کے تمام مسلمان، وحدتِ کلمہ کی بنا پر متحد ہوگئے، جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک بے مثال صورتِ حال تھی۔

تحریکِ خلافت کے بعد، یہ پہلا موقع تھا کہ ہر مکتبِ فکر کے مسلمانوں نے متحد ہوکر اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر، اسلامی اتحاد کا ثبوت دیا، اِس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا دوسرا عظیم اجتماع حیدرآباد میں منعقد ہوا، اِس جلسے کی ورکنگ کمیٹی نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اور جنرل سکریٹری امیرِ شریعت بہار واڑیسہ مولانا منت اللہ صاحب رحمانیؒ کو منتخب کیا۔

بمبئی کے کنونشن کا بنیادی مقصد پرسنل لا کا تحفظ اور ترمیم سے اُس کا بچاؤ کرتے ہوے، تمام مکاتبِ فکر کے اہلِ علم وفضل اور دانش وروں کو یہ اعلان کرنا تھا کہ مسلمانانِ ہند خواہ اُن کا تعلق کسی مکتبِ فکر سے ہو، اپنے پرسنل لا کے تعلّق سے کسی ایسے قانون کو

قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جو پرسنل لا کے کسی ایک شرعی جزیئے پر بھی اثر انداز ہو، بالفاظِ دیگر مسلمان اپنی معاشرتی اور ثقافتی خصوصیات اور امتیازات کو فنا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، جن پر اُن کے ملی وجود کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور اُن کا ممتاز شرعی اور قومی امتیاز قائم ہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اِس دورِ آخر میں ''دفاع عن الاسلام'' کے حوالے سے آزاد ہندوستان میں پہلا اور سب سے طاقت ور وسیع البنیاد پلیٹ فارم ثابت ہوا اور اپنی تاسیس کے بعد سے اب تک (نصف ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ابتداے مارچ ۲۰۱۰ء، جس وقت یہ مضمون طباعت کے لیے تیار کیا جا رہا ہے) کسی نہ کسی شکل میں یہی اِس وقت مسلمانوں کے لیے، اسلامی قوانین پر آنے والی، کسی بھی آنچ سے حفاظت کا طاقت ور اور متحدہ اسٹیج ہے اور اِس کی تعمیر کا اصل سہرہ حکیم الاسلامؒ اور دارالعلوم دیوبند کے سر جاتا ہے، جو ہمیشہ ہندی مسلمانوں کے لیے ''دفاع عن الاسلام'' کا اولیں قائد رہا ہے۔ حکیم الاسلامؒ، تاحیات اِس کے متفقہ صدر، سربراہ اور راہ نما رہے۔(۱)

حضرت حکیم الاسلام یعنی لاثانی خطیب

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

خداے علیم وخبیر کو گواہ بنا کے یہ ناچیز یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اُس نے اپنی زندگی میں، ہندوستان کے طول وعرض میں اور برِّصغیر کے وسیع تر خطے میں، کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا، جس نے وعظ وتقریر کے اسٹیج پر بیٹھ کے، لوگوں کے دلوں اور جذبات پر؛ اپنے علم کی

(۱) اِس مضمون کا، یہاں تک کا بڑا حصہ عربی میں، حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات کے کچھ ہی روز بعد لکھا گیا، جو پندرہ روزہ ''الداعی'' کے شمارہ ۱۹، جلد ۶، ۱۰/اگست ۱۹۸۳ء مطابق ۳۰/شوال ۱۴۰۳ھ میں شائع ہوا۔ اردو میں اِس کو راقم نے خود یک شنبہ: ۲۰/ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ مطابق ۷/مارچ ۲۰۱۰ء کو اضافے کے ساتھ تحریر کیا۔

بے پناہی؛ معلومات کی کثرت؛ مطالعے کی وسعت؛ بھرپور دماغی سرمایہ؛ کتاب وسنت اور اُن کے سرچشمے سے نکلے ہوئے علوم پر کامل عبور؛ رموزِ شریعت سے غیر معمولی آگاہی؛ اسلام، اسلامی احکام وقوانین وآداب کو پیش کرنے کے انمول اور خوش نما انداز؛ نیز اپنی شیریں گفتاری، سلاستِ لسانی، جادو بیانی، حسنِ ظاہر، سلیقۂ پوشش، عالمانہ وقار، مومنانہ استحضار، متکلمانہ شان، صالحانہ اندازِ تکلم، مناظرانہ طرزِ استدلال اور اپنی دھیمی، مرتب، حکمت ریز ﴿و﴾ علم خیز موتی کی لڑی جیسی تقریر سے، اِس طرح قابو پانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، جیسی حجۃ الاسلام، حضرۃ الامام محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ = ۱۸۳۲-۱۸۸۰ء) بانیِ دارالعلوم دیوبند کے نبیرۂ عظیم اور جگر گوشۂ نانوتوی دارالعلوم کے سابق مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (۱۲۷۹-۱۳۴۷ھ = ۱۸۶۲-۱۹۲۸ء) کے مجسمِ علم وہنر صاحب زادے اور اپنے دور میں دارالعلوم کی عالمی شہرت وعزت کے یکتا ضامن: حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قدس سرہ العزیز (۱۳۱۵-۱۴۰۳ھ = ۱۸۹۷-۱۹۸۳ء) رکھتے تھے۔

بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

وہ جب محوِ تکلم ہوتے تو سچ مچ لگتا کہ ''بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں'' یا کوئی معصوم فرشتہ وحیِ الٰہی کی ادائیگی میں مشغول ہے۔ اُن کی تقریر میں زیادہ اتار چڑھاؤ نہ ہوتا، وہ میدانی ندیوں کی طرح دھیمی رفتار سے بہتے اور مسلسل اور بلا انقطاع بہتے۔ اپنی آواز سے کسی کے لیے، باعثِ سمع خراشی ہوتے، نہ اپنے پر جوش و پرشور اندازِ گفتار سے کسی کے لیے باعثِ اذیّت، نہ وہ بہ تکلّف ہنسی کا ماحول بنانے کے لیے کوئی ''کرتب'' دکھاتے، نہ وہ ہاتھ کو ناپسندیدہ انداز میں حرکت دیتے، نہ انگلیوں کے مکروہ اشاروں کا سہارا لیتے، نہ گرجتے برستے، نہ منھ سے جھاگ نکالتے، نہ ''آنکھیں دکھاتے'' نہ عام مُقرّرِین کی طرح منھ چڑاتے، نہ دین کا ''بے وجہ'' نشا، اُن کو بدمست کرتا، نہ مسلمانوں

کے حالِ بد کا واقعی اِدراک اُن کے لیے مصنوعی آنسوؤں کے چھلکنے کا باعث بنتا، نہ حاضرین کی طرف سے داد کے طالب ہوتے، نہ ستایش کی تمنا کرتے، نہ صلے کی پرواہ۔ وہ نرمی، گدازی، اور حلم وکرم کے ساتھ، اِس طرح بولتے جیسے شیریں خواب، محوِ خواب اِنسان کے دل ودماغ کو، لذّت وانبساط اور تازہ دمی کی خوش گواری سے، عجیب سی نہ ختم ہونے والی مسرّت بخش جاتا ہے۔

وہ بولتے تو موتی پروتے۔ وہ اسلام کی سچائیوں کو اِس طرح آشکارا کرتے جیسے کوئی پھول نچھاور کررہا ہو۔ وہ جہنم سے ڈرانے جنّت کا لالچ دلانے میں، عام مقرروں کی طرح کسی ''انتہا پسندی'' کا سہارا لیتے، نہ کوئی غیر معمولی انداز اختیار کرتے، جس سے آدمی چینٹ منٹ بعد ہی بالیقین اُوب جاتا ہے۔ نہ وہ الفاظ کی تلاش میں سر کھپاتے، نہ تعبیرات کا پیچھا کر کے درماندہ ہوتے، نہ لفظیّات کا جمال اُن سے خیانت کرتا، نہ خیالات کی خوبی اُن سے دغا کرتی، نہ افکار کا جادو سرتابی دکھاتا؛ بل کہ یہ سارے کے سارے، اُن کے سامنے دست بستہ اور اِنتہائی نیاز مندی کے ساتھ کھڑے رہتے اور اپنی بندگی میں قبول کر لینے کے لیے، اُن سے بے طرح آرزو اور منّت کرتے۔ خیالات کا آبشار، فکرِ ارجمند کے ہمالیہ سے، اِس طرح تسلسل کے ساتھ گرتا کہ سامعین کے لیے، اُس کو سمیٹنا مشکل ہوتا؛ لیکن اُن کی — سامعین کی — خوشی اور سرمستی کا عالم دیدنی ہوتا۔ اُن کے لیے معمولی سے معمولی موضوع کو جو عام سامعین کے نزدیک کسی معنویّت کا حامل نہ ہوتا گراں قدر بنا دینا، بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ عوام کے نزدیک تمام تر بے وقعتی رکھنے والے مضمون پر بھی عام طور پر دو تین گھنٹہ بول لیتے تھے اور سامعین اِس طرح شوق وذوق سے سنتے رہتے، جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں صرف اور صرف حضرت حکیم الاسلامؒ ہی کو ایسا مقرر پایا جس کے سامعین واقعی باتمکین ہوتے تھے، مضمون کی لذّت، جو اکثر اندازِ سخن سے پیدا ہوتی تھی، کسی سامع کو اپنی ''بدذوقی'' کا مظاہرہ کرنے کا کوئی موقع نہ دیتی تھی۔ کسی پر اسْتنجے کا دباؤ اُس کو اپنی

جگہ سے اُٹھنے پر مجبور کرتا، نہ تمبا کو نوشی کی عادت کا اضطرار کسی کو اپنی جگہ چھوڑنے پر گدگداتا، نہ پیاس کی شدّت کسی کو ستاتی، نہ کوئی اور عارضہ کسی کے لیے جلسے کی پرسکون فضا میں ادنیٰ سے انتشار کو جنم دینے کی دعوت دیتا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اتنے باذوق و پرشوق، لذّت کے رسیا، معلومات کے انوکھے پن کے اتنے دل دادہ اور اپنے مُخاطِب کے اتنے باوفا و قدر شناس سامع، ہمارے ہوش میں کسی کو نہ ملے ہوں گے، جتنے قاری محمد طیب صاحب نَوَّرَ اللّٰہ مرقدہ کے ملے۔ یہ سامعین کی خوش نصیبی تھی کہ اُنھیں اُن جیسے پھول برسانے، راحت پہنچانے، لذّت دینے اور خوشیاں لٹانے والے مُقرِّر و واعظ ملے کہ جب وہ اپنی عمومی طور پر دراز نفس تقریر کو دعائیہ کلمات اور رخصت کے الفاظ پر ختم کرنے کا اِعلان کرتے، تو نہ صرف اُن کی — سامعین کی — زبان سے بہ یک زبان افسوس کے الفاظ نکل پڑتے؛ بل کہ جب وہ یہ کہتے کہ ''اِنھی الفاظ پر میں اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں'' تو سامعین کے چہرے پرغم کی لکیریں ابھر آتیں اور وہ اُس غیر معمولی لذّت سے، اچانک محرومی کے اِعلان پر تڑپ اٹھتے کہ کس نے اِن سے کہا ہے کہ اِنھی الفاظ پر بات ختم کردیں، ہم ہنوز سیر نہیں ہوے اور ہماری بے تابی اور بڑھ گئی ہے اور ہمارا شوق اب ہمیشہ طالبِ تسکین رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی تقریر سے اٹھنے والے سامعین کو دلچسپ صحبت، یا گھنیرے سایے کے لطف، یا روح پرور گانے کی دھوم مچادینے والی لے، یا شیرینی ولذّت میں بے مثل مٹھائی سے، یا بہ یک وقت اِن ساری چیزوں اور اِن کے علاوہ بہت ساری چیزوں سے، محروم ہوجانے کا شکوہ ہوتا تھا۔

بیرونِ ملک کی مسلم اکثریت واقلیت کے علاوہ برِّصغیر کے کونے کونے میں پھیلے ہوے مدارس، اِداروں، تنظیموں اور عام مسلمانوں کی طرف سے، اُن کے پاس بڑے چھوٹے جلسوں کو رونق بخشنے کی گزارشوں اور افتتاحوں، بنیاد گزاریوں، دعا کی مجلسوں، خوشیوں کی تقریبوں وغیرہ میں، اپنے قدومِ میمنت لزوم سے، برادرانِ اسلام کو سرفراز کرنے کے اِتنے سارے دعوت نامے اُن کے پاس آتے رہتے کہ اُن کا شمار بھی مشکل

تھا۔ وہ ایک ایک سفر میں بعض دفعہ دسیوں، بیسیوں ہی نہیں سیکڑوں جلسوں اور تقریبوں کو خطاب کرتے۔ کسی شہر میں مدعو ہوتے، یا کسی دیہات میں اُن کی آمد ہوتی، تو سارے مدارس، جماعتیں اور تنظیمیں؛ جنھوں نے اُن کو مدعو بھی نہیں کیا ہوتا تھا، اُن کی تشریف آوری کو غنیمت جان کر فوراً اپنا پروگرام بھی برپا کر دیتیں کہ اِتنی بڑی دولتِ بے بہا سے، جو اَز خود ہاتھ آ گئی ہے محروم رہ جانا بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ اب جو وہاں کہیں بھی جلسہ ہوتا تو سارا شہر اور سارا علاقہ اُمڈ پڑتا اور جہاں کئی روز کا قیام ہو جاتا، وہاں عید کی سی رونق اور خوشی کا ماحول دیکھنے کو ملتا۔

نرالا اندازِ خطابت

حضرت حکیم الاسلامؒ کی تقریروں کا انداز بالکل نرالا تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر بولتے، بات سے بات پیدا کرتے جاتے اور مرکزی موضوع مُتعَدِّد ذیلی موضوعات پر، اِس طرح پھیل جاتا کہ اُن کی تقریر کے دوران بیچ میں حاضرِ مجلس ہونے والا سامع، بسا اوقات یہی سمجھتا کہ حضرت فلاں موضوع پر گفتگو فرما رہے ہیں، حال آں کہ وہ کوئی ذیلی گوشہ ہوتا جس پر وہ اظہارِ خیال کر رہے ہوتے تھے۔ اُن کی تقریر شاخ در شاخ ہو کر پھر مرکزی تنے سے اِس طرح جڑتی چلی جاتی تھی کہ بہت کم مُقَرِّروں کے لیے، اِس طرح کی لمبی لمبی شاخوں کو مرکزی موضوع سے جوڑنے کی صلاحیت ہوتی ہوگی۔ وہ نہ کبھی مرکز سے ہٹتے، نہ اَصل موضوع کو بھولتے، جب کہ ذیلی موضوعات پر دراز کلامی سے، عموماً مرکزی موضوع کا سِرا ہاتھ سے چھوٹ جایا کرتا ہے۔ وہ ہر ذیلی موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرتے اور پھر قرینے سے اُنھیں اصل موضوع سے جوڑ دیتے۔

تقریر کے دوران کتاب و سنت کے نصوص کو اصل عربی میں پڑھتے اور اُن کا انتہائی سلیس اور مزے دار ترجمہ کرتے۔ اقوالِ سلف کو بھی اُن کی اصل زبان میں ہی پیش فرماتے: عربی ہو یا فارسی یا اردو۔ دلچسپ لطیفوں، درس انگیز حکایات، عبرت خیز نکات،

نازک اشارات، معنی ریز تشبیہات، عقل کشا واقعات، ذہن کو بیدار کرنے والے نت نئے خیالات والتفاتات اور سب سے بڑھ کر تجدیدِ ایمان ویقین کا سامانِ صد ہزار رکھنے والے ایسے حقائقِ حیات سے، اُن کی تقریریں بھری پُری ہوتیں، جن سے دل کا ہر زنگ دور ہو جاتا، ہمتِ عمل پر سان چڑھتی، کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی اَن گنت نشانیوں پر غور کرنے کا نہ ختم ہونے والا جذبہ بیدار ہوتا اور بہت سی مرتبہ گنہ گار آنکھوں کو غسلِ تطہیر کا سامان مُیَسَّر آجاتا اور آدمی سابقہ خطاؤں سے بالکلیہ توبہ کر لینے کی، ایسی توفیق لے کر اٹھتا کہ آیندہ زندگی میں اپنی تقدیر، اپنے ہاتھ سے لکھنے کی راہ پا جاتا۔

افکار وخیالات کو سامعین کے ذہنوں میں پیوست کرنے کا بے مثال انداز

حضرت رحمۃ اللہ علیہ، ضرب الامثال، کہاوتوں، محاوروں نیز زبان وبیان کے مختلف اَسالیب اور لسانی ساختیات کے مختلف رویّوں سے، اپنے افکار وخیالات کو سامعین کے ذہنوں میں اُتارنے میں لاجواب تھے۔ بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی کے ابتدائی سالوں میں سے کسی سال کے محرم کی بات ہے، لکھنؤ کے اِحاطۂ شوکت علی میں منعقد ہونے والے فضائلِ صحابہ کے پندرہ روزہ پروگرام کے تحت، حضرت قدس سرہ خُطَبَا کے سرتاج کی حیثیت سے ــــ جیسا کہ وہ واقعتاً تھے بھی ــــ ایک روز تقریر فرما رہے تھے، جس کی ایک ماہ سے زائد عرصے سے لکھنؤ میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ گنہ گار حضرت کی تقریر کے عُشّاق میں ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کی وجہ سے، اولیں وقت میں، جلسہ گاہ میں حضرت کی تشریف آوری سے مناسب وقت پہلے، اسٹیج سے مناسب فاصلے پر ایسی جگہ سیٹ حاصل کر چکا تھا، جہاں سے حضرت کے سراپے کو اچھی طرح دیکھنا اور حضرت کی بات کو بہ حسن وخوبی رُو دَر رُو سننا ممکن تھا۔ اب تو یہ بات یاد نہیں رہی کہ حضرت کی تقریر کا مرکزی موضوع کیا تھا؛ لیکن بالیقین

فضائلِ صحابہ ہی رہا ہوگا۔ حضرت کی گفتگو کا خلاصہ اِس وقت میرے ذہن میں یہ ہے کہ راستے مختلف ہوسکتے ہیں؛ لیکن اصل اور مطلوبہ منزل تک اگر وہ پہنچتے ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ صحابۂ کرام میں بھی مختلف المزاج لوگ تھے، اُن کے طریقہ ہائے کار میں کبھی اختلاف بھی ہوتا تھا؛ لیکن اُن کی منزل صرف رب کی رضا جوئی اور خدا کی خوشنودی تھی؛ اِسی لیے وہ سب خدا کے دین کے سپاہی اور جنت کے راہی تھے۔ حضور ﷺ کے ہر صحابی جنتی تھے، کوئی صحابی جنت سے محروم نہ ہوں گے۔ اگر اُن میں سے بھی کوئی ایسا ہو کہ اُس کو جنت نہ ملے، تو پھر بعد کا تو کوئی انسان بھی مستحقِ جنت نہیں ہوسکتا؛ اِس لیے کہ کسی کا ایمان و عمل اُس معیار پر نہیں اتر سکتا جس پر صحابہ رضی اللہ عنہم تھے؛ کیوں کہ اُنھیں حضور ﷺ کی، بہ حالتِ ایمان، کایا پلٹ صحبت سے سرفرازی حاصل تھی، جو بعد کے بڑے سے بڑے ولی اللہ کو حاصل نہ ہوسکی۔ راستے مختلف ہوں اور وہ سبھی مطلوبہ منزل تک جاتے ہوں، تو اُن میں سے کسی کا بھی راہی ہونا چنداں مضر نہیں۔ مضر یہ ہے کہ آپ ''کعبہ'' تک پہنچنے کے لیے ''ترکستان'' کی راہ پر چل پڑیں اور اِس خوش فہمی میں مبتلا رہیں کہ آپ سوئے حرم محوِ سفر ہیں۔ حضرتؒ نے اِس کو ایک واقعے سے اِس طرح واضح فرمایا:

ایک نحوی کا واقعہ

ایک نحوی (ماہر علم نحو) انتہائی سیاہ رو اور بدشکل تھے(۱)۔ رات کی تاریکی اُن پر رشک

(۱) حضرت سے میں نے اپنی نوجوانی میں ایسا ہی کچھ سنا تھا، ہوسکتا ہے کہ میں نے محفوظ رکھنے میں غلطی کی ہو؛ لیکن ۱۴۲۲ھ کی ''ام القریٰ'' جنتری میں، میں نے اِس قصے کا اختصار اس طرح دیکھا تھا: ''عمران بن حِطّان — متوفی ۸۴ھ/۷۰۳ء زبردست خطیب، پرگو و بلیغ شاعر اور اعلیٰ پایے کے فصیح اللسان تھے اور اُسی درجے کے بدصورت اور سیاہ رو تھے۔ ایک روز اُن کی بیوی نے، جو اُنھی کے برعکس حد درجہ حسین و جمیل تھی، اُن سے کہا: ''توقع ہے کہ ہم دونوں ہی جنت میں جائیں گے۔ میں تو اس لیے جاؤں گی کہ اللہ نے مجھے تم ایسے پر صبر کی توفیق بخشی اور تم اِس لیے جنت میں جاؤ گے کہ اللہ نے مجھ جیسی مہ پارہ بیوی کی نعمت سے تمھیں نوازا اور انتہائی صابر اور انتہائی شاکر دونوں جنت میں جائیں گے''۔

کرتی تھی جب کہ اُن کی بیوی اِنتہائی گوری اور بے نظیر حسینہ تھی، وہ چاند کا ٹکڑا لگتی اور ماہِ تمام سے تراشیدہ معلوم ہوتی تھی۔ جب دونوں: میاں و بیوی اکٹھے ہوتے، تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا کہ ایک آفتاب اور دوسرا سایا ہے۔ بل کہ دونوں شب و روز کی طرح ممتاز ہوتے اور ایک دوسرے کی نقیض، یا آگ پانی کی طرح ضدّین محسوس ہوتے۔ ایک دن دونوں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ میاں نے بیوی سے کہا: ہم دونوں بالیقین جنتی ہیں۔ اہلیہ نے کہا: تمھارے منھ میں گھی شکر، خدا کرے ہم دونوں جنت نصیب ہوں؛ لیکن تم نبی ہونے سے رہے، جس کو خدا بہ وقتِ ضرورت، بہ طورِ حکمت و مصلحت، غیب کی بعض باتیں بتا دیا کرتا ہے، تو تمھیں یہ کیسے معلوم کہ ہم اِن شاء اللہ جنتی ہیں؟ میاں نے کہا کہ ہم دونوں کے تعلّق سے جنتی ہونے کی بات معلوم کرنے کے لیے نبی اور ولی ہونے کی چنداں ضرورت نہیں؛ اِس لیے کہ تمھیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ تم اِس وقت لاثانی حسینۂ عالم ہو، اِس کے باوجود تم نہ اِتراتی ہو، نہ بدمستی دکھاتی ہو، نہ غرورِ بے جا میں مبتلا ہوتی ہو؛ بل کہ یک سوئی کے ساتھ ذکرِ الٰہی، عبادتِ خداوندی اور شوہر کی طاعت اور فرماں برداری میں لگی رہتی ہو، حسن کی نمایش، عشوہ و ادا کو عالم آشکارا کرنے کی کوئی خواہش، تمھیں کسی لمحہ بھی نہیں ستاتی؛ اِس لیے میں شکر و امتنان کے ایسے مرتبے پر فائز ہو چکا ہوں، جو شاید آج دنیا کے کسی انسان کو بھی نصیب نہیں۔ میں ہمہ وقت تیری ایسی چودھویں کے چاند اور آفتابِ عالم تاب بیوی کی شکل میں ملی ہوئی، بے نظیر دولتِ عظمیٰ کے استحضار سے، مست رہتا ہوں اور میرے ہر بنِ مو سے شکر و عرفان کے جذبات اُبلتے رہتے ہیں۔

اِس کے برعکس میں آج روئے زمین کا شاید سب سے بدصورت انسان ہوں، دنیا کے کسی گوشے میں میری نظیر تلاشِ بسیار کے باوجود بھی مشکل سے ملے گی، چمڑے میرے سیاہ، ہونٹ میرے موٹے، گردن میری فربہ، جسم میرا بے ڈھنگا: غرض میری کوئی کل سیدھی نہ لائقِ توجہ؛ بل کہ خدا کی مصلحت سے میں نہ صرف تیرے لیے؛ بل کہ ہر دیکھنے والے کے لیے باعثِ عبرت؛ بل کہ باعثِ اذیت ہوں کہ اتنی بُری شکل کا

آدمی بھی اُن لوگوں کو خواہی نہ خواہی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا کے غیر متعلق انسانوں کے لیے میں اپنی مکروہ صورت سے باعث تنفر و تکدّر ہوں، تو تو تیرے ایسی مہ پارے کے لیے میں کتنے تحمل، صبر اور خدا کے فیصلے پر راضی رہنے کے ہمہ وقت امتحان کا باعث بنا رہتا ہوں، اِس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں اور میرے خدا کو تو ہر چھپے کھلے کا بہ خوبی علم ہے، اِس کے باوجود تم میرے اوپر نہ صرف صبر کرتی ہو؛ بل کہ خدائی تقسیم اور رب کا فیصلہ سمجھتے ہوے، اِس صورتِ حال کو بھی (جیسا کہ تمھارے سارے رویّوں سے عیاں ہے) نعمت اِلٰہی باور کرتی ہو؛ لہٰذا تمھیں صبر کا ایسا اعلیٰ ارفع درجہ ملا ہوا ہے، جو شاید آج اِس کرۂ ارض پر کسی کو نصیب نہ ہوگا۔ اِس طرح تیرا خاکسار شوہر شکر و امتنان کی انتہائی اونچی منزل کا باسی ہے اور تم صبر و تحمل کی چوٹی پر متمکن ہو؛ اِس لیے میں راہِ شکر کا راہی ہوں اور تم راہِ صبر کی مسافر ہو۔ راستے تو ہم دونوں کے مختلف ہیں؛ لیکن منزل ہم دونوں کی ایک ہی ہے۔

اِس ناچیز کو اچھی طرح یاد ہے کہ حضرتؒ نے اِس واقعے کو اِتنی تفصیل سے اور اِتنے مزے دار انداز میں بیان فرمایا تھا کہ سارا جلسہ لوٹ پوٹ ہوتا رہا تھا اور لوگوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا تھا۔ میاں بیوی کے حسن و قبح کو اُنھوں نے ایسی لفظیات دی تھی اور قصّے کے بیان میں ایسی لطف انگیز تعبیریں اختیار کی تھیں؛ جو اُنھی کا حصہ تھیں۔ اُن کا کمال نہ صرف اِس مجلس میں؛ بل کہ ہر مجلس میں یہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ہلکی مسکراہٹ پر اکتفا کرتے تھے اور سامعین کا بہت سے مواقع پر ہنسی کے تسلسل سے حال دگرگوں ہو جاتا تھا۔ اُن کی دورانِ تقریر بہ وقتِ ضرورت مسکراہٹ بھی، اُن کے اندازِ سخن کو نہ صرف پر لطف؛ بل کہ معنی خیز بنا دیا کرتی تھی۔

ایک دلچسپ واقعہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کے بعض سوانح نگاروں نے، ضرب الامثال اور حکایتوں

کے تئیں اُن کی مہارت کا ایک دل چسپ واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ

''ملتان — پاکستان — میں عظیم الشان جلسہ تھا۔ قاری صاحبؒ قرآنِ کریم کے ترجمے کے اصول وضوابط بیان فرمارہے تھے۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے، اُنھوں نے فرمایا: صحیح مُترجم وہ ہوتا ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کرے، اُس کو اُس زبان کے محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال پر پورا عبور ہو۔ اِس سلسلے میں قاری صاحبؒ نے ایک فرنگی افسر کی مثال دی۔ فرمایا: یہ انگریز افسر برسوں سے ہندوستان میں مقیم تھا، یہاں رہتے بستے اور ملازمت کرتے کرتے اردو سیکھ گیا۔ ایک دن لہرا کر اپنے اَرْدلی سے کہا: مجھے اردو پر پورا عبور حاصل ہوگیا ہے۔ اُردلی مسکرایا، وہ اہلِ زبان تھا، ادب سے بولا: نہیں صاحب کہ ع (پیادہ، ساتھ رہنے والا سپاہی)

آتی ہے اردو زباں آتے آتے

''فرنگی بولا: نہیں، مجھے پورا عبور حاصل ہے۔ اردلی نے کہا: کیا میں آپ کا امتحان لےلوں؟ فرنگی نے لپک کر کہا: ضرور! اردلی نے پوچھا بتایئے ''کریلا اور نیم چڑھا'' کا کیا مطلب ہے؟ فرنگی صاحب فرمانے لگے کہ ''کریلا'' ''نیم چڑھا'' کے درمیان ''اور'' بمعنی واوَ حرفِ عطف یا رابطہ ہے یہ کیوں؟ اردلی نے کہا: آپ اسے جانے دیجیے، صرف ''کریلا نیم چڑھا'' ہی کا مطلب بتادیجیے۔ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ غور وفکر کے بعد بولے: ''کریلا'' تو ایک سبزی کا نام ہے اور پھر کچھ وقفے کے بعد کہا: ''نیم'' کا مطلب ہے ''آدھا'' پھر مزید وقفے کے بعد فرمایا: ''چڑھا'' کا مطلب ہے کہ ہنڈیا میں چولھے پر چڑھا اور پھر ہنس کر کہا: تمھیں معلوم ہے کہ کریلا کڑوی سبزی ہے، کسی نادان نے پکایا تو پوری طرح پک نہیں سکا؛ بل کہ ''نیم'' یعنی آدھا پکایا، جس کے نتیجے میں کریلے کی کڑواہٹ ختم نہیں ہوئی۔ بس اب مطلب صاف اور واضح ہے۔

''اردلی ہنس پڑا، عرض کیا: صاحب! میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کو اردو پر عبور حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے صحیح مطلب بیان نہیں کیا۔ میں آپ کو

اِس کا صحیح مطلب بتاتا ہوں۔ سنیے! کریلا تو ہوتا ہی کڑوا ہے، کسی نے اُس کی بیل کو اُس سے بھی زیادہ کڑوے پتوں والے درخت یعنی ''نیم'' کے درخت پر چڑھا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اور زیادہ کڑوا ہو گیا، انگریز افسر بولا: اچھا! میرا دھیان ''نیم'' کے درخت کی طرف نہیں گیا؛ ورنہ صحیح مطلب معلوم ہو جاتا۔

''یہ مثال بیان کرنے کے بعد حضرت قاری صاحبؒ نے زیرِ لب تبسّم کے ساتھ فرمایا: اُس انگریز نے ''کریلے'' کا نام سن رکھا تھا، اُس نے فارسی کا لفظ ''نیم'' بھی پڑھا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فارسی میں ''نیم'' کے معنی نصف کے ہوتے ہیں۔ اب اُس ''صاحبِ عبور'' نے کیا یہ کہ ہندی کے لفظ ''چڑھا'' کو ساتھ ملا لیا اور اسے ہنڈیا میں ڈال کے چولے پر چڑھا دیا اور یوں محاورے کا ستیاناس کر دیا اور جب اردلی نے اُس محاورے کا صحیح مطلب بتایا، تو وہ کھسیانا ہو گیا۔ کہنے لگا: اچھا کچھ اور پوچھو، میں صحیح جواب دوں گا۔ اردلی نے کہا: صاحب! کچھ اور پوچھوں گا تو آپ بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے۔ انگریز نے کہا: نہیں نہیں، کچھ اور پوچھو۔ اردلی نے کہا کہ چلیے یہی بتا دیجیے کہ ''بغلیں جھانکنے'' کا کیا مطلب ہے؟ انگریز نے دایاں بازو اٹھایا، بغل میں جھانکا، پھر بایاں بازو اٹھا کر بائیں بغل میں جھانکا اور کہا کہ تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں بغلوں کو جھانک لوں گا۔ یہ سن کر اردلی نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی پر قابو پایا۔ اب اُس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا''۔(۱)

حکایات وواقعات سے
نتائج ومسائل کے استخراج کا عجیب وغریب ملکہ

حضرت حکیم الاسلامؒ کو حکایات وواقعات سے نتائج، مسائل اور طرح طرح کے

(۱) ''بیس مردانِ حق''، ج:۲،ص:۸۲۷-۸۳۷،مکتبہ رشیدیہ ۲۵ لوئر مال، لاہور۔ طبع اول جمادی الاخری ۱۴۱۷ھ= اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

اَسباق وعِبَر کے استخراج میں جو کمال حاصل تھا، وہ اُنھی جیسے دقیق النظر، وسیع المطالعہ اور روحِ شریعت سے بھرپور واقفیت رکھنے والے عالم ہی کو حاصل ہوا کرتا ہے، جو روز روز پیدا نہیں ہوتا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کردہ اسلام، ایمان اور اِحسان والی حدیث طلبہ وعلما بار بار پڑھتے سنتے اور پڑھاتے رہتے ہیں۔ (۱) عموماً اس حدیث کے تعلق سے لوگ مذکورہ تینوں حقائق کے بیان، پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ کسی اور بات کی طرف شاید وباید ہی ''اہل علم'' کا ذہن جاتا ہوگا۔ ہم لوگوں نے بھی اِس حدیث کو اساتذہ سے سمجھ کے پڑھا، پھر عملی زندگی میں اِس پر غور کرنے اور تدریسی زندگی میں اِس کے حوالے سے طلبہ کو، بہ وقتِ ضرورت بار بار دین کی سچائیوں کو سمجھانے کی توفیق حاصل رہی؛ لیکن جب قاری صاحب سے اِس حدیث کو ایک مشہور مدرسے کی مسجد میں اپنی تقریر میں پڑھتے، ترجمہ کرتے اور اِس کے لفظ لفظ اور حرف حرف کو بار بار نچوڑ کر، اُس سے شریں تر مُعطّر و مُصفّٰی رس، اپنی زبان کے انتہائی شفّاف گلاس میں سامعین کو، پیش کرتے ہوے دیکھا اور بہ راہِ راست سنا، تو خدا کی خلاّقیت اور قاری صاحب کے فہمِ دین وعلوم دین کا ہلکا سا تجربہ کر کے حیرت، رشک اور خوشی کے ملے جلے جذبات کی بے پناہی کی وجہ سے محسوس ہوا کہ میرا ''تنگ ظرف'' سینہ شاید شق ہو جائے گا:

حضرتؒ نے جہاں پوری حدیث کی عربی میں تلاوت فرمائی، وہیں اُس کا خوب صورت ترجمہ فرمایا اور پھر حقائق کے ساغر انڈیلنا شروع کیے، تو لوگ جھوم جھوم اٹھے۔

---

(۱) حدیث کا پورا متن اِس طرح ہے:

عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَا يُرَى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتّٰى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخِذَيْهِ وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ، وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيلًا" قَالَ: صَدَقْتَ. قَالَ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِيمَانِ. ←

إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ: فرمایا چوں کہ حضرت جبرئیل ''طالب علمانہ'' تشریف لائے تھے؛ اِس لیے سرکارؐ کی خدمت میں، جنھیں اُس وقت خدا کے حکم سے اُنھوں نے ''معلم'' بنایا تھا، گندے سندے کپڑوں میں تشریف نہیں لائے؛ بل کہ اُن کے کپڑے انتہائی سفید تھے، جس سے سفید لباسوں کی مرد کے لیے فضیلت کے ساتھ ساتھ، طالب علم کو صاف ستھرا رہنے کی تاکید بھی مُتَرَشِّح ہوتی ہے۔ اِس سے جہاں اُستاذ کے دل و دماغ میں طالب علم کی طرف سے اچھا تأثر قائم ہوتا ہے کہ یہ صفائی پسند، سلیقہ مند، نستعلیق، اچھائیوں کو فطرتاً اختیار کرنے والا ہے؛ وہیں خود طالب علم کے اپنے ذہن اور اپنی ذات پر بھی خوش گوار اثر قائم ہوتا ہے۔ وہ صحت مند، خوش، نفسیاتی طور پر اخذِ علم کے لیے تیار، تلقین کیے گئے اسباق کو کماحقُّہٗ محفوظ رکھنے اور سمجھنے کے لیے بیدار رہتا ہے اور ساتھ ہی معاشرے کے دگر انسانوں کے لیے، صفائی ستھرائی کا عملی مُعلِّم بن کر انسانوں کے لیے دور رس فوائد کی طرح ڈالنے والا ثابت ہوتا ہے۔

شَدِيدُ سَوَادِ الشَّعْرِ سے کم عمری میں حصولِ علم کی تلقین ہوتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ بالیقین طلبِ علم، حصولِ فن اور ہنر کو سیکھنے کے لیے، انسانوں کے لیے، اُن کے خالق نے یہی عمر متعین کی ہے۔ اِس میں کسی بھی چیز کا حصول آسان ہوتا ہے کہ سیکھنے کا جذبہ وملکہ، از خود اَشیا سے آگہی کے لیے انسان کو آمادہ کرتا رہتا ہے۔ جستجو، جان کاری اور تجسس کا شوق ہر وقت جادہ پیما رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے اور نوعمر لوگ

← قَالَ: "أن تُؤمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ". قَالَ: صَدَقْتَ. قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ. قَالَ: "أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّهُ يَرَاكَ". قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ. قَالَ: "مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ". قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَتِهَا. قَالَ: "أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا، وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُونَ فِي الْبُنْيَانِ". ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا. ثُمَّ قَالَ: يَا عُمَرُ أَتَدْرِي مَنِ السَّائِلُ"؟ قُلْتُ: اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: "فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ". (رواهُ مُسلمٌ)

ہر وقت ہر چیز کے متعلق اپنے بڑوں سے، سوال کرتے رہتے ہیں۔ گو اسلام نے مہد سے لحد تک طلبِ علم میں لگے رہنے کی دعوت دی ہے؛ لیکن حصولِ علم کا اصل زمانہ نوعمری ہے، جس میں سارے قویٰ صحیح طور پر کام کرتے رہتے ہیں اور عمر کی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ، سارے قویٰ رفتہ رفتہ مضمحل ہوتے جاتے ہیں اور بالآخر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔

فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلَى فَخِذَيْهِ سے یہ حکم مُستنبط ہوتا ہے کہ طالبِ علم کو انتہائی باادب بیٹھنا چاہیے۔ اِس سے اُستاذ کے ذہن میں جہاں طالبِ علم کی اِطاعت شعاری، سلیقہ مندی، خاک ساری اور سیکھنے کے لیے انتہائی آمادگی کا تأثرؒ اُبھرتا ہے؛ وہیں طالب علم کے لیے دیے گئے سبق، تلقین کیے گئے مواد اور پیش کی گئی باتوں کے حرف حرف کو بہ غور سننا اور بہ دقّت یاد رکھنا، زیادہ قرینِ قیاس اور آسان ہوتا ہے۔

ناچیز نے یہاں اپنی یاد سے انتہائی اختصار کے ساتھ، حدیث سے اخذ کردہ بعض باتیں لکھی ہیں۔ قاری صاحبؒ نے اِس مضمون کو ۹ر بجے سے ساڑھے ۱۲ر بجے تک، یعنی ساڑھے تین گھنٹے تک بیان فرمایا تھا۔ طلبہ اور اساتذہ، ذوق وشوق سے اِس طرح دھیان کے ساتھ سنتے رہے کہ شاید اُن میں سے کوئی ایک آدمی بھی کسی کام سے اِس طویل وقفے میں اٹھا، نہ کسی نے اکتا کر بلاوجہ کھانس کر سامعین کی توجّہ کو منتشر کیا، نہ کسی کو ''حوائجِ بشریہ'' کے عذر نے پریشان کیا؛ کیوں کہ اندر کا شوق اور دل کا جذبہ بہت سی رکاوٹوں کو خود لاشے بنادیا کرتا ہے اور انسان غیر مرئی ''خرقِ عادت'' طاقت کے ذریعے، اُن پر پوری طرح قابو پالیتا ہے۔

حکیم الاسلام کی خطابت.. منفرد خصوصیات

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں کی خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کے لیے، یقیناً مستقل کثیر الصفحات کتاب کی ضرورت ہے؛ لیکن یہاں مختصراً چند اہم خصوصیات کی

طرف اِشارہ کیا جاتا ہے، جو ناچیز نے اُنھیں سننے کے دوران اخذ کی تھیں:

۱- وہ جس موضوع کو بھی چھیڑتے، اُس پر بھرپور طریقے سے بولتے تھے اور وضاحت، دلائل، ردّوقدح، ہر شبہے کے اِزالے کے ساتھ متعلقہ سارے گوشوں کا اِحاطہ اور اُن سے متعلق وہ ساری جان کاریاں ضرور دیتے، جن کے متعلق وہ یہ محسوس کرتے کہ سامعین کے لیے، یہ ضروری اور انتہائی مفیدِ مطلب ہیں۔ اپنے وسیع تجربے، زندگی، اِنسان اور انسانی معاشروں کے مسائل سے اپنی گہری اور بصیرت افروز معلومات کی وجہ سے، وہ سامعین کے دامنِ جستجو کو مالا مال کر دیتے تھے۔

۲- وہ چھوٹے اور بڑے، غیر معمولی اور معمولی: دونوں طرح کے موضوعات پر یک ساں تقریری ملکے سے اِس طرح بولتے تھے کہ موضوع سے متعلق کسی طرح کی تشنگی کا، کسی سامع کو کبھی احساس نہ ہوتا تھا۔ کوئی بھی تقریب ہو، کیسا بھی وقت ہو، کیسا ہی موقع ہو؛ قاری صاحب کو جب بھی دعوتِ سخن دی جاتی، تو وہ اِس طرح محوِ تکلم ہو جاتے، جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آن کر دیا ہو۔

۳- بعض دفعہ اچانک انتہائی معمولی موضوع پر گفتگو کے لیے، اُن سے فرمایش کی جاتی۔ سامعین کو محسوس ہوتا کہ حضرتؒ کے لیے، اِس پر بولنا شاید مشکل ہوگا کہ یہ بھی کوئی موضوع ہے، جس کی معلومات کسی پڑھے لکھے کے پاس ہوگی یا اُس نے اِس پر غور کرنے کی سوچی ہوگی؛ لیکن وہ الحمدللہ الخ کر کے شروع ہو جاتے اور اُس موضوع کو اتنا اہم، غیر معمولی اور ایسا مبارک بنا دیتے کہ حاضرین عش عش کرنے لگتے۔ اُن کی جادو بیانی، شیریں مقالی، بہ وقتِ ضرورت مزاحیانہ انداز، نکتہ آفرینی، بات سے بات پیدا کرنے کی عجیب سی قدرت، حاضر دماغی، طرزِ ادا، معلومات کا انوکھا پن، فکری جولانی، غیبی مدد، تعلق مع اللہ کا پانی میں راہ پیدا کر دینے کی کرامت؛ ایسا رنگ دکھاتی کہ لوگوں کی حیرت کی صلاحیت بھی جواب دے جاتی۔

۴- وہ مُرتّب انداز میں تسلسل کے ساتھ دھیمی رفتار سے، لیکن شیریں گفتاری

سے، اِس طرح تقریر کرتے کہ نہ معلومات کا خزانہ کبھی ختم ہوتا، نہ الفاظ کا ذخیرہ ناپید۔ بس شروع کرنے کی دیر ہوتی، پھر ختم کرنا صرف اُن کی اپنی مرضی پر موقوف ہوتا۔ کسی سامع کے ابّا کی مجال نہ تھی کہ اُن کی بزم میں، اپنے کسی رویّے سے اپنے کو بدذوق ثابت کرنے کی ہمت کرے۔ خیالات وافکار، معلومات ومعارف اور الفاظ وتعبیرات کے صف بستہ قافلے جوق در جوق، اُن کی خدمت میں اِس طرح پیش ہوتے رہتے، جیسے وہ خدائی حکم سے مجبورِ محض ہوں۔

۵- اُن کی تقریر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ سامعین، اُن کے پیش کردہ آرا وافکار میں اُن کے بالکل ہم رائے محسوس ہوتے۔ یہ کسی مقرر کا اِعجاز ہوتا ہے کہ وہ اپنی قادر الکلامی اور مُدلّل گفتگو سے، اپنے مخاطبین کو اپنا ہم رائے بنالے۔ حاضرین خواہ اِس مجلس سے پہلے اُس رائے کے حامل نہ رہے ہوں جو قاری صاحبؒ نے پیش کی ہوتی تھی؛ لیکن قاری صاحبؒ کی بزم وعظ میں شرکت کے بعد، وہی بات اور خیال اُن کے دل اور زبان پر ہوتا جو اُنھوں نے پیش کیا ہوتا تھا۔ اُن کی تقریر کو سن کر، ہر سامع زبانِ حال اور اکثر دفعہ زبانِ قال سے کہہ اٹھتا:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا، یہ بھی میرے دل میں ہے

کاش ہم مُکَبِّرُ الصوت ہوتے

دارالعلوم میں طلبہ کی عربی انجمن ''النادی الادبی'' نے لاؤڈ اسپیکر خریدا۔ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) نے النادی کے معتمد اور اہم ذمے داروں سے فرمایا کہ حضرت قاری صاحبؒ کے ذریعے، اِس کا افتتاح ہونا چاہیے۔ تم لوگ حضرت سے وقت لے کر افتتاح کی تقریب برپا کرو، اِن شاء اللہ اِس سے برکت ہوگی۔ چناں چہ حضرتؒ کی تقریر سے ہی اُس کا افتتاح ہوا۔ حضرتؒ نے اِس

موقع سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی جو تقریر کی، مکبر الصوت کی فضیلت پر جو روشنی ڈالی، اُس بے جان آلے کی خوبی و اِفادے کے گوشوں کو جس طرح اُجاگر کیا، دین و دعوت اور تعلیم و تربیت کے میدان میں اُس کو برتے جانے کے پہلوؤں کو جس جس طرح گنوایا، تو ایسا لگا کہ وہ حضرت حسن بصری، سعید بن المسیب، عبداللہ بن المبارک، امام غزالی، یا ائمہ اربعہ کے فضائل بیان کررہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو بہت سے طلبہ کے لاشعور میں یہ تمنا جاگ اٹھی کہ کاش ہم "مکبر الصوت" ہی ہوتے: روزِ محشر حساب و کتاب سے بچ جاتے اور حضرت قاری صاحبؒ کی اِتنی ساری تعریفوں کا مستحق بھی بن جاتے!۔

قناعت اور مسافرانہ زندگی کی فضیلت

ایک بار میں نے قناعت اور دنیا میں مسافرانہ زندگی گزارنے کے موضوع پر، حضرتؒ کی تقریر سنی، تو لذّتِ تقریر اور دلائل کی کثرت کی وجہ سے، میرے دل میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ ایک سچے مسلمان کی مثالی زندگی یقیناً وہی ہوسکتی ہے جو حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور اُنھی کی طرح کے صحابہ و تابعینؒ اور امت کے زاہدین نے گزاری اور اُس کی دعوت بھی دی۔ دل نے پوری طاقت سے گواہی دی کہ اِس قابلِ رشک اِیمانی زندگی سے مختلف جو زندگی بھی گزاری جائے گی، بلاشبہہ وہ ہوا و ہوس، بے عقلی اور پاگل پن سے عبارت ہوگی۔ اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت تقریر فرمارہے تھے، تو اکثر حاضرین کی آنکھیں اَشک بار تھیں، اُن کے دلوں کا زنگ کافور ہورہا تھا، اُن کے ایمان پر سان چڑھ رہی تھی، دنیاوی وہم وگمان اور خواب وخیال اور تمناؤں اور نہ ختم ہونے والی خواہشات کے بت اوندھے منھ گررہے تھے اور مادہ و معدہ، حرص و ہوس، اَنانیت اور خود پسندی اور اپنی ذات کے سارے پجاری اپنی خیر منارہے تھے۔ یقین جانیے کہ میرے دل کی گہرائیوں سے آواز آرہی تھی کہ قناعت! زندہ باد، مال و دولت کی ہوس! مردہ باد۔

مال و دولت تقرّب الی اللہ کا ذریعہ

چند سالوں بعد میں نے ٹیپ ریکارڈر سے حضرت کی، ہندوستان کے معاشی دارالحکومت اور تجارتی راج دھانی بمبئی کی ایک تقریر سنی، جس میں حضرت نے مال و دولت کی فضیلت اور اُس کے ذریعے بھلائی کے بے شمار کاموں کے انجام پذیر ہونے کا، تذکرہ کیا تھا۔ حضرتؒ نے اِس تقریر میں خیر کے اتنے پہلوؤں کی طرف اِشارہ کیا تھا، جن کی طرف عموماً لوگوں کا ذہن نہیں جاتا اور کارِ خیر میں سبقت کرنے والے اور اِسلامی وانسانی سرگرمیوں کی انجام دہی پر مال و دولت کا دہانہ کھول دینے والے سعادت مند انسانوں کی توجّہ کا، وہ کسی طرح اور کبھی بھی باعث نہیں بنتے۔ اِس تقریر کو سن کر میں اور میرے بہت سے شرکاے مجلس خوشی کے مارے اچھلنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ مجلس کی فضا، آس پاس کی دیواریں، اِردگرد کے درخت اور سارے سننے والوں کی زبانیں بے خود ہو کر داد دے رہی ہیں اور ہر طرف سے اللہ اکبر، واہ واہ، خوب بہت خوب، سبحان اللہ اور جلیل القدر و فرید العصر مقرر کے لیے دعاؤں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اُس وقت دل میں اِس خیال نے طاقت سے انگڑائی لی کہ دنیا کی سب سے بڑی بہتری اور برتری، کارِ خیر کے لیے دولت کا حصول ہے؛ کیوں کہ دنیا کی اَن گنت بھلائیاں ایسی ہیں، جنھیں صرف اور صرف مال و دولت کے ذریعے ہی بروے کار لایا جاسکتا ہے۔ گویا اُن کار ہاے خیر کے حوالے سے، خدا کا تقرّب اُسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے، جب آدمی مال و دولت سے بہرہ ور ہو؛ لہٰذا مال و دولت تقرّب الی اللہ اور اُس کی جنت کے حصول کا یقینی ذریعہ ہے، بہ شرطے کہ تقرّب اِلی اللہ کے لیے، اُس کو خرچ کرنے کی توفیق مُیسَّر رہے۔

بہت سے لوگ محض مال و دولت کے حصول اور دنیوی وسائل کے جٹانے کو ہی بہت بُرا سمجھتے ہیں اور اِس سمت کے کسی راہی کے حوالے سے، اُن کا خیال ہمیشہ منفی اور

بہت بُرا ہوتا ہے۔ حضرتؒ کی تقریر سُن کر اندازہ ہوگیا کہ محض مال لعنت نہیں؛ بل کہ دنیوی عیش میں پڑ کر آخرت کو فراموش کر بیٹھنا اور حاصل شدہ یا حاصل کردہ مال کو اپنی ذاتی ''ہنرمندی'' کا نتیجہ اور اپنے ہاتھ کا کھیل اور اپنی محنت کا صلہ سمجھنا، یا مال کے حصول میں حلال وحرام کی تمیز نہ کرنا اور اُس کے حوالے سے اللہ کے اَحکام کی پیروی نہ کرنا اور فقرا و مساکین کا حق نہ دینا اور زکات وصدقات کو ضیاعِ مال کا ذریعہ باور کرنا، یہ دونوں باتیں بُری ہیں اور خدا کی لعنت کا ذریعہ ہیں۔ حصولِ مال وزر بُرا نہیں؛ بل کہ غلط طریقے سے اُس کا حصول اور غلط جگہوں میں اُس کا خرچ بُرا ہے۔

اِسی طرح محض فقر محمود نہیں، اگر محمود ہوتا تو اللہ کے رسول اُس سے صبح وشام اِس طرح کیوں پناہ مانگتے جیسے کفر سے پناہ مانگتے تھے۔ ہاں اگر اللہ نے اپنی تقدیر اور حکمت سے فقیر بنادیا ہو، تو اللہ پر توکل، تھوڑے پر قناعت کو، اَنبیا اور اُن کے سچے جانشین کی طرح، اپنا شیوہ بنانا چاہیے اور اُس سے پیدا شدہ ہم دردی، غم خواری، تواضع، انکساری، رجوع اِلی اللہ کی کیفیت، رقّتِ قلب، وغیرہ کو بہت غنیمت جاننا چاہیے کہ اللہ نے اِتنا سارا ''مال ودولت'' عطا کیا ہے۔ یقیناً اُنھیں ہم آخرت کا ذخیرہ، جنت کا زینہ، رضائے اِلٰہی کا ذریعہ اور اُس کی دید کا سبب بنا سکتے ہیں اور صبر کر کے اللہ پاک کے بے شمار ثواب واِنعام کا مستحق بن سکتے ہیں، جو صرف صابرین اور اَجرِ الٰہی کا یقین رکھنے والوں ہی کو ملے گا۔

تقریر کی لذّت کی بے پناہی کے، اَن گنت اسباب

اُن کی تقریر کی لذّت کی بے پناہی کے بہت سے اَسباب تھے۔ اُن کا علم، بے پناہ تھا، عمل بے ریا تھا، اِخلاص اُن کی شخصیت کی کلید تھی، حلم وکرم سے اُن کا خمیر اٹھا تھا۔ اُن کے یادداشت کا سرمایہ نہ ختم ہونے والا عجیب سا خزانہ تھا۔ اُن کی ذہانت بڑی اَخّاذ تھی۔ اسلاف کی علمی وکتابی صحبت کا ایسا فیض یافتہ مقرر، برِصغیر کی خاک سے خال خال ہی اٹھا

ہے۔اُن کی شخصی نستعلیقیت؛ اُن کا مردانہ جمال؛ اُن کی معصوم سی موہنی صورت؛ جسمانی ساخت کا اعتدال؛ اُن کے چہرے کی دمک؛ آنکھوں کی چمک؛ سفید سرخ رنگ؛ اُن کا حسنِ قامت؛ شیروانی کی نفاست؛ کلاہِ تاج نما کی رفعت؛ خوب صورت اور نازک سی اُن کی چھڑی کا اُن کے ہاتھ میں مچلنا؛ کرسیِ خطابت پراُن کی باوقار نشست؛ فضول گوئی سے احتراز؛ مفیدِ دنیا وآخرت باتوں پر اِکتفا؛ زبان وافکار پر قابو؛ نشست وبرخاست، قیام وقعود، حرکات وسکنات میں غیر معمولی سنجیدگی؛ اُن کے ظاہری روے روشن پر اُن کے باطنی نور کا غازۂ جمال، جواُن کے سارے وجود پر نور اَفشانی کرتا تھا؛ اُن کا موروثی اعلیٰ وارفع حسب، جواُن کے لیے فرشتے جیسی معصومیّت کا ضامن تھا اور جس کی وجہ سے لوگ اُن سے بے اختیارانہ اور بے تحاشا محبت کرتے تھے؛ یہ اور اِس کے علاوہ بہت سی باتیں تھیں، جواُن کی ذات کو بے مثال علمی، دینی، قائدانہ، خطیبانہ شخصیت کا روپ دیتی تھیں، اُسی شخصیت کو لوگ ''حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند'' کہتے اور لکھتے تھکتے تھے، نہ اُکتاتے تھے۔ اُس شخصیّت میں جادو کا اثر تھا، تازگی اور مسرّت بخش کیپسول کی طاقت تھی۔ یعنی وہ ایک ایسی شخصیت تھی جو حضرت حکیم الاسلام کی شکل میں پائی گئی اور اُنھی پر ختم ہوگئی۔ اُن کے بعد مولانا رُومؒ کا چراغ لے کر بھی، تلاشِ بسیار کے باوجود، مل سکی نہ اب کبھی ملے گی۔ رہے نام اللہ کا۔

بسیار خوباں دیدہ اَم؛ لیکن تو چیزے دیگری (*)

سوانحی نقوش

❁ اسم گرامی: (مولانا قاری) محمد طیب بن محمد احمد بن (حجۃ الاسلام مولانا) محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاء الدین بن محمد فتح بن محمد ہاشم بن شاہ محمد بن قاضی طہ بن مفتی مبارک بن

(*) یہ تحریر بہ راہِ راست اردو میں بہ روز یک شنبہ ۲۰ رشوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۲ رنومبر ۲۰۰۶ء ۱:۳۰ بجے دن میں، حکیم الاسلام سیمینار منعقدہ ۲۳، ۲۴، ۲۵ رشوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۵، ۱۶، ۱۷ رنومبر ۲۰۰۶ء کے لیے لکھی گئی۔

قاضی جمال الدین بن قاضی میران، جن کا سلسلۂ نسب حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

❁ پیدائش اور تعلیم: محرم ۱۳۱۵ھ/ جون ۱۸۹۷ء بہ روز اتوار دیو بند میں آپ کی ولادت ہوئی، تاریخی نام مظفر الدین رکھا گیا۔ بعد میں محمد طیب تجویز کیا گیا، آپ نے اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ ۷ سال کی عمر میں دار العلوم دیو بند میں داخل ہوے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندیؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ اور آپ کے والدِ محترم مولانا حافظ محمد احمدؒ کی موجودگی میں آپ کی بسم اللہ کرائی گئی۔ ۲ سال کی مدت میں ہی قرآن پاک مع تجوید حفظ کیا، حفظِ قرآن پاک کے بعد درجۂ فارسی میں داخل ہوے اور پانچ سال میں پورا نصاب مکمل کیا، اِس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے شعبۂ عربی میں داخل ہوے اور آٹھ سال کی مدت میں دار العلوم کی ساری نصابی کتابیں مکمل کرنے کے بعد ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء میں سندِ فضیلت حاصل کی، حدیث میں آپ کے خصوصی اُستاذ محدثِ کبیر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ تھے۔ آپ کو وقت کے مشاہیر علما سے بھی خصوصی سندِ حدیث حاصل ہوئی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بہ طور خود آپ کو سہارنپور طلب فرما کر اوائلِ حدیث کی تلاوت کرا کر، اپنی خصوصی سند خود اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر عطا فرمائی، اِسی طرح مولانا عبد اللہ انصاری اور اپنے والد ماجد مولانا محمد احمد سے بھی سندِ حدیث لی۔

❁ بیعت وخلافت: آپ ۱۳۳۹ھ میں یعنی دار العلوم سے فراغت کے دو سال بعد، شیخ الہندؒ سے بیعت ہوے، تزکیہ و احسان کی منزلیں طے ہی کر رہے تھے کہ شیخ الہندؒ کی وفات ہوگئی۔ ۱۳۴۳ھ میں آپ نے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف رجوع کیا اور اُنھی کے زیرِ تربیت سلوک ومعرفت کی منزلیں طے کیں۔ ۱۳۵۰ھ میں حضرت تھانویؒ نے آپ کو خلافت سے نوازا۔

❁ تدریس: فراغت کے بعد آپ نے مادرِ علمی میں درس دینا شروع کیا اور مختلف علوم وفنون کی اہم کتابیں پڑھائیں، خصوصیت کے ساتھ "حجة الله البالغة" تقریباً ہمیشہ ہی آپ کے درس میں رہی، اِس کے علاوہ ابن ماجہ شریف، مشکاۃ شریف اور شمائلِ ترمذی کا بھی آپ نے سال ہا سال درس دیا، ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۷ھ تک آپ نے مستقلاً درس دیا، اُس کے بعد اہتمام کی ذمّے داری کے ساتھ ساتھ بھی آپ نے "حجة الله البالغة" کا درس تقریباً آخر تک جاری رکھا۔

❁ منصبِ اہتمام کے لیے انتخاب: ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۴ء میں نائب مہتمم کے منصب پر آپ فائز کیے گئے جس پر اوائل ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۸ء تک فائز رہے۔ وسط ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء میں آپ کو مہتمم منتخب کیا

گیا۔ اِس عہدے پر آپ تقریباً تاحیات فائز رہے۔

آپ کے دورِ اہتمام میں، دارالعلوم کی تعمیری، تعلیمی، تنظیمی، ترقی، اور مشاہیرِ وقت کی آمد پر ایک طائرانہ نظر

۞ آپ نے سب سے پہلے دارالعلوم کی مسجد قدیم کی بالائی منزل تعمیر کی۔

۞ ۱۳۴۹ھ میں دارالحدیث کی پرشکوہ عمارت، جو عرصے سے زیرِ تعمیر تھی آپ کے مساعی سے تکمیل کو پہنچی۔

۞ دورۂ تفسیر کا اِجرا: ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں آپ کے دورِ اہتمام میں دورۂ تفسیر کا اِجرا عمل میں آیا۔

۞ دارالحدیث فوقانی کی تعمیر: ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء میں دارالحدیث فوقانی کی عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوا اور چند سالوں میں اُس کی تکمیل ہوئی۔

۞ اسی سال قواعد داخلہ میں اصلاح و ترمیم کی گئی

۞ نیز کھانے کے ٹکٹ کا اِجرا ہوا۔

۞ صدارتِ اہتمام: ۱۹۳۵ء/۱۳۵۴ھ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو صدر مہتمم منتخب کیا گیا۔

۞ ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء میں حکیم الامت حضرت تھانویؒ دارالعلوم کی سرپرستی سے مستعفی ہو گئے۔

۞ ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء میں تین شعبوں کا قیام ہوا: شعبۂ تنظیم و ترقی، شعبۂ محافظ خانہ، شعبۂ ورزش۔

۞ علمائے مصر کا وفد: ۲/ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو جامعۂ ازہر کے علما کا ایک مُوَقّر وفد دارالعلوم آیا جس نے دارالعلوم کا معاینہ کیا اور اساتذہ کی محنت اور تعلیم و تدریس کی جامعیّت کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوا۔

۞ ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۷ء میں چند جدید عمارتیں: درجۂ فارسی کی درس گاہ ''یادگارِ سعدی'' کے نام سے تعمیر ہوئی، دوسری محافظ خانے کی دو منزلہ عمارت جو دارالاہتمام کی جنوبی سمت میں واقع ہے، تیسری عمارت دارِ جدید کی تکمیل سے متعلق ہے جو مولانا حافظ محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے دور میں تعمیر ہونا شروع ہوئی تھی؛ لیکن اُس کی تکمیل حضرت حکیم الاسلام کے دور میں پایۂ انجام کو پہنچی۔

۞ ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء حافظ محمد ابراہیم وزیر رسل ورسائل کا ورود دارالعلوم: جنھوں

نے دارالعلوم کو ریلوے اسٹیشن سے ملانے کے لیے باب الظاہر سے سڑک تعمیر کرنے کی منظوری دی۔

❁ **سلطان ابن سعود کا علمی ہدیہ:** اسی سال یعنی ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، جس کے دوران اُن کی سلطان ابن سعود سے ملاقات ہوئی، اُنھوں نے کتب خانۂ دارالعلوم کے لیے، حکومتِ حجاز کی جانب سے شائع کردہ کتابیں عنایت فرمائیں۔

❁ **حکیم الاسلام کا سفرِ افغانستان:** دارالعلوم دیوبند میں ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر تبریک و تہنیت کا جلسہ منعقد ہوا، اِس موقع پر مجلس عاملہ نے طے کیا کہ دارالعلوم اور افغانستان کے قدیم علمی اور تعلیمی روابط کی تجدید اور اُن کو مستحکم بنانے کے لیے، مہتمم صاحب دارالعلوم کے نمایندے کی حیثیت سے، کابل تشریف لے جائیں، چناں چہ آپ کا یہ سفر ہوا اور آپ نے وہاں دارالعلوم کا زبردست تعارف کرایا۔

❁ **دارالتفسیر کی تعمیر:** ۱۳۵۸ھ میں دارالحدیث کی بالائی منزل کی درس گاہ دارالتفسیر کے نام سے تعمیر کی گئی، دارالتفسیر کے اوپر ایک پُرشکوہ گنبد بنایا گیا، جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دارالعلوم کے سر پر تاج رکھ دیا گیا ہے۔

❁ **باب الظاہر کی تعمیر:** ۱۳۵۹ھ میں افغانی عطیے کے مصرف کے تعلق سے مجلس شوریٰ نے طے کیا کہ چوں کہ دارالعلوم کی مخصوص سڑک تیار ہوگئی ہے اور دارالتفسیر کا گنبد بھی مکمل ہو چکا ہے، اِس لیے دارالحدیث کے بالمقابل دارالطلبہ کے صدر دروازے کا بنوایا جانا ضروری ہو گیا ہے؛ لہٰذا افغانی عطیے سے، شاہِ افغانستان کے نام پر صدر دروازہ تعمیر کروا کے، اُس کا نام ''باب الظاہر'' رکھا جائے۔ اس کا سنگ بنیاد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی (۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء-۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۱ء) کے ذریعے رکھوایا گیا۔

❁ **مسلم یونیورسٹی میں حضرت مہتمم صاحب کی تقریر:** مسلم یونیورسٹی کی انجمن ''اسلامی تاریخ وتمدن'' کی جانب سے مہتمم صاحب کو ''اسلام اور سائنس'' کے موضوع پر تقریر کی دعوت دی گئی، آپ نے دعوت قبول کرتے ہوئے وہاں تشریف لے جا کر، مذکورہ موضوع پر معرکۃ الآراء عالمانہ وفلسفیانہ تقریر فرمائی، جو وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے حلقے میں بے حد پسند کی گئی۔

❁ ۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء میں دارِ جدید کے کمروں کی تکمیل۔

❁ **ماہ نامہ دارالعلوم کا اِجرا:** جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ سے دارالعلوم کے نام سے ایک اردو ماہ نامہ رسالے کا اِجرا عمل میں آیا۔

❁ علامہ عثمانی کی یکسوئی: ۱۳۵۴ھ میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ صدر مہتمم مقرر ہوئے تھے، ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء میں مجلس شوریٰ نے وقتی حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تمام اختیارات مہتمم دارالعلوم مولانا قاری محمد طیب صاحب کو منتقل کردیے اور علامہ عثمانیؒ مستعفی ہوکر، اپنی ذمے داریوں سے کنارہ کش ہوگئے۔

❁ شعبۂ خوش خطی کا اِجرا: ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء میں شعبۂ خوش خطی کا اجرا عمل میں آیا۔

❁ ۱۳۶۵ھ میں دارالصنائع کا قیام: ۱۳۶۵ھ میں شعبۂ تجلید سے دارالصنائع کا افتتاح عمل میں آیا۔

❁ دارالاِفتا کی جدید عمارت: ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء میں دارالافتا کی متعدد کمروں پر مشتمل عمارت بن کر تیار ہوئی اور دارالاِفتا کو اُس میں منتقل کردیا گیا۔

❁ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لیے علمائے دیوبند کا انتخاب: ۱۳۶۸ھ میں پہلا موقع تھا کہ مسلم یونیورسٹی نے، اپنے کورٹ کے لیے علمائے دیوبند کو منتخب کیا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محفوظ الرحمٰن نامی اور مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کو کورٹ کی رکنیت کے لیے منتخب کیا گیا۔

❁ پاکستانی طلبہ کے داخلے میں حکومتِ ہند کا تعاون: ہندوستان کی تقسیم کے بعد پرمٹ سسٹم (اُس وقت دونوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ اور ویزا نہ تھا، پرمٹ لے کر ایک دوسرے ملک میں سفر کیا جاسکتا تھا) کی وجہ سے پاکستانی علاقے کے طلبہ کی آمد و رفت بالکل بند ہوگئی تھی، بالخصوص مذہبی طلبۂ پاکستان کے لیے، دارالعلوم میں حصولِ علم کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا، اِس صورتِ حال کو حکومتِ ہند کے سامنے پیش کیا گیا، وزارتِ تعلیم نے دارالعلوم کی اِس درخواست کو منظور کرکے ۱۳۶۹ھ میں یہ اجازت دے دی کہ جو طلبہ پاکستان سے دارالعلوم آنا چاہیں، اُنھیں درخواست پیش کرنے پر، ایک سال کا پرمٹ دے دیا جایا کرے گا، جس کی بعد میں صوبائی حکومت سے توسیع کرائی جاسکتی ہے؛ مگر اِس اجازت کے باوجود، دفتری ضوابط کی وجہ سے زیادہ عرصے تک یہ سلسلہ چل نہ سکا۔

❁ حکومتِ ہند کی جانب سے بیرونِ ہند دارالعلوم کا تعارف: اِسی سال یعنی ۱۳۶۹ھ میں وزارتِ خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے اپنی نشریات کے سلسلے میں، اِس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دارالعلوم کی تاریخ اور موجودہ حالات کا بیرونی دنیا، بالخصوص مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں، تعارف کرایا جائے، چناں چہ اِس مقصد سے دارالعلوم کے حالات اور تصاویر لینے کے لیے، یکے بعد

دیگرے وزارتِ خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے اراکین دیوبند آئے، جنھوں نے دارالعلوم کے معاینے کے بعد بلند الفاظ میں اپنے تأثرات کا اظہار کیا۔

❁ **سفیرِ افغانستان کی دارالعلوم میں آمد:** ۷/رجب ۱۳۶۹ھ کو سفیرِ افغانستان سردار نجیب اللہ خانؒ دارالعلوم میں سرکاری حیثیت سے تشریف لائے، اُنھوں نے اِس موقع سے فرمایا:

”دارالعلوم دیوبند، افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک علمی درس گاہ ہے؛ مگر میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک علمی درس گاہ ہی نہیں؛ بل کہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، دارالعلوم تنہا ہندوستان کا ورثہ نہیں؛ بل کہ تمام عالمِ اسلام کی میراث ہے“۔

❁ **مولانا آزاد کی تشریف آوری:** ۲۹/ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ کی صبح کو حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد، دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، اِس موقع سے اُنھوں نے دارالعلوم کے طلبہ کو خطاب کیا اور حصولِ علم کی راہ میں اُنھیں انتھک کوشش کی دعوت دی۔

❁ **اچاریہ ونوبا بھاوے کی دارالعلوم آمد:** ۲/ربیع الاول ۱۳۷۱ھ مطابق ۲/دسمبر ۱۹۵۱ء کو ”اچاریہ ونوبا بھاوے“ اپنی بھومی دان تحریک کے سلسلے میں واردِ دیوبند ہوے، سات بجے شب میں دارالعلوم دیکھنے آئے اور طلبہ کی خواہش پر اُن کے درمیان ایک مختصر سی تقریر میں کہا:

”یہ یونیورسٹی ہمارے ملک کا بہترین سرمایہ ہے، جس میں پورے ایشیا کے نوجوان جمع ہیں، غلامی کے دور میں اِس یونیورسٹی نے جو خدمت انجام دی ہے، مجھے امید ہے کہ یہ آزادی کے دور میں اُس سے بہت زیادہ عظیم الشان خدمت انجام دے گی، اُنھوں نے کہا: یہی ایک ادارہ ہے جس نے پہلے دن سے برطانوی سامراج کی مخالفت کی اور اِس مخالفت میں ہر محاذ پر سب سے پہلے قربانیاں دیں“۔

❁ **ایک مصری فاضل کا ورود:** اِسی سال عرب لیگ نے دارالعلوم کے نوادر مخطوطات کے مشاہدے اور اُن کے حصول کے لیے اپنے نمایندے شیخ محمد رشاد بن عبدالمطلب کو دیوبند بھیجا، اُنھوں نے کتابِ معاینہ میں دارالعلوم کے حوالے سے جو کچھ کہا اُس میں یہ بھی لکھا کہ کوئی شبہہ نہیں کہ فخر ومباہات کے زبردست اسباب میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ میں نے اِس ادارے کی زیارت کی جو مضبوط بنیادوں پر قائم ہے؛ کیوں کہ اِس کے قائم کرنے والے انتہائی مخلص اور صالح تھے۔

۞ **شعبۂ طب میں اِضافہ اور دار الشفا کا قیام:** ۱۳۷۲ھ میں دار العلوم نے شعبۂ طب میں اِضافہ کیا اور دار الشفا میں سات معالجین، چھ کارکن اور دوا کی تقسیم کے لیے اَفراد میں اِضافہ کیا۔

۞ **مَلِکِ حجاز کا پیغامِ تبریک وعطیہ:** مسجدِ نبوی میں توسیع کے اِرادے اور اُس کے لیے نقشہ تیار کیے جانے کے موقع سے ۱۳۷۳ھ میں دار العلوم نے اپنی طرف سے شاہ سعود کو مبارک باد پیش کی، جس کے جواب میں شاہ سعود نے اپنے سفیرِ مقیمِ ہند کے ذریعے دار العلوم کا شکریہ ادا کیا، اتفاق سے اِسی سال شاہ سعود ہندوستان تشریف لائے اور دار العلوم کو بہ طورِ خاص ۲۵؍ ہزار روپیے کا عطیہ عنایت فرمایا۔

۞ **انور السادات کی دار العلوم آمد:** اِسی سال عرب جمہوریہ مصر کے، بعد میں ہونے والے صدر محمد انور السادات، جو اُس وقت ''مؤتمر اسلامی'' کے جنرل سکریٹری تھے دار العلوم تشریف لائے، اِس موقع سے اُنھوں نے کتابِ معاینہ میں بڑے اچھے تاثرات رقم کیے، جن میں لکھا کہ اِس عظیم دینی اور تاریخی درس گاہ کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں بہ صمیمِ قلب اپنے بھائیوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کروں جو اِس عظیم اِدارے کو چلا رہے ہیں۔

۞ **امریکہ اور یورپ میں دار العلوم کا تعارف:** اِسی سال یعنی ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۵ء میں کناڈا یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے ایک ریسرچ اِسکالر کی طلب پر، دار العلوم کی علمی ودینی تاریخ پر، ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بھیجا گیا، جو امریکہ اور یورپ کے علمی حلقوں میں دار العلوم کے تعارف کا مُؤثّر ذریعہ ثابت ہوا۔

۞ **مصر سے دار العلوم کے روابط:** مؤتمرِ اسلامی کے جنرل سکریٹری محمد انور السادات کی آمد کے موقع پر حکیم الاسلامؒ نے، موصوف سے جامعۂ ازہر اور دار العلوم کے مابین روابط قائم کیے جانے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، مؤتمرِ اسلامی اور جامعۂ ازہر میں مہتمم صاحب کی اِس تجویز کا پُر جوش خیر مقدم کیا گیا اور ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء میں جامعۂ ازہر مصر سے دو جلیل القدر اَساتذہ شیخ عبدالمنعم النَّمِرْ اور شیخ عبدالعال العَقبَاوِی کو دو سال کے لیے، دار العلوم میں جدید عربی ادب اور اِنشا کی تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔

۞ **دار العلوم کی مسجد میں توسیع:** اِسی سال یعنی ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۶ء میں مسجد کے حوض کو وسطِ صحن سے ہٹا کر مشرق کی جانب، دار الاِفتا کی عمارت کے نیچے بنایا گیا، جس سے مسجد کے صحن میں کشادگی پیدا ہو گئی، اِسی کے ساتھ سردی کے موسم میں گرم پانی کے لیے ایک ٹنکی تیار کرائی گئی۔

۞ **فتاویٰ دار العلوم کی تدوین:** حضرت مہتمم صاحب کی اِس تجویز کو مجلسِ شوریٰ نے پسند کیا

کہ فتاویٰ دارالعلوم کو فقہی ترتیب پر ابواب وار مرتب کر کے شائع کیا جائے، چناں چہ ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۶ء سے تدوین وترتیبِ فتاویٰ کا کام مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی کے سپرد ہوا، فتاویٰ دارالعلوم کی پہلی جلد ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی۔

❁ **صدر جمہوریہ ہند کی دارالعلوم میں آمد:** ۱۴؍ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ/ ۱۳؍جولائی ۱۹۵۷ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد دارالعلوم تشریف لائے، اِس موقع سے ایک عظیم الشان جلسے کو صدر جمہوریہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''دارالعلوم کے بزرگوں نے صرف اِس ملک کے رہنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی؛ بل کہ اُنھوں نے اپنی خدمات سے اِتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ملک کے طالب علم بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پا کر اپنے ملکوں میں واپس جا کر اُس کی اِشاعت کرتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ دارالعلوم میں جو علم سکھایا جاتا ہے اُس سے صرف دارالعلوم یا مسلمانوں کی خدمت نہیں؛ بل کہ پورے ملک اور پوری دنیا کی خدمت ہوتی ہے۔ آج دنیا میں مادّیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے، اُس کا صحیح علاج روحانیت ہے، میں دیکھتا ہوں کہ سکون اور اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لیے مُہیّا فرما رہے ہیں''۔

❁ **حکیم الاسلام کا سفرِ برما:** اِسی سال یعنی ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء میں مہتمم صاحب نے برما کا سفر کیا، اُن کا یہ سفر ۱۵؍جمادی الاولی سے ۲۸؍رجب تک جاری رہا، جس کے دوران اُنھوں نے برما کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور عوام وخواص کے جلسوں کو خطاب کیا، جس سے دارالعلوم کے تعارف اور حلقۂ اثر میں غیر معمولی اِضافہ ہوا۔

❁ **شاہِ افغانستان کا وُرود:** ۵؍شعبان ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۵؍فروری ۱۹۵۸ء کو شاہِ افغانستان محمد ظاہر شاہ بہ ذریعۂ کار دہلی سے دارالعلوم تشریف لائے، یہاں اُن کا شان دار استقبال کیا گیا، شاہِ افغانستان نے دارالعلوم کے دارِ جدید کے اِحاطے میں ۲۰ ہزار افراد کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع ملا، یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور پر وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور ومعروف ہے، افغانستان کے علما دارالعلوم کے بانیوں اور یہاں کے

اساتذہ کو عزت و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، افغانستان میں اِس دارالعلوم کی شہرت محض اِس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ ایک مشہور ادارہ ہے؛ بل کہ دراصل یہ نتیجہ ہے اُن تعلقات کا جو افغانستان اور اِس دارالعلوم کے درمیان عرصۂ دراز سے قائم رہے ہیں۔

❁ **شعبۂ تنظیم فضلاے دارالعلوم:** ۱۳۷۸ھ میں فضلاے دارالعلوم کی تنظیم قائم کی گئی، جو ایک دیرینہ آرزو تھی۔

❁ **حضرت مہتمم صاحب کا سفرِ افریقہ:** ۶/محرم ۱۳۷۹ھ کو ہمدردانِ دارالعلوم کی دعوت پر حکیم الاسلامؒ نے رِی یونین کا سفر فرمایا۔ اِس سفر کے دوران زنجبار، دارلسلام، موریشس، مڈغاسکر اور ری یونین کے مختلف شہروں کا دورہ کیا، وہاں کے باشندوں نے جگہ جگہ جلسے کیے، جنھیں حکیم الاسلام نے خطاب کیا۔

❁ **دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جوبلی میں دارالعلوم کی نمایندگی:** دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے جنوری ۱۹۶۰ء میں بڑے پیانے پر جوبلی منانے کا انتظام کیا، اُس میں نمایندگی کے لیے دارالعلوم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔

❁ **صدر جمال عبدالناصر کے لیے دارالعلوم کی طرف سے علمی ہدیہ:** مارچ ۱۹۶۰ء میں جمہوریۂ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ہندوستان کا دورہ کیا، اُنھیں دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب، قاہرہ میں اپنی موجودگی کے دوران دارالعلوم آنے کی دعوت دے چکے تھے؛ لیکن صدر کے ہندوستان آمد کے وقت شوال کا پہلا ہفتہ تھا، جو دارالعلوم میں تعطیل کا زمانہ ہوتا ہے؛ اِس لیے مہتمم دارالعلوم نے خود دہلی پہنچ کر جمال عبدالناصر سے ملاقات کی اور دارالعلوم کی طرف سے فیض الباری، فتح الملہم اور سوانحِ قاسمی کے نسخے علمی ہدیے کے طور پر پیش فرمائے، صدر ناصر نے کھڑے ہو کر بڑی عقیدت سے قبول کیا اور وقیع الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

❁ **جامعہ طبیہ کا اِجرا:** ۱۳۸۰ھ میں جامعہ طبیہ کی باقاعدہ عمارت بنی، جس میں چار سالہ نصاب کے ذریعے فنِ طب کی علمی اور عملی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔

❁ **ڈاکٹر پی ہارڈی کی آمد:** اِسی سال لندن یونیورسٹی میں "شعبۂ تعلیمِ اسلام" کے لکچرار ڈاکٹر "پی ہارڈی" اپنی تاریخی تحقیق کے سلسلے میں دیوبند آئے اور ایک ہفتہ دارالعلوم میں قیام کیا، وہ دارالعلوم سے بہت متأثر ہوئے اور کتابِ معاینہ میں عقیدت مندانہ تأثرات لکھے۔

❁ **مسٹر ہمایوں کبیر کی آمد:** جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ میں مرکزی حکومت کے وزیر ثقافت

وسائنسی تحقیقات ''پروفیسر ہمایوں کبیر'' دارالعلوم دیوبند آئے اور اُنھوں نے خیر مقدمی جلسے میں دارالعلوم کی دینی اور مُلکی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا اور فرمایا: ''یہ دارالعلوم ایشیا میں اپنی قسم کا پہلا اِدارہ ہے''۔

❁ **کتب خانہ کی ترتیبِ نو:** ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم کے کتب خانے کی مزید ترتیب کی ضرورت پیش آئی، اِس کے لیے مجلسِ شوریٰ کی تجویز سے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کا انتخاب کیا گیا، موصوف نے بڑی جگر کاوی سے، فہرت سازی کا کام انجام دیا، نیز مخطوطات کی تعارفی فہرست بھی تیار کی۔

❁ **شام کے جلیل القدر عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی آمد:** اِسی سال جامعہ حلب شام کے استاذِ جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے دارالعلوم کو دیکھ کر جن تاثرات کا اظہار فرمایا وہ غیر معمولی نوعیت کے ہیں، اُنھوں نے اِس موقع سے مشائخِ دارالعلوم کی اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کی دعوت دی۔

❁ **حکیم الاسلام کا سفرِ افریقہ ومصر:** ۱۳۸۳ھ میں حکیم الاسلام نے دو بیرونی سفر کیے، پہلا سفر جنوبی افریقہ کا تھا، دوسرا مصر کا۔ یہ دونوں سفر مختلف حیثیتوں سے دارالعلوم کے لیے مفید ترین ثابت ہوے۔ آپ کا یہ سفر اواخرِ محرم ۱۳۸۳ھ میں شروع ہوا، جس وقت آپ جوہانسبرگ کے ہوائی اڈے پر اترے، تو جنوبی افریقہ کے چاروں صوبوں کے مسلمانوں کا نمایندہ اجتماع خوش آمدید کہنے کے لیے مجتمع تھا، جو تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل تھا، جوہانسبرگ کے ڈچ میئر ''اوبرہولز'' خیر مقدم کے لیے، اپنی اہلیہ کے ساتھ موجود تھے، آپ نے اِس موقع سے ڈربن اور کیپ ٹاؤن کا دورہ کیا اور بڑے بڑے اجتماعات کو خطاب کیا۔

دوسرا سفر: ۱۹رشوال ۱۳۸۳ھ مطابق ۴رمارچ ۱۹۶۳ء کو 'عالمی مؤتمرِ اسلامی'' قاہرہ کی دعوت پر ہوا، اِس مؤتمر میں دنیاے اسلام کے ممتاز علما کو دعوت دی گئی تھی، ہندوپاک کے نمایندے سب کے سب فضلاے دیوبند تھے، دارالعلوم کے وفد میں مہتمم دارالعلوم حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کے علاوہ مولانا سید منت اللہ رحمانی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی بھی تھے، مؤتمر کے بعد حکیم الاسلام اور مولانا منت اللہ رحمانی قاہرہ سے حج بیت اللہ کے لیے حجاز مقدس تشریف لے گئے، اِس دوران جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور اپنے اِعزاز میں منعقدہ خیر مقدمی جلسے سے خطاب کیا، جس کے دوران آپ نے دارالعلوم اور مسلکِ دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ ۶رمحرم ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹رمئی ۱۹۶۴ء کو حکیم الاسلام دیوبند واپس تشریف لائے۔

❁ **مستشرقین کی کانگریس میں دارالعلوم کی شرکت:** وِگیان بھون دہلی میں مستشرقین

کی بین الاقوامی کانگریس کا ۲۶واں اِجلاس جنوری ۱۹۶۴ء کی شروع تاریخوں میں منعقد ہوا، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کی درخواست پر، دارالعلوم کے مُنتخَب مخطوطات اِس موقع پر پیش کیے گئے، مستشرقین نے انھیں خاص طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، کانگریس میں یہ شرکت دارالعلوم کے وسیع تعارف کا ذریعہ بنی۔

❁ **عربی مجلّہ دعوۃ الحق کا اِجرا:** ۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم کے حلقے کو وسیع تر بنانے کے لیے ایک سہ ماہی عربی مجلّہ دعوۃ الحق کے نام سے نکالا گیا، جس کے چیف ایڈیٹر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ تھے۔

❁ **اتر پردیش کے گورنر کی دارالعلوم میں آمد:** ۲۳؍ مارچ ۱۹۶۵ء کو اتر پردیش کے گورنر ''وشوا ناتھ داس'' دارالعلوم تشریف لائے اور دارالعلوم کو دیکھ کر جلسۂ عام میں اپنے گہرے اور گراں قدر تأثرات کا اِظہار کیا۔

❁ **دارالعلوم مرکزی حکومت کی نظر میں:** اِسی سال مرکزی حکومت کی طرف سے ''ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے'' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا گیا، جس میں دارالعلوم دیوبند کا مختصر؛ لیکن بہت اچھا تعارف کرایا گیا۔

❁ **کتب خانے کا جدید ہال:** ۱۳۸۶ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں کتب خانے کی توسیع کے لیے ایک جدید ہال اور دو کمروں کا اِضافہ ہوا، یہ ہال عربی زبان کی کتابوں کے لیے مخصوص کیا گیا۔

❁ **علمائے دیوبند کی تصانیف:** اِسی سال دارالعلوم کے کتب خانے میں تصانیفِ علمائے دیوبند کے لیے ایک گوشہ مخصوص کیا گیا اور اُن کی کتابیں ایک جگہ جمع کی گئیں۔

❁ **مصر، شام اور اردن کے لیے امداد:** ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ ملتِ اسلامیہ کا ایک ایسا اندوہ ناک واقعہ تھا، جس سے پورا عالم اسلام بری طرح متأثر ہوا، دنیائے اِسلام بالعموم مظلوم عربوں کی امداد و اِعانت میں حصہ لے رہی تھی، دارالعلوم نے بھی اپنی سابقہ روایت کے تحت، اِس کے لیے ملک کے مسلمانوں سے اپیل کی اور ایک خطیر رقم فراہم کر کے مصر، شام اور اردن کی حکومتوں کو پیش کی گئی۔

❁ **مغربی ممالک کے ریسرچ اسکالر کی دارالعلوم آمد:** ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۷۰ء میں امریکہ سے مسز ''گیلی گراہم''، جرمنی سے مس ''کیریں ڈیٹ میرا'' اور کیلی فورنیا سے ''مسز مٹکاف'' اپنے تحقیقی

مقالے کی تیاری کے لیے دیوبند آئیں اور دارالعلوم کے کتب خانے سے استفادہ کیا، جرمن طالبہ نے اپنا یہ تأثر بیان کیا کہ: ''مجھے دارالعلوم میں توقع سے زیادہ مواد ملا، مجھے امید نہیں تھی کہ میرے تحقیقی مقالے کے تعلق سے، یہاں کی لائبریری میں اِتنا زیادہ مواد مل سکے گا''۔

۞ **عرب ممالک کے زائرین کے تأثرات:** رجب ۱۳۸۹ھ میں عرب ملکوں میں سے مراکش، الجزائر اور شرقِ اُردن کے چند حضرات دارالعلوم تشریف لائے اور اپنے گراں قدر تاثرات کا اِظہار کیا۔

۞ **مسجد چھتہ میں تعمیر:** ۱۳۸۹ھ میں چھتہ مسجد کے شمالی حجرے، جس میں حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا قیام رہا کرتا تھا، کو ازسرِ نو تعمیر کیا گیا۔

۞ **نصابِ تعلیم میں تبدیلی:** ۱۳۹۰ھ میں دارالعلوم میں نصابِ تعلیم پر نظرِ ثانی کی گئی جس کے نتیجے میں حسب ذیل تبدیلیاں زیرِ عمل آئیں۔

۱- نصابِ تعلیم میں درجہ بندی کو لازم قرار دیا گیا، اِس سے قبل کتاب وار طریقۂ تعلیم جاری تھا۔

۲- نصابِ تعلیم میں کچھ کتابوں کا اِضافہ کیا گیا۔

۳- درجات کی تکمیل کے سلسلے میں تکمیلِ تفسیر، تکمیلِ دینیات، تکمیلِ معقولات اور تکمیلِ ادب کا اِجرا کیا گیا۔

۞ **جدید تعمیرات:** ۱۳۹۱ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں مندرجۂ ذیل اِضافہ ہوا:

۱- دارالشفا جامعہ طبیہ کی نامکمل عمارت مکمل ہوگئی۔

۲- دارالشفا کے شمال میں افریقی طلبہ کے لیے ''افریقی بلڈنگ'' کے نام سے ایک عمارت تعمیر ہوئی۔

۳- جدید دارالاقامہ (دارِ جدید) کے کچھ کمروں میں تعمیری تغیّر کر کے، اُن کو غلے کا گودام بنایا گیا۔

۞ **آل انڈیا زرعی کمیشن کے ایک ممبر کی دارالعلوم آمد:** اِسی سال آل انڈیا زرعی کمیشن کے ایک ممبر ''چودھری رندھیر سنگھ'' نے دارالعلوم کا دورہ کیا اور جلسۂ عام میں دارالعلوم کی تعریف میں پُر جوش تقریر کی۔

۞ **حکیم الاسلام کا سفرِ یورپ:** ۱۴؍جمادی الاخری ۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) میں حکیم الاسلام نے انگلستان، فرانس اور مغربی جرمنی کا سفر کیا، یہ سفر ۱۵؍شعبان ۱۳۹۱ھ کو ختم ہوا، اِس کے دوران آپ نے انگلستان کے تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا، جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں: گلوسٹر، بریڈفرڈ باٹلے، بلیک برنڈ، برسٹنگ، بولٹن، شیفلڈ، کونٹری، برمنگھم، راجڈیل، وال سول اور لندن، اِس دوران آپ نے بڑے

بڑے اجتماعات کو خطاب کیا اور بریڈ فورڈ یونیورسٹی کے طلبہ کی خواہش پر، اُن کے ایک جلسے میں بھی تقریر کی۔

۲۲/دسمبر ۱۹۷۱ء تک انگلستان میں قیام رہا، وہاں سے واپسی میں ''پیرس'' جانا ہوا وہاں کے دو جلسوں میں عربی میں تقریریں کی، پیرس سے ''مغربی جرمنی'' کا سفر ہوا اور وہاں سے مکہ مکرمہ حاضری ہوئی، عمرہ اور روضۂ اقدس کی زیارت کے بعد ''کویت'' کا سفر ہوا، وہاں مختصر قیام کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی۔

❁ **مصری ثقافتی وفد کی آمد:** اِسی سال ''محمد توفیق عویضہ'' کی قیادت میں مصر کا ایک وفد دہلی سے بہ ذریعۂ کار دیوبند پہنچا، وفد نے ملاقات کے دوران کہا کہ دارالعلوم دیوبند کے سلسلے میں علامہ رشید رضا کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ ''ہندوستان میں جس شخص نے دارالعلوم کو نہیں دیکھا، اُس نے کچھ بھی نہیں دیکھا''۔

❁ **جاپانی وفد کی آمد:** ۷/ستمبر ۱۹۷۲ء (۱۳۹۲ھ) کو بہ ذریعۂ کار دہلی سے ٹوکیو یونیورسٹی جاپان کے اردو پروفیسر ''تاکیش سوزوا'' اور تاریخ کے پروفیسر ''مت میو آرا'' ایک اسکالر خاتون کے ساتھ دارالعلوم آئے اور دارالعلوم کی معلومات حاصل کیں، وہ یہاں کے ماحول اور پُرسکون فضا سے بہت متأثر ہوے۔

❁ **رابطہ عالمِ اسلامی کے وفود کی آمد:** ۱۳۹۳ھ میں سعودی عرب سے دو وفد دارالعلوم آئے، ایک وفد ''رابطہ عالمِ اسلامی'' مکہ مکرمہ کی جانب سے، دارالعلوم آیا جو دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کررہا تھا، اِس وفد کے سربراہ ''سید ابراہیم ثقاف'' تھے اُس کے کچھ عرصے بعد دوسرا وفد شعبان ۱۳۹۴ھ کے اوائل میں آیا، اُس میں وزارتِ معارف کے ڈائرکٹر اور ''ادارہ مباحثِ اسلامیہ'' کے نمایندے شامل تھے۔ اِن حضرات نے دارالعلوم کو دیکھنے کے بعد، اُسے علم کا روشن مینارہ، عرفان ومعرفت کا مرجع اور طالبینِ ہدایت کی پناہ گاہ قرار دیا۔

❁ **گورنر اترپردیش کی آمد:** ۱۳۹۳ھ کے اواخر میں اترپردیش کے گورنر ''اکبر علی خان'' دارالعلوم دیکھنے آئے اور بلند الفاظ میں دارالعلوم کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا، اِس موقع پر اُنھوں نے دیوبند میں ''بھارت ڈگری کالج'' کا سنگ بنیاد رکھا۔

❁ **دارالقضا کا قیام:** ۱۳۹۴ھ میں مسلم پرسنل لا اور قوانینِ شریعت کے تحفظ وبقا کے لیے عملی طور پر محکمۂ قضا قائم کیا گیا۔

❁ **حکیم الاسلام کا سفرِ افریقہ وحجاز ویورپ:** اوائل شعبان ۱۳۹۵ھ میں مشرقی افریقہ کے ملک ''ری یونین'' میں ''سینٹ پیٹر'' کے مقام پر حکیم الاسلام نے عالی شان مسجد کا افتتاح فرمایا، وہاں سے ''رابطہ عالمِ اسلامی'' کی دعوت پر ''رسالۃ المسجد'' کے اجلاس میں شرکت کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے

گئے۔ اِس اِجلاس میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید منت اللہ رحمانی اراکین شوریٰ دار العلوم نے بھی شرکت کی۔ مکہ مکرمہ سے حکیم الاسلام پیرس (فرانس) ہوتے ہوئے لندن تشریف لے گئے اور وہاں کے متعدد شہروں کے اجتماعات سے خطاب کیا۔

❁ **شیخ الازہر اور دِیگر علمائے عرب کی آمد:** ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وکیل الازہر شیخ عبدالرحمٰن بیطار، مفتی اعظم مصر محمد خالد اور سابق شیخ الازہر شیخ محمد الفحام دار العلوم تشریف لائے، شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے اپنے خطاب میں کہا کہ: ''میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مہتمم دار العلوم دیوبند کے زہد وتقویٰ، رفعتِ علم اور اخلاص وللّٰہیت ہی کے یہ آثار ہیں، جو اِس ادارے میں دیکھے جا رہے ہیں''۔ شیخ محمد الفحام نے اپنے خطاب میں فرمایا: ''میں ایک زمانے سے دار العلوم دیوبند کی زیارت کا مشتاق تھا، میرا یہ اشتیاق دن بہ دن بڑھتا رہا، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری موت اُس وقت تک نہ آئے جب تک میں دار العلوم کی زیارت نہ کرلوں۔ الحمد للہ کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی، جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا، میں نے اپنی آنکھ سے جو کچھ یہاں دیکھا، وہ اُس سے بہت زیادہ ہے جو میں نے سنا تھا''۔

❁ اِن حضرات کے چند روز بعد علمائے عرب کی ایک دوسری جماعت آئی جس میں یوسف السید ہاشم رفاعی وزیر حکومتِ کویت، استاذ عبدالرحمٰن مدیر البلاغ کویت اور قطر کے شیخ عبدالمعز عبدالستار کے ساتھ ''تاشقند'' کے نمایندے ''شرف الدین محمود وف'' وغیرہ شامل تھے۔ سارے عرب مہمانوں نے دار العلوم کو دیکھ کر جلسۂ عام میں دار العلوم کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔

❁ **صدر جمہوریۂ ہند کی آمد:** ۲۳/ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ کو صدر جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد دار العلوم کی زیارت کو دہلی سے بہ ذریعہ ہیلی کوپٹر تشریف لائے۔ یوپی کے وزیرِ اعلیٰ اور گورنر کے علاوہ چند مرکزی اور صوبائی وُزرا بھی ہم رکاب تھے۔

صدر جمہوریہ نے اپنی طویل تقریر میں فرمایا کہ یہ دار العلوم صرف ہندوستان ہی نہیں؛ بل کہ پوری دنیائے اسلام کی ایک اہم عظیم تاریخی اور دینی درس گاہ ہے، میں اِس کے اکابر اور اساتذہ کے خلوص اور اسلامی سادگی سے بے حد متاثر ہوں۔

❁ **صد سالہ اجلاس منعقدہ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء سے معاً پہلے کی گئیں اہم تعمیرات:**

۱- ''دارِ جدید'' کے نام سے مشہور دار الاقامہ کی دوسری منزل پر دسیوں کمرے تعمیر کیے گئے۔

۲- دارالحدیث تحتانی کی شمالی وجنوبی جانب دوسری منزل پر دو بڑی درس گاہیں تعمیر ہوئیں۔

۳- دارالعلوم کی مرکزی عمارت کے دونوں جانب شمال وجنوب کے مناروں کو سہ منزلہ تعمیر کیا گیا، پہلے یہ دونوں دومنزلہ ہی تھے۔

۴- مسجد قدیم میں ترمیم واِصلاح کی گئی اور دونوں منارے اونچے کیے گئے۔ مسجد کا صدر دروازہ تعمیر کیا گیا، نیز مسجد کے حوض کو اور مشرقی جانب منتقل کیا گیا اور پہلے سے بڑا تعمیر کیا گیا۔

۵- اِحاطۂ باغ کو اِحاطۂ دارِ جدید سے جوڑنے کے لیے راستہ بنایا گیا۔

۶- اِحاطۂ باغ کی بالائی منزل پر بہت سے چھوٹے کمرے تعمیر ہوے۔

۷- تعلیمات کی دوسری عمارت اُسی جگہ پر پہلے سے کشادہ اور ضرورت کے مطابق تعمیر کی گئی۔

۸- دارالعلوم کے صدر گیٹ ''بابِ قاسم'' کو از سرِ نو ترمیم کے ذریعے پہلے سے زیادہ اچھا اور جاذبِ نظر کیا گیا۔

۹- اِحاطۂ کتب خانہ میں ہمہ جہت دومنزلہ گیلری تعمیر کی گئی۔

۱۰- دارالتفسیر کے گنبد کی تزیین کاری کی گئی۔

❁ **اسفار:** حکیم الاسلام نے برصغیر سمیت، ایشیا، امریکہ، یورپ اور افریقہ کے کونے کونے اور شہروں اور دیہاتوں کا اِتنا سفر کیا کہ کم مشاہیرِ ہند کو اِتنے اسفار کا موقع ملا ہوگا۔ انھوں نے اپنے اسفار، ملاقاتوں اور دوروں سے دارالعلوم کے کام، مقام اور نام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ وہ جہاں گئے اُن کی ذات وصفات اور علم وکمال کا لاثانی امتیاز، نقشِ جاوداں چھوڑ آیا اور ہر جگہ کے لوگوں نے بلا امتیازِ مذہب وملت یہ گواہی دی کہ یہ فرشتہ صفت، مؤمنی صورت انسان، جس مذہب اور جس اِدارے سے وابستہ ہے، وہ یقیناً سچے اور حق وصداقت کے نمایندے ہیں۔

❁ **اہم علمی نقوش:** سائنس اور اسلام ● اسلام میں اخلاق کا نظام ● فطری حکومت ● خاتم النبیین ● اسلام اور مسیحی اقوام ● حدیث کا قرآنی معیار ● کلمۂ طیب ● دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات ● قوموں کی ترقی وزوال کے اسباب ● مذہب وسیاست ● دعوتِ اسلامی کے اصول ● اسلامی مساوات ● اجتہاد وتقلید۔

اِس کے علاوہ اُن کی تقریروں کا مجموعہ بھی دسیوں جلد میں چھپ چکا ہے اور اُن کا شعری دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔

۞ دارالعلوم میں خلفشار اور اہتمام سے استعفا: ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم میں اختلاف اور خلفشار رونما ہو جانے کے بعد، آپ نے ۱۸/ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ۹/ اگست ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کو اپنا استعفا پیش کر دیا اور اہتمام کی ذمے داریوں سے سبک دوشی اختیار کر لی۔

۞ وفات: ۶/ شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷/ جولائی ۱۹۸۳ء بہ روز اتوار ٹھیک ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ بہ وقتِ وفات آپ ۸۸ سال کے تھے۔

اتوار و سموار: ۶-۷/ شوال کی درمیانی شب میں آپ کی نمازِ جنازہ ۱۱ بجے اِحاطۂ مولسری دارالعلوم دیوبند میں آپ کے صاحب زادۂ اکبر مولانا محمد سالم قاسمی نے پڑھائی۔ جدِّ اَمجد حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتوی کے پہلو میں، مقبرۂ قاسمیہ میں تدفین عمل میں آئی۔ تقریباً ایک لاکھ آدمی نے نمازِ جنازہ پڑھی، جن میں زیادہ تعداد علما و صلحا و طلبہ کی تھی۔

پس ماندگان

حکیم الاسلام کے چار صاحب زادے اور چار صاحب زادیاں ہوئیں، جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

صاحب زادگان

۱- حضرت مولانا محمد سالم قاسمی: پیدائش جنوری ۱۹۲۶ء (جمادی الاخری ۱۳۴۴ھ) آپ نے از اول تا آخر دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، ۱۹۴۸ء (۱۳۶۷ھ) میں فارغ ہونے کے بعد آپ نے سال ہا سال تک دارالعلوم ہی میں تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۹۸۲ء (۱۴۰۳ھ) میں دارالعلوم میں پیدا ہونے والے اختلاف کے بعد، آپ نے اپنے رُفقا کے تعاون سے دارالعلوم وقف کے نام سے دوسرا دارالعلوم قائم کر لیا، جس کے شروع سے مہتمم ہیں اور وہیں بخاری شریف کی تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اِسی کے ساتھ ملک اور بیرونِ ملک میں سیکڑوں دینی اور دعوتی اسفار کیے۔ پرسنل لا بورڈ کے رکنِ مجلس عاملہ رہے اور اب اُس کے نائب صدر ہیں۔ مجلسِ مشاورت کے بھی صدر ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلما کی مجلسِ منتظمہ، مظاہر العلوم وقف کی مجلسِ شوریٰ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے رکن ہیں، اُنھیں مصری حکومت کئی سال پہلے برِصغیر کے ممتاز عالم کے نشانِ امتیاز سے نواز چکی ہے۔

۲- مولانا محمد عاصم قاسمی: دارالعلوم دیوبند میں حفظِ قرآن کے بعد فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ۷/ مئی ۱۹۴۲ء (۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۱ھ) میں ۱۴ سال کی عمر میں وفات ہوگئی۔

۳- مولانا محمد اسلم قاسمی: پیدائش ۱۹۳۸ء (۱۳۵۷ھ) اُنھوں نے بھی ساری تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، پھر دارالعلوم کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار اور منتظم رہے۔ اُس کے بعد شعبۂ

تنظیم وترقی کے ناظم اور ۱۹۸۰ء (۱۴۰۰ھ) میں منعقد ہونے والے صد سالہ اجلاس کے ناظم کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم وقف کے قیام کے بعد، اُسی میں تدریسی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ اِس وقت ہندوستان کے منتخب واعظین اور خطبا میں شمار کیے جاتے ہیں، اُنھیں عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی سے بھی واقفیت ہے۔

۴- **محمد اعظم قاسمی:** دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ساری تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں حاصل کی، چنانچہ بی. اے، ایم. اے اور پی. ایچ. ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور وہیں بہ طور لیکچرار تقرر ہوا اور ترقی کر کے پروفیسر بنے، ۲۰۰۶ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد علی گڑھ میں ہی رہائش پذیر ہیں۔

صاحب زادیاں

۱- **فاطمہ بیگم:** یہ سب سے بڑی صاحب زادی تھیں، ماسٹر رشید احمد صاحب (بریلی) کے نکاح میں تھیں۔ تقسیم ملک کے بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہوگئیں اور کراچی میں رہائش اختیار کرلی، وفات کے بعد وہیں مدفون ہیں۔

۲- **ہاجرہ بیگم:** اِن کا نکاح مولانا حامد الانصاری غازیؒ (رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند و مدیر المدینہ اخبار بجنور) سے ہوا، وہ بڑے ادبی ذوق کی حامل تھیں، بِرصغیر کے ادبی حلقوں میں وہ معتبر نام شمار ہوتی تھیں، ''نازلی'' تخلص کرتی تھیں۔ ۱۸ سے زائد اِصلاحی ومعاشرتی ناولوں کی مُصنِّفہ ہونے کے علاوہ ہند و پاک کے مختلف دینی، ادبی اور اِصلاحی ماہ ناموں میں مختلف موضوعات پر، اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں علی گڑھ میں وفات پائی، یونیورسٹی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئیں۔

۳- **حمیرا بیگم:** دیوبند کے معروف گھرانے کے سابق چیرمین اور رئیسِ دیوبند محتشم صاحب کے صاحب زادے: سید احتشام کاظمی سے منسوب ہیں، احتشام صاحب تقسیم ملک کے بعد، کراچی منتقل ہوگئے اور وہیں بود و باس اختیار کرلی، گذشتہ تین دہائیوں سے امریکہ میں مقیم ہیں۔

۴- **عذرا بیگم:** دیوبند کے ڈاکٹر افضال سے نکاح ہوا، اور شادی کے ڈیڑھ سال کے بعد ۱۹۵۶ء میں بہ عمر ۲۱ سال وفات ہوگئی، قاسمی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

احفاد (ابنائے شیخ محمد سالم قاسمی)

۱- **محمد سلمان قاسمی:** شرح جامی تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد، مسلم

یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی میں تعلیم حاصل کی، ایم. اے کرنے کے بعد ۱۹۸۰ء میں بہ غرضِ ملازمت جدہ چلے گئے، چار سال وہاں قیام رہا ۱۹۸۶ء میں پاکستان منتقل ہوگئے اور پی. آئی. اے میں ملازم ہوے، تاحال اسی عہدے پر فائز ہیں۔

۲- **محمد سفیان قاسمی:** حفظِ قرآن کریم کے بعد، دارالعلوم دیوبند میں تعلیم مکمل کی، ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوے، دورانِ تعلیم ہی پرائیویٹ طریقے پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہائی اسکول سے ایم اے تک امتحانات دیے، ۱۹۷۶ء جامعۃ الازہر، قاہرہ میں کلیۃ شرعیہ سے ماجستیر (ایم اے) کیا، ۱۹۸۰ء میں واپسی ہوئی، ۱۹۸۳ء سے دارالعلوم وقف سے وابستگی ہوئی اور ابتدائی کتب زیر تدریس رہیں، تدریجاً انتظامی ذمہ داریاں بھی سپرد ہوئیں، گذشتہ چار برس سے نیابتِ اہتمام متعلق ہونے کے ساتھ ساتھ، ترمذی شریف جلد ثانی کے اسباق متعلق ہیں۔ ۲۰۰۷ء کلکتہ اجلاس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے رکن منتخب کیے گئے۔ اس کے علاوہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بھی رکن ہیں۔

۳- **محمد عدنان قاسمی:** جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ہائی اسکول کرنے کے بعد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم کام تک تعلیم حاصل کی، تجارتی سرگرمی کے لیے ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء ساؤتھ امریکہ کے ملک چلی میں مقیم رہے۔ حالیاً دہلی میں مقیم ہیں اور تجارتی مصروفیات میں مشغول ہیں۔

۴- **حافظ محمد عاصم قاسمی:** حفظ قرآن کے بعد، جامعہ ملیہ دہلی سے ہائی اسکول کیا، جید حافظ ہونے کے ساتھ، خوش لحن انداز میں قراءت سے متأثر ہوکر، بعض عرب حضرات نے بہ غرضِ تراویح امریکہ کی دعوت دی، بقیہ تعلیم وہیں پر مکمل کی، تعلیم کے بعد تجارتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ، واشنگٹن کے اسلامک سینٹر سے بھی وابستہ رہے۔ اور اپنے حلقۂ اثر میں تبلیغِ اسلام خاص موضوع رہا، چالیس سے زائد افراد نے دل نشیں اندازِ تعلیمات سے متأثر ہوکر، اِسلام قبول کیا، جنھیں قرآن کی تعلیم دی۔ دنیا کے مختلف ممالک میں قیام پذیر رہے اور امریکی شہریت اختیار کی، حالیاً دہلی میں مقیم ہیں۔

۵- **اسماء اِعجاز:** سید اعجاز حسن صاحب، جو کہ چاند پور ضلع بجنور کے ایک معروف گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، سے منسوب ہیں، ایم اے اردو تک تعلیم حاصل کی، حالیاً دہلی میں مقیم ہیں۔

۶- **عظمیٰ ناہید:** مولانا حامد الانصاری غازی صاحب کے صاحب زادے سلمان منصور غازی صاحب کے نکاح میں ہیں، اِقراء ایجوکیشنل فاؤنڈیشن شکاگو کی ہندوستانی شلخ کی چیرپرسن ہیں، اِس کے علاوہ ملک و بیرون ملک اِصلاحی تحریکات سے فعال وابستگی کی بنیاد پر، ملک کی معتبر ترین خاتون کی حیثیت سے متعارف ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ میں خواتین وِنگ میں نہایت فعال شخصیت کی حیثیت

سے جانی جاتی ہیں۔

(ابنائے مولانا محمد اسلم قاسمی)

۱- مولانا محمد فاروق قاسمی: دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ندوۃ العلما لکھنؤ سے فضیلت کی، اُس کے بعد امریکہ چلے گئے، وہاں پر دس سالہ قیام میں درس وتدریس سے وابستہ رہے، ۲۰۰۰ء میں وطن واپسی ہوئی، دارالعلوم وقف دیوبند سے منسلک ہوگئے، تاحال اِسی ادارے میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

۲- محمد ہشام قاسمی: حفظ کلام اللہ کے بعد ابتدائی تعلیم دیوبند میں حاصل کرنے کے بعد، ہائی اسکول تا ایم اے دہلی یونیورسٹی سے کیا، اس کے بعد اپنے تجارتی کاروبار میں مشغول ہوگئے ہیں۔

۳- فوزیہ زرین: امریکہ میں مقیم اجمیری خانوادے سے تعلق رکھنے والے ایک ذی استعداد فاضل سے منسوب ہوکر امریکہ چلی گئیں اور وہیں پر ۳۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ بی اے تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پرائیویٹ طریقے پر امتحانات دے کر تعلیم حاصل کی تھی۔

۴- فرح زرین: گھر پر رہ کر ضروری دینی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ، پرائیویٹ طریقے پر ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور کاندھلہ کے ایک معروف گھرانے کے فرد بدرالاسلام صاحب سے منسوب ہیں۔

(ابنائے محمد اعظم قاسمی)

۱- احمد فرید: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ابتدا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، فضائی فوج کے لیے منتخب کرلیے گئے، حالیاً دہلی میں مقیم ہیں اور لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔

۲- قاسم رشید: علی گڑھ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد، دہلی میں زیرِ تعلیم ہیں۔

۳،۴- صباحت، زینب: دونوں لڑکیاں شادی ہونے کے بعد، امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔

ادیب، شاعر، نقاد، محقق، عالمِ دین اور مفتی

حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلویؒ

۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء - ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء

۲۳ سال پہلے کی بات ہے (کیوں کہ میں یہ سطریں آج سہ شنبہ: ۵/شعبان ۱۴۳۰ھ = ۲۸/جولائی ۲۰۰۹ء کو سپردِ قلم کررہا ہوں) راقم الحروف کی جمعہ ۱۱/شعبان ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳/مارچ ۱۹۸۷ء کو سعودی عرب کے ایک سفر سے واپسی ہوئی۔ مجھے کسی ناگزیر کام سے اردو بازار دہلی کے کتب خانہ عزیزیہ میں اذانِ عصر کے وقت چند منٹ کے لیے جانے کا اتفاق ہوا۔ کتب خانے کے مینیجر مولوی عبدالحکیم صاحبؒ (۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء- ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء) پسرِ خُرد مولانا سمیع اللہ قاسمیؒ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء- ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) ونواسہ مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء-۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء) کی جیسے ہی میرے اوپر نظر پڑی، کہنے لگے: مولانا! آپ کو معلوم ہے ابھی ابھی مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصف کا انتقال ہوگیا ہے۔ مجھے بہت عجلت تھی؛ کیوں کہ کسی بہت ضروری داعیے سے اُسی وقت دیو بند لوٹنا تھا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. کا بے ساختہ وِردْ کرتے ہوے، اُن سے کہا کہ مولانا مرحوم کے کسی صاحب زادے سے ملاقات ہوجاتی تو میں کم سے کم تعزیت کی سنت کی ادائیگی کی سعادت حاصل کرلیتا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ مولانا مرحوم کی رہائش، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہمارے کتب خانے کے اوپر ہی ہے؛ لیکن اِس وقت شاید بیٹھک میں بھیڑ ہو اور آپ کو جلدی ہے؛ آپ شاید بہ عجلت کسی سے نہ مل سکیں گے کہ اتنے میں مولانا مرحوم کے ایک

صاحب زادے محمد قاسم (جو بعد میں ماشاء اللہ ڈاکٹر محمد قاسم ہوگئے) اپنے مکان سے اُتر کے کسی عاجلانہ ضرورت کے لیے نیچے آئے، میں فوراً اُن سے بغل گیر ہوا اور باچشمِ نم اُن سے اِظہارِ تعزیت کیا، موصوف نے کہا آپ کی تعزیت سے بڑی تقویت ملی، والد صاحب آپ سے بڑی محبت کرتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپ کا ذکرِ خیر کرتے تھے۔

مولانا کا سراپا

دہلی سے دیوبند کے پورے راستے میں رہ رہ کے مولانا مرحوم کی یاد آتی اور ستاتی رہی۔ وہ میرے اُن بڑوں میں تھے جنھوں نے ایسی شفقت ومحبت دی، جس کا اب کسی بڑے سے تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ اُنھیں اُن کی عنایتوں کے بدلے وہاں کی بڑائی نصیب کرے جہاں کی بڑائی ہی اصل بڑائی ہے۔ اُن کا سراپا آنکھوں کے سامنے پھرتا اور سفر کی تنہائی میں بار بار ہم کلام ہوتا رہا: گندم گوں رنگ، چھریرا بدن، چال میں متانت، چہرے پر وقار، آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور تامّل وتفکّر کی جھلک، سر پر بال والی سیاہ سفید کھڑی کشتی نما ٹوپی، بدن پر ہلکی سُرمئی رنگ کی شیروانی، رفتار میں سرعت، گفتار میں سنجیدگی، دراز قد بھنویں گھنیری، پیشانی کشادہ۔ گویا ہوتے تو مطالعے کی وسعت، علمی تنوّع، تاریخی جان کاری اور عہدِ رفتہ کی عظمتوں کی بے پناہ معلومات کی جھری لگ جاتی۔ مخاطب کو متکلم کی راست گوئی اور زبان ودل کی یکسانیت پر اِیمانِ راسخ کی طرح یقین ہوتا؛ کیوں کہ وہی کہتے جو دل میں ہوتا، لہجے میں صفائی، بات میں ترتیب وہم آہنگی ہوتی۔ لباس معمولی اور سادہ لیکن زفرق تا بہ قدم نستعلیقیت پھوٹی پڑتی۔ زندگی میں برتی جانے والی اُن کی کسی چیز میں بدنمائی ہوتی نہ بے ڈھنگا پن۔ مُہذّب ومُرتّب اِنسان کا وہ اعلیٰ وارفع نمونہ تھے۔ اُن کی سیرت وسلوک سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زندگی جینے کے فن کے اعلیٰ پایے کے ماہرین میں سے ایک ہیں۔ سچ یہ ہے کہ فنِ حیات کے بڑے آرٹسٹ (Artist) اور

زبردست کاری گر تھے۔ اُن کے پاس بار بار جانے کو جی چاہتا اور جب بھی اُن کے پاس سے اُٹھتے جی برا ہوتا، اُن کے دل کی پاکیزگی اور خلوص کی جاذبیت میں مقناطیس کی کشش تھی، مجھے لگتا تھا کہ انسانیت کے خالص پارس کو تحلیل کر کے اُن کی شخصیت کا خمیر اُٹھایا گیا تھا، قناعت پسندی و کفایت شعاری اُن کا وصفِ خاص تھا اور لایعنی گفتگو سے پرہیز اُن کا مابہ الامتیاز۔

غیر معمولی اصل کی فرع

اُن کی لاتعداد خوبیوں کو دیکھ کے از خود اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ کسی غیر معمولی اصل کی فرع ہیں۔ پھر جب اُنھیں برتنے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ علاّمۂ یگانہ مفتیِ اعظمِ ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃُ اللہ علیہ کے فرزندِ ارجمند ہیں تو اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ بالیقین یہ اُسی غیر معمولی درخت کی خوب صورت اور نرالی شاخ ہیں۔ مفتی صاحبؒ کے بارے میں جاننے والے کو معلوم ہے کہ وہ نہ صرف ایسے فقیہ اور کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ ﷺ میں مجتہدانہ درک رکھنے والے ایسے عالم و فاضلِ روزگار تھے کہ سارے علماے حق کو اُن کی فقیہانہ بصیرت اور مفتیانہ عبقریّت و عظمت پر اتفاق تھا؛ بل کہ بعض عُلَما و مُفکِّرین کے نزدیک اُن کی فقہی بصیرت ایسی تھی جیسے اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (نعمان بن ثابت ۸۰ھ/ ۶۹۹ء-۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء) کے بہ راہ راست شاگرد کی۔ اِسی کے ساتھ وہ عربی اور اردو زبانوں کے بلند پایہ عالم تھے، دونوں زبانوں کے پختہ اسلوب شاعر تھے وہ اردو میں ایسی نثر لکھتے تھے کہ دقیقہ رس ناقد کو بھی اُس میں کہیں حشو و زوائد یا زبان کی ساختیات و اسلوبیات کے خلاف کوئی تعبیر تلاشِ بسیار کے بعد بھی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ علماے کبار اور فقہاے عظام کے درمیان کئی حوالوں سے امتیازی شان کے مالک تھے۔ اُن کی تقریر و تحریر انتہائی مُرتَّب و مُختَصر اور صرف مغز کی حامل ہوتی تھی۔ وہ فتاویٰ بھی بہت مُختَصر و مُرتَّب اور واضح نثر میں لکھتے

تھے، جب کہ فقہا وعلما کی زبان اپنی پیچیدگی کے لیے مشہور ہے؛ اِسی لیے وہ تاحیات جب تک مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن رہے، تجویزوں اور فیصلوں کی عبارتیں ہمیشہ وہی تحریر کرتے تھے۔ اِسی کے ساتھ وہ عربی اور اردو کے بڑے خطّاط اور خوش نویس بھی تھے، مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم نے اپنی بیٹھک والے کمرے میں اُن کے لکھے ہوئے کئی طغرے دکھائے جو حسنِ کتابت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ فن کار طبّاخ بھی تھے، چناں چہ وہ جب قافلۂ آزادی کے اپنے قدآور دوستوں حکیم اَجمل خاں دہلوی (مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں دہلوی ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۸ء-۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) اور ڈاکٹر انصاری (ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰ء-۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء) وغیرہ کی کبھی دعوت کرتے تھے، تو وہ حضرات اُن کے اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کی فرمایش کرتے تھے کہ اُن میں جو لَذَّت ہوتی تھی وہ بعض دفعہ خواتین کے تیار کردہ کھانوں میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑے خَیّاط بھی تھے کہ ہاتھ سے مشین کی طرح باریک اور خوب صورت سلائی کر لیتے تھے، اگر ضرورت پڑتی تو اپنا مُکَمَّل جوڑا اپنے ہاتھ سے سِل لیا کرتے تھے۔ غرض زندگی کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو اپنے ناخنِ تدبیر سے پوری کر لینے کی ایسی صلاحیت رکھتے تھے، جو عموماً بڑے اور باکمال علما میں نہیں ہوتی؛ کیوں کہ حرفِ علم کی اچھی معرفت رکھنے والا، بالعموم حرفِ حیات سے نا آشنائے محض ہوتا ہے؛ لیکن مفتی صاحبؒ کو اللہ نے دقیقہ رسی اور فقہی باریک بینی کے ساتھ، مسائلِ حیات کی ہمہ گیر آگہی بھی عطا فرمائی تھی۔ وذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ.

بے انتہا سادگی اور ڈھیر ساری پُر کاریاں

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف کو دیکھنے والا گواہی دے سکتا تھا کہ واقعی عظیم باپ نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں اپنی عالمانہ و فقیہانہ و تجربہ کارانہ و فن کارانہ صلاحیت کا بھرپور ثبوت دیا ہے اور ہونہار، سپوت اور فرماں بردار و سعادت نصیب بیٹے نے، اُس

پدری تربیت کو مُکَمَّل طور پر جذب کر کے، عظیم باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سرور بننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ توفیقِ الٰہی نے ہمہ نصیب بیٹے کا ہمہ لحہ بہ خوبی ساتھ دیا ہے؛ اِس لیے ہونہاری و فرماں برداری کے معیارِ مطلوب پر پورا اُترنے میں کام یابی نے ہر گام پر اُس کے قدم چومے ہیں؛ لٰہذا اُس کی صلاحیت کی ہمہ گیری، شخصیّت کی نرالی سج دَھج، سیرت و کردار کا بانک پَن، علم و فکر کے نتائج کے خوش نما رنگ و ڈھنگ، اِنھی عوامل کی مشترکہ اثر خیزی کی دین ہیں۔

مولانا واصف مرحوم عالمِ دین، مُفتی، مؤرِّخ، محقِّق، ادیب، شاعر، نقّاد، خطّاط اور مؤلِّف واہلِ قلم تھے؛ لیکن اُن کی سادگی کو دیکھ کر اِتنی ساری پُرکاریوں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اُن کے کسی رویّے سے علمی کرّ وفرّ کا اندازہ نہ ہوتا تھا؛ ہاں اُن کی عالمانہ ہیئت سے بیشک اُن کے پڑھے لکھے ہونے کا اندازہ ہوجاتا تھا؛ لیکن کسی طرح کسی کو اوّلین وہلے میں اُن کے اُتنے بڑے ہونے کا، جتنے کہ وہ تھے، اٹکل نہ ملتا تھا۔ وہ بہت بڑے ہوکر بہت چھوٹے لگتے تھے، ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تو تھا؛ لیکن علمی پندار سے قطعاً مُنَزَّہ تھے۔ وہ کسی اجنبی سے پہلی ملاقات میں بہت کُھلتے نہ کسی ملنے والے سے بہت سمٹتے تھے؛ لیکن وہ بہت جلد گھل مل جاتے تھے؛ بالخصوص اُس وقت جب وہ ملنے والے میں کسی طرح کا علمی ذوق محسوس کرتے، اُنھیں جیسے ہی اپنے ملاقاتی میں اپنی ہم جنسی کا احساس ہوتا اُن کی باچھیں کِھل جاتیں۔

خاکِ دہلی کا سچا نمایندہ

مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ تو اَصلاً ''شاہ جہاں پور'' یوپی کے تھے؛ لیکن جوانی سے بڑھاپے اور وفات تک دہلی ہی میں رہے اور اُسی کی خاک کا پیوند بنے۔ اُن کی بود و باش تو شروع شروع میں ''بارہ دری شیر افگن خاں'' میں کرایے کے مکان میں رہی، اُس کے بعد ''حویلی اعظم خان'' میں کئی مکان تبدیل کیے، کرایے

کے مکانوں میں سب سے آخری مکان ''کوچہ فولاد خاں'' گلی مدرسہ شاہ عبدالعزیزؒ میں لیا، جس میں ۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء سے ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء تک قیام رہا۔ اِسی دوران دہلی کے مشہور محلّہ ''کوچہ چیلان'' میں ایک ذاتی مکان خرید لیا اور اِصلاح و مرمت کے بعد ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء سے تا وفات اِسی میں رہایش رہی۔ یہ کوچہ ہمیشہ سے گہوارۂ علم وادب اور علُما و صُلَحا کا مسکن رہا تھا۔ یہیں اُستاذ العلما مولانا مملوک العلی نانوتویؒ (۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء-۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) اُن کے باکمال وعبقری فرزند صدر المدرسینِ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء-۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء) اور دورِ آخر میں ہند میں سرمایۂ ملّت کے نگہبان و پشتیبان حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء-۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) بانیِ دارالعلوم دیوبند کا طالبِ علمی کے زمانے میں قیام رہا تھا اور غالبًا اُن کے رفیقِ درس وہم راز وہم فکر فقیہ ومحدثِ کبیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۹ء-۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کی بھی زمانۂ طالب علمی میں اپنے استاذ مولانا مملوک العلیؒ کے ساتھ اِسی کوچے میں یا قرب وجوار میں رہایش رہی تھی۔ اِسی کوچے میں مفتیِ اعظمؒ کے زمانے میں اُن کے عظیم المرتبت شاگرد سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ (۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء-۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۹ء) اور بیرسٹر آصف علی دہلوی (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء-۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء) کا مسکن بھی تھا۔ یہی کوچہ اپنے زمانے میں عظیم اردو شاعر وحکیم مومن خان مومن دہلویؒ (۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء-۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۲ء) کی جاے پیدایش ووفات بھی رہا تھا۔

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی ۱۰ر فروری ۱۹۱۰ء (۲۸ر محرم ۱۳۲۸ھ) کو اِس جہانِ آب وگل میں آئے۔ پیدایش تو اُن کی غالبًا حویلی اعظم خاں میں ہوئی ہوگی؛ لیکن بچپن، لڑکپن اور جوانی کا زمانہ اِسی کوچہ چیلان میں گزرا اور دہلی کی بالعموم اور اِس کوچۂ علم وحکمت کی بالخصوص علمی وادبی فضا میں پرورش پائی۔ اُس وقت تک دلّی علم وادب، شعر وسخن، اور ثقافت وتہذیب کی باقیات کی بڑی حد تک امین تھی، اُس کی

اصلیت، ثقافت وتہذیب اورزبان وادب کا بانک پَن بڑی حد تک گہنایا نہ تھا؛ اِس لیے مولانا کو بچپن سے ثقافت وتہذیب اورزبان وادب کی شفاف فضا میں سانس لینے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا، لہٰذا وہ نہ صرف دہلویؒ الولادۃ تھے؛ بل کہ خالص دہلویؒ الثقافۃ واللسان بھی تھے، اِسی لیے اردو زبان، اُس کی نوک پلک، لب ولہجہ، روزمرّہ، صحّتِ تلفّظ وصحّتِ اِملا، مفردات ومُرکّبات کے صحیح وبر محل استعمال کے حوالے سے، وہ جس درجہ حسّاس اور اُستاذانہ لیاقت کے حامل تھے، میں نے اپنی زندگی میں علما وغیر عُلما میں کسی کو دیکھا نہ برتا۔

اُنھوں نے از اوّل تا آخر تعلیم بھی دہلی ہی کے مدرسہ امینیہ میں حاصل کی، یہیں اردو وفارسی زبان وادب، علم عروض وقوافی، علم فقہ وحدیث، حکمت وفلسفہ، تاریخ اسلام، معقولات ومنقولات اور اِفتا کی تعلیم حاصل کی اور اپنے عظیم والد علامہ مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کی تربیت وسرپرستی میں اپنے دگر اساتذۂ گرامی سے بھی ہر علم وفن میں خوب خوب فیض پایا۔ وہ جہاں پختہ علم عالم وفقیہ ومفتی تھے، وہیں عربی وفارسی کے رمز آشنا اور اردو زبان کے قدآور ادیب وشاعر ونقّاد تھے۔ اردو کے حوالے سے وہ دہلی میں آخری مُستنَد استاذ تھے، جس پر ہر ایک کو اتفاق تھا۔ اُن کی وفات پر اہلِ کمال اُدبا وناقدین نے اُن پر جو مضامین وتاثرات لکھے تھے، اُن میں بہ یک زبان اُنھیں اردو وفارسی لسانیات کے حوالے سے خاکِ دہلی کا آخری فرزند شمار کیا گیا تھا اور ۱۸۵۷ء میں اُجڑنے والی دہلی کے ملبے سے پورے تمدن وثقافت کی نئی اور دل آویز عمارت تعمیر کرنے کی ہمت جتانے والے سرخیلوں میں اُنھیں گردانا گیا تھا۔ عجب بات یہ ہے کہ وہ رہائش کے اعتبار سے بھی سوفی صد یا اس سے زیادہ دہلوی تھے۔ وہ یہاں سے شاید وباید کہیں چند روز کے لیے گئے ہوں گے، اُنھوں نے زندگی کے سارے شیریں وتلخ لمحے یہیں گزارے۔ اُنھوں نے پنجاب یونیورسٹی کا مولوی، عالم وغیرہ کا امتحان بھی یہیں سے دیا۔ اُنھوں نے ۱۹۳۳ء سے سبزی منڈی کے اسکول میں عربی کے ٹیچر کی

حیثیت سے عملی زندگی کی ابتدا کر کے یہیں روزی روٹی کا بندوبست کیا۔ گویا وہ خاکِ دہلی کے فرزندوں میں گِنے چُنے سپوتوں میں تھے؛ اِسی لیے دہلی کے مٹنے، اُس کی تہذیب اور اُس کے تمدن کے مسمار اور زبان و روز مرّہ کے تہس نہس ہو جانے کا اُنھیں بہت غم تھا۔ اُنھوں نے اپنے اِس غم کا اِن الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''گھر میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہتا ہوں، باہر کیا نکلوں اور کہاں جاؤں؟ اگر کبھی باہر نکلتا ہوں تو نگاہیں دلی کو ڈھونڈتی ہیں؛ مگر دلّی کہیں دکھائی نہیں دیتی''(۱)

مولانا کی شخصیت کے تعمیری عوامل

مولانا واصفؒ دہلی کی جامع الکمالات ہستیوں کی آخری یادگار تھے، اُن کی ہمہ گیر عظمت کی تعمیر میں عظیم القدر والد مفتیِ اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ، اُن کے ہنر مند اساتذۂ گرامی اور اُن کے ذاتی جوہر کے علاوہ جو ذرا سی جلا بخشی سے ذرّے سے آفتاب بن جانے کے لیے قدرت کی طرف سے اُنھیں ودیعت ہوا تھا، اُس دور کی فطرت کو بھی بڑا دخل تھا، جو غیر معمولی تیز رفتار، سماجی و تہذیبی تبدیلیوں، ہنگامہ خیز تحریکوں، استعماری مظالم سے پیہم ٹکر لینے والی اولوالعزمانہ سرگرمیوں اور حصولِ آزادی کی چوکھٹ تک سرفروشی کی تمناؤں میں شب و روز بسر کرنے والی ہندی قوم کے عزم و ہمّت پر سان چڑھاتی، اُس کے ضمیر کو گہری سطحوں تک جھنجھوڑتی اور اُس کی مردم خیزی کی صلاحیت کو ساحرانہ قوّت سے ہم کنار کر رہی تھی۔ برسرِ پَے کار مخالف طاقت سے سخت اور مسلسل تصادم کی فطرت زبردست خلّاقی قوّت کی حامل ہوتی ہے؛ اِسی لیے ہمارے اِسلامی اور

(۱) مضمون ''شہر میں اِک چراغ تھا نہ رہا'' از ڈاکٹر محمد قاسم دہلوی فرزند مولانا واصفؒ مرحوم شائع شدہ در ''کتاب نما'' دہلی، اپریل ۱۹۸۹ء۔

عربی ملکوں میں دورِ غلامی نے جتنے بڑے اور عبقری انسانوں کو جنم دیا اور ہر شعبۂ حیات کا دامن جیسے جیسے بے مثال باکمالوں سے مالا مال رہا، اُن میں سے کسی ایک کے قد کا کوئی انسان آج ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اُن میں سے کسی ایک کی معمولی سی شبیہ دیکھنے کو آنکھیں بے تاب اور دل مچلتے ہیں؛ لیکن یہ عنقا ہمیں آج نظر نہیں آتا۔

مولانا واصفؔ نے علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (۱۲۹۲/ ۱۸۷۵ء-۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء) بانیِ مدرسہ امینیہ دہلی: مولانا امین الدین اورنگ آبادی اِیلوی (۱۲۸۷ھ/ ۱۸۷۰ء-۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا شاہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ (۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء-۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء) مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء-۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) سحبانُ الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ، مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خواجہ حسن نظامیؒ (۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء-۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء) اور اُن کے ہم عصر بہت سے جلیل القدر علما و ادبا و مفکرین و قائدین کو بار بار دیکھا سنا اور اُنھیں مفتی صاحب (مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ) سے ملک و ملت کے لیے بہت سی مجلسوں میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے پایا۔ جنگِ آزادی کی سرگرمیوں میں عملی حصّہ لیا، اُس کی تحریکات کی ہنگامہ خیزیوں میں وقت گزارا اور اُس کے ہراول دستے کے متعدّد سپہ سالاروں سے اُنھیں ملنے اور اُن کے افکار و خیالات سے قریب سے واقف ہونے کا موقع ملا۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ (۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء-۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۶ء) مولانا محمد علی جوہرؒ (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء-۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء) مہاتما گاندھی (۱۸۶۹-۱۹۴۸ء) پنڈت موتی لال نہرو (۱۸۶۱-۱۹۳۱ء) اور جواہر لال نہرو (۱۸۸۹-۱۹۶۴ء) جیسے اَساطینِ جنگِ آزادی کو سننے سمجھنے اور دیکھنے کی اُنھیں فرصت ملتی رہی۔

انسانی فکر و خیال کی تعمیر اور کسی بڑی شخصیت کی تشکیل میں ''چراغ سے چراغ

جلنے'' کا عمل زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ مولانا واصف کی تعمیر میں بھی یہ عامل (Factor) پوری طرح مُؤثّر رہا تھا۔ وہ اِن بڑوں کے اُٹھ جانے کے بعد اِن کی صورتیں اپنے خانۂ خیال میں مُستحضَر کرتے اور اِن کی یادوں سے اُجالے حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور گزری ہوئی صحبتوں پر اِن اَلفاظِ میں حسرت وافسوس کا اِظہار کرتے تھے:

اب کہاں واصف ملیں گی وہ گزشتہ صحبتیں
اب وہ باتیں سر بہ سر خوابِ پریشاں ہوگئیں

اردو زبان کا نمایندہ ادیب وشاعر ونقّاد

نسلِ نو کے شُعرا واُدبا واہل قلم کی زبان ومحاورات کے تعلق سے فروگزاشتوں پر بہت آزردہ ہوتے تھے؛ کیوں کہ اردو زبان، اُس کے محاورات، اُس کی لفظیات وساختیات، الفاظ وتعبیرات کی اصل، اُن کے اِستعمالی سفر، قواعدِ صَرف ونحو وغیرہ پر اُن کی ایسی غائرانہ نظر تھی کہ اُن کے ہم عصروں میں کم لوگوں کی رہی ہوگی۔ اُنھیں زبان لکھنے، بولنے اور استعمال کرنے والوں کو صحیح ڈگر پر لانے اور باقی رکھنے کی بڑی فکر رہا کرتی تھی، اِسی داعیے کے پیشِ نظر اُنھوں نے نہ صرف اپنی کتاب ''ادبی بھول بھلیّاں'' لکھی؛ بل کہ ''آج کل'' ''برہان'' ''نگار'' ''ہماری زبان'' اور ''کتاب نما'' جیسے علمی وادبی رسالوں میں بہت سے لاجواب ادبی ولسانی، تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے۔ نیز ''اردو مصدر نامہ'' تالیف فرمائی، جس میں اردو زبان کے تیرہ سو مصادر اور اُنیس سو مشتق الفاظ کا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے اور اساتذۂ سخن کے چیدہ اشعار سے استعمال وتعبیرات کی صحت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

مولاناؒ کی نثر ونظم حشو وزوائد سے پاک اور صحتِ ادا، نفاستِ زبان، برجستگی، روانی، شیرینی اور جاذبیت کا نمونہ ہوتی تھی۔ وہ تاریخ نگاری کرتے، ادبی مضامین تحریر کرتے، یا علمی وتنقیدی تحریریں لکھتے، ہر جگہ اُن کے ہاں یہ خوبیاں اُن کا امتیاز

ہوتیں۔ اُن کی تحریروں سے جہاں اُن کی دقیقہ رسی وژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اُن کی ذہانت، صحیح نتائج تک پہنچنے کی اُن کی اُستاذانہ لیاقت اور تلبیسی پردوں کو چاک کردینے میں اُن کی غیر معمولی مہارت سطر سطر سے چھلکتی ہے۔ اُنھوں نے اپنی تاریخی و تحقیقی تحریروں میں بہت سی غلطیوں کی تصحیح کی جنھیں حقائق کے طور پر تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اُنھیں اپنے عظیم والد سے تحقیق و تدقیق، سچائی پسندی، سچائی کی تلاش اور سچائی تک بہ ہر حال پہنچنے کی جُستجو اور حوصلہ وراثت میں ملا تھا، اُس کی وجہ سے وہ کسی "حقیقت" کو پرکھے بغیر قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ تحقیق و جستجو کا طویل، پُرپیچ اور انتہائی دشوار سفر، اُن کے لیے بالکل آسان تھا۔ علم و تحقیق کے باب میں عرق ریزی اُن کا لذّت انگیز مشغلہ تھی۔ اِس راہ میں وہ جتنا پریشان ہوتے، اُتنا ہی اُنھیں مزا آتا۔ علم و تحقیق کے اصلی مسافر کی یہی پہچان ہے کہ وہ راہ کی طوالت و دشوار گزاری کے باوجود ہمیشہ نا آشنائے تکان رہتا ہے۔

اُنھوں نے پندرہ-سولہ سال کی عمر سے ہی شعر گوئی شروع کردی تھی۔ اِس کی ابتدا اُنھوں نے فارسی زبان سے کی، اُن کے مجموعۂ کلام "زرِگل" میں جو فارسی حمد شامل ہے، اُس پر تحریر کردہ نوٹ میں کہا گیا ہے: "یہ نظم میری پہلی شاعری ہے۔" اردو میں اُن کا پہلا کلام مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد میں کہا گیا تھا اور سہ روزہ "الجمعیۃ" دہلی میں شائع ہوا تھا، جس کے دو شعر اِس طرح تھے:

مسیحُ الملک جو سِدرہ نشینِ عزم وہمّت تھا
سحابِ فیض، کوہِ استقامت، بحرِ حکمت تھا
پیاپے آرہی ہے یہ صدا شہرِ خموشاں سے
جو قابل ناز کے تھی، لُٹ گئی رونق گلستاں سے

شعر گوئی کی ابتدا کے ایک دو سال بعد ہی شعبان ۱۳۴۶ھ/ جنوری ۱۹۲۸ء میں حضرت سائل دہلویؒ (مرزا سراج الدین احمد خاں ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء-۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء)

تلمیذِ داغؔ دہلوی (نواب مرزا خاں ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء-۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) سے سلسلۂ تلمذ قائم ہوا، جو سائلؔ صاحب کی وفات تک قائم رہا۔ حضرت نواب سائل دہلویؒ سن رسیدگی کے بعد چلنے پھرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے تب بھی بلا ناغہ شام کو رکشے پر بیٹھ کر اردو بازار میں، مولانا واصفؒ کے مرحوم کتب خانہ رحیمیہ میں تشریف لاتے اور استاذ وشاگردِ شعروشاعری کی باریکیوں پر تبادلۂ خیال کرتے۔ سائلؔ دہلوی اپنے شاگرد واصف دہلوی کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے، کم سنی میں جب دلی کے کسی مشاعرے میں عزیز شاگرد نے اپنے اشعار پڑھتے وقت ہچکچاہٹ محسوس کی، تو سائلؔ صاحب نے اُن کے اشعار خود ہی مشاعرے میں پڑھے اور شاگردکی بے پناہ حوصلہ افزائی کا سامان بہم پہنچایا۔ سائلؔ صاحب کی وفات کے بعد، مولانا واصف نے داغؔ دہلوی کے ایک دوسرے شاگرد نوح ناروی (محمد نوح ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء-۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) سے مشورۂ سخن جاری رکھا۔ مولانا واصف نے اپنی جوانی میں دہلی کے مُشاعَروں میں نہ صرف شرکت کی؛ بل کہ اپنی معنی ریز اور اِشارت خیز غزلوں اور نظموں کے ذریعے اُنھیں خوب خوب لوٹا۔ بعد میں علم وتحقیق کی خاموش وادیوں کی مُسافَرت نے اُنھیں نہ صرف تنہائی پسند بنادیا؛ بل کہ اُن کے رب نے اپنی توفیقِ خاص سے، اُنھیں لبِ خاموش اور دلِ گویا سے نواز دیا۔

اشعار کے نمونے

مولانا واصفؔ کے اشعار میں سوز وگداز، حقیقت شناسی، استغنا و بے نیازی، خودداری وخود شناسی، حکمت ودانائی، حوصلہ مندی ووفاداری، جوشِ جنوں وآبلہ پائی، امید ویقین، رجائیّت افزا حسرت، بے وفائی کا شکوہ لیکن وفا کی بے انتہا امید، خردمندی کی عیّاری اور جنونِ بے خطر کی سادہ لوحی کا ایک دریا پوری طرح موج زن نظر آتا ہے، جو اپنی سبق آموز لہروں کے ذریعے قاری کے لیے زندگی کے بیاباں کی شبِ تاریک میں

قندیلِ رَہبانی ثابت ہوتا ہے:

کیا بہار اور کیا خزاں ، واصفؔ نظر کا کھیل ہے
لی جہاں انگڑائی دل نے ، موسمِ گل آگیا

آزمایشِ گہِ غم میں ، دلِ نازک کو نہ لا
کہ زرِ گل نہیں ہوتا کبھی معیار طلب

نہ بولو مجھ سے؛ لیکن کیا مجھے دل سے بھلا دو گے
کسی کی یاد مٹ جائے، کہیں ایسا بھی ہوتا ہے

اے میری حسرتو ! ابھی سو جاؤ رات ہے
یہ آہ کی چمک ہے ، نمودِ سحر نہیں

مِرے سر پھوڑنے کو موجِ بوے گل ہی کافی ہے
نہیں جوشِ جنوں ، وابستۂ دیوار و در اپنا

باوفا ثابت ہوا ، اُس بے مروّت کا خیال
بے تکلف آگیا ، خلوت میں دل بہلا گیا

ستارے، یہ ستارے کیا کریں گے رہبری میری
مِرا ہر اِک قدم، خود اپنی منزل یاد رکھتا ہے

تلاشِ بحر میں قطرے نے کتنی ٹھوکریں کھائیں
سمجھ لیتا جو خود کو، بن ہی جاتا بے کراں اب تک

کسی کا نام آتے ہی، مہک اُٹھتے ہیں صحرا بھی
بہاریں مسکراتی ہیں، نظارے جگمگاتے ہیں

میں بے نیاز تھا اِس واسطے رہا معتوب
وہاں اُنھیں ضرورت تھی نیازمندوں کی

منافی تھا یہ اے منصور! دستورِ امانت کے
کسی کی بات کو یوں اپنے بیگانے میں رکھ دینا

حمدِ باری تعالیٰ کے، اُن کے یہ اشعار بھی بے حد پسندیدہ اور مقبول ہیں:

تری شان کے ہو لائق، وہ ثنا کہاں سے لاؤں
تجھے آئے پیار جس پر، وہ ندا کہاں سے لاؤں
نہ ہو لب پہ کوئی شکوہ، وہ رضا کہاں سے لاؤں
کوئی سن سکے نہ جس کو، وہ صدا کہاں سے لاؤں
مَلَکوت کے عنادل، جسے سُن کے جھوم اٹھیں
وہ ترانہ کس سے سیکھوں، وہ نَوا کہاں سے لاؤں
ترے آستاں سے اُٹھوں، تو مَیں جاؤں کس کے در پر
جو ہو بے مثال تجھ سا، وہ خدا کہاں سے لاؤں

دلِ زار کی کہانی، میں سناؤں کس کو یارب !
وہ سماں شکستگی کا ، وہ صدا کہاں سے لاؤں
یہ وسیع صحنِ گلشن، ہے قفس سے بڑھ کے واصفؔ
یہ سوادِ کوئے جاناں ، وہ فضا کہاں سے لاؤں

اہتمامِ مدرسہ امینیہ

جیسا کہ پچھلے صفحات میں ایک جگہ عرض کیا گیا کہ مولانا واصفؔ نے عملی زندگی کا آغاز محکمۂ تعلیم دہلی میں عربی زبان کے مدرس کی ملازمت سے کیا؛ لیکن والد بزرگ وار حضرت مفتیِ اعظمؒ کے حکم سے یہ ملازمت چھوڑ کتب خانہ رحیمیہ دہلی کے انتظام کی ذمّے داری سنبھالی۔ پنج شنبہ- جمعہ: ۱۳-۱۴/ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱/دسمبر ۱۹۵۲ء یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب میں ۱۰ ½ بجے جب حضرت مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ مہتمم مدرسہ امینیہ کا انتقال ہوگیا، تو آپ کے انتقال کے ۱۲ دن بعد مدرسے کی مجلسِ انتظامی کا جلسہ ہوا تو کچھ دنوں کے لیے اہتمام کا عہدہ سحبانُ الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ کے سپرد ہوا؛ لیکن کچھ ہی دنوں بعد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۹ء- ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء)، حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۱ء-۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) وغیرہ اکابر وارکانِ مجلسِ منتظمہ کی مُتّفقہ رائے سے یہ منصب، مفتیِ اعظم کے فرزندِ ارجمند مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؔ کے سپرد کیا گیا، جسے اُنھوں نے، اپنے علمی مشاغل اور تنہائی پسند طبیعت کے باوجود، بہ حسن وخوبی نباہا اور مدرسے کی ترقی اور تعلیمی استحکام کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اُن کے بس میں تھا۔ ۱۹۷۹ء (۱۳۹۹ھ) میں آپ نے اپنی ناتوانی کی وجہ سے اِس عہدے کی گراں بار ذمّے داریوں سے اپنے کو علاحدہ کرلیا۔ زندگی کے اپنے اِس گراں مایہ چند سالوں کو، یادِ الٰہی اور تکمیل طلب علمی کاموں کی تکمیل میں یک سو ہو کر صرف کیا۔

حسّاس دل اِنسان اور بہار کے بعد خزاں سے سابقہ

مولانا واصف نہ صرف بڑے کی اولاد تھے؛ بل کہ بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا تھا، اُن کی صحبتوں سے فیض پایا تھا، اُن کی عظمتوں کے مظاہر دیکھے تھے، اُن کی قربانیوں کی یادیں اُن کے خانۂ خیال کا بہترین اثاثہ تھیں۔ اب چند لوگوں کے استثنا کے ساتھ نسبتاً بہت چھوٹوں سے اُنھیں سابقہ پڑا تھا، جو اخلاق، کردار، مروّت، انسانیت، وفاداری اور علم وہنر وفکر وآگہی: ہر اعتبار سے اُن بڑوں کے پاسنگ برابر بھی نہ تھے۔ دوسری طرف اکابر کی جدوجہدِ آزادی کی برس ہا برس کی سرفروشانہ کوششوں کے (ملک کی تقسیم، فسادات، انتشار، کشت وخون اور خونِ مسلم کی بہ طورِ خاص ارزانی، ہر شعبۂ حیات میں عدمِ انصاف کی فراوانی کی شکل میں) رائگاں جانے کے مشاہدے سے اُن کے حسّاس دل کا آبگینہ بُری طرح چور چور ہو گیا تھا۔ وہ بڑی حسرت سے کہتے ہیں:

اے ہم نشیں وطن کے مِرے! داستاں نہ پوچھ
لوٹا ہے کس نے آہ! مِرا آشیاں نہ پوچھ

اُن کے چہرے بُشرے کو دیکھ کر جس پر برسوں کے اُتار چڑھاؤ کی لکیریں اُبھری ہوئی تھیں، کوئی بھی حسّاس انسان، اُن کے باطنی کرب اور ذہنی کوفت کو معلوم کر سکتا اور دل کی گہرائیوں میں پیچ وتاب کھانے والی غم واندوہ کی لہروں کی آوازیں بہ خوبی سن سکتا تھا۔ اُن کے دل کا کیف آور درد اُن کی گفتگو میں صاف طور پر جھلکتا تھا۔ وہ سن وسال کے گہرے تجربوں کے بوجھ سے دبے کچلے محسوس ہوتے تھے۔ اُن کی طرح کے اُن کے دگر ہم عصروں کا بھی کچھ یہی حال رہا ہوگا؛ لیکن زیاں کا اِحساس بہ قدرِ حسّاسیت ہی ہوا کرتا ہے۔ ناحسّاس یا کم اِحساس کا انسان بڑے سے بڑے واقعے کو کوئی حیثیت نہیں دیتا؛ لیکن نازک اِحساس کا اِنسان، اُس کے نتائج و مُضمَرات کو سوچ سوچ کر قریب المرگ یا جاں

بہ حق تسلیم ہوجاتا ہے۔ اِنسانیت کے کسی زخم کا کوئی مداوا اگر، تقدیرِ الٰہی کے طفیل، تدبیرِ اِنسانی سے ممکن ہوتا ہے، تو اِسی دوسری نوع کے انسانوں کے ذریعے ہی روبہ عمل آتا ہے۔ پہلی قسم کے اِنسان نما لوگ اپنے لیے کچھ زیادہ مفید ہوتے ہیں نہ دوسروں کے لیے۔

مولانا سے باقاعدہ تعارف کی تقریب

مدرسہ امینیہ کے وہ مہتمم تھے اور حضرت مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی رحمۃُ اللہ علیہ (۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء - ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) وہاں کے صدر مفتی اور شیخ الحدیث، جن سے بہ راہ راست کسبِ فیض کی تمنّا مجھے شاہ جہاں آباد: دہلی لے آئی تھی اور مدرسہ امینیہ کا طالبِ علم بننے پر مجبور کردیا تھا۔ حضرت مولانا سے تو اَسباق میں روزانہ ہی باقاعدہ ملاقات ہوجاتی تھی؛ لیکن مولانا واصف صاحب مرحوم سے صرف دور سے علیک سلیک کے سوا کئی ماہ تک باقاعدہ ملاقات کی کوئی تقریب پیدا ہوئی تھی نہ میں نے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی؛ کیوں کہ مجھے اِس کی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی؛ اِس لیے کہ میرے اوپر مولانا موصوف کے علمی پَرَت نہیں کھلے تھے اور نہ کسی ضرورت نے ابھی تک اُن سے ملنے پر مجبور کیا تھا۔ اُس وقت اِقامت گاہ میں مدرسے نے خورد ونوش کا انتظام نہیں کیا ہوا تھا، طلبہ کو نقد وظیفے دے دیے جاتے تھے، وہ حسبِ منشا و فرصت کھانا اپنے کمروں ہی میں از خود تیّار کر لیتے تھے یا عموماً جامع مسجد کے پاس مٹیا محل کے ہوٹلوں میں جاکر کھایا کرتے تھے۔ وظائف کی تقسیم کا کام بالعموم مدرسے کے دو مُنشیوں میں سے کوئی ایک کیا کرتا تھا، جب دونوں کسی وجہ سے غائب ہوجاتے تو یہ فریضہ خود مہتمم مولانا حفیظ الرحمٰن صاحب واصفؔ انجام دیتے تھے۔ مدرسے میں ۳-۴ ماہ گزارنے کے بعد ایک مرتبہ یہ سعادت مجھے حاصل ہوئی کہ دونوں منشی رخصت پر تھے، مولانا موصوف ہی وظیفہ تقسیم کررہے تھے اور اُن سے ملاقات کا موقع مُیَسَّر آیا۔ میں نے بالقصد اپنی باری سارے طلبہ کے بعد رکھی؛ تاکہ اطمینان کے چند

لمحے ملیں اور اُن سے نہ صرف سلام وکلام؛ بل کہ تعارف کا بھی موقع حاصل ہو۔ اُن کا اہتمامی حجرہ دفتر کی عمارت کے بیچ میں واقع تھا، چھوٹا سا حجرہ جیسے کسی خانقاہ کا خلوت خانہ، جس میں دو دروازے جانبِ غرب وجنوب میں کھلتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوا تو ہر طرف سے عیاں ہو رہی ترتیب، سلیقہ، سگھڑاپا اور حسنِ انتظام کے منظر نے دل کو موہ لیا۔ خوب صورت سی چھوٹی سی تپائی، پیتل کا سنہرے رنگ کا اُگال دان، ردّی کی نستعلیق ٹوکری، چھوٹے سے ڈنڈے میں بندھی ہوئی خوش رنگ جھاڑن اور اُن کے سامنے کا نفیس ڈسک: ہر چیز سے اُس کے رکھنے اور برتنے والے کی شائستگی اور ذوق عیاں ہوتا تھا۔ میں جیسے ہی کمرہ میں داخل ہوا اور سلام کے بعد مصافحہ کرتے ہوئے اپنا نام بتایا، اُنھوں نے فوراً فرمایا: بھئی حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب تمھارا تذکرہ مجھ سے وقتاً فوقتاً کرتے ہیں اور تمھاری صلاحیت اور سلامت روی کو سراہتے ہیں؛ لیکن تم تو کبھی دفتر میں آتے ہو نہ مجھ سے ملتے ہو۔ میں نے اپنے شرمیلے پن اور بڑوں سے ملنے میں حجاب کے اِحساس کی بات کہی تو فرمایا: یہ شرمیلا پن بعض دفعہ تو صحیح ہوتا ہے؛ لیکن ہمت کر کے بڑوں سے کبھی کبھار ملتے رہنا چاہیے، اِس سے بھی بہت فائدہ ہوتا ہے۔ میں نے حجرے میں داخل ہوتے ہی دیکھا کہ وہ روپے کے مڑے ہوئے نوٹوں کی سلوٹوں کو پانی کے ذریعے اپنی انگلیوں سے ٹھیک کر رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے گول گول پتھروں سے دبا دبا کے رکھ رہے ہیں: سو کے نوٹ، پچاس کے نوٹ، بیس کے، دس کے، پانچ کے، ایک کے، علاحدہ علاحدہ رکھتے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا: میں نے اپنی زندگی میں یہ پہلا آدمی دیکھا ہے، جسے نوٹوں کی نوک پلک درست کرنے اور اُن کی سکڑنوں کو دور کر کے، اُن کی بگڑی ہوئی شکل وصورت کو اپنی اصلی حالت پر لانے کا اتنا اہتمام ہے۔ حجرے کی ترتیب، سامانوں کی سلیقے سے سجاوٹ اور نوٹوں پر اُن کی اِتنی ساری عنایات دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ یہ حضرت حد درجہ سلیقہ مند ہیں اور کسی بھی چیز کی بدسلیقگی و بے قرینگی سے اِنھیں بہت ہی نُفُور ہے۔ کچھ دیر

ملاطفت کی باتیں کرنے کے بعد اُنھوں نے پہلے سے درست کیے نوٹوں کی گڈّیوں میں سے، مجھے میرے وظیفہ کی رقم عنایت کی۔ میں اُٹھنے لگا تو فرمایا: حضرت مولانا سید محمد میاں تم سے اِتنے خوش ہیں، اِس سے مجھے بہت خوشی ہے، اِسی طرح محنت کرتے رہو اور وقتاً فوقتاً مل لیا کرو۔

استحکامِ تعلقات کے عوامل

اِس تقریب کے بعد، اُن سے ملاقات میں کوئی حجاب نہ رہا، اُن کی قرینہ پسندی کو دیکھ کر اُن سے بار بار ملنے کو جی چاہنے لگا۔ ظہر کی نماز وہ مدرسے کی مسجد ہی میں ادا کرتے تھے، اُس کے بعد وہ دفتر جاتے اور شیروانی زیبِ تن کرتے پھر جامع مسجد اردو بازار میں واقع اپنے مکان تشریف لے جاتے۔ میں اِس ملاقات کے بعد ظہر کی نماز میں اکثر اُن کے بغل میں کھڑا ہوتا اور اگر جماعت شروع ہو جاتی اور میں کسی وجہ سے اِدھر اُدھر صف میں کھڑا ہو جاتا، تو نماز کے بعد اُنھیں سلام کرنے اور اُن سے ملنے کی کوشش کرتا۔ ایک روز اُن سے اُن کے دفتر میں جا کے ملا تو فرمانے لگے: مولوی صاحب! دہلی میں واقع کویت کے سفارت خانے سے بہت ساری عربی کی کتابیں خوب صورت سی آئی ہیں، اکثر نئی لکھی ہوئی کتابیں ہیں، چند ایک قدیم مصنّفین کی نئی چھپی ہوئی کتابیں بھی ہیں، میں نے حضرت مولانا سید محمد میاں کی نشست گاہ والے کمرے کی شیشے کی الماریوں میں اُنھیں چنوا دیا ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ نے صرف تمھارے لیے بھجوادی ہیں، جدید عربی میں لکھی ہوئی کتابیں عموماً ہمارے علما پڑھتے ہیں نہ اُن کے مُکمّل طور پر سمجھ میں آنے کی ہیں، تمھارے لیے اِجازت ہے کہ دفتر کے اوقات میں جب چاہو وہاں آ کر مطالعہ کر سکتے ہو، بالخصوص خالی گھنٹوں میں۔

میں کسی طرح وقت نکال کے روزانہ ہی ایک آدھ گھنٹہ دفتر کے حضرت مولانا سید

محمد میاںؒ والے کمرے میں جاتا اور سکون کے ساتھ وہاں بیٹھ کے اُن کتابوں کا مطالعہ کرتا اور نہ صرف اُن کے مضامین و مشمولات سے فائدہ اُٹھاتا؛ بل کہ اُن کی عربی زبان پر بہت زیادہ غور کرتا۔ الفاظ کے استعمال، صلہ جات، ترکیبوں، ساختیات کے ساتھ ساتھ، رموزِ املا: کاما، سیمی کولن، بیانیہ، علامتِ ندا و مفاجات وغیرہ کے موقع و محل پر بہ طور خاص غور کرتا۔ رمضان کی چھٹی میں جو شعبان کے اوائل سے ہی شروع ہو گئی تھی، بالخصوص بہت استفادے کا موقع ملا۔ مولانا واصفؒ رمضان میں بھی پابندی سے دفتر آتے اور متعلقہ امور انجام دیتے تھے۔ مطالعہ کا یہ موقع اُن سے بار بار یعنی روزانہ ہی ملنے کا موقع ثابت ہوا اور میری اُن سے قربت کا ذریعہ بنا۔ اُن کتابوں میں کئی کتابیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ (۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء - ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء) کی تھیں: اَلْأَرْكَانُ الْأَرْبَعَةُ، مَاذَا خَسِرَ الْعَالَمُ بِانْحِطَاطِ الْمُسْلِمِيْنَ، الصِّرَاعُ بَيْنَ الْفِكْرَةِ الْإِسْلَامِيَّةِ وَالْفِكْرَةِ الْغَرْبِيَّةِ میں اِن تینوں کتابوں کو از اوّل تا آخر نہ صرف پڑھ گیا؛ بل کہ اُن میں سے بعض کتابوں کے بعض پیراگراف خواندگیِ بسیار کی وجہ سے زبانی یاد ہو گئے۔

ایک روز مطالعے سے فارغ ہو کر، اُن کے حجرے کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اُنھوں نے آواز دی: مولوی نور عالم! میں فوراً حجرے میں داخل ہوا، سلام کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، تو اُنھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا: ”لو یہ ایک اہم کتاب ہے (مفتیِ اعظم کی یاد) اِس کا مطالعہ کرنا، حضرت والد صاحبؒ پر میں نے اِس میں بہت سا مواد جمع کر دیا ہے۔“ میں نے رمضان ہی میں وہ کتاب بھی از اوّل تا آخر پڑھ ڈالی اور اُس کی روشنی میں حضرت مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ پر ایک مُفَصَّل مضمون دو تین ماہ بعد لکھا جسے رسالہ ”دارالعلوم دیوبند“ کے سابق ایڈیٹر مولانا سیّد از ہر شاہ قیصرؒ (۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء - ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۵ء) نے کئی قسطوں میں اپنے رسالے میں شائع کیا۔ اُس کے بعد اُن کا بار بار پوسٹ کارڈ ملتا رہا کہ آپ اِسی طرح کے اور مضامین رسالہ ”دارالعلوم“ کے

لیے لکھیں؛ لیکن بہ وجوہ میں اُن کی فرمایش پوری نہ کرسکا۔

شوال ۱۳۹۱ھ/نومبر ۱۹۷۱ء میں ایک مرتبہ اُن کے گھر، اردو بازار، جامع مسجد دہلی جانا ہوا۔ دیوان خانہ جو اُن کا کتب خانہ بھی تھا، میں فرش پر سفید سوتی کپڑے کی چاندنی بچھی ہوئی تھی، جس پر کسی جگہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی شکن نہیں ملی۔ کتابیں لکڑی کی کھلی الماریوں میں سجی تھیں اور دیوار پر چاروں طرف طغرے سجے تھے، میرے استفسار پر مولاناؒ نے فرمایا کہ اِن میں سے کچھ والدصاحبؒ کے ہاتھ کے اور کچھ میرے ہاتھ کے لکھے ہوے ہیں۔ پھر اُنھوں نے اپنی زیرِ ترتیب کتاب "کفایت المفتی" (مجموعۂ فتاویٰ حضرت مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ) کے ٹائٹل پر دی جانے والی نام و پتے والی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی کئی خطوں والی عبارت دکھائی اور فرمایا: پسند کرو، کون سا اچھا رہے گا؟ میں نے عرض کیا: حضرت! میں تو مبتدی ہوں آپ کا ذوقِ عالی جو کہے وہی مُنتَخَب فرمالیں۔ فرمایا: نہیں تم اپنی پسند بتاؤ، اُس کے بعد میں اپنی پسند سے اُس کا موازنہ کروں گا۔ میں نے عرض کیا: یہ خطِ نسخ والی عبارت زیادہ اچھی لگتی ہے۔ مولاناؒ نے بھی اُسی کو پسند فرما رکھا تھا، چناں چہ اُسی کو ترجیح دی گئی۔

اہلِ قلم اور خطّاط

عموماً خطّاط موٹے اور جلی حروف میں تو اچھا لکھ لیتے ہیں، لیکن باریک کتابت کے حوالے سے بہت بدخط ہوتے ہیں؛ لیکن مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؒ فاؤنٹین پن سے بھی بہت خوب صورت اور خوش حروف خطِ نستعلیق وخطِ نسخ لکھتے تھے۔ اُنھوں نے اُسی ملاقات میں "کفایت المفتی" کے مُسَوّدوں کے بعض صفحات دکھائے، اِس موٹی سی کئی جلدوں والی کتاب کے سارے مُسَوّدے، اُن کے قلم سے یک ساں خوش خط نستعلیق میں لکھے ہوے تھے، اُن کی تحریر بڑی واضح اور نوک پلک کی صحت اور نقطوں کے واضح ہونے اور صحیح جگہ میں پڑنے کے حوالے سے اِتنی ممتاز تھی کہ میں دیر تک دیکھتا

اور سر دُھنتا رہا۔ اِس سے پہلے میں نے کسی بڑے اہلِ قلم کی، ایسی تحریر نہیں دیکھی تھی، جو طویل ہونے کے باوجود اِتنی حسین اور خوش خطی کے "معیار و اقدار" کی اِس درجہ حامل ہو۔ سچ یہ ہے کہ میں نے پہلا اِنسان دیکھا تھا جو بہ یک وقت عالم وفقیہ اور کاتب (رائٹر) وشاعر و ادیب اور خوش نویس تھا۔ خط فاؤنٹین پن سے، حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) کا بھی بہت پاکیزہ ہوتا تھا؛ لیکن وہ خطّاط اور اہلِ قلم ومؤلِّف تو تھے؛ مگر فاؤنٹین پن کی اُن کی تحریریں کشیدہ اور قواعدِ کتابت وخوش خطی سے قدرے ناموافق ہوتی تھیں۔

۱۱/ جولائی ۱۹۷۲ء (۲۸/ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ) کو، راقم الحروف دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں مُدرِّس مُنتخَب ہوا، تو مولاناؒ نے وہاں کے طویل قیام کے دوران مجھے کئی خطوط لکھے، جن کے مضامین تو پر کشش تھے ہی؛ لیکن اُن کے حسنِ خط کو میں بار بار دیکھتا اور سیر نہ ہوتا۔ کئی کئی روز اُن خطوں کو سامنے کسی جگہ رکھتا، بار بار پڑھتا اور مشمولات کے ساتھ ساتھ خوش خطی کے ساحرانہ جمال سے آنکھوں کو ٹھنڈی کرتا۔ ایک بار ایک پوسٹ کارڈ بھیجا، جس میں لکھا تھا کہ اب تمھارے خطوط نہیں آتے، شاید تم بھول گئے ہو، مولانا علی میاںؒ ایسے خوب صورت علم والے، خوب سیرت انسان کو پاکر ہم جیسوں کو بھول جانا قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ توَقُّع ہے کہ تم اُن سے تعلُّق کے ساتھ مجھے بھی یاد رکھتے ہوگے۔ اُنھوں نے اپنے خط میں حضرت مولانا علی میاںؒ کو سلام کہنے کا حکم دیا اور اِس شعر پر خط کو ختم کیا۔

چوں با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بہ یاد آر حریفانِ بادہ پیماں را

ناچیز نے حسبِ سابق خط کو کئی بار پڑھا، جب قدرے طبیعت سیر ہوگئی، تو حضرت مولانا علی میاںؒ کی دار العلوم ندوۃ العلما کے مہمان خانے میں آمد اور قیام کے موقع سے، میں نے وہ خط اُنھیں پڑھنے کو دیا، تو حضرت بہت خوش ہوے اور فرمایا کہ

مولانا واصف صاحب کا خط اِتنا خوب صورت ہوتا ہے؟ میں نے شاید ہی کسی اہلِ قلم کا اتنا پاکیزہ خط دیکھا ہوگا۔ اہلِ قلم، افکار وخیالات ومواد پر توجہ دہی کی وجہ سے، تحریر کے ظاہر کو سنوارنے کے لائق نہیں رہتے؛ اِس لیے عموماً نہ صرف یہ کہ خوش خط نہیں ہوتے؛ بل کہ بدخط ہوتے ہیں، اللہ نظرِ بد سے اُنھیں بچائے، آپ جب بھی اُنھیں خط لکھیے گا، میرا اسلام ضرور لکھیے گا اور میرا یہ تاثر بھی۔ صد افسوس کہ مولاناؒ کا یہ خط میرے کاغذات میں تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں مل سکا۔

مولانا واصف رحمۃ اللہ علیہ خوش نویسی میں مشہور خطّاط منشی عبدالغنی کے شاگرد تھے، جو اپنے والد منشی ممتاز علی کے واسطے سے بہادر شاہ ظفرؒ آخری شہنشاہِ ہند (ابوالمظفر محمد سراج الدین ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء - ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) کے تلمیذ تھے۔

بے پایاں شفقت وعنایت

رمضان ۱۳۹۲ھ کی کسی تاریخ کو جامعہ اِسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے ناچیز کی درخواست پر، جو اُس نے خود ہی عربی میں تیار کی اور خود ہی خطِّ نسخ میں اُس کی کتابت کی تھی، سفارش کے لیے حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دہلویؒ نے اپنے گرامی نامے کے ساتھ، اُس کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کی خدمت میں روانہ فرمانے کا اِرادہ کیا تو ایک روز، ناچیز نے اِس کا تذکرہ مولانا واصف صاحبؒ سے کیا۔ اُنھوں نے ازخود، میری گزارش کے بغیر فرمایا کہ مولانا علی میاںؒ تو مجھ سے بھی بہت بے تکلّف ہیں، وہ میرے بہنوئی مولانا سمیع اللہ قاسمیؒ کے کتب خانہ عزیزیہ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی میں (جو ہندوستان کی علمی وادبی، سماجی وسیاسی، فکری ودعوتی ممتاز شخصیتوں کا ہمہ گیر مرکز رہا ہے) اُس وقت بہت تشریف لاتے تھے، جب اُن کا حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ (۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء - ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۳ء) کی خدمت میں آنے جانے کا پیہم سلسلہ تھا اور دگر علمی ودینی تقاضوں سے بھی اُن کا دہلی آنا جانا لگا

رہتا تھا۔ اِن شاء اللہ میں بھی اُنھیں تمھارے لیے خط لکھوں گا؛ تاکہ وہ ضرور سفارش لکھ دیں۔ میں نے عرض کیا: حضرت! ابھی لکھ دیجیے؛ تاکہ اُسے حضرت الاستاذ کے خط کے ساتھ ہی روانہ کر دیا جائے۔ چناں چہ اُنھوں نے بھی منشی مدرسہ امینیہ کے ذریعے خط تیار کروا کے میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ چند روز بعد یہ خط میں اپنے قلم سے لکھتا، تو کچھ اور بات ہوتی، اِس وقت کئی چیزوں میں بے حد مشغول ہوں؛ لیکن تم یہ صحیح کہہ رہے ہو کہ ہم رشتہ دونوں خطوط جائیں گے تو زیادہ مُؤثّر ہوں گے۔ چناں چہ مولانا علی میاںؒ نے وہ سفارش لکھ دی اور جوابی رجسٹری لفافے میں موصول ہوگئی؛ لیکن جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ جانا مُقدَّر نہ تھا؛ اِس لیے نہ جا سکا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

مولانا کے میرے نام شفقت نامے

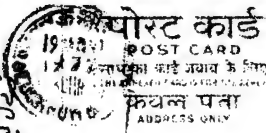
دار العلوم ندوۃ العلما میں میرے دس سالہ تدریسی دورانیے میں، مولانا واصفؒ نے موقع بہ موقع اپنے گرامی ناموں کے ذریعے، اپنی شفقت وعنایت سے نوازا۔ پہلے سال بالخصوص میرے خطوط کے جواب میں اُنھوں نے کئی شفقت نامے تحریر فرمائے۔ مدرسہ امینیہ میں دفتر کے قریب جانبِ شمال میں واقع ایک مُختصَر سے حجرے میں، میں نے اپنے سامان رکھ دیے تھے؛ کیوں کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی خدمت میں مہمان کی حیثیت سے صرف تین دنوں کے لیے گیا تھا؛ لیکن مولاناؒ نے اپنی بے پایاں عنایت کے طفیل مجھے اپنے پاس ہی روک لیا اور بالآخر مجھے دار العلوم ندوۃ العلما میں مدرس مُنتخَب کیا۔ میں بار بار مولانا واصفؒ کو لکھتا کہ حضرت! میں مدرسہ کا ایک کمرہ گو مُختصَر سا ہی سہی، طویل عرصے سے مشغول کیے ہوا ہوں، مجھے اِس سے بے حد شرمندگی ہے؛ لیکن میری مجبوری ہے کہ میں سال کے بیچ میں دہلی آ کر اپنا سامان لا بھی نہیں سکتا۔ مولاناؒ کا جواب آتا کہ مجھے اِس سے کوئی گرانی نہیں اور دیانتاً مدرسے کا کوئی نقصان بھی نہیں؛ کیوں کہ اُس قبر نما کمرے میں کوئی کبھی رہتا ہے نہ رہ سکتا ہے، آپ خاطر جمع رکھیے اور اپنی فرصت اور گنجایش کے مطابق ہی آئیے، آپ کا سامان جب تک آپ

لے نہیں جائیں گے۔ محفوظ رہے گا۔

اِس سلسلے کے اُن خطوں میں سے ایک خط یہ تھا:

17.5.

6296





عزیز گرامی قدر مولوی نور عالم امینی مظفرپوری

معرفت حضرت مولانا محمد حسنی زید مجدہٗ

DAR-UL-ULOOM NUDWA-TUL-
-ULAMA. LUCKNOW
U.P.

۱۲/مارچ ۱۹۷۲ء (۲۳/محرم ۱۳۹۲ھ) کو میں نے مولانا کو "کفایت المفتی" کے حوالے سے یاد دلایا کہ اگر وہ چھپ گئی ہو، تو آپ حضرت مولانا علی میاں صاحب کو ضرور بھیج دیں، وہ بہت خوش ہوں گے۔ اُس کے جواب میں اُن کا یہ عنایت نامہ موصول ہوا:

30 7/72

مدرسہ امینیہ اسلامیہ
دہلی

عزیز مکرم زیدت معالیکم

السلام علیکم۔ آپ کا ۱۳ مارچ کا تحریر کردہ خط ملا تھا مگر کثرت مشاغل کی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔
عرصے سے آپ کی خیریت معلوم نہیں ہوئی۔
آجکل آپ کیا کر رہے ہیں؟ مطلع کیجئے نیز اپنی اور مولانا علی میاں کی خیر و عافیت سے بھی مطلع کیجئے۔
مولانا کو میرا سلام مسنون بھی پہنچا دیجئے۔
کفایت المفتی کی تیسری جلد چھپ رہی ہے۔ دوسری بعد میں چھپے گی۔ تیسری اور چوتھی جلد ساتھ ہی ساتھ مولانا کو انشاء اللہ عنقریب بھیجونگا۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔

فقط والسلام دعاگو حفیظ الرحمن

TO. MAULVI NOOR ALAM
AMINI
C/O MAULA MUHAMMAD
AL-HASANI
DARUL-ULOOM
NADWATUL-ULAMA
LUCKNOW.





احقر کے ایک ناچیز نامے کے جواب میں ۵رشعبان ۱۳۹۳ھ (۴رستمبر ۱۹۷۳ء) کو مندرجۂ ذیل مکرمت نامہ ارسال فرمایا، جس کی سطر سطر سے شفقت ومحبت کا ظہور ہوتا ہے:

۵ رشعبان ۹۳ھ

عزیز مکرم زیدت معالیکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ ۔ تمہارا خط آیا پیغام مسرت لایا
ہجوم افکار و مشاغل کی وجہ سے جواب میں تاخیر اور تمہارے
انتظار میں توفیر ہوئی ۔
یاد تمہاری اکثر آتی رہتی ہے اور دل کو گرماتی رہتی ہے
قابل فخر ہیں وہ سعادت مند روحیں جو اپنی چاہنے والوں
کو چاہیں اور استواریٔ تعلق کو آخر تک نباہیں ۔
اللہ رب العزت تمہارے علم و عمل میں برکت اور افزونی
عطا فرمائے اور تمہارے تمام دینی و دنیاوی مقاصد بر لائے
بھئی میری ناچیز تالیف الاعرفی نام اردو مصدر نامہ
اور تاریخی نام معیار البلاغہ ہے ۔ کتابت شروع
ہو چکی ہے ۔ دعا کی ضرورت ہے
میں بخیریت ہوں ۔ امید ہے کہ تم بھی بخیریت ہو گے

حضرت مولانا علی میاں اگر ندوہ میں تشریف فرما ہوں
تو احقر کی طرف سے سلام مسنون اور مندرجۂ ذیل تحیات
موزوں پیش کر دینا :-

بآں گروہ کہ غافل زیاد ما ہستند
سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

فقط تمہارا خیر اندیش
حفیظ الرحمٰن واصف
4/9/73

पोस्ट कार्ड
POST CARD





بمطالعہ عزیزم مولوی نور عالم امینی
دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
LUCKNOW
U.P.

۱۴/۶/۱۹۷۳ء (۱۲/جمادی الاولی ۱۳۹۳ھ) کے شفقت نامے میں جس محبت وقدردانی کا اظہار فرمایا ہے، وہ اُنھی کا حصّہ تھی۔ اِس دنیا میں اب میرے ایسے ''بڑے'' اور بزرگوار لوگ نہیں رہے، جو ایسے خلوص ومحبت سے مجھے نوازیں:

14/6/73

عزیز مکرم زیدت معالیکم

وعلیکم السلام - تمہارا خط موصول ہو کر موجب مسرت ہوا

یادآوری کا ممنون اور دعاگو ہوں -

تمہاری باتیں یاد آتی رہتی ہیں محبت، اخلاق، مروت - ادب، احترام، زندہ دلی - وغیرہ

اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے اور تمام مقاصد دینی و دنیوی میں فائز و کامیاب کرے - آمین -

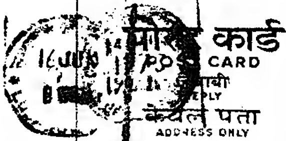
گرمی کی شدت کی وجہ سے چھوٹا بچہ بیمار ہو گیا تھا اور مجھے بھی اختلاج قلب وغیرہ کی شکایت ہو گئی تھی اب الحمد للہ دونوں بخیریت ہیں سب بچے سلام عرض کرتے ہیں -

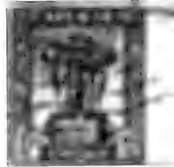
دمتم بخیر وسلامہ

عشتم بعز وکرامہ

دعاگو

6970ع





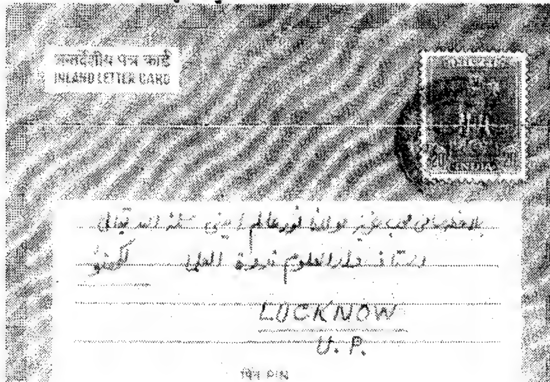
بملاحظہ عزیز مکرم مولانا نور عالم امینی

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

LUCKNOW

U.P.

مولاناؒ کی مشہور کتاب ''اردو مصدر نامہ'' چھپی تو اُنھوں نے میری عزت افزائی کے لیے، اُس کا ایک نسخہ میرے پاس بھی روانہ فرمایا۔ مطالعے کے بعد ناچیز نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، تو آپ نے اُس کی (ناچیز کی) اپنی بڑائی کی وجہ سے اتنے بلند الفاظ سے حوصلہ افزائی کی کہ وہ ہرگز اُن کا مستحق نہ تھا:



مجھے لکھنؤ میں پہلی بار اہلِ تعلق نے مُتوَجّہ کیا کہ اپنا پاسپورٹ بنوالینا چاہیے؛ کیوں کہ یہ مختلف الاغراض ہوتا ہے اور اُس کی ہر جگہ ضرورت پڑتی ہے۔ اِس کے لیے پیدائش کی سند کی ضرورت تھی، میں نے مولانا موصوف کو لکھا کہ آپ کے مدرسے کے ریکارڈ میں میری جو تاریخِ پیدائش درج ہے، وہ ہمیں عنایت فرمادیں، مجھے دستاویز کے لیے ضرورت ہے، حضرت نے اِس سلسلے میں معذرت کی اور وہ معذرت معقول تھی، اِس سلسلے میں یہ عنایت نامہ موصول ہوا۔



نمبر ....

المدرسة العالية العربية الاسلامية الامينية الواقعة بدهلی

مورخہ ۔۔۔۔ 20/8/66 ۔ کشمیری دروازہ۔ دہلی

عزیز مکرم

وعلیکم السلام ۔ افسوس کہ آپ نے ایک ایسی خدمت میری سپرد کی ہے کہ اس کا انجام دینا مشکل ہے۔ ہمارے دینی مدارس میں چونکہ تعلیم کے لئے عمر کی کوئی شرط نہیں ہے اور پھر ملازمت کے لئے بھی عمر کی کوئی قید نہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں تاریخ پیدائش کا کوئی خانہ نہیں۔ اور فارم داخلہ میں تخمینی عمر طالب علم جو اپنے آپ لکھ دیتا ہے اسکی تصدیق ہم نہیں کر سکتے = کیونکہ ہم کسی طالب علم سے تاریخ پیدائش کا سرٹیفکٹ نہیں مانگتے = اپنی تاریخ پیدائش کا سرٹیفکٹ تو اپنے وطن سے ہی حاصل کیجئے۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔ فقط والسلام

[signature] مہتمم

ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشنِ تعلیمی کی روداد مولانا سید محمد الحسنیؒ (۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء-۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) سابق ایڈیٹر ''البعث الاسلامی'' (عربی ترجمان دار العلوم ندوۃ العلما) نے لکھی تو میں نے اُس کا ایک نسخہ مولاناؒ کی خدمت میں بھیجا تو اُنھوں نے، اِن الفاظ میں وصول یابی کی رسید دی:



पोस्ट कार्ड
POST CARD
साथ का कार्ड जवाब के लिए
THE ANNEXED CARD IS FOR THE REPLY
केवल पता
ADDRESS ONLY

بملاحظہ عزیز مکرم مولوی نور عالم صاحب امینی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلما
لکھنؤ
NADWAT-UL-ULAMA
LUCKNOW
पिन PIN U. P.

افسوس ہے کہ مولاناؒ کے متعدد خطوط کاغذات میں کہیں گم ہوگئے، رسالۂ ''دارالعلوم'' میں حضرت مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر میرے دراز نفس مضمون کو پڑھ کر اُنھوں نے بڑا حوصلہ افزا خط لکھا تھا اور بہت داد دی تھی، حال آں کہ یہ مضمون اردو میں میری پہلی کاوش تھی، اِسی طرح دارالعلوم ندوۃ العلما میں استاد منتخب ہونے پر بھی بہت شاباشی دی تھی؛ لیکن یہ خطوط زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکے، جس کا بہت قلق ہے۔

لکھنؤ سے دہلی کا پہلا سفر اور مولاناؒ کی میز بانی سے شرف یابی

جمادی الاولی ۱۳۹۳ھ/ مئی ۱۹۷۳ء میں، ایک سال سے زائد مدت کے بعد گرمی کی چھٹی میں دہلی آیا، کئی روز قیام رہا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دہلویؒ اور مولانا واصفؒ کے ہاں پہلی بار دوپہر کے کھانے میں یکے بعد دیگرے مدعو ہوا۔ مولانا واصفؒ کے دسترخوان کا قرینہ دیکھ کے مجھے کھانا لینے میں تکلّف ہوا کہ اِس قرینے کے آداب کو صحیح طور پر برتنے کی سطح پر، میں پورا اُتر سکوں گا کہ نہیں۔ مولاناؒ نے اپنے مُتعَدِّد بڑے صاحب زادوں کو جو اُن کی پہلی اہلیہ محترمہ ''شفیعہ خاتون'' ہمشیرۂ مولانا سمیع اللہ قاسمی سے تھے بلوالیا تھا؛ تاکہ میرا اُن کا تعارف بھی ہوجائے اور میرے اِکرام میں بھی اِضافہ ہو۔ اُن میں مولانا جمیل الرحمٰن قاسمی مرحوم (متوفی چہارشنبہ: یکم رجب ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۳/نومبر ۱۹۹۶ء) جنھوں نے عربی میں ایم اے کرنے کے بعد اینگلو عربک اسکول میں ٹیچر کی خدمات انجام دیں، پھر سال ہا سال ریاض میں برسرِ ملازمت رہے اور بعد میں وفات تک مدرسہ امینیہ دہلی کے مہتمم بھی رہے۔ نیز مولانا انیس الرحمٰن قاسمی (جو ذاکر حسین کالج میں لکچرر اور پھر پروفیسر ہیں) بہ طورِ خاص یاد ہیں۔ آخر الذکر سے دارالعلوم دیوبند آمد کے بعد بھی کئی بار اُن کے گھر پر ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

کھانے کے بعد دیر تک مجلس جمی اور طرح طرح کی یادوں اور باتوں کو خوش گوار

وپر بہار علمی ماحول میں دہرایا جاتا رہا۔ عموماً عُلما قیلولہ کی سنّت ادا کرتے ہیں، یقیناً مولانا واصفؒ اور اُن کے لائق فرزندان بھی اِس کے عادی رہے ہوں گے؛ لیکن اُس دن مولانا واصفؒ نے مدرسہ امینیہ کی تاریخ، جہادِ آزادی اور جمعیۃ علما اور اپنے مدرسے کے تعلق سے مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کے تاریخی و علمی ومجاہدانہ کارناموں کا ایسا خوب صورت تذکرہ چھیڑا کہ ہم لوگ عصر کی اذان کے وقت ہی اُن کی مجلس سے اُٹھ سکے۔ میں اُن کے مکان سے نیچے اردو بازار کی سڑک پر اُتر رہا تھا تو ایسا محسوس ہوا کہ پاؤں پیچھے کو کھنچ رہے ہیں؛ کیوں کہ عظیم انسان کے ولولہ انگیز کارناموں کو سن کے دل میں جوش ومسرّت کی ایسی حسین لہریں اُٹھ رہی تھیں کہ یہ افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اِس مجلس کے اختتام کو اِتنی آسانی سے کیسے گوارا کرلیا۔

میری دیوبند آمد اور مولاناؒ سے ملاقات

شوال ۱۴۰۲ھ/ اگست ۱۹۸۲ء میں، راقم الحروف استاذ دارالعلوم دیوبند اور چیف ایڈیٹر پندرہ روزہ ''الداعی'' عربی (۱) کی حیثیت سے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند آ گیا۔ چوں کہ شروع شروع میں طباعت کے لیے بار بار خود ہی دہلی جاتا تھا؛ اِس لیے کثرت سے دہلی جانے آنے کا سلسلہ لگا رہتا تھا؛ اِس کے باوجود کثرتِ مشاغل کی وجہ سے مولانا واصفؒ سے دیوبند آمد کے بعد صرف دو بار اُن کے مکان پر ملنے کی سعادت حاصل ہوسکی۔ وہ دارالعلوم کے ۱۹۸۰ء سے تقریباً دو سال تک جاری رہنے والے جھگڑے، اُس کی تقسیم، عُلما کی ہوا خیزی اور تاریخِ دارالعلوم کی بدنامی سے بہت زیادہ رنجیدہ اور شکستہ خاطر نظر آئے۔ مجھ سے فرمایا: مولوی نور عالم! میں اپنی زندگی میں غم زیادہ اور خوشیاں بہت کم پاسکا ہوں؛ لیکن اِس غم کی وسعت و گہرائی پر غور کرتا ہوں تو دل چھلنی ہو جاتا ہے۔ عُلما شخصی اور سیاسی نزاع کو کہاں تک لے جاسکتے ہیں، اِس کا اندازہ

(۱) جو شمارہ ۱، جلد نمبر ۱۷، شائع شدہ صفر۔ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ مطابق اگست ۱۹۹۳ء سے ماہ نامہ میں تبدیل ہوگیا۔

نہ تھا۔ مدرسہ امینیہ کی تاریخ میں بھی طرح طرح کی ناہم واریوں کے زخم سہنے پڑے ہیں؛ لیکن دارالعلوم کا گھاؤ گہرا اور نا قابلِ اندمال ہے۔ کاش میرے مولیٰ نے اِس واقعے سے پہلے مجھے اُٹھالیا ہوتا۔

مولانا کی تصنیفات

۱- کفایت المفتی، نو جلدیں، طبعِ اول ۱۹۷۲ء، طبعِ دوم ۱۹۸۲ء۔ یہ حضرت مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوی کا مجموعہ ہے، جو مولانا واصف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سال ہا سال کی محنت اور عرق ریزی کے بعد جمع کیا تھا۔ علما و مفتیانِ کرام کے لیے بیش بہا خزانہ ہے۔

۲- درس الاسلام، طبع شدہ ۱۹۶۲ء، یہ منظوم تعلیم الاسلام (تالیف حضرت مفتی اعظم) ہے۔

۳- مفتیِ اعظم کی یاد، مطبوعہ ۱۹۶۷ء، اِس میں وہ سارے مضامین و تاثرات جمع کردیے گئے ہیں، جو اہلِ علم و فضل اور بڑے بڑے قائدین نے حضرت مفتیِ اعظمؒ کے انتقال پر لکھے تھے یا تقریر میں اُن کا اِظہار کیا تھا۔ خود مولانا واصف صاحب کے قلم سے اُس میں ایک مفصل مربوط اور مؤثر مضمون ہے۔

۴- اردو مصدر نامہ، مطبوعہ ۱۹۷۵ء، اردو زبان کے تیرہ سو مصادر اور انیس سو مشتق الفاظ کا ذخیرہ۔

۵- تذکرۂ سائل، مطبوعہ ۱۹۷۵ء، حضرت سائلؔ دہلوی کی سوانح اور نمونۂ کلام۔

۶- زرِ گل، مطبوعہ ۱۹۷۶ء، مجموعۂ کلام حضرت واصف دہلویؒ۔

۷- سہ لسانی مصدر نامہ، مطبوعہ ۱۹۷۷ء، اردو مصادر کے عربی، فارسی مترادفات کی تحقیق و تشریح و طریقۂ استعمال۔

۸- ادبی بھول بھلیاں، مطبوعہ ۱۹۸۰ء، لسانی و ادبی تحقیق و تنقید۔

۹- قرآنی پند نامہ، مطبوعہ ۱۹۸۱ء، آدابِ معاشرت سے متعلق قرآنی آیات کا ترجمہ و تفسیر اور ضروری وضاحت۔

۱۰- مُطَلَّقَہ کی شرعی حیثیت، مطبوعہ ۱۹۸۵ء (بہ شکل پمفلٹ)

۱۱- عقیدہ ورواداری، مطبوعہ ۱۹۸۵ء، قرآن وحدیث کی روشنی میں اِس مسئلے پر شرعی نقطۂ نظر کو بڑے صائب اور معقول انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۱۲- جمعیۃ علما پر تاریخی تبصرہ، مطبوعہ ۱۹۶۹ء، اِس مختصر سی کتاب میں بہت سے اصل حقائق کو اجاگر کیا گیا ہے، جس سے جمعیّت کی اصل تاریخ کی بصیرت افروز آگہی حاصل ہوتی ہے۔

۱۳- مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ دہلی، طبعِ چہارم ۱۹۶۹ء۔ اس میں مدرسے کی تاسیس، دہلی میں اُس کی ضرورت، نیز مدرسے کے بانیان بالخصوص مولانا امین الدین اورنگ آبادیؒ، حضرت مفتی مولانا محمد کفایت اللہؒ اور علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کا مختصر مگر جامع تذکرہ اور ساتھ ہی مدرسے کے اکابر اور نام ور فضلا بالخصوص حضرت مفتیِ اعظمؒ کے تلامذہ کا اجمالی تذکرہ بھی شامل ہے۔ مدرسہ امینیہ کی ضرورت واہمیت اور کارنامے کو جاننے کے لیے، اِس رسالے کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

۱۴- مدرسہ حسین بخش کا تعارف۔

۱۵- قصّہ بلّی کا، مطبوعہ ۱۹۸۰ء، فارسی نظم کا منظوم اردو ترجمہ۔

مولانا کی آل واولاد اور خاندان

مولاناؒ کی پہلی شادی مولانا سمیع اللہ قاسمی کی ہمشیرہ ''شفیعہ خاتون'' سے ہوئی، جن کے بطن سے ۴لڑکے اور ایک لڑکی ''سکینہ خاتون'' مُتَوَلّد ہوئی:

۱- حمید الرحمٰن بی اے، جو عرصے تک ایران ایمبیسی میں اہم عہدے پر کام کرتے رہے۔

۲- حبیب الرحمٰن ایران میں انگریزی زبان کے پروفیسر رہے۔

۳- مولانا جمیل الرحمٰن قاسمیؒ، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد اینگلوعربک اسکول دہلی میں ٹیچر رہے، پھر سال ہا سال ریاض میں برسرِ عمل رہے، آخر میں مدرسہ امینیہ دہلی کے مہتمم کے عہدے پر فائز رہے۔ چہارشنبہ: یکم رجب ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۳/نومبر ۱۹۹۶ء کو وفات پاگئے۔

۴- مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، ایم اے عربی، دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد جامعہ ملّیہ اسکول، نہرو یونیورسٹی دہلی سے تعلیم حاصل کی اور ذاکر حسین کالج میں لکچرر اور پروفیسر ہیں۔

۵- محترمہ سکینہ خاتون حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے برادرِ اوسط جناب حمید الزماںؒ سے منسوب تھیں۔ اُن کے انتقال کے بعد وہ مولانا ہی کے اہلِ خاندان کے ساتھ گزر بسر کرتی ہیں، لاولد ہیں۔

مولانا واصفؒ کی دوسری شادی ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء کے دوران مولانا امین الدین صاحبؒ بانی مدرسہ امینیہ دہلی کی نواسی ''نور جہاں بیگم'' سے ہوئی۔ اُن کے والد کا نام مولانا سید جلال الدین تھا۔ اُن کے بطن سے مولانا کے ۳ صاحبزادے اور ۶ صاحب زادیاں ہوئیں:

۱- محمود الرحمٰن ایم ایس سی، سعودی عرب میں الکٹرانک انجینئر رہے بالخصوص مکہ مکرمہ اور ریاض میں۔

۲- ڈاکٹر محمد قاسم دہلی یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس، اُن کی ذاتی کلینک ہے۔

۳- محمد سالم انجینئر بلڈنگ (آرکیٹیکٹ)۔

۴- امینہ بیگم (بی اے) گھریلو خاتون۔

۵- انیسہ بیگم (بی اے) ٹیچر۔

۶- عقیلہ بیگم (ایم اے) ٹیچر۔

۷- خدیجہ بیگم (ایم اے) گھریلو خاتون۔

۸- شکیلہ بیگم (ایم اے لائبریری سائنس) مدینۂ منورہ میں قیام پذیر۔

۹- نسیم فاطمہ (ڈاکٹر) شارجہ، امارات میں قیام پذیر۔

مولانا واصفؒ کے اُن سے ایک چھوٹے بھائی تھے، جنھوں نے کراچی میں سکونت اختیار کرلی تھی، اُن کا اسم گرامی خلیل الرحمٰن تھا، اُن کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی، لڑکے کا قیام کناڈا میں تھا۔ مولانا واصفؒ کی دو ہمشیرہ تھیں، ایک اپنے خاوند کے ساتھ کراچی جابسی تھیں اور ایک مولانا سمیع اللہ قاسمیؒ کی اہلیہ تھیں۔ اُن کے ۳ لڑکے اور ایک لڑکی تھی:

۱- عبدالسلام جو دہلی کے اسکول میں ٹیچر رہے۔

۲- عبدالعزیز، امریکہ میں برسرِ عمل رہے۔

۳- عبدالحکیمؒ، جو کتب خانۂ عزیزیہ اردو بازار کے منیجر تھے۔

۴- سلیمہ خاتون۔



جلیل القدر عالم و قائد امیرِ شریعت

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ —— چند یادیں

۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۳ء —— ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

تیرے بغیر رونقِ دیوار و در کہاں

۴؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ کی صبح کو دیوبند میں، دیوبند ہی کے ایک دوست نے اچانک ملاقات کے دوران بتایا کہ آل انڈیا ریڈیو کے آج کے شب کے نشریے سے معلوم ہوا کہ امیرِ شریعت بہار واڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ: حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی ۲-۳؍رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹-۲۰؍مارچ ۱۹۹۱ء سہ شنبہ و چہارشنبہ کی درمیانی شب میں، اِس جہانِ آب و گل سے روپوش ہوگئے۔

اِس خبرِ وحشت اثر کو اچانک اور بغیر کسی ذہنی آمادگی کے، سُن کر دل دھک سے رہ گیا۔ استعجاب و غم واندوہ کے ملے جلے جذبات کے درمیان کچھ دیر ہکّا بکّا سا رہا اور ایسا لگا جیسے کسی نے نہ صرف میرا؛ بل کہ پوری ملت کا سرمایۂ حیات لوٹ لیا ہو۔ دل کی گہرائیوں میں معاً یہ معصوم خیال پیدا ہوا کہ کاش یہ خبر غلط ہو؛ لیکن دیگر ذرائع سے یہ تحقیق ہوگئی کہ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی، ہم مسلمانانِ ہند کو یتیم سا چھوڑ کر اپنے رب کے جوارِ رحمت میں جا چکے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

ہر چند کہ مولانا سال ہا سال سے شکر کے مریض تھے؛ لیکن اِس موذی مرض کے تمام تر اثرات کے باوجود، معاصر علما اور دانشوروں کے درمیان اُن کی ممتاز، فعّال، متحرک اور سرگرم شخصیت کے پیشِ نظر، اِس خبر کی تصدیق میں خاصا تردّد ہوا، اور یہ حادثۂ وفات ایک ''ناگہانی واقعہ'' سا محسوس ہوا۔ خصوصاً اِس لیے کہ اُن کے مُتعدّد ہم عصر رفقائے کار علما، سن وسال میں اُن سے بڑے اور امراض کی وجہ سے عرصے سے رہینِ فراش ہیں، ذہن اُن کی خبرِ وفات سننے کے لیے بہت حد تک تیار ہے، اِس کے برعکس مولانا دمِ واپسیں تک سرگرمیِ زیست کی راہ پر محوِ سفر رہے؛ لیکن کیا کیا جائے کہ جب کسی کی موت کا وقتِ مُعیّن آجاتا ہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی مُؤخّر نہیں ہو پاتا اور ہماری خواہشیں اور ضروریات اُس کو نہیں ٹال پاتیں۔ إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ.

اور نگاہوں کے تیر، آج بھی ہیں دل نشیں

میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۸۱ھ سے جانتا تھا، جب میں مدرسہ امدادیہ، لہریا سرائے دربھنگہ (بہار) میں درجہ ششم اردو کا طالب علم تھا، مولانا مدرسے کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے، مجھ جیسے وہ طلبہ جنھوں نے اُنھیں اِس سے پہلے نہیں دیکھا تھا؛ بل کہ اُن کے متعلق صرف سنا تھا (بل کہ اِس سے قبل موجودہ ہندی مسلمانوں کی کشتی کی ناخدائی کرنے والے کسی قدر آور عالم کی دید سے اُن کی آنکھیں شرف یاب نہیں ہوسکی تھیں) اُنھیں ایک نظر دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ مولانا کے اوصاف وکمالات کا ہلکا سا نقش میرے ذہن میں عقیدت ومحبت کے جذبات کے ساتھ پہلے سے صرف اِتنا ہی قائم تھا، جتنا ایک ۹-۱۰ رسال کے بچے کے ذہن میں قائم ہوسکتا تھا۔ میں نے مولانا کے متعلق جو کچھ پہلے سنا ہوگا، اُس کا واحد ذریعہ میرے مربیِ اوّل واستاذ برادرِ معظم حضرت مولانا اویس القاسمی رائپوری (۱) تھے، جو اُس وقت مدرسہ

(۱) متوفی بہ روز جمعہ ۱۱ربجے دن ۳رجمادی الاخری ۱۴۱۹ھ مطابق ۲۵رستمبر ۱۹۹۸ء۔

امدادیہ کے باوقار استاذ تھے۔

مولانا کی ایمبیسیڈر کار مدرسے کے میدان میں آکر رکی اور مدرسینِ مدرسہ کے ساتھ ساتھ طلبہ کے جمّ غفیر نے کار کو گھیر لیا، مدرسین استقبال کے لیے اور طلبہ دیدار کے لیے۔ مولانا کار سے اترے اور اپنی پُر رونق شکل وصورت سے ہماری نگاہوں میں بس گئے: درخشندہ چہرہ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں جو ذہانت اور فہم وفراست کی غماز تھیں، بڑا سا سر جو دماغوں اور خزانہ ہائے فکر ونظر سے بھرا ہوا تھا اور دوہرا بدن ——— کچھ دیر بعد یعنی مغرب کے بعد جلسے کی صدارتی تقریر کے دوران اپنی واضح اور گونجتی ہوئی آواز اور مربوط و مُرتّب گفتگو سے میرے معصوم دل کے سادہ صفحے پر احترام ومحبت کا پُرشکوہ شیش محل بنا گئے۔ شعور وآگہی کے آیندہ دور میں بہ خوبی اندازہ ہوگیا کہ معاصر علما وقائدین کے درمیان، یہ صفت مولانا کے امتیازات میں سے تھی۔

سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد مولانا ہم لوگوں کے لیے، صرف ایک بڑے ہندوستانی عالم نہیں رہ گئے؛ بل کہ وہ ہمارے فردِ خاندان اور ہماری عقیدتوں کا گہوارہ بھی بن گئے، ہمیں اُن سے ہزاروں مضبوط رشتے مربوط کر چکے تھے۔ اُن رشتوں کا سرچشمہ ہمارے گھر، خاندان اور ہمارے وسیع تر علاقے میں اُن کا مسلسل ذکرِ خیر تھا۔ ممکن نہیں تھا کہ علم وفضل کے حوالے سے کوئی مجلس منعقد ہو اور علما وفضلا کی زبان اُن کے تذکرہ سے خالی رہے۔ اِس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بہار واڑیسہ کے اکثر مدرسوں کے مولانا صدر یا نگراں تھے۔ اُن رشتوں کی دوسری بنیاد، اُن کے علم وفضل کے ساتھ ساتھ برِّصغیر میں اسلام ومسلمانوں کی خدمت کے سلسلے میں اُن کی بے پناہ کوششِ پیہم کا اعتراف وقدردانی تھی، جو وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل ودماغ کو شاد اور فخر ونازش کے جذبات سے سرشار کرتی گئی۔ خداے کریم اُنھیں نبیوں، صدیقوں، شہدا اور صالحین کے ساتھ جنت الفردوس سے نوازے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز

اگر یہ سچ ہے اور یقیناً ہے کہ توفیق وصلاحیت بندوں میں محض خدا کی طرف سے تقسیم ہوتی ہے اور یہ کہ باری تعالیٰ ہی وقت کے تقاضے کے مطابق، رجالِ کار پیدا کرتا ہے؛ تو یقیناً یہ بھی سچ ہے کہ خدائے قدیر نے مولاناؒ کو بیدار مغز اور باتوفیق بنا کر پیدا کیا تھا؛ تا کہ وہ آفتابِ آزادی کے طلوع سے ہنوز ہندی مسلمانوں کو تلاطم ہائے مصیبت میں گھری ہوئی کشتی کے چیدہ سعادت مند ناخداؤں میں سے ایک ہوں۔ خدا نے اُنھیں دو ایسے زبردست اوصاف سے نوازا تھا، جن میں معاصر علما وقائدین میں سے کوئی اُن کا شریک نہ تھا۔ یعنی ذہانت اور جرأت؛ اِسی لیے آزاد اور سیکولر ہندوستان میں مذہب وعقیدہ پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں درپیش مسائل و آزمایشیں مولانا منّت اللہ رحمانیؒ اور اُن جیسے ذہین وجرأت علما وقائدین کی موجودگی میں، مسلمانوں کے لیے حوصلہ شکن نہ بن سکیں؛ کیوں کہ اُن علما وقائدین نے اُنھیں مسائل ومشکلات سے نمٹنے، اپنے اِسلامی تشخص کو برقرار رکھنے اور ''سیکولر قومی دھارے'' یا ''یکساں شہری قانون'' کی گردن پر لٹکتی ہوئی تلوار سے بچے رہنے کی ہمّت دی۔ چناں چہ وہ تمام حوصلہ شکن حالات کے باوجود، خود اِرادی وخوداعتمادی کے ساتھ زندہ رہنے کے جذبے سے سرشار ہیں اور ملی وقومی زندگی کی بے حساب وبے رحم ناہمواریاں، اُن کے صبر وعزیمت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہتی ہیں اور اِن شاء اللہ آیندہ بھی ہوتی رہیں گی۔

میرِ کارواں

مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسٹیج سے ہندی مسلمانوں کے لیے مولاناؒ کی زبردست خدمات ہمیشہ ناقابلِ فراموش رہیں گی۔ یہ بورڈ اُن کی اور دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (متوفی شوال ۱۴۰۳ھ مطابق

جولائی ۱۹۸۳ء) رحمۃ اللہ علیہما کی تحریک ودعوت پر بمبئی میں ۲۸ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو منعقدہ تاریخ ساز اِجلاس میں، زیرِ عمل آیا تھا۔ اِس اِجلاس میں ہندوستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے علما وفضلا شریک ہوئے تھے۔ علما وقائدین نے متفقہ طور پر، مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ کو بورڈ کا سکریٹری جنرل اور حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کو صدر منتخب کیا۔ قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اِس کے صدر منتخب ہوئے اور کئی سال تک اِس منصبِ جلیل کی زینت رہے۔

اِس بورڈ کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں نے پوری طاقت سے یہ اِعلان کردیا کہ وہ مسلم پرسنل لا میں کسی قسم کی دخل اندازی برداشت نہیں کریں گے۔ مسلم پرسنل لا کو بے اثر کرنے والے، ہندوستان کے قانون ساز اداروں کی طرف سے وضع کردہ قوانین پر مسلسل نظر رکھنے کے لیے بورڈ نے باقاعدہ کمیٹی بنائی، جس نے حسن وخوبی سے اپنی ذمہ داری ادا کی اور آیندہ بھی اِسی جوش وجذبے کے ساتھ اِن شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی سعیِ مسلسل، اُن کی بے پناہ بیدار مغزی اور ہوش مندانہ قیادت کے طفیل، مسلم پرسنل لا کی حفاظت ہندوستان گیر تحریک بن کر اُبھری اور ملک کے طول وعرض اور شہر ودیہات میں مسلمانوں کے اندر اِسلامی شعور کی بیداری اور اِسلامی زندگی اختیار کرنے اور جاہلی زندگی سے گریز کرنے اور مذہب وعقیدے کی راہ میں پیہم خطرات اور اندیشوں سے باخبر رہنے کا اِحساس اُجاگر کرنے میں، اِس تحریک نے قابلِ ستایش کردار ادا کیا —— نیز اِس نے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں، جو مغربی تہذیب کا پروردہ اور مغربی ثقافت کا دیوانہ ہے، اسلامی شریعت کی آفاقیت، ابدیّت اور ہر جگہ اور ہر زمانے میں قابلِ عمل ہونے کے حوالے سے، اعتماد بحال کیا اور یہ یقین بھی کہ اسلامی شریعت اتنی جامع، کشادہ اور لچک دار ہے کہ اُس کے پاس زندگی کے نت نئے مسائل کا کلّی اور اطمینان بخش حل موجود ہے۔

کارِ خلیلاں خارا گدازی

ہندوستانی سپریم کورٹ نے ۱۹۸۵ء میں شاہ بانو کیس کا فیصلہ کرتے ہوئے، یہ حکم دیا کہ مسلم مطلقہ کا اُس کے طلاق دہندہ شوہر پر، اُس وقت تک نفقہ واجب ہوگا، جب تک مطلقہ شادی نہ کرلے۔ یہ حکم کھلم کھلا اِسلامی شریعت پر حملہ تھا اور دوسری طرف بورڈ کے لیے ایک بڑا چیلنج اور مسلمانوں کی اپنے دین کے سلسلے میں ذکاوتِ حس کا امتحان بھی۔ مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ، اُس وقت پوری طاقت وقوت کے ساتھ حرکت میں آگئے اور اُن کا بورڈ پوری طرح سرگرمِ عمل ہوگیا۔ مولاناؒ اِس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر طرح کمر بستہ ہوگئے۔ ہندوستان کے طول وعرض کا سفر کیا، مسلم رائے عامہ کو اِس حکم کے خلاف بیدار اور ہموار کیا اور اِس کے پیچھے مسلم پرسنل لا میں دخل اندازی کے لیے کارفرما، جذبے سے عوام وخواص کو واقف کرایا۔ بورڈ نے اِس سلسلے میں ملک کے مختلف شہروں میں جلسے اور میٹنگیں کیں۔ قائدین نے اِس کے خلاف بیانات دیے۔ مولانا رحمانیؒ کی حکمتِ عملی اور اُن کی ذہانت وجرأت، نیز بورڈ کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بھاری بھرکم شخصیت اور بورڈ سے متعلق علما وقائدین کے جہدِ مسلسل کی وجہ سے؛ حکومت کو مسلمانوں کے اِرادے کے سامنے سپر انداز ہوکر، مطلقہ سے متعلق قانون میں، مسلم پرسنل لا کی خواہش کے مطابق، بل پاس کرنا پڑا۔ یہ بورڈ کا؛ بل کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا ایک تاریخی کارنامہ تھا۔

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ہندوستان کی سابق وزیرِ اعلیٰ آں جہانی اندرا گاندھی (۱۹۱۷-۱۹۸۴ء) نے ہندوستان میں ایمرجنسی نافذ کی اور اپنے تیز وطرار چھوٹے بیٹے سنجے گاندھی (۱۹۴۶-۱۹۸۰ء) کے تعاون سے عام باشندوں میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً، جبری نس

بندی کا زور شور اور حکومت کی طاقت سے عمل شروع کیا۔ لوگوں کے منھ بند کر دیے گئے، زبانیں منجمد کر دی گئیں، قلم توڑ دیے گئے، پریس اور ذرائع اِبلاغ پر سخت قسم کا سنسر عائد کر دیا گیا۔ عوام تو عوام خواص کو ڈرا دھمکا کر بھیگی بلی بنا دینے کی کوشش کی گئی، شہریوں پر ایسی آہنی گرفت عمل میں لائی گئی کہ اللہ کی پناہ، وطنِ عزیز کے عزیزوں کو ذلیل کیا گیا، حرمت وعزت کو پامال کیا گیا، ظلم و جور کے آہنی شکنجوں سے ملک کی چیخ نکل پڑی، جبری نس بندی کے خوف سے لوگ بعض دفعہ اپنا گھر چھوڑ کر جنگلوں، دھان، گیہوں اور گنے کے کھیتوں میں چھپ کر رات گزارنے پر مجبور ہوے۔ مسلم علما کو کبھی ترغیب اور کبھی تہدید کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کی گئی، مفتیانِ کرام کو نس بندی کے حق میں فتوے دینے پر مجبور کیا گیا اور زعماے ملت سے زبردستی انٹرویو کر کے، اُن کی گفتگو کو سیاق وسباق سے ہٹا کر، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں نشر کیا گیا —— خلاصہ یہ کہ اُس وقت کلمۂ حق کا اِظہار بُرے سے بُرے نتائج کو دعوت دیتا تھا۔ چناں چہ بہت سے علما تو کسی گوشۂ نامعلوم میں خلوت گزیں ہو گئے یا مصیبت کے ٹلنے کے انتظار میں خاموش رہے۔ وہ ایسا وقت تھا جب خلقِ خدا زبانِ حال وزبانِ قال سے کہہ رہی تھی "مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ" خدا کی مدد کب آئے گی؟ اور گویا پوری قوم یہ کہہ رہی تھی ؎

ناز جس خاکِ وطن پر تھا مجھے آہ، جگر
اُسی جنت پہ، جہنم کا گماں ہوتا ہے

یہاں یہ بھی کہنے دیجیے کہ آخرش یہی واقعات آں جہانی اندرا گاندھی کی حکومت کے اختتام کا باعث بنے اور اُس وقت کے انتخابات میں اُنھیں شکستِ فاش کھانا پڑا؛ کیوں کہ اُنھوں نے نوشتۂ دیوار پڑھنے کی کوشش نہیں کی ؎

آسودۂ ساحل تو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اُٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

اِن حالات میں مولانا رحمانیؒ آگے بڑھے، کلمۂ حق کے اِظہار کا بیڑا اٹھایا، دہلی

میں مسلم قائدین کا اجلاس منعقد کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمام مسلم علما وزعما سے پہلے وہ اور اُن کے دست وباز ورفقاے کار دہلی پہنچے۔ دیگر علما وقائدین یہ معلوم کرنے کے بعد ہی دہلی پہنچنے کی جرأت کر سکے کہ مولانا رحمانیؒ دہلی پہنچ چکے ہیں۔ مسلم قائدین اور مولاناؒ نے جبری نس بندی کے خلاف بیانات دیے اور متعدّد رسائل تصنیف کیے، جن میں نس بندی کے متعلق اِسلام کا موقف واضح کیا گیا، ملک کی مختلف زبانوں میں اُن کا ترجمہ ہوا اور ملک کے طول وعرض میں اُنھیں تقسیم کیا (کیا)۔ شہریوں خصوصاً مسلمانوں میں اِس کام یاب جدوجہد کی وجہ سے اعتماد پیدا ہوا اور حکومت کو اپنے نامۂ اعمال کا جائزہ لینے کی تحریک ہوئی، اِس سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کو ظلم کے خلاف کہنے سننے کا حوصلہ ہوا—— یہ واقعہ بھی مولانا رحمانیؒ کی مثالی بے باکی کا غماز ہے۔

عیشِ منزل ہے، غریبانِ محبت پہ حرام

آزادی کے بعد سے اب تک فسادات کی آتشِ فروزاں میں مسلسل جلنے اور خانما برباد ہونے والے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں مولاناؒ کا کردار بھی نمایاں رہا ہے۔ وہ حکاموں سے ملتے، فسادزدہ علاقوں کا دورہ کرتے، اسباب ونتائج پر حکومت کی توجّہ مبذول کرتے، مصیبت زدوں کو ہر ممکن مدد پہنچاتے، اُن کی اشک شوئی اور دل جوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے—— وہ سب کچھ ایک فوجی کی چستی، چوکیدار کی بیداری، مومن کے احساسِ ذمہ داری اور مجاہد فی سبیل اللہ کی قربانی کی روح کے ساتھ کرتے تھے۔

ہر قدم، معرکۂ کرب وبلا ہے درپیش

یوپی کی صوبائی حکومت نے بابری مسجد کے گیٹ پر ۱۹۵۲ء سے پڑا ہوا تالا ہندوؤں کے لیے کھول دیا اور بابری مسجد کے منبر ومحراب میں کھلے عام بتوں کی پرستش کی اِجازت دے دی اور مسلمانوں پر مسجد کو کلیتاً حرام کر دیا۔ پھر تشدد اور تعصب پسند

ہندو جماعتوں نے رتھ یاترا، پدیاترا اور طرح طرح کی یاتراؤں کے ذریعے، ملک کے طول وعرض میں آگ سی لگادی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی لَو پہلے سے زیادہ تیز کردی گئی، قریہ قریہ اور شہر شہر مسلمان ہراساں وخوف زدہ کردیے گئے، زمین مسلمانوں پر اپنی تمام تر کشادگیوں کے باوجود تنگ ہوگئی، خونِ مسلم کو آب سے زیادہ ارزاں بنادیا گیا، مسلمانوں کی عزت وناموس کو پامال کیا گیا، ظلم وجور کے ایسے مناظر سامنے آئے کہ دیکھنے اور سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرٹھ، ملیانہ اور بھاگلپور وغیرہ ہندوستانی تاریخِ سیاست وحکومت پر، ایک بدنما داغ بن کر اُبھرے اور ظلم وبربریّت کے ننگے ناچ کے لیے، ضرب المثل کے طور پر صحافی، مؤرخ اور عوام کے قلم وزبان پر شب وروز جاری ہوکر، تاریخ کا ناقابلِ محوجزو بن گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملیانہ وبھاگلپور وغیرہ کی داستانِ خونچکاں قلم بند کرتے ہوے، کس طرح قلم کاروں کے ہاتھ کانپنے لگتے تھے، روح فرسا واقعات کی حکایت بیان کرتے وقت، الفاظ زبانوں پر ٹوٹ پھوٹ جاتے تھے۔

اِس رنگ سے اٹھائی، کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے، غم ناک ہوگئے

دوسری طرف اِسلام نا آشنا، انگریزی تعلیم یافتہ وہ طبقہ جس کے ساتھ موروثی طور پر "مسلمان" کا لفظ چپک گیا ہے اور جو صرف مغربی تہذیب وتمدن کو راہِ سعادت ونجات سمجھتا ہے، علماے دین پر سکوت وجمود کی تہمت کا علَم لے کر کھڑا ہوگیا اور اپنی تحریر وتقریر میں حسبِ عادت اُس کو زمانہ ناآشنا، تنگ نظر، حالات سے بے خبر رہنے وغیرہ کہنے لگا اور ساتھ ہی یہ "فتویٰ" بھی صادر کرنے لگا کہ مسلمانوں کی جان ومال کی حفاظت کی خاطر، بابری مسجد سے دست کش ہوجانا چاہیے۔

اِن حالات میں مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم پھر سامنے آئے اور اُنھوں نے دسمبر ۱۹۹۰ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے سایہ تلے، مسلم علما وزعما کو جمع کیا، اِس اِجلاس نے

حکومت اور مسلم عوام کے نام دو الگ الگ پیغام دیے۔ حکومت کو یاد دلایا گیا کہ:

''اقلیت کی حفاظت کے بغیر، ملک کا مستقبل ہر وقت خطرے میں رہے گا اور ملک کا سیکولر و جمہوری کردار لا اینڈ آرڈر کے ذریعے باقی رہ سکتا ہے۔ قانون کی بالادستی حکومت کا اولین فریضہ ہے۔ مسلسل تین سال سے فرقہ پرست، ملک کے اَطراف واَکناف میں اشتعال انگیز تقریروں، تحریروں اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعے فرقہ پرستی کو شعلہ زن کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے مختلف جگہوں پر بدترین فرقہ وارانہ فسادات ہوے اور ہو رہے ہیں۔ ان پر قابو پانا اور روک لگانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں نے اب تک ملک کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتے ہوے صبر کا دامن تھامے رکھا ہے اور اُنھوں نے تشدد کا جواب تشدد سے دینے سے گریز کیا ہے۔

بورڈ بابری مسجد کے حوالے سے، اپنا موقف واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مسجد اور مسجد کی جگہ خدا کی ملکیت ہے؛ لہٰذا اُن میں کسی طرح کی تبدیلی یا اُن کی خرید و فروخت یا کسی جماعت، فرد یا حکومت کی کسی عقدِ صلح کے ذریعے، سپردگی جائز نہیں اور نہ ہی حکومت کو اِکوائر کرنے کا حق ہے —— ناقابلِ انکار دلائل و دستاویزات سے ثابت ہے کہ بابری مسجد، مسجد ہی ہے اور بابری مسجد، کسی غصب شدہ زمین یا کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی ہے؛ لہٰذا شرعاً اِس کی حیثیت وہی ہے جو کسی مسجد کی ہوا کرتی ہے؛ اِس لیے ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء والی پوزیشن کے ساتھ بابری مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا جانا چاہیے''۔

مسلمانوں کے نام پیغام میں کہا گیا کہ:

''اِس ملک میں مسلمانوں کا وجود کسی حکومت، کسی اکثریت یا کسی فرقہ کی رہینِ منت نہیں ہے۔ مسلمان محض خدا کے بھروسے پر یہاں جی رہے ہیں۔ وہ خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے ذریعے ہی آیندہ بھی یہاں رہ سکتے ہیں

اور محض خدا کے طفیل سے وہ دین وایمان پر مضبوطی سے قائم رہنے کے ساتھ ساتھ اِن شاءاللہ، روشن مستقبل کی طرف محوِ سفر رہیں گے''۔

مسلمانوں سے مزید کہا گیا کہ:

''فسادات کو خود ہوا نہ دیں۔ لیکن اُن کی جان ومال اور آبرو پر جب حملہ ہو، تو خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا دفاع کرنے سے ہرگز دریغ نہ کریں''۔

اِس موقع سے ایک باوقار وفد کی سربراہی کرتے ہوئے، مولانا رحمانیؒ نے وزیرِ اعظم چندر شیکھر (۱۹۲۷-۲۰۰۷ء) سے ملاقات کرکے بابری مسجد کے تعلق سے، اِسلام کا موقف واضح کرنے اور فرقہ وارانہ فسادات کے دہکتے ہوئے شعلوں کو فرو کرنے کے لیے؛ حکومت کی توجّہ مبذول کرانے کی سوچی کہ ؎

درد دِل لکھوں کب تک، جاؤں اُن کو دکھلا دوں
اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکا اپنا

مولاناؒ نے جب مذکورہ مسائل پر گفتگو شروع کی تو مسٹر چندر شیکھر نے نہایت نامعقول جواب دیا، جو ہندوستان جیسے ملک کے وزیرِ اعظم کے لیے، کسی طرح موزوں نہ تھا۔ اُنھوں نے کہا: ''آپ سب لوگ بھنگ کے کنویں سے پانی پی کر آئے ہیں''۔ مولانا کہاں چوکنے والے تھے، آپ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ ؎

طنز و تعریض کی آخر کوئی حد ہوتی ہے
آدمی ہوں، مرے منھ میں بھی زبان ہے ساقی

مولاناؒ نے چندر شیکھر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''حکومت تو پاگل نہیں ہوگئی ہے؟!'' اِس جملے کے بعد چندر شیکھر کو ہوش آیا اور اُنھوں نے سنجیدہ ماحول میں وفد کی گفتگو سنی:

پہلے تو عرضِ غم پہ، وہ جھنجھلا کے رہ گئے
پھر کچھ سمجھ کے، سوچ کے، شرما کے رہ گئے

اِدھر چند سالوں سے موجودہ ہندوستان میں مولانا کی حیثیت ہندی مسلمانوں کے لیے ایک ماہر حکیم کی ہوگئی تھی، جس سے لوگ پیچیدہ اور لاعلاج مرض کے سلسلے میں رجوع کرتے اور اُس کی صحیح تشخیص و تجویز سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نازک ترین وقت میں بھی مسلمانوں کو اِس سے ڈھارس بندھتی تھی کہ ہمارے درمیان مولانا رحمانیؒ ایسے عظیم لوگ موجود ہیں؛ اِس لیے ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل خدا کی مدد اور توفیق سے ضرور نکل آئے گا:

زندگی میں آ گیا جب ، کوئی وقتِ امتحاں
اُس نے دیکھا ہے جگرؔ ، بے اختیارانہ مجھے

تو مردِ میداں تو میرِ لشکر

امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ (اور مولاناؒ کی وفات کے کئی سال بعد بہار سے کٹ کر بننے والے صوبے جھارکھنڈ) کے اسٹیج سے، جس کے وہ ۳۳ سال امیر رہے، اُن کی خدمات، اُن کے زندۂ جاوید کارناموں کے نامۂ اعمال میں روشن ستارے کی طرح چمکتے اور ہمیشہ کے لیے زمانے کی زبان پر نغمۂ شیریں بن کر گونجتے رہیں گے ——— اُن کے عہدِ امارت میں، امارتِ شرعیہ نے کمّاً و کیفاً ہر سطح پر ترقی کی، اُس کے شعبوں، اِداروں اور شاخوں میں وسعت و بہتری آئی اور اِمارت کو مسلمانوں کی دینی و ملی زندگی کے سنوارنے اور قانونِ شریعت کے مطابق استوار کرنے میں قابلِ ذکر و شکر کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔

تینوں صوبوں میں مختلف مقامات پر دارالقضا کا قیام عمل میں آیا، قضاۃ سازی اور مفتیانِ کرام کی ٹریننگ کا باقاعدہ نظام قائم ہوا، اِس کے لیے باقاعدہ بجٹ کا ایک حصّہ مخصوص کیا گیا۔ امارت کے قائم کردہ دارالقضا کی وجہ سے مسلمانوں کو عائلی مسائل میں سیکولر عدلیہ کا سہارا لینے کے عذاب سے نجات حاصل ہوئی۔ سرکاری سطح پر بھی تینوں

صوبوں میں اُن دارالقضاؤں کی حیثیت تسلیم کی گئی اور پرسنل لا اور عائلی مسائل میں حکومت نے اُن سے رجوع کیا۔

بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ میں امارت کی کارگزاری کو دیکھ کر قائدین کی خواہش ہوئی کہ اِس کو وسعت دے کر ملک گیر کردیا جائے۔ اِس سمت میں مولاناؒ کے جوشِ عمل کے نتیجے میں پیش رفت بھی ہوئی اور متعدد صوبوں میں خصوصاً جنوبی اور مغربی علاقوں میں امارت کے طرز پر کام شروع ہو چکا ہے اور وہاں کے دارالقضا، سرگرمی سے اپنی ذمہ داری ادا کررہے ہیں۔

امارت نے بیت المال کے نظام کو بھی وسعت دی اور اُسے نہایت درجہ فعال ادارہ بنادیا۔ سیلاب اور فسادات سے تباہ حال لوگوں کی اِمداد، بیوہ گان اور یتیموں کی کفالت اور غریب لڑکیوں کی شادی ایسی خدمات میں بیت المال نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نیز بہار واڑیسہ میں مختلف مساجد میں ائمہ ومؤذنین کے انتظام اور اُن کی تنخواہ کے بند وبست میں اُس نے مدد دی۔ نیز تعلیمی وتربیتی اور عصری اِداروں کا قیام عمل میں آیا۔

چند سال قبل امارت کی مرکزی عمارت کی تعمیر، زیرِ عمل آئی جو دفاتر، لائبریری، میٹنگ ہال اور ایک پروقار وقابلِ اعتبار فلاحی ہسپتال، پر مشتمل ہے، عمارت سادہ وپرکار ہے۔ اِس کے علاوہ بہت سے منصوبے زیرِ غور اور بہت سے زیرِ تنفیذ تھے، اُن کے لیے مال اور وسائل کی فراہمی کا کام بھی جاری تھا۔ لیکن مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ.

لذّتِ تقریر

مولانا کی تقریر پُر مغز ہوتی تھی، جچے تلے الفاظ استعمال کرتے؛ لیکن مضامین مُرتَّب، مُدَلَّل اور لہجہ واضح اور گونج دار ہوتا۔ اکتا دینے والی طوالت اور خلل انداز ایجاز بیانی، دونوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے۔ تقریر میں حافظہ، تعبیر، الفاظ اور مضامین کی غیر معمولی معنویّت: سبھی اُن کا ساتھ دیتے۔

جب وہ کرسیِ خطابت پر فروکش ہوتے، تو حاضرین کی نگاہیں اُن کی بھاری بھرکم، پروقار اور جاذبِ نظر شخصیت کی دید سے مسرور ہو جاتیں۔ اُن کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ سامعین کے دل میں پیوست ہو جاتا؛ اِس لیے کہ وہ اپنے ہر لفظ کو ایک ماہر اور ذہین استاذ کی طرح استعمال کرتے تھے جو درس سے قبل اپنے محاضرے کو تیار کر لیتا اور اُس میں ترتیب اور تقدیم و تاخیر کی رعایت کر چکا ہوتا ہے۔

سلیقۂ تحریر

وہ اردو میں تصنیف و تالیف کا حسین ذوق رکھتے تھے؛ لیکن مذہب و ملّت کی خدمت کے سلسلے میں مسلسل اَسفار اور ملک کے گوشے گوشے میں پیہم آمد و رفت، نیز دورانِ قیام نوع بہ نوع مشاغل کے ہجوم کی وجہ سے، تصنیف و تالیف کے لیے وہ وقت نکال سکے اور نہ ہی اُنھیں وہ سکون و اطمینان حاصل ہو سکا، جن کے بغیر اِس طرح کا کام انجام دینا ممکن نہیں ہوتا ـــــ اِس کے باوجود اُنھوں نے مختلف فقہی موضوعات پر متعدد پُر مغز اور کار آمد رسالے لکھے۔ نیز مختلف اوقات میں دیگر مختلف عنوانوں پر بہ وقتِ ضرورت، بہت سارے مضامین اُن کے علمی قلم سے نکلے۔ اُن کی نگارشات میں "مکاتیبِ گیلانی" کے نام سے علامہ مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۵ھ - ۱۹۵۶ء) کے گراں قدر خطوط کی جمع و ترتیب بھی پایے کی چیز ہے۔

بندۂ مولیٰ صفات

مولانا اپنے پہلو میں ایک نہایت ہم درد دل رکھتے تھے، مجھے طالب علمی کے زمانہ میں اور اُس کے بعد بار ہا اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اُن سے ہر بار مل کر انسانیت اور شراف کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملی۔ ۱۹۷۱ء میں، میں مدرسہ امینیہ دہلی میں طالب علم تھا۔ میرے شفیق و محترم المقام استاذ، فقہ و تاریخ کے عظیم

مصنف، مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء) نے مجھے حکم فرمایا کہ میں، مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا دیوبند سے آتے ہوئے پرانی دہلی کے اسٹیشن پر استقبال کروں، پروگرام کے مطابق مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان میں ''ادارہ مباحث فقہیہ'' کے دفتر میں قیام کرنا تھا۔

مولانا محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ اِس ادارے کے ذمہ دار تھے۔ اِس دوران دو روز تک مولانا کی خدمت میں بار بار آنے اور اُن سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ میں نے مولاناؒ میں وقار کے ساتھ تواضع، ذہانت کے ساتھ علم، زود فہمی کے ساتھ دور رسی، چھوٹوں پر شفقت کے ساتھ دنیا وآخرت میں اُس کی بھلائی کی نصیحتیں اور غیر معمولی حلم وبردباری دیکھی۔

مولاناؒ سے اِس ملاقات کے بعد چوں کہ میرا اُن سے تعارف بھی ہوگیا اور وہ دہلی میں ملاقات کے دوران بہت شفقت ومحبت سے بھی پیش آئے؛ اِس لیے اُن سے مراسلت اور اپنی تعلیمی زندگی میں مشورہ ورہ نمائی لینے میں کوئی تکلف اور حجاب مانع نہیں رہا، ناچیز کے ایک عریضے کے جواب میں اُنھوں نے جو شفقت نامہ تحریر فرمایا، اُس کی سطر سطر سے غیر معمولی محبت واپنائیت کا اِظہار ہوتا تھا:

ازمنت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ

خانقاہِ رحمانی، مونگیر

۱۹۷۱/۹/۳ء

عزیز مکرم! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، محبت نامہ ملا، آں عزیز نے اِس عاجز کے متعلق جن خیالات کا اِظہار کیا ہے، وہ محض آپ کی فطری صلاح وسعادت کا اثر ہے؛ ورنہ "صَاحِبُ البیتِ أَدرٰی بِمَا فِیهِ" حق تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ آپ کو علم وعمل سے سرفراز کرے اور شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔ آمین

مولوی محمد شعیب صاحب آواپوری (۱) کہاں ہیں؛ اگر اُن سے آپ کی ملاقات ہوتو کہہ دیں کہ رمضان میں ایک آدھ ہفتے کا وقت مونگیر میں گزاریں

حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام کہہ دیں۔

والسلام

منت اللہ

مولاناؒ کے مکتوب کے بعد، مولانا شعیب آواپوری کو تلاش کیا تو وہ اتفاق سے ہفتے تک نہیں ملے، اِس کی اِطلاع فوراً ایک عریضے کے ذریعے، مولاناؒ کو دی؛ تاکہ اُنھیں انتظار کی اذیّت نہ ہو، تو مولاناؒ نے یہ شفقت نامہ ارسال فرمایا:

منت اللہ رحمانی

خانقاہ رحمانی، مونگیر

۱۲/۹/۱۹۷۱ء

عزیز مکرم! علیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خط ملا، مولانا شعیب آواپوری کی تلاش میں عجلت کی ضرورت نہیں، جب ملاقات ہو، کہہ دیا جائے۔ الحمد للہ جملہ اَہالیانِ خانقاہ وجامعہ بہ عافیت ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ آں عزیز کو علمِ نافع عطا فرمائے اور عملِ صالح کی توفیق دے۔ آمین

اِس خط کے جواب کی ضرورت نہیں، میں اکتوبر میں اکثر وبیشتر باہر ہی

---

(۱) مولانا محمد شعیب، موضع آواپور، ضلع سیتامڑھی، سابق ضلع مظفر پور کے باسی تھے، میرے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے، ہم لوگوں سے کئی درجہ اوپر تھے، میں جب مدرسہ امینیہ میں ۱۹۷۱ء میں تھا، تو وہ دارالعلوم سے فارغ ہوکر جامعہ طبیہ دہلی میں، جو اُس وقت گلی قاسم جان میں تھی، طب کی تعلیم حاصل کررہے تھے، غالباً مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے دست گرفتہ ہوگئے تھے، مولانا سید احمد ہاشمیؒ سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماے ہند کی صاحب زادی سے اُن کی شادی ہوئی، اب صاحبِ اولاد ہیں، پہلے جامعہ طبیہ جے پور کے پرنسپل رہے اب تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ دھیمی طبیعت، نرم مزاج، دھیمی رفتار، نرم گفتار کے آدمی ہیں، اللہ اُنھیں عمرِ دراز نصیب کرے۔

رہوں گا، اگر خط لکھنا ہو تو اوائلِ رمضان میں لکھیں۔

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ سے سلام مسنون کہہ دیں۔

والسلام

منت اللہ

دارالعلوم ندوۃ العلما میں تدریس کے دوران بھی مولاناؒ سے، وہاں کی مجلس منتظمہ کے جلسوں اور دیگر تقریبات میں شرکت کے لیے اُن کی آمد کے موقع سے، کئی بار ملاقات ہوئی اور اُن سے تعلق وعقیدت میں اِضافہ ہوا۔ اُن کے صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ، جو اَب اُن کے جانشین اور سجّادہ نشین خانقاہ رحمانی مونگیر ہیں، اُن کا ایک گراں قدر مضمون ''اجتہاد'' کے موضوع پر، عربی میں ترجمہ کے لیے، اِس ناچیز کے پاس لے کر دارالعلوم ندوۃ العلما تشریف لائے، راقم نے استطاعت کے مطابق اُس کا اچھے سے اچھا ترجمہ کرنے کی کوشش کی اور مکمل کر کے، اُنھیں بھیجا تو اُنھوں نے حد درجہ پسند فرمایا، بہت دعائیں دیں اور اپنے مکتوب میں اُس کا شکریہ ادا کیا، افسوس ہے کہ اُن کے سارے خطوط میرے پاس محفوظ نہیں رہ سکے۔ اِس تقریب کی وجہ سے مولانا ولی رحمانی مدظلہ سے بھی گہرا تعلق قائم ہو گیا، اُس کے بعد وہ جب بھی دارالعلوم ندوۃ العلما آتے تو ناچیز ہی کے پاس اکثر قیام فرماتے۔

ہمارے شمالی بہار کے وسیع ترخطّے کے عظیم داعی وشیخ مولانا بشارت کریمؒ (۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷-۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء) کے نبیرہ مولوی مظہر الحق کریمی (۱) کے داخلے کے تعلق سے بھی امیر شریعتؒ نے اِس ناچیز کو بڑے اعتماد کے ساتھ، اُن کے لیے جو کچھ ہو سکتا تھا، کرنے کا حکم فرمایا، اُس سلسلے میں یہ مکتوب اِرسال فرمایا:

منت اللہ رحمانی

امیر شریعت بہار واڑیسہ

---

(۱) دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد، وہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ سے فارغ ہوئے اور وہیں استاذ مُقرَّر ہوئے۔

خانقاہ رحمانی، مونگیر

عزیز گرامی قدر مولانا عالم صاحب امینی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔ میں آپ کو حصولِ ثواب کا ایک موقع دینا چاہتا ہوں: حضرت مولانا بشارت کریم رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے: مولوی مظہر الحق سلمہ اللہ فاضل دیوبند، تخصص فی الادب میں داخلے کے لیے ندوہ جارہے ہیں۔ اِس تعارف کے بعد اب عزیز موصوف آپ کے لیے اجنبی نہ ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ داخلہ اور کمرہ وغیرہ ملنے تک اُنھیں اپنا مہمان رکھیں گے، اور جو سہولتیں آپ بہم پہنچاسکتے ہوں، پہنچائیں گے۔

والسلام

منت اللہ

۱۹۷۹ء کے اواخر میں، فقیہ العصر مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (۱) کے حکم پر، میں نے عربی زبان میں امارتِ شرعیہ کے تعارف میں ایک دراز نفس مقالہ لکھا، جسے کچھ ہی دنوں بعد امارت والوں نے "خِدْمَةٌ دِينِيَّةٌ عَظِيمَةٌ" کے عنوان سے مستقل رسالے کی شکل میں شائع کیا، اُس تحریر پر مولانا مجاہد الاسلامؒ اپنے گراں قدر تأثرات کا اِظہار ایک سے زائد خط میں طباعت سے قبل اور طباعت کے بعد، کرچکے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد حضرت مولانا رحمانیؒ کا مندرجۂ ذیل خط باعثِ سرفرازی ہوا، جو گویا ایک اہلِ نظر اور عظیم اہلِ علم کی ایک طالب علم کے لیے قیمتی سند ہے۔ مولانا نے گرامی نامہ میں اِصرار کے ساتھ مونگیر آنے کی دعوت دی تھی؛ لیکن افسوس کہ اپنی مشغولیات کی وجہ سے نہ اُس وقت مونگیر جاسکا اور نہ اس کے بعد کبھی اِس کا موقع ملا۔

"عزیز مکرم! وَفَّقَكُمُ اللّٰهُ لِمَا يُحِبُّ وَيَرْضٰى"، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

(۱) متوفی شب ۲۰-۲۱/محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۴-۵/اپریل ۲۰۰۲ء۔

وبرکاتہ، خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں، ابھی ابھی مولوی ولی سلمہٗ نے "خِدْمَةٌ دِيْنِيَّةٌ عَظِيْمَةٌ" کا ایک نسخہ مجھے بھی دیا۔ تحریر بلند اور طباعت ناقص ہے، جو اِس دور کے لیے مناسب نہیں۔ بہ ہر حال اِس تحریر کے سامنے آتے ہی آپ یاد آ گئے اور آپ کا وعدہ مونگیر آنے سے متعلق بھی یاد آ گیا۔ آپ ۲۴؍ جون کی شام تک مونگیر آئیں، اِن شاء اللہ میں بھی رہوں گا اور ولی سلمہٗ بھی، ٹریننگ کیمپ بھی چل رہا ہوگا۔ اگر ۲۴؍ کو نہ آسکیں تو ۲۵-۲۶؍ کو ضرور آئیں۔ مجھے یقین ہے کہ اِس میں آپ تخلّف نہ کریں گے۔ میں آپ کا منتظر رہوں گا"۔

والسلام

منت اللہ

۱۶؍ جون ۱۹۸۰ء

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر

دار العلوم دیو بند کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا سے کثرت سے ملنے اور اُن کی ذہانت اور علم وفکر سے حسبِ ظرف خوشہ چینی کا موقع ملا —— دار العلوم دیو بند سے مولانا کو چوں کہ غیر معمولی محبت تھی اور وہ اُس کی ترقی و بہبود کے لیے ایک ہوش منداور سپوت فرزند کی حیثیت سے کوشاں اور فکر مند رہا کرتے تھے؛ اِس لیے شوریٰ کے اِجلاس سے عموماً دو ایک روز قبل دیو بند تشریف لے آتے اور تین روزہ اجلاس کے ایک دو روز بعد تشریف لے جاتے۔ مولاناؒ کی رائے اور مشورے کو فکرِ رسا پر مبنی ہونے کی وجہ سے، دار العلوم کی شوریٰ میں بڑی اہمیّت دی جاتی تھی۔ سال میں دو مرتبہ شوریٰ کے اِجلاس اور دیگر تقریبات کے مواقع سے مولانا کے کئی روزہ قیامِ دار العلوم سے طلبۂ دار العلوم کو مستفیض ہونے کا سنہرا موقع ہاتھ آجایا کرتا تھا۔

دار العلوم میں میرے چند رُفقا کی ایک جماعت تھی، خیالات ورجحانات کی

یکسانیّت اور زبان وادب سے مناسبت کے قدرِ اشتراک نے ہم لوگوں میں ایسا تعلّقِ خاطر پیدا کر دیا تھا، جسے اِن شاءاللہ موت ہی ختم کر سکتی ہے۔ ہماری اِس جماعت کے سربراہ اردو زبان کے ممتاز اور صاحبِ طرز اہلِ قلم اور دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے بانی وسرپرست برادرِ معظم مولانا محمد رضوان القاسمی (۱) تھے۔ اِس کے ممبران میں اردو کے فطری شاعر وادیب و اِنسان ودنیا وزندگی کا بصیرت مندانہ تجربہ رکھنے والے حافظ قاری شبّیر احمد دربھنگوی مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھروارہ، ضلع دربھنگہ؛ ممتاز عربی داں وعربی اِنشاپرداز برادرِ محترم مولانا بدرالحسن قاسمی (حال مقیم کویت) زمیلِ مکرم مولانا حافظ ابرار احمد دربھنگوی (امام وخطیب جامع مسجد لہریا سرائے دربھنگہ) اور حافظ دستگیر احمد قاسمی جالوی دربھنگوی وغیرہ تھے۔

ہماری یہ جماعت مولاناؒ کے قیامِ دیوبند کو بہ طورِ خاص غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی تھی۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کے ساتھ اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد حسین بہاری استاذ دارالعلوم (۲) اور حضرت مولانا مفتی ظفیرالدین صاحب مفتاحی مفتی دارالعلوم (۳) بھی مہمان خانہ میں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے میں تشریف لے آتے، تو مجلس اور بھی مفید اور پرلطف ہو جاتی۔

تربیتِ فکر وآگہی

کسی اِنسان کی قیمت، اُس کے حسب ونسب کی بہ جائے، اُس کی اپنی لیاقت اور

(۱) متوفی دوشنبہ ڈھائی بجے سہ پہر ۲۵؍شعبان ۱۴۲۵ھ مطابق ۱۱؍اکتوبر ۲۰۰۴ء۔

(۲) متوفی ۶؍رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲؍جنوری ۱۹۹۲ء۔

(۳) اور اب بہ وقتِ تیاری کتاب برائے اشاعت در اپریل ۲۰۱۰ء مطابق ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ (سابق مفتی دارالعلوم دیوبند) اِس لیے کہ شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق اگست ۲۰۰۸ء میں بیماری اور بڑھاپے کے بڑھتے ہوئے عوارض کی وجہ سے مستعفی ہو کر اپنے وطن ''پورانوڈیہا''، ضلع دربھنگہ تشریف لے گئے۔

جوہر سے متعیّن کی جاتی ہے۔ مولانا کی یہ سعادت وعظمت تھی کہ وہ الحمد للہ دونوں پہلوؤں سے بڑے تھے، علم وفضل وتقویٰ میں مولانا کو جو مقام حاصل تھا، وہ محتاجِ تعارف نہیں، دوسری طرف وہ عظیم ترین باپ یعنی بانی ندوۃ العلما حضرت مولانا محمد علی مونگیری (متوفی ۱۳۴۶ھ = ۱۹۲۷ء) خلیفۂ خاص حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی (متوفی ۱۳۱۳ھ) کے فرزندِ ارجمند تھے۔ وہ اِسی علمی ودینی گھرانے میں ۹؍ جمادی الاخری ۱۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مونگیر وحیدرآباد میں حاصل کرنے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلما میں داخل ہوئے، جہاں چار سال تک زیرِ تعلیم رہ کر وہاں کے باکمال اساتذہ سے مستفیض ہوئے، ۱۳۴۹ھ میں ایشیا کی عظیم وقدیم ورجال ساز درس گاہ ودانش گاہ دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ وہاں اُنھوں نے صاحبِ عزیمت مجاہد وشیخ ومحدث مولانا سید حسین احمد مدنی (متوفی ۱۳۷۷ھ = ۱۹۵۷ء) آخری دور میں برِصغیر کے جلیل القدر عالم مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم الباکستانی الکراچوی (متوفی ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء) عالمِ باعمل مولانا سید اصغر حسین دیوبندی (متوفی ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۴ء) جیسے یگانۂ روزگار علما سے اکتسابِ علم وآگہی کی۔ دیوبند میں زمانۂ طالب علمی میں اُنھوں نے جدوجہد آزادیِ ہند میں حصہ لیا اور سہارنپور میں اِس کی وجہ سے گرفتار بھی ہوئے۔

۱۹۳۵ء میں جمعیۃ علماے بہار کے ناظم عمومی منتخب ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ہی ابوالمحاسن مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک پارٹی تشکیل دی اور مولانا کو اُس کا ممبر نامزد کیا، اِسی جماعت کے نمایندے کی حیثیت سے وہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء میں بہار قانون ساز اسمبلی کے سہرسہ سے ممبر چنے گئے۔ ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کی سجادہ نشینی کے خلعتِ فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۷۴ھ = ۱۹۵۵ء میں مادرِ علمی دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے ممبر منتخب ہوئے اور تادمِ حیات، اِس عہدے پر فائز رہے اور دار العلوم کو اپنے قیمتی مشوروں، طویل تجربوں اور روشن افکار وخیالات سے فائدہ پہنچا کر اپنا دامنِ اجر وسعادت بھرتے رہے۔ ۱۳۷۶ھ = ۱۹۵۷ء میں امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ کے چوتھے

امیرِ شریعت کا منصبِ جلیل سپرد کیا گیا۔ امارتِ شرعیہ کو ابوالمحاسن مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۲۶ء میں قائم کیا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں مولانا نے جامعہ رحمانی کو از سرِ نو زندہ کیا۔ اس کی بنیاد خود حضرت مولانا مونگیریؒ نے اپنے دستِ اقدس سے رکھی تھی۔ مولاناؒ نے اپنی نتیجہ خیز صلاحیت و ذہانت و مساعی سے اُسے ہندوستان کا ممتاز ادارہ اور بہار کا بڑا مدرسہ بنا دیا تھا۔ ۱۳۸۳ھ = ۱۹۶۴ء میں اُنھوں نے قاہرہ میں منعقد ہونے والی اِسلامی کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمایندگی کی۔ واپسی پر سفر کی روداد بھی قلم بند کی، اسی طرح پہلی بار جب حج و زیارت کی سعادتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوے، تو ہندوستان واپس آ کر سفر نامۂ حج مرتب فرمایا۔ مُتعَدّد عربی اور اسلامی ملکوں میں منعقدہ کانفرنسوں اور مجالسِ علمیہ میں شرکت کی اور ہر جگہ اپنی ذہانت و فراست اور علم و تجربہ کا نقشِ لافانی ثبت کیا۔

نظرِ کیمیا اثر کی کرشمہ سازی

ہندوستان کے جن علما و قائدین کو ہمیں دیکھنے، برتنے، جینے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے، اُن میں متعدد حضرات کو ہم نے پایا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اِس بات کے کوشاں نظر آئے کہ ''قد آوروں'' کے قد تراش دیں؛ تا کہ وہ منفرد ''قد آور'' رہ جائیں اور سارے ''بڑوں'' کو کسی طرح نگل کر تنہا ''بڑے'' رہیں؛ اِس لیے وہ علما جو بہ ذاتِ خود ''بڑے'' ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے ''بڑے'' بن جانے یا ''بڑا'' بنے رہنے کو نہ صرف یہ کہ گوارا کر لینے کا ظرف رکھتے ہیں؛ بل کہ ''چھوٹوں'' کو بڑا بنانے کی صلاحیت رکھتے اور بڑا بنا دینے کے لیے اپنی ممکنہ صلاحیتوں اور ذرائع کا کشادہ نفسی و سلیقہ مندی سے استعمال کر کے، ایسے رجالِ کار اور جانشینِ باکمال پیدا کر جاتے ہیں، جو اُن کے بعد لیاقت کے ساتھ اُن کی قائم مقامی کرتے، اُن کے چھیڑے ہوے کاموں اور چھوڑے ہوے مشن کو پایۂ تکمیل پہنچاتے اور اُن کی دکھائی راہ پر پورے اعتماد و بصیرت کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف محوِ سفر رہتے ہیں؛ درحقیقت یہی بڑے علما و قائدین کہلانے کا حق

رکھتے ہیں اور اِنھی کی قسم کے علما و مشائخ اِس لائق ہیں کہ اُن کی عظمت کی چوکھٹ پر قدردانوں کی جبینِ نیاز و سپاس خم ہو کہ یہی لوگ درحقیقت راہِ سلف کے مسافر اور اُن عظماے اسلام کے نقشِ پا پر چلنے والے ہیں، جنھوں نے علم و معرفت، فکر و نظر، رشد و ہدایت اور زہد و قناعت کے ایسے بلند مینارے تعمیر کیے، جن کی روشنی میں قافلۂ بشر، شاہ راہِ صواب پر صدیوں سے بغیر بھٹکے ہوے سفر کرتا آرہا ہے۔ رحمہم اللہ

مولانا رحمانیؒ اُنھی خوش نصیب علما میں تھے۔ مولاناؒ نے علم و فکر و عمل کے میدان کے "مسافرانِ نو" یا "سپاہِ تازہ" کو اُن کے ذوق و رجحان کے مطابق کام میں لگا کر، اُن کی صلاحیتوں کو اِس طرح مہمیز کیا کہ وہ اُن کی زندگی میں "بڑے" ہونے کی سند عوام و خواص کی زبانِ حال و اعترافِ قال سے حاصل کرلی۔ میں اُن میں سے صرف تین آدمی کا اِس وقت نام لے سکتا ہوں۔ یعنی امارتِ شرعیّہ بہار و اڑیسہ کے قاضی القضاۃ، برِّ صغیر کے فقیہِ وقت اور دارالعلوم دیوبند کے لائقِ نازش و افتخار فاضل مولانا مجاہد الاسلام قاسمی؛ خادمِ ملّت اور امارتِ شرعیہ کے بارِ گراں کو اپنی دوش پر، لیاقت کے ساتھ کسی اکتاہٹ، تھکاوٹ یا شکایت کے بغیر مسلسل اُٹھائے رہنے والے مولانا سید نظام الدین اور ہر مجلس میں اپنی ذہانت، سوجھ بوجھ اور ہنر مندی کا سکّہ جما دینے والے مولانا رحمانیؒ کے پسرِ خوش خصال مولانا سیّد محمد ولی رحمانی

نو واردِ مئے خانہ تھا، ساقی نے یہ کیا کر دیا
پینے والے کہہ اٹھے "یا پیرِ مے خانہ" مجھے

میں اِن سطروں میں مولانا رحمانی کو برِّ صغیر کا سب سے بڑا اور عدیم المثال عالم نہیں کہنا چاہتا؛ لیکن مجھے یہ کہنے دیجیے کہ مولانا کو قسّامِ ازل نے جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں، اُن میں اُن کے معاصرین و رفقاے کار علما میں کوئی اُن کا شریک نہ تھا۔ کہ

توفیق باندازۂ ہمّت ہے ازل سے

خداے حکیم ہر ایک کو دین و دنیا سے متعلق سرگرمیوں کی ایک الگ توفیق سے نوازتا

ہے اور علم و فضل میں سے ہر ایک کا حصّہ اپنے اندازے سے متعین کرتا ہے۔ از آدم تا ایں دم انسانوں سے متعلق اُس کی یہی سنّت رہی ہے، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (خدا کی سنت تبدیل نہیں ہوا کرتی)۔

خدا اُن کو، اُن کے اعمال کی بہترین جزا دے اور اُنھیں جنت الفردوس کا مکیں بنائے۔(*)

سوانحی خاکہ

❁ ولادت: ۹؍جمادی الاخری ۱۳۳۲ھ مطابق ۷؍اپریل ۱۹۱۴ء

❁ جاے پیدائش: خانقاہ رحمانی مونگیر

❁ والد ماجد: حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء=۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء)

❁ ابتدائی تعلیم: قرآن پاک ناظرہ اور ابتدائی عربی و فارسی کتابیں وطن میں پڑھیں، اس کے بعد عربی صرف و نحو و منطق کی کتابیں حیدر آباد میں ۱۱؍سال کی عمر میں مولانا مفتی عبداللطیفؒ متوفی ۱۳۷۹ھ سے پڑھیں، اُن کی خدمت میں ایک سال قیام فرمایا۔

❁ متوسط تعلیم: ۴ سال تک دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔

❁ اعلیٰ تعلیم: دارالعلوم دیوبند، ۱۳۴۹ھ میں داخل ہوے اور ۱۳۵۲ھ میں تکمیل علومِ عالیہ سے فارغ ہوے۔ آپ نے بخاری شریف شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی۔

آپ نے متعدد کتابیں اور رسالے تالیف فرمائے، بالخصوص فقہی اور مسلمانوں کے پرسنل لا کے موضوعات پر، آپ کا اردو اسلوب پختہ، سادہ اور دلکش تھا، آپ کی تالیف ''سفرنامۂ مصر و حجاز'' کو بڑی شہرت ملی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ انگریزی سے واقفیت رکھتے تھے۔ تقریر و تحریر دونوں پر یکساں قدرت تھی، اُنھوں نے جامعہ رحمانی کا از سرِ نو اجرا فرمایا اور اس کو بہت ترقی دی، اُن کی زندگی میں یہ بہار کا بہت مشہور

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۲۱-۲۲، جلد ۱۴، ۲۷؍ذی الحجہ ۱۴۱۱ھ و ۱۲؍محرم ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۰-۲۵؍جولائی ۱۹۹۱ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود، جو اخبار مشرق کلکتہ اور ملک کے مختلف اخبارات و رسالوں میں شائع ہوئی۔

مدرسہ بن گیا تھا۔

امارتِ شرعیہ کو، آپ کی امارت کے زمانے میں، ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی اور ملک میں متعدد جگہ شاخیں قائم ہوئیں، بالخصوص بہار واڑیسہ میں۔

❁ **عہدے ومناصب:** ۱۳۵۵ھ میں آپ بہار اسمبلی کے رکن منتخب ہوے، ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین بنائے گئے، ۱۳۷۴ھ میں دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن منتخب ہوے اور تاحیات رکن رہے۔ ۱۳۷۶ھ میں اُنھیں بہار واڑیسہ (بہار اب دوصوبوں میں بہار اور جھارکھنڈ میں تقسیم ہو چکا ہے) کا امیر شریعت منتخب کیا گیا۔ ۱۳۸۳ھ=۱۹۶۴ء میں موتمر اسلامی قاہرہ میں ہندوستان کے نمایندے کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے محرک اور شروع سے اُس کے تاحیات جنرل سکریٹری رہے۔

مولانا رحمانی ملک کے چیدہ عالم وقائد تھے، اُن کی ذہانت، اِصابتِ رائے، قوتِ فیصلہ؛ ہر مجلس میں اُن کی پہچان تھی۔



حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ

ایک استاذ، ایک تاریخ

۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء — ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری؟

۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۷ء میں، مَیں دار العلوم دیوبند میں بہ حیثیت طالب علم داخل ہوا، گو میں ایشیا کی اِس عظیم دانش گاہ کے اُن اساتذہ کے سلسلۃ الذہب کو دیکھنے سے محروم رہا جو اپنے علم و فضل وتقوی میں یگانۂ روزگار تھے؛ لیکن عظیم سلف کے مُتعَدِّد اُن جانشینوں کو دیکھنے، اُن سے پڑھنے اور اُن کی کیمیا نظری سے حسبِ توفیق، اکتسابِ فیض کرنے کی سعادت ملی، جو اُن کے علم وصلاح، اِیثار وقربانی اور تعلیم وتربیت کے میدان میں انفرادیت کے بڑی حد تک امین تھے۔ جن میں سرِ فہرست دار العلوم کے مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب (وفات ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب (وفات ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء) مولانا فخر الحسن صاحب مرادآبادی (وفات ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء) مولانا مبارک علی صاحب نائب مہتمم (وفات ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) اور نائب مہتمم اور بعد میں صدر مدرس حضرت مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی کا نام لیا جاسکتا ہے، جو یک شبنہ ۷/۲/۱۴۱۲ھ مطابق ۱۸/۸/ ۱۹۹۱ء کو سوا دس بجے دن میں ربِّ کریم کے حضور پہنچ کر ہزاروں دلوں کو رنجور اور ہزاروں آنکھوں کو اشکبار کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ایک اصول پسند اِنسان

داخلہ کے بعد دار العلوم میں چند ہی ہفتے گزرے ہوں گے کہ طلبہ سے اختلاط، دار العلوم کے نظام کار سے واقفیت، اساتذہ سے دید وشنید اور دفاتر سے سابقہ پڑتے ہی مولانا معراج الحق صاحب کو اچھی طرح پہچان گیا۔ مولانا دار العلوم کے نظام وقانون کی پامالی کرنے والوں کے تئیں سخت گیری، اور دار العلوم کے لائحۂ عمل کی تصریحات ودفعات کو دیانت دارانہ طور پر نافذ کرنے کی پابندی کے لیے؛ اُس وقت مشہور تھے۔ چناں چہ سارا دار العلوم اُن کی اُصول پسندی کا قائل تھا۔ کسی ''بڑے باہمت'' آدمی کے علاوہ کسی کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ وہ اُصول وضوابط کی خلاف ورزی کرے۔ مولانا دار العلوم کے چپے چپے میں اُصول وضوابط کی عمل داری کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ اُس وقت مجھے اپنی ناتجربہ کاری کے باوجود اِس کا خوب اندازہ ہوا کہ ایک اُصول پسند شخص، جس کو اپنی ذمے داری کا مطلوبہ اِحساس، اپنے ماتحتوں کی داروگیر پر مجبور کرتا ہو، عموماً اپنے زیرِ دستوں میں مبغوض نہیں تو محبوب بھی نہیں ہوسکتا؛ اِس لیے کہ اِنسانی نفس بڑا سرکش واقع ہوا ہے، وہ لامحدود آزادی اور سارے گوشہ ہاے حیات میں تمام قسم کی پابندیوں اور جکڑ بندیوں سے آزاد رہنے کا دل دادہ ہے؛ اِسی لیے اُس کو بدی سے عموماً رغبت اور نیکی سے عموماً نفرت رہا کرتی ہے۔

چناں چہ مولانا اُس وقت سہولت پسندوں ''حالات کی رعایت'' اور ''حقیقتِ حال سے مصالحت'' پر ایمان رکھنے والوں کی ناوک فگنی کا نشانہ تھے۔ مولانا کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اُس سطح پر اپنے آپ کو اُتار لیں، جس پر مذکورہ قسم کے لوگ اُنھیں دیکھنا چاہتے تھے: اِس لیے کہ وہ خودی، خودداری اور خود اِرادی سے سرفراز، اُن عظیم انسانوں میں سے تھے جو شب کے سناٹے میں (جب انسان کے ساتھ اُس کی ذات اور اُس کے خدا کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا) بھی کسی خلافِ مروّت وشرافت عمل سے، گریزاں رہا کرتے ہیں۔

مادرِ علمی سے مثالی وفاداری

مولاناؒ کی اُصول پسندی میرے علم وتجربہ میں، اوّلاً اُن کی طبعِ سلیم کا فیضان تھی، چناں چہ اِس کی جلوہ گری تمام کارہاے حیات میں نمایاں تھی، اور ثانیاً دار العلوم کے سلسلے میں اُن کی غیر معمولی عقیدت ومحبت اور اپنے منصب کے حوالے سے مکمل اِحساسِ ذمے داری کا نتیجہ تھی۔ دار العلوم کے لیے اُن کی عقیدت ومحبت کا سرچشمہ اُن کے وہ اساتذہٗ گرامی تھے، جو علم وفضل کے آفتاب وماہ تاب تھے۔ عقیدت ومحبت نے ہی اُنھیں کم وبیش پچاس سال تک مادرِ علمی کی خدمت کی سعادت کے حصول کے لیے صبر وشکر کے ساتھ سرِ گرم عمل رہنے پر مجبور رکھا۔ اِس طویل عرصے میں حالات کی استواری وناہمواری کی دھوپ چھاؤں سے بھی وہ گزرے؛ لیکن دار العلوم سے اُن کی وابستگی ووفاداری میں کوئی فرق نہیں آیا ـــــ حسّاس قلب وجگر رکھنے کے باوجود!

میں، مولاناؒ سے کسی درسی کتاب کے باقاعدہ پڑھنے کی سعادت تو حاصل نہیں کرسکا؛ لیکن دار العلوم اور دار العلوم سے باہر میں نے، جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اُن میں سے سب یا اکثر مولانا کے شاگرد تھے اور طالبِ علمی میں، دار العلوم کے طلبہ سے جو مولاناؒ کے پاس آتے جاتے، یا اُن کی خدمت میں رہا کرتے تھے، اُن کے متعلق جو کچھ سنتا تھا اُس سے میرے دل میں اُن کی عظمت ورفعت کا اِحساس اور اُن کے لیے احترام وعقیدت کا جذبہٗ بے پناہ پیدا ہوگیا تھا۔ طلبہ اُن کے شمائل وخصائل، اُن کی تدریسی مہارت، بالغ نظری اور بلند خیالی کا لذّت وعقیدت کے ساتھ تذکرہ کیا کرتے تھے۔

باصلاحیت منتظم

پچاس سال کا طویل عرصہ، اُنھوں نے مادرِ علمی کی چہار دیواری میں گزارا، تدریس کے ساتھ ساتھ، وقفے وقفے سے وہ مختلف انتظامی صیغوں سے بھی وابستہ رہے۔ کبھی

ناظمِ دارالاقامہ کبھی نائب مہتمم اور کبھی بہ حیثیت صدر مدرس؛ اِس لیے دارالعلوم کے گوشے گوشے میں اُن کے فکر و عمل کے لازوال نقوش نمایاں ہیں۔ اُنھوں نے تعلیمی اور انتظامی شعبوں میں بہت سی مفید اور کارآمد اِصلاحات کیں، جن سے دارالعلوم کے نظامِ تعلیم و تربیت کو زیادہ نتیجہ خیز اور انتظامی ڈھانچوں کو زیادہ کارگر بنانے میں مدد ملی۔ دارالعلوم کا موجودہ نظامِ امتحان ہر چند کہ شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اِعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کاوشِ فکر کا نتیجہ ہے؛ لیکن اُس کا بانکپن اور نوک پلک کی نزاکت، مولاناؒ کی دقتِ نظر کا کرشمہ ہے۔ ہماری طالبِ علمی میں یہاں درجہ بندی نہیں تھی، مولاناؒ نے ہی درجہ بندی کی تحریک کی اور اُسے عملی طور پر برپا کرنے کے لیے، سن رسیدگی کے باوجود، اپنی محنت و توانائی کا بہت بڑا حصہ صرف کیا۔

باکمال مدرس

دارالعلوم اور برِّ صغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش میں، دارالعلوم کی طرز کے ہزاروں مدرسوں میں پڑھائے جانے والے، تقریباً سارے مضامین پر مولانا کو قابلِ ذکر دست رس حاصل تھا؛ لیکن چوں کہ وہ شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ کے خصوصی شاگردوں میں تھے اور اُن کی تعلیم و تربیت کا اثر اُنھوں نے گہرائی سے جذب کیا تھا؛ اِس لیے اُن پر فقہ و ادب کا رنگ شوخ تھا۔ دیوانِ حماسہ اور ہدایہ اخیرین زمانۂ تدریس کے اوائل سے اُن کی وفات تک، تقریباً ہر سال اُن کے زیرِ درس رہیں۔ اول الذکر کے اکثر اشعار مولاناؒ کو ازبر تھے۔ حماسی شعراء کے حالات، مختلف قصیدوں کا پس منظر، اشعار میں ذکر شدہ جگہوں کا جغرافیائی تناظر، اُن کے الفاظ و تعبیرات کے معنی و مفہوم کی سرگذشت اور اخلاقی، اجتماعی پہلو والے اشعار جو سیرت سازی میں معین ہو سکتے ہیں، مولاناؒ کو خوب یاد تھے، اور اُنھیں برموقع سنایا کرتے تھے۔ ثانی الذکر کتاب، اُس کے مضمون اور متعلقہ فن پر مولاناؒ کے عبور کی غمازی کے لیے صرف یہ بتانا کافی ہے کہ ہماری طالبِ علمی میں،

طلبہ اُنھیں ''صاحبِ ہدایہ'' کہا کرتے تھے اور اُن کے اِس سبق میں طلبہ جس ذوق و شوق سے جاتے تھے، اُس کی مثال اب شاید و باید ہی ملے گی۔

مولاناؒ کے درس کی مقبولیت کا راز ایک طرف علم و فن میں غایت درجہ کمال میں پنہاں ہے، تو دوسری طرف اُن کے حسنِ بیان اور دل رُبا طریقۂ تدریس میں، جس کی وجہ سے طلبہ نہایت آسانی سے، اُن کے مضمون کو ہضم اور یاد کرلیا کرتے تھے۔ وہ درس میں بے جا تفصیل، دراز بیانی، سمع خراش شور اور درس کی رونق و رعنائی میں اِضافے کی خاطر بلا ضرورت طنز و مزاح کا سہارا لینے کے قائل تھے نہ عامل اور اب تو مدارس کے ماحول میں اِس عنصر کی فراوانی اور مقبولیت فزوں تر ہے۔ مولاناؒ اُن نابغۂ روزگار اساتذہ کے ہونہار شاگرد تھے، جو تفہیم درس میں اختصار و سہولت سے کام لے کر نفسِ مسئلہ کو، طلبہ کے ذہن میں اتار دینے میں چابک دست تھے اور بہ جائے خود سب کچھ کہنے کے، طلبہ کو محنت، جاں فشانی، استخراجِ مسائل، اور دقّتِ نظر سے کام لینے کا خوگر بنا دینے کی مہارت رکھتے تھے۔ اِسی لیے اُن کے شاگرد اپنی اپنی جگہ جبلِ علم ہوا کرتے تھے۔

محبوبیت و عقیدت کا خراج

انسان، جس درجہ دوسروں کے لیے نفع بخش ہوتا ہے، اُسی درجہ وہ مخلوق میں محبوب ہوتا ہے۔ مولاناؒ کی طلبہ و اساتذہ میں غایت درجہ محبوبیت، اُن کی وفات کی خبر کے دار العلوم میں پھیلتے ہی دیکھنے میں آئی، جب سارے طلبہ و اساتذہ مغموم چہروں اور اشک آلود آنکھوں کے ساتھ، اُن کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے اور جنازہ اٹھنے اور اُن کی تدفین کے وقت تک اُن کے دیدار کے لیے، نہ ختم ہونے والے تسلسل کے ساتھ آتے رہے، سارا دار العلوم سوگ وار اور آنکھیں، خوں بار نظر آرہی تھیں۔ جنازہ کو قبرستان تک جس شوق و عقیدت کے ساتھ طلبہ و اساتذہ کا جمِ غفیر لے گیا، وہ منظر بھی دیدنی تھا۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ۔

مولاناؒ نے شادی نہیں کی اور نہ اُن کے اولاد تھی، جو اُن کی محبت کو تقسیم کرسکتی، یا اُن کی توجہات اور اوقاتِ زندگی کا قیمتی حصہ مشغول کرلیتی۔ اُن کا جذبۂ محبت محفوظ، اُن کی دل چسپیاں صحیح سلامت اور اُن کے اوقاتِ زیست خالی تھے۔ اُنھوں نے سلیقہ سے اپنے اوقات اور دلچسپیوں کو اپنی محبوب جامعہ کی خدمت میں صرف کیا۔ طلبہ کو علم وآگہی سے، اَساتذہ کو فکرونظر اور مشورہ سے اور ملازمین کو نصیحت وراہ نمائی سے فائدہ پہنچایا اور اپنی تمام محفوظ توانائیوں کو دارالعلوم کی رفتارِ ترقی کو تیز تر کرنے اور بزرگوں کے حسین خوابوں کی خوب صورت تعبیر برآمد کرنے کے لیے صرف کردیں۔

مہرِ مادری اور شفقتِ پدری

اگر یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے ذخیرۂ محبت کو، اپنے پاس والوں میں صرف کیے بغیر زندگی نہیں جی سکتا، تو یہ ایک حقیقت ہے کہ مولاناؒ نے اپنی محبت وشفقت کا مرکز طلبۂ دارالعلوم کو بنایا، خصوصاً اُن طلبہ کو جو اُن سے استفادے کی خاطر اُن سے زیادہ مربوط رہے۔ اُن طلبہ نے بہت سی دفعہ اُن کی شفقت ومحبت کے ایسے مظاہر دیکھے، جن کے سامنے شفقتِ پدری اور مہرِ مادری ہیچ محسوس ہوئی اور جن سے اُن کی اُس سخت گیری کی تکذیب ہوجاتی ہے، جو سہولت پسندوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ وہ سخت گیر ضرور تھے؛ لیکن یہ سخت گیری درحقیقت مثبت ردِّعمل تھی، دارالعلوم، اُس کے اساتذہ، اُس کے طلبہ، اُس کے ملازمین اور اُس کی تاریخ اور اُس کے روشن دل وروشن فکر بانیوں سے سچی محبت کا۔ وہ دارالعلوم کو دیگر صاحبِ بصیرت فضلاے دارالعلوم کی طرح، اسلام اور اسلامی دعوت وفکر کا مضبوط قلعہ اور قدرتِ الٰہی کے بعد اِس دیار میں (حکومتِ مغلیہ کے زوال کے بعد) اسلامی وجود کی بقا کا ذریعہ بننے والے اِیمانی دستوں کا ہراول سمجھتے تھے۔ چناں چہ وہ اپنے اساتذۂ گرامی کی طرح، کسی ایسی کوتاہی کو برداشت کرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے جو دارالعلوم کی بخششی صلاحیت کو دیر یا سویر مجروح کرسکتی تھی؛ اِس

لیے ممکن حد تک ہاتھ کی طاقت، ورنہ زبان کی صلاحیت سے ''مُنکَرْ'' کے ازالے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ ''اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ'' والے درجے یعنی دل میں برا مان کر خاموش رہنے پر، شدید مجبوری کی حالت میں ہی عمل کر پاتے تھے۔

ایک دہائی سے زیادہ دار العلوم سے غیر حاضری کے بعد، جب میں دس گیارہ سال قبل (۱)، دار العلوم میں استاذ اور پندرہ روزہ عربی جریدہ ''الداعی'' کے مدیر کی حیثیت سے دار العلوم واپس آیا، تو مولاناؒ کے متعلق جو سخت گیری مشہور تھی، وہ میں نے اُن میں یکسر مفقود دیکھی۔ طالبِ علمی کے زمانے میں، شاید ہی مولاناؒ کے ہاں بہ راہِ راست آمد و رفت کا کوئی اتفاق ہوا ہو؛ لیکن دورِ تدریسی میں شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا گزرا ہو، جس میں مولاناؒ سے شرفِ ملاقات اور تبادلۂ خیال اور اُن کے پُرسلیقہ دسترخوان پر چائے نوشی کا موقع نہ ملتا رہا ہو؛ اِس لیے اِس دورِ ثانی میں اُن کے خیالات، اُن کی ترجیحات اور اُن کے مزاج کو پڑھنے کا صحیح موقع ملا۔ میں نے مولاناؒ کو نہایت حلیم، کریم، شفیق، مانوس ہو جانے والا اور مانوس کر لینے والا پایا۔ غصہ ہوتے، چڑھتے، اور دھر پکڑ کرتے، میں نے اُنھیں شاید ہی دیکھا اور جانا ہو۔ البتہ آخری چند سالوں میں مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ اُن کو ایک طرح کی وحشت اور تنہائی کا اِحساس دامن گیر ہے، اُس شخص کی طرح جس نے اپنے سارے رفقائے حیات کھو دیے ہوں۔ چناں چہ وہ اساتذۂ دار العلوم، خصوصاً ہم ایسے نوجوان اساتذہ کی ملاقات سے بے حد مانوس و مسرور ہوتے۔ اگر ایک دو ہفتے ہم غیر حاضر ہو جاتے، تو شکوہ کرتے، ہماری طویل نشست کے خواہش مند رہتے، ہماری گفتگو اور علمی، فکری، اور عالمِ اسلامی کے مسائل پر ہم لوگوں کی ہرزہ سرائیوں سے بہت خوش ہوتے اور اپنے تجربات اور پختہ خیالات کی روشنی میں ہمارے خیالات کی تصحیح کرتے۔

(۱) یہ سطریں ۱۴۱۲ھ = ۱۹۹۱ء میں حضرت مولانا معراج الحق کے انتقال کے وقت لکھی گئیں، راقم الحروف دار العلوم دیو بند بہ حیثیت مدیر ''الداعی'' عربی و استاذِ ادب عربی شوال ۱۴۰۲ھ/ اگست ۱۹۸۲ء میں آیا تھا۔

مولاناؒ کا وطن

مولانا معراج الحق بن منشی نور الحق کا وطن خاص ''دیوبند'' ہے جسے خاصانِ خدا اور عالمانِ دین قیم نے، اسلامی قلعہ کی تعمیر کے لیے انتخاب کیا تھا۔ مولاناؒ (۱۹۱۰ء/ ۱۳۲۸ھ) میں دیوبند کے جنوب مغربی سمت کے ایک محلّہ ''بیرون کوٹلہ'' میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی، پھر وہ دار العلوم دیوبند میں درجۂ متوسطات میں ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں داخل ہوئے اور پہلے سال میں مختصر المعانی اور ہدایہ اولین وغیرہ پڑھی، دوسرے سال میں ہدایہ اخیرین، جلالین اور مشکوۃ شریف وغیرہ اور تیسرے سال دورۂ حدیث میں صحاح ستہ اور دیگر کتبِ حدیث پڑھیں اور ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۹۳۲ء میں فارغ ہوئے۔ ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں اُنھوں نے دار العلوم میں مزید ایک سال لگایا اور مختلف علوم وفنون کی امہات الکتب پڑھیں۔ مولاناؒ دار العلوم کے ممتاز طلبہ میں تھے۔ سالانہ امتحان کے نمبرات (جو دار العلوم کی سالانہ روداد میں ریکارڈ ہیں) کے دیکھنے سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسے محنتی اور اپنے وقت کو صحیح مصرف میں استعمال کرنے والے طالب علم تھے۔

مولاناؒ کے لائق اساتذہ

مولانا کے قابلِ ذکر اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (وفات ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دار العلوم دیوبند (وفات ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اِعزاز علی امروہویؒ (وفات ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (وفات ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) مولانا مبارک علی سابق نائب مہتمم دار العلوم (وفات ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) اور مولانا عبد السمیع دیوبندی (وفات ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۶) جیسے آسمانِ علم وفضل ہیں۔

تدریسی سلسلہ

دارالعلوم سے فراغت کے بعد، مولاناؒ نے کئی ایک مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیں، چناں چہ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۹ء کے عرصے میں بمبئی میں زکریا مسجد کے مدرسے میں وہ رہے۔ اِس کے بعد گل برگہ کے ایک مدرسے میں ۱۹۴۱ء تک کام کیا۔ پھر یکم محرم ۱۳۶۲ھ مطابق ۲۹/ دسمبر ۱۹۴۳ء کو دارالعلوم میں بہ حیثیت مدرس اُن کا تقرر ہوا۔ اُنھیں شرحِ وقایہ، شرحِ عقائدِ نسفی، مقاماتِ حریری، شرحِ مائۃ عامل، ہدایۃ النحو، اصول الشاشی اور نورالانوار وغیرہ پڑھانے کو دی گئیں۔ وفات کے وقت دیوان حماسہ، سبع معلقات اور ہدایہ اُن کے زیرِ تدریس تھیں۔ تقریباً پچاس سال کے طویل عرصے میں، اُنھوں نے دارالعلوم کے نصاب میں داخل اکثر کتابوں کو حسن وخوبی سے پڑھایا اور علم وآگہی کا جام لنڈھایا۔ اُنھوں نے حدیث شریف کی متعدد کتابیں بھی پڑھائیں۔ اِسی کے ساتھ ساتھ، اُنھوں نے مختلف انتظامی شعبوں کی ذمہ داریاں لیاقت کے ساتھ نبھائیں۔ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں وہ ناظمِ دارالاقامہ بنائے گئے، شوال ۱۳۸۶ھ مطابق جنوری ۱۹۶۷ء میں وہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے نائب (مہتمم) مقرر ہوئے، اِس منصبِ جلیل پر رجب ۱۳۹۶ھ مطابق جولائی ۱۹۷۶ء تک فائز رہے۔ ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۹۸۲ء سے تاحینِ وفات وہ صدر مدرس رہے۔

خوش نصیب مربی

مولاناؒ نے کسی موضوع پر کوئی تصنیف نہیں چھوڑی؛ لیکن برِّصغیر اور دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے ہزاروں شاگرد چھوڑے ہیں، جن میں علما، مبلغین، مصنفین، فقہا، اَصحابِ اِفتاء اور زندگی کے مختلف زمروں سے متعلق افراد موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک کام یاب مدرس جو باصلاحیت افراد پیدا کرتا اور مطلوبہ رجالِ کار تیار کرجاتا

ہے، وہ بسا اوقات اُن مُصنّفین اور قلم کاروں سے زیادہ لائقِ تحسین اور لائقِ شکر و ثواب ہوا کرتا ہے، جو نفع بخش کتابوں کی شکل میں صدقہ جاریہ چھوڑ جاتے ہیں۔

پس ماندگان

مولانا کے پانچ بھائی تھے، ایک بھائی اُن سے بڑے تھے، باقی سبھی اُن سے چھوٹے تھے۔ ایک بھائی ثناء الحق دہلی ہمدرد دواخانہ میں ملازم تھے، اُن کا مستقل قیام ''گلی قاسم جان'' میں رہا۔ باقی دِگر برادران تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور مولاناؒ کی وفات تک بہ قیدِ حیات تھے، تین بہنیں تھیں۔ اُن میں سے ایک بہن پاکستان میں زندہ تھیں دو بہنیں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

مشہور مؤرخ، مصنف، مدرسہ امینیہ دہلی کے سابق صدر مفتی اور شیخ الحدیث اور علامہ محمد انور شاہ کشمیری (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء) کے خصوصی شاگرد مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلویؒ (متوفی ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء) مولاناؒ کے بہنوئیؒ تھے۔ مولانا محمد میاںؒ کی اولاد بھی مولانا کے برادرِ خُرد ثناء الحق صاحب کے ساتھ ہی عرصے تک گلی قاسم جان دہلی میں مستقل طور پر متوطن رہی۔ راقم الحروف کو مولانا محمد میاں صاحبؒ سے خصوصی تلمذ کا شرف حاصل ہے اور اُن کی بے پناہ عنایتوں اور شفقتوں سے سرفراز رہا ہے۔ مولانا معراج الحق صاحبؒ کو مولانا مرحوم کے ساتھ ناچیز کے اِس تعلق کا بڑا خیال تھا، میرے ساتھ غیر معمولی نوازشوں کا جو معاملہ فرماتے تھے، یقیناً اِس میں اِس احساسِ تعلق کو بڑا دخل تھا۔

حلیہ اور اَطوار و عادات

مولانا خوش وضع، خوش لباس، اور خوش شکل تھے، کچھ سال قبل تک کسی بھی موسم میں کمرے سے باہر، شیروانی اُن کے تن سے شاید ہی جدا ہوتی تھی، اُن کی نستعلیقیت اور

خوش وضعی تمام امورِ زندگی میں نمایاں تھی۔ مولاناؒ کا سراپا کچھ اِس طرح تھا: کتابی چہرہ، سرخ وسپید جسم، اونچی ناک، دراز قد، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، گھنی بھویں، متوازن، سیدھی اور خوب صورت باڈی، سر کا اکثر حصہ گنجا، آواز صاف، کشیدہ قامت ہونے کی وجہ سے لمبا قدا ٹھاتے اور تیز چلتے، ہاتھ میں خوب صورت سی چھڑی رکھتے، راست باز اور صائب الرائے تھے۔ اِرادے کے پختہ، دل کے مضبوط، صاف دل، کم گو، کم خواب اور کم خور تھے، پُر وقار اور پر رعب تھے۔ میں طالبِ علمی کے زمانہ میں اکثر دیکھتا کہ مولانا جس راہ پر دور سے بھی نظر آجاتے، طلبہ اپنا راستہ بدل لیتے تھے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ عصر کی نماز کے بعد، دار العلوم کی مسجد کے جنوبی دَر میں وہ خاص انداز سے کھڑے ہوکر مسجد سے بھیڑ کے نکل جانے کا انتظار کرتے، اُن کے ایک ہاتھ میں جوتے، دوسری میں چھڑی، اور کندھے پر رومال ہوتا۔ طلبہ کو ہمت نہ ہوتی کہ اُن کے آگے سے نکل جائیں، دائیں بائیں سے کٹ کر اور سمٹ کر نکلتے تھے۔ اُن کی سلیقہ مندی اور خوش وضعی کی شہرت کی وجہ سے، ایسے ویسے طلبہ اُن کی خدمت میں آنے جانے، یا خدمت میں رہنے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ سلیقہ مند، باادب، مُہذّب اور خوش نصیب ہی، اِس سعادت سے بہرہ مند ہو پاتے تھے۔

وہ عشا کے بعد فوراً سو جانے اور سحر خیزی کے عادی تھے۔ رات کے آخری حصے میں بیدار اور اپنے معمولات سے فارغ ہوکر، اپنے رب سے مُتوجِّہ ہوتے، فجر کی نماز کے بعد ساتھ رہنے والے طلبہ کے تعاون سے چائے ناشتہ تیار کرتے۔ وہ اپنی خدمت آپ کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ برتن دھونے، چائے یا کھانا اور پان بنانے میں سلیقہ مندی نمایاں ہوتی۔ مولاناؒ اُس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو پان کا خاص اہتمام کرتی تھی، چائے کا ذوق بہت لطیف تھا، چائے کے سلسلے میں یہ ذوقِ لطیف شرفا کا حصہ تھا، اب صرف خال خال علما کے یہاں باقی رہ گیا ہے۔ دار العلوم کے مُتعَدّد اساتذہ اور اور شیوخ کے ہاں چائے کا جو اہتمام ہنوز باقی ہے، اُس کی مثال قہوہ کے ساتھ عربوں کے عشق

سے دی جاسکتی ہے۔ میں کئی ایک عظیم ترین عصری تعلیم گاہوں کے بہت سارے اساتذہ سے ملا ہوں، نیز شعرا، ادبا اور صحافیوں سے سابقہ رہا ہے، اُن کے دستر خوان پر چائے نوشی کا موقع بھی ملتا رہا ہے، میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بالخصوص چائے کے حوالے سے، علما کے طبقے میں، جو ذوقِ عالی اب تک باقی ہے وہ اُن کے ہاں یکسر مفقود ہے۔

عجم کے حسنِ طبیعت کی جلوہ گری

مولاناؒ کو نوادرات اور نفیس اَشیا کے جمع کرنے کا خاص شوق تھا۔ اُن کا کمرہ (جو دار جدید کے جنوبی دروازہ کے اوپر تھا اور عرصۂ دراز سے اُن کا مسکن ہونے کی وجہ سے یہ دروازہ بھی دار العلوم میں ''معراجی گیٹ'' یا ''باب معراج'' سے معروف ہو چکا ہے) مختلف قسم کے سیکڑوں نوادرات سے بھرا ہوتا، ہر چیز اپنی جگہ اِس سلیقے سے رکھی ہوتی جیسے کسی پارک میں طرح طرح کے پھول قرینے سے کیاریوں میں لگے ہوں، ہر پھول، اپنی خوشبو، رنگ اور شوخیِ حسن میں ایک دوسرے سے مختلف۔ مولاناؒ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک ملاقاتی کو سامانوں کا تنوّع، قوس قزح کی رنگینی اور حسنِ امتزاج کے ساتھ، اپنی طرف مائل کر لیتا۔ ایسا لگتا کہ عجم کا حسن طبیعت اور عرب کا سوزِ دروں، کمرے کی ترتیب میں اپنا اثر دکھا گیا ہے۔ لیمپ کی مختلف قسمیں، انگیٹھیوں کے متعدد اقسام، چائے کے طرح طرح کپ، انواع واقسام کی چائے دانیاں، اُن کے والد صاحب کو جہیز میں ملی ہوئی مسہری، خوب صورت قسم کی الماریاں، اعلی درجے کی قابلِ اعتبار کمپنی کی سلائی مشین، کتابوں کی مخصوص ترتیب، سونے کا ایک دو بستر فرشی اور ایک آدھ مسہری پر، قرینے سے بچھی ہوئی چٹائیاں، مختلف سمتوں سے لگے ہوئے پردوں کے ذریعے متعدد خانوں میں تقسیم شدہ اُن کا حجرہ، چھوٹے بڑے کئی عدد گاؤ تکیے اور تکیے، ایک گوشے میں رکھا ہوا فریج، قرینے سے سجے ہوئے برتن، اپنی مخصوص نشت پر رکھا ہوا گیس کا چولھا اور سلنڈر، مولاناؒ کی نشست گاہ کے قریب اور سامنے رکھا ہوا پان دان،

اگال دان، پان کے مسالوں کی چھوٹی سی صینی اور خوب صورت سا سروتا، کپڑے ٹانگنے کی خوش نما کھونٹیاں، شیروانیوں کی مخصوص جگہ اور ہاتھ میں رکھنے کی چھڑی کی خاص وضع۔ بڑے چھوٹے قدرے اونچے اور کم اونچے لکڑی کے پیڑھے، متعدد تپائیاں اور ڈسک، مطالعے کی متعین جگہ اور ایک کونے میں بنا ہوا چھوٹا سا وضوخانہ، کمرے میں مختلف جگہ چھت کی کڑیوں میں بدھی ہوئی لٹکتی ہوئی رسیاں، جن سے آخری سالوں میں ضعف کی زیادتی کے بعد اٹھتے وقت سہارا لیا کرتے تھے اور دیگر وہ بہت ساری اشیا جو میرے خانۂ خیال کی گرفت میں نہیں، مولاناؒ کے کمرے کو ایک خاص قسم کا حسنِ سحر خیز دیتی تھیں۔ مولاناؒ سال چھ مہینے کے بعد سامانوں کی ترتیب اور اُن کی جائے وقوع بدلتے رہتے تھے کہ یک رنگی اور یکسانیت سے وہ اکتا جایا کرتے تھے۔

اُنھیں مرغی، بطخ، کبوتر اور بکری پالنے کا بھی شوق تھا۔ اِدھر کوئی دس بارہ سال سے بکریاں تو نہیں رکھتے تھے؛ لیکن اول الذکر قسم کے پرندے اُن کی وفات کے دل دوز واقعے کے مشاہدہ سے غالباً اِنسانوں کی طرح یا اُن سے زیادہ مغموم تھے۔ کئی ایک بطخ اب تک موجود ہیں۔ میں جب مولاناؒ کے کمرے کے پاس سے گزرتا ہوں، تو کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے اور ان بطخوں کو دیکھ کر مولاناؒ کی یاد تازہ اور زخمِ دل مزید ہرا ہو جاتا ہے۔ ابھی کل یہ کمرہ شفقت و مرحمت، علم و ہنر، فکر و نظر، سلیقۂ وقرینہ، صلابت واِصابت رائے کا گہوارہ تھا اور اِس کے دیوار و در ایک ''رجل رشید'' کی جلوہ گری سے تابندہ و درخشندہ اور آنے جانے والوں کے تسلسل کی وجہ سے شاد و آباد تھے، مگر آج - اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی۔

بطخوں، مرغیوں اور کبوتروں کے لیے آرام دہ رہائش گاہ بنواتے، اُن کی اِس طرح دیکھ ریکھ کرتے، جیسے انسان اپنے لختِ جگر کی۔ جاڑے کے موسم میں اُن رہائش گاہوں میں بجلی کا بلب بھی جلاتے؛ تاکہ ٹھنڈک کی شدّت سے، اِن بے زباں پرندوں کو کوئی گزند نہ پہنچے، اُنھیں بیماری آزاری سے بچانے کی تدبیریں کرتے، اُن کے زیادہ

شور کرنے پر فکر مند ہوتے کہ مبادا اُنھیں کوکوئی تکلیف تو نہیں۔

شامِ زندگی

خورونوش کے تعلق سے مولانا بڑے محتاط تھے،اور اکثر عام قسم کی بیماریوں کا علاج، وہ دوا کی بہ جائے غذا سے کرلیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ شدید نزلے میں مبتلا تھے۔ میں نے عرض کیا حضرت! آپ نے کوئی دوا نہیں لی؟ فرمایا میں کل سے اِس نزلے کی حالت تباہ کیے ہوا ہوں، نہ کھاتا ہوں نہ پیتا ہوں۔ عزیزم! میں تو اِس طرح کی بیماریوں کو، اکثر اتنا پریشان کردیتا ہوں کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

لیکن خدا کی حکمت، قدرت اور مشیّت کہ شعبان ۱۴۱۰ھ میں وہ تقریباً ۲۸ روز تک مسلسل پیچش میں مبتلا رہے۔ اُن کے بھائی ثناء الحق صاحب اُنھیں اپنے ہاں دہلی لے گئے۔ مولاناؒ انگریزی طریقۂ علاج کے عموماً اور ایلو پیتھک کے خصوصاً مخالف تھے۔ وہ یونانی طریقۂ علاج اور ادویہ کی تاثیر اور بے ضرر ہونے کے قائل تھے؛ لیکن جب یونانی دوائیوں سے کوئی فائدہ محسوس نہ ہوا، تو بھائی کے اِصرار پر انگریزی دواؤں کے استعمال پر رضامند ہوگئے، دو ایک ماہ کے علاج کے بعد اِفاقہ ہوا؛ لیکن نہایت کم زور اور نحیف ہوگئے۔ میں ذی قعدہ ۱۴۱۰ھ کے اوائل میں گھر سے واپسی پر دہلی میں اِحاطہ کالے صاحب گلی قاسم جان میں واقع، اُن کے بھائی کے مکان پر، اُن کی عیادت کے لیے حاضر ہوا، تو بہت خوش ہوے؛ مگر گفتگو کے دوران صبر وعزیمت کے اُس کوہِ وقار نے بار بار یہ دہرایا کہ عزیزم! میں تو اب زندگی سے مایوس ہو چلا ہوں اور میں تو اب مرض الموت میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ مولاناؒ شفایابی کے بعد غالباً ذی قعدہ کے اواخر میں دہلی سے دیوبند آگئے اور ایک آدھ ماہ کے بعد، اُنھوں نے حسبِ معمول درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرمادیا؛ لیکن عرصے تک اُن کے منھ میں چھالے پڑتے رہے اور معدہ اِس درجہ کم

زور ہو گیا تھا کہ مرچ کا ایک ذرہ بھی اُن کو ہضم نہ ہوتا تھا۔ دو ایک مرتبہ میں نے گزارش کی کہ حضرت! میں اپنے ہاں سے کوئی پسند کا کھانا بھجوادوں؟ فرمایا عزیزم! ضرور بھجوادو بس مرچیں بالکل نہ ہوں، پھر شکر دانی میں سے شکر کا ایک دانہ نکال کر فرمایا: دیکھو! اتنی سی مرچ بھی معدے کے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

اِس بیماری سے وہ کلّی طور پر شفایاب نہ ہوسکے اور اِس کا تسلسل اُن کی وفات پر منتج ہوا۔ حُکَما اور ڈاکٹر مکمل طبی جانچ کے بعد کہتے کہ مولانا کو کوئی مرض نہیں ہے؛ لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر تھے کہ اُن کو کھانا ہضم کیوں نہیں ہوتا؛ جس کے نتیجے میں اُن کے جسم میں خون کی خطرناک حد تک کمی ہوتی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ آخری دنوں میں صرف ہڈیوں کا مجموعہ رہ گئے تھے۔ رمضان کے نصفِ آخر میں، میں گھر چلا گیا، ذی قعدہ کے اوائل میں واپسی ہوئی تو مولانا سال گذشتہ سے زیادہ ناتواں اور زندگی سے مایوس تھے۔ مہتمم صاحب مدظلہ نے اُنھیں مہمان خانے میں قیام پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہاں اُن کے کمرے سے زیادہ بعض سہولتیں تھیں۔ میں گھر سے آیا تو اپنے وطن ''مظفر پور'' کی لیچی ڈرتے ڈرتے، ایک طالب علم کی معرفت بھجوادی؛ لیکن یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ مولانا نے نہ صرف یہ کہ اُس کی پذیرائی کی؛ بل کہ شوق و رغبت سے تناول فرمایا اور حاضرین خدمت کو بھی چکھایا، سوئے اتفاق کہ گھر سے آتے ہی ذی قعدہ کے وسط میں میرے بائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور دیگر معذوریوں کے ساتھ کپڑے پہننا بھی مشکل تھا؛ اِس لیے اُن کے مرض الموت میں اُن کی بہت کم عیادت کی سعادت حاصل ہوسکی۔ عید الاضحیٰ کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں بالائی منزل پر میں نے بائیں جانب ادا کی مولانا دائیں طرف پہلی صف میں تھے۔ نماز کے بعد دو طالب علم دونوں بازو پکڑ کر سہارے سے، اُنھیں اٹھانا چاہ رہے تھے کہ جلدی سے پہنچ کر میں نے مصافحہ کیا۔ حسرت سے دیکھنے لگے اور میری کلائی کو دیکھ کر کہنے لگے: تم نے یہ کیا کر لیا؟ جن دوستوں سے مل کر زندگی کے اِن لمحوں میں خوشی ہوتی، وہ بھی مجبوریوں اور معذوریوں کی نذر ہو گئے۔

ہم نے کسے کھودیا

مولانا کی وفات سے ہم نے درحقیقت وہ کڑی کھودی ہے، جو ہمیں اُن اساتذہ ومشائخ دارالعلوم کے سلسلة الذہب سے مربوط کرتی تھی۔ جو علم وفضل کے منارے، ورع وتقویٰ کی مثال اور سادگی وقناعت، پاک دامنی اور پاک نفسی کا نمونہ تھے۔

اُن کی موت سے اساتذہ اور ذمہ داران دارالعلوم نے ایک باوقار وروشن دماغ سرپرست اور امانت دار وصاحبِ لیاقت مشیر کار کھودیا ہے۔ جو مضبوط رائے قائم کرنے، بروقت کسی اُلجھن کا حل ڈھونڈ نکالنے، بارآور طریقۂ کار وضع کرنے اور تعلیمی وانتظامی صیغوں کے مفید ترین خاکوں کی اِیجاد وتنفیذ پر ماہرانہ اور بصیرت افروز قدرت رکھتا تھا۔ مولانا کے ایسا پختہ رائے اور کسی نظریے پر تادیر اور ہر حالت میں ثابت قدم رہنے والا آدمی میں نے زندگی اور تجربہ میں حضرت مولانا سیّد منت اللہ صاحب رحمانی (متوفی شب ۳؍رمضان ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۹۱ء) کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا ہے۔ اُن کی رائے فولاد کی طرح ٹھوس ہوتی اور وہ اُس پر پہاڑ کی طرح جم جاتے تھے۔

باوجودے کہ مولاناؒ اہتمام سے متعلق نہ تھے؛ لیکن دارالعلوم کے منتظمین وذمّے داران، دارالعلوم کے بہت سے مسائل ومعاملات میں مولانا کے مشوروں اور خیالات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اُن کی موت برِّصغیر کے علمی اور مذہبی حلقوں کا عمومی خسارہ ہے اور حالات وواقعات کے تناظر میں مولانا جیسے فاضل کے خلا کا پر ہونا مشکل ہے۔ یوں تو خدائے ذوالجلال ہر چیز پر ہر وقت قادر ہے۔ کسی بزرگ ہستی کے چلے جانے سے سب سے بڑا نقصان، اُن کے تجربات، خیالات اور اکتسابات سے محرومی کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ بزرگوں کے ہم سے جدا ہوجانے کا، یہی سب سے سنگین اور قابلِ رنج وملال پہلو ہے۔ (*)

(*) عربی تحریر شائع شدہ پندرہ روزہ "الداعی" شمارہ ۳، جلد ۱۵، ۳۰/صفر ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۰/ستمبر ۱۹۹۱ء اردو تحریر بہ قلم خود، جو عربی تحریر کے چند روز بعد ہی سپردِ قلم ہوئی اور اخبار مشرق کلکتہ اور دگر اخبارات ورسائل بالخصوص "ماہ نامہ دارالعلوم" میں شائع ہوئی۔

اُستاذ الاساتذہ

حضرت مولانا محمد حسین "ملّا بہاری" رحمہ اللہ

۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء — ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء

اُس کی اُمّیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دِل فریب، اُس کی نگہ دِل نواز

ولادت اور تعلیم

مولانا محمد حسین بہاری، ضلع مظفر پور (حال سیتامڑھی) کے ایک دور افتادہ گاؤں "شیخ بسہیا" میں ۱۳ر شوال ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۳ر نومبر ۱۹۰۵ء کو ایک مفلوک الحال خاندان میں پیدا ہوئے۔ معمولی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں اپنے برادرِ بزرگ ابوبکر صاحب سے حاصل کی، اس کے بعد وہ کئی ایک مدرسوں میں زیرِ تعلیم رہے، جن میں سرفہرست دار العلوم مئوناتھ بھنجن ہے، جہاں اُنھوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء) کے ایک ہونہار ترین اور مشہور صاحب درس شاگرد مولانا کریم بخش سنبھلیؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) سے استفادے کی سعادت حاصل کی اور ان سے مُرَوَّجہ علوم وفنون کی متعدد کتابیں پڑھیں۔ مولانا کریم بخش سنبھلی محدثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی (متوفی ۱۱ر رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۷ر مارچ ۱۹۹۲ء) اور مشہور اسلامی اہل قلم وداعی الی اللہ مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ (۱) کے

(۱) وفات: شبِ دوشنبہ: ۲۷ر ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۵ر مئی ۱۹۹۷ء۔

بھی مربی اور استاذ تھے۔

مولانا بہاریؒ نے کئی سال مظاہرِ علوم سہارنپور میں بھی گزارے، وہاں اُنھوں نے موقوف علیہ تک پڑھنے کے بعد ۱۳؍شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۶؍اپریل ۱۹۲۷ء کو دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث شریف میں داخلہ لیا اور دوسرے سال یعنی ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوے۔ حدیثِ پاک کی اکثر کتابیں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) سے پڑھیں۔ وہ حضرت مدنیؒ سے دورۂ حدیث مکمل کرنے والی پہلی کھیپ کے فضلا میں تھے؛ اِس لیے کہ مولانا مدنی کا دارالعلوم میں تقرر ۱۳۴۶ھ میں ہوا جب علامہ محمد انور شاہ کشمیری (متوفی ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء) دارالعلوم سے مستعفی ہوگئے تھے۔ دارالعلوم میں مولانا بہاری کے دیگر قابلِ ذکر اساتذہ میں علامہ محمد ابراہیم بلیاوی (متوفی ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) اور شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی امروہوی (متوفی ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) تھے۔ دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا فخر الحسن صاحب مرادآبادی (متوفی ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۹۸۰ء) اور مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی کے سابق صدر مدرس و شیخ الحدیث مولانا قاضی سجاد حسینؒ (متوفی ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء) دارالعلوم میں مولانا کے رفقاے درس میں تھے۔

درس و اِفادہ

دارالعلوم سے فراغت کے بعد اُنھوں نے متعدد مدرسوں میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں، ایک عرصہ تک راندیر (گجرات) کے مدرسے سے وابستہ رہے، وہاں سے واپس آئے تو سہارنپور کے شاہ بہلول کے مدرسے میں صدر مدرس ہوگئے، کچھ عرصے بعد پھاٹک حبش خان (دہلی) کے مدرسہ صدیقیہ والوں نے اُنھیں باصرار اپنے وہاں بلوالیا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادیِ ہند کے پُر آشوب و خوں ریز موقع پر وہ اسی مدرسہ میں موجود تھے اور دہلی اور اُس کے اَطراف میں خصوصاً اور پورے ہندوستان میں عموماً اُس

وقت برپا ہونے والے ہمہ گیر ودل دوز ہندو مسلم فسادات میں کسی نہ کسی طرح جان بچا کر وہ اپنے وطن مالوف "شیخ بسہیا"، ضلع مظفر پور (حال ضلع سیتامڑھی) بہار، آگئے۔

اِس موقع سے اُن کے ذہن میں خدا نے ایک مبارک خیال یہ ڈالا کہ اپنے گاؤں میں مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے ایک تعلیم گاہ قائم کریں، کہ اس علاقے کے مسلمان اقتصادی وتعلیمی اعتبار سے بہ طورِ خاص پس ماندہ ہیں۔ چناں چہ اُنھوں نے اپنے استاذ ومربی مولانا مدنی کے دستِ مبارک سے "مدرسہ مدنیہ" کے نام سے ۱۹۴۸ء میں اس تعلیم گاہ کا آغاز کیا۔ مولانا کے فرزندوں سے معلوم ہوا کہ مذکورہ مدرسہ ہنوز کسی نہ کسی صورت میں باقی ہے اور علاقے کے نونہالانِ توحید کو روشنیِ علم وہنر سے مستفید ہونے میں مدد دے رہا ہے۔

مولانا کو درسِ نظامی کے مدرسوں میں پڑھائے جانے والے تقریباً سبھی علوم سے خاصی مناسبت تھی، اُن کا علم ٹھوس تھا؛ اِس لیے کہ وہ شعور کی آنکھیں کھولنے کے بعد ایک زبردست ذہنی چوٹ کے نتیجے میں تعلیم کی طرف متوجہ ہوے تھے (جس کی طرف آیندہ سطروں میں اِشارہ کیا جائے گا) اِس لیے اُنھوں نے طلبِ علم میں اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو یکسوئی، محنت اور لگن کے ساتھ صَرف کیا۔ پھر یہ کہ وہ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے تھے، عمیق مطالعہ اور غور وفکر کے بعد پڑھاتے تھے۔ وہ معمولی سے معمولی فن یا کتاب بغیر مطالعے کے پڑھانے کے قائل تھے نہ عامل۔ علومِ عقلیہ اور منطق وفلسفہ سے طبعی مناسبت نے ان کے فکر ونظر پر مطلوبہ مثبت اثرات ڈالے اور اُن کا ذہن کسی علمی نظریے اور مسئلے کو مرتب ومعقول طور پر سوچنے اور مربوط ومختصر جملوں میں ڈھالنے اور پیش کرنے کا عادی بن گیا تھا۔ درس میں اُن کی مختصر بیانی طلبہ کے لیے بہت مفید ہوتی تھی، کہ اُن کے لیے مسئلے کا فہم اور اُس کا اخذ وہضم آسان ہوتا تھا، جو کسی مختصر وماقل ودل گفتگو کا سب سے مثبت اور نفع بخش پہلو ہوا کرتا ہے، جب کہ درازیِ گفتار اکثر مرتبہ مضمون کو خبط اور مخاطب کے لیے اُس کو مزید پیچیدہ کر دیتی ہے۔

مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر مولانا کے شاگردوں کو اُن سے جو محبت وعقیدت تھی وہ گنے چنے اساتذہ ہی کے ساتھ ہوا کرتی ہے، جن کی نفع بخشی وفیض رسانی کی مخلصانہ کوشش وصلاحیت کی محسوس برکتیں ادنیٰ فہم کے طالبِ علم کو بھی مُتاثّر کیے بغیر نہیں رہتیں۔ مولانا کے باکمال تلامذہ کو اُن کی شاگردی پر جس فخر واِعزاز کا اظہار کرتے دیکھا ہے، وہ دارالعلوم کے اساتذۂ سلف ہی کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔

مُرَوَّجہ علوم وفنون سے ہمہ گیر مناسبت کی سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند ایسی عظیم درس گاہ میں اُس کی درسیات کی اکثر کتابوں اور فنون کو لیاقت، اعتماد اور قابلِ ذکر خوش اسلوبی کے ساتھ، تقریباً ساڑھے چار دہائیوں تک پڑھایا۔

مولانا دارالعلوم کے اُن چند ہما نصیب اساتذۂ گرامی قدر میں تھے، جنھوں نے وہاں کی درسیات کی اِتنی ساری کتابیں، اِس وقار واعتبار سے پڑھائیں کہ دارالعلوم کے انتظامیہ اور اُن کے شب بیدار وخوش اوقات باذوق طلبہ کے دل ودماغ میں، اُن کے لیے اعتقاد اور محبت کا جذبۂ بے پناہ پیدا ہو گیا تھا۔ وفات والے دن عصر کے بعد احاطۂ مولسری میں اُن کی نمازِ جنازہ میں اور مقبرہ قاسمیہ تک مشایعت اور سپردِ خاک کرنے کے موقع پر جو رشک افزا بھیڑ میں نے دیکھی، وہ فضلاے دارالعلوم اور اُن کے تلامذہ کی اُن سے بے پایاں عقیدت ومحبت کی واضح علامت تھی۔

مولانا کی زندگی کا سبق آموز پہلو

اُن کی زندگی کا نہایت درجہ سبق آموز پہلو یہ ہے کہ وہ اسبابِ زیست سے تہی دست گھرانے میں پیدا ہوئے، ابھی دس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور بے سروسامانی کی تیز دھوپ اُن کے سر پر پڑنے لگی۔ والدین کے بعد اُن کی کفالت کی ذمے داری اُن کے ماموں کے سر آئی؛ لیکن وہ بھی تنگ دست تھے؛ اِس لیے مولانا کو اپنی زندگی کی شمع روشن رکھنے کے لیے، دوسروں کے چراغ سے تیل حاصل کرنا پڑا،

جس کی قیمت وہ اُن کی گائے بھینس یا بیل و بکریاں چرا کر ادا کرتے تھے۔
وہ ایک چرواہے کی زندگی گزار رہے تھے کہ خدائے علیم و حکیم نے (جس کے یہاں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے) ایک روز اُن کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اُنھیں بامعنی اور قدر و قیمت والی زندگی جینے کے لیے تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ مولانا نے اِس نیک ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھانی اور وہ ہندوستان کے کئی ایک مدرسوں میں یکے بعد دیگرے داخل ہو کر اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے؛ تا آں کہ برِ صغیر کی سب سے قدیم و عظیم اسلامی دانش گاہ یعنی دار العلوم سے فارغ التحصیل ہونے کی سعادتِ عظمیٰ حاصل کی۔
اُنھوں نے علم و معرفت کے اکتساب میں اِس طرح دادِ محنت دی کہ وہ اپنے بہت سے اُن ہم عمروں اور رفقائے درس سے بہت آگے نکل گئے، جو خوش حالی کی گود میں کھیلنے اور نعمتوں کی سیج پر لوٹنے والوں میں تھے، جنھیں مقدراتِ الٰہی نے روزی روٹی کی فکر سے آزاد اور سایۂ والدین سے سرفراز رکھا تھا جب کہ مولانا زندگی کے اُن تمام وسائل سے قطعاً محروم تھے، جو کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے سنجیدگی سے سوچنے کا حوصلہ دیتے اور اِس سلسلے میں نتیجہ خیز قدم اُٹھانے کے لیے ایک انسان کو آمادہ کرتے ہیں۔
یہی نہیں؛ بل کہ مولانا کے بہ قول اُن کا ذہن و حافظہ بھی کسبِ علم میں اُن کے لیے معین نہیں تھا، وہ تحصیلِ علم کا حوصلہ پا کر بھی اپنے کو اِس کے حصول سے معذور محسوس کرتے تھے۔ یہ بات اُن کے لیے قلبی کرب کا باعث رہا کرتی تھی کہ وہ کسی علمی مسئلے کو بڑی دقتِ نظر کے بعد سمجھتے اور نہایت محنت کے بعد یاد کرتے تھے اور پھر وہ جلد ہی اُن کے حافظے سے ہرن ہو جاتا تھا۔
فرماتے تھے کہ اِس کی وجہ سے میں بڑا دل شکستہ رہا کرتا تھا اور شکستگیِ قلب کا احساس جب اتنا بڑھ جاتا کہ میرے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیتا، تو میں اپنے رب سے اکثر اِس طرح گریہ کناں ہوتا تھا، جیسے ایک معصوم بچہ اپنی ماں سے چمٹ کر، اپنی معصوم تمناؤں کو پورا کر دینے کی تڑپ تڑپ کر اور رو رو کر؛ اِس طرح درخواست کرتا ہے

کہ وہ کسی صورت سے اُس کی درخواست رد نہیں کر پاتی۔ فرماتے تھے کہ تھوڑے عرصے بعد میرے فکر و فہم نے میری دادرسی شروع کی اور مشکل ترین مسائل کا سمجھنا اور یاد کرنا میرے لیے نہایت آسان ہو گیا۔

مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر چوں کہ وہ تحصیلِ علم کی طرف قدرے تاخیر سے متوجہ ہوے، اِس لیے دار العلوم سے فراغت کے وقت وہ توانا اور جوان ہو چکے تھے۔ طبعی طور پر ان کا جی چاہا کہ شادی کے ذریعے زندگی کا وہ سکون حاصل کریں جس سے وہ تا حال محروم رہے ہیں؛ لیکن اُن کے بہ قول چوں کہ وہ نادار بھی تھے اور شکل و صورت بھی اِتنی جاذبِ نظر نہ تھی جو غربت کے باوجود ہندوستانی معاشرے میں اور خصوصاً اُن کے علاقے میں ایک باپ کو اُن کے ایسے جوان سے اپنی لڑکی بیاہنے پر آمادہ کر سکتی، چناں چہ لوگوں نے اُن کی غربت اور گہرے گندمی رنگ کی وجہ سے اُنھیں اپنا داماد بنانے سے انکار کر دیا۔

اُس وقت اُنھیں ایک مرتبہ پھر سخت ذہنی صدمہ پہنچا؛ لیکن اِس صدمے کی تہوں میں اُن کے لیے زندگی کا گہرا سبق موجود تھا۔ اُنھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ زندگی بڑی تنگ دل اور سنگِ گراں ہے، قبول و انکار اور پسند و ناپسند کے سلسلے میں اُس کا اپنا مخصوص پیمانہ ہے، اِنسان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے سلسلے میں اُس کا اپنا خصوصی معیار ہے۔ اُنھوں نے اُس وقت جی کڑا کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اُنھیں زندگی کا چیلنج قبول کرنا اور اُس کی دھوپ چھاؤں میں اُس کی مرضی کے مطابق جینا ہے۔

اُنھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوے اُن مدرسوں میں سے ایک میں تدریس کی ملازمت شروع کی، جو تاریخ کے نامعلوم سُرنگوں میں گم ہوتی ہوئی قدیم ترین صنم پرستی کے اِس دیار میں فرزندانِ توحید کی دینی بیداری اور اِسلام کی غیر معمولی تاثیری قوت کی واضح علامت ہیں۔

وہ نہایت درجہ سادہ زندگی گزارتے اور اپنی تنخواہ سے ماہ بہ ماہ کچھ پس انداز

کرتے رہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مدارس اسلامیہ میں تنخواہ کا معیار ہنوز ناقابلِ ذکر حد تک گرا ہوا ہے۔ مولانا کی تدریسی زندگی کے آغاز کے وقت بھی اُس وقت کے حالات کے چوکھٹے میں مدارس کی تنخواہیں یقیناً بہت کم رہی ہوں گی۔ اِس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولاناؒ قوتِ لایموت کی کس سطح کو اپنا کر اپنی تنخواہ سے رقم پس انداز کرتے رہے ہوں گے۔

پس اندازی کی حکیمانہ پالیسی کے ذریعے اُنھوں نے اِتنی رقم جمع کرلی، جس سے اُنھوں نے اتنی "بہت سی" زراعتی زمینیں خرید لیں، جن سے اُنھیں "مال داروں" کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اُس وقت متعدد والدین اپنی لڑکیوں سے اُن کی شادی کے لیے خواہش مند ہوے۔ اُنھوں نے اُن میں سے ایک لڑکی کا انتخاب کیا، جسے قضاے الٰہی نے اُن کی زوجیت میں دینا طے کیا تھا۔ اس سے ان کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ دو لڑکے مولوی احمد حسین اور مولوی نجم الحسن بالترتیب ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۱ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوے۔ مولانا کے تمام لڑکے الحمدللہ کام سے لگے ہوے ہیں، اُن کی اہلیہ اُن کی وفات سے تقریباً ۲۳ سال قبل اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔

مولاناؒ کی زندگی کا سبق

مولانا کو اپنی زندگی میں روزِ اول سے تنگ دستی کی جس پُر خار وادی سے گزرنا پڑا اُس نے اُنھیں زندگی بھر مال وزر کا قدرداں بنائے رکھا، اُن کو عملی زندگی میں یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ تہی دامنی اِنسان کو نہایت زہریلے سانپ سے زیادہ بری طرح ڈسنے اور خبیث بچھو سے زیادہ مسلسل ڈنک مارتے رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے؛ اِس لیے وہ بہت سوچ سمجھ کر اور نہایت ضرورت کے وقت ہی خرچ کرتے تھے۔ آمد وخرچ میں "مکمل توازن" قائم کرنے کی جو صلاحیت اُن کے رب نے اُنھیں دی تھی اور اِس سلسلے میں اُن کی قوتِ ارادی میں جو صلابت تھی وہ اُن کا خاص حصہ تھی۔ اُنھوں نے مدرسوں کی قلیل

تنخواہوں کے ذریعے اپنے بچوں کے لیے اِتنا کچھ کردیا کہ اِن شاء اللہ اُن کے بعد اُنھیں تازیست کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اِس طرح اُنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث پر مکمل عمل کیا جس میں ورثا کو اغنیا چھوڑنے کی ترغیب اور تنگ دست چھوڑنے کی نکیر کی گئی ہے۔

مولانا کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ بعض دفعہ عمدہ قسم کے درخت شوریدہ زمین میں اُگتے اور مخالف ماحول، نامناسب موسم، پانی سے دوری، بارش کی کمی اور کسان کی عدمِ دلچسپی اور اُن کی دیکھ ریکھ کے سلسلے میں اُس کی طرف سے مکمل کوتاہی کے باوجود، وہ اِس طرح بڑھتے، پروان چڑھتے اور ربِ کائنات کی مرضی سے ہر موسم میں اِتنا برگ و بار لاتے ہیں کہ عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

اِس کے برخلاف بعض دفعہ ''لاخیرے درخت'' سرسبز و شاداب زمین میں، شیریں چشموں کے بیچ اُگتے ہیں، اُنھیں عمدہ ماحول اور مناسب موسم میسر ہوتا ہے، رب العالمین بروقت بارشوں سے اُن کی قدرتی سینچائی بھی کرتا رہتا ہے، کسان اُن کی نگہ داشت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا؛ لیکن وہ لاخیرے ہی رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا﴾ کے مصداق، سچ ہے خدائے ذوالجلال ہر چیز پر، ہر طرح اور ہر وقت اور ہر جگہ قادر ہے۔

مولانا کی قابلِ ذکر خصوصیتیں

دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ میں اِس بات پر اتفاق تھا کہ مولانا دو باتوں میں امتیازی شان کے مالک ہیں: نماز باجماعت کی مواظبت اور درس کی پابندی۔ کڑاکے کی سردی ہو یا گرمی میں لو کی تپش یا برسات کی جھڑی، کوئی چیز مولانا کے لیے دارالعلوم کے وسط میں واقع مسجد میں باجماعت پنج گانہ کی ادائیگی سے روک نہیں سکتی تھی۔ وفات سے کچھ ہفتے پہلے چلنے پھرنے سے بالکلیہ معذوری سے قبل تک اُن کی مسجد کی حاضری میں

کوئی خلل کبھی نہ ہوا۔ وہ اذان سے قبل وضو سے فارغ ہو جاتے اور اذان کے فوراً بعد ایک دو طالب علم کے سہارے اپنی چھڑی ٹیکتے ہوئے مسجد پہنچ جاتے۔ پیرانہ سالی اور کم زوری کی وجہ سے وہ خاصی دھیمی رفتار سے چلتے، بعض دفعہ آگے کی صفیں بھر جاتیں؛ لیکن وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے اور طلبہ اُنھیں دیکھ کر از خود اُن کے صفوں سے گزرنے اور آگے بڑھنے کے لیے جگہ خالی کر دیتے۔ بعض دفعہ وہ اپنی خاص آواز اور شفقت آمیز لہجے میں اُن طلبہ کو ڈانٹتے جو نو وارد ہونے کی وجہ سے اُن کو نہ جانتے اور اپنی جگہ سے نہ ہٹتے، طلبہ اُن کی دیگر ڈانٹوں کی طرح اس ڈانٹ سے بھی مزے لیتے اور مسکراتے ہوئے پہلی صف میں پہنچ جاتے۔

مولانا کی روزمرّہ زندگی ہر طرح کے تکلفات اور نستعلیقیت سے خالی بے حد سادہ تھی، اُن کے کمرے میں جو دارِ جدید کے شمال مشرقی کونہ پر دوسری منزل پر تھا، چند عدد کھانے پینے کے برتن، ایک دو عدد چارپائی، معمولی سا بستر، ایک آدھ بکس، ایک پرانا سا ٹیبل فین، سادہ سا پان دان، چند عدد پلاسٹک اور شیشے کے ڈبے اور مرتبان، جن میں بعض ماکولات اور مشروبات قسم کی چیزیں رکھتے، اور ایک عدد لوٹا وغیرہ کے علاوہ آپ کو کوئی ایسی چیز نظر نہ آتی جو زیبائش اور کمالیّات سے تعلق رکھتی ہو۔ ایسا کب ہو سکتا تھا جب کہ مولانا ضروریات کے تعلق سے بھی خاصے بے پروا واقع ہوئے تھے۔

میں کبھی کبھی مغرب بعد بہ طورِ خاص اُن سے ملنے کے اِرادے سے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ اپنے کمرے کی اندرونی "کٹیا" میں، ایک بجھے بجھے سے لیمپ کے "سائے" میں ایک میلے سے سال خوردہ گاؤ تکیے پر اپنی داہنی کہنی سے ٹیک لگائے، اپنے شانوں کو جھکائے، کسی زیرِ تدریس کتاب پر نظر جمائے، مطالعے میں مستغرق ہوتے۔ میں اپنے سلام سے "کٹیا" کی خاموشی کو توڑتا ہوا اُن سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا اور وہ سیدھا بیٹھ جاتے، مسکراتے، دل سے دعائیں دیتے، خیر خیریت دریافت کرتے اور بے طرح خوشی کا اِظہار کرتے جیسے عرصے کے بعد اُن کا کوئی گراں

قدر تحفہ اُنھیں مل گیا ہو۔ یہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا کہ مولانا سے میں جب بھی ملتا اِس اعتماد، خوشی اور ناز کے ملے جلے جذبات سے ملتا جیسے وہ میرے شفیق باپ ہوں۔ مولاناؒ کی طرف سے بھی پیہم پدرانہ شفقت کے معاملے نے مجھے اُن پر خاصا ''دلیر'' بنادیا تھا؛ اِس لیے میں شوخی اور ظرافت کے پیرائے میں بہت سی ایسی باتیں اُن سے کہہ جاتا تھا، جواُن کے مقام ومرتبے کے آدمی کے لیے مجھ جیسے خُردسال وخُردمقام آدمی کی طرف سے سوے ادب کے خانے میں آسکتی ہیں؛ لیکن وہ اِن باتوں سے خوش ہوتے اور بعض دفعہ اپنی چھڑی میرے اوپر خاص انداز میں اٹھالیتے، جیسے وہ سچ مچ میری اچھی طرح خبر لینے والے ہوں۔ اُن کی یہ چھڑی نہ جانے کتنے طلبہ اور اساتذۂ دارالعلوم پر جن میں سے اکثر اُن کے شاگرد ہیں، اٹھتی رہتی تھی۔ اُن کے اکثر شاگردوں اور دارالعلوم کے اساتذہ کواُن کی مرنجا مرنج طبیعت، سادگی، خوش مزاجی، اداے دل برانہ اور اندازِ مؤمنانہ کی وجہ سے، اُن سے جو بے تکلفی تھی اور خود اُنھیں اُن سے جو محبت تھی اُس کی بنا پر اکثر اساتذہ انھیں ان کی دعائیں لینے اور اُن کی چھڑی کھانے کے لیے چھیڑتے رہتے اور سوچ سمجھ کر پیسے خرچ کرنے کی، اُن کی عادت کی وجہ سے، اکثر اُن کی جھڑکی سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُن سے دعوتِ طعام کی فرمایش کرتے اور پھر کیا تھا، اُن کی مصنوعی غضبنا کی شباب پر آجاتی اور نتیجے میں اُن کا ''عصاے کلیمی'' حرکت میں آجاتا۔ دعوت دیئے جانے سے وہ بے حد ''خوش ہوتے'' اور دعوت طلب کیے جانے سے اُسی قدر یا اُس سے کچھ زیادہ ''ناراض'' ہوتے؛ لیکن اُن کی ''خوشی'' اور ''غضبنا کی'' دونوں ہی ہم لوگوں کو محبوب اور مطلوب تھی، کہ دونوں سے ہمیں یکساں لطف ملتا تھا۔

اُس کی نفرت بھی عمیق، اُس کی محبّت بھی عمیق
قہر بھی اُس کا ہے، اللہ کے بندوں پہ شفیق

مجھے مولانا کے کمرے کے اسباب میں جس چیز پر سب سے زیادہ رحم آتا وہ اُن کا گاؤ تکیہ تھی، میں مولانا سے اکثر کہتا: حضرت! آپ اِس گاؤ تکیے کو (جو بوسیدہ بھی ہے اور

جس کی روئی کثرتِ استعمال سے پس کر آٹے کی طرح ہوگئی ہے اور آپ کی کہنی اِس میں اتنی دھنس جاتی ہے کہ سہارا لینے کا مطلوبہ فائدہ آپ کو یقیناً حاصل نہیں ہو پاتا) کیوں تبدیل نہیں کر لیتے؟ آپ کے لیے کیا چیز مانع ہے؟ آپ تو جس شاگرد سے بھی فرمادیں گے وہ فوراً تعمیلِ حکم کرے گا اور دیگر اسباب حجرہ بھی تو غالباً از قبیل ہدایا ہی آئی ہوں گی، مولانا یہ سن کر روایتی خفگی کا اظہار کرتے اور اپنی چھڑی کے گول دستے سے میری گردن کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے، میں دائیں بائیں مڑ کر بچ نکلتا۔

مولانا رقیق القلب تھے، نبیِ اکرم ﷺ، صحابۂ کرام اور بزرگانِ عظام کے تذکرے کے وقت اکثر آب دیدہ ہو جاتے، وہ کسی بات سے جلد متأثر ہو جاتے، اُن کی خفگی اور خوشی میں بال سے زیادہ فاصلہ نہ تھا؛ لیکن یہ دونوں کیفیتیں اُن کی شخصیت میں ایک پرلطف رنگ اور آہنگ کے ساتھ نمودار ہوتی تھیں۔ وہ پاک نفس اور صاف دل تھے۔ اُن کی سادگی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے دارالعلوم کے طلبہ اُن سے کچھ زیادہ ہی گھلے ملے رہتے تھے۔ ہر ایک اُن کی خدمت کر کے اپنے کو سرخ رو سمجھتا تھا۔ اُن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ مختلف المشرب معاصر بزرگان دین اور علمائے کبار کے یہاں محبوب رہے۔ دارالعلوم کے اکثر موجودہ اساتذہ کو، جو اُن کے شاگرد ہی تھے "مولانا فلاں" نہ کہہ کر پیار اور اعتماد کے وجہ سے اکثر "فلاں" ہی کہتے تھے۔ یہ غالباً دارالعلوم میں تنہا اُنھی کی خصوصیت تھی، اساتذہ اُن کے اس طرزِ تخاطب سے نہ صرف یہ کہ شاد ہوتے؛ بل کہ لطف لیتے اور سعادت محسوس کرتے اور زبانِ حال اور قال سے کہتے کہ اِن کے بعد ہمیں اِس طرح پکارنے والا اب کوئی نہ ہوگا۔

اُن کی امیدیں قلیل اُن کے مقاصد جلیل

وہ درمیانہ قد تھے، داڑھی اور سر کے بال گھنیرے تھے، جسم متوسط اور نگاہ تیز تھی، بھنویں گھنی، پیشانی درمیانہ، ناک اونچی اور رنگ گہرا گندمی تھا، صاف ستھری بات

کرتے اور خوشی یا ناراضگی کا برملا اظہار کردیتے تھے، اُن کی دنیاوی تمنائیں قلیل اور اُخروی مقاصد جلیل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی زندگی مؤمنانہ تھی۔

اُن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ اُن کا آخری وقت جب بھی آئے دارالعلوم ہی میں آئے، اساتذہ وطلبۂ دارالعلوم ہی اُن کو اپنے ہاتھوں مقبرۂ قاسمیہ میں سپردِ خاک کریں؛ اِسی لیے وہ اپنے وطن بہت کم جایا کرتے تھے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے، سکون وآرام کی جو دولت وہ یہاں محسوس کرتے تھے اُن کو وطن میں میسر نہ تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اُن کی یہ مخلصانہ؛ بل کہ عاشقانہ آرزو پوری ہوئی اور طلبہ واساتذۂ دارالعلوم اور پڑوس کے اضلاع کے مدرسوں میں پھیلے ہوئے سیکڑوں؛ بل کہ ہزاروں شاگردوں نے اُنھیں انتہائی عقیدت ومحبت سے مقبرۂ قاسمیہ میں عظیم ترین علماے دیوبند کے جوار میں، اُن کی آخری آرام گاہ میں اتار دیا۔ ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

اُن کی سرگرمیِ حیات کا خلاصہ

اُن کی زندگی کی سرگرمی کا خلاصہ تھا نماز، ذکرِ الٰہی، درس، طلبہ واساتذۂ دارالعلوم، خود دارالعلوم، زندگی جینے کے لیے کچھ خورونوش، اپنی اولاد کی پرسکون زندگی کے لیے فکرمندی اور ہم نشینوں سے خوش گپیاں۔ ہم نشینوں میں سرِفہرست اُن کے دیرینہ رفیق وپڑوسی وہم صوبہ مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی دربھنگوی مفتیِ دارالعلوم دیوبند اور مرحوم جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند کے لائق استاذ مخلص وکرم فرما مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب مئوی تھے(۱)۔ اول الذکر نے ہمیشہ عموماً اور مرض الموت کے ایام میں خصوصاً مولانا کی لائقِ ستائش خدمت کرکے اپنی مخلصانہ رفاقت کا حق ادا کردیا۔ خداے کریم اُنھیں اِس کا بہترین بدلہ دے اور تمام اُن اساتذہ اور طلبہ کو بھی جو اُن کی معذوری کے دنوں میں

(۱) فات: جمعرات: ۱۹؍رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۰؍ستمبر ۲۰۰۹ء۔

انسانی، اسلامی اور تلمیذانہ جذبہ وعقیدت کے ساتھ اُن کی تیمارداری کر کے اپنے ربّ کی جزا کے مستحق ہوئے۔

یادوں کے سایے

مجھے مولانا سے پہلی مرتبہ ملاقات کا شرف شوال ۱۳۸۸ھ میں اُس وقت حاصل ہوا جب دارالعلوم دیوبند میں میری طالب علمی کا دوسرا سال تھا۔ میرے ہم خاندان اور ہم قریہ مولانا عمیس اختر کے ہم راہ اُنھی کی تحریک پر ہم دونوں مغرب کی نماز کے بعد مولانا سے ملنے کے لیے اُن کے کمرے میں حاضر ہوئے۔ وہ اُسی روز رمضان المبارک کی تعطیلِ کلاں گزار کر گھر سے تشریف لائے تھے، ہماری آمد کے وقت وہ اور اُن کے صاحبزادے مولوی احمد حسن قاسمی اور مولوی نجم الحسن قاسمی (جو اُس وقت خُرد سال تھے) دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا گھر سے تلی ہوئی مچھلی اور روٹیا لائے ہوئے تھے، وہ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے بچّے ہنوز کھا رہے تھے، اُنھوں نے اپنے خاص انداز میں دونوں بھائیوں کو مچھلی کی مزید ایک ایک یا دو دو قاشیں دیتے ہوئے فرمایا "بس اب اِس کے بعد اگر تم لوگوں نے اظہار طمع کیا تو ایک ہی تھپڑ میں دماغ صحیح کردوں گا"۔ ہم لوگوں کے سلام کی آواز سے مولانا یکا یک ہماری طرف متوجہ ہوئے اور اپنی روایتی جھڑکی کے ساتھ، اپنے وطن کے لہجہ میں فرمایا "کون ہے رہے؟" مولوی عمیس کو جانتے تھے؛ اِس لیے ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اُن کو پہچان گئے، البتہ میرے اوپر سوالیہ نگاہ ڈالتے ہوئے پھر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ مولوی عمیس نے تعارف کرایا تو وہ سمجھ گئے کیوں کہ غائبانہ وہ مجھے بھی جانتے تھے۔ سامنے پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھنے کا اِشارہ کیا اور پڑوس کے کمرے میں رہنے والے میرے ایک ہم سبق اور ہم ضلع طالب علم مولوی عبدالحنان مظفرپوری کو آواز دی اپنے اُسی وطنی لہجے میں "رے عبدالحنان؟" وہ فوراً ہی حاضرِ خدمت ہوئے، اُنھیں چار آنے تھمائے (یاد رہے کہ اُس وقت "آنے" کا ہی چلن تھا) اور فرمایا ایک آنے کی طوطا چھاپ

چائے پتی، ایک آنے کا دودھ اور ایک آنے کے میرے لیے پان کے پتے لے آؤ۔ حسب الحکم وہ سامان لے کر آئے، تو فرمایا: تمھارے اسٹو میں تیل ہے تو لے آؤ اور چائے تیار کرو۔ چائے بنی اور ہم لوگوں کی خاطر تواضع کی گئی۔

اِس کے بعد مولانا کی خدمت میں بار بار حاضری کا موقع ملا؛ لیکن زیادہ گھلنا ملنا یا اُن کی خدمت کرنا یاد نہیں؛ کیوں کہ مولانا کے یہاں میرا کوئی سبق بھی نہیں تھا دوسرے اُن کا رعب و دبدبہ بھی حجاب رہا۔ اُس وقت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ) کے بعد دار العلوم کے گوشے گوشے میں، منطق و فلسفہ اور معقولات میں، مولاناؒ کے طاق ہونے کا غلغلہ بلند تھا، مولانا اُس وقت زیادہ بوڑھے بھی نہیں ہوے تھے: اِس لیے معقولات میں دست گاہ رکھنے اور اُس سے دلچسپی لینے والوں میں جو ایک طرح کی ''خودداری'' عموماً ہوا کرتی ہے اس کا تھوڑا یا بہت اثر اُن پر تھا یا نہیں؛ لیکن اُس کی شہرت طلبہ میں اُس وقت بہت تھی۔ اِس بنا پر ہم ایسے کم ہمّت طلبہ عموماً اُن سے زیادہ گھلنے ملنے یا اُن کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے تھے۔

وہ معقولات میں اپنی غیر معمولی دلچسپی اور مہارت کی وجہ سے دار العلوم میں اُس وقت ''علامہ بہاری'' کے نام سے ہی جانتے جاتے تھے۔ بعد میں ''مولانا بہاری'' یا ''ملا بہاری'' ہمیشہ کے لیے اُن کے نام کا قائم مقام بن گیا، حتیٰ کہ بعض طلبہ سالوں دار العلوم میں گزارنے کے بعد واپس چلے جاتے اور اُنھیں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ اُن کا اصلی نام مولانا ''محمد حسین'' ہے۔ گویا منطق کی شہرۂ آفاق کتاب ''سلم العلوم'' کے جلیل القدر مصنف ملّا محبّ اللہ بن عبد الشکور بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء) سے تشبیہ دینے کے لیے اُنھیں ''ملا بہاری'' کہا جاتا تھا۔

مولاناؒ کی ناچیز سے خفگی اور پھر رضا مندی کا واقعہ

۱۹۶۹ء میں دار العلوم میں ایک زبردست اسٹرائک ہوئی، راقم الحروف اُس میں

کسی طرح بھی شریک نہ تھا؛ کیوں کہ میں کم سن بھی تھا اور میرا علم اور تجربہ بھی کچھ ایسا نہ تھا کہ میں دیگر ’’عالی حوصلہ‘‘ طلبہ کا ساتھ دے سکتا؛ لیکن ایک روز میں مدنی گیٹ (دارِ جدید کا شمالی دروازہ) سے عصر کی نماز کے بعد کچھ ساتھیوں کے ہم راہ تفریح کے لیے نکل رہا تھا، مولاناؒ بھی اپنے بعض رفقا کے ساتھ بہ غرضِ تفریح نکل رہے تھے۔ اسٹرائک کے تعلق سے اُنھوں نے ہم لوگوں سے کوئی گفتگو کی، میری زبان سے رواروی میں ایک آدھ لفظ ایسا نکل گیا جو مولاناؒ کو اِس درجہ ناگوار گزرا کہ عرصے تک وہ مجھ سے چڑتے اور مجھ کو کوستے رہے۔

بالآخر ۱۹۷۶ء میں، جب میں دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں مدرس تھا، مولاناؒ کی رضامندی حاصل کر لینے میں کام یاب ہوگیا۔ مشفقِ محترم مولانا مفتی ظفیر الدین کے خط سے معلوم ہوا کہ مولانا فلاں تاریخ کو بہ راہِ لکھنؤ دیوبند سے گھر جا رہے ہیں؛ چوں کہ اس وقت لکھنؤ سے دیوبند تک بڑی لائن اور لکھنؤ سے مظفر پور تک چھوٹی لائن تھی، اِس لیے گاڑیوں کی تبدیلی کے لیے مسافروں کو کئی کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑتا تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اُن سے ملنے چار باغ اسٹیشن آگیا۔ حسبِ توقع مولاناؒ چھوٹی لائن کے پلیٹ فارم پر مطلوبہ گاڑی کے انتظار میں تشریف فرما تھے، علیک سلیک کے بعد میں نے مولانا سے عفو و درگزر کی درخواست کی، مولاناؒ نے نہ صرف یہ کہ میری طرف سے اپنا دل صاف کر لیا؛ بل کہ بے پناہ دعائیں دیں اور میرے سر پر دستِ شفقت و برکت پھیرتے ہوئے فرمایا اِن شاء اللہ تم ہمیشہ اور ہر جگہ کام یاب رہو گے۔

دارالعلوم دیوبند کی تدریسی زندگی میں مولاناؒ کا مشورہ اور سکونِ خاطر

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں، دارالعلوم میں حالیہ انتظامیہ کے استوار ہونے کے بعد، جب میں ’’الداعی‘‘ کے مدیر اور استاذ دارالعلوم کی حیثیت سے آیا تو ایک آدھ ماہ گزرنے کے بعد

ہی اُس وقت کے غیر مستحکم حالات میں کچھ زیادہ جی نہ لگا اور میں یہاں مستقل ملازمت کے حوالے سے (دارالعلوم سے غیر معمولی؛ بل کہ نا قابلِ بیان عشق وعقیدت کے باوجود) خاصا متردد ہوگیا، اپنے دیرینہ ومخلص کرم فرماؤں میں مولانا کے علاوہ مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آیا جس سے اِس سلسلے میں مشورہ کرتا۔ میں ایک روز مغرب کے بعد اِس اعتماد و یقین کے ساتھ مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آج مولاناؒ جو مشورہ بھی دیں گے میں اُسی کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اُس پر عمل کرنے کی سعی کروں گا۔ وہ حسبِ معمول اپنے گاؤ تکیے پر داہنی کہنی ٹیکے ہوئے محوِ مطالعہ تھے، میں نے سلام اور مزاج پرسی کے بعد تفصیل سے اپنا مسئلہ اُن کے سامنے رکھا، چند منٹ وہ خاموش رہے جیسے صغریٰ وکبریٰ کو ترتیب دے کر کسی نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہوں، پھر کامل یقین کے ساتھ فرمایا:

> ”عزیزم! تم یہاں از خود تو آئے نہیں؛ بل کہ بلائے گئے ہو، جس منصب اور ملازمت کا انسان از خود طالب نہیں ہوتا تو خدائی مدد اُس کے ساتھ ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب یہ تمھارے لیے خدا کی پسند اور دارالعلوم کے لیے اُس کی طرف سے تمھارا انتخاب ہے، اِس لیے تم ہمت کے ساتھ اپنا کام کرتے رہو، اِن شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا“۔

میں مرحوم کے پاس سے اٹھا تو میرا دل تردد کی تمام کیفیات اور شکوک وشبہات سے اِس طرح صاف تھا، جیسے کسی مؤمنِ کامل کا دل آلودگیِ شرک ونفاق سے؛ چناں چہ یک سو ہو کر اپنے فرائض میں لگ گیا۔

یہاں کی تدریسی زندگی میں رفتہ رفتہ مولانا سے ایسا تعلّقِ خاطر ہوگیا کہ وہ جہاں اپنی تواضع اور ملنساری کی وجہ سے سبھوں کے لیے محبوب ومحترم تھے، وہیں میرے لیے بزرگِ خاندان لگتے تھے۔ میں اُن کی خدمت میں ایک آدھ ماہ کی تاخیر سے حاضر ہوتا تو وہ پدرِ شفیق کی طرح طویل غیر حاضری کا شکوہ کرتے۔ خدائے کریم اُن کو ہر طرح نوازے۔

مولاناؒ کے تعلّق سے مہمان خانۂ دارالعلوم کا ایک دلچسپ واقعہ

دارالعلوم میں میری طالبِ علمی کے زمانے میں، ایک مرتبہ خادمِ قوم وملت امیرِ شریعت بہار واڑیسہ مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ محرم کی شوریٰ کے موقع سے دارالعلوم کے مہمان خانے میں فروکش تھے۔ مولانا بہاریؒ اور مفتی ظفیر الدین مدظلہ (مولانا رحمانی سے اپنے دیرینہ خصوصی تعلق کی بنا پر، اُن کے دارالعلوم میں قیام کے دوران، اُن کی مجلس میں پابندی سے عصر کے بعد حاضر ہونے کے معمول کے مطابق) اُن کے کمرے میں تشریف لائے، بہت سارے طلبہ بھی تھے۔ مولانا رحمانی تھوڑے ہی دنوں قبل حج وزیارت سے مُشرَّف ہوکر دیارِ خدا وحبیب سے تشریف لائے تھے، اُنھوں نے وہاں سے لائی ہوئی عطر کی شیشی حاضرین کی طرف بڑھائی سبھوں نے ذرا بہت لے کر ایک دوسرے کی طرف بڑھادی، جب وہ مولانا بہاریؒ کے ہاتھ لگی تو اُنھوں نے حق ادا کردیا، داڑھی، آستین، سینے، دامن، سبھی کچھ مُعطّر کرلیے۔ مولانا رحمانی نے بڑے ظریفانہ انداز میں اُن سے شیشی طلب کی اور فرمایا ''مولانا! اب واپس کردیجیے، یہ کڑوا تیل (یعنی سرسوں یا رائی کا تیل) نہیں ہے، ساری مجلس زعفران زار ہوگئی اور ہنستے ہنستے لوگوں کا برا حال ہوگیا۔

مدعووین سے ''شاہی نذرانے'' کی وصولی

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے قدیم شاگردوں کی دارالعلوم آمد کے موقع سے، نیز دیگر وارِدانِ دارالعلوم میں سے اپنے تعلّق والوں کی بسا اَوقات دعوت کرتے، لیکن دسترخوان پر مہمان کے بیٹھنے سے پیشتر اور کبھی کبھی دعوت کی تیاری سے قبل، دعوت دیتے وقت ہی فرماتے کہ بھئی پہلے ''شاہی نذرانہ پیش کرو'' مولانا کا ظریفانہ انداز اور حسنِ طلب کی تاثیر اور فرمایش کا جھڑکی والا خاص اُسلوب، شاگرد اور غیر شاگرد سبھی

حسبِ حیثیت بہ خوشی ''نذرانہ'' پیش کر دیتے۔

بعض دفعہ اُن کی دعوت بھی اُن کی عام زندگی کی طرح نہایت سادہ اور بڑی دلچسپ ہوتی: میرے زمانۂ طالب علمی میں اُنھوں نے ایک بار مولانا رحمانی اور اُن کے رفقا کی دعوت کی تو اُس کی فہرست کچھ اِس طرح تیار ہوئی:

''مطبخ کی تین عدد نان، ایک پاؤ کٹڑے کا گوشت، آدھا کیلو چاول کا خشکہ اور پانچ عدد پیاز اور دو عدد ٹماٹر کا سلاد''۔

دارالعلوم کے صد سالہ اِجلاس کے موقع سے شمالی بہار کے ضلعوں میں خصوصی چندہ کی وصولی کا کام مولانا بہاریؒ، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور مفتی ظفیر الدین صاحبان کے سپرد ہوا۔ مولانا بہاریؒ کے رفقائے سفر بتاتے ہیں کہ بعض دفعہ ہم لوگ ایک ایک روز میں دسیوں گاؤں سے مالیہ کی فراہمی سے فارغ ہو جاتے۔ کسی گاؤں میں مشکل سے ایک آدھ گھنٹہ صرف ہوتا اور ہزاروں کا چندہ ہو جاتا۔ گاؤں کے کسی صاحبِ وجاہت آدمی کی بیٹھک میں ہم لوگ بیٹھ جاتے اور مولاناؒ کا حکم ہوتا کہ بھئی سارے تونگروں اور چودھریوں کو جمع کرو۔ جب وہ اکٹھا ہو جاتے تو ایک ایک شخص کو مُخاطَب کر کے فرماتے:

''آپ اِتنے سو، آپ اِتنے ہزار، آپ اِتنے روپے، بس سولہ منٹ میں دید یجیے، ورنہ اِس کے بعد اگر آپ کو کوئی نقصان پہنچا تو آپ جانیں، ہمیں نہ کوسیے گا۔ چند منٹ میں ہزاروں روپئے نقد آجاتے''۔

بعض دفعہ کسی گاؤں کا کوئی صاحبِ حیثیت دعوت کرنی چاہتا یا چائے پلانے کی خواہش کا اِظہار کرتا، تو فرماتے ہم آپ کی دعوت قبول کرتے ہیں بشرطے کہ آپ اِتنے ہزار دستر خوان پر بیٹھنے سے پہلے دے دیں۔ کسی جزرس مال دار سے سابقہ ہوتا تو اُس سے مطلوبہ رقم، متعینہ وقت میں حاضر کر دینے کا حکم دینے کے بعد فرماتے:

''آپ دیں یا نہ دیں میں نے اپنی بات کہہ دی''۔

مولانا اِس طرح کے جملے ایسے لوگوں کو اِس طرح کڑک کے ساتھ، تیوری چڑھا کر مؤثر انداز میں کہتے کہ وہ مطلوبہ رقم دینے میں سکنڈوں کی تاخیر کو بھی، اپنی دنیا وعقبیٰ کی بربادی کے لیے بہت سارے نامعلوم خطروں کو دعوت دینے کا مترادف سمجھتے اور سارے کام چھوڑ چھاڑ، جہاں سے بن پڑتا روپئے حاضر کر دیتے۔

خدائے پاک اُن کو اپنی کشادہ جنّت میں جگہ دے۔

وفات

وفات سے چند ماہ قبل تک مولاناؒ کی عمومی صحت اچھی تھی اور بڑھاپے کے اَعذار کے سوا الحمد للہ اُنھیں کوئی تکلیف نہیں تھی؛ لیکن ۸/اکتوبر ۱۹۹۱ء کو اُن پر لقوہ کا حملہ ہوا اور جدید وقدیم طریقہ ہائے علاج سے وہ شفایاب ہو چلے تھے کہ ۱۲/دسمبر ۱۹۹۱ء جمعرات کے روز مغرب کی نماز کے لیے کھڑا ہونا چاہتے تھے کہ یکا یک گر گئے اور کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ایک دو روز بعد مظفر نگر کے ایک ہڈی کے پرائیوٹ ہسپتال میں اُنھیں داخل کیا گیا؛ لیکن وہ اکثر اوقات بے ہوش رہے، کچھ اِفاقے کے بعد ۲۷/دسمبر کو اُن کے صاحبزادگان، جو اُن کی تیمارداری کے لیے آئے ہوئے تھے، اُنھیں دیوبند واپس لے آئے۔ وفات سے تین روز قبل سے اُن پر پھر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی اور موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر یک شنبہ ۶/رجب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۲/جنوری ۱۹۹۲ء کو ٹھیک ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر اُس گنجینۂ علم وحکمت نے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ موت کے وقت وہ تقریباً ۹۰ سال کے تھے۔ اُنھوں نے چالیس برس سے زائد عرصے تک مادرِ علمی دار العلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دی۔ دار العلوم میں بہ حیثیت مدرس اُن کا تقرر ۳/ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۷/اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ہوا تھا۔ اُنھوں نے اِس طویل عرصے میں سیکڑوں شاگرد پیدا کیے، جن میں بعض عالمی شہرت یافتہ علمائے باکمال بھی ہیں۔

خدائے کریم اُن کے درجات بلند فرمائے، اُن کے پس ماندگان اور تمام شاگردوں اور اہلِ تعلق کو صبر جمیل و اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین

حیاتِ انساں ہے شمع صورت، ابھی ہے روشن ابھی فسردہ
نہ جانے کتنے چراغ یوں ہی جلا کریں گے، بجھا کریں گے

یکتاے زمانہ

حضرت مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ

۱۳۴۹/۱۴۱۵ھ=۱۹۳۰/۱۹۹۵ء

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے اِنسان نکلتے ہیں

حضرت الاستا مولانا کیرانویؒ پر اِس راقم نے اردو میں با قاعدہ کتاب ''وہ کوہ کن کی بات''، لکھی تھی، جو الحمدللہ بہت چھپی اور بہت پڑھی گئی اور پڑھی جارہی ہے؛ کیوں کہ تحریر کی چاشنی اور صاحبِ سوانح کی ساحرانہ شخصیت دونوں قاری کو دعوتِ خواندگی دیتی رہتی ہیں۔
راقم نے حضرت پر عربی زبان میں بہت مفصّل مقالہ بہ عنوان ''اَلْکَیْرانَوِيُّ ذٰلِكَ الْمُعَلِّمُ وَالإِنْسَانُ وَصَانِعُ الرِّجَالِ وَالتَّارِيْخِ'' سپردِ قلم کیا تھا، جو ''الداعي'' کے شمارہ۱، جلد۱۹، محرم ۱۴۱۶ھ مطابق جون ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ زیرِ نظر مقالہ بہ راہِ راست اردو میں لکھا گیا تھا، جو نذرِ قارئین کیا جارہا ہے، یہ نہ تو عربی سے ترجمہ ہے اور نہ ''وہ کوہ کن کی بات'' سے ماخوذ ہے۔ (امینی)

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ میں، مردم گری وافراد سازی میں بے مثال گزرے ہیں۔ بعض فضلا اُنھیں دارالعلوم کے پیش رو مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ (متوفی ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۹ء) بن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (۱۲۴۷-۱۳۲۵ھ = ۱۸۳۱-۱۹۰۷ء یکے از اساس گزارانِ دارالعلوم) سے مردم گری میں تشبیہ دینے کے لیے "حبیب الرحمٰن ثانی" بھی کہتے اور لکھتے ہیں؛ لیکن میری اور میرے جیسے اکثر فضلا وعلما کی رائے ہے کہ مولانا کیرانویؒ افراد سازی میں ہمہ گیریت کی وجہ سے، کسی کے ثانی نہیں؛ بل کہ لاثانی تھے اور ہر لاثانی لافانی ہوتا ہے؛ اِس لیے وہ الحمدللہ زندہ وتابندہ ہیں اور اِن شاءاللہ آیندہ بھی رہیں گے۔

خدائی صنعت کی خاص دین

حضرت مولانا کیرانویؒ کی زندگی پر (شعوری وتعلیمی وقفے سے عملی وتدریسی منزل کے آخری لمحے تک پر) محض طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی، ہر کس وناکس کو یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ خدائی صنعت کی خاص دین تھے۔ خداے حکیم نے اُنھیں تعلیم وتربیت کی دنیا میں ممتاز رول کی ادائیگی اور مدرسی ماحول کی ہمہ گیر اصلاح اور انقلاب آفریں عمل کی انجام دہی کے لیے خلق کیا تھا۔ اُنھوں نے قدیم ماحول میں ہی تعلیمی سفر طے کیا؛ لیکن جدید ترین اداؤں سے جتنے وہ واقف تھے، کہا جاسکتا ہے کہ خاص جدید ماحول کے پروردہ کو بھی شاید اِتنی ہمہ گیر وثمر آور واقفیت نہیں ہوتی۔ وہ بہ یک وقت عبقری مُعلِّم، جلیل القدر مُربِّی، بے نظیر مُصلح، مفید تر اور انوکھے موضوعات کے مُصنِّف، ہنر مند قلم کار وقلم کار گر، نئے سَمْت کے صحافی وصحافی ساز، مُدَبِّر عالم، مُنتظِم ذمّے دار، لدنی انجینیر و آرکیٹکٹ، خوش نوا و پرجوش وسحر خیز مقرِّر اور فن کار و پُرکار تعلیم یافتہ اور اِس کے علاوہ بہت کچھ تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ماحول اور زمانے کے رویّوں کو بہت دور تک، بہت واضح طور پر دیکھ لیتے تھے؛ اِسی لیے کام کا خاکہ بنانے اور اُس خاکے میں رنگ بھرنے میں، کسی اِبہام کا شکار ہوتے تھے نہ اُلجھاوٴ کا۔

اُن کی تعلیمی، تربیتی اور اِصلاحی فتوحات واکتسابات کی مَعْنوِیَّت کو اگر مُختَصر لفظوں میں سیمٹا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں بے پناہ لینے کی صَلاحِیّت تھی اور اُس سے زیادہ دینے کی، جو لیتا نہیں وہ کیا دے سکتا ہے، ''اُو خود کہ گم است کرارہ بری کند'' ایسے لوگ جو لینے دینے سے ناآشنا اور لاتَعلُّق ہوتے ہیں وہ اِنسانی مُعاشَرے کے لاخیرے افراد ہوتے ہیں، بے فیض اور گھامڑ۔ ہاں بہت سے لوگ صرف لینا جانتے ہیں، دینا نہیں جانتے، یعنی وہ اَخذ و تحصیل کی مثالی لِیاقت کی وجہ سے خود تو بڑے فاضل اور فائق بن جاتے ہیں؛ لیکن وہ فیضان ناآشنا رہتے ہیں؛ کیوں کہ وہ دینے کا سلیقہ نہیں سیکھ پاتے؛ لہٰذا اُن کا ابرِ سیاہ؛ بل کہ ابر سفید پانی سے لبریز ہونے اور بار بار گرجنے کے باوجود، برسنے سے رہ جاتا ہے۔ راقم الحروف کو علم وفکر کی دنیا کی بہت سی زندہ ومردہ عظیم ہستیوں کا علم ہے، جو اِسی قبیل کے تھے۔ دوسری طرف بہت سے مُدَرِّسین ورجالِ تربیت ودعوت دیتے تو ہیں؛ لیکن بد سلیقگی، پھوہڑپن اور بے ڈھنگے طریقے سے؛ اِسی لیے اِنسانوں کو اُن سے فائدہ نہیں ہوتا اور لینے والے محروم اور شرم سار رہتے ہیں، ضیاعِ وقت کے سوا کوئی چیز اُنھیں ہاتھ نہیں آتی۔ زیادہ تر مُدَرِّسین، مُصْلِحِین، رجالِ تربیت اور دُعاۃ اِسی زمرے میں آتے ہیں؛ اِس لیے وقت کا مُوَرِّخ اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ گویا وہ اپنی برادری میں ''عوام'' کے درجے میں ہوتے ہیں، تاریخ عوامی سطح کے لوگوں کو گھاس نہیں ڈالتی، وہ چنیدہ وبرگزیدہ کو ہی منھ لگاتی ہے۔

معلوم سے مجھول تک رسائی کی غیر معمولی صلاحیّت

حضرت مولانا کیرانویؒ نے مکتب، مدرسہ، اساتذہ، زمانہ، ماحول اور تجربے سے اِس سلیقے سے سیکھا کہ اِس سلیقے سے صرف اُنھی کی طرح کے گنے چُنے علم وہنر کے سُنار اور مستری سیکھتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے علم وآگہی کے سرمایے کی لیاقت کے ساتھ ''سرمایہ کاری'' کی اور غیر معمولی ''منافع'' کمائے، چناں چہ معلوم سے مجھول تک رسائی کے جو

دروازے، اُن پر وا ہوے وہ کم سعادت مندوں کے لیے وا ہوتے ہیں۔ اِس حوالے سے قارئینِ کرام کے لیے، صرف ایک مثال کافی ہوگی: عربی زبان کو زندہ و مُتحرک اور روزمرہ کے استعمال، نیز لکھنے بولنے کی زبان کی حیثیت سے اُنھوں نے باقاعدہ کسی اُستاد سے نہیں سیکھا؛ بل کہ اُنھوں نے چند خوشے ایک آدھ خرمَن سے اٹھا لیے اور اپنی فطری صَلاحِیَّت، لینے اور اَخذ کرنے کی حیرت انگیز لیاقت سے اور فکری ارتکاز پر بے نظیر طور پر عمل پیرا ہو کر اِس فن کے باکمال؛ بل کہ بے مثال فرد بن کر اُبھرے اور دارالعلوم کی فضا میں ہمہ گیر اِنقلاب کے بانی ثابت ہوے اور اُس کے حال و مستقبل کو اِس تعلّق سے ماضی سے یکسر مختلف بنا دیا۔ اور چوں کہ دینی علوم کے حوالے سے دارالعلوم کو غیر معمولی وقار و اعتبار اور عوامی مقبولیّت برِّ صغیر میں حاصل ہے؛ اِس لیے عربی زبان کی ہمہ گیر ترویج و اشاعت کی جو فضا، اِس پورے دیار میں بنی، اُس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی؛ کیوں کہ یہاں جو صدا بلند ہوتی ہے، وہ خدا کے فضل سے برِّ صغیر میں کُو بہ کُو پھیل جاتی ہے اور اُس کی (دارالعلوم کی) برگزیدگی کی وجہ سے، وہ صدا صرف مسموع نہیں رہتی؛ بل کہ معمول بہ ہو جاتی ہے۔

حضرت مولاناؒ جس تعمیری، تخلیقی اور اِنقلابی ذہن کے ساتھ خلق ہوے تھے، اُس ذہن کا اِنسان، کسی فن اور پیشے یا ڈیوٹی کو محض بے جان طریقے سے، روٹینی انداز میں انجام دینے پر بس نہیں کرتا، وہ کوئی بھی کام کرے، اپنے اندازِ کار، روح کی گرمی، فکر کی روشنی، تخیُّل کی بلندی، راے کی پاکیزی، سوچ کے انوکھے پن اور اپنے عام رویّے سے گرد و پیش پر اِتنا اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ اُس پر چھا جاتا ہے اور بالآخر سارا ماحول اُسی کے پیچھے چلنے اور اُسی کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ کسی تعلیم گاہ میں بہت سے اساتذہ برسرِ عمل ہوتے ہیں؛ لیکن وہ اپنی جامعیَّت اور اِفادے کی ہمہ گیری کے بہ قدر ہی، طلبہ کے ذہنوں پر اثر انداز ہو کر اُنھیں اپنے سوچ کے دھارے پر ڈال پاتے ہیں۔ اساتذہ کی بڑی تعداد اور غالب اکثریَّت محض حرفِ علم کی تلقین کنندہ ہوتی ہے؛ اِسی لیے وہ اپنے

مستفیدین کے ذہنوں پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑ پاتی اور اُن کی زندگی میں کسی طرح کے انقلاب کا ذریعہ نہیں بنتی۔ ایسے معلّمین احترام کا اپنا حصّہ پانے کے باوجود، جوانوں کے دل ودماغ پر مُسلّط نہیں ہو پاتے۔ یعنی آخر الذکر کو اول الذکر کو نمونۂ عمل نہیں بناتے۔

کتابِ علم کے ساتھ،
کتابِ آدابِ حیات پڑھانے والا عبقری مُعلّم

حضرت مولانا کیرانویؒ کا صرف یہی امتیاز نہیں تھا کہ وہ مُتعلّقہ کتاب یا مضمون کو، مُعاصرین واَقران سے زیادہ بہتر طریقے سے پڑھا لیتے تھے اور ترسیل کی ساحرانہ صَلاحیّت کے مالک تھے؛ بل کہ اُن کا یہ بھی عجیب وغریب کمال تھا کہ وہ کتابِ علم ومضمونِ فن کے ساتھ ساتھ کتابِ آدابِ حیات بھی پڑھا دیتے تھے۔ طالبِ علم کو اُن کے سبق سے مُتعلّقہ علم وفن کی مہارت کے ساتھ ساتھ، زندگی کے ہمہ گیر اصول وآداب، نتیجہ خیز داعی کی صفات، کام یاب مُعلّم کے کمالات، سچے مسلمان کی ذمّے داریوں اور بامقصد اِنسان کے عزائم کا بہ خوبی نہ صرف علم ہو جاتا تھا؛ بل کہ عملی تربیت بھی ہو جاتی تھی۔ مُعلّمِ کیرانویؒ دیکھنے سننے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، سفر کرنے ہم سفر بننے، مہمان بننے میزبانی کرنے، ملنے جلنے، ایک دوسرے کے ساتھ رہنے، اِجتماعی زندگی گزارنے، سبق سننے سبق پڑھانے، درجے میں آنے درجے سے جانے، سلام کرنے سلام کا جواب دینے، اِصلاح قبول کرنے اِصلاح کرنے، غم وخوشی کو برتنے، جلسہ یا میٹنگ کرنے، تقریر کرنے تقریر کو سننے، انتظامی ذمے داریوں کو نباہنے، کسی انجمن، اِدارے یا مدرسے کو چلانے، تربیت دینے تربیت پانے، حتی کہ دار العلوم کے مطبخ سے روٹی لانے، دسترخوان سجانے اور اپنے بدن، کپڑوں اور ماحول کو صاف رکھنے وغیرہ جیسی سیکڑوں چیزوں کے اُصول وضوابط کی تعلیم کے ساتھ ساتھ، اُن کی ایسی مشق کرا دیتے تھے کہ اُن کی تعلیم کو جذب کرنے والا سعادت مند طالبِ علم، زندگی کے کسی

شعبے میں کبھی بھی اور کسی جگہ بھی نامراد نہیں ہوسکتا تھا۔

مولانا طالبِ علم کی نشست و برخاست، حرکت و سکون، رفتار و گفتار، طرزِ عمل اور ہر قول و فعل میں اُس کے برتاو پر عُقابی نگاہ رکھتے۔ وہ نہ صرف اپنے درجوں کے طلبہ؛ بل کہ دارالعلوم کے سارے طلبہ کو، اپنے ہی طلبہ سمجھتے تھے اور اِسی حَیثِیَّت سے اُن سے معاملہ بھی کرتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے سبق میں؛ بل کہ دارالعلوم کے کسی بھی طالبِ علم کی، کسی بھی جگہ فہمایش سے چوکتے نہ تھے۔ کسی بھی طالبِ علم کی کج رفتاری اور ناروا گفتاری پر اُس کی قولاً یا فعلاً تادیب ضرور کرتے تھے۔ فعلاً میں تھپڑ رسید کرتے یا ضربِ تادیبی کی کوئی بھی شکل اختیار کرتے۔ وہ ہماری طالبِ علمی اور تدریسی زمانے میں تنہا ایسے فرد تھے کہ دارالعلوم کے ماحول میں زبانی روک ٹوک کے علاوہ، ضربِ تادیبی سے بھی کام لیتے تھے، اُن کے رعب داب نیز اُن کی تعلیمی و تربیتی بخشایشوں کی بے پناہی کی وجہ سے، اُنھیں جو برگزیدگی اور احترام حاصل تھا، اُس کی بنا پر کسی بھی سرکش اور بے ادب طالبِ علم کو بھی، اُن کے خلاف سرکشی کا کوئی رویّہ برتنے کی ہمّت نہیں ہوتی تھی۔

وہ لینے سے زیادہ دینے کے فن میں طاق واقع ہوے تھے۔ کسی معلم کا یہ اعجاز ہوتا ہے کہ جو کچھ اُس نے سیکھا ہے اُس کو بہ آسانی دوسروں کو سکھادے۔ مولانا کیرانویؒ کا یہ اِعجاز در اِعجاز تھا کہ وہ اپنے سیکھے ہوے سرمایے سے زیادہ اور بہت زیادہ، اپنے سے سیکھنے والوں کو سکھادیتے تھے اور بہت کم وقت میں اور بڑی سہولت کے ساتھ۔ نیز تَعَلُّم اور اخذ کے لیے وہ تلامذہ میں ایسی صلاحیّتیں تخلیق کردیتے تھے، جن سے اُن کے لیے تَعَلُّم کا عمل آسان اور شوق انگیز ہوجاتا تھا۔ مجھے بہت بار ایسا محسوس ہوا کہ وہ لینے سے اِبا کرنے اور تَعَلُّم سے پرہیز کرنے والوں کو بھی لینے کا رسیا اور تَعَلُّم کا خوگر بنادیتے تھے۔ میں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی مرحلے میں بعض خدارسیدہ اساتذۂ گرامی سے سنا تھا کہ استاذ وہ نہیں جو کتاب اور مضمون پڑھادے؛ بل کہ استاذ وہ ہے جو مُتعلِّقہ کتاب اور فن سے نہ صرف مُناسبَت بل کہ عشقِ بے پناہ پیدا کردے کہ طلبہ کو مُتعلِّقہ فن سے چین نہ ملے۔ مولانا

کیرانویؒ کو میں نے اِس معیار پر جتنا تولا اُنھیں اِس سے سوا پایا۔ بعض جہان دیدہ اہل علم ونظر سے راقم نے سنا تھا: لَا یَکُوْنُ الْمُعَلِّمُ مُعَلِّمًا حَتّٰی یَکُوْنَ مُلْهَمًا یعنی کوئی اُستاذ اُستاذ کہلانے کا اُسی وقت مستحق ہوتا ہے، جب وہ اُس منزل پر پہنچ جائے کہ اُس کو ''اِلہام'' ہونے لگے کہ کس مضمون کو کس طرح پڑھائے اور کس اُلجھن کو کس طرح دور کرے اور کون سی بات کہاں کہے اور کون سا انداز کہاں اختیار کرے، درازنفسی سے کب کام لے اور اختصار کا ہتھیار کب استعمال کرے؟ یہ اور اِس کے سوا ہزاروں اور لاتعداد مسائل میں وہ ایسا ہنرمند واقع ہو کہ لگتا ہو کہ اُس نے کتاب اور اُستاذ سے نہیں؛ بل کہ اپنے رب سے بہ راہِ راست اخذ کیا ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ میرے علم ومطالعہ وتجربے کے مطابق مُعاصر مُعلِّمین میں مُکمَّل طور پر اِسی معیار کے تھے، نہ صرف عجم میں؛ بل کہ عرب میں بھی کوئی اُستاذ اِس حوالے سے اُن کی ٹکّر کا کم از کم میں نے نہیں دیکھا۔

میں نے عرب وعجم کے بہت سے تعلیم کدے دیکھے ہیں، بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم سے ملاقات کی ہے، چیدہ علما ومُفکِّرین سے تبادلۂ خیال کیا ہے، بعض اساتذۂ عرب سے، اُن کے درجوں میں اور حلقہ ہائے درس میں بیٹھ کر استفادے کا موقع بھی ملا ہے، ہندوستان کے مُتعدِّد پرسوز اساتذہ سے میں نے پڑھا ہے، سلیقہ طریقہ سکھانے والے اُستاذوں کے سامنے زانوے تعلّم تہ کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے، سبھوں کے احترامِ کامل کے ساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ مُعلِّم کی حیثیت سے سبھوں سے فائق تھے۔ وہ دراصل مُعلِّم ہی پیدا کیے گئے تھے، یہی اُن کا اصل جوہر تھا۔ اگر تقدیرِ الٰہی سے وہ اِسی کے لیے یک سو ہو جاتے اور دگر دلچسپیوں نے اُن کے اوقاتِ کارکا، تیا پانچہ، نہ کیا ہوتا اور وہ اِس ''طبعی درد'' کے علاوہ دگر بہت سے درد کی پرورش میں نہ لگتے، تو آج کا برِّصغیر اُن کی تدریسی برکات اور تعلیمی وتربیتی تخلیقات سے اِس طرح بھرا ہوا نظر آتا کہ چپّے چپّے پر اُن کے فیضان کو محسوس کیا جا سکتا تھا؛ لیکن سرمایۂ وقت کی تقسیم کے باوجود، اُنھوں نے جو کچھ کیا اپنی کیفیت کے اعتبار سے آب دار موتی

کی طرح ممتاز اور دور سے چمکتا ہے۔

سچّے اور کام یاب مُعلِّم کا امتیاز

سچّا اور کام یاب مُعلِّم وہی ہوسکتا ہے جو اپنے نتیجۂ عمل کو دیکھ کے اِس طرح باغ باغ ہو جیسے کوئی باپ اپنے اکلوتے بچے کی ہنرمندی سے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اِس معیار سے میں نے جتنی مرتبہ آنکا، وہ یکتا نظر آئے۔ مرحوم اپنے شاگردوں کی فرزانگی بالخصوص اُن کی علمی تَرَقّی سے حد درجہ خوش ہوتے اور ہر جگہ تذکرہ کرتے، سراہتے، دعائیں دیتے اور فرماتے کہ مجھے اِس سے بھی زیادہ تب خوشی ہوگی، جب وہ نہ صرف علمی؛ بل کہ دینی و دنیوی دونوں سطحوں پر شہرت و عزّت اور صَلاحیّت میں مجھ سے ہزار درجہ بڑھ جائے۔ یہ اُن کے سچے اور مُخلِص اُستاذ ہونے کی دلیل تھی؛ ورنہ مجھے تدریسی زندگی کی راہوں میں بہت سے اُستاذ کہے جانے والے، ایسے لوگ بھی ملے جو اپنے خُرد وں اور تلامذہ کی ترقی سے بہت نالاں نظر آئے، غالباً وہ یہ سمجھتے تھے کہ خُردوں کی ترقی سے اُن کی تَرَقّی رک گئی ہے، یا اُن کے قد چھوٹے ہوگئے ہیں۔

ہمہ گیر عبقریّت

حضرت مولانا کیرانویؒ عبقری مُعلِّم تو تھے ہی؛ لیکن اُن کی عَبقَرِیّت ہمہ گیر تھی۔ اُن کے سارے کارناموں میں انوکھے پن کا رنگ انتہائی شوخ تھا۔ وہ سرعت سے سوچتے، سرعت سے منصوبہ بندی کرتے اور بہ عُجلت اُس کو عملی جامہ پہنانے کو اُٹھ کھڑے ہوتے۔ اُن کے مُنحنی جسم میں عجیب سا دماغ تھا، جو شعلے کے مانند روشن، شیشے کی طرح شفّاف اور سیماب کی طرح بے تاب رہتا تھا۔ شاید وہ کسی لمحہ پرسکون نہ ہوتا تھا، ہمہ دم سوچتا اور خاکے بناتا رہتا تھا؛ اِسی لیے اُنھیں جلدی اور گہری نیند کبھی نہیں آتی تھی، جس کی وجہ سے اُن کی صِحّت پر قدرتاً منفی اثر پڑتا تھا۔ منفی اثرات کی بے پناہ یلغار

سے ہی وہ بہ ظاہر بہ عجلت لقمۂ اجل بن گئے، دگر اسباب کے ساتھ ساتھ اُن کی روشنیِ طبع بھی، اُن کے لیے بَلائے جاں ثابت ہوئی۔ دنیا کے زیادہ سوچنے والے دماغ کے حامل لوگ اندر ہی اندر جلتے اور پگھلتے رہتے ہیں اور بالآخر بہ جلد اُن کا وجود تحلیل ہوجاتا ہے۔ مولاناؒ بے چین طبیعت کے مالک تھے، اُن کے وجود کے دُبلے پتلے ڈھانچے میں اُن کا دماغ مشین کی طرح ہمہ وقت مُتحرِّک رہتا تھا، حتی کہ سخت بیماری کی حالت میں بھی وہ زندگی کے مسائل کا حل ڈھونڈتے رہتے اور تعلیم وتربیت کے نئے نئے انداز کی نقشہ گری کرتے رہتے تھے۔ وہ مثلاً تدریس کے دوران درجے میں طلبہ کو 'النادي الادبي' کے سالانہ جلسے کے چار پانچ خاکے بتاتے، طلبہ اُن کے نرالے پن کی وجہ سے، اُن میں سے ہر ایک کو بہت پسند کرتے؛ لیکن مثلاً اُسی روز ''النادي'' کی رات کی میٹنگ میں دس بارہ اور نرالے اور پہلے خاکوں سے خوب تر خاکے پیش کرکے پوچھتے یہ کیسے رہیں گے؟ طلبہ کہتے: حضرت! یہ تو اُن سے بھی بہ درجہا بہتر ہیں، اِنھی کے مطابق سالانہ جلسے کی تیاری اور تقسیم کار کی جائے تو جلسہ لاجواب ہوگا۔

دفترِ تعلیمات یا دفترِ اہتمام میں، ناظمِ تعلیمات یا مُعاونِ مُہتَمم کے منصب پر برسرِ عمل رہنے کے زمانے میں کوئی مجلس مشورے کی کسی موضوع پر مُنعَقِد کرتے اور مُتعلِّقہ اساتذہ کو پہلے سے ایجنڈہ کی کاپی بھجوادیتے اور اُن سے خواہش کرتے کہ وہ مُتعلِّقہ موضوع پر مسائل کا حل سوچ کے آئیں۔ مجلس ہوتی تو مُتعلِّقہ مدعو حضرات تو غور وفکر کرکے آتے یا نہ آتے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریری طور پر مسئلے کے ہر جزو کے تعلُّق سے کئی کئی حل لکھ کے بھی لاتے، جو وہ اساتذہ اور مُتعلِّقہ لوگوں کی گفتگو سننے کے بعد، اُن کی طرف سے، خاطر خواہ جوابات پیش نہ کرنے کی صورت میں سناتے اور اُتنے ہی حل انھی مسئلوں کے زبانی بھی بتاتے، جو لکھے ہوئے سے علاحدہ اور اطمینان بخش وحیرت انگیز ہوتے، تو لوگوں کو خوشی بھی ہوتی اور تعجُّب بھی۔

دماغ کے ہمہ وقت مصروفِ کار اور ذہن کے ہمہ دم مائل بہ تخلیق ہونے کی وجہ سے

ہی اُن کے لیے، کسی اچھی کتاب کا مطالعہ مشکل ہوتا تھا، وہ کتاب کے چند ہی صفحے پڑھتے کہ اُن کے دماغ میں مضامین، کتابوں، تدریسی اسباق، تحقیق کے نئے زاویوں اور طلبہ کے علمی، فکری، تربیتی مواعظ کے نئے نئے اور کارآمد خاکے اُبھرنے لگتے اور وہ کاغذ، قلم، پنسل، اِسکیل اور ضروری لوازمات لے کر بیٹھ جاتے۔ اگر رات ہوتی، اُس کی پروانہ کرتے پوری رات اِسی اُدھیڑ بن میں رہتے کہ زیرِ مطالعہ کتاب کی عبارت، مضامین اور طرزِ نگارش سے کیا کیا فائدے اٹھائے جاسکتے ہیں۔ اُن کے پاس صبح کو پہنچنے والے مُتعلّقہ لوگوں کو علم ہوتا کہ اُنھوں نے رات بھر میں استفادے کے یہ نقشے مُرتّب کیے ہیں اور اِتنے سارے مضامین لکھ ڈالے ہیں، تو اُنھیں حیرت ہوتی اور اُن کی جان کاہی پر رحم بھی آتا۔

کوئی مُدرِّس، طالبِ علم اور علمی شغل رکھنے والا وَارِد و صادر اُن کے پاس جاتا اور اَحوالِ واقعی سنانے کے بعد، اُن سے لکھنے پڑھنے کے حوالے سے مشورہ کرتا، تو مقالہ نویسی، تالیفِ کتاب اور عام مطالعۂ ونگارش کے مُتعدِد اِتنے سلجھے ہوے اور لائقِ عمل خاکے اُس کے سامنے پیش کردیتے، کہ اُس کو دل چاہی مراد مل جاتی اور وہ مچلنے لگتا اور سوچتا کہ کب اپنی منزل پر پہنچوں اور فوراً اِن خاکوں کے مطابق کام شروع کردوں کہ یہ تو بہت آسان، بہت مفید اور بہت مرغوب ثابت ہوگا۔ مولاناؒ صرف ''آوٹ لائن'' ہی نہ بتاتے؛ بل کہ کام کو عبور کرنے کے لیے پوری راہ کے نقوش بھی اُجاگر کردیتے؛ لہٰذا راہیِ عمل بھٹکتا، نہ مُترَدِّد ہوتا، نہ بھٹکنے کے اَندیشوں کا شکار ہوتا؛ بل کہ اُس پر سیدھا اور دوڑتا ہوا منزل تک پہنچ جاتا۔

آسانی اور خوش اُسلوبی سے دینے والا داتا

اُن کی عَبقَرِیَّت کے خانے ہی میں یہ بات بھی آتی ہے کہ وہ لینے والے کو بڑی آسانی سے، بہت جلد اور انتہائی مختصر وقت میں مطلوبہ شے دے دیتے۔ اُن کے پاس دینے کے لیے نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا، دینے کا سلیقہ تھا، عطا کرنے کو بے تاب رہتے

تھے؛ لہٰذا بہ عجلت تمام، علم و فکر کی بھیک "بھکاری" کے ہاتھ میں ہوتی تھی؛ بل کہ بھکاری کے لیے مانگنا بھی شرط نہیں تھا؛ بعض دفعہ وہ "بے نیاز بھکاری" کو بھی عطا کر دیتے تھے اور عطیے کی قدر کرنے کا راز بھی باور کرادیتے تھے۔ میں نے ۳۳-۳۴ سالہ تدریسی زندگی میں اور اُس سے قبل دس سالہ طالبِ علمی میں، بہت سے مدرسین کو پایا کہ وہ یا تو کچھ دے ہی نہیں پاتے تھے، یا اِتنی دیر میں دیتے تھے کہ لینے والا، لینے سے اِبا کرنے لگتا تھا، کوئی چیز جب سیدھے ہاتھ سے نہ دی جائے، گھما پھرا کے دی جائے، جیسے دینے والے کو دینے کا اِرادہ نہ ہو، تو لینے والا اُوب جاتا ہے اور مطلوبہ شے کی گراں قدری، اُس کے لیے باعثِ کشش نہیں رہتی؛ بل کہ وہ سوچتا ہے کہ اِس کا نہ لینا ہی بہتر ہے۔

یوں تو ہر آدمی منفرد اِکائی کی حَیثِیَّت رکھتا ہے اور اپنی الگ شناخت کے حوالے سے، اپنی ساری کام یابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ، لاجواب ہوتا ہے۔ معمولی ہو یا غیر معمولی، خواندہ ہو یا ناخواندہ، دین دار ہو یا بے دین، مسلم ہو یا غیر مسلم: ہر فردِ بشر اپنی الگ پہچان رکھتا ہے، درحقیقت کوئی اِنسان دوسرے اِنسان کا جواب اور اُس کا بدل یا اُس کی نظیر نہیں ہوتا؛ لیکن حضرت مولانا کیرانویؒ کو اپنے نام "وحید الزماں" کا جو وافر حِصّہ قدرت کے خزینے سے ملا تھا، اُس کی مثال آسانی سے پیش نہیں کی جا سکتی۔ کاش اُنھوں نے "مُخَالِف سَمت" میں پیراکی نہ کی ہوتی اور ہوا کا رخ دیکھ کے ہی اپنی کشتیِ فکر و عمل کو کھیتے، تو آج علمی تحقیقات اور "انسانی تصنیفات" کی شکل میں اِتنا بڑا ترکہ چھوڑ جاتے کہ لوگوں کے لیے اُس کا سمیٹنا مشکل ہوتا؛ لیکن شاید خالقِ کائنات کو یہ منظور نہ تھا، غالبًا اُس کی یہی مرضی تھی کہ تاریخِ دارالعلوم کا یہ بے مثال بشری ہیرا تراش، اِتنے ہی ہیرے تراش کے، اپنی دکان بڑھادے اور دنیا کے سوچنے والے انسانوں کو، اِس حوالے سے خدا کی حکمت اور قدرت، ہمیشہ حیران رکھے۔

ظاہر و باطن کی یکسانیّت

مولانا رحمۃ اللہ علیہ پکّے مومن تھے، اُن کے ظاہر و باطن میں یکسانیّت تھی، اُن کی

زبان پر وہی کچھ ہوتا جو دل میں ہوتا تھا۔ نفاق، دوہرے پن اور دورنگی سے بالکل دور تھے۔ ایسے آدمی کی آنت شیطانی نہیں ہوتی؛ لہٰذا وہ لمبی منصوبہ بندی، مَصْلَحَتْ اندیشی اور مفاد پرستی کی آلودگیوں سے بھی مُبَرّا ہوتا ہے؛ کیوں کہ اِس فِعل کے لیے جس طرح کی تہہ داری، طویل المیعاد منفی سوچ اور بہ ظاہر نرم گفتاری اور بہ باطن سنگ دلی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اُس سے یکسر تہی مایہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ''چلو تم اُدھر کو ہَوا ہو جدھر کی'' کے نسخے پر عمل کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ زمانہ سازی، ابن الوقتی اور اپنی ذات کے لیے توڑ جوڑ، بلاک بندی اور مُدَاہَنَتْ، اپنے ضمیر کی مُخَالَفَتْ اور تَمَلُّق کے ناپاک؛ بل کہ ''نجسِ عین'' عناصر سے اُس کا خمیر بالکل مُنَزَّہ ہوتا ہے؛ اِس لیے ایسے مزاج کا آدمی عموماً ''لے دے'' کی پالیسی پر عمل کرنے کی سکت نہیں رکھتا اور ''منافع کی تقسیم'' کے بدلے، کسی بھی شرط پر صلح کے لیے تیّار نہیں ہوتا۔

ایسا اِنسان کھرا ہوتا ہے؛ اِس لیے وہ ''سچّائیوں'' کے خلاف کسی چیز کو گوارا نہیں کرتا اور وہ مُعَاشَرِے کے کسی ایسے رویّے پر (جس کو وہ اپنے نزدیک ''ناروا ناہم واری'' تصور کرتا ہے) برافروختہ اور سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ وہ دوسرے کے دلوں کو اپنے دل سے ملانے کی ناکام کوشش کرتا ہے؛ لہٰذا سارے اِخلاص کے باوجود نامراد رہتا ہے، پھر وہ جھنجھلاتا ہے، تلملاتا ہے اور غصّے سے پھٹ پڑتا ہے، تو لوگ اُس کو غُصِیلا اور غیر مُتَوَازِن کا نام دے دیتے ہیں۔ یعنی ردِّ عمل کو عمل شمار کر کے اُس کو نہ صرف ناکارہ؛ بل کہ مجرم سمجھ بیٹھتے ہیں؛ حال آں کہ یہ صورتِ حال اُس کے اِحساسِ نامرادی و محرومی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی اِنسان دودھ کا دُھلا نہیں ہوتا، ظاہر ہے مولاناؒ بھی اِس کُلِّیے سے مستثنیٰ نہیں تھے؛ کیوں کہ وہ بھی اِنسان تھے؛ لیکن مولاناؒ کے حوالے سے جو فضیلت و عظمت اور یکتائی وانفرادیت بیان کی گئی ہے، کسی شدید مُعَانِد کو بھی اُس کے اِنکار کی تبھی جرأت ہوگی، جب وہ سورج کے نصف النہار میں طلوع ہونے کا منکر ہوگا۔

وہ عشق کی طرح بے پرواہ، محبت کی طرح خطر پسند، ایمان کی طرح بے نیاز،

امید کی طرح شفّاف، اور اِخلاص کی طرح تملّق نا آشنا تھے۔ ایسا اِنسان نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہوتا ہے۔

ہوئی نہ عام، جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

جامِعیَّت کا فیضان

مولاناؒ نے اپنی جامِعیَّت کی وجہ سے پوری نسل کو ثقافتی، لسانی، تہذیبی، تعلیمی، تربیتی اور فکری سطح پر جگا دیا اور نسل در نسل کی بیداری کا انتظام کر دیا۔ بلاشبہ وہ دار العلوم کی نشأتِ ثانیہ کے بھی بانی تھے۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء کے دار العلوم کے انقلاب (جو انقلابِ تاریخِ دار العلوم کا بھی باعث بنا) کا اصل سہرا مولانا کیرانویؒ کے سر جاتا ہے، اُنھوں نے ہی اِس کی طرح ڈالی۔ وہی اصل سپاہی اور انجام تک لے جانے والے ''کوہ کن'' تھے، موجِ بلا سے اُنھی نے پنجہ آزمائی کی، تھپیڑے اُنھی نے کھائے، لہریں اُنھی سے آکے ٹکرائیں، منجھ دار میں وہی کودتے اور اُچھلتے رہے، ہر مرض کی دوا جٹانے میں اُنھی کی ''طبابت'' نے کام دیا، طعن و تشنیع کا براہ راست محل بھی وہی بنے اور سب سے زیادہ گھائل بھی وہی ہوئے۔ وہ بڑے مخلص سپاہی تھے، جس محاذ کو سر کرنے کی ٹھان لیتے، سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے، جو اُن کے سلیم القلب ہونے کی علامت تھی۔ اللہ اُنھیں سارے مُخلِصانہ عمل کا بھرپور بدلہ عطا کرے کہ وہ ہر ایک کے جہد و عمل کی حقیقت سے زیادہ واقف ہے۔

مزاح و سنجیدگی کا توازن

حضرت مولانا کیرانویؒ انتہائی کھلے دماغ کے آدمی تھے، ظریف الطبع، خوش مزاج، خوش فکر، نکتہ آفریں، جملہ سنج، کشادہ قلب اور فیّاض نفس۔ ساتھ ہی وہ حد درجہ سنجیدہ و باوقار تھے۔ مذاق اور سنجیدگی کے بیچ کا دُوْرَانِیَّہ اُن کے ہاں بعض دفعہ اِتنا مختصر

ہوتا کہ کھلے ملے لوگ اور تلامذہ و مستفیدین اُنھیں بعض اوقات ایک قالب میں دو بالکل مختلف انسان باور کرتے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہ کوئی مزاحیانہ جملہ استعمال کرتے ہوتے کہ اُسی وقت آن کی آن میں اُن پر کسی ناگزیر اِحساس کے تحت سنجیدگی طاری ہوجاتی، تو خردوں اور بعض دفعہ ہم عمروں کے لیے بھی، اُن سے آنکھ ملانے کی ہمّت نہ ہوتی۔ اُس وقت اُن کی سنجیدگی دیدنی ہوتی، اُن کے چہرے پر عجب سی تمکنت چھا جاتی، اُن کی آنکھیں مجلس کے کسی ایک رخ پر جم جاتیں، گہری خاموشی کا ماحول مجلس پر چھا جاتا، اُن کے ہونٹ ایک دوسرے پر اِس طرح چپک جاتے جیسے وہ بالکل ہی تبسّم ناآشنا ہوں۔ درحقیقت وہ زندگی کے سارے معاملات میں اپنی حد پر رہنے کے قائل تھے۔ حد سے تجاوز اُن کے نزدیک ناروا فعل تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور اساتذہ سے سنا تھا کہ کثرتِ مزاح سے وقار مجروح ہوجاتا ہے اور آدمی کا رعب داب جاتا رہتا ہے، اِس اُصول پر عمل کرتے ہوئے بہت سے لوگ از مہد تا لحد اپنے منھ کا زاویہ خراب کیے رہتے ہیں۔ ''اہلِ نظر'' کہتے ہیں کہ وہ جس دن ہنس پڑیں گے یا تبسّم ریز ہوں گے کوئی بڑا واقعہ ضرور رونما ہوجائے گا، ہوسکتا ہے کہ قیامت بھی آجائے!۔ مجھے اپنی زندگی میں صرف مولانا کیرانویؒ ملے جو انتہائی خوش مزاج بھی تھے اور انتہائی سنجیدہ بھی اور دونوں مسلکوں میں اُن کے ہاں غیر معمولی توازن تھا، جس کی وجہ سے اُن کا کبھی وقار مجروح ہوا اور نہ اُن کے اعتبار اور رعب داب میں کمی آئی۔

کام کرنے اور کام لینے میں طاق

اُنھیں جتنا کام کا سلیقہ تھا، اُتنا ہی کام لینے کا سلیقہ تھا۔ سابق پیش کارِ دارالعلوم بابو جی طاہر (متوفی ۲۸؍شعبان ۱۴۲۲ھ = ۱۵؍نومبر ۲۰۰۱ء) نے اِس راقم سے کئی بار کہا کہ مولانا! میں گورنمنٹ کے محکموں میں کام کر چکا ہوں، اچھے سے اچھے اور خراب سے خراب افسروں سے سابقہ ہوا۔ زندگی کا بڑا دَوْرَانِیَہ سرکاری مُلازَمت میں گزرا،

ریٹائرمنٹ کے بعد میں اپنی خوش قسمتی سے دار العلوم سے جُڑا، یہاں بھی ہر طرح کے ذمّے داروں سے سابقہ پڑا اور پڑتا رہتا ہے۔ میں بڑے اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ "افسر" ہونے کی جو صلاحیت حضرت مولانا کیرانویؒ میں ہے، میں نے کسی میں نہیں دیکھی۔ وہ کام اِس طرح مُرتَّب شکل میں دیتے ہیں کہ مجھے کام سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ چوں کہ وہ کام لینے کی وہبی صلاحِیَّت رکھتے ہیں اور اِس حوالے سے وہ طاق ہیں؛ اِس لیے وہ متعلقہ کام کی "آوٹ لائن" اِس طرح کھینچ دیتے ہیں کہ گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ یہ خوبی میں نے اب تک کسی میں محسوس نہیں کی۔ اگر مولانا کسی جدید اِدارے سے وابستہ ہوتے تو سونے سے تولے جاتے۔ قدیم اِداروں میں کام کرنے کے بعد، اُن کی بہت بڑی خرابی یہ نظر آئی کہ یہاں قدر ناشناسی اور قد تراشی کے ساتھ ساتھ حرف گیری اور شکوہ سنجی کا بڑا چلن ہے، جس کی وجہ سے کارکردگی کی صَلاحِیَّت مُتاَثّر ہوتی ہے اور حوصلہ ساتھ نہیں دیتا؛ بل کہ سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

اُن کا مزاج تھا کہ وہ مُتعیَّنہ وقت میں بہتر کام کے طالب ہوتے تھے۔ ذمّے داریوں کو پوری کروانے کے حوالے سے، بہ وقتِ ضرورت، قدرے سخت گیری سے کام لیتے؛ لیکن کام اچھا کرنے پر بڑی شاباشی دیتے۔ کام کی نزاکت اور اُس کو ہنرمندی سے انجام دینے کے بہ قدر، بعض دفعہ اِتنی حوصلہ افزائی کرتے کہ کام کرنے والے کا دل اِتنا بڑا ہو جاتا کہ اُس کو لگتا کہ وہ اب اُس کے سینے میں اپنی جگہ نہیں سما پا رہا۔ ساتھ ہی اَلاؤنس دلواتے، اپنی طرف سے بھی اِنعام دیتے اور اِقدامی تَرَقّی کی شکل بھی پیدا کرتے۔ عام ذمّے داروں کی عموماً یہ حالت ہوتی ہے کہ خود بھی وہ کام کرنے کے سلیقے سے نابلد ہوتے ہیں اور کام لینے کے فن سے بھی ناآشنا؛ اِس لیے بڑے سے بڑا اور اچھے سے اچھا کام کرنے والا بھی، اُن کی طرف سے کسی ثنا کا مستحق نہیں ہوتا، حرفِ تعریف کی ادائگی کے لیے، اُن کے سِلے ہوئے ہونٹ کبھی وا نہیں

ہوتے۔ اِس سے کام کرنے والوں کا نہ صرف دل ٹوٹتا ہے؛ بل کہ کام کو بہ حسن وخوبی انجام دینے کا ولولہ سرد پڑ جاتا ہے اور بالآخر گرد ہو جاتا ہے۔ کاش ذمّے داروں اور افسران کو یہ بات معلوم ہوتی کی ماتحت لوگوں کو حوصلہ افزائی کے دو بول سے کتنی خوشی ہوتی ہے اور اُن کے سامنے حوصلہ افزائی کا ایک جملہ کتنی دیرپا اور دور رس اِنرجی کا کیپسول ثابت ہوتا ہے۔

کام تو کام کرنے سے ہی آتا ہے

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہت کثرت سے فرماتے تھے کہ کام تو کرنے سے آتا ہے، صرف اِرادے سے نہیں آتا۔ وہ اپنے نو آموز فُضلا؛ بل کہ زیرِ تعلیم طلبہ کو تالیفِ کُتُب، تحریرِ مقالہ اور اِدارتِ رسالہ کی ذمّے داری بلاتکلف سونپ دیتے۔ اگر وہ گھبراتے تو بے پناہ حوصلہ افزائی کرتے۔ اُن میں سے کوئی کام کر کے لاتا تو مُسَوَّدے پر اِدھر اُدھر نظر ڈال کے فرماتے: واہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، بھئی! آپ نے تو توَقُّع سے بھی زیادہ اچھا لکھا ہے۔ اب آپ یہ کیجیے کہ اُستاذ، ناقد؛ بل کہ مُعانِد بن کر اِس پر نگاہ ڈالیے۔ آپ اس میں جتنی زیادہ غلطیاں نکالیں گے، میرے نزدیک اُسی درجہ لائق وفائق، قابلِ حوصلہ افزائی اور مستحقِ قدردانی ثابت ہوں گے اور میں یہ سمجھوں گا کہ آپ واقعی بڑے سے بڑا مشکل تالیفی وتحقیقی کام کر سکتے ہیں۔ اب وہ غلطیاں نکال کے لاتا، تو فرماتے: کیا خوب، بھئی! آپ کی نظر تو بڑی گہری ہے، اِن میں سے بعض غلطیوں تک تو میرا ذہن بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اِس کے بعد حضرت مولاناؒ آخری نظر ڈال کر تحریر کو چھپنے کے لیے صادر کر دیتے تھے۔

جمعیّتِ علمائے ہند کے ''الکفاح'' میں (جس کے وہ مؤسّس اور چیف ایڈیٹر تھے) اور اُس کے قبل دار العلوم میں ''النادی'' کے طلبہ کے دیواری رسالوں میں نئے فضلا اور طلبہ سے کام لیتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سی غلطیاں زبان وقواعد وغیرہ کی ہوتیں۔

لوگ آپ سے اِس بات کی شکایت کرتے، تو آپ فرماتے: بھئی! اِن غلطیوں سے زمین و آسمان نہیں ٹوٹ جائے گا، دیکھیے دنیا اب بھی قائم ہے۔ اِنھیں کام کرنے دیجیے، ایک دن بہ جلد ایسا آئے گا کہ آپ کو اِن کے کام میں کوئی غلطی نظر نہیں آئے گی۔ کسی بھی میدان کے نئے راہی ضرور ٹھوکر کھاتے ہیں۔ کام کرنے سے ہی کام میں پختگی آتی ہے، اِنھیں مایوس کر دیا جائے گا تو تھک ہار کے بیٹھ جائیں گے، پھر لائق آدمی کس طرح تیار ہوں گے؟ آدمی شروع سے لائق نہیں ہوتا، پہلے ''نالائق'' ہوتا ہے، پھر کام کرنے سے لائق ہو جاتا ہے۔

نوجوانوں کی تعمیر میں اُن کا طریقۂ کار

نوجوانوں کی تعمیر میں اُن کا طریقہ یہ تھا کہ وہ خود اعتمادی کی روح پھونکنے کے ذریعے، زیادہ سے زیادہ کام لیتے تھے۔ وہ طلبہ کی غلطیوں پر کبھی اُنھیں اِس طرح نہیں ٹوکتے تھے جس سے حوصلہ پست ہو۔ اِسی طرح طلبہ کو بات ماننے کا بہت عادی بناتے تھے۔ فرماتے تھے ذہانت ثانوی بات ہے، پہلی اور بنیادی صفت طلبہ کی یہ ہے کہ اُن میں اِطاعتِ محض کا جذبہ ہو، جس میں یہ صفت جس درجہ ہوگی اُسی درجہ وہ کام یاب ہوگا اور جو جتنا اِس سے تہی دامن ہوگا اُسی قدر نامراد ہوگا۔ جس طالب علم میں شروع سے یہ صفت ہوتی، اُس کی مزید افزائش کا انتظام کرتے اور جس میں نہ ہوتی اُس میں مُختلف طریقے سے پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ درجے میں سبق کے دوران طلبہ سے ''ترکیز'' Concentration یعنی متعلقہ مسئلوں اور شرحِ درس کے تعلُّق سے ذہنی جماؤ اور بیداری پر بہت زور دیتے تھے؛ کیوں کہ اخذ و تحصیل کی اصل کلید ترکیز ہی ہے۔ ترکیز کی صَلاحِیَّت کی بیداری کے لیے بھی بہت سے مُحرِّکات سے کام لیتے، کبھی یک بہ یک پوچھتے کہ میں کیا کہہ رہا تھا؛ کسی غافل طالبِ علم پر کوئی ظریفانہ جملہ چست کر دیتے؛

کبھی ذہنی تازگی کا کوئی حکیمانہ عمل اِس طرح کرتے کہ عدمِ ترکیز کی کوئی گنجایش، کسی کے لیے باقی نہ رہتی۔

ساحرانہ طرزِ تکلّم

حضرت مولاناؒ کی ایک بڑی خوبی، اُن کا طرزِ تَکَلُّم اور اندازِ مُخَاطَبَت تھا۔ وہ عام مجلس میں گفتگو کرتے، یا جلسے میں تقریر کرتے، یا طلبہ کو پڑھاتے، یا کسی مسئلے کے تعلُّق سے اُنھیں سمجھاتے، یا گھر کے لوگوں سے روزمرہ کی گفتگو کرتے؛ اُن کی بات حشو وزوائد سے پاک، انتہائی مُرَتَّب، تکیۂ کلام کی بیہودگی سے مُبَرَّا ہوتی۔ مُخَاطَب کو ایسا محسوس ہوتا کہ اُنھوں نے سوچ سمجھ کے لکھ کر، رٹ کر یہ گفتگو یا تقریر کی ہے۔ طرزِ ادا میں ٹھہراؤ، جماؤ ہوتا، آواز صاف شفّاف اور پر جوش ہوتی۔ مُخَاطَب مُتَاَثِّر ہوے بغیر نہیں رہ سکتا تھا؛ بل کہ اکثر دفعہ مرعوب ہوجاتا تھا۔ اگر اُنھیں دارالعلوم کی مُعَاصِر تاریخ میں اِس اندازِ تکلُّم کا امام قرار دیا جائے، تو بے جا نہ ہوگا۔ ناچیز راقم نے اسلافِ دارالعلوم کو دیکھا اور سنا نہیں ہے؛ اِس لیے حضرت مولانا کیرانویؒ کا کسی سے مُوَازَنہ نہیں کرسکتا؛ مگر یہ سمجھیے کہ مُخَاطَب کو قائل کرنے اور اُس سے اپنی بات منوانے کا جوفن، اللہ نے اُنھیں عطا کیا تھا، اُس میں مُعَاصِرین میں کوئی اُن کا شریک نہ تھا اور اِس وقت تو کوئی اِس کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

وہ جب کسی موقع سے دارالعلوم میں کسی جگہ یک بہ یک تقریر شروع کردیتے، تو طلبہ اپنے کمروں سے اپنی اُسی حالت میں بھاگے چلے آتے، جس میں وہ ہوتے تھے، لگتا تھا کہ طلبہ کے جذبات وخیالات کو اپیل کرنے والی تقریر کے لیے صرف وہی پیدا ہوے تھے۔ اُن کے جیتے جی اُن کے سوا طلبہ کو مطمئن کرنے کا کام کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر کسی موقع سے وہ کسی جلسے میں نہ ہوتے اور طلبہ سے متعلّق کوئی بات کرنی ضروری ہوتی، تو طلبہ صرف اُنھی کو تلاش کرتے۔

دستِ قدرت کے تراشیدہ

حضرت مولانا کیرانوی نستعلیق، دستِ قدرت کے تراشیدہ انمول پیس Piece لگتے تھے: اُن کا طرزِ پوشش، لباس کی صفائی ستھرائی، رہائش گاہ کی ترتیب، رفتار وگفتار، سج دھج، زندگی جینے اور برتنے کے اُن کے سارے آداب واُصول لائقِ ستائش اور قابلِ تقلید اور باعثِ ریکارڈ تھے۔ زندگی کے اُن کے بہت سے ضوابط پر ایسا لگتا تھا کہ اپنے وقت کے سب سے بڑے مُربی: حکیم الاُمّت مجدّد الملّت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوّر اللہ مرقدہ (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ = ۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) کی ہدایات کی روشنی پڑی ہو؛ حال آں کہ حضرت کیرانویؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ (۱۲۹۵-۱۳۷۷ھ = ۱۸۷۹-۱۹۵۷ء) کے شاگرد اور اُنھیں کے خوشہ چیں تھے۔ حضرت تھانویؒ کو اُنھوں نے دیکھا نہ اُن سے فیض پایا اور مشاغل کی اُس نوعیّت کی وجہ سے، جو اُن کے لیے مُقدّر ہوئی، اندازہ یہی ہے کہ حضرت تھانویؒ کی تربیتی کتب: مواعظ ومجالس وملفوظات وغیرہ کے پڑھنے کا اُنھیں وقت نہیں ملا ہوگا؛ لیکن اُن کے خاندانی ماحول، والدین کی تربیت، اُن کے شریفانہ گھرانے کی روایت، اساتذۂ کرام کی نگاہِ کایا پلٹ اور اپنی ذات کی تعمیر وتہذیب میں اُن کی محنتِ پیہم، نے اُنھیں ایسا تراشا تھا کہ ربِّ کریم کے طفیل سے اُنھیں اپنے ہم عصروں میں یکتائی وانفرادیّت کا طمغۂ امتیاز حاصل تھا، جس پر معاصرین کو رشک تو آتا تھا؛ لیکن اُنھیں غالباً اُن سے حسد کرنے کی سکت نہیں تھی؛ کیوں کہ دل کی گہرائیوں میں وہ بھی اِس حوالے سے اُن کے استحقاقِ کلّی کے قائل تھے؛ بل کہ بہت سے شریف مُعاصِرین تو زبان سے بھی اِس سچائی کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے۔

جدید وقدیم طبقوں میں یگانہ

حضرت مولاناؒ علمائے دین کی مجلسوں میں ہی نہیں؛ بل کہ جدید تعلیم یافتہ دانش

وروں کی بزم میں بھی اپنی نشست و برخاست سے یگانہ لگتے تھے؛ لیکن بے گانہ اور اجنبی محسوس نہیں ہوتے تھے کہ وہ جدید ترین ''روشن خیالوں'' سے بھی زیادہ جِدّت آشنا اور تہذیب وتَمَدُّن کے نام نہاد دعوے داروں سے کہیں زیادہ جَدِیدِیّت کے آداب سے واقف اور حدودِ شریعت میں اُن پر عامل تھے۔

حضرت کیرانویؒ اِس دنیا میں نہیں؛ لیکن اُن کی تعلیم وتربیت کی فیض رسانی اِن شاء اللہ باقی رہے گی اور آیندہ نسلیں، اِس سے فائدہ اٹھاتی اور اُنھیں دعائیں دیتی رہیں گی۔ناچیز راقم نے ''وہ کوہ کن کی بات'' میں اُن کا مختصر مگر جامع خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔مزید معلومات کے لیے اُس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ایک نظر میں

❁ نام: مولانا وحید الزماں بن مولانا مسیح الزماں بن قاضی مولانا محمد اسماعیل بن قاضی مولانا محمد حسین بن قاضی غلام حسین بن قاضی قلندر بخش بن قاضی محمد ظہیر الدین بن قاضی محمد زمان بن قاضی شیخ حسن بن قاضی علی احمد بن قاضی محمد عبد النبی بن خواجہ قاضی احمد بن خواجہ محمد بن خواجہ نظام بن قاضی شمس الدین بن خواجہ علاء الدین مدنی (وارِدِ ہندوستان در قصبہ ''کیرانہ'' ضلع ''مظفرنگر'' صوبہ ''یوپی'') بن خواجہ ظہیر الدین بن خواجہ قوام الدین بن خواجہ بدر الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ قطب الدین بن خواجہ تاج الدین (اُن کے دولڑ کے تھے خواجہ شرف الدین، جو انصاریانِ قصبہ ''انبہٹہ پیرزادگان'' ضلع ''سہارنپور'' صوبہ ''یوپی'' کے مُورِثِ اعلی تھے، دوسرے خواجہ قطب الدین جو انصاریانِ قصبہ ''کیرانہ'' ضلع ''مظفرنگر'' کے جَدِّ اعلیٰ تھے) بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ اسماعیل عبد اللہ ہراتی بن خواجہ ابومنصور بن خواجہ علی بن خواجہ محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ علی بن خواجہ جعفر بن ابومنصور بن ابوایوب انصاری: صحابی رسول ﷺ۔

❁ تاریخ پیدایش: ۱۷ر فروری ۱۹۳۰ء (۱۷ر شوال ۱۳۴۹ھ) See p 351

❁ مقامِ پیدایش: قصبہ ''کیرانہ'' ضلع ''مظفرنگر'' صوبہ ''یوپی''۔

ایک علمی خاندان میں پیدا ہوے۔آپ کے والد، دادا، پردادا سب حضرات عالمِ دین تھے اور آپ کی

دادی، نواب قطب الدین مصنف ''مظاہر حق'' کی نواسی تھیں۔

۞ **ابتدائی تعلیم**: مدرسہ عربیہ جامع مسجد کیرانہ میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں بہ غرض تعلیم حیدرآباد گئے اور ایک سال قیام رہا؛ لیکن تقسیمِ ہند کی بنا پر تعلیم کا کوئی نظام نہیں بن سکا۔

۞ **۱۹۴۸ء** میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔

۞ **۱۹۵۲ء** میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔

تعلیم کے دوران ممتاز طلبہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ زمانۂ تعلیم میں عربی زبان کی اِشاعت کے لیے "سِلْسِلَةُ الدُّرُوْسِ الْعَرَبِيَّة" کے نام سے اسباق لکھ کر آویزاں کرتے تھے اور طلبہ کو مشق بھی کراتے تھے۔ دارالعلوم میں آنے والے عربی مہمانوں کے استقبال اور سپاس نامے وغیرہ لکھنے کا کام آپ ہی انجام دیتے تھے۔ مختلف جلسوں میں عربی مقالے بھی پیش کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ دارالعلوم کے عربی کے تحریری کام بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔ پانچ سال تک تمام کتابوں میں اعلیٰ نمبرات حاصل کیے اور خصوصی انعامات بھی۔ امتیازی حیثیت کی بنا پر دارالعلوم کی جانب سے پندرہ روپے ماہانہ خصوصی وظیفہ بھی جاری کیا گیا۔ زمانۂ طالب علمی میں جمعیۃ الطلبہ کے ناظمِ اعلیٰ بھی رہے۔

۞ **فراغت** کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رئیس الاحرار مرحوم (۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء - ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء) کے پرائیویٹ سکریٹری رہے اور اُن کے ساتھ بڑی بڑی سرکاری ضیافتوں میں شریک ہوئے۔

۞ **۱۹۵۶ء** میں ۹/افراد پر مشتمل ایک سرکاری خیرسگالی وفد (گڈول مشن) سعودی عرب گیا۔ آپ اس میں بہ حیثیت ایک ترجمان ممبر کے شامل تھے۔

۞ **سعودی عرب** سے واپسی کے بعد محمد احمد کاظمی مرحوم ممبر پارلیمنٹ کی کتاب ''تقسیم ہند اور مسلمان'' کا "تقسيم الهند والمسلمون في الجمهورية الهندية" کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔

۞ اُسی زمانے میں مختلف موضوعات پر سات کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: (۱) آخرت کا سفرنامہ (۲) شرعی نماز (۳) انسانت کا پیغام (۴) اچھا خاوند (۵) اچھی بیوی۔

۞ اِسی دوران ''القاموس الجدید'' اردو عربی ڈکشنری کی تکمیل کی۔

۞ **۱۹۵۹ء** میں دیوبند میں ''دارالفکر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے تحت عربی اور انگریزی زبان کی کلاسیں جاری کی گئیں اور ماہ نامہ ''القاسم'' بھی اِسی ادارے سے جاری کیا گیا، جو کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ اِسی ادارے سے ''القاموس الجدید'' اردو عربی ڈکشنری پہلی بار شائع ہوئی۔

۞ ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیو بند میں بہ حیثیت استاذِ عربی تقرّر رہا (آپ نے اس کے لیے کوئی درخواست نہیں کی تھی؛ بل کہ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ نے از خود تقرر کیا تھا) ایک سال بعد استقلال کے ساتھ درجۂ وسطیٰ (ب) میں آپ کا نام درج کیا گیا۔

۞ ۱۹۶۵ء میں سہ ماہی مجلّہ ''دعوۃ الحق'' کا اِجرا عمل میں آیا اور آپ کو اُس کی اِدارت سپرد کی گئی۔

۞ چند سال بعد درجۂ وسطیٰ (الف) میں ترقی دی گئی۔

۞ ۱۹۷۵ء میں درجۂ علیا میں ترقی دی گئی اور ۱۹۷۶ء و ۱۹۷۷ء میں عربی زبان وادب کے ساتھ حدیث کی دو مشہور کتابوں طحاوی شریف اور نسائی شریف کا درس بھی دیا۔

۞ ''دعوۃ الحق'' کے بند ہو جانے کے بعد پندرہ روزہ ''الداعی'' (تاسیس جمادی الاخری ۱۳۹۶ھ مطابق جون ۱۹۷۶ء) کی سرپرستی کچھ عرصے تک سپرد رہی۔

۞ دارالعلوم میں تدریس کے دوران ''النادی الادبی'' کے نام سے طلبہ کی ایک عربی انجمن قائم کی، جس سے ہر سال تقریباً تین سو طلبہ وابستہ ہو کر، عربی زبان کی تقریری اور تحریری مشق کرتے تھے۔ اُس کے تحت بہت سے قلمی پرچے بھی نکالے گئے اور اُس کے ذریعے طلبہ کو علمی پروگراموں کے ساتھ، اِنتظامی اُمور کی بھی تربیت دی گئی۔

۞ اِسی عرصے میں ''القاموس الجدید'' عربی اردو ڈکشنری اور ''القراءۃ الواضحہ'' کے تین حصے اِشاعت پذیر ہوے۔ واضح رہے کہ القاموس الجدید (اردو عربی اور عربی اردو دونوں) اور ''القراءۃ الواضحہ'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، آخر الذکر کتاب بہت سے کالجوں، یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں داخلِ نصاب ہے۔

۞ ۱۹۷۷ء میں جمعیۃِ علماے ہند کے ایک سہ رکنی وفد کی سربراہی کرتے ہوے مُتعَدِّد عربی ممالک (سعودی عرب، بحرین، متحدہ عرب امارات وغیرہ) کا دورہ کیا۔ ایک طویل عرصے تک آپ جمعیۃِ علماے ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور اُس کے پندرہ روزہ عربی اخبار ''الکفاح'' کے چیف اڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ جمعیۃ کے تصنیفی شعبے ''مرکز دعوتِ اسلام'' کے ڈائریکٹر بھی رہے، جو آپ ہی کی تحریک پر قائم کیا گیا تھا۔ اس شعبے نے متعدد علمی اور اِصلاحی کتابیں شائع کیں۔

۞ ۱۹۸۰ء میں اِجلاسِ صد سالہ کے لیے فراہمیِ مالیات کے سلسلے میں مشرقی یو پی کے اضلاع کا کامیاب دورہ کیا۔

۞ اجلاسِ صد سالہ کی تیاری کے لیے بنائی گئی کمیٹیوں کا آپ کو کنویز مقرر کیا گیا، نیز دار العلوم کی تزیین و ترمیم اور تعمیر جدید کا کام بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔ آٹھ ماہ کے عرصے میں دار العلوم میں ہر چہار جانب بوسیدہ اور اور مرمّت طلب عمارتوں کی اِصلاح و ترمیم ہوئی اور بے شمار جدید تعمیرات ہوئیں، جیسے قدیم مسجد کا صدر دروازہ، دار العلوم کے صدر دروازے کی بالائی منزل کی تعمیر، احاطۂ کتب خانہ کا دو منزلہ برآمدہ، دفتر تعلیمات، دار جدید کی بالائی منزل کے بہت سے کمرے، دار الحدیث فوقانی کی دائیں اور بائیں جانب دو درس گاہیں اور اُن کے سہ طرف برآمدے اور اِس طرح کی مختلف تعمیرات۔

۞ اجلاسِ صد سالہ کے عین موقع پر ذیابیطس کے مرض کی شدت اور شب و روز محنت و شب بیداری کے نتیجے میں شدید بیماری کا حملہ ہوا، جس کے باعث اِجلاس میں شریک نہ ہوسکے۔ اسٹیج کا ذمے دار اور اناؤنسر بھی آپ ہی کو بنایا گیا تھا۔

۞ اجلاسِ صد سالہ کے اختتام پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند نے دار التربیت کی تعمیر اور اُس کے نظام کار کو مرتب کر کے چلانے کا کام بھی آپ کے سپرد فرمایا۔ اُس کے لیے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے وائس چانسلر نے دس لاکھ کی رقم عنایت کی تھی ——— اِس کے بعد دار العلوم کے حالات اندرونی طور پر بگڑنے شروع ہوئے، جس نے رفتہ رفتہ انقلاب کی صورت اختیار کر لی۔

۞ ۱۹۸۲ء میں دار العلوم کے دوبارہ کھل جانے کے کچھ عرصے بعد ۱۹۸۳ء میں آپ کو ناظمِ مجلسِ تعلیمی بنایا گیا اور اسی سال آپ نے ماریشش، ری یونین، انگلینڈ، مصر اور پیرس کا سفر کیا۔

۞ ۱۹۸۵ء میں آپ کو معاون مہتمم بنایا گیا۔ اُس زمانے میں بہت سی نئی تعمیرات اور دفتری نظام کی اصلاح، طریقۂ کار میں پھرتی اور تیز رفتاری اور نظامِ تعلیم میں پختگی پیدا کرنے جیسی بہت سی نمایاں انتظامی خدمات انجام دیں۔ ہندوستان کے بعض علاقوں سے مالیات کی فراہمی کا کام بھی کیا۔ پندرہ روزہ "آئینہ دار العلوم" کا اِجرا کیا۔

۞ ۱۹۸۷ء میں معاون مہتمم کے عہدے سے استعفا دے کر تدریس پر واپس آ گئے۔

۞ دار العلوم کی انتظامی ذمّے داریوں سے سبک دوش ہونے کے بعد، ۱۹۸۸ء میں "دارُ المؤلّفین" کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا۔ اُس اِدارے نے نوجوان فضلائے دار العلوم کی تصنیفی رفاقت حاصل کی اور نا مساعد حالات اور کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہ ہونے کے باوجود، دو سال کے عرصے میں تقریباً دو درجن کتابیں شائع کیں۔ نیز اُسی دور میں سابق "القاموس الجدید" اردو عربی اور عربی اردو میں گراں قدر اِضافہ کیا۔

۞ ۱۹۸۸ء میں دہلی میں منعقد ملّی کنونشن میں ''ملّی جمعیۃ علماے ہند'' کا قیام عمل میں آیا اور آپ کو بہ اتفاقِ رائے اُس کا صدر منتخب کیا گیا۔

۞ ۱۹۹۰ء میں مجلسِ شوریٰ نے تدریسی ذمّے داریوں سے سبک دوش کر کے آپ کو پنشن دینا منظور کیا۔

۞ ۱۹۹۰ء میں ہی وزارتِ حج واوقاف سعودی عرب کی دعوت پر، حج وزیارت سے شرف یاب ہوے۔

۞ جنوری ۱۹۹۲ء میں وزارتِ اطلاعات ونشریات کویت کی طرف سے منعقدہ عالمی اسلامی کانفرنس میں شرکت فرمائی۔

۞ اُسی سال مرکزی جمعیۃ العلما کے صدر منتخب ہوے۔

۞ ۱۹۹۳-۱۹۹۴ء میں ایک ضخیم قاموس ''القاموس الوحید'' بڑے سائز کی ۱۸۰۰ صفحات پر مشتمل تالیف فرمائی۔

۞ اِسی دوران مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی ''معارف القرآن'' سے اہم علمی وتحقیقی مباحث کو کئی جلدوں میں ''جواہر المعارف'' کے نام سے جمع فرمایا، جس کی ایک جلد چھپ چکی ہے۔

۞ ۱۹۹۴ء میں قرآن پاک کے اردو ترجمے کا آغاز فرمایا۔

۞ ۱۹۹۵ء میں مشکاۃ شریف سے اخلاق وآداب ومعاشرت پر مشتمل حدیثوں کا ایک قیمتی مجموعہ مُرتّب فرمایا۔

۞ تقریباً تمام ہی عربی ملکوں کا وقتاً فوقتاً دورہ فرمایا اور وہاں کی دعوت پر کانفرنسوں اور مجالسِ علمی میں شرکت فرمائی۔

۞ بہت سے مدرسوں میں عربی زبان کے شعبوں اور ادبی انجمنوں کے سرپرست رہے۔

۞ اُن کے شاگرد دنیا بھر میں پھیلے ہوے ہیں۔ جامعات ومدارس میں اساتذہ یا جماعتوں اور اداروں کے قائدین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

۞ اُن کے بعض شاگرد برصغیر کے نام ور اہلِ قلم اور عربی وار دو زبان وادب کے مسلم ادیب اور مصنف کی حیثیت سے اپنی مستقل شناخت رکھتے ہیں۔ (*)

(*) بہ روز یک شنبہ، ۱ بجے بہ وقتِ ظہر ۲۱؍رمضان ۱۴۲۷ھ = ۱۵؍اکتوبر ۲۰۰۶ء (بہ راہِ راست اردو میں لکھا گیا۔)

مؤرخ، محقق، مصنف، صحافی اور مشہور عالم

حضرت مولانا قاضی عبدالحفیظ اَطہر مبارک پوریؒ

۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء ـــــ ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

کئی ماہ سے، مبارک پور اور دیارِ اعظم گڑھ سے آنے جانے والوں کے ذریعے، مسلسل یہ خبر ملتی رہی کہ مولانا قاضی عبدالحفیظ اطہر صاحب مبارک پوری رہینِ فراش ہیں۔ اُنھیں ناک میں کوئی تکلیف تھی جس کا آپریشن کرایا تھا۔ آپریشن کی وجہ سے نقاہت و اضمحلال پیدا ہوگیا، جو عرصے تک اُنھیں اپنی گرفت میں لیے رہا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ صحت یاب ہوگئے ہیں۔ اِس کے کچھ ہی دنوں بعد خبر آئی کہ وہ بخار وغیرہ میں مبتلا ہیں، کم زوری کافی بڑھی ہوئی ہے؛ تا آں کہ یہ خبرِ صاعقہ اثر سننے کو ملی کہ تحقیق ومطالعہ، تصنیف وتالیف، صحافت وتدریس اور تعلقاتِ عرب وہند کے صحرائے ناپیدا کنار کا راہیِ پُر شوق؛ بل کہ مجنونِ حوصلہ بہ دوش؛ یک شنبہ ۲۷ر صفر ۱۴۱۷ھ = ۱۴ر جولائی ۱۹۹۶ء کا دن گزار کر شبِ دوشنبہ: ۲۸/۲/۱۴۱۷ھ مطابق ۱۵/۷/۱۹۹۶ء کو ٹھیک ۹ بج کر ۵۵ منٹ پر دارِ فانی سے؛ جو ہم سبھی اِنسانوں کی سرائے ہے؛ دارِ آخرت کو؛ جو ہم سبھوں کا آخری ٹھکانا ہے؛ سدھار گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

نا قابلِ پُر خلا

قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے نہ صرف برِّصغیر؛ بل کہ اِسلامی دنیا کے کثیر التالیف اہلِ تحقیق مؤرخوں کی صف میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے؛ جس کا اِس دورِ قحط الرجال میں، بہ ظاہرِ حال پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ خدائے قدیر، ہر چیز پر قادر ہے؛ لیکن عرصے سے یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ میدانِ علم وعمل اور فضل وکمال کا جو یکتائے روزگار بھی رخصت ہو جاتا ہے؛ اُس کی جگہ خالی ہی پڑی رہ جاتی ہے؛ بالآخر ''کام چلاؤ'' پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

قاضی صاحب نے، طویل وصبر آزما مطالعے پر مبنی گراں مایہ تصنیفات سے اِسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا اور عرب وہند کے تعلقاتِ دیرینہ کے اچھوتے موضوع پر؛ تفصیل، دقیقہ رسی اور جامعیّت کے ساتھ عہد بہ عہد کام کیا؛ ہزاروں صفحات پڑھے اور چیونٹی کے منھ سے شکر جمع کرنے کے عمل کے ذریعے، کئی عدد ضخیم کتابیں اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تصنیف کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا یہ کام علمی دنیا پر؛ رہتی دنیا تک کے لیے لائقِ ہزار شکر ہے؛ جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دیوبندی دہلوی متوفی ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء؛ جنھوں نے اپنے ''ندوۃ المصنفین'' دہلی سے؛ قاضی صاحب کی اہم ترین تاریخی کتابوں کو خصوصی دل چسپی کے ساتھ شائع کیا تھا؛ ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان'' کے پیشِ لفظ میں، بہت ہی خوب صورت اور معنی ریز جملوں میں؛ قاضی صاحب کی محنت اور انتھک تلاش وتحقیق کی داد دی اور لکھا کہ: ''اِس میں شک نہیں کہ قاضی صاحب اِس بے آب وگیاہ صحرا میں تنہا چلے اور جب لوٹے تو باغ وبہار کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لائے''

اُن کا یہ تاریخی سلسلہ؛ جس میں ''عرب وہند عہدِ رسالت میں'' ''خلافتِ راشدہ اور ہندوستان'' ''خلافتِ امویہ اور ہندوستان'' ''خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان''

اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' سرِفہرست ہیں؛ بہت مقبول ہوا اور اردو عربی دونوں زبانوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

قاضی صاحب کی شناخت

تحقیق و مطالعہ طلب اور شب و روز کی محنت کی متقاضی تاریخی و اکیڈمک تصانیف کی تالیف؛ قاضی صاحبؒ کی شناخت بن گئی تھی۔ وہ سرسری مضامین لکھنے پر قادر نہ تھے؛ کیوں کہ وہ سطحی تالیفات و نگارشات کی آلودگیوں سے پاک دامن، ہندوستانی مؤلفین کے قافلۂ قابلِ رشک کی باقیات میں سے تھے۔ اِسی وجہ سے اپنی بے سروسامانی، سادگی، شہرت سے دامن کشی اور کاروانِ نعرہ زن سے بیگانہ رہنے کے باوجود؛ عالم گیر شہرت نے، اُن کے قدم چومے اور ہمہ گیر نیک نامی نے اُن کی بلائیں لیں۔ بالخصوص عرب دنیا میں وہ بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اِس طرح وہ اپنے دین و ملت؛ جس کے وہ ایک قابل افتخار فرزند تھے، کے ساتھ ساتھ، اپنے اُس ملک کے لیے بھی نیک نامی کا ذریعہ بنے؛ جو اَب مسلمانوں کے تئیں ناشکری کی تمام حدیں پھلانگنے پر تُلا ہوا ہے۔

قابلِ رشک حد تک، اپنے کو بڑا بنانے کا ہنر رکھنے والے

قاضی اطہر مبارک پوریؒ اِس بات کی تاب ناک مثال تھے کہ اِنسان اپنے آپ کو؛ تنگ دستی و عسرت کے باوجود اور ''چھوٹی جگہ'' میں رہ کر؛ اپنی محنت و جاں فشانی اور بلند ہمتی کے ذریعے قابلِ رشک حد تک بڑا بنا سکتا ہے۔ اُنھوں نے حقیقی بڑائی، پایے دار نام وری اور قابلِ قدر مقام و مرتبے کے عناصرِ مطلوبہ؛ اپنے چھوٹے سے گم نام مدرسے بہ نام اِحیاء العلوم مبارک پور اور اپنے محدود ماحول والے ایسے قصبے میں حاصل کر لیے؛ جو مُروَّجہ مفہوم میں ''تہذیب و تمدن کی روشنی'' سے محروم اور کسی ایسی قابلِ ذکر علمی

وثقافتی سرگرمی سے نا آشنا تھا؛ جو عالمِ اِسلام کے علمی پایہ تختوں کا امتیاز رہا ہے۔ جیسے حجاز، دمشق، قاہرہ، بغداد، فارس، رباط، دہلی اور دیوبند وغیرہ۔ مکتب کے مرحلے میں اعلیٰ تعلیم تک کے تمام مراحل اُنھوں نے اِسی قصبے میں طے کیے۔ صرف ایک سال مدرسہ شاہی مرادآباد میں گزارا، جہاں دورۂ حدیث شریف میں شرکت کی اور سندِ فراغ حاصل کیا۔

وہ خود فرماتے ہیں:

''میرے محدود وسائل اور مخصوص حالات، قرب وجوار کے بڑے مدرسوں میں جانے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے صرف ایک سال باہر رہنا نصیب ہوا۔ اِس کے باوجود، حوصلے کی بلندی اور تحصیلِ علم کے دُھن کا حال یہ تھا کہ جامعہ ازہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا سودا ہر وقت سر میں سمایا رہتا تھا؛ بل کہ بعد میں بھی یہ آرزو باقی رہی؛ مگر میں نے اپنے ذوق وشوق کی بہ دولت ناکامی کو کام یابی سے یوں بدل دیا کہ اپنے گھر اور مدرسے کو جامع ازہر، جامعِ زیتونہ، جامع قرطبہ، مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ مستنصریہ بنالیا اور وطن ہی میں رہ کر، خدا کے فضل وکرم، اساتذہ کی شفقت ومحبت اور اپنی محنت وعزیمت سے؛ بہت کچھ حاصل کیا۔ اُس دور میں مجھ پر عجیب علمی سرمستی اور شوریدگی چھائی رہتی تھی۔ ہر وقت بغداد و بخارا، اُندلس وغرناطہ اور عالمِ اسلام کی قدیم مشہور درس گاہوں اور اُن کے اساتذہ وتلامذہ کے مناظر سامنے رہتے تھے اور میں اُن کی حسنات وبرکات سے مستفیض ہوتا رہتا تھا۔''(۱)

قاضی صاحبؒ کا علم وفضل اِس بات کی زندہ شہادت ہے کہ علم وثقافت اور فکر ودعوت کے میدان میں قابلِ ذکر کردار ادا کرنے اور جبینِ تاریخ پر نقشِ دوام چھوڑ جانے کے لائق بننے کے لیے اِنسان کو، اُس کا ماحول اور وسائل، بالیقین اِتنا ساتھ

(۱) ''قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' از: قاضی اطہر مبارک پوریؒ، ص: ۱۸-۱۹

نہیں دیتے؛ جتنا کہ خود اُس کی ہمّت وحوصلہ اور مطلوبہ محنت؛ جس کو توفیقِ الٰہی اور برکتِ ربّانی کی آمیزش نے مُنوَّر کر دیا ہو۔

خود اپنے چمکنے کی جس میں قدرت ہو

وہ ذرّہ منتظرِ فیضِ آفتاب نہیں

اُن کی زندگی میں ہمارے اُن نوجوانوں کے لیے سامانِ درس موجود ہے، جو اپنے آپ کو بنانے کے حوالے سے؛ تن آسانی، کم کوشی، کوتاہ طلبی، عاقبت نااندیشی اور حاصل شدہ موقع، وقت، جگہ اور شخصیّات کی تمام تر ناقدری کے ساتھ؛ صرف ''خوب سے خوب تر'' جگہ اور وسائلِ فراواں کو پالینے کی آرزو اور کوشش میں، عمرِ عزیز اور وقتِ گراں مایہ کا ایک ایسا حصہ ضائع کر دیتے ہیں جس میں یک سوئی، اولوالعزمی اور صبر وقناعت کے ساتھ ہنرمندی کے ذریعے؛ بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ سچ ہے کہ اگر اِنسان ذوقِ طلب اور شوقِ جستجو سے محروم ہو، تو آبِ حیواں کے چشمۂ بے پناہ پر پہنچ کر بھی تشنہ کام ہی واپس آجاتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی ذرا سی عمر کے دورانیے میں بہت سے مذکورہ قسم کے ''تشنہ کاموں'' کا مشاہدہ کیا ہے اور کر رہا ہے۔

اِس حقیقت کا بیان خود قاضی صاحب کی زبان سے سنیے:

''طالبِ علم میں محنت اور کوشش کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ذوق وشوق ہو؛ تو چھوٹی جگہ رہ کر بڑا بن سکتا ہے اور اگر یہ باتیں نہ ہوں تو بڑی جگہ رہ کر چھوٹا ہی رہے گا۔ مجھے کسی بڑے علمی وتحقیقی اور تربیتی اِدارے کی ہوا تک نہیں لگی، نہ کسی بڑی شخصیت کی رہ نمائی حاصل ہوسکی؛ ساتھ ہی میرے ذاتی اور خانگی حالات بھی سازگار نہیں تھے؛ اِس کے باوجود میں مطمئن اور خوش ہوں کہ اپنے ذوق وشوق، محنت وحوصلہ اور خودسازی کے بل پر؛ وہ سب کچھ حاصل کیا جو بڑے اِداروں اور بڑی شخصیتوں کی سرپرستی میں رہ کر حاصل کیا

جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے —— جیسا کہ ہوتا بھی ہے —— کہ مجھے کسی بڑی شخصیّت یا اِدارے کے سایے میں جگہ ملتی، تو میرا علمی پوداقوتِ نمو سے محروم ہو جاتا اور کھلی آب وہوا میں اُسے آزادانہ پھلنے پھولنے اور بارآور ہونے کا موقع مُیَسَّرنہ آتا۔" (۱)

ہمّت افسردہ نہ ہو، تو منزلوں کا قحط کیا
لے چلیں گے جانبِ پنہاے اِمکاں، راستے

قاضی صاحب سے دید وشنید

۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ اُن سے لکھنؤ میں شرفِ ملاقات وتعارف حاصل ہوا۔ وہ مجھ سے یہ جان کر بہت خوش ہوے کہ میں بھی حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء کا شاگرد ہوں۔ قاضی صاحب چوں کہ بے حد خورد نواز تھے؛ اِس لیے یہ سنتے ہی مجھے گلے لگالیا کہ تم تو میرے استاد بھائی نکلے۔

اُن سے دوسری ملاقات دار العلوم دیوبند کے تاریخی اور بے مثال اِجلاسِ صد سالہ (منعقدہ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء) کے موقع سے اچانک ایک روز صدر گیٹ پر عرفات نما بھیڑ میں ہوئی۔ دیکھتے ہی پہچان گئے اور علیک سلیک کے بعد ایک طرف کو کھڑے ہوکر اپنے ہم سفر دو صاحب زادوں کا تعارف کرایا کہ یہ دونوں دار العلوم سے بھی فارغ ہیں اور جامعہ اسلامیہ مدینۂ منورہ سے بھی۔ میں بے حد مُتَاَثِّر ہوا، اُن کی اِس یادداشت سے: کیوں کہ وہ آٹھ نو سال کے بعد بھی مجھے اپنے خانۂ خیال میں محفوظ رکھے ہوے تھے کہ اُنھیں مجھ کو پہچان لینے میں ذرا بھی تکلف نہ ہوا؛ لیکن اُس سے بھی زیادہ اُن کے اِس اَخلاقِ کریمانہ سے مُتَاَثِّر ہوا کہ وہ اِس بھیڑ میں دیکھتے ہی شفقت سے لپٹ گئے؛ ورنہ اُن سے بہت کم درجے کے لوگ اپنی "علمی ساکھ" کا رعب ودبدبہ قائم رکھنے

(۱) حوالۂ سابق، ص: ۱۹

کے لیے، عموماً چھوٹوں کو پہچان کر بھی طرح دے جاتے ہیں اور اگر از خود پیش رفت کر کے تعارف کرائیے، تو تجاہلِ عارفانہ کے ذریعے اپنی کھوکھلی عظمت کو جلا بخشنے کی کوشش سے نہیں چوکتے۔

پھر دیوبند میں اُن سے بار بار ملنے کی سعادت حاصل رہی؛ جہاں وہ رسمی اور غیر رسمی طور پر سال میں ایک سے زائد بار تشریف لاتے رہتے تھے کہ اُنھیں ہندی ملّتِ اسلامیہ کی مذہبی زندگی کے جلی عنوان دار العلوم دیوبند سے (وہاں سے رسمی طور پر فارغ نہ ہونے کے باوجود) ایسی محبت وعقیدت تھی، جو بعض دفعہ یہاں کے بہ راہ راست فاضل کو بھی نہیں ہوا کرتی؛ دار العلوم دیوبند بھی اُن کے ساتھ اپنے ایک فاضلِ باکمال ہی کی طرح عزت واحترام کا معاملہ کرتا تھا۔

اِدھر آخری کئی سالوں سے شیخ الہند اکیڈمی دار العلوم دیوبند کی اِعزازی سرپرستی قبول کر لینے کے بعد؛ یہاں اُن کی آمد ورفت یقینی بن گئی تھی؛ لیکن علالتِ پیہم کے باعث قریباً ڈیڑھ دو سال سے دار العلوم تشریف نہیں لا سکے تھے۔ ہم اساتذہ کو انتظار رہی رہا کہ وہ اب آئیں گے اور تب؛ لیکن وہ خود یہاں نہ آسکے؛ بل کہ عالمِ جاوداں کو چلے جانے کی، اُن کی خبر آئی اور ہم سبھوں کو اُداس ودل فگار کر گئی۔

میدانِ تحقیق وتصنیف وصحافت میں اُن کا شہرہ؛ میرے کانوں سے؛ طالب علمی کی صغیر السنی ہی میں آٹکرایا تھا اور میرے کان، میری آنکھوں سے پہلے اُن کے عاشق ہو گئے تھے کہ "الْأُذُنُ تَعْشَقُ قَبْلَ الْعَيْنِ اَحْيَانًا" بسا اوقات آنکھوں سے پہلے کان عاشق ہو جایا کرتے ہیں۔ ملاقات کے بعد آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اُس کے متعلق خدا کو گواہ بنا کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ کانوں کے سُنے ہوے سے فزوں تر تھا اور عربی کے مندرجۂ ذیل شہرۂ آفاق اشعار کا مصداق:

لَقَدْ كَانَتْ مُحَادَثَةُ الرُّكْبَانِ تُخبِرُنَا ۔۔۔ عَنْ جَعْفَرِ بْن فَلَاحٍ أَطيَبَ الْخَبَرِ

فَلَمَّا الْتَقَيْنَا فَلَا وَاللّٰهِ مَا سَمِعَتْ ۔۔۔ أُذُنِيْ بِأَحْسَنَ مِمَّا قَدْ رَأَى بَصَرِيْ

یعنی آنے جانے والے قافلوں کے ذریعے جعفر بن فلاح کی مسرت بخش خبریں ملا کرتی تھیں۔ جب ہماری اُن سے ملاقات ہوئی، تو خدا جانتا ہے کہ کانوں نے (پہلے) اُس سے بہتر نہیں سنا جو کہ آنکھوں نے (بعد میں) مشاہدہ کیا۔

لیکن بہت سے ''جعفر بن فلاح'' ایسے ہیں کہ اُن کے متعلق جو کچھ دور سے سنا جاتا ہے؛ قریب کا مشاہدہ اُس کی تکذیب کر دیتا ہے۔

قاضی صاحبؒ کے متعلق میں نے اپنا یہ تاثر بہ طورِ خاص اِس لیے ریکارڈ کر دیا ہے کہ بعض دفعہ ''بڑوں'' کے متعلق دور سے سنے ہوے آوازے سے پیدا شدہ اعتقاد کو قریب کا تجربہ مسمار کر دیتا ہے اور زبانِ حال وقال سے کہنا پڑتا ہے کہ ''أَنْ تَسْمَعَ بِالْمُعَيْدِيِّ خَيْرٌ مِنْ أَنْ تَرَاهُ'' یعنی دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں۔

چہرے مہرے سے، علم وتحقیق کی پھوٹتی روشنی

قاضی صاحبؒ کو دیکھ کر اُن کے چہرے مہرے سے علم وفکر کی بو باس اور اُن کے خدوخال سے طویل تحقیق ومطالعے کا سراغ مل جاتا تھا۔ اللہ نے اُنھیں طالبِ علم پیدا کیا تھا۔ میں جب بھی یہاں دار العلوم کے مہمان خانے میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا، میں نے اُنھیں کچھ پڑھتے یا کچھ لکھتے ہوے پایا۔

وہ؛ تکلّف، تصنّع اور بناوٹ سے ہر زاویے سے پاک تھے۔ لباس وپوشاک، رہن سہن اور زندگی کے تمام شعبوں میں اُنھیں تصنّع سے نفرت تھی۔ وہ تحریر وتصنیف میں بھی تکلّف سے بری تھے؛ اِسی لیے اُن کی تحریر میں بے ساختگی، سلاست، اختصار، قدرتی باغ کا جمال، خودرو سبزے کی بہار، راست تعبیر کی شیرینی اور آسان پسندی کی نمکینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ وہ عصرِ حاضر کے قلم کاروں کی طرح؛ ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کی روش پر چل کر؛ معانی سے زیادہ عبارت کی طوالت، اَلفاظ کے اِسرافِ بے جا اور اُن کے بناؤ سنگار پر توجہ نہیں دیتے تھے؛ بل کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے

گودا ہی گودا ہوتا؛ چھلکا تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت میں بھی بے تکلّف تھے۔ اُن سے پہلی ملاقات بھی پرانی اور بار بار کی ملاقات معلوم ہوتی تھی۔ ہر ملنے والے کو ایسا لگتا کہ برسوں سے اُن سے جان پہچان ہے؛ بل کہ وہ اُس کو اُس کے بزرگِ خاندان یا فردِ خاندان محسوس ہوتے۔ اپنی بے ساختہ گفتگو، شیریں کلامی، سادگی، مہر آمیز برتاؤ، شفقت شعاری اور انسیت ریز تبسم سے ملنے جلنے والوں کے دل میں گھر کر جاتے تھے۔

فقرِ غیور کی صنعت گری

وہ علماے قدیم کی مبارک نسل سے تعلق رکھتے تھے؛ جن کا شعار قناعت پسندی ہوا کرتا تھا؛ چناں چہ زندگی کے کسی دور میں مادّیت کی دل فریبی نے اُنھیں مسحور نہیں کیا۔ بمبئ ایسے رنگ و نور کے شہر اور دولت و ثروت کی ریل پیل والے ماحول میں؛ بل کہ آسایشِ حیات کے مُتَلاطِم سمندر میں رہ کر بھی اپنے دامنِ علم کو تر ہونے سے بچائے رکھا اور یک سوئی کے ساتھ دادِ تحقیق دینے اور بے مثال تصنیفات کی تیاری اور علمی مشاغل میں اپنے کو منہمک کیے رکھا۔ اُن کی اکثر اہم تصانیف اِسی شہرِ پُرشور میں اُن کے قلم سے ڈھلیں۔

قاضی صاحبؒ خود فرماتے ہیں:

> ”بمبئ جیسے شہر میں مدتِ دراز تک رہنے کے باوجود؛ میں بمبئ والا بالکل نہیں بن سکا۔ بڑی بڑی عقیدت مندانہ پیش کش کو، شکریے کے ساتھ واپس کر دیا۔ تملّق، چاپلوسی اور خوشامد سے نفرت رہی اور مدرسے کی فضا میں جو ذہن و مزاج بنا تھا؛ وہ اِس شہر کی رنگینی اور دولت کی نذر نہ ہوسکا اور الحمدللہ کہ میں نے اِس شہر کے ایک معمولی کمرے میں بیٹھ کر وہ کام کیا، جو بڑی بڑی تنخواہوں پر علمی اور تصنیفی و تالیفی اِداروں میں کیا جاتا ہے اور اُس سے دولت

کمائی جاتی ہے۔''(۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''تیس سال سے زائد مدت تک بمبئ میں مستقلاً قیام رہا اور جس شہر میں شبلی مرحوم ''کنارِ آبِ چوپاٹی وگل گشت اپالو'' کی سیر کر کے غزل کہا کرتے تھے؛ اُن کے ایک ہم وطن نے ایک معمولی سے کمرے میں ''مرکزِ علمی'' کا بورڈ لگا کر تصنیف وتالیف اور مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کا دورِ شباب گزارا۔ میں نے بڑے بڑے عقیدت مندوں کی عقیدت اور بڑی بڑی پیش کش کرنے والوں کی پیش کش کا شکریہ ادا کر کے، شہر کی چمک دمک میں کھو جانے کے مقابلے میں بوریہ نشینی کو ترجیح دی۔ میرے بہی خواہ اور مخلص بزرگ واَحباب اِس معاملے میں مجھے احمق سمجھتے تھے اور میں کم از کم اِس بارے میں اپنے کو عقل مند سمجھتا تھا؛ بل کہ اب بھی سمجھتا ہوں۔

''بمبئ غریب پرور ہونے کے ساتھ ساتھ علم کُش شہر ہے، جس کا اِحساس مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی تھا؛ اِس لیے میں نے دولت وثروت کے اِس ''اندرونِ قعرِ دریا'' میں تیس سال سے زائد ''تختہ بند'' ہونے کے باوجود، اپنے دامنِ علم کو تر نہیں ہونے دیا اور مختلف قسم کی مصروفیات کے باوجود؛ عرب وہند کے ابتدائی چار سو سالہ تعلقات پر، عربی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھ کر ایک بڑے خلا کو پُر کیا۔''(۲)

اب نئی نسل کو کس طرح سمجھایا جائے کہ قناعت کتنی بڑی دولت ہے؛ بل کہ کلیدِ دولت ہے کہ اُس کے ہوتے ہوے، اِنسان ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حال میں دولت مند رہتا ہے اور اِس سے عاری ہونے کے صورت میں خزانۂ قارون اور دولتِ فرعون ونمرود کی

(۱) حوالۂ سابق، ص:۴۶

(۲) حوالۂ سابق، ص:۵۱-۵۲

فراوانی کے باوجود مفلسِ بے مایہ رہتا ہے۔ عربی کے شاعر نے کتنی سچی بات کہہ دی ہے:

مَا كُلُّ مَا فَوْقَ الْبَسِيْطَةِ كَافِيًا　　فَإِذَا قَنِعْتَ ؛ فَكُلُّ شَيْءٍ كَافِي

یعنی اگر انسان قناعت پسند ہے تو کوئی بھی چیز اُس کے لیے کافی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر روے زمین کی تمام چیزیں اُس کے لیے ناکافی ہیں۔

قناعت کے ہتھیار کے ذریعے؛ دنیا کے تمام مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے؛ بل کہ قناعت پیشہ افراد کے نزدیک دنیا کا کوئی ''مسئلہ'' مسئلہ نہیں ہوتا؛ اِسی لیے وہ تمام مسائل اور الجھنوں سے یک سو ہو کر صرف اپنے عظیم اور شریفانہ مقاصد کو بروئے کار لانے میں جٹ جاتے ہیں اور ایسے ہی افراد کی مساعیِ جمیلہ کے نتیجے میں، انسانی برادری کو سعادت و سرخ روئی اور فلاح و بہبود کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ دورِ آخر میں ہمارے اکابر دیو بند بھی قناعت کی مثال تھے۔ اُن کی قناعت کے قلعے کو مُنعمانِ دہر اپنی کسی کوشش کے ذریعے فتح نہ کر سکے اور اُن خدامستوں کی زبان حال، سرخ روئی سے یہ شعر پڑھتی رہی:

اپنی سی چال چل کے رہے منعمانِ دہر
مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

اِسی قناعت پسندی اور فقرِ غیور کا نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے دار العلوم دیو بند اور اُس کی جدو جہد کی شکل میں؛ برِّ صغیر میں اِسلامی نشاۃِ ثانیہ کی طاقت ور تحریک کی بنا اِس طور پر اُستوار کی کہ اُس کا شجرۂ طوبی، روزِ اوّل سے ہنوز سر سبز و شاداب ہے اور کسی بھی موسم میں برگ و بار لانے میں کوتاہی نہیں کرتا۔

قاضی صاحبؒ نے قناعت کا درس بچپن ہی سے لینا شروع کر دیا تھا؛ اپنے گھر میں اور اپنے معاشرے میں، جس میں اُس وقت لوگ قناعت پسندی و کفایت شعاری اور سادگی کی فطرت پر جنم لیتے تھے اور اِن عناصر سے مرکب زندگی جینے میں ایسی راحت و سکون محسوس کرتے تھے، جو اَب وسائلِ زندگی سے بھرے پُرے اِس دور میں؛ کسی اِنسان کو

نصیب نہیں۔

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ”طالبِ علمی کا پورا دور عُسرت اور تنگ دستی میں گزرا۔ کھانے، پینے اور پہننے میں کفایت شعاری اور سادگی ہی رہی۔ اُس وقت آج کل کی طرح معاش ومعیشت میں فراوانی وفراخی نہیں تھی۔ عام طور پر لوگ روکھی پھیکی زندگی کے عادی تھے؛ اِس تنگ دستی اور غربت کا اِحساس نہیں تھا؛ بل کہ سب لوگ اُسی زندگی پر راضی وخوش رہا کرتے تھے۔ اُس میں بڑی خیر وبرکت تھی۔ میں بھی ہر معاملے میں اپنے ذوق وشوق کے مطابق سامان مہیا کرلیا کرتا تھا اور کبھی احساسِ کم تری کا شکار نہیں ہوا۔“ (۱)

عاشقِ علم ومطالعہ

قاضی صاحبؒ علم کے سچے عاشق تھے۔ اُنھیں جھوٹی شہرت اور وقتی نام وری سے بے پرواہ کر، علم میں مشقت آمیز وصبر آزما سفرِ دراز میں بے پناہ لذت ملتی تھی۔ افسوس ہے کہ نسلِ نو اِس لذّت سے نا آشنائے محض ہوتی جارہی ہے؛ اِسی لیے اُس کی تخلیقات اور نتائجِ مطالعہ وتصنیفات میں گہرائی اور دقتِ نظر کا دور دور تک پتہ نہیں؛ بل کہ سطحیّت ہی اُس کی شناخت بن گئی ہے۔ اِس لیے کہ علم وتحقیق کی راہ میں قاضی صاحبؒ، اُن کے بعض ہم عصر اور اُن کے اکثر پیش رو جس طرح ”مَکارِہ“ (ناپسندیدہ چیزیں یعنی مصائب وتکالیف) کو برداشت کرنے؛ بل کہ اُنھیں شیریں سمجھنے کے عادی تھے؛ یہ صفت نسلِ نو میں معدوم ہوگئی ہے اور لگتا ہے کہ ماؤں نے اب سابقہ نسل کے لوگوں کو جننا چھوڑ دیا ہے:

---

(۱) حوالہ سابق، ص: ۴۴-۴۵

فروغِ شمع جو اَب ہے؛ رہے گی رہتی دنیا تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی؛ ہوتی جاتی ہے

شمعِ علم تو جلتی رہے گی؛ لیکن تشویش کی بات یہ ہے کہ اُس پر نثار ہونے والے پروانے اب ناپید ہوتے جارہے ہیں۔

علم کے ساتھ اُن کے عشق وخلوص کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنی کتاب کا ذاتی طور پر نہ تو حقوقِ طبع محفوظ کرایا، نہ ہی معاوضے کی بات کی، نہ رائلٹی لی؛ بل کہ خدمتِ علم کے جذبے سے کتابیں لکھیں اور اِسی جذبے سے مختلف ناشرین کو، اُن کی طباعت واِشاعت کی اِجازت دے دی۔ یہ اور بات ہے کہ بعض ناشرین نے (جو کہ عموماً نامعقول اور ناخداترس ہوتے ہیں) اپنے لیے ''جملہ حقوق طبع بہ حق ناشر محفوظ ہیں'' کے ساتھ اُن کی کتابیں چھاپیں۔ اِس عمومی اِجازت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کتابیں عموماً مُتدَاوَل اور مُیسَّر رہتی ہیں، جب کہ ''حقوقِ طبع بہ حق مؤلف محفوظ'' والی کتابیں عموماً مؤلف کے اِس دنیا سے چلے جانے کے بعد؛ نایاب ہوجاتی ہیں؛ نیز اُن کے ورثہ کے آپسی اختلاف کی آماج گاہ بن کر، اہلِ علم کے لیے باعث اذیت وافسوس بن جاتی ہیں۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی کوئی کتاب، اِسی لیے نایاب نہیں ہوتی کہ اُنھوں نے محض خدمتِ دین وعلم وعقیدہ وملت کی خاطر، کتابیں لکھیں اور ہر ایک کو چھاپنے کی عام اِجازت دے دی۔

سادگی، تواضع، بے تکلفی، قناعت شعاری، ملنساری، شفقت آمیز برتاؤ، نرم خوئی، علمی انہماک، مطالعہ وتصنیف میں محویت، دنیا کی لذتوں اور مادیت کے سحر سے مکمل آزادی اور شہرت سے نفرت وغیرہ؛ قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ، کی شخصیت کے عناصر ترکیبی تھے۔

قاضی صاحب کا سراپا

قاضی صاحبؒ؛ میانہ قد، قدرے کشادہ جبیں، متوازن الجسم، گندم گوں رنگ،

گھنی داڑھی والے، قوی الحافظہ، ذہین اور اپنے ملنے جلنے والوں کو بہت دنوں تک یاد رکھنے والے آدمی تھے۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے شروع ہی میں بینائی کم زور ہوگئی تھی؛ اِس لیے بہت پاور کا موٹے شیشے والا چشمہ استعمال کرتے تھے۔ نہایت خود دار آدمی تھے۔ زندگی اور انسانوں سے بہت پر اُمید رہا کرتے تھے۔ وقت کے قدرداں تھے؛ جو ایک سچے خادم علم کا ممتاز خاصہ ہوا کرتا ہے۔ دنیوی غموں سے آزاد اور علمی مشاغل کے غلام تھے۔ ترفّع اور خود پسندی سے کوئی مناسبت نہیں تھی، البتہ خودسازی پر اُن کی توجّہ ہمیشہ مرکوز رہی۔ بہت سے اہل علم وقلم کی طرح اپنی تعریف آپ کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ ہی دوسروں کو حقیر وکم رتبہ سمجھتے تھے۔ دوسروں سے بات چیت کرتے وقت پر سکون رہتے۔ طلبہ اور اہل علم سے بے حد محبت کرتے اور متکبروں اور انانیّت شعاروں سے حد سے زیادہ نفرت کرتے تھے خواہ وہ کسی قد وقامت کے ہوں۔

ناچیز کے نام قاضی صاحبؒ کا گرامی نامہ

۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء میں، جب راقم السطور نے، حضرت الاستاذ مربِّی کبیر حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانویؒ کے انتقال کے چند ہی ماہ بعد، اُن پر اپنی تاثراتی کاوش ''وہ کوہ کن کی بات...'' شائع کی اور حضرت قاضی صاحب کو اُس کا ایک نسخہ بہ ذریعہ ڈاک بھیجا، تو اُنھوں نے کتاب پڑھ کر مندرجۂ ذیل مکتوب اِرسال فرمایا، جو اِس ناچیز نو وارِد بساطِ تالیف کے لیے بڑا حوصلہ افزا ثابت ہوا:

باسمہ تعالیٰ

مبارک پور

۲۶ ربیع الآخر ۱۴۱۶ھ

عزیز گرامی مولانا نور عالم امینی صاحب زید مجدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے مزاج گرامی بہ عافیت ہو، آپ کی مرسلہ کتاب ''وہ کون کن کی بات'' اور لفافہ دونوں ملے، یاد فرمائی کے لیے شکر گزار ہوں۔

کتاب اِس قدر دلچسپ اور موٴثر انداز میں لکھی گئی ہے کہ ملتے ہی ہاتھ میں لیا تو ختم کر کے ہی رکھا، اس میں نہ انشائیہ ہے، نہ سوانحی خاکہ ہے اور نہ ہی سوانح عمری ہے؛ بل کہ اس میں مختصر ہونے کے باوجود سب کچھ ہے، آپ نے اپنے علمی مربی اور اُستاذ مولانا وحید الزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متفرق حالات کو، جس عقیدت ومحبت اور سلیقہ مندی سے مرتب کیا اُس کا ظہور کتاب کی سطر سطر سے ہوتا ہے، اندازِ بیان اور طرزِ تحریر نے کتاب کو علمی اور ادبی بنا دیا ہے، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم کی زندگی، جہدِ مسلسل سے عبارت تھی اور مردم سازی، مردم شناسی، تصنیف وتالیف، درس وتدریس اور تنظیم میں وہ کس قدر کام یاب تھے، یہ آپ کی سعادت مندی ہے کہ قلیل عرصے میں اپنے محسن ومربی استاذ کے حالات کو نہایت والہانہ اور سبق آموز انداز میں لکھ کر، اُن کے علمی وادبی کارناموں سے اہل علم کو روشناس کرایا ہے، اِن شاء اللہ یہ کتاب ہمارے مدارس کے اَساتذہ وتلامذہ کے لیے، مشعلِ راہ ہوگی اور وہ اِس سے بہت کچھ حاصل کریں گے۔

آپ نے یہ اچھا کیا کہ مولانا مرحوم کے، جن تلامذہ ومتعلقین کے نام کتاب میں آئے، اُن کا تذکرہ حاشیہ میں کر دیا، یہ بھی بڑے کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے علم وقلم میں برکت عطا فرمائے۔

والسلام

قاضی اطہر مبارک پوری

سوانحی خاکہ

❁ **ولادت اور نام ونسب:** قاضی صاحبؒ کی ولادت بہ روز یک شنبہ: ۴؍رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۷؍مئی ۱۹۱۶ء صبح پانچ بجے ''مبارک پور''، ضلع ''اعظم گڑھ'' میں ہوئی۔ اُن کے جدّ اعلی؛ سطان نصیر الدین ہمایوں (۹۱۴-۹۶۴ھ = ۱۵۰۸-۱۵۵۶ء) کے عہدِ سلطنت میں؛ کڑا مانک

پور سے، راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد چشتی مانک پوریؒ متوفی ۲/ شوال ۹۶۵ھ بانیِ ''مبارک پور'' کے ہم راہ؛ ''مبارک پور'' آ بسے تھے۔ قاضی صاحب کے خاندان میں اُسی زمانے سے نیابتِ قضا کا عہدہ چلا آرہا تھا۔ اِسی مناسبت سے اُنھیں اور اُن کے تمام اہلِ خاندان کو ''قاضی'' کے سابقے کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔(۱)

قاضی صاحبؒ کے نانا مولانا احمد حسین صاحب رسول پوریؒ متوفی ۲۶/ رجب ۱۳۵۹ھ نے اُن کا نام ''عبدالحفیظ'' رکھا تھا؛ لیکن وہ قلمی و علمی دنیا میں قاضی اطہر مبارک پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کا سلسلۂ نسب اِس طرح ہے:

مولانا عبدالحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری بن شیخ حاجی محمد حسن بن شیخ حاجی لعل محمد بن شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی۔ اُن کے والد شیخ حاجی محمد حسن نے ۱۱/ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ میں وفات پائی۔

۞ حصولِ تعلیم: قاضی صاحبؒ نے قاعدۂ بغدادی، ناظرہ قرآن شریف اور اردو وغیرہ کی ابتدائی تعلیم؛ اُس زمانے کے بابرکت رواج کے مطابق محلے کے خانگی مکتب میں حاصل کی۔ اُس کے بعد جب کہ وہ قرآنِ پاک کا تیسرا پارہ ناظرہ پڑھ رہے تھے؛ مدرسہ ''اِحیاء العلوم'' مبارک پور میں داخل ہوئے۔ اُسی مدرسہ میں قرآنِ پاک ختم کیا؛ پھر اردو و فارسی کی تعلیم پندرہ سال کی عمر تک بہ قول اُن کے (۲) کھیل کود کر حاصل کی۔

صفر ۱۳۵۰ھ سے شعبان ۱۳۵۹ھ کے دوران؛ درسِ نظامی میں پڑھائے جانے والے تمام علوم و فنون کی تحصیل؛ مدرسہ اِحیاء العلوم ہی میں کی۔ البتہ شوال ۱۳۵۸ھ تا شعبان ۱۳۵۹ھ کا یک سالہ تعلیمی زمانہ؛ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں گزارا، جہاں اُنھوں نے دورۂ حدیث شریف میں؛ مولانا سید فخر الدین احمد متوفی ۱۳۹۲ھ، مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ اور مولانا محمد اِسماعیل صاحب سنبھلی متوفی ۱۳۹۵ھ ایسے اساتذۂ یگانہ سے فیض پایا۔ درمیان میں ۱۳۵۴ھ میں بھی، اُنھوں نے جامعہ قاسمیہ میں داخلہ لیا تھا؛ لیکن ناگزیر اَسباب کی بنا پر صرف دو ماہ

(۱) ''قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' مؤلفہ: قاضی اطہر مبارک پوریؒ، مطبوعہ مکتبہ صوت القرآن، دیوبند، سنۂ طباعت ندارد، ص:۹-۱۰ (ترمیم واختصار کے ساتھ)

(۱) حوالۂ سابق، ص:۱۲

بعد مبارک پور واپس ہو گئے تھے۔

مدرسہ ''اِحیاء العلوم'' میں جن اساتذہ کے سامنے زانوے تلمذتہ کیا، اُن میں قابلِ ذکر یہ ہیں: مولانا مفتی محمد یٰسین مبارک پوری متوفی ۱۴۰۴ھ، مولانا محمد شکراللہ مبارک پوری متوفی ۱۳۶۱ھ، مولانا بشیر احمد مبارک پوری متوفی ۱۴۰۴ھ، مولانا محمد عمر مظاہری مبارک پوری اور اُن کے اپنے ماموں مولانا محمد یحیی رسول پوری متوفی ۱۳۸۷ھ۔

اپنی مختصر خودنوشت سوانحِ حیات میں، اُنھوں نے ''مبارک پور'' اور قرب وجوار میں اُن کے زمانے میں موجود، اُن علما اور اہلِ کمال کے نام گنائے ہیں، جن کے کاموں اور کارناموں کو دیکھ سن کر، اُن کے اندر علمی حوصلہ بیدار ہوا اور اُن سے کسی نہ کسی طرح راہ نمائی ملی۔ اُن میں سرِ فہرست اُن کے جدِّ محترم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری متوفی ۱۳۵۹ھ ہیں؛ جو متبحر عالم، مدرس، مصنف، ادیب، طبیبِ حاذق اور عربی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ دوسرے مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ صاحب ''تحفۃ الاحوذی'' متوفی ۱۳۵۳ھ تیسرے مولانا عبد السلام مبارک پوری مصنف ''سیرۃ البخاری'' متوفی ۱۳۴۳ھ۔(۱)

نیز علوم وفنون کی پچاسوں اُن اُمّہات الکتب کے نام بھی لیے ہیں، جنھیں اُنھوں نے عاریتاً یا خرید کر پڑھیں اور اُن کے ذریعے، اپنی علمی صلاحیت کو پختہ کیا اور ثقافتی اثاثے کو وسعت دی، جس کے طفیل علمی دنیا میں دھوم مچا دینے والی تصنیفات اُن کے قلم سے نکلیں۔(۲)

اُن کی علمی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ طالبِ علمی کے اولین دور سے ہی، جب کہ وہ عُسرت کی زندگی گزار رہے تھے؛ درسی کتابوں کے علاوہ، بہت سی غیر درسی مطبوعات ومخطوطات خریدیں اور جو نایاب تھیں اُنھیں اپنے قلم سے نقل کر لیں کہ اُس زمانے میں آج کی طرح فوٹو اسٹیٹ کی کوئی سہولت نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنی مختصر آپ بیتی میں خریدی ہوئی کتابوں کی فہرست، اُس زمانے میں اُن کی قیمتیں اور اکثر کتابوں کی تاریخِ خرید، نیز نقل کی ہوئی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔(۳)

❁ **اِنشا اور مضمون نگاری کا ذوق:** مضمون نگاری کا شوق اُن کے اندر، اپنے

---

(۱) حوالۂ سابق، ص:۱۳-۱۶

(۲) حوالۂ سابق، ص:۲۳-۲۴

(۳) حوالۂ سابق، ص:۲۷-۳۲

نانا مولانا احمد حسین متوفی ۱۳۵۹ھ کی صحبت سے پیدا ہوا؛ جن کے ذاتی کتب خانے میں علم وفن کی بے بہا کتابیں، کثرت سے موجود تھیں اور اُنھیں تصنیف وتالیف کا صاف ستھر انداق تھا۔ مطالعہ وکتب بینی کے رسیا تھے۔ اُن کی نشست کے کمرے میں، ہر چہار جانب کتابیں مطالعہ کے لیے چٹائی پر بکھری رہتی تھیں۔ قاضی صاحبؒ کو چوں کہ لکھنے پڑھنے کا خداداد شوق تھا؛ اِس لیے اُن کی تربیت اور طریقِ مطالعہ وتصنیف سے، اپنے شوق کو مہمیز کیا؛ لیکن باقاعدہ راہ نمائی اُنھوں نے کسی سے حاصل نہیں کی؛ بل کہ اِس سلسلے میں صرف اُن کے ذوق اور خود اعتمادی نے، اُن کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''معلومات کی فراہمی، اُن کی ترتیب اور اُسلوبِ نگارش وغیرہ میں چوں کہ کسی کی راہ نمائی حاصل نہ ہوسکی؛ اِس لیے ایک مضمون کئی بار لکھتا اور پھاڑ کر پھینک دیتا اور کافی محنت کے بعد میرے ذوق کے مطابق ہوتا؛ ساتھ ہی خیال ہوتا کہ یہ مضمون قابلِ اِشاعت ہوا کہ نہیں؟ مگر جب بغیر کسی حک واِضافے کے چھپ جاتا، تو حوصلے میں نئی جان آجاتی اور فوراً دوسرا مضمون تیار کرنے میں لگ جاتا۔'' (۱)

اُنھوں نے اِشارہ کیا ہے کہ اُنھیں مضمون نگار بنانے اور تصنیف وتالیف کے لیے حوصلہ دینے میں؛ مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ مرادآباد سے رسالہ ''قائد'' نکالتے تھے۔ اتفاق سے ۱۳۵۷ھ میں ''اِحیاء العلوم'' مبارک پور کی جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے بلائے گئے۔ اِس موقع سے مولانا محمد میاں صاحب مرحوم کو عبد الحفیظ قاضی اطہر مبارک پوری: شاعر اور مضمون نگار کا تعارف ہوا اور اُنھوں نے قاضی صاحب کو رسالہ ''قائد'' میں مضمون لکھنے کی دعوت دی؛ چناں چہ مستقل طور پر رسالہ ''قائد'' میں اُن کے مضامین اور اَشعار چھپنے لگے۔ شاعری اور مضمون نگاری کا تسلسل تالیف وتصنیف پر منتج ہوا اور اُنھوں نے زمانۂ طالب علمی ہی میں پانچ کتابیں لکھ ڈالیں؛ دو عربی میں اور تین اردو میں۔

❁ شاعری: قاضی صاحبؒ ایک قادر الکلام اور برجستہ گو شاعر تھے، شاعری میں کوئی اُستاذ نہ تھا، طالبِ علمی ہی کے زمانے میں آپ کی نظمیں ''الفرقان'' بریلی ۱۳۵۷ھ رسالہ ''قائد''

---

(۳) دیکھیے حوالۂ سابق، ص: ۳۶

مراد آباد ۱۳۵۷ھ میں شائع ہونے لگیں، بعد میں لاہور کے اخبار ''زم زم'' اخبار ''مسلمان'' اخبار ''کوثر'' وغیرہ میں بہ کثرت اَشعار چھپے اور یہی بہ سلسلۂ صحافت امرتسر، لاہور اور بمبئی جانے کا سبب بنے، شاہ نامہ کے طرز پر اصحاب صُفّہ کے نام سے منظوم رسالہ ۲۲۵، اشعار پر مشتمل لکھا، جسے ۱۳۵۹ھ میں شباب کمپنی بمبئی نے طبع کرنے کے لیے لیا؛ مگر گم ہوگیا، بعد میں جب حالات نے، اُن کو صحافی اور مصنف بنادیا، تو شاعری ترک کردی۔

آپؒ کے اَشعار کا مجموعہ ''مئے طہور'' کے نام سے اپریل ۲۰۰۶ء میں، قاضی اَطہر اکیڈمی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی سے شائع ہوچکا ہے۔

''بہارِ مدینہ'' کے عنوان سے اُن کی ایک نعت کے کچھ اَشعار اِس طرح ہیں:

نعت

بہارِ مدینہ

نظر آرہا ہے، دیارِ مدینہ — دیارِ محمد ، جوارِ مدینہ
مرا دامنِ آرزو بھر رہا ہے — ثمر بار ہے ، شاخ سارِ مدینہ
برستے ہیں جلوے نگاہوں میں اپنی — کہ سرمہ بنا ہے ، غبارِ مدینہ
قطاریں کھجوروں کی ، راہِ اُحد میں — ہے کیا دل رُبا ، کوہ سارِ مدینہ
سرِ شام گنبد کے نوری کلس پر — ہے جنت سے بڑھ کر، بہار مدینہ
مجھے حاجتِ رنگ و بو، کس لیے ہو — کھٹکتا ہے جب دل میں، خارِ مدینہ

اُن کی سب سے پہلی غزل کے چند اَشعار درج ذیل ہیں، جو ''اَسرار'' کے عنوان سے ''زم زم'' لاہور میں ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو چھپی تھی۔

خلوتِ بے نیاز کو سلطنتِ شہی سمجھ
بے خودی خودی میں ڈوب سِرِّ قلندری سمجھ
آہِ سحر کی قیمتیں دے نہ سکیں گے دو جہاں
سازِ شکستہ پر نہ جا ، رازِ شکستگی سمجھ
ساحلِ اضطراب کیا؟ موجِ سکوں میں ڈوب جا
عشق کو برملا نہ کر ، عظمتِ عاشقی سمجھ

عشق ہے بے خبر نہ سو، نخلِ سکوں کی چھاؤں میں
بے خودیِ حواس کو ، فرصتِ آگہی سمجھ

اُن کی ایک نظم کے چند اشعار نذر قارئین ہیں:

اعلانِ آزادی

کھنچا آتا ہے خود میری طرف دامانِ آزادی
قفس میں کر رہا ہوں بیٹھ کر سامانِ آزادی
نظر آتے ہیں مجھ کو، ہر طرف آزاد نظّارے
بہ اندازِ جلا آنکھوں میں ہیں ارمانِ آزادی
یہ کیا ہے زندگی؟ ہر ہر نفس وقفِ غلامی ہے
کوئی پوچھے شہیدانِ وطن سے شانِ آزادی
کوئی صیّاد کے حلقہ نشینوں کو خبر کر دے
قفس کی تیلیوں میں ہو گیا اعلانِ آزادی

ان کی ایک دوسری نظم کے چند اشعار بھی مُلاحظہ ہوں:

''ترانۂ مجاہد''

ہم مردِ مجاہد دنیا میں دو روز کی راحت کیا جانیں
تکلیف و مصیبت کے خوگر آرام و راحت کیا جانیں
ہم ایک خدا کے قائل ہیں، ہم اپنے نبی کے تابع ہیں
ہم غیر کا سجدہ کیا جانیں، ہم اور کی طاعت کیا جانیں
کچھ لوگ عدو کی گھاتوں میں، کچھ لوگ خدا کی باتوں میں
غزوات کی خونیں راتوں میں، ہم نیند کی لذت کیا جانیں
آغوشِ وفا میں سوتے ہیں، شمشیر کے ٹھنڈے سائے میں
لیلائے شہادت کے شیدا، سلمٰی کی محبت کیا جانیں

۞ رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد کے مشاغل:

● از شوال ۱۳۵۹ھ تا ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۴ء، مدرسہ اِحیاء العلوم مبارک پور میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ اِس دوران شباب کمپنی (ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی) کے لیے؛ سید جمال الدین افغانی (۱۲۵۴-۱۳۱۴ھ/ ۱۸۳۹-۱۸۹۷ء) کے دو عربی رسالوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

● ۲۷/نومبر ۱۹۴۴ء تا ۱۲/جنوری ۱۹۴۵ھ؛ مرکزِ تنظیم اہلِ سنت ''امرتسر'' سے منسلک رہے۔ اِس دوران ردّ شیعیت وقادیانیت میں مضامین لکھے، لکھوائے اور چھپوائے۔

● ۱۳/جنوری ۱۹۴۵ء تا یکم جون ۱۹۴۶ء ''زم زم'' کمپنی لمیٹڈ لاہور سے منسلک رہے۔ اِس عرصے میں ساڑھے نو سو صفحات میں منتخب التفاسیر مرتب کی۔

● قیام لاہور کے دوران قاضی صاحب کے والد صاحب حج کو گئے؛ تو شوال ۱۳۶۶ھ تا صفر ۱۳۶۷ھ (یکم اکتوبر ۱۹۴۶ء تا جنوری ۱۹۴۷ء) مدرسہ اِحیاء العلوم مبارک پور میں عارضی مدرسی کی۔

● ۱۷/جنوری ۱۹۴۷ء سے سہ روزہ ''زم زم'' روزنامہ ہو گیا، تو اُس کے ایڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط متوفی ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء کے زیرِ تربیت اُس سے وابستہ ہو کر صحافت سیکھی۔ تقسیمِ ملک سے کچھ دنوں پہلے، دونوں (مولانا محمد عثمان فارقلیط اور قاضی صاحبؒ) اِس اِرادے سے اپنے وطن آ گئے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد، لاہور واپس آجائیں گے؛ لیکن حالات کی ستم ظریفی کے دراز تر ہو جانے کی وجہ سے، اُن کے لیے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

● ۱۹۴۸ء کے آغاز میں بہرائچ سے ہفت روزہ ''انصار'' نکالا؛ جو حکومت کے عتاب کی وجہ سے، آٹھ ماہ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔

● شوال ۱۳۶۷ھ تا شعبان ۱۳۶۸ھ؛ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تعلیمی خدمت انجام دی۔

● جمعہ ۲۸/ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق نومبر ۱۹۴۹ء کو وہ بمبئی وارد ہوئے، جو اُن کے علمی سفر کی آخری منزل تھی اور جہاں اُنھوں نے چالیس سال سے زائد مدت تک قیام کر کے اہم علمی، ثقافتی اور صحافتی کارنامے انجام دیے۔

● بمبئی میں اُنھوں نے شروع میں دفتر جمعیۃ علما صوبہ بمبئی میں اِفتا کے اور دیگر تحریری کام کیے۔ پھر روزنامہ ''جمہوریت'' میں نائب مدیر رہے۔

● ۱۳؍فروری ۱۹۵۱ء سے مارچ ۱۹۹۱ء تک یعنی چالیس سال سے زائد مدت تک روزنامہ ''انقلاب'' میں ''جواہر القرآن'' اور ''احوال و معارف'' کے عنوان سے علمی، دینی، سیاسی اور تاریخی مضامین لکھتے رہے۔

● ۱۹۵۲ء میں جب انجمن خدام النبی کی طرف سے ماہ نامہ اور ہفت روزہ ''البلاغ'' نکلنا شروع ہوا، تو دونوں کی اِدارت میں کام کرنے لگے ہفت روزہ ''البلاغ'' تو کچھ ماہ بعد بند ہوگیا؛ لیکن ماہ نامہ ''البلاغ'' پچیس سال تک اُن کی اِدارت میں نکلتا رہا۔

● ۱۲؍نومبر ۱۹۶۰ء سے دس سال تک انجمن اسلام ہائی اسکول میں دینیات و اَخلاق کی تعلیم دی؛ نیز اسی دوران دار العلوم اِمدادیہ بمبئی میں جز وقتی مدرسی کی۔

● ۱۹۵۱ء میں بھیونڈی میں ''مفتاح العلوم'' کی بنا ڈالی جو ہنوز سرگرمِ عمل ہے۔

۞ اردو تصانیف

۱- عرب و ہند عہد رسالت میں ۲- خلافتِ راشدہ اور ہندوستان ۳- خلافتِ امویہ اور ہندوستان ۴- خلافتِ عباسیہ اور ہندوستان ۵- ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۶- اِسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ ۷- مآثر و معارف ۸- دیار یورپ میں علم و علما ۹- آثار و اخبار ۱۰- مختصر سوانح ائمۂ اَربعہ ۱۱- تدوین سیر و مغازی ۱۲- خیر القرون کی درس گاہیں اور اُن کا نظام تعلیم و تربیت ۱۳- خواتینِ اسلام کی دینی و علمی خدمات ۱۴- معارف القرآن ۱۵- علی و حسین ۱۶- طبقات الحجاج ۱۷- تذکرہ علمائے مبارک پور ۱۸- تعلیمی و تبلیغی سرگرمیاں عہدِ سلف میں ۱۹- اِفاداتِ حسن بصری ۲۰- اِسلامی نظام زندگی ۲۱- حج کے بعد ۲۲- مسلمان ۲۳- اِسلامی شادی ۲۴- قاعدۂ بغدادی سے صحیح بخاری تک۔

۞ عربی تصنیفات

۲۵- رجالُ السند والهند ۲۶- العقد الثمين في فتوح الهند ومن ورد فيها من الصحابة والتابعين ۲۷- الهند في عهد العباسيين ۲۸- الحكومات العربية في الهند ۲۹- خير الزاد في بانت سعاد ۳۰- مرآة العلم۔

قابلِ ذکر ہے کہ کتاب نمبر ① اور نمبر ⑤ کے ترجمے بھی عربی زبان میں قاہرہ سے چھپ چکے ہیں۔ دونوں ترجمے دو مصری عالم ڈاکٹر عبد العزیز عزت مصری اور عبد العزیز عبد الجلیل عزت کے قلم سے ہیں۔

عربی میں تحقیق وتحشیہ

۳۱- جواهر الأصول في علم حديث الرسول لأبي الفيض محمد بن محمد بن علي الحنفي الفارسي ۳۲- تاريخ أسماء الثقات لابن شاهين البغدادي ۳۳- ديوان أحمد؛ جواُن کے نانا مولانا احمد حسین کے عربی اَشعار کا مجموعہ ہے۔ قاضی صاحبؒ نے اسے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

علمی ودینی اسفار: قاضی صاحب نے پانچ حج کیے۔ پہلا حج ۱۳۷۵ھ میں، دوسرا ۱۳۸۵ھ میں، تیسرا ۱۳۹۳ھ میں، چوتھا ۱۳۹۷ھ میں، پانچواں ۱۴۰۲ھ میں۔

چوتھے حج ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۶ء کے بعد اُنھوں نے بلادِ عرب وافریقہ کا علمی وثقافتی دورہ کیا۔ وہاں کے ممتاز علما سے ملے، کتب خانوں سے اِستفادہ کیا، نادر کتابوں کی معلومات حاصل کیں اور عالمِ اسلام کے ایک معتد بہ حصّے کے مسلمانوں کے حالات ومسائل سے قریب سے واقف ہوے۔ جن ملکوں اور شہروں میں گئے؛ اُن کے نام اور اَسفار کی تفصیل، اُنھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھ دی ہے۔

اِعزازی نشانات واِنعامات

- مارچ ۱۹۸۴ء میں "تنظیمِ فکر ونظر" سکھر کی دعوت پر سندھی ادبی میلے میں شرکت کی۔ اِس موقع سے اُنھیں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق (ش ۳؍محرم ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۷؍اگست ۱۹۸۸ء بہ روز چہار شنبہ) کے ہاتھوں تنظیم کا اِعزازی نشان، سندھ کی روایتی چادر اور ٹوپی دی گئی۔
- ۱۴۰۰ھ میں اسلام آباد، پاکستان میں منعقدہ تیسری عالمی کانفرس اور سرکاری سیرت کانفرنس میں مدعو ہوے اور شرکت کی۔ اِس موقع سے جنرل ضیاء الحق مرحوم نے اُنھیں ایک نہایت قیمتی لیمپ، عمدہ کشمیری مصلی اور ایک حمائل شریف تحفے میں دیا۔
- اگست ۱۹۸۶ء میں "تنظیمِ فکر ونظر" سندھ نے قاضی صاحبؒ کی اپنے ہاں کی چھپی ہوئی کتابوں کی رسم اِجراء میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے، اُنھیں دعوت دی۔ وزیرِ اعلی سندھ سید غوث علی شاہ کی صدارت میں، تاج محل ہوٹل کراچی میں ایک شان دار وپروقار جلسہ ہوا؛ جس میں چوٹی کے پاکستانی اہلِ علم وقلم وادب وماہرینِ قانون وماہرین تعلیم وتربیت نے اُنھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔
- ۱۵؍اگست ۱۹۸۴ء کو صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے؛ عربی زبان اور علمی وتحقیقی کارناموں کے پیشِ نظر؛ توصیفی سند، کشمیری چادر اور پانچ ہزار روپے نقد سالانہ تا حیات کی پیش کش کی گئی۔

۱۹۸۸ء میں یہ رقم دس ہزار کر دی گئی تھی۔

وہ اِدارے جن کے ممبر یا سرپرست رہے

۱-معتمد انجمن تعمیراتِ ادب مزنگ، لاہور ۲-مشیر علمی اِدارہ ''التراث العربی'' کویت ۳-صدر جمعیۃ علما مہاراشٹر بمبئی ۴-صدر دینی تعلیمی بورڈ مہاراشٹر ۵-رکن انجمن خدام النبی بمبئی ۶-رکن رویتِ ہلال کمیٹی جامع مسجد بمبئی۔

مذکورہ بالا اِداروں سے ماضی میں تعلق رہا تھا اور اُن سے وابستہ رہ کر مُفوَّضہ ذمہ داریاں انجام دی تھیں، جب کہ مندرجہ ذیل اِداروں سے تاحینِ حیات وابستہ رہے:

۷-رکن تاسیسی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ۸-سرپرست ''شیخ الہند اکیڈمی'' دار العلوم دیوبند ۹-اعزازی رفیق ''دار المصنفین'' اعظم گڑھ ۱۰-اعزازی مدیر ماہ نامہ ''برہان'' دہلی ۱۱-رکنِ مجلس شوری دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ ۱۲-رکنِ مجلس شوری تاج المساجد بھوپال ۱۳-رکن مجلس شوری جامعہ اشرفیہ نیا بھوجپور (بہار)۔(۱)

پس ماندگان: مولانا قاضی اَطہر کی پہلی شادی مولوی نعمت اللہ مبارک پوری (متوفی ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ) کی صاحب زادی سے ہوئی تھی، جو مولانا قاضی اطہر صاحب کے فارسی میں اُستاذ بھی تھے۔ کسی وجہ سے ایک دو بار ہی کی رخصتی کے بعد علاحدگی ہو گئی۔ دوسری شادی محترمہ سائرہ بنت محمد یعقوب صاحب ساکن ''ولید پور'' ضلع ''مئو'' کے ساتھ ہوئی۔ قاضی صاحب کی تمام اولاد اُنھی محترمہ کے بطن سے ہوئی۔ ''سائرہ'' کی پرورش و پرداخت اُن کے نانا حافظ محمد زاہد ساکن ''محمد آباد گوہنہ'' ضلع ''مئو'' کے زیرِ تربیت ہوئی تھی۔ حافظ محمد زاہد مرحوم اپنے وقت کے اچھے حافظوں میں گنے جاتے تھے۔ بڑے نیک، متقی، پرہیز گار اور سادہ مزاج قسم کے بزرگ تھے۔ اُن کے بیٹے مولوی حکیم محمد اکبر صاحب (متوفی ۲۰۰۳ء) مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے، درسِ نظامی کے فارغ التحصیل تھے، لکھنؤ سے فنِ طب کی سند بھی حاصل کی تھی۔ حکیم صاحب اپنے وطن ''محمد آباد گوہنہ'' میں آخری عمر تک مطب کر کے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے ہیں۔ اُن کی

---

(۱) یہ تمام معلومات قاضی صاحب کی کتاب ''قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' سے ماخوذ ہیں۔ البتہ پس ماندگان کے باب کی اکثر معلومات ''مئے طہور'' ''مجموعۂ کلام قاضی اطہر مبارک پوری'' مُرتبہ: مولانا قمر الزماں مبارک پوری، کے ابتدائیے سے بالفاظہٖ مختصراً لی گئیں ہیں۔

طبابت کی بنیاد، جلبِ منفعت نہیں، خلقِ خدا کی خدمت کا تصور تھی۔

قاضی صاحب کی حرم محترم ''سائرہ'' بنت محمد یعقوب پابندِ صوم وصلاۃ ہونے کے ساتھ، کثرتِ تلاوت سے خصوصی شغف رکھتی تھیں۔ قاضی صاحب کی والدۂ مکرمہ کی طرح اُنھوں نے بھی، اپنے گھر پر بچوں کے لیے مکتب کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور وہ محلّہ کے بچوں کو نہایت انشراحِ قلبی کے ساتھ، قرآنِ مجید کی تعلیم اور دینی تربیت دیتی تھیں۔ اُنھیں دوبار حجِّ بیت اللہ شریف کا شرف حاصل ہوا تھا۔ دوسری بار ہوائی جہاز سے اپنے فرزندِ اکبر مولانا خالد کمال (ولادت یکم دسمبر ۱۹۳۸ء — وفات ۵؍دسمبر ۱۹۹۹ء)(۱) کے ہم راہ اس مقدس سفر پر نکلیں۔ دنیا سے اُن کے جانے کی ادا بھی بڑی مبارک تھی: وہ اپنے میکے ''ولید پور'' اپنی بہن کو سفرِ حج کے مبارک موقع پر الوداع کہنے کے لیے گئی تھیں۔ بہن کو رات گزار کر صبح میں سفرِ حج پر نکلنا تھا۔ اُنھوں نے نمازِ عشا ادا کرتے ہوئے مُصلّے پر ہی بے ہوشی اختیار کر لی اور صبح ہوتے ہوتے، بہن کے حج پر جانے سے پہلے ہی یکم ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸؍فروری ۱۹۹۸ء جہانِ آب وگل کو الوداع کہتے ہوئے خود سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئیں۔

❁ **اولاد واحفاد:** مولانا قاضی اطہر مبارک پوری دنیاوی نعمتوں کے اعتبار سے بھی خوش نصیب تھے۔ مولانا مرحوم کی چھ اولادِ ذکور اور دو اولادِ اناث تھی۔ مولانا کے دو بچے شریف انور اور انور جمال صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے۔ مولانا نے علم ودین داری کی جو روایات آگے بڑھائیں، اُن کی اولاد میں بھی تعلیم وتعلم اور دین ودیانت کی وہ وراثت پروان چڑھی اور سب کے سب لڑکے اور لڑکیاں تعلیم یافتہ اور صاحبِ صلاحیت ہوئے؛ بل کہ یہ سلسلہ اب اولاد سے گزر کر احفاد تک بھی آ گیا ہے اور ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کی بہترین مثال پیش کر رہا ہے۔

اُن کے سب سے بڑے فرزند مولانا خالد کمال تھے، یکم دسمبر ۱۹۳۸ء اُن کی تاریخ ولادت ہے، بڑے ذہین وفطین اور خوش مزاج تھے۔ ابتدائی اُردو کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ ''اِحیاء العلوم'' مبارک پور میں حاصل کی۔ اِس کے بعد دو سال تک دار العلوم دیوبند میں رہے اور دورۂ حدیث کی تکمیل کر کے ۱۹۵۸ء میں سندِ فراغ حاصل کی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد مدرسہ ''احیاء العلوم'' میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر مدرسہ ''مفتاح العلوم'' بھیونڈی میں درس وتدریس پر مامور ہوئے۔ جس کو آپ کے والد مرحوم نے ۱۹۵۱ء/ ۱۳۷۱ھ میں قائم فرمایا تھا۔ اِسی دوران آپ کی خداداد صلاحیت وقابلیت سے

(۱) یہ ۵؍دسمبر کی تاریخ ہندوستان کے اعتبار سے ہے؛ ورنہ نیوزی لینڈ میں جہاں ان کا انتقال ہوا، ۶؍دسمبر کی تاریخ تھی۔

مُتاثّر ہو کر حکومتِ مصر کے قونصل جنرل عبدالمنعم النجار نے مشہور عالمی درس گاہ جامعہ ازہر میں سرکاری وظیفے پر داخلے کے لیے زور دیا؛ لیکن مولانا قاضی اطہر، اسلامی تہذیب وثقافت کی اقدار پر دل وجان قربان کیے ہوے تھے، اُنھیں یہ دیکھ کر سخت ذہنی اذیت پہنچ رہی تھی کہ جامعہ ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے عموماً اسلامی لباس وتہذیب سے عاری اور بے ریش ہوا کرتے تھے اور اپنے رہن سہن میں یہود ونصاریٰ کا نمونہ بن جاتے تھے؛ اِس لیے وہاں بھیجنے میں مولانا کو سخت تکدُّر وتامُّل تھا؛ مگر جب مدینہ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو علمی وفنی کمالات اور دینی حمیّت میں اِضافے کے لیے انشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اپنے فرزند کا داخلہ کرادیا۔ ۵ برس تک لائق اساتذہ سے علمِ دین کی تکمیل کرنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں مدینہ یونیورسٹی کے "كلية الشريعة" سے فارغ ہوے اور حکومتِ سعودی عرب کی وزارتِ اسلامی امور کی طرف سے گھانا (مغربی افریقہ) میں مبعوث بنا کر، دین اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے مامور کیے گئے۔ مولانا خالد کمال کی علمی ودینی، اصلاحی وتبلیغی سرگرمیوں نے، مغربی افریقہ کی قومی ودینی زندگی میں بڑی نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں۔ اُن کی کوششوں سے سعودی حکومت نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر حج سے روکا۔ مولانا خالد کمال نے گھانا میں چودہ برس تک اہم دینی وعلمی خدمات انجام دیں۔ وہاں سے انگریزی میں "اطہر" کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی جاری کیا۔ سعودی عرب نے مولانا خالد کمال کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۸۱ء میں نیوزی لینڈ تبادلہ کردیا، جہاں وہ اپنی وفات ۵/دسمبر ۱۹۹۹ء تک برسرِ کار رہے۔ آپ نے پندرہ بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

مولانا خالد کمال عربی زبان پر قدرت کے ساتھ، علومِ اسلامی میں بھی کافی درک رکھتے تھے۔

نیوزی لینڈ میں مولانا خالد کمال نے ایک عظیم الشان اسلامک سینٹر قائم کر کے، اُس میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کی یہ پہلی مسجد قرار پائی، اِس کی تعمیر وتزیین کے لیے، مولانا نے یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا۔

مولانا خالد کمال میں بڑی خوبیاں تھیں: وہ ادیب وشاعر بھی تھے۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں، اُنھیں اپنے والد صاحب کی طرح قرطاس وقلم کی امانت حاصل ہوگئی تھی۔ اُن کے مضامینِ نظم ونثر جو "البلاغ" اور دوسرے رسائل میں شائع ہوے، اُن سے، اُن کی علمیت اور ادبیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا بڑی ہنس مکھ اور محفل کو زعفران زار بنا دینے والی طبیعت کے مالک تھے۔ اُنھیں اداروں

کو ترقی دینے اور اِن اداروں کو قومِ مسلم کے لیے، کارآمد بنانے کا بہت اچھا سلیقہ تھا۔

مولانا خالد کمال نے دعوت و تبلیغ اور دوسری دینی و ملی مصروفیات کی وجہ سے فرصتِ کار بہت کم پائی؛ اِس لیے صلاحیتوں کے باوجود اُن کی ادیبانہ و شاعرانہ شان کا اِظہار بہت کم ہو پایا، مولانا قاضی اطہر کو، اُن سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، وہ اکثر محسوس کرتے تھے کہ تکمیلِ تعلیم کے بعد وہ تصنیف و تالیف کی طرف مُتَوَجِّہ ہوں گے اور اُن کی فتوحاتِ قلمی کا دائرہ بہت وسیع ہوگا؛ مگر دوسری علمی تگ و دو نے اُنھیں علم و قلم کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں دیا۔ پھر بھی مولانا خالد کمال نے نثر و نظم میں جو سرمایہ چھوڑا ہے، اُس سے اُن کی علمیت و صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ سفرناموں کے علاوہ مقالہ نگاری اور شعر گوئی کی طرف بھی توجّہ کرتے تھے۔ اُن کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور اُن کا شعری مزاج بہت شایستہ تھا۔

اُن کی ایک نعت شریف بہ طورِ نمونۂ کلام، ذیل میں درج کی جارہی ہے:

یہ کیا کم سارے عالم پر، ترا اِحسان ہے ساقی
نہ جائے تشنہ لب کوئی، ترا اِعلان ہے ساقی
نہ بدلا ہے نہ بدلے گا، کبھی دستورِ محفل کا
مِرا کیا؟ ساری دنیا کا، یہی ایمان ہے ساقی
وفاداری کی رسمیں حل ہیں، تیری بزمِ رنگیں میں
ہر اِک میکش بہ ذاتِ خود، ترا سلمان ہے ساقی
ترے در سے کوئی سائل، تہی داماں نہیں اٹھا
ترے جود و سخا پر، عقلِ کل حیران ہے ساقی
تِری بزمِ محبت کی، یہ یکسانی تعالی اللہ
نہ کوئی اجنبی ہے، نہ کوئی انجان ہے ساقی
امیری میں بھی راحت ہے، فقیری میں بھی تسکیں ہے
غلامی کا تِرِی نسخہ، بہت آسان ہے ساقی

خوشی پر بھی وہ رقصاں ہے، الم پر بھی وہ خنداں ہے
گدائے کوچۂ غم کی، نرالی شان ہے ساقی
گراں گزرے تو کیوں گزرے؟ کسی کی عقل وفطرت پر
موافق عقل وفطرت کے، ترا فرمان ہے ساقی
تری بستی میں مدفن ہو، ترے کوچے میں دم نکلے
تری قربت کا خالد کو، بڑا ارمان ہے ساقی

مولانا خالد کمال کو ہندوستانی تاریخ کے مطابق ۵/دسمبر ۱۹۹۹ء کو نیوزی لینڈ میں غریب الوطنی کی موت آئی اور وہیں پیوند خاکِ ہوئے۔

مولانا خالد کمال کے ایک لڑکے ''فوزان طارق'' ہیں اور باقی پانچ لڑکیاں ہیں۔ مولانا کی تمام اولاد مُتأہّل زندگی گزار رہی ہے اور سب کی سب نیوزی لینڈ میں مقیم ہے، اُن کا وطن آنا جانا رہا کرتا ہے۔

''فوزان طارق'' کی ابتدائی تعلیم مدرسہ ''اِحیاء العلوم'' مبارک پور میں ہوئی۔ پھر نیوزی لینڈ میں یونی ورسٹی کی سطح تک تعلیم حاصل کی اور عربی پڑھنے کے لیے قاہرہ بھی گئے۔ فوزان طارق اِس وقت نیوزی لینڈ میں سرکاری صیغۂ ملازمت سے وابستہ ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے دوسرے صاحب زادے قاضی حاجی ظفر مسعود صاحب تھے۔ اُن کی تاریخ پیدائش یکم دسمبر ۱۹۴۱ء/۴/جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ ہے۔ اُنھوں نے مدرسہ اِحیاء العلوم مبارک پور سے پرائمری درجات پاس کرنے کے بعد ایم پی انٹر کالج سے ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ جامعہ اُردو علی گڑھ سے ۱۹۶۱ء میں ادیب ماہر، ۱۹۶۲ء میں ادیب کامل کی سندیں حاصل کیں۔ پھر دینی ومذہبی تعلیم کے لیے، مدرسہ اِحیاء العلوم، مبارک پور میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو سے پہلی پوزیشن میں عالم کا امتحان پاس کیا۔ دو مرتبہ شرفِ حج بیت اللہ بھی حاصل کیا۔ ۱۹۶۸ء میں فخر المحدثین علامہ سید فخر الدین شیخ الحدیث دار العلوم دیو بند نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہو کر خصوصی سندِ حدیث سے نوازا۔ قاضی ظفر مسعود کی علمی ودینی سرگرمیوں سے کئی میدان سرسبز تھے۔ اُنھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے خاص تعلق خاطر تھا۔ مطالعہ کے موضوعات میں بڑا تنوع اور پھیلاؤ تھا۔ مبارک پور میں لڑکیوں کی

پہلی انگریزی درس گاہ ''انصار گرلس انٹر کالج'' کے بانیوں میں سے تھے۔(۱) اس سے پہلے بھی کئی انجمنوں، لائبریریوں اور اِداروں کو وجود میں لانے کا فخر حاصل کر چکے تھے۔ اُنھیں موقع محل کے اچھے اور معیاری اشعار خوب از بر تھے اور اُن کے استعمال میں بڑی برجستگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے مولانا قاضی اطہر کے سلسلے میں کئی اشاریے ترتیب دیے تھے، جو تحقیقی کام کرنے والوں کی رہ نمائی کا بہتر فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

اللہ تعالی نے اُنھیں نو اولاد کی ابویت کا شرف بخشا تھا، جن میں صرف ایک لڑکے مولوی قاضی فرحان سلمہ ہیں۔ اُن کی ولادت ۱۱ر نومبر ۱۹۷۶ء کو ہوئی۔ اُن کی ابتدائی اردو اور عربی کی تعلیم مدرسہ اِحیاء العلوم میں ہوئی اور ایشیا کی شہرۂ آفاق درس گاہ دار العلوم دیو بند سے، اُنھوں نے فراغت پائی۔ گھر پر عائلی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے خاندان کی دیکھ ریکھ کر رہے ہیں۔

قاضی اطہر مبارک پوری علیہ الرحمہ کے تیسرے فرزند مولانا قاضی سلمان مبشر مبارک پوری (ولادت یکم جنوری ۱۹۵۳ء) ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم اِحیاء العلوم میں پانے کے بعد، ایک سال کے لیے دار العلوم دیو بند گئے۔ وہاں سے سندِ فراغ لینے کے بعد ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں ''کلیۃ الدعوۃ واصول الدین'' سے تعلیم کی تکمیل کی، اُس کے بعد حکومت سعودیہ عربیہ کی طرف سے مبلغ مدرّس کا امتیاز دے کر ''گھانا'' مغربی افریقہ میں مامور کیے گئے۔ وہاں اہل وعیال کے ساتھ چودہ برس رہ کر، قوم وملت کی اہم خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۹۲ء میں حکومت سعودیہ نے تبادلہ کر کے ہندوستان بھیجا، یہاں کے مختلف مدارس میں اُنھوں نے تعلیم دی۔ اِس وقت دار العلوم حسین آباد ''اَنجان شہید'' ضلع اعظم گڑھ میں مدرّس ہیں۔ اُنھیں چھ مرتبہ حج کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ اپنے والد مؤرخ مبارک پوری کے علمی ودینی کارناموں کو منظر عام پر لانے کے لیے، دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور اِس سلسلے میں مختلف افراد واداروں سے مسلسل رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ مولانا مرحوم کی جن کتابوں کے ایڈیشن ختم ہو گئے ہیں، اُن کی اِشاعت ثانی اور جو کتابیں منتظرِ اِشاعت ہیں اُن کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی

(۱) افسوس ہے کہ قاضی حاجی ظفر مسعود صاحب بھی بہ روز جمعرات: ۲۹ر ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ ۱۷ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو راہیِ ملکِ بقا ہو گئے۔

تگ ودو میں اپنا وقتِ عزیز صرف کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت سے نوازے، مولانا قاضی سلمان مبشر کے عقد میں مورخِ اسلام مولانا قاضی اَطہر مبارک پوری کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحیٰ رسول پوری کی صاحب زادی ہیں، جن کے بطن سے پانچ اولاد ہے، تین لڑکے اور دو لڑکیاں۔

مولانا سلمان مُبَشّر کے بڑے صاحب زادے قاضی فیصل ہیں۔ اُنھوں نے ابتدائی تعلیم ''گھانا'' مغربی افریقہ میں حاصل کی، پھر ۱۹۸۸ء میں اپنے تایا مولانا خالد کمال کے سایۂ شفقت میں رہ کر نیوزی لینڈ میں تعلیمی مراحل طے کیے اور بی ایس سی کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ قابلیت حاصل کرکے، اُسی شعبے میں ملازمت کرلی۔ وکٹوریہ یونی ورسٹی ونگٹن سے کمپنی نے، اُنھیں اپنی نئی برانچ سڈنی ''آسٹریلیا'' میں کار منصبی کی انجام دہی کے لیے بھیج دیا، جہاں اب تک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ برسرِ کار ہیں۔

دوسرے صاحب زادے قاضی محمد ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم ''گھانا'' میں ہوئی۔ ۱۹۹۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ منتقل ہوگئے۔ یہاں ۲۰۰۳ء میں ایم.اے. ویسٹ ایشیا اسٹڈی میں ٹاپ کیا اور مڈل کے مستحق ہوئے، اس وقت سڈنی ''آسٹریلیا'' میں بہ سلسلہ اعلیٰ تعلیم مقیم ہیں۔

تیسرے لڑکے قاضی ریّان احمد ہیں جنھوں نے ''گھانا'' میں پڑھنے کے بعد ہندوستان کے مختلف اداروں میں تعلیم حاصل کی اور اس وقت ''ملبورن'' آسٹریلیا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے سب سے چھوٹے بیٹے قاضی حسان احمد (متولد یکم جمادی الآخر ۱۳۷۳ھ) ہیں۔ جنھوں نے مدرسہ ''اِحیاء العلوم'' سے اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرکے شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ ڈگری کالج اعظم گڑھ سے بی، اے، کیا۔ اِس کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا، اِس وقت ''انصار گرلس انٹر کالج'' میں امورِ مُفَوَّضَہ کی انجام دہی میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کی پرورش وپرداخت میں آٹھ بچے ہیں، جن میں ۲ ذکور اور ۶ اناث ہیں۔ اُن کے بڑے بیٹے قاضی عدنان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ ''اِحیاء العلوم'' میں ہوئی اور سندِ فراغ ''مظاہر العلوم'' سہارن پور سے حاصل کی، پھر ''مرکز المعارف'' بمبئی سے انگریزی زبان دانی کا کورس بھی مکمل کیا۔

امۃ الرحمٰن ام سلمہ (پ: یکم مارچ ۱۹۴۸ء/ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ) مولانا قاضی اطہر کی بڑی صاحب زادی ہیں۔ جو اپنے ننہالی رشتے میں ''محمد آباد گوہنہ'' ضلع ''مئو'' کے رہنے والے ماسٹر مصباح

الدین محمد رافع سے منسوب ہیں۔ اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ ماسٹر مصباح الدین مولانا قاضی اطہر کی حرمِ محترمہ کے ماموں زاد ہیں۔ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی، ایس، سی، کر کے گورکھ پور یونی ورسٹی سے ایم، ایس، سی، کیا۔ ۱۹۶۷ء سے اسلامیہ انٹر کالج ''فیروز آباد'' میں بائیلوجی کے لکچرار ہوے، یہیں ۲۰۰۵ء سے پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ مع اہل وعیال ''فیروز آباد'' میں قیام ہے۔

مولانا قاضی اطہر کے نواسے سعد الدین نے ''فیروز آباد'' میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے فیضِ درس اٹھایا۔ اُس کے بعد منی پال (کرناٹک) سے ڈینٹل کورس کیا۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ''نیوزی لینڈ'' گئے۔ تکمیلِ تعلیم کر کے، وہیں ایک سرکاری ہسپتال میں طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی چھوٹی بیٹی شمیمہ عائشہ (پ: ۵/شعبان ۱۳۷۹) ماسٹر رضوان احمد علیگ نوادہ، مبارک پور کے عقدِ مناکحت میں ہیں۔ جو مولانا کے حقیقی ماموں مولانا محمد یحیٰ رسول پوری کے نواسے ہیں۔ اُنھوں نے مبارک پور میں تحصیلِ علم کر کے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی راہ لی اور وہاں رہ کر بی، اے، کیا۔ اُس کے بعد ملک سعود یونی ورسٹی ریاض سعودی عربیہ میں تکمیلِ درس کی، بہ سلسلہ تجارت بمبئی میں قیام ہے۔ اُن کی چھ اولاد میں چار اولاد نرینہ اور دو اولاد اناث ہے۔ اُن کے بڑے لڑکے صفوان ہیں، جن کی ابتدائی تعلیم مبارک پور میں ہوئی انٹر فیروز آباد سے کیا۔ اِس کے بعد بمبئی میں الکٹرک انجینیرنگ کا کورس کیا، دوسرے لڑکے شیبان ہیں اُنھوں نے مبارک پور میں تعلیمی سلسلہ شروع کر کے شبلی کالج اعظم گڑھ سے انٹر کیا۔ اس کے بعد برہان پور (ایم. پی) میں بی، یو، ایم، ایس، کا میڈیکل کورس کیا۔ (*)

(*) تاریخ عربی تحریر چہار شنبہ: ۱۲ بجے دن ۱۴/ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۳۱/جولائی ۱۹۹۶ء، جو ''الداعی'' کے شمارہ ۳۰، جلد ۲۰، ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق اگست ۱۹۹۶ء میں ''كلمة العدد'' یعنی اِداریے کی جگہ، پر بہ عنوان ''المؤرخ الإسلامی الهندي الشهير القاضي أطهر المبارك بوری في ذمة الله'' شائع ہوئی، نیز ماہ نامہ ''الفیصل'' ریاض سعودی عربیہ کے شمارہ ۴ ۲۸ صفر ۱۴۲۱ھ مطابق مئی - جون ۲۰۰۰ء کے گوشہ ''أعلام'' میں ص: ۹۶ - ۱۰۰ پر شائع ہوئی۔ اردو تحریر بہ قلم خود چہار شنبہ: ۲۸/ربیع الاول ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴/اگست ۱۹۹۶ء جو ہندوستان کے مختلف کثیر الاشاعت رسالوں میں شائع ہوئی۔

مفتی اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ (*)

۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء — ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی

آخری مفتی

ہماری طالب علمی کے زمانے میں، طلبۂ دارالعلوم کی زبان پر اکثر یہ جملہ رہا کرتا تھا کہ آخری مہتمم (یعنی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ) آخری شیخ الحدیث (یعنی حضرت مولانا سید فخر الدین احمد ہاپوڑی ثم المرادآبادیؒ) اور آخری مفتی (یعنی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ) کا زمانہ دیکھ لو۔ اب دارالعلوم میں اِن کے بعد، اِن کی جگہ پر، جو بھی آئے گا، وہ ہرگز اِن کے برابر نہ ہوگا۔

اور واقعی وہی ہوا جو چیدہ خلقِ خدا یعنی مہمانانِ رسولؐ: طلبۂ دارالعلوم کی زبان سے اکثر سننے کو ملتا تھا کہ دارالعلوم میں مذکورہ بالا عظیم ہستیوں کی جگہ پر جو حضرات آئے یا آتے رہے، وہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود، اُن کا جواب اور اُن کے ہم پلّہ نہیں تھے۔

عظیم سلف کے عظیم خلف

مفتی محمود حسن صاحبؒ میں، اپنے عظیم اسلاف ومشائخ وفقہا وعلما کی طرح،

(*) ترجمہ از عربی، بہ قلم مولوی جاوید اشرف قاسمی مدھے پوری، رجب ۱۴۱۷ھ/ نومبر ۱۹۹۶ء۔

اِستحضارِ علمی، سرعتِ انتقالِ ذہنی، فقہی بصیرت، اِجتہادی صلاحیت، اُصول وفروع کی تطبیق کی لیاقت، سابقہ نظائر واَشباہ پر، نئے مسائل کے قیاس کی وہ مہارتِ تامہ پائی جاتی تھی، جو کسی عبقری مفتی اور فرعی اِجتہاد کا عمل انجام دینے کی وہبی لیاقت والے مجتہد کی شان ہوا کرتی ہے۔

ساتھ ہی وہ اپنے اکابر ہی کی طرح دینی غیرت واستقامت، عقائدی صلابت، اِحسانی کیفیت اور تعلّق مع اللہ کے باب میں بھی مثالی عالم کے اعلیٰ رتبے پر فائز تھے۔ اِخلاص واحتساب اور سلوک وعرفان کے حوالے سے بھی، وہ دارالعلوم کے اَساتذہ ومشائخ کے معاشرے میں ایسا لگتا ہے کہ "خاتم العارفین الصادقین" تھے۔ اُن کے ایسا بلند پایہ صاحبِ نسبت شیخ ومربی کو دیکھنے کے لیے، نہ صرف طلبہ واَساتذہ و متعلقین دارالعلوم کو؛ بل کہ ساری ہندی ملت کو، نہیں معلوم کہ کب تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ذیل کا شعر بہت گھس پٹ جانے کے باوجود، حقیقت بیانی کے لیے، اپنا جواب نہیں رکھتا:

ہزاروں سال نرگس، اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے، چمن میں دیدہ وَر پیدا

علم وعمل کی صحیح جامعیّت

مفتی صاحبؒ کے وجود سے، دارالعلوم کے ماحول میں علم وعمل کی صحیح جامعیّت کا رنگ کسی نہ کسی درجے میں قائم تھا اور ہر آنے جانے والے کو، بالخصوص جس میں دینی شعور اور اِسلامی آگہی واِدراک کی خوبو پائی جاتی تھی، یہ محسوس ہوتا تھا کہ دارالعلوم کے ماحول کے خاکستر میں ابھی ایسی چنگاری باقی ہے، جو فقرِ غیور اور عشقِ جسور کے آتشِ فروزاں کا رنگ اختیار کر لینے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے؛ لیکن اُن کی وفات کے بعد، دارالعلوم کے دور دیوار ہر کہ ومہ کو بے رونق سے لگتے ہیں۔ مفتی صاحبؒ کی صحبت میں بیٹھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ اَسلاف کے علم وعمل کے حقیقی وارث کا رنگ وڈھنگ ابھی

اِس مے خانۂ علم و عرفان میں الحمدللہ کسی درجے میں قائم ہے۔

اُن کی وفات کے بعد ہی نہیں؛ بل کہ اُن کے آخری سفرِ افریقہ، جو اُن کی وفات پر منتج ہوا، کے دوران ہی مجھ جیسے بے شعور اور فراست و بصیرت سے یکسر عاری انسان کو بھی دل کی گہرائیوں میں چھتہ مسجد، اُس کے سامنے کی سڑک اور دارالعلوم کے ماحول میں ایک طرح کی ناقابلِ توجیہ تاریکی کا اِحساس ہونے لگا تھا اور دل کے خاموش گوشوں میں یہ آواز سنائی دیتی تھی کہ شاید اَب یہ مردِ خدا دوبارہ اپنی دید سے ہم لوگوں کو لذّت یاب نہیں کرے گا اور وہی ہوا جو دل نے کہا۔ زندگی کا اپنا ذاتی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ دل کی آواز بہت بار سچی ثابت ہوتی ہے۔

مسجدِ چھتّہ کا سونا پن

مسجدِ چھتّہ اب بھی قائم ہے، اُس کا قاسمی حجرہ اب بھی باقی ہے، اُس کے در و بام اب بھی نمازیوں کی سجدہ ریزیوں سے مُنوَّر ہیں؛ لیکن وہ روحانی روشنی، وہ عرفانی کرنیں اور وہ احتسابی کیف جس سے اُس کا گوشہ گوشہ معمور تھا، دور دور تک نظر نہیں آتا۔ میں افریقی منزل قدیم سے (جہاں میری اور متعدد اَساتذہ کی اپنے بچوں کے ساتھ رہائش ہے) دارالعلوم آتے جاتے ہوئے روزانہ مسجد چھتّہ کے سامنے کی سڑک سے گزرتا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ، اِن گلیوں کی تاریکیوں میں محسوس طور پر اِضافہ ہوتا جاتا ہے:

تیرے بغیر رونقِ دیوار و در کہاں
شام و سحر کا نام ہے، شام و سحر کہاں
عرصہ ہوا کہ رسمِ محبت بدل گئی
دامن سے اب معاملۂ چشمِ تر کہاں

حرفِ علم کے آشناؤں کی اب بھی کوئی کمی نہیں (اور آیندہ بھی نہیں ہوگی)؛ لیکن

عرفانِ حقیقت، یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبتِ فاتحِ عالم کے دُرِ نایاب سے، اُن کے صدف کی آغوش ہم جیسوں کو تو بہت خالی نظر آتی ہے؛ اِس لیے اُن کی ذات سے، تمام برکاتِ علم وحکمت کے باوجود، وہ روشنیاں نہیں پھیل پاتیں، جن سے عالمِ رنگ و بو کے بیاباں کی حقیقی تاریکی کافور ہوا کرتی ہے:

گماں آباد ہستی میں، یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں، قندیلِ رہبانی

جس کو دنیاے آب وگل میں آنے کی بیماری لاحق ہوگئی ہے، اُسے ایک نہ ایک دن ضرور ناپید ہوجانا ہے؛ لیکن جو لوگ حبِّ الٰہی اور عشقِ نبوی سے اپنے دل کو مُنَوَّر اور اپنے وجود کو روشن کرجاتے ہیں، وہ موت کے بعد بھی پایندہ رہتے ہیں:

تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

دوشنبہ اور سہ شنبہ مورخہ ۱۷-۱۸ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ (ہندوستانی کیلنڈر کے مطابق): ۱۹-۲۰ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ (جنوبی افریقہ کی تقویم کے مطابق) مطابق ۲-۳ ستمبر ۱۹۹۶ء کی درمیانی شب تھی کہ اچانک اِحاطۂ دارالعلوم دیوبند کے بیچ میں واقع مسجدِ قدیم کے مناروں پر نصب لاؤڈ اسپیکر کے ہارن گونج اٹھے اور اِس افسوس ناک خبرِ وفات کا اعلان کیا گیا کہ مفتیِ اعظم حضرت مولانا محمود حسن گنگوہیؒ کا جنوبی افریقہ کے شہر "جوہانس برگ" میں انتقال ہوگیا، جہاں آپ ۲۰ اپریل ۱۹۹۶ء سے مقیم تھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

غم واَلم کا ہمہ گیر سایہ

نصفِ شب کے وقت یہ روح فرسا خبرِ وفات ہم پر بجلی بن کر گری اور ہم گھبرائے

ہوے جاگ اٹھے، آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں؛ لیکن اِس اطلاع سے نیند یکسر کافور ہوگئی؛ کیوں کہ ایک ایسی بزرگ ہستی کے کھونے کا غم ہمارے لیے دل گداز ہورہا تھا، جو گہرے علم، اپنے رب کے لیے مخلصانہ عمل اور اپنے غیر معمولی اِصلاح کے ساتھ ساتھ بہت سے بندگانِ خدا کی اِصلاح کا ذریعہ تھی۔

سہ شنبہ مورخہ ۱۸ربیع الثانی کی پوپھٹی، صبح تڑکے ہی دارالعلوم کے طلبہ اور بہت سے اساتذۂ کرام اور اہلِ دیوبند کی بھیڑ چھتہ مسجد میں جمع ہوگئی۔ یہ سبھی لوگ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی بیماری اور وفات کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے۔ دارالعلوم میں تعلیمی تعطیل کا اِعلان کردیا گیا۔ پورے شہر کے مسلمان اور دارالعلوم کے اساتذہ وطلبہ پورے دن حضرت مرحوم کے لیے مغفرت وبخشش، رفعِ درجات اور جنت الفردوس میں جگہ عطا کیے جانے کی دعائیں کرتے رہے۔ اِحاطۂ دارالعلوم میں منعقدہ جلسۂ تعزیت میں کئی ایک اساتذۂ دارالعلوم، خصوصًا شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب اعظمی مدظلہ اور مولانا ریاست علی صاحب مدظلہ نے، حضرت مرحوم کی سیرت وشخصیت پر اپنی تقریروں میں روشنی ڈالی اور حضرت مرحوم کے کارناموں اور علم وفضل، دعوت وتبلیغ اور اِصلاح واِرشاد کے میدانوں میں اُن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ایک واضح نقشہ پیش کیا۔ مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ نے بھی اِس وفات حسرت آیات پر اپنے شدید رنج والم کا اِظہار فرمایا، جس کی بنا پر مسلمانوں کو اور خصوصًا دارالعلوم کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اِس کے علاوہ پورے برِّصغیر ہند میں عمومًا اور ہندوستان بھر میں پھیلے ہوے اِسلامی مدارس وجامعات میں خصوصا، تعزیتی اور دعائیہ جلسے منعقد ہوے، جب کہ دنیا کے گوشے گوشے سے بے شمار تعزیتی پیغامات موصول ہوے۔

دارالعلوم پر حزن وملال کی خیمہ زنی

دیوبند شہر اور دارالعلوم پر بالعموم اور چھتہ مسجد کے قرب وجوار پر بالخصوص غموں

کا بادل چھایا ہوا تھا؛ (۱) کیوں کہ اِسی مسجد کے ایک کمرے میں حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ۲۰/رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ سے برابر زندگی کے آخری لمحوں تک قیام رہا۔ اِس مسجد کے کمروں کو یہ شرف حاصل ہے کہ پرانے زمانے سے ہی ہمیشہ وہ اللہ کے نیک و صالح بندوں کی فرودگاہ رہے ہیں، مثلاً حاجی عابد حسین صاحبؒ (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء) جنھوں نے سب سے پہلے دار العلوم کے قیام کے لیے بہ روزِ جمعہ ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء چندے کی تحریک کی اور چندے اکٹھے بھی کیے، اُن کا بھی اِسی مسجد کے ایک کمرے میں تقریباً ساٹھ سال تک مسلسل قیام رہا اور تیس سال تک اُن کی تکبیرِ اولی کبھی فوت نہیں ہوئی، اِسی طرح دار العلوم دیو بند کے بانی حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) کا جب بھی دیو بند آنا ہوتا، لازماً چھتہ مسجد کے کمروں میں ہی قیام فرماتے۔

یہ مسجد اخیر سالوں میں حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت و تلاوت اور ذکرِ خدا سے ہر دم آباد رہی اور اُس کی فضا ذوقِ عبادت سے سرشار اور عشقِ الٰہی میں مست بندگانِ خدا کی عبادت و تلاوت سے ہر لحظہ معمور رہی۔ یہ لوگ حضرت مفتی صاحب مرحوم کے پاس برابر آتے اور ساتھ رہتے تھے اور اُن کی معیّت میں دن رات گزار کر زہد و صلاح اور شوقِ آخرت کا درس لیتے، آستانۂ رب پر جبہہ سائی کے آداب سیکھتے اور لذتِ احتساب اور سرورِ اِحسان و اِخلاص کی تعلیم پاتے تھے۔ جب حضرت مرحوم موجود ہوتے، تو لوگ ٹوٹے پڑتے اور مسجد نمازیوں سے بھر جاتی۔ یہ لوگ آپ کے ساتھ نماز پڑھنے میں خشوع و خضوع، قلبی استحضار اور سکونِ دل کی جو کیفیت محسوس کرتے تھے، وہ آپ کی عدمِ موجودگی میں اُنھیں میسّر نہیں آتی تھی۔ حضرت مفتی

---

(۱) یہ مسجد چھتہ دار العلوم کی تین مسجدوں میں شامل ہے۔ یہ مسجد شہنشاہ "محمد تغلق" متوفی ۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔ اِسی مسجد میں دار العلوم دیو بند نے محرم ۱۲۸۳ھ میں ایک انار کے درخت کے نیچے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یہ مسجد دار العلوم کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

صاحب مرحوم اگر رمضان، چھتہ مسجد میں گزارتے، اعتکاف فرماتے اور ذکر و عبادت اور تلاوت و ریاضت کے لیے راتوں کو جاگتے، تو مسجد کی رونق اور بہار دیکھنے کے قابل ہوتی۔ سیکڑوں علما و صالحین اور طلبہ آپ کے ساتھ اعتکاف میں ہوتے۔ بسا اوقات حضرت مرحوم، محبّین و معتقدین کے اِصرار پر دیو بند کے علاوہ کسی اور شہر میں، یا ہندوستان کے باہر کسی دوسرے ملک میں رمضان گزارتے، تو مسجد زبانِ حال سے نمازیوں کی قلّتِ تعداد کی شکایت کرتی نظر آتی۔

اوراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد

حضرت مرحوم کا ۹۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا؛ اِس لیے کہ آپ کی تاریخ ولادت ۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء ہے۔ گویا آپ نے نسبتاً عمرِ دراز پائی؛ کیوں کہ لوگ عموماً ۶۰ سال یا اِس سے کچھ اوپر ہی جیتے ہیں۔

لیکن بڑے حضرات، جنھیں لوگ ''وقتِ ضرورت'' — اور اُن کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی — شبِ تاریک میں چودھویں رات کے چاند کی طرح تلاش کرتے ہیں، اُن کی موت بڑی ہی دل گداز اور روح فرسا ہوتی ہے، جس سے اِنسانوں کے جگر پارہ پارہ ہو جاتے ہیں اور اُنھیں ایک دائمی حزن و ملال اور لازوال قلق و اضطراب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ کیفیت اُس وقت اور بھی فزوں ہو جاتی ہے، جب ایسی شخصیّات دنیا سے اٹھ جاتی ہیں، جن کے خلا کا صحیح طور پر، پُر ہونا محال اور اُنھیں جیسا جانشین ملنا ناممکن نظر آتا ہے؛ اِس لیے کہ یہ شخصیتیں طویل قربانیوں اور پیہم سینہ سوزیوں کی پیداوار ہوتی ہیں، جن سے گزرنا صرف توفیق یافتہ اور اہلِ قسمت حضرات ہی کے حوصلے کی بات ہے۔ یہ حضرات زندگی کے عیش و عشرت، جسمانی و مادی خواہشات اور بہت سی آرزوؤں و تمناؤں اور مرغوبات و من پسند اَشیا کی قربانیوں کے بعد تیار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تحصیلِ علم اور اُس کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کو خندہ پیشانی کے ساتھ

برداشت کرنے کے لیے شدید مجاہدوں سے گزرتے ہیں، نفس کی تہذیب واِصلاح کے لیے، ہر طرح کی جدوجہد کام میں لاتے ہیں؛ تاکہ نفس کو زہد وتقویٰ، سادگی وقناعت اور عبادت ومجاہدہ کی ڈگر پر ڈال دیں اور مصائب وآلام پر صبر، جملہ لایعنی کاموں سے اجتناب، خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت اور ناپسندیدہ اُمور کی بجاآوری پر ابھاریں اور برانگیختہ کریں۔ وہ اپنے اندر ہمہ گیر علم اور مسلسل عمل کی صلاحیت پیدا کرنے اور اپنی زندگی کے تمام لمحات کو رضاے اِلٰہی کے کاموں سے آباد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اِسلام کی تبلیغ ودعوت، باطل سے نبرد آزمائی، بندگانِ خدا کے حالات کی اِصلاح اور دلوں کی شمع کو ایمان ویقین، عشقِ الٰہی اور خلوصِ عمل کی چنگاری سے بھڑکا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور ہر آن اُمت میں یہ شعور بیدار کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں کہ وہ دنیا کے لیے اُتنی ہی محنت کام میں لائے، جتنا اسے یہاں جینا ہے اور اپنی آخرت سنوارنے کے لیے اُسی قدر زیادہ کوشش صرف کرے، جتنا اُسے وہاں رہنا ہے، مختصراً یہ کہ شیطان جب خداے بزرگ برتر کے احکام ونواہی کے نفاذ میں آڑے آتا ہے، تو یہ حضرات اُس سے پنجہ آزمائی کے لیے فوراً کمربستہ ہوجاتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اُنھی نیک بخت افراد میں شامل تھے۔ افسوس کہ دن بہ دن اُن جیسے حضرات کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے، یہ لوگ دنیا سے گزرجاتے ہیں اور اپنے پیچھے علم وعمل کی ''صحیح جامعیت'' میں اپنی نظیریں نہیں چھوڑتے۔ صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں، جن کا علم وعمل باہم مخالف اور متضاد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اسلامی مزاج کے قطعاً مخالف ہے؛ اِس لیے کہ اسلام اپنے فرزندوں کو ایک ہمہ گیر، کامل ومکمل اور علم وعمل دونوں سے بنے ہوے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ عمل سے خالی علم اور علم سے محروم عمل دونوں ہی شر انگیز فساد کا ذریعہ ہیں، جس میں صاحبِ معاملہ تو مبتلا ہوتا ہی ہے، وہ بھی نہیں بچتا، جو اس سے دور رہتا ہے۔

خاندان اور نشو ونما

مفتی صاحب شجرۂ طیبہ کی ایک شاخ تھے اور قرآنِ کریم میں خدائے پاک نے صراحت فرمائی ہے کہ باپ کی نیکی اُس کی اولاد کے لیے سود بخش ثابت ہوتی ہے۔ وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا میں اِس طرف اشارہ ہے، پوری آیت اس طرح ہے:

﴿ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَ كَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَّبْلُغَآ أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ﴾ (کہف/۸۲)

اور وہ جو دیوار تھی، سو دو یتیم لڑکوں کی تھی اِس شہر میں، اور اُس کے نیچے اُن کا مال گڑا تھا اور اُن کا باپ نیک تھا، پھر تیرے رب نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور اپنا گڑا ہوا مال نکالیں، تیرے رب کی مہربانی سے۔

لٰہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مفتی صاحب مرحوم نے اپنے والدِ ماجد کے صلاح وتقویٰ سے بھرپور حصہ پایا، یا دوسرے الفاظ میں: اللہ پاک نے اُنھیں والدِ گرامی کے صلاح و تقوی کی بہ دولت خوب نفع پہنچایا اور اُن کے ساتھ لطف و رحمت کا معاملہ فرما کر اُنھیں خوش بخت اور ایک متقی عالمِ دین بنا دیا۔

مفتی صاحب مرحوم کے والدِ ماجد مولانا حامد حسن گنگوہیؒ (متوفی ۲۱ محرم ۱۳۷۱ھ مطابق ۲۳ ر ستمبر ۱۹۵۱ء) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء، جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے طالبِ علم تھے، پھر دارالعلوم کے صدر المدرسین کے عہدے پر فائز رہے) کے شاگرد اور عالم باعمل، مجاہدِ جلیل اور برِّصغیرِ ہند میں شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) کے ساتھی تھے۔

مولانا حامد حسین صاحبؒ کو اُن کے اُستاذ حضرت شیخ الہندؒ نے ''نہٹور''، ضلع ''بجنور''

صوبہ اتر پردیش میں مدرّس بنا کر بھیجا۔ آپ وہاں زندگی بھر بچوں کو دینی علوم پڑھاتے اور اُن کی تربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے، اعلیٰ تعلیم پانے کے لیے، آپ اُنھیں دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارن پور بھیج دیتے۔ اُس شہر کو آپ نے کبھی چھوڑنا گوارا نہ کیا، تا آں کہ وہیں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں سپردخاک کر دیے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اُن کے مرضِ وفات نے شدّت اختیار کی، تو فرزندِ رشید مولانا مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے درخواست کی کہ وطن آجائیں؛ تاکہ وہ اور دیگر افرادِ خاندان اچھے طریقے پر اُن کی تیمارداری کر سکیں؛ لیکن اُنھوں نے یہ کہتے ہوے بات رد کر دی کہ کل قیامت کے دن اگر میرے استاذ نے مجھ سے پوچھ لیا کہ ''میں نے ایک مدرسہ تیرے حوالے کیا تھا؛ لیکن تو اسے چھوڑ کر اپنے وطن چلا گیا''، تو میں کیا جواب دوں گا؟

مولانا حامد حسن نیک و صالح، عشقِ الٰہی سے سرشار، حلال و حرام کی بہت زیادہ تمیز کرنے والے، عمل و ترکِ عمل دونوں میں رضاے الٰہی کے جویا، سامانِ دنیا کے سلسلے میں زاہد و قانع اور متاعِ آخرت کے مشتاق تھے۔ اُمورِ تعلیم و تربیت کی انجام دہی کے ساتھ، شہر کی جامع مسجد میں امامت بھی کیا کرتے تھے؛ لیکن اہلِ شہر کے شدید اِصرار کے باوجود اِس کا کوئی وظیفہ قبول نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار اُن کا شدید اِصرار ہوا، تو فرمایا: اگر آپ حضرات اِس سلسلے میں مجھ پر دباؤ ڈالنے سے باز نہیں آئیں گے، تو میں امامت سے کنارہ کش ہو جاؤں گا۔ مولانا کے صاحب زادے مولانا مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا: ابا جان! اگر آپ اپنے لیے یہ مُباح معاوضہ قبول ہی فرمالیں، تو کیا حرج ہے؟ مولانا نے فرمایا: ''میں علم تو بیچتا ہی رہا، کیا اب اپنی نمازیں بیچنے پر بھی اتر آؤں؟''

مولانا حامد حسن صاحبؒ دعوتیں کھانے پر راضی نہیں ہوتے تھے اور اگر کوئی تیار کھانا اُن کے پاس بھیج ہی دیتا، تو پڑوس میں کسی بھوکے شخص کو ہدیہ کر دیتے۔ اُنھیں کسی بھی طرح سے لوگوں سے خدمت لینا بالکل پسند نہ تھا، وہ صرف لوگوں کی ہی خدمت

کرنا پسند کرتے تھے۔ اپنے احتیاط کے سلسلے میں وہ یہاں تک پہنچے ہوے تھے کہ وضو کرتے وقت مسجد کے لوٹوں کے استعمال سے بھی پرہیز کرتے تھے اور اپنا لوٹا اِس مقصد سے ساتھ رکھتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے دادا حاجی خلیل احمد صاحبؒ بھی اِتباعِ سنت اور نبی اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کے شدید اہتمام میں مشہور و معروف تھے۔ وہ ہمیشہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (بانی دار العلوم دیو بند) کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اُن سے تربیتِ دین اور تزکیۂ قلب کی تعلیم پاتے تھے۔ حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد اُنھوں نے اپنا رشتہ حضرت العلاّم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۵ء) سے قائم کرلیا اور اُن کی صحبت اختیار کی۔ آپ نہایت رقیق القلب اور اللہ کے حضور بہت زیادہ رونے والے تھے، خلوت بہت پسند تھی، اپنے رب سے دعا و مناجات کرتے ہوے مرشدِ کبیر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (دار العلوم کی بانی جماعت اہل اللہ کے روحانی مُربّی، متوفی و مدفون مقبرۂ معلاۃ مکہ مکرمہ ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) کے پرسوز اور رقت انگیز اشعار گنگناتے تھے۔

اِسی نیک و صالح باپ اور صاحبِ ورع و تقوی دادا کے گھر مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے جنم لیا اور دونوں بزرگوں کی پسندیدہ صفات اور نیک خصوصیات اُن میں منتقل ہوئیں۔ اُنھیں صالح تربیت اور نشو و نما ملی۔ بچپن سے ہی اُنھوں نے اپنے اوقات کو قیمتی سمجھا اور اُنھیں سنبھال کر خرچ کیا، اپنے لیے فائدہ بخش کاموں میں استعمال کیا اور بے سود کاموں سے دور رکھا۔ اِنھی چیزوں کی برکت تھی کہ ذی استعداد عالم اور ژرف نگاہ فقیہ بن کر نکلے۔ آپ نے جو علوم پڑھے تھے، اُن پر آپ کی غائرانہ نظر تھی اور اُن کا پورا پورا استحضار تھا۔ اِس میں بہت کچھ دخل اُن کی صلاح و تقوی کے آمیزے سے تیار شدہ ذکاوت و ذہانت اور بارگاہِ ایزدی سے عطا کردہ محنت کا تھا۔ الثانیۃ

مفتی صاحب مرحوم کی ولادت شبِ جمعہ، مورخہ ۸ یا ۹ ر جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ/

۱۹۰۷ء کوشہر ''گنگوہ''، ضلع ''سہارن پور'' میں ہوئی۔ جب آپ کچھ باشعور ہوے، تو آپ کے والدِ ماجد نے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیو بندی اور حضرت مولانا عبدالرحیم رائپوری (۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء- ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء) سے درخواست کی کہ آپ کی بسم اللہ کرادیں اور آپ کے لیے خیر و برکت کی دعا فرمادیں۔ یہ رسم ہندوستان کے نیک اور شریف گھرانوں میں رائج رہی ہے۔

تعلیم و تربیت

مفتی صاحب مرحوم نے ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں حاصل کی، جو شہر ''گنگوہ'' کے محلّہ ''بہاء الدین'' میں مولانا حامد حسن صاحب کے گھر کے پاس، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی صاحب زادی کے مکان کی بیٹھک میں قائم تھا، استاذ ایک نابینا بزرگ حافظ کریم بخش تھے۔ مفتی صاحب مرحوم نے اُن کے پاس ہی قرآن کریم حفظ کیا، البتہ آخر قرآن سے سترہ سطریں باقی تھیں کہ حافظ کریم بخش کو اللہ کا بلاوا آگیا، اِس کے بعد مفتی صاحب نے جامع مسجد گنگوہ کے امام و مدرّس حافظ عبدالکریم صاحب کے پاس جاکر حفظِ قرآن پاک کی تکمیل کی۔

فارسی، اردو اور عربی کی مبادیات و قواعد اوّلاً مولانا فخر الدین گنگوہی (شاگرد مولانا مظہر نانوتوی متوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۶ء) سے گنگوہ میں، مولانا امتیاز حسین صاحب سے اور اپنے والدِ ماجد مولانا حامد حسن صاحب سے ''نہٹور'' میں ہی پڑھے، پھر سہارن پور چلے آئے، جہاں ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں اُنھوں نے مشہور مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور پورے سات سال وہاں مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء میں دار العلوم دیو بند میں داخلہ لیا اور یہاں کبارِ اساتذہ سے علوم شرعیہ کی تحصیل فرمائی۔ بالخصوص عالم باعمل، مجاہدِ جلیل شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے صحیح بخاری اور جامع ترمذی پڑھی، پھر اُسی سال یعنی ۱۳۵۰ھ میں دوبارہ مظاہر علوم سہارن پور

چلے گئے، جہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ بمقام مدینہ منورہ) بن حضرت مولانا محمد یحیی کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۱۵ء) سے سنن ابوداؤ داور جامع ترمذی اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن کیمل پوری رحمۃ اللہ علیہ سابق استاذ مظاہر علوم سے سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور دوسرے اساتذۂ کرام سے دوسری کتب احادیث پڑھیں۔

تدریس و افتا اور تربیت و دعوت کے میدانوں میں مفتی صاحب مرحوم کے کارہائے نمایاں

مفتی صاحب مرحوم ۱۳۵۱ھ/ ۱۹۳۲ء میں بیس روپے ماہ وار پر مظاہر علوم میں مفتی کے عہدے کے لیے متعین کیے گئے اور ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء تک مفتی اور بعد میں مُدرّس کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ آپ نے اُس وقت فقہ و تفسیر اور بلاغت کی چند کتابیں پڑھائیں۔ پھر اُسی سال یعنی ۱۳۷۳ھ کے ماہ ربیع الاوّل میں اتر پردیش کے بڑے تجارتی شہر "کانپور" کے مدرسہ "جامع العلوم" میں منتقل ہو گئے۔ اللہ پاک نے آپ کی موجودگی میں مدرسہ اور شہر میں خوب خیر و برکت عطا فرمائی۔ مدرسے میں آپ کی نسبت کے طفیل نمایاں ترقی ہوئی اور شہر "کانپور" تو آپ کی سرگرمیوں کا خاص مرکز بنا رہا۔ آپ نے "کانپور" اور قرب و جوار کے علاقوں میں بدعات و خرافات کا پوری جواں مردی سے مقابلہ کیا اور فرقِ باطلہ کے مقابلے میں اپنی پوری توانائیاں صرف کردیں؛ چناں چہ اُن سے مناظرے کیے اور خود اُن کی کمین گاہوں میں اُن کا تعاقب کیا۔ اِسی طرح مسلمانوں کے عقائد کی تصحیح اور اُنھیں کتاب و سنت کی صحیح تعلیمات سے واقف اور آگاہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونے دیا۔ آپ نے مختلف اِسلامی مضامین کی تدریس کے سلسلے میں پوری محنت صَرف کرڈالی؛ چناں چہ روزانہ ۱۴ مضامین پڑھاتے تھے، جب کہ مختلف قریبی اور دور دراز علاقوں سے مدرسے میں

بھیجے گئے سوالات کے جوابات اور اِفتا کی ذمّے داری آپ ہی کے سپرد تھی، مدرسے کے کتب خانہ، دارالاقامہ اور مطبخ کی نظامت کے فرائض بھی آپ ہی انجام دیتے تھے، ساتھ ہی آپ کو مختلف عوامی علاقوں سے بہ راہِ راست رابطہ بھی رکھنا پڑتا تھا؛ تاکہ اُن میں مدرسے کا اثر و رسوخ پھیلے اور عقائد کو بدعات و خرافات اور اوہام و خیالات سے پاک کرنے کے سلسلے میں اُس اثر و رسوخ کو استعمال کیا جائے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کانپور اور اُس کے اطراف و نواح کے علاقے، پرانے زمانے سے ہی بدعات و خرافات کا اڈّہ تھے۔ اِس سے پہلے بھی یہاں ایک عظیم مصلح، داعیِ اسلام، بدعات و خرافات اور قبر پرستی کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے والی اور عقائد کو آلودگیوں سے پاک صاف کرنے کا بیڑا اٹھانے والی شخصیّت نے اِن حالات سے نبرد آزمائی کی تھی، میری مراد مربی کبیر، مردِ جلیل حضرت علامہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کی ذاتِ گرامی سے ہے، جنھیں برِّصغیر ہند میں ''حکیم الأمّت'' کے لقب سے جانا جاتا ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ لقب اُن کی مُصلحانہ شخصیّت کے بالکل عین مطابق ہے۔ حضرت تھانویؒ ''کانپور'' میں ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء سے ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء تک مسلسل تقریباً ۱۴سال رہے اور بہ یک وقت ایک بے مثال مُعلّم، بے نظیر داعی اور عظیم مصلح کے فرائض انجام دیے اور برابر غیر اِسلامی رسوم و رواج سے پوری قوت کے ساتھ نبرد آزما اور کتاب و سنت کی گہری تعلیمات سے ماخوذ عقائدِ صحیحہ کی نشر و اِشاعت کے لیے ہر طرح سرگرمِ عمل رہے۔

اُن کے بعد مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ یہاں فروکش ہوئے اور ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء سے ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء تک تقریباً ۱۵سال اُن کا قیام رہا۔ اِس دوران حضرت مفتی صاحب مرحوم نے مسلسل اُسی مُہم کو انجام دیا، جس کا بیڑا اُن کے سلفِ عظیم حضرت تھانویؒ اٹھا چکے تھے۔ اُن دونوں حضرات کی انتھک جدوجہد اور کوششوں سے ''کانپور'' اور اُس کے اطراف کے گاؤں میں بڑی حد تک کتاب و سنت کی روشنیاں پھیل گئیں اور بدعات و خرافات کی

۱۲

طاقتیں کم زور پڑ گئیں، جب کہ اُن مبارک مساعی سے پہلے یہ طاقتیں اِن علاقوں میں کھلے بندوں چوکڑیاں بھرتی اور دندناتی پھرتی تھیں۔

دار العلوم دیو بند میں آپ کے کارنامے

سابق صدر شعبۂ اِفتادار العلوم دیو بند مولانا مفتی مہدی حسن شاہ جہاں پوریؒ (متوفی ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۴۷ء سے ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء تک کے عرصے میں دار العلوم دیو بند کے صدر مفتی رہے؛ لیکن جب سن رسیدہ ہوگئے اور مرض نے شدت اختیار کرلی، تو دار العلوم نے پوری جِدّ و جہد کے ساتھ اُن کے قائم مقام کی تلاش شروع کردی، بالآخر نظرِ انتخاب حضرت مولانا مفتی محمود حسنؒ پر پڑی۔ چناں چہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۰۳ھ ۱۹۸۳ء) سابق مہتمم دار العلوم دیو بند اور مجاہدِ جلیل شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث دار العلود یو بند کے فرزند اکبر مولانا سید اسعد صاحب مدنی حال ممبر مجلس شوریٰ دار العلوم دیو بند(۱) نے آپ سے اِصرار کیا اور خود آپ کے بزرگ اور محترم استاذ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ نے بھی حکم فرمایا کہ وہ دار العلوم میں صدر مفتی کا عہدہ قبول کرلیں۔ دراصل حضرت مفتی صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ مدرسہ جامع العلوم ''کانپور'' میں ہی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں؛ کیوں کہ آپ نے وہاں رہ کر کتاب وسنت کے علوم اور دین و دعوت کی خدمت کے لیے، اپنی تمام تر جدوجہد اور توانائیاں صرف کی تھیں اور اِس طویل عرصے کے بعد اپنی اَنتھک مساعی کو بار آور بنانے کے لیے زمین کو ہموار کیا تھا؛ لیکن اِن اکابر علما کے حُکموں کے سامنے اُنھیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور اُنھوں نے ۲۶/ جمادی الاولی ۱۳۸۵ھ/ ۲۳/ ستمبر ۱۹۶۵ء کو شعبۂ اِفتادار العلوم دیو بند میں اپنی ذمہ داری سنبھالی۔ دار العلوم نے آپ کو صدر مفتی کی حیثیت سے بلایا تھا؛ لیکن آپ نے فرطِ تواضع سے یہ قانونی

(۱) بہ وقتِ ترتیبِ ایں مضمون برائے اشاعت بہ شکل کتاب متوفی بہ روز دوشنبہ: ۷/محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۶/فروری ۲۰۰۶ء۔

منصبِ صدارت اپنے رفیقِ کار حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب دامت برکاتہم (۱) کے سپرد کر دیا اور خود شعبے میں ایک فرد کی حیثیت سے کام کرنے پر ہی رضامند ہو سکے۔

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء) سابق صدر المدرسین وشیخ الحدیث دار العلوم دیوبند جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچے اور اُس عمر کی کمزوریاں اور عوارض اُنھیں زیادہ محسوس ہوئے، تو اُنھوں نے مفتی محمود حسن صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ میری جگہ بخاری شریف کی جلدِ ثانی پڑھائیں۔ شروع میں مفتی صاحب مرحوم نے یہ درخواست یہ سمجھتے ہوئے قبول نہیں فرمائی کہ وہ اِس کے اہل نہیں ہیں؛ لیکن جب مولانا فخر الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ کا اِصرار ہوا، تو آپ نے ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں یہ عظیم ذمہ داری بھی انجام دینی شروع کر دی۔ جس سال حضرت مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا، آپ نے صحیح بخاری کی دونوں جلدوں کا درس دیا۔ جو لوگ حضرت شیخ الہندؒ اور محدثِ کبیر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (متوفی ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء) جیسے یگانۂ روزگار اساتذۂ حدیث کے مایۂ ناز شاگرد حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی کی علمِ حدیث میں مہارت، علومِ شرعیہ میں ژرف نگاہی اور عقلی ونقلی علوم کے وسیع مطالعہ کا حال جانتے ہیں، وہ حضرت مولانا کی جگہ، أصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری کی تدریس کے لیے کسی کے اِقدام کی نزاکت کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں؛ لیکن مفتی صاحب مرحوم کو کسی نزاکتِ حال کا سامنا نہیں ہوا، اور اُن کے اَسباق طلبۂ دورۂ حدیث کی اِتنی بڑی تعداد کے لیے جامع اور تسلّی بخش رہے، جس کا سبب علوم شرعیہ کا وسیع مطالعہ، اُن پر کامل دست گاہ اور اُن کی وہ ذہانت وذکاوت تھی، جس کا رشتہ صلاح وتقوی اور سیرت نبی ﷺ سے مستفاد اَخلاقِ حسنہ سے جُڑا ہوا تھا۔

لیکن مفتی صاحب مرحوم نے حضرت مولانا فخر الدین احمد مراد آبادی کی وفات کے

---

(۱) بہ وقتِ اِشاعتِ این مضمون بہ شکل کتاب ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ۔ وفات: شب شنبہ و یک شنبہ: ۲۰-۲۱/ ذی قعدہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۶-۲۷/ فروری ۲۰۰۰ء۔

بعد ذمہ داروں کے سامنے اس خدمت کی مسلسل انجام دہی سے معذرت ظاہر فرمادی، اُنھوں نے اُن کے سامنے واضح فرمادیا وہ صرف مولانا فخرالدین صاحبؒ کی شدید خواہش پر اور اُن کی سن رسیدگی اور ضعف کا لحاظ کرتے ہوئے آج تک یہ ذمہ داری نبھاتے رہے ہیں۔ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ میں دارالعلوم کی نئی انتظامیہ کی بہ حالی کے بعد بھی آپ نے ذمہ داروں کے اِصرار پر کبھی کبھی بعض کتبِ حدیث بالخصوص سننِ نسائی کا درس دیا۔

دارالعلوم میں رہائش

مفتی صاحب مرحوم اپنی ذمہ داری سنبھالنے لیے جب دارالعلوم تشریف لائے، تو شروع میں مہمان خانۂ دارالعلوم میں فروکش ہوے، پھر وہاں سے دارالعلوم کی مسجدِ قدیم کے ایک کمرے میں آ گئے یہ کمرہ مسجد کے اُس دروازے سے متصل ہے، جو سڑک پر کھلتا ہے اور مہمان خانے کے دروازے کے عین مقابل میں واقع ہے۔ اِس سے پہلے حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) جو "شیخ الادب والفقہ" کے لقب سے جانے جاتے ہیں کا بھی اِسی کمرے میں قیام رہا ہے۔ اخیر میں حضرت مفتی صاحب مرحوم ۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۹۱ھ مطابق ۱۷ر فروری ۱۹۷۱ء کو یہاں سے منتقل ہوکر مسجدِ چھتّہ کے شمالی جانب کے کمرے میں آ گئے۔ یہ وہی کمرہ ہے، جس میں دارالعلوم دیوبند کے بانی حُجّۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ اپنی دیوبند میں آمد اور اِقامت کے وقت ہمیشہ قیام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمانے میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خواہش ورغبت کارفرما تھی۔ حضرت مفتی صاحب وفات تک مسلسل اِسی کمرے میں قیام پذیر رہے۔

علمی کارنامے

مفتی صاحب مرحوم کی مشغولیّات بے پناہ تھیں، تدریس، اِفتا، دعوت وتبلیغ اور

اِصلاح واِرشاد کی مسلسل مصروفیّت کے ساتھ ساتھ تخریب کُن فرقوں سے مقابلہ آرائی اور فساد انگیز جماعتوں سے نبرد آزمائی کی پیہم سرگرمیاں بھی رہا کرتی تھیں، اِن متنوع اعمال ومصروفیات نے موقع ہی نہیں دیا کہ مفتی صاحب مرحوم بہ قلم خود کوئی کتاب لکھیں؛ البتہ آپ کے اہلِ مجلس، مستفیدین اور تربیت پانے والوں میں جو ذی استعداد علما تھے، اُنھوں نے آپ کے نتائجِ افکار، خلاصۂ تحقیقات، اور ساتھ ہی آپ کے فتاویٰ، رسائل وخطوط اور ملفوظات کی تدوین وترتیب کا گراں بہا کام انجام دیا اور اُن کی نشر واِشاعت کا اہتمام کیا۔ اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

● فتاویٰ بڑی تقطیع پر ۱۸ جلدوں میں ہیں، تمام جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۷۱۱۳ سات ہزار سات سو تیرہ ہیں۔ یہ فتاویٰ بہت بڑا علمی سرچشمہ اور گراں قیمت سرمایہ شمار کیے جاتے ہیں۔ علما ومُفتیانِ کرام اور فقہا ومحدثین کو اِس ذخیرے سے اُس وقت بڑی مدد ملتی ہے، جب اُن پر مسائل وقضایا اور استفتا کی یورش ہوتی ہے، یا وہ علمی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فتاویٰ برِّ صغیر ہند میں بہت زیادہ متداول ہیں۔

● اس کے بعد دوسری اہم اور خاصے کی چیز اُن کی مجالس کی گفتگو کا مجموعہ ہے، جسے ''ملفوظاتِ فقیہِ الامت'' کے نام سے مُرتَّب کیا گیا ہے، اسے متوسط تقطیع پر دس جلدوں میں منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ اِس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۱۸۴ (گیارہ سو چوراسی) ہے۔ اِس مجموعے میں آپ علمی نکتے، معاشرتی مسائل، فکری نوادِرات، دعوتی اَفکار، صالح تربیت کے اُصول، شعور آفرینی کے مناہج واسالیب، اِصلاح واِرشاد کے طریقے، دعوتی خیالات، باطل مذاہب کے بانیوں اور اہلِ بدعت وہوا پرستوں پر ٹھوس اعتراضات اور بہت سے اِسلامی فرقوں اور جماعتوں کے ہاں پائی جانے والی فکری غلطیوں کی طرف ظریفانہ اِشارے اور ان کے دل چسپ محاسبے: یہ سب کچھ بھرپور مقدار میں پائیں گے۔

● تیسری اہم اور یادگار چیز اُن رسائل وخطوط کا مجموعہ ہے، جو اُنھوں نے اپنے

مُخلصین ومُحبّین اور حصولِ تربیت کا رشتہ رکھنے والوں کے نام لکھے ہیں، اُن میں علماے کرام، تعلیم یافتہ حضرات اور مختلف عوامی طبقات کے لوگ شامل ہیں۔ اِس مجموعے کا نام ''مکتوبات فقیہ الامت'' ہے، یہ چھوٹی تقطیع پر تین جلدوں میں ہے، جن کے مجموعی صفحات ۵۸۴ (پانچ سو چوراسی) ہیں۔ اِن رسائل کا بڑا حصہ دعوتی اور اِصلاحی امور پر مشتمل ہے، جن سے قاری کا نفس سنورتا اور اُس کے دل میں رقّت پیدا ہوتی ہے اور اُن کے پڑھنے سے آخرت کی یاد اور عقبیٰ کی فکر اُس کے دل میں جگہ پاتی ہے۔ یہ خطوط، اِس فانی دنیا اور اِس کی ڈھلتی چھاؤں پر مر مٹنے سے زیادہ اپنی عاقبت پر توجہ دینے پر ابھارتے ہیں۔

● اِس کے بعد حضرت مفتی صاحب مرحوم کے مواعظ وخطبات کا مجموعہ بڑا مفید اور گراں قدر سرمایہ ہے، جسے متوسط تقطیع پر ۹ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۱۲۸ (گیارہ سو اٹھائیس) ہے۔ یہ مجموعہ بھی مفتی صاحب مرحوم کے دعوتی رجحانات کا غمّاز ہے اور اُن کی اِصلاحی سرگرمیوں کا نمایندہ ہے، جن میں ایک داعی کی بے قراری وبے چینی ہے، عالمِ باعمل کے خیالات واَفکار کا نور ہے اور عشقِ الٰہی سے سرشار اور ذوقِ نیم شبی سے سرمست عبادت گزار بندے کے تجربات ومشاہدات کی تجلّی ہے، چناں چہ یہ مواعظ بہت فائدہ مند، نہایت اثر انگیز اور دلوں میں فوراً اتر جانے والے ہیں، ان کا مطالعہ ہر ایسے مسلمان کے لیے نفع بخش ہے، جو دنیا کی بہ جاے اپنے دین کی بگڑی بنانا چاہتا ہے اور فانی زندگی کو چھوڑ کر حیاتِ جاوداں کی بہتری اور وہاں کی سرخ روئی کا خواہاں ہے۔

اِسی طرح مختلف کتابوں میں، مختلف عنوانوں کے تحت، آپ کے مزید علمی ودعوتی اِفادات جمع کیے گئے ہیں، جن میں سے اہم کتابوں کے نام ذیل میں درج ہیں:

۱- مسلکِ علماے دیوبند اور محبّتِ رسول ۲- مراحل علم وعلم نافع ۳- جواہرِ علمیہ ۴- یومی معمولات واَوراد ۵- اسبابِ لعنت کی چہل حدیث ۶- اسبابِ غضب اور چہل حدیث ۷- حدودِ اختلاف ۸- آسان فرائض ۹- ارمغانِ اہلِ دل ۱۰- جنوبی افریقہ میں

حضرت مفتی صاحب مرحوم کی دعوتی خدمات (۲ جلدیں) ۱۱- سرکاری سودی قرضے ۱۲- رفعِ یدین ۱۳- حقیقتِ حج ۱۴- وصفِ شیخ (اپنے اُستاذ اور مربی شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ کے سلسلے میں مفتی صاحبؒ کے تاثرات) ۱۵- شوریٰ واہتمام ۱۶- مجموعہ اشعار مفتی صاحب مرحوم ۱۷- اسبابِ مصائب اور اُن علاج۔

اِس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں ہیں جو ابھی زیرِ ترتیب ہیں، یہ سبھی کتابیں اردو زبان میں ہیں اور مفتی صاحب مرحوم کی خصوصیات کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں عمیق علم، وسعتِ مطالعہ، سلامتِ فہم، استقامتِ فکر، اعتدالِ نظر، فیصلے میں توازن اور کسی نتیجے تک پہنچنے میں غور وفکر، یہ تمام اوصاف، صاف صاف جھلکتے ہیں۔ ساتھ ہی اخلاص واِحتساب اور بندوں کی اِصلاح وتربیت کی روح اُن علمی اِفادات کے لفظ لفظ میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اَدبی وشاعرانہ ذوق

مفتی صاحبؒ اپنی باوقار علمی ودینی وتربیتی شخصیت کے ساتھ، خوش فکر شاعر بھی تھے، اُنھوں نے یہ فن کسی اُستاذ سے نہیں؛ بل کہ اپنی فطری صلاحیت اور موزوں طبیعت سے حاصل کیا تھا، وہ اکثر برجستہ شعر کہتے، جس میں زبان کی صفائی وسلاست کے ساتھ، علم وفکر کے آب دار موتی لفظ لفظ سے دَمکتے ہوئے محسوس ہوتے۔ حمد ونعت، دینی حقائق، سلوک ومعرفت اور اِصلاح وتربیت کے مختلف الجہات موضوعات پر آپ نے جو اَشعار وقتاً فوقتاً کہے ہیں، اُن سے آپ کا مکمل دیوان تشکیل پا کر زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

علمی، اِصلاحی اور دعوتی اسفار

مفتی صاحب مرحوم نے مختلف اِسلامی ممالک کے دورے اور اسفار کیے اور اُن میں آپ کا طویل ومختصر ومطابقِ پروگرام قیام رہا، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی، حج وعمرہ کے

اَسفار کے موقع سے بارہا زیارت کی۔ اپنے مخلصین اور معتقدین کی دعوت پر پاکستان اور بنگلہ دیش بارہا جانا ہوا اور بسا اوقات اُن کی خواہش پر وہاں طویل قیام کیا اور رمضان المبارک کے مہینے گزارے، اِسی طرح افریقہ بھی آپ کی خاص بیرونی اِقامت گاہ تھا، یہاں دعوتی، اِصلاحی اور تربیتی اُمور کی انجام دہی کے لیے کتنے ہی مرتبہ لمبی مدتوں تک قیام رہا، جن ممالک کے آپ نے اسفار کیے، اُن میں برطانیہ، امریکہ، کناڈا، ری یونین، زامباوے، زمبیا، موریشش اور وہ دوسرے ممالک ہیں، جہاں ہندوپاک کے مسلمان بستے ہیں۔ وہاں بہت سے آپ کے دست گرفتہ اور آپ سے دینی اِصلاحی تربیت کے لیے تعلق رکھنے والے رہتے ہیں، اللہ نے اُنھیں آپ کے وجود سے نفع پہنچایا اور دیگر علما و مشائخِ دیو بند کی کوششوں اور مفتی صاحب مرحوم کی مبارک جدوجہد کے طفیل اُن ممالک میں عظیم دینی کام یابیاں سامنے آئیں اور کئی تعلیمی و تربیتی اِدارے قائم ہوئے، جو مسلم نسل کی تعلیم اور اُصولِ دین کے مطابق تربیت کے سلسلے میں مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں اور اُسے اُن اسلحوں سے مسلح کر رہے ہیں، جن سے وہ خدا بے زار مادّیت کی لہر کو روک سکے اور مغربی ممالک میں، جنھوں نے ہدایتِ ربّانی سے منھ موڑ کر سائنس کے دعاوی پر آمنّا وصدّقنا کہا؛ ٹھاٹھیں مارتی ہوئی تہذیبی برائیوں کے طوفان میں اپنے اور دوسروں کے دین وایمان کو محفوظ رکھ سکے۔

نسب اور گھریلو و علمی و دینی حالات

مفتی صاحب مرحوم کا نسب صحابی رسول ﷺ سیدنا ابوایُّوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے، جنھوں نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی پہلی بار مدینہ تشریف آوری پر ضیافت کا شرف حاصل کیا۔ مفتی صاحب مرحوم کا نسب حسب ذیل ہے:

(حضرت مولانا مفتی) محمود حسن بن مولانا حامد حسن بن الحاج قاضی خلیل احمد بن ولی محمد بن قلندر بخش بن محمد اعلی بن غلام رسول بن عبدالحمید بن قاضی محمد فاضل بن قاضی

جمیل احمد بن قاضی خلیل محمد بن قاضی ولی محمد بن قاضی محمد کبیر بن قاضی امّن بن خواجہ فرید بن خواجہ شاہ بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاء الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ نجم الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ بدا بن خواجہ عبد الحمید بن خواجہ کبیر بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ اِسماعیل بن خواجہ شیخ الاسلام عبد اللہ ہروی بن خواجہ ابو منصور محمد بلخی بن جعفر بن ابو معاذ بن محمد بن احمد بن علی بن جعفر بن ابو منصور مت (صامت؟) انصاری ہروی تابعی بن ابو ایوب خالد خزرجی انصاری رضی اللہ عنہ صحابی رسول ﷺ۔ see p 299

اِس نسب کا شجرہ ہندوستان کے بہت سے ایسے شریف علمی گھرانوں میں موجود ہے، جن کا نسب حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے؛ لیکن اِس میں اختلال وانقطاع کا قوی احتمال ہے اور اہلِ علم بھی اِس کے بارے میں مختلف رائیں رکھتے ہیں، خصوصاً حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد واَحفاد اور پھر اُن کی اولاد واَحفاد سے متعلق فوقانی فہرست میں؛ لیکن اِس کے باوجود یہ بات محقَّق ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نسب اُسی طرح عظیم صحابیِ رسول سے جا ملتا ہے، جس طرح مربّیِ جلیل، فقیہِ نبیل اور محدثِ بے مثیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور علماے فرنگی محل لکھنؤ اور دوسرے علما ومشائخِ کرام کا نسب اُن تک پہنچتا ہے۔

آپ کے والدِ ماجد مولانا حامد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فاضلِ دار العلوم دیوبند کے تین بھائی تھے:

محمد یامین، منشی سعید احمد اور قاضی یٰسین۔

مفتی صاحب مرحوم کے والدِ ماجد مولانا حامد حسن صاحب نے آپ کا نکاح، آپ کے چچا قاضی یٰسین کی صاحب زادی سے کیا، جن سے دو لڑکے ہوئے، پہلے عبد الرحمٰن، جو مردہ پیدا ہوئے اور دوسرے عبد الرحیم، جن کی بچپن ہی میں وفات ہوگئی؛

اور دو لڑکیاں، پہلی محترمہ شمیمہ، جن کا نکاح جناب حاجی محمد شفیع علوی سے ہوا، یہ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر، اتر پردیش کے ہیں اور اُن کا نسب ولیِ کامل میاں جی نور محمد جھنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۶ء - ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء) سے ملتا ہے، جو دار العلوم کی بانی جماعت کے پیر و مُرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء-۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء) کے مُرشد و مربّی تھے۔ اُن سے تین لڑکے ہوے، جناب نیّر، قیصر اور پرویز، اور تین لڑکیاں۔ نسرین، یاسمین اور تسنیم۔ حضرت مرحوم کی دوسری صاحب زادی محترمہ شاکرہ ہیں، جن کا اپاہج ہونے کی بنا پر نکاح نہیں ہوا؛ لیکن وہ ہنسی خوشی، خدا کا شکر ادا کرتے ہوے اور ثواب کی امید رکھتے ہوے گزر بسر کر رہی ہیں اور اپنی زندگی کے تمام اوقات کو عبادت و تلاوت اور ذکر اللہ سے آباد رکھتی ہیں۔ اُن کا قیام اپنی خالہ کے ساتھ، جو اُن کی والدہ سے چھوٹی ہیں، محلّہ ''بہاء الدین'' گنگوہ میں اپنے والدِ محترم کے مکان میں ہے۔ اللہ پاک مشکلاتِ زندگی کو انگیز کرنے میں اُن کی مدد فرمائے۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کی والدۂ محترمہ ''کلثوم'' قاضی سعید حسن گنگوہی کی صاحب زادی تھیں، نہایت ہی صالحہ اور نمازِ تہجد کی پابند، حضرت مفتی صاحب مرحوم ابھی ساڑھے چار سال کے ہی تھے کہ والدۂ محترمہ کو اللہ کا بلاوا آ گیا۔ آپ کی والدۂ محترمہ کے کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ والدۂ محترمہ حالتِ ولادت میں تھیں کہ ایک لڑکی تولد ہوئی؛ لیکن دونوں ہی اُسی وقت اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

والدِ ماجد نے آپ کی والدۂ محترمہ کے انتقال کے بعد دو شادیاں کیں، بعد کی دو بیویوں میں سے ایک کا نام بھی ''کلثوم'' تھا، اِن سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں، لڑکا اور ایک لڑکی سالوں پہلے ہی اِنتقال کر گئے، دوسری لڑکی، جس کا نام حسینہ تھا، مکہ مکرمہ میں تھیں، اُن کی وفات ۱۴۱۵ھ میں ہوئی، اُن کے پانچ لڑکیاں تھیں، جن میں ایک مکہ مکرمہ، دوسری مدینہ منورہ اور بقیہ تینوں پاکستان میں مقیم ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم کی تیسری والدہ کا نام ''خورشید'' تھا، ان سے ایک لڑکا تولّد ہوا، جن کا نام ''احمد'' تھا۔

مفتی صاحب مرحوم کی ایک پھوپھی بھی تھیں، جن کا نام حلیمہ تھا۔ اُن کے شوہر محلّہ "بہاء الدین" گنگوہ کے ہی رہنے والے تھے۔ اِس محلّے میں بہت پرانے زمانے سے اُن کے آباو اَجداد بستے آرہے تھے۔ اِن پھوپھی محترمہ کے ایک لڑکا تھا، جن کا نام "الطاف الرشید" تھا۔ یہ انتقال مکانی کرکے پاکستان چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔

اگر انسان اپنے کردار و عمل میں پستہ قد ہو، تو صرف نسب اُسے رفعت و اقبال نہیں بخش سکتا۔

خداے پاک کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (احزاب:۱۳)

ترجمہ: تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مُعَزَّز، تم میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے ہیں۔

مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے ہی خوش بخت تھے کہ اُنھیں نسبِ عالی کے ساتھ عملِ صالح، اور علومِ شرعیہ میں کامل دست گاہ کے ساتھ دلِ دردمند اور قلبِ ارجمند عطا ہوا۔ ہزاروں خلقت میں آپ کو محبوبیّت و مقبولیّت ملی، بندوں کی یہ محبت بتاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک بھی آپ محبوب تھے؛ اِس لیے کہ خداے پاک ہی سب سے پہلے کسی بندے سے محبت کرتا ہے اور پھر اُس کی محبت اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے اور وہ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

صحت و تن دُرستی

مفتی صاحب مرحوم کی بچپن سے صحت اچھی تھی؛ البتہ وقفے وقفے سے اُنھیں دورانِ سر لاحق ہوتا رہتا تھا؛ چناں چہ صغرِ سنی ہی کا واقعہ ہے کہ آپ کے حفظِ کلام پاک کے استاذ حافظ عبدالکریم صاحب امام جامع مسجد گنگوہ، جن کے پاس آپ نے قرآن کریم کے حفظ و دور کی تکمیل کی، آپ سے بہ حالتِ قیام قرآن کریم کا ایک متعینہ حصہ سنتے تھے، تو آپ کبھی کبھی دورانِ سر کے لاحق ہوجانے کی بنا پر گر پڑتے تھے۔

لیکن جب نگاہ کم زور پڑ گئی اور ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء میں کلکتہ میں آنکھوں کا آپریشن ہوا، پھر دوبارہ لندن میں داہنی آنکھ کا آپریشن ہوا، جس کی بینائی بعد میں جاتی رہی اور اب آپ صرف بائیں آنکھ سے ہی کچھ دیکھ سکتے تھے، اس کے بعد مختلف جسمانی عوارض سے دوچار رہنے لگے۔ ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء میں آپ کے دل کا آپریشن ہوا اور دل کی حرکتوں کو کنٹرول کرنے کے لیے مشین لگادی گئی؛ تاکہ دل، مطلوبہ شکل میں صحیح صحیح کام کرے۔ ایک بار آپ کو کھانسی ہوگئی اور مہینوں ختم نہیں ہوئی۔ آپ نے خادم مولانا محمد ابراہیم صاحب افریقی سے کہا: لگتا ہے کہ اِسی کھانسی میں میری زندگی تمام ہوجائے گی؛ لیکن آپ کے معالجِ خاص اِسی دوران ہندوستان آئے اور آپ کا علاج کیا، جس سے یہ مرض بڑی حد تک ختم ہوگیا، اِس کے بعد پہلے کی طرح یہ تکلیف بھی باقی نہیں رہی۔

کئی سالوں سے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ کھڑے ہوکر ادا فرماتے تھے کہ ایک بار اچانک دورانِ سر لاحق ہوگیا اور گر پڑے، جس سے ران سے اوپر کی ہڈی میں کچھ شکن آگئی اور اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ گئی۔ اکسرے کرنے کے بعد آپ کو دہلی لے جاکر ڈاکٹروں کو دکھایا گیا اور علاج ہونے لگا؛ لیکن جب تھوڑے دنوں کے بعد ڈاکٹر عبدالحی امریکہ سے آئے، تو اُنھوں نے دوبارہ اکسرے کرانے کا مشورہ دیا۔ اکسرے کے بعد معلوم ہوا کہ آج تک جو علاج ہوتا رہا، اُس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں نے متّفقہ طور پر دوسرے آپریشن کی رائے دی۔ الحمدللہ کہ یہ دوسرا آپریشن کام یاب رہا اور بڑی حد تک آپ کی صحت بہ حال ہوگئی۔

ایک عرصے کے بعد آپ کے خادمِ خاص مولانا محمد ابراہیم افریقی، طبی معاینے کے لیے آپ کو دہلی لے گئے، دہلی میں نظامِ ہضم میں اختلال در آیا اور ڈاکٹروں کے لیے اِس کی تہ تک پہنچنا بڑا مشکل ہوگیا، چناں چہ دہلی کے ایک ہسپتال میں داخل کیے گئے اور ہفتوں علاج جاری رہا۔ اِس مرض کا آپ کے حافظے پر بڑا اثر پڑا اور اکثر اَوقات آپ پر بے ہوشی طاری رہنے لگی۔ دیوبند واپسی کے بعد بھی یہ صورتِ حال ختم نہیں ہوئی؛ لیکن

اِس حالت میں بھی اگر اِفاقہ ہوتا، تو آپ لوگوں کے سوالات اور سلاموں کا جواب صحیح طور پر دیتے تھے، حتی کہ الفاظ کی صحتِ ادائگی اور اُن کی ترتیب بھی نہیں بدلتی تھی اور جب بے ہوشی اور غفلت ہوتی، تو ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔

اِس مرض کے بعد بینائی بالکل ختم ہوگئی، حضرت مرحوم کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کوئی چیز ہے؛ لیکن اُسے واضح اور متعین شکل میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی طرح قوتِ سماعت بھی متأثر ہوگئی تھی اور اخیر عمر میں تو صحیح طور پر کام بھی نہیں کرسکتی تھی۔

وفات حسرت آیات

حضرت مرحوم نے اپنے محبین کی دعوت پر ۲۰/اپریل ۱۹۹۶ء مطابق یکم ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ کو دہلی سے "جوہانس برگ" جنوبی افریقہ کا سفر کیا اور اپنے خادمِ خاص جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب افریقی (۱) کے پرانے مکان میں قیام پذیر ہوے۔ یہاں حضرت مرحوم برابر صحت یاب ہوتے رہے اور اپنے مصاحبین اور مستفیدین کے ساتھ دیر تک بیٹھنے بھی لگے۔ آپ اُنھیں علمی معلومات، دعوتی نصائح اور اِصلاحی مواعظ سے فیض یاب فرماتے، ساتھ ہی عبادتوں میں پہلے کی طرح ہی مجاہدہ فرماتے۔ آپ نے یہاں کئی علمی اور تبلیغی دورے کیے، جن کے دوران وہاں کے مدارسِ اِسلامیہ کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں، اجتماعات میں تقریریں کیں، لوگوں کے پاس بیٹھے اور علماے کرام اور دعوت و اِصلاح کے میدان میں کام کرنے والے افراد سے ملے۔

لیکن حضرت مرحوم کو اِس سے پہلے سے ہی گردے میں تکلیف کی شکایت تھی۔ در اصل گردے اور مثانے کی درمیانی نالی میں غدود پیدا ہوگیا تھا اور اخیر میں بڑھ کر مثانے

---

(۱) آپ کے یہ خادم خاص سفر وحضر، ہندو بیرونِ ہند، دیو بند اور ہندوستان کے دیگر شہروں کے اَسفار میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے اللہ اُنھیں اِس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے، وہ اِس وقت آپ کے اجلّ خلفا میں ہیں؛ بل کہ اُن کے درمیان اُنھیں اَرفع مقام حاصل ہے۔

تک پھیل گیا تھا۔ آپ کے دونوں معالجِ خاص: ڈاکٹر عبدالحی بلبلیا امریکی اور ڈاکٹر محمد لہر نے ڈاکٹر محمد خان کی شرکت وتعاون سے غدود کا کام یاب آپریشن کیا، پھر ہر ہفتے نالی کی صفائی کی جاتی رہی۔ آخری عملِ صفائی سے پہلے ہی خدّام نے ''ڈربن'' کا سفر ترتیب دے دیا، اِس سفر کے بعد کے متعلق طے تھا کہ آپ ''ہرارے'' جائیں گے، جہاں آپ اپنی نواسی سے اور ''ہرارے'' کے مدارس کے علما و دُعاۃ سے ملنا چاہتے تھے اور پھر ''ملاوی'' کے مدارس اور ''چپاٹا'' میں مولانا عبدالرحیم متّالی کے مدرسے میں تشریف لے جانا تھا، اُس کے بعد ''فرانس'' کے ایک جزیرے ''ری یونین'' میں مسجد مولانا بدر عالم کا افتتاح فرمانا تھا، اِن سب مشاغل کے بعد ہندوستان آتے ہوئے حرمین شریفین کی زیارت اور عمرے کی ادائیگی، اور مسجد نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرنے کا پروگرام تھا اور ماہ ستمبر ۱۹۹۶ء میں ہندوستان واپسی کا ارادہ تھا۔

لیکن سفرِ ''ڈربن'' کے دوران ہی کھانسی لاحق ہوگئی اور وہاں سے ''جوہانس برگ'' لوٹتے ہوئے شدت اختیار کرگئی، ڈاکٹر محمد لہر مسلسل آپ کے علاج میں مشغول رہے۔ ''ڈربن'' سے واپسی کے بعد حضرت مرحوم اپنے خادم خاص مولانا محمد ابراہیم صاحب کے بھائی صاحب کے نئے مکان میں مقیم ہوئے۔ فالج کے حملے کی وجہ سے جو چیز بھی آپ کھاتے یا پیتے، سانس کی نالی کے ذریعے پھیپھڑے کی طرف آجاتی تھی۔ معالجین اُسے آلات سے صاف کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس دوران کبھی آپ کی حالت اچھی ہو جاتی اور کبھی بیماری بہت زیادہ بڑھ جاتی۔ ۲۷-۲۸ر اگست ۱۹۹۶ء کی درمیانی شب میں مرض بہت زیادہ شِدّت اختیار کر گیا؛ اِس لیے آپ ''جوہانس برگ'' کے پارک لین کلینک کے ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کیے گئے، آپ کے معالجِ خاص ڈاکٹر عبدالحی بلبلیا بھی آگئے۔ فالج کی وجہ سے غذا کا معدے تک پہنچنا ممکن نہیں رہا تھا، ڈاکٹروں نے غذا پہنچانے کی ایک نالی بہ راہِ راست معدے سے جوڑ دینا مناسب سمجھا، چناں چہ اُنھیں محسوس ہوا کہ صحت اچھی ہو رہی ہے؛ لیکن ۲ر ستمبر ۱۹۹۶ء کی شام کو اچانک

صحت میں نہایت اضمحلال اور شدید ضعف در آیا اور آپ کی روح جوارِ رحمت میں چلی گئی۔ اس وقت (جنوبی افریقہ کے وقت سے ۲-۳ ستمبر ۱۹۹۶ء: دوشنبہ اور سہ شنبہ کی درمیانی شب کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ إنالله وإنا إليه راجعون۔

ہزاروں محبّین آپ کو کاندھوں پر ہسپتال سے لائے اور "نیوٹاؤن" کے مدرسے میں آپ کو غسل دینے کے بعد تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے۔ رات بارہ بجے کے قریب آپ کی نعشِ مبارک مولانا محمد ابراہیم کے گھر میں رکھی گئی۔ اِس دوران بے شمار علمائے کرام، مخلصین و محبّین اور مدارسِ افریقہ کے ذمہ دار حضرات آتے رہے؛ تاکہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شرکت کریں اور کاندھا دے کر آخری قیام گام تک پہنچا سکیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہم علمائے دیوبند، جن کا شیوہ توفیقِ خداوندی سے، شریعت اسلامی اور سنتِ نبوی کی کامل پیروی ہے، جنازوں کو آخری مستقر تک پہنچا آنے میں جلدی کرتے ہیں؛ لیکن حضرت مولانا مفتی محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین کے سلسلے میں قانونی عذر کی بنا پر تھوڑی تاخیر ہوگئی۔ افریقی قانون کی رو سے سرکاری کارروائیوں کی تکمیل کے بغیر راتوں کو قبر کھودنے کی اِجازت نہیں ہے، اِس لیے لوگ منتظر رہے، جب سرکاری دفاتر کھلنے کا وقت ہوا، تو اُن کے لیے ضروری کارروائیوں سے نمٹنا ممکن ہوا۔ نہایت تیزی کے ساتھ اِن سب اُمور سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے ساڑھے نو بجے دن میں (افریقی وقت سے) مولانا محمد ابراہیم صاحب کے گھر سے جنازہ اٹھایا، جو لوگ جنازے کے ساتھ تھے، اُن کی گاڑیوں کی لائن گھر سے مقبرے تک لگی ہوئی تھی، جب کہ مقبرہ تقریباً ۵ کیلومیٹر کی مسافت پر واقع تھا۔ آپ کی نمازِ جنازہ میں شریک افراد کی تعداد کا اندازہ پندرہ ہزار کے قریب ہے۔ نمازِ جنازہ کی امامت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب بنارسی رکنِ مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے فرمائی۔ مولانا، حضرت مفتی صاحب مرحوم کی عیادت کے

لیے افریقہ تشریف لے گئے تھے۔ ساڑھے دس بجے دن میں (افریقی وقت سے) ''ایلز برگ'' کے قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔ رحمہ اللہ رحمةً واسعةً۔

انسانیت وعبودیت کا پیکر

شروع زندگی سے ہی مفتی صاحب مرحوم کا کھانا پینا اور رہنا سہنا بہت ہی سادہ اور معمولی تھا، حتی کہ صرف دو پہر یا رات کا کھانا کھاتے تھے، دونوں ایک ساتھ نہیں کھاتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی میں اپنا دوپہر یا رات کا کھانا مدرسے کے کسی ضرورت مند کو ہبہ کر دیتے تھے۔ اِسی طرح مدرِّس ہونے کے بعد بھی اُنھوں نے، دوپہر اور رات کے کھانے ایک ساتھ نہیں کھائے؛ البتہ جب اِصلاح وتربیت کے لیے، اُن کے پاس مہمانوں کی آمد زیادہ ہونے لگی، جن میں علما ومشائخ، طلبہ، جدید تعلیم یافتہ حضرات اور مختلف عوامی طبقات کے لوگ ہوتے تھے، تو آپ خوش اخلاقی، دل داری، اِعزاز واکرام کے پیش نظر، اُن کے ساتھ کھانے پر مجبور ہوئے؛ تاکہ مہمان کی عزت واحترام کے سلسلے میں نبیٔ اکرم ﷺ کی سیرتِ پاک کی پیروی اور اِس بارے میں آپ ﷺ کے احکام کی اطاعت وفرماں برداری کا ثواب ملے۔

مفتی صاحب مرحوم دارالعلوم کی تنخواہ قبول نہیں کرتے تھے، اِس سلسلے میں اُن کا معمول تھا کہ تنخواہ میں کچھ اپنے پاس سے ملا کر دارالعلوم کو ہی لوٹا دیتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم حلیم وبردبار، خوش اخلاق ونرم خو اور علما وطلبہ سے محبت رکھنے والے تھے، اپنی مجالس میں اپنے اَسلاف، شیوخ واساتذہ، صلحا ومربین، ائمہ ومجتہدین اور فقہا ومحدثین کا بہت زیادہ تذکرہ فرماتے اور کثرت سے اُن کے ایمان آفریں اور شوق پرور قصے، حکایات اور واقعات سناتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم، دیوبند کے بہت سے علما ومشائخ کی طرح بہت زیادہ قوی الحافظہ تھے، چناں چہ علوم وفنون کی مختلف کتابوں کی عبارتیں آپ کو حفظ تھیں، آپ اُنھیں

زبانی پڑھ ڈالتے تھے، پڑھے ہوئے فنون کے بہت سے مسائل چھوٹی چھوٹی جزئیات اور باریک تفصیلات، حیرت انگیز حد تک مستحضر تھے۔

۱۹۶۷ء کا دارالعلوم کے زمانۂ طالبِ علمی کا واقعہ ہے کہ مجھے ایک مسئلہ بہت دشوار لگا، میں نے طلبہ کی زبانی مفتی صاحب مرحوم کی علمی یادداشتوں کے بارے میں سن رکھا تھا، میں نے اُن سے ہی پوچھ لینا مناسب سمجھا، چناں چہ میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا، جو مسجدِ قدیم کے اُس دروازے سے متصل تھا، جولبِ سڑک اور مہمان خانے کے دروازے کے سامنے ہے۔ میں نے سلام کرنے کے بعد اپنا تعارف کرایا اور اُن کے سامنے شرحِ وقایہ کا وہ صفحہ کھولا جس میں مجھے اِشکال درپیش تھا، اُنھوں نے چند ثانیوں میں ہی اُس کی وضاحت فرمادی اور مُتعلِّقہ مسئلے کو اصولِ فقہ کے ایک کلیّے میں تبدیل فرمادیا، جسے أصول الشاشی کے مصنف نے بہت اچھے اور واضح انداز واسلوب میں بیان کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے میرے سامنے زبانی کتاب کی عبارت پڑھی اور فرمایا:

”اصول الشاشی سے رجوع کرلیجیے، وہاں آپ کو فلاں بحث اور فلاں صفحے میں، یہ مسئلہ خوب مفصَّل مل جائے گا، اِس پر حاشیہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے“۔

ان کے مستحضر علم اور قوی حافظے کا یہ عالم دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کمرے آیا اور ”أصول الشاشی“ کے صفحات پلٹے جیسا کہ اُنھوں نے بتایا تھا، وہاں مجھے وہ مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ مل گیا۔

مفتی صاحب مرحوم ذکاوت وذہانت کا پیکر تھے، آپ کے فتاویٰ، ملفوظات اور ہنگامی مسائل کے سلسلے میں آپ کے پاس بیٹھنے والے اور آپ سے فتویٰ لینے والے لوگوں کے سوالات کے برجستہ اور مناسب جوابات اِس بات کی کھلی شہادت ہیں۔ آپ کی ذہانت کے قصے علما اور طلبہ میں بہت زیادہ مشہور ومعروف ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم نہایت بدیہہ گو اور فصیح الکلام تھے۔ خصم کو لاجواب کردینے میں یدِطولیٰ حاصل تھا، مقابل

فریق کو اپنی باتوں سے اچھی طرح مطمئن کر دیتے تھے، سائل کا تسلّی بخش جواب دیتے، کسی بات کو تشنہ نہ چھوڑتے اور شکوک وشبہات گزیدہ شخص کو اِیمان ویقین کی دولتِ بے بہا عطا کرتے، مبتدعین سے نبرد آزمائی، باطل پسندوں سے مناظرہ اور لمبی باتیں بنانے والے؛ لیکن اعمال کے سرمایے سے یکسر خالی اور تہی دست گم راہ اِسلامی فرقوں کے خدا بے زار و بے دین لوگوں کے تعاقب نے، حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ان صلاحیتوں کو جِلا بخش دیا تھا۔

یہ صلاحیتیں آپ کے لیے اِفتا کی ذمہ داریوں اور فقہی فیصلوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے میں معاون ثابت ہوئیں اور اِن کے طفیل آپ کے لیے، تفسیر، حدیث، فقہ اور اُصول کے مباحث سے متعلق علمی مسائل کی تہ تک بہت جلد پہنچ جانے میں آسانی ہوتی تھی۔

اِنھی خصوصیّات کی بنا پر آپ مطلوبہ حد تک دار العلوم جیسے عظیم اسلامی ادارے میں (جسے یہ خصوصیت وفضیلت حاصل ہے کہ بِرصغیرِ ہند کے مسلم عوام جتنا اعتماد وبھروسہ اُس کے فتاویٰ اور فقہی فیصلوں پر کرتے ہیں، اِس قدر کسی دوسرے ادارے کے فتاویٰ پر نہیں کرتے اور تمام دینی مسائل میں جو مرجعیّت اور مرکزیّت اسے حاصل ہے، وہ کسی دوسرے ادارے کو حاصل نہیں) صدر مفتی کا منصب سنبھالنے کے اہل اور لائق تھے۔

دیکھنے میں آتا ہے کہ بہت سے علما درشت کلامی اور معاملات میں بے اعتدالی کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں، لوگوں کے ساتھ اختلاط میں سخت گوئی اور کم گوئی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُن کا یہ رویّہ عزت واحترام کا سبب اور ہیبت ووقار کا باعث بنے گا، اِس بنا پر وہ مزاح ودل لگی اور اُن تمام باتوں سے بچنے کی بے انتہا کوشش کرتے ہیں، جن سے دل میں سرور وکیف پیدا ہو، فکر میں نشاط وشگفتگی کی لہر دوڑ جاتی اور خیالات میں تازگی ورعنائی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے؛ لیکن حضرت مفتی صاحب مرحوم حد درجہ ظریف اور نہایت ہی خوش طبع انسان تھے، الفاظ اور جملوں کی نشست وبرخاست، عمدہ

یا خراب تراش خراش، حسین یا قبیح معانی، قریب یا بعید دلالتوں، حقیقی یا مجازی مرادوں اور شیریں یا تلخ ادائیگیوں سے نکتے تراشتے اور انوکھی باتیں پیدا کرتے، لطیف اِشارات اور خوش کن کنایوں سے مجلس میں سماں بندھ جاتا۔

سراپا

آپ کا قد دراز، رنگت سپید، جسم دبلا، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی، پلکیں لمبی اور باریک، ڈاڑھی اور سر کے بال گھنے اور بالکل سفید تھے۔ روشن چہرہ، شگفتہ رو، متبسم ہونٹ والے تھے، فُقرا و مساکین کے ساتھ بہت زیادہ حسنِ سلوک برتتے، علما، طلبہ اور اہلِ تعلق حضرات کا بہت زیادہ پاس و لحاظ فرماتے، آپ پاک دامن اور نظافت پسند تھے، لوگوں پر پھبتیاں اُڑانے سے اپنی زبان محفوظ رکھتے، گم راہ فرقوں کا بڑا تعاقب فرماتے، تمام معاملات میں دور بینی سے کام لیتے، ہر وقت راضی بہ رضا، شکایاتِ زمانہ سے گریزاں، تھوڑے مال اور اُمیدوں پر قانع اور عبادات و اعمال کے وافر ذخیرے کے مشتاق و متمنی رہے، اپنے پروردگار پر بہت زیادہ بھروسہ اور اس کے بندوں پر بہت زیادہ اعتماد تھا، شریفانہ عادات و اطوار اور عمدہ اَخلاق و کردار کے مالک اور بہت ہی حلیم الطبع انسان تھے، اُنھیں فکر صرف خدا سے اپنے رشتہ و تعلق کی اِصلاح کی تھی، بندگانِ خدا کو اپنی تمام چیزوں: مال و زر، علم و فضل، صلاح و تقویٰ، مواعظ و نصائح اور تربیت و اِصلاح سے نفع پہنچایا۔ آپ بلا استثنا سبھوں کے نزدیک محبوب تھے، آپ کی مجلس، علم و ذکر کی مجلس ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ آپ پر اپنے نیک بندوں جیسی رحمت برسائے، آپ کو اپنی جنت میں انبیا، صدیقین اور شہدا و صالحین کے ساتھ جگہ عطا کرے اور علم و دین اور اسلام و اہل اسلام کی جو بے بہا خدمت انجام دی، اُس کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، آپ کے رشتہ دار و اقارب اور تمام محبین کو صبر و شکیبائی کی توفیق دے اور ہمیں آپ کی جدائی کے اَجر

سے فیض یاب کرے اور آپ کے بعد کسی آزمائش میں نہ ڈالے، ہمیں آپ کے علم سے حصہ عطا فرمائے اور آپ کے جیسے قول وفعل اور علم وعمل کی توفیق بخشے۔ بلاشبہ خدا کی ذات ہی حافظ ونگہبان اور ہر چیز پر قادر ہے۔

صلّى الله وسلّم على سيدنا ونبينا ومولانا عبده ابن عبد الله محمد وعلى آله وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .(۱)

مختصر سوانحی خاکہ

- اسم گرامی: محمود حسن۔
- تاریخِ ولادت: ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء۔
- جائے ولادت: محلہ بہاء الدین، قصبہ گنگوہ، ضلع سہارن پور، یوپی۔
- والد ماجد کا نام: مولانا حامد حسن۔
- ابتدائی تعلیم: مکتب قصبہ گنگوہ اور جامع مسجد گنگوہ میں۔
- عربی مبادیات: ''نہٹور'' ضلع ''بجنور'' میں اپنے والد صاحب سے۔
- عربی وشرعی علوم: مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور ودار العلوم دیوبند میں۔
- تدریس: اولاً مدرسہ مظاہر علوم میں، ۱۳۵۱ھ سے ۱۳۷۳ھ تک، اُس کے بعد مدرسہ جامع العلوم ''کانپور'' میں ۱۳۸۵ھ تک۔ ۲۶ر جمادی الاولی ۱۳۸۵ء سے آخری زندگی تک دار العلوم دیوبند میں مفتیِ اعظم رہے۔ ۱۳۸۸ھ میں حضرت مولانا سید فخر الدین احمد شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے حکم پر، اُن کی وفات ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء تک صحیح بخاری شریف جلد ثانی کی تدریس کا فریضہ انجام دیا۔
- دار العلوم دیوبند میں آپ کا قیام اوائل رمضان ۱۳۹۱ھ تک مسجد قدیم کے احاطے کے اُس کمرے میں رہا، جو مہمان خانے کے گیٹ کے سامنے کے مسجد کے گیٹ پر واقع ہے۔ ۲۰ر رمضان ۱۳۹۱ھ کو آپ مسجدِ چھتّہ کے شمالی جانب کے اُس کمرے میں آگئے، جس میں دار العلوم دیوبند کے بانی امام محمد قاسم نانوتویؒ کا

(۱) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۵، جلد ۲۰، جمادی الاولیٰ و جمادی الاخریٰ ۱۴۱۷ھ = اکتوبر ۱۹۹۶ء۔

قیام رہا کرتا تھا۔

۞ آپ کے فتاوے ۸ جلدوں میں ۱۴۱۷ صفحات میں چھپ چکے ہیں، جو بہت مقبول و مُتدَاوَل اور علما کے لیے علمی و فقہی مرجع ہیں۔

۞ آپ کے علمی و فکری نتائج کو علما و مستفیدین نے مختلف موضوعات پر شائع کیا ہے، اُن کتابوں کی تعداد بیس (۲۰) کے قریب ہے۔

۞ آپ نے دنیا کے بیش تر ممالک کا اصلاحی و دعوتی دورہ کیا اور وہاں طویل و مختصر قیام فرمایا۔

۞ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

۞ آپ کی وفات جنوبی افریقہ کے شہر ''جوہانس برگ'' میں ۲-۳/ستمبر ۱۹۹۶ء مطابق ۱۹-۲۰/ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ کی درمیانی شب میں وہاں کے وقت کے مطابق ساڑھے سات بجے واقع ہوئی، دوشنبے ۳/ستمبر ۲۰/ربیع الثانی کو تقریباً ۹/بجے وہاں کے وقت کے مطابق تدفین عمل میں آئی۔



علامہ شیخ عبدالفتّاح ابوغُدَّہ حلبی شامیؒ

۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء — ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء

جو ذکر کی گرمی سے، شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

شبِ دوشنبہ ۹/۱۰/۱۴۱۷ھ (بہ حساب ہندوستانی جنتری) ۱۰/۱۰/۱۴۱۷ھ (بہ حساب سعودی جنتری) مطابق ۱۷/۲/۱۹۹۷ء، ٹھیک ۱۲½ بجے (بہ وقتِ ہندوستان) دس بجے (بہ وقتِ سعودی عرب) مطالعے کی کتاب کو میز پر ڈال اور الارم گھڑی بغل میں رکھ میں بستر پر دراز ہوا ہی چاہتا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، میں نے رسیور ہاتھ میں لیا تو معلوم ہوا کہ ریاض سے ایک قاسمی دوست کا فون ہے، اُنھوں نے علیک سلیک کے بعد جب یہ کہا کہ میں تمھیں ایک اندوہ ناک خبر سنانے جا رہا ہوں، تو راقم نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھتے ہوئے اُن سے عرض کیا ''بتائیں'' اُنھوں نے کہا آج ہی یعنی یک شنبہ ۱۶/۲/۱۹۹۷ء بہ وقت فجر، ریاض کے ہسپتال ''مُسْتَشْفَی الْمَلِكْ فَیْصَلْ التَّخَصُّصِي'' میں علاّمہ شیخ عبدالفتاح ابوغُدّہ رکنِ اساسی ''رابطۂ عالمِ اسلامی'' اور سابق نگرانِ اعلیٰ ''اِخوان المسلمین'' سیریا نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ابھی ذرا دیر پہلے مسجدِ نبوی میں اُن کی نمازِ جنازہ ہوئی ہے اور جنّت البقیع میں سپردِ خاک ہوئے ہیں۔ کافی دیر تک اِنَّا لِلّٰہ... کا ورد کرتا اور اپنے کو تسلّی دیتا رہا۔ نگاہوں کے سامنے علم وعمل کی برکات سے مُنَوَّر اُن کے روشن چہرے کی تصویر پھر گئی اور اُن کی

دیدوشنید کا پورا دورانیہ سامنے آگیا۔

ہمارے دوست کی مہربانی سے اُن کے عالمِ جاودانی کو سِدھار جانے کی خبر فوراً مل گئی، خدا اُنھیں بھی خوش رکھے؛ لیکن دل پرغم واندوہ کی فضا نے جس طرح ڈیرا ڈالا اور اُس وقت سے اب تک قلب وجگر کی جو کیفیّت ہے اُسے خدائے علیم ہی جانتا ہے، اُسے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ رنج والم کی یہ کیفیت برِّصغیر کے صرف چند ہی علماے ربانیین اور عالم اِسلام کے انگلیوں پر شمار کیے جانے والے مُفکِّرین واُدباے مُخلِصین کی وفات پر ہی محسوس ہوئی تھی۔ میرا ایمان ہے کہ دل فگاری کی اِسی کیفیّت سے عالمِ اسلام وعالم عرب میں عموماً اور برِّصغیر میں خصوصاً وہ ہزاروں علما دوچار ہوے ہوں گے، جنھیں اُن سے اُن کی للہیّت اور اُن کے غیر معمولی علم وفضل کی وجہ سے اُسی طرح کی محبت وعقیدت تھی جیسی عہدِ قریب کے بَرِّصغیر کے خدارسیدہ ومحبت چسیدہ علماے عالی مقام ومشائخِ ذی احترام سے۔

علم وعمل میں بے نظیر عالم

اِس دورِ آخر میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ایسے عالم باعمل، مُحدِّثِ دیدہ ور اور فقیہِ نبض آشناے شریعتِ مُطَہَّرہ کی نظیر عالمِ عرب واسلام میں کم ہی ملے گی؛ بل کہ صحیح یہ ہے کہ وہ بے مثال تھے۔ اُن کی علمی بے پناہی کے ساتھ اُن کے ذوقِ عبادت وشوقِ طاعت اور عملی ہمہ گیری میں بالخصوص عالمِ عرب میں، اِس وقت شاید ہی کوئی اُن کا ہم پلہ رہا ہو، ہرچند کہ بعض حلقوں کو شاید یہ بات ناگوار گزرے، جو اپنے مکتبۂ فکر کے خول سے باہر دیکھنے کا حوصلہ نہیں جٹا پاتے۔

میں نے عالم اسلام کو جہاں تک دیکھا اور سنا ہے تو میں نے یہ پایا ہے کہ وہاں علامۂ کبیر، مُحدِّثِ جلیل، مُفکِّرِ دوراندیش، مفتیِ باخبر، قاضیِ بابصیرت کی کوئی کمی نہیں۔ البتہ وہاں ایسے اِنسانوں کی بے شک کمی ہے جو اپنے علمی وعملی منصب کے معیار پر

سیرت وکردار اور عمل واخلاق کے اعتبار سے پورے اُترتے ہوں۔ وسیعُ العلمی ودقیقُ النظری کے ساتھ ساتھ بہت سارا، پیہم اور مربوط عمل؛ یہی وہ امتیاز ہے جو علامہ عبدالفتاح ابوغدہ کو اپنے بہت سے اَقران سے جدا کرتا ہے، اُن اَقران سے جن کے اَسما والقاب، شکل وصورت، کُلاہ ہاے بلند، زبان ہاے فصاحت ریز وقلم ہاے سیل صفت سے ایسی شوکت وعظمت برستی ہے کہ صرف ہم ایسے خُرد وں ہی کا نہیں بہت سے بزرگوں کا بھی مَرعُوبیّت کے مارے بُرا حال ہو جاتا ہے۔

پھر یہ کہ علم کے اعتبار سے بھی وہ صرف ایک دو فن کے غوّاص نہیں تھے؛ بل کہ سلفِ صالحین اور علماے مُتقدّمین کی طرح بہت سارے علوم کے شناور تھے۔ علومِ قرآن وحدیث، فقہ واُصولِ فقہ، اَسماءُ الرِّجال اور تاریخ وغیرہ میں اُن کی اُستاذیّت تو مُسلَّم تھی ہی؛ لیکن وہ عَربیّت: صرف ونحو، معانی وبیان، علم العروض والقوافی، فنِ اِنشا پردازی ونثر نگاری، منطق وفلسفہ اور علم النفس کے بھی صاحبِ نظر عالم اور ماہر مُصنّف تھے۔

اِنھی بہت سی خصوصیّات کی وجہ سے، وہ ساری دنیاے عرب واسلام میں ہزاروں علما وطلبہ وعلم دوست لوگوں کے دلوں کی دھڑکن تھے۔ وہ دنیاے علم کا ایک تاب ناک ترین ستارہ، ایک مُعتبَر علامت اور حلقۂ فُقہا ومُحدّثین وعلما وزاہدین کا گوہرِ شب تاب تھے۔

علم کا ایسا رسیا اور اُسے ہر ممکن طریقے سے حاصل کرنے اور ہمہ وقت اُس میں لگا رہنے والا، نیز اپنے سے سن وسال میں چھوٹے اور تجربہ وآگہی میں کم تر سے بھی فیض یاب ہونے کا حوصلہ رکھنے والا، میں نے اُن کے ایسا کسی اور کو کیوں دیکھا ہوگا، اپنے سے بڑے سے اکتساب کا تو ذکر ہی کیا۔

اِسی شوقِ طلب کی وجہ سے، اُن کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد ۱۲۰ (ایک سو بیس) تک پہنچتی ہے، اُن میں سے اَکثر کا تعلق اُن کے مادرِ وطن حلب ودمشق پھر قاہرہ ومصر، مغربِ عربی اور برِّصغیر سے ہے، جہاں کے علما کے وہ بے حد دل دادہ ومُعتقِد رہے تھے اور زندہ ومردہ دونوں قسم کے علما سے اُنھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

علماے ہند سے ربط و تعلق

وفات یافتہ علما میں وہ امامِ عالی مقام احمد بن عبدالرحیم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ/ ۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) علّامہ عبدالحی فرنگی محلّی (۱۲۶۴-۱۳۰۴ھ/ ۱۸۴۸-۱۸۸۶ء) سے بہت عقیدت رکھتے تھے، ثانی الذکر کی بہت سی کتابوں کو اپنی تحقیق و تحشیے کے ساتھ عالمِ عرب سے شائع کیا اور علماے عرب کو اُن سے مُتعارِف ہونے اور فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچایا۔

اِن دونوں بزرگوں کے بعد وہ مُحدِّثِ عبقری علّامہ محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ (۱۲۹۲-۱۳۵۲ھ/ ۱۸۷۵-۱۹۳۳ء) کے حد درجہ قدرداں تھے۔ اُن کی میراثِ علمی سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے اور اپنے عرب دوستوں کو اِس علمی خزانے سے اپنا حصہ پانے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔ علامہ کی ایک سے زیادہ کتابوں کو ایڈٹ کر کے بیروت وغیرہ سے شائع کیا تھا۔

پھر علامہ کشمیری کے تلمیذ بارّ مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ (۱۳۱۶-۱۳۸۵ھ/ ۱۸۹۸-۱۹۶۵ء) نیز محدثِ کبیر مولانا ظفر احمد تھانویؒ صاحبِ ''اِعلاءُالسنن'' (۱۳۱۰-۱۳۹۴ھ/ ۱۸۹۲-۱۹۷۴ء) جن کی ''اِعلاء السنن'' پر اُن کا فاضلانہ مُقدِّمہ، علمِ حدیث میں اُن کی دست گاہ کی روشن دلیل ہے۔ نیز مفتیِ اعظم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی پاکستانیؒ (۱۳۱۴-۱۳۹۶ھ/ ۱۸۹۶-۱۹۷۶ء) اور علامہ کشمیریؒ کے شاگردِ رشید اور اُن کے علمی ترکے کے مُدَوِّن و ناشر مُحدِّثِ کبیر مولانا محمد یوسف بنوریؒ صاحبِ ''معارف السنن'' (۱۳۲۶-۱۳۹۷ھ/ ۱۹۰۸-۱۹۷۷ء) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (۱۳۱۵-۱۴۰۲ھ/ ۱۸۹۷-۱۹۸۲ء) اور آخر میں برصغیر کے مُحدِّث و محقق مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (۱۳۱۹-۱۴۱۲ھ/ ۱۹۰۱-۱۹۹۲ء) کے نہ صرف قائل تھے؛ بل کہ اُن میں سے جنھیں پایا اُن کی صحبت اور علمی خزانے اور جنھیں نہیں پایا اُن کی تصنیفات سے علمی دقیقہ

رسی و گوہر باری سیکھی اور علما و طلبہ کو اُنھیں حرزِ جاں بنا لینے کی تلقین کی۔

برِّصغیر کے خطیبِ بے بدل اور اسلام کے لسانِ ناطق مولانا قاری محمد طیّب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۵-۱۴۰۳ھ/ ۱۸۹۷-۱۹۸۳ء) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مشہور مفکّر وداعی ومصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء/۰۰۰۰/۰۰۰۰(۱)) سے اُنھیں حد درجہ قلبی اُنس، فکری ہم آہنگی، روحانی یکسانیت اور مسلکی یگانگت تھی۔

علامہ ابوغدہ نے ائمۂ سلف کی کتابوں پر توجُّہ دینے کے ساتھ ساتھ علماے ہند کی تصنیفات وتالیفات کو بھی اپنی علمی توجُّہ کا مرکز بنایا، چناں چہ دقتِ نظر کے ساتھ عصری اسلوب میں اُنھیں ایڈٹ کیا، اُن پر حاشیہ نویسی کی اور اُنھیں عالمِ عرب کے مکتبات سے بڑی عرق ریزی کے ساتھ شائع کروایا۔ اِس طرح علماے عرب کو اُن سے مُطّلِع ہونے اور اُن سے علمی پیاس بجھانے کی راہ ہم وار ہوئی۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے بعض ہندی علما کو بھی ہمارے اکابر کی بہت سی تصنیفات کا علم تب ہوا جب شیخ ابوغدہ نے اُن کی علمی اَہمیّت کو اجاگر کیا اور اُنھیں روشنی میں لائے۔ افسوس ہے کہ علماے برصغیر کو اُن کی قدر و قیمت کے ساتھ جاننے والا، دنیاے عرب میں شیخ ابوغدہ کی قد و قامت کا اب کوئی عالم نہیں رہا۔

دارالعلوم دیوبند اور اُس کے مشائخ سے عقیدت

وہ دارالعلوم دیوبند کی ہمہ گیر علمی ودینی خدمات کے بڑے مدّاح اور وکیل تھے۔ علم ودین واخلاص کے حوالے سے، بانیانِ دارالعلوم کے مقام ومرتبے کو خوب خوب جانتے تھے اور اِس دیار میں اِسلامی حکومت وشوکت کے زوال کے بعد اِسلامی وجود کی بالعموم اور دینی علوم ودینِ اسلام کی بالخصوص، حفاظت کے سلسلے میں اُن کے کردار کی

---

(۱) اِس تحریر کے عربی اور اردو میں لکھے جانے کے وقت حیات تھے۔ بہ روز جمعہ: ۲۲/رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ۱۱ بج کر ۵۵ منٹ پر داعیِ اَجل کو لبیک کہا۔

آ گہی، اِس طرح رکھتے تھے کہ اب کسی عربی عالم سے موجودہ حالات کے چوکھٹے میں شاید ہی امید کی جا سکے۔ وہ دیو بند کئی مرتبہ آئے اور اپنی حسین یادوں اور عطر بیز تأثُّرات کا اپنی گل ریز زبان میں اِظہار کیا۔ وہ دارالعلوم میں اپنے کو موجود پا کر قلبی اِطمینان اور روحانی سکون محسوس کرتے جیسے مچھلی کو سازگار پانی مل گیا ہو، اُن کی دارالعلوم آمد کے وقت خُدّام دارالعلوم کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے کسی سلف کی محفل میں بیٹھے ہوے ہیں؛ اِس لیے کہ اُنھیں دیو بند سے ہر طرح مسلکی ودعوتی اتفاق وامتزاج تھا۔

علمی ہمہ گیری

علامہ ابوغدہ کو فقہِ حنفی پر عبور تھا جس کے وہ مُتَّبِع بھی تھے، نیز فقہِ شافعی اور دیگر اِسلامی مذاہب کی فقہ پر بھی کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ اصولِ فقہ، اصولِ حدیث، فنِ اَسماء الرجال اور حدیث کے متناً وسنداً اور روایۃً ودرایۃً ماہر تھے۔ ساری زندگی اِن فنون کے پڑھنے پڑھانے، نشر واشاعت اور تصنیف وتالیف میں گزار دی۔ اِن فنون پر اپنی تالیفات اور سلف کی تصنیفات کی تحقیقات وتعلیقات کے ذریعے، عصرِ حاضر کے علما وطلبہ کے لیے اِستفادے کو آسان بنا دیا۔ اُن کی تصنیفات اور تحقیقات دونوں میں وہ بالغ نظری، جامِعیّت اور وُسعَتِ فکری ہے جس کا سر چشمہ ہمہ وقتی مطالعہ، بے تکان کتب بینی، کشادہ قلبی اور علم النفس کی غوّاصی ہے، جس میں اُنھوں نے دو سال تک ماہرانہ بصیرت پیدا کی تھی؛ اِسی لیے اُن کی تصنیفات وتحقیقات؛ بل کہ محاضرات وخطابات میں اُس طرح کا موازنہ ومحاکمہ ہوا کرتا ہے جس کی بنیاد، علم النفس پر قائم ہوتی ہے۔

اُن کے علمی کام کی تعداد ساٹھ سے مُتجاوِز ہے (۱) جس کا دو تہائی، حدیث رسول اللہ اور اُس کے متعلقات کے موضوع پر ہے اور ایک تہائی کا تعلق فقہ اور دیگر اسلامی موضوعات سے ہے۔ استاذ عبدالوہاب بن ابراہیم ابوسلیمان نے صحیح کہا ہے کہ:

(۱) اہم تصنیفات وتحقیقات کی ایک فہرست مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

''علامہ عبدالفتاح ابوغدہ کے مطالعوں میں، حدیث اور اُس کے علوم کو امتیازی اَہمیّت حاصل ہے۔ اِس مُعزّز علمی میدان میں اُنھوں نے اِسلامی لائبریری کو پختہ تصنیفات سے مالا مال کیا ہے۔ بعض موضوعات پر قلم اٹھانے والے وہ پہلے مُصنِّف ہیں۔ اُن کی تالیفات اپنی خصوصیات، نقطہ ہائے نظر، اغراض ومقاصد، تنوّع، مشمولات کی خوبیوں اور اُسلوبِ نگارش وطرزِ تخاطب کی سحر کاری کے اعتبار سے ممتاز مکتبۂ فکر کی نمائندہ ہیں۔ یہ تصنیفات عقل وخرد کو اپیل کرتی ہیں۔ اُن کی بنیاد ٹھوس علمی اُصولوں پر ہے، جن کو اخلاص وتواضع نے چار چاند لگادیے ہیں۔ یہ تصنیفات علامہ کی شخصیت کا آئینہ، اُن کی ذِہنیّت کی دلیل اور اُن کی اُس روحانی شَفّافیّت کی غمّاز ہیں جس کے طفیل اُنھوں نے علمی دنیا کو تاب ناک خیالات اور بے مثال فوائد وحصول یابیوں سے نوازا ہے''۔(۱)

علامہ کی ایک اور خصوصیّت

اُن کی ایک اور خصوصیّت بھی تھی، جو اُن کے، اور دگر علمائے معاصرین کے درمیان خطِّ فاصل قائم کرتی ہے۔ وہ یہ کہ اُنھیں عربی زبان اور متعلقہ علوم وفنون پر بھی عبور تھا۔ عربی کی نثر ونظم کا اتنا بڑا سرمایہ اُنھیں محفوظ تھا کہ اِس پختگی کے ساتھ بعض پیشہ ور اُدبا واہلِ قلم کو بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ عربی زبان کے مُفردات ولغات اُس کے نظائر وشواہد کے ساتھ، قواعدِ صرف ونحو اختلافِ مذاہب کے ساتھ اور مسائلِ بلاغت اُس کے دلائل کے ساتھ یاد تھے۔

اُستاذ محمد عوامہ نے (جو شیخ ابوغدہؒ کے ارشد تلامذہ میں ہیں) اپنے ایک مضمون میں ایک دلچسپ حکایت نقل کی ہے جس سے اِس فن کے حوالے سے علامہ کی عظمت پر

(۱) مضمون بر علامہ ابوغدہ از استاذ عبدالوہاب بن ابراہیم ابوسلیمان، عکاظ، جدہ، شمارہ سہ شنبہ، ۱۸رشوال ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۵ر فروری ۱۹۹۷ء۔

روشنی پڑتی ہے:

''... ثانوی مرحلے کے پہلے سال میں، جب ہم طالب علم تھے، تو ہمارے ایک استاذ نے بیان کیا کہ کچھ لوگوں کے ساتھ وہ دمشق گئے، وہاں ایک مدرس کے سبق میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ اتفاق سے ایک لفظ کے تلفّظ یا اِعراب (مجھے یاد نہیں رہا) کے متعلق اُنھیں اِشکال ہوا۔ مدرس صاحب نے ایک طالبِ علم سے کہا کہ ''القاموس المحیط''(۱) لے آؤ تو ہمارے استاذ نے جو اِس واقعے کے راوی ہیں اُن سے فرمایا کہ: قاموس لانے کی کیا ضرورت ہے، یہ رہے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ جو قاموسِ گویا ہیں، آپ جو چاہیں معلوم کرلیں''۔(۲)

اُستاذ محمد عوامہ نے اِس واقعے کے درج کرنے کے بعد یہ اشارہ بھی کردیا ہے کہ ہمارے مذکورہ اُستاذ شیخ ابوغدہ کے ہم خیال نہیں تھے؛ بل کہ اُنھیں اُن سے خدا واسطے کا بیر تھا اِس کے باوجود ہوا وہی کہ جادووہ جو سر چڑھ کر بولے۔

بات یہ ہے کہ علامہ نے حصولِ علم کے لیے شمع کی طرح جلنے اور پروانے کی طرح نچھاور ہونے کا سلیقہ، سلف ہی کی طرح سیکھا تھا، جو خدا کی توفیق اور اُس کے لطفِ خاص کے بغیر ممکن نہیں، اِسی لیے اُنھیں علمی دنیا میں وہ نام ومقام حاصل ہوا، جو معاصرین میں کم لوگوں کے حصّے میں آیا۔ اُستاذ محمد عوامہ نے اُن کی علمی پیاس کے حوالے سے مندرجۂ ذیل واقعہ سپردِ قلم کیا ہے:

''علامہ ابوغدہ کے نوجوان اُستاذوں میں ایک تھے شیخ محمد سلقینی رحمۃ اللہ علیہ، اُنھیں ایک مرتبہ کچھ دنوں کے لیے سفر درپیش ہوا۔ اُنھوں نے سبق کا

---

(۱) علامہ ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (۷۳۰—۸۱۷ھ/ ۱۳۲۹—۱۴۱۴ء) کی مشہور عربی لغت، جس کی علامہ مرتضیٰ زبیدی (۱۱۴۵—۱۲۰۴ھ/۱۷۳۲—۱۷۹۰ء) نے ''تاج العروس من جواہر القاموس'' کے نام سے شرح لکھی تھی جو عربی زبان کی شہرۂ آفاق لغات میں سے ایک ہے اور اپنے خصائص کے اعتبار سے فائق۔

(۲) مضمون شیخ محمد عوامہ بر علامہ ابوغدہ، شائع شدہ روزنامہ عکاظ، جدہ، سعودی عربیہ، شمارہ سہ شنبہ ۱۱/۱۰/۱۴۱۷ھ مطابق ۱۸/۲/۱۹۹۷ء۔

ناغہ مناسب نہیں سمجھا؛ اِس لیے اپنے شاگرد ابوغدہ کو مدرسہ خسرویہ[1] میں قائم مقام کر گئے۔ اُنھوں نے استاذ کی قائم مقامی کا حق ادا کر دیا۔ جب شیخ سلقینی سفر سے واپس آئے، تو طلبہ نے اُن سے پوچھا کہ: حضرت! کیا شیخ عبدالفتاح ابوغدہ آپ کے شاگرد ہیں تو سلقینی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے تواضع کے ساتھ فرمایا کہ: ہاں کبھی ہوا کرتے تھے؛ لیکن اب میں اُن کا شاگرد ہوں۔ میں اُنھیں نحو میں شرح اُجرومیہ پڑھایا کرتا تھا اور وہ فن کی اونچے درجے کی کتاب ''مغنی اللبیب'' سے مطالعہ کر کے آیا کرتے تھے''۔[2]

نوادرِ کتب کے حصول کا شوقِ بے پناہ اور اِس سلسلے کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات

ذوقِ علم کے نتیجے میں اُنھیں کتابوں سے غایت درجہ محبت تھی، جو ایک سچے طالب علم کی پختہ علامت ہے۔ نوادرِ کتب کے حصول، مخطوطات و مطبوعات کی ذخیرہ اندوزی کے لیے ہر طرح سے کوشاں رہتے۔ اِس سلسلے میں وقت، مال، محنت اور بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کرتے۔ بعض کتابوں کے مقدموں میں اُنھوں نے اِس سلسلے کے بعض واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مُدَرِّس علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''التصریح بما تَواتَرَ في نزول المسیح'' کو اُنھوں نے کس محنت و جستجو کے بعد پایا اور پھر اُس کو اپنی تحقیقِ انیق کے ساتھ عالمِ عربی سے شائع کیا، اِس کا واقعہ خود اُنھی کی زبانی سنیے:

---

(۱) شہر ''حلب'' کے اِس مدرسے میں شیخ ابوغدہ نے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور اب یہ ''مدرسۂ ثانویہ شرعیہ'' کے نام سے معروف ہے۔

(۲) شیخ محمد عوامہ کا مذکورہ مضمون۔

''... یہ کتاب جو قارئین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، اِس کا حصول میری زندگی کی اہم آرزو تھا؛ لیکن اِس آرزو کا پانا میرے لیے دشوار ثابت ہوا۔ میں مسلسل پندرہ سال سے اِس کے ہندوستانی نسخے کے حصول کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ مصر میں جو کتابوں کا ملک ہے اپنے چھ سالہ قیام کے دوران میں نے اِس کی جستجو کی۔ پھر میں نے اِسے مکہ و مدینہ اور بغداد نیز دیگر عربی ملکوں کے کتب خانوں میں ڈھونڈا؛ لیکن نہیں ملی، ہندو پاک کے بعض علمائے گرامی سے میں نے درخواست کی کہ وہ اپنے ہاں کا چھپا ہوا، اِس کتاب کا کوئی نسخہ فراہم کر دیں، اُنھوں نے قابلِ شکر کوششیں کیں؛ لیکن اُنھیں بھی نہیں ملی۔

چوں کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور اپنے مُصَنِّف کی امامت کے حوالے سے منفرد ہے اِس لیے ۱۳۴۴ھ میں طبع ہونے کے ساتھ ہی علما و طلبہ نے اِسے اُچک لیا اور بعد میں اِس کے کسی نسخے کا حصول مشکل ہو گیا۔ خدا نے جب ہندو پاک کے سفر کا موقع دیا، میں نے وہاں کی لائبریریاں دیکھیں، وہاں اِس کی تلاش میں سعی کی؛ لیکن دست یاب نہ ہو سکی۔ ہندوستان سے مَیں پاکستان آ گیا، کراچی میں قیام رہا، وہاں علامہ و محققِ جلیل القدر مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی پاکستانی (۱) سے ملاقات ہوئی۔ اُن کا بڑا کرم ہے کہ اُنھوں نے اِس کتاب کا اپنا محفوظہ اور خاص نسخہ مجھے عنایت فرمایا اور خواہش کی کہ عالمِ عربی میں یہ کتاب ضرور چھپ جائے۔ میں نے اپنے سفرِ واپسی شنبہ ۷؍ جمادی الاولی ۱۳۸۲ھ سے قبل یہ ہدیہ شکریے اور قدر دانی کے ساتھ قبول کیا''۔(۲)

فقہِ حنفی کی مشہور کتاب ''فتح باب العنایہ'' کو بھی اُنھوں نے اپنے مقدمے اور تحقیقات کے ساتھ شائع کیا، لیکن اِس کے حصول کے لیے اُنھوں نے کس طرح ملکوں، شہروں اور

---

(۱) ولادت: ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۹ء، وفات ۱۱؍ شوال ۱۳۹۶ھ مطابق ۶؍ اکتوبر ۱۹۷۶ء۔ (امینی)

(۲) کتابِ مذکور: ص ۳-۴۔

گلیوں کی خاک چھانی۔ اُنھی کے قلم کی زبانی سنیے:

''تکمیلِ تعلیم کے لیے میں نے مصر میں چھ سال گزارے، جس جس کتب خانے میں گمان ہوتا کہ یہ کتاب وہاں موجود ہوگی، میں وہاں جاتا اور اِس کے متعلق معلوم کرتا رہا؛ لیکن اِس کا کوئی اتا پتا نہ چل سکا۔

اپنے شہر ''حلب'' واپسی پر بھی میں نے ہر اُس شہر میں اِس کی پیہم تلاش جاری رکھی، جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوا اور تمام مکتبات میں اِس کتاب کو ڈھونڈتا رہا، جن میں قدم رکھنے کی نوبت آئی۔ حتی کہ ایک جان کار کتب فروش یعنی شیخ حمدی سفر جلانی دمشقی رحمۃ اللہ علیہ سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب ''روس'' کے شہر ''کازان'' میں چھپی تھی؛ لیکن وہ اِس وقت کبریتِ احمر سے زیادہ نادر الوجود ہے اور یہ کہ ساری زندگی میں اِس کتاب کا، صرف ایک نسخہ اُن کے پاس آیا تھا، جو اُنھوں نے ناقابلِ یقین حد تک اونچی قیمت میں علامہ کوثریؒ کو فروخت کیا تھا۔ اُن کے کہنے سے مجھے یہ تو معلوم ہوگیا کہ کتاب کس شہر میں طبع ہوئی تھی؛ لیکن ساتھ ہی اِس کے حصول کے حوالے سے میں نا اُمید سا ہوگیا۔

خدا نے ۱۳۷۶ھ میں جب اپنے گھر کے حج کی توفیق دی اور مکہ مکرمہ کی زیارت سے شرف یاب ہوا، تو میں گھوم گھوم کر وہاں کے مکتبات میں اِس کتاب کا اتا پتا معلوم کرتا رہا کہ شاید اُس دیار سے شہرِ حرام مکہ مکرمہ کو ہجرت کنندہ کسی صاحب کے ساتھ یہاں آئی ہو؛ لیکن میں ناکام رہا۔

خدائے کریم کی عنایت سے میں مکہ مکرمہ کے ایک معمولی سے بازار کے ایک گوشے میں ایک کتب فروش کی دوکان پر جا پہنچا، یعنی شیخ مصطفیٰ بن محمد شنقیطی کی دوکان پر۔ میں نے اُن سے کچھ کتابیں خریدیں اور مایوسانہ اِحساس کے ساتھ میں نے اُن سے بھی اِس کتاب کو دریافت کیا؛ تو اُنھوں نے بتایا کہ دو ہفتے قبل میرے پاس اِس کا ایک نسخہ تھا، جو مجھے بعض بخاریوں کے ترکے سے حاصل ہوئی تھی، میں نے اچھی قیمت پر ''طاش قند'' کے ایک

بخاری عالم کو بیچ دی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ جھوٹ کہہ رہے ہیں؛ لیکن اُنھوں نے کتاب کا سراپا اِس طرح بیان کر دیا کہ مجھے کتاب کے سلسلے میں، اُن کی جان کاری کا یقین ہو گیا اور میں نے باور کر لیا کہ یقیناً یہ مطلوبہ کتاب ہی ہے، جس کی تلاش میں مَیں زمانۂ دراز سے سرگرداں رہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ اِس کتاب کو خریدنے والے عالمِ طاش قندی کون ہیں؟ تو اُنھوں نے اُنھیں یاد کرنے کی کوشش کے بعد، اُن کا نام شیخ عنایت اللہ طاش قندی بتایا۔ میں نے اُن کی رہایش گاہ، محلِ عمل یا ملاقات گاہ کے متعلق پوچھا، تو لاعلمی کا اظہار کیا کہ اِس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں نے کہا تو پھر کس طرح اُن کا پتا معلوم ہوگا؟ کہنے لگے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اُس وقت مجھے سخت مایوسی ہوئی''۔[۱]

اِس کے بعد علامہ نے لکھا ہے کہ میں مکہ مکرمہ کی گلیوں میں چکر لگاتا رہا، تا آں کہ شیخ عنایت اللہ سے خدا نے ملاقات کرا دی اور میں نے یہ کتاب اُن سے حاصل کر لی۔

علامہ کو گراں قدر کتابوں کے حصول کا اِتنا شوق ہوتا کہ وہ بعض کتابوں کے لیے منت مانتے تھے کہ اگر فلاں کتاب مل گئی، تو اِتنی رکعتیں نماز خدا کے لیے پڑھوں گا۔[۲]

وہ لکھتے ہیں کہ ایک کتاب کو خریدنے کے لیے میرے پاس روپیے نہیں تھے، تو میں نے اپنے والد سے ورثے میں آئے ہوئے ایک قیمتی سامان کو بیچ دیا۔[۳]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''اہلِ علم کی زندگی میں کتاب کو وہ مقام حاصل ہے جو روح کو جسم میں اور صحت مندی کو جان میں''۔[۴]

---

(۱) کتاب مذکور، جلد ۱، ص ۸-۹۔

(۲) کتاب ''صفحاتٌ من صبر العلماء'' ص: ۲۷۹۔

(۳) حوالۂ سابق۔

(۴) حوالۂ سابق، ص: ۲۵۶۔

جس کے شعلے نے جلا، سیکڑوں فانوس دیے

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ اِتنے بہت سارے اور بے شمار علما وطلبہ کی آنکھوں میں نہ بستے اور دلوں میں نہ سماتے، اگر وہ محض علومِ عقلیہ ونقلیہ کے جامع علاّمہ ہوتے، یا وہ صرف بڑے محقّق ومُصنِّف ہوتے، یا زمانۂ دراز تک درس دینے والے کام یاب ترین اُستاذ ہوتے، یا عالمِ اِسلام کے چپّے چپّے کی سیر کرنے والے اور جہاں دیدہ ہوتے۔ علم دوست وکمال پرستوں کی نگاہ میں جس چیز نے اُنھیں اِتنا محبوب ومطاع بنادیا تھا، وہ صحیح معنی میں اُن کی علمی وعملی جامعیّت تھی کہ کتاب وسُنّت کے علوم کے دیدہ ور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ شیریں اخلاقی، تواضع پسندی، اِخلاص ووسیع النظر فی اور اُنسیّت مزاجی وملنساری اُن کا شیوہ وشعار اور اُسوہ وکردار رہی تھی؛ جس کی وجہ سے اُن کے پاس بیٹھنے، اُن کو سننے اور اُن سے ملنے والے کا دل کھنچتا تھا اور تادمِ زندگی اُن کا اسیرِ محبت ہوجایا کرتا تھا۔

میں نے پایا ہے اُسے اشکِ سحر گاہی میں
جس درِ نایاب سے خالی ہے صدف کی آغوش

وہ آنکھوں میں بسے ہوئے اور دلوں میں بچھے ہوئے تھے؛ اُن کا تواضع؛ اُن کی نرم خوئی ودل جوئی؛ اُن کی شرم گیں وذہانت ریز نگاہیں؛ اُن کی جبینِ سجدہ پیشہ؛ یادِ الٰہی سے تر اُن کی زبانِ ادب شناس؛ اُن کی شریں گفتاری؛ باوقار چال؛ حبِّ الٰہی سے معمور سینہ، خشیتِ خدا سے لبریز دل؛ دعائے سحر گاہی ونالہ ہائے نیم شبی اور ربِّ شکور کے سامنے مسلسل گریہ وزاری، نیز آنسوؤں کی پاکیزہ ونورانی جھری سے نہائی ہوئی اُن کی فراخ عربی آنکھیں؛ اُن کی سرخ وسپید شامی شبیہ؛ اُن کا سڈول متوازن اور نفیس عربی جسم؛ پھلوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح ہر چھوٹے بڑے انسان کے لیے، اُن کی خمیدہ جبینی وخندہ روئی؛ مجلسِ درس وتقریر میں اور ہمہ وقت اُن کی گل بار وعطر افشاں

زبان اورکلیوں کی طرح تبسّم ریز ہونٹوں سے نکلتی ہوئی رس گھولتے ہوے سبک خرام الفاظوں کی موتی کی سی لڑی؛ ہمیشہ یادرہے گی۔

کچھ حسین یادوں کے اُجالے

میں گرم تھا اور میرا مُتَرجِم سرد!

۳۱/اکتوبر تا ۳/نومبر ۱۹۷۵ء کوندوۃ العلما لکھنؤ کا پچاسی سالہ جشن منعقد ہوا،۲/ نومبر کی شب میں شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر تھی، حدیث وسیرت ومغازی کے گہرے مطالعے سے تراشیدہ، عمیق فکرِ اسلامی سے ڈھلی ہوئی، اِسلامی درد اور دینی ولولوں میں بسی ہوئی اور معانی وبلاغت سے رولی ہوئی، اُن کی زبان کا ترجمہ ایک ندوی فاضل کررہے تھے۔ شیخ ہرچند کہ عربی نژاد تھے؛ لیکن علماے برِّصغیر سے، کثرتِ ارتباط واِفادہ واِستفادہ اور اِس دیار میں بار بار کی آمدورفت کی وجہ سے، اردو زبان کو کماحقہٗ نہ سمجھنے کے باوجود، یہ سمجھ جاتے تھے کہ مُترجم سے فلاں بات رہ گئی اور فلاں خیال اپنی تہ داری کے ساتھ اَدا نہیں ہوسکا، یا جوش وجذبے کی گل کاری اور اَفکار وخیالات کی نزاکتوں کا اِحاطہ نہیں ہوسکا۔ اِس سلسلے میں اُن کی عالِمانہ حِس اور مُحدِّثانہ ذہانت بھی اُن کی راہ نمائی کرتی۔ اُن کا قیام دیگر عربی مہمانوں کے ساتھ دریاے گومتی کے کنارے ''حضرت محل'' پارک کے پہلو میں واقع ''اودھ کلارک'' ہوٹل میں تھا۔ ۲/نومبر کی صبح کو مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی مدظلہٗ اُستاذ حدیث وفقہ وتفسیر دارالعلوم ندوۃ العلما اور راقم الحروف اُن سے ملنے گئے۔ اُن کی عالمانہ گفتگو وظریفانہ وادیبانہ گل افشانی سے فائدہ اٹھانے اور لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ اِسی دوران اُن کی شب کی تقریر کا تذکرہ چل نکلا، تو نہایت بلیغ جملے میں ترجمے کی خامی کی طرف اِشارہ کرتے ہوے فرمایا کہ ''کُنتُ حَارًّا وَکَانَ مُترَجِمِي بَارِدًا'' یعنی میں گرم تھا اور میرا مُترجِم سرد۔

میں کم وبیش پندرہ روز کی شبانہ روز کی، اُن کی مجلسِ درس ومحاضرات وتقریر میں شریک رہا ہوں، وہ اگر حدیثِ پاک، یا اُصولِ حدیث، یا کسی موضوع پر درس دیتے، تو وہ زیرِ بحث آنے والے دیگر علوم وفنون پر ایسی فاضلانہ، چشم کشا اور سیر حاصل گفتگو کرتے کہ سننے والے کو محسوس ہوتا کہ شیخ کا اصل موضوع یہی علوم ہیں اور اِنھی پر اُنھیں دست گاہ حاصل ہے۔ اُن کے درس ومحاضرے میں بیٹھ کر ایسا لگتا کہ ہم ایک ایسے خوش سلیقہ گلستاں میں بیٹھے محوِ نظارہ ہیں، جس میں ہر طرح کے خوش نما و دل ربا پھول اپنی جاں فزا خوشبوؤں کے ساتھ، قلب ونگاہ کی آسودگی کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ علماے سلف اور ائمہ کرام کی نیز دورِ آخر میں علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ کی مجالسِ درس کا تذکرہ سنا اور پڑھا تو تھا؛ لیکن آنکھوں نے اُن کی تصویر شیخ ابوغدہ ہی کے درس وتقریر میں دیکھی۔

علمی کمال اور دینی جمال کی بادِ بہاری

۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں، جب کہ راقم الحروف ندوۃ العلما لکھنؤ میں استاذِ زبانِ عربی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا؛ مخدوم گرامی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ[۱] کی دعوت پر، شیخ ابوغدہ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ندوے تشریف لائے۔ جمعرات ۲۶/ جمادی الاخری تا منگل ۹/ رجب ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۴/ مئی تا ۵/ جون ۱۹۷۹ء ندوہ ہی میں اُن کا قیام رہا۔ ذمہ داروں کے اصرارِ مسلسل کے باوجود، اُنھوں نے شہر کے کسی ہوٹل میں قیام گوارا نہ کیا؛ بل کہ عام ہندوستانی مُدرِّسین کی طرح مئی جون کی شدید گرمی میں وہ اُس وقت کے سادے مہمان خانے میں، جہاں اُس زمانے میں ضروری سامانِ راحت بھی دست یاب نہیں تھے، علم وعلما کے درمیان اور دینی فضا

(۱) اور بہ وقتِ اشاعتِ کتاب در ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ رحمۃ اللہ علیہ کیوں کہ ۲۲/ رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء کو وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

میں قیام کو بہ اِصرار ترجیح دیا۔

اُس موقع سے فخرِ ہند مُحدِّثِ عصر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نوّر اللہ مرقدہ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء — ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء) سے بھی یہاں تشریف لانے اور قیام فرمانے کی گزارش کی گئی تھی جو اُنھوں نے از راہِ نوازش قبول فرما کر شیخ ابوغدہ کے ساتھ طویل قیام فرمایا۔ علم و فضل اور حدیث و اَسماء الرجال کے اِن دونوں شہ بازوں کے قران السعدین اور اِجتماعی قیام کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ علم و کمال کی مینھ برس رہی ہے۔ ہر طرف علم و فن کی باتیں، علمائے سلف کے قصے، حدیث و اَسماء الرجال کے تذکرے، علمی نکتے اور لطیفے، مطالعہ و کتب بینی کے مشغلے؛ ان دونوں بزرگوں کے ہمہ وقت کے علمی و مذاکرتی انہماک کی وجہ سے، اِس طرح قائم ہو گئے تھے، جیسے علم و فکر کا موسمِ بہار آ گیا ہو، یا فیضانِ علمی و بخششِ آگہی کی بادِ بہاری چلنے لگی ہو۔

صبح سے ۱۲ بجے تک کے ہمہ روزہ درس میں، اکثر حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ[1] اور ندوے کے اونچے درجے کے طلبہ کے علاوہ زیادہ تر اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ شیخ ابوغدہ (جو دن میں اُصولِ حدیث اور بہ طورِ خاص شروطِ ائمہ خمسہ: بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی کا درس دیتے اور رات میں اکثر کوئی عام علمی محاضرہ اِلقا فرماتے) کا اَبرِ علم برستا تو ایک ساتھ گوہرِ زبان و بیان اور علم و آگہی کا یاقوت و مرجان لٹا جاتا اور سامعین کا دامن ایک ہی نشست میں کفِ باغ بان اور دامنِ گل فروش سے زیادہ بھرا پُرا نظر آنے لگتا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس موقع سے اپنی ڈائری سے ایک پیراگراف نقل کر دیا جائے، جو راقم نے آج سے کم و بیش ۱۸/ سال قبل (۲) شبِ یک شنبہ: ۱۳۹۹/۶/۲۹ھ مطابق ۱۹۷۹/۵/۲۷ء کو شیخ ابوغدہؒ کے درس کی ایک نشست میں شرکت کے بعد لکھا تھا۔

---

(۱) اور اب بہ وقتِ اشاعتِ کتاب در ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ۔ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء - ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء)

(۲) یعنی بہ وقتِ کتابتِ مضمون در عربی زبان۔

''ابھی ابھی محدثِ کبیر علامۂ جلیل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ استاذِ شریعتِ اِسلامی کالج امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض کے محاضرے اور درس میں شرکت کی سعادت سے بہرہ ور ہوکر واپس ہوا ہوں۔ شیخ علم وعمل کی جامعیت، سچے مومن کی تواضع، انکساری، بے نفسی اور رقتِ قلب کے اعتبار سے نہ صرف عالمِ عرب؛ بل کہ عالمِ اسلام کی بے نظیر شخصیت ہیں۔ ہر چند کہ اُن کا درس دراصل، اصولِ حدیث اور شروط ائمۂ خمسہ کے موضوع پر ہوا کرتا ہے؛ لیکن وہ فقہ وتفسیر، ادب ولغت، نحو وصرف، قراءت وتجوید، حکمتِ بیانی، طلاقتِ لسانی، لطیف اشاروں اور ماہرانہ رموز ونکات کا جامع ہوا کرتا ہے: جس سے درس دہندہ کی سلیقہ مندی، کثرتِ علم، وسعتِ مطالعہ، ژرف نگاہی، پختہ مغزی، طولِ تجربہ، فکر وفن سے گہری مناسبت اور اپنے موضوع پر دیرینہ ادھیڑ بن کے ساتھ ساتھ، راہِ اکتسابِ علم میں اُس کی شب بیداری اور شمع شعاری و پروانہ مزاجی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نیز اُن کی ذہانت، قوتِ حافظہ، کثرتِ محفوظات، طلبہ ومستفیدین کے سامنے مواد ومضامین پیش کرنے کے حوالے سے، اُن کی فن کاری اور چابک دستی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اِن سب چیزوں پر مستزاد اُن کی شریں بیانی، شگفتہ سخنی، فصاحتِ بیانی، بلاغت شناسی، حاضر جوابی اور ادب وظرافت کے عناصر سے مرکب اُن کی وہ زبان ہے، جس کے سامنے بہت سے پیشہ ور عربی ادیبوں اور خطیبوں کی صنعت کاری ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ عرصہ نو سال سے میں ندوے میں مدرس ہوں، لیکن اب تک میں نے آنے جانے والے کسی عربی ادیب وخطیب کی زبان میں وہ چاشنی، سلاست، نہر کی روانی، الفاظ کی شوکت، تعبیر کی لذّت، طرزِ ادا کی نزاکت، جملوں کی حلاوت نہیں دیکھی جو میں ابوغدہ کے یہاں کئی روز سے دیکھ رہا ہوں۔ پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندوں میں سے، جسے چاہتا ہے، اتنی بہت سی خوبیوں سے نواز دیتا ہے۔ اُن کا درس، سنجیدگی

ومزاح کا بھی حسین مخلوطہ ہوا کرتا ہے، علمائے سلف کے مسرت بخش لطیفوں سے مجلسِ درس کو زعفران زار بنائے رکھتے ہیں؛ لیکن ساتھ ہی جب بھی کسی عالمِ باکمال، زاہدِ اَوّاب، محدثِ جلیل، فقیہِ بابصیرت کا تذکرہ کرتے ہیں، یا اُن کے حصولِ علم کی داستان اُن کی زبان پر آجاتی ہے، یا راہِ علم میں بھوک پیاس سے بے پرواہو کر اور راستے کی درازی وخطرناکی سے بے خوف ہو کر اُن کے سفر کرنے کا حال سناتے ہیں، یا اُن کے بے نظیر اِخلاص، اپنے خدا اور اُس کے رسول سے اُن کی محبت وفنائیت کی طرف اِشارہ کرتے ہیں، تو وہ بار بار آب دیدہ وبے قابو ہو جاتے ہیں اور کئی کئی منٹ تک سلسلۂ درس منقطع ہو جاتا ہے۔

اِس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں، وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی، ستاروں کو عرقناک

ہم نے محسوس کیا ہے کہ وہ اِخلاص ووفا، رقّتِ قلب، علم وعمل، بے نفسی وخاکساری، حیا وخجالت، اِیمان ویقین، گدازی ونرم خوئی، دینی صلابت اور اِیمانی حرارت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہیں، یہ خصائل اب کبریتِ اَحمر کی طرح خواص وعلما میں بھی کم یاب ہیں۔ عوام وجہلا کا کیا ذکر"۔

منگل ۹؍رجب ۱۳۹۹ھ مطابق ۵؍جون ۱۹۷۹ء کو آٹھ بجے صبح، لکھنؤ کے ہوائی اَڈّے پر اُنھیں طلبہ واساتذہ کی بڑی تعداد نے، جس خلوص ومحبت وعقیدت کے ساتھ رخصت کیا تھا، اُس کی ہلکی سی جھلک میں نے اپنی ڈائری میں بہ روز جمعہ ۱۲؍۷؍۱۳۹۹ھ مطابق ۸؍جون ۱۹۷۹ء کو ریکارڈ کر لیا تھا۔ اُس کی چند سطریں نذرِ ناظرین کر رہا ہوں:

"۹؍رجب بہ روز منگل، لکھنؤ کے ہوائی اڈے پر عالمِ جلیل، مومنِ مخلص اور محدث ومحقق عبد الفتاح بن محمد بن بشیر ابو غدہ حلبی (ولادت: ۱۹۱۷ء) کو باچشم ہائے نم وبادل ہائے پرغم طلبہ واساتذہ کے جمِ غفیر نے الوداع کہا، بعض طلبہ وفورِ جذبات سے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، بڑی مشکل سے اُنھیں دلاسا دلایا

جاسکا۔ یہاں اپنی نو سالہ مدرسی کے دوران، میں نے پچاسوں علما وفضلا کو استقبال والوداع کہتے ہوئے دیکھا ہے؛ لیکن کسی کے تئیں یہ والہانہ عقیدت ومحبت دیکھنے کو نہیں ملی۔ یہاں ۱۲-۱۳ روزہ قیام کے دوران طلبہ واساتذہ نے جہاں اُن کے گوناگوں علم وآگہی اور فکر ونظر سے استفادہ کیا، وہیں لاشعوری طور پر اُن کی روحانیت وربانیت کے شیشۂ وجام سے بھی فیض یاب ہوے۔ ایمان واخلاص اور ہمت وعزیمت پر سان چڑھی، دلوں کا زنگ دور ہوا، عقل وخرد کو پاکیزگی ملی۔ کتب بینی، مطالعہ وعلم کوشی، شب و روز علمی انہماک اور اِفادے واستفادے کے بغیر کسی لمحے کے ضیاع سے گریز اور تمام اوقاتِ لیل ونہار کو علمی مباحثے، سوالات کے جوابات، علمی مسائل کی کھود کرید، کسی حاشیے کی تحقیق، کسی مغالطے کی تصحیح، کسی مضمون کی تیاری وتسوید میں، اُن کی عجیب وغریب مصروفیت سے (جس کا قصہ ہم دورِ آخر میں علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، حضرت حکیم الامت تھانویؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، علامہ سید سلمان ندویؒ وغیرہ کے متعلق سنتے آئے تھے) ایسا لگتا تھا کہ علم کا سوقِ عکاظ اور فکر ونظر کا ذوالمجنہ ومجاز قائم ہوگیا ہے اور امام ابوحنیفہ وامام شافعی ایسے اِمامِ عظیم کے شاگرد یا شاگرد کے شاگرد نے تعلیم وتدریس کی بساط بچھادی ہے"۔

ہندوستان میں علم کا شجرِ سایہ دار

۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء میں راقم الحروف کو ۵-۶ مہینے ریاض وحجاز میں قیام اور حرمین شریفین کی زیارت کی اولین مرتبہ سعادت حاصل ہوئی، جس کا عنوان جامعۃ الملک سعود ریاض میں عربی زبان کی تدریس کے سلسلے کے ایک پروگرام میں شرکت کرنا تھا۔ اِس موقع سے جہاں متعدّد علما واُدبائے عرب سے شرفِ ملاقات وتعارف حاصل ہوا وہیں علامہ ابوغدہ سے بھی ایک روز تادیر اکتسابِ فیض کی فرصت ملی۔

راقم الحروف نے اِس ملاقات کا تذکرہ اپنے سفرنامے بہ عنوان ''تین مہینے سعودی عرب اور جوارِ حرمین میں'' کی ساتویں قسط شائع شدہ ''الداعی'' مؤرخہ ۴-۱۹؍ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۰-۲۵؍ دسمبر ۱۹۸۳ء میں مختصر طور پر کیا تھا۔ اُس کے چند جملے یہاں درج کیے جاتے ہیں:

''شبِ جمعہ وشنبہ ۲۹؍ رجب ویکم شعبان ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۲-۱۳؍ مئی ۱۹۸۳ء کو چند احباب کے ساتھ علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ استاذ (کلیۃ اُصول الدین) جامعہ امام محمد بن سعود ریاض، سے اُن کی قیام گاہ واقع میدانِ دخنہ ریاض میں شرفِ ملاقات واستفادہ حاصل ہوا۔ شیخ، علماے ہند کے بڑے قدرداں اور علومِ کتاب وسنت میں اُن کی گیرائی وگہرائی کے اور اِسلامی علوم میں اُن کے متفردانہ رسوخ کے بے حد قائل ہیں، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ علامہ عبدالحی فرنگی محلیؒ، علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ وغیرہ کے بالخصوص بڑے مدّاح ہیں اور اُن کے علمی ترکے سے استفادے کا پیہم تعلق رکھتے ہیں۔ دیو بند اور اُس کے مکتبِ فکر کو ہندی مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، اِسی لیے جیسے ہی مجلس جمی شیخ نے دارالعلوم دیو بند کا اَحوال معلوم کرنا شروع کر دیا اور فرمایا کہ یہ ہندوستان میں ''علم کا شجرِ سایہ دار'' ہے اِس نے فکرِ اسلامی اور ثقافتِ دینی کی بے حساب خدمت کی ہے، ہم اِس کی بقا وترقی اور مزید فیض رسانی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ شیخ نے طلبہ واساتذہ کی تعداد، نئی تعمیرات اور کتب خانے میں موجود مخطوطات کی نئی فہرست کی تیاری کی بابت معلوم کیا۔ جب ہم نے یہ کہا کہ ہم لوگ اور اساتذہ وطلبۂ دارالعلوم آپ سے حد درجہ محبت وعقیدت رکھتے ہیں، تو فرمایا کہ مجھے دارالعلوم سے نا قابلِ بیان محبت ہے اور میں تو اُس کے علما ومشایخ کا خوشہ چیں رہا ہوں۔ اِس موقع سے شیخ نے اپنی ایک غلط فہمی کا اِظہار فرمایا کہ آپ کے ہاں عربی زبان وادب کے ایک

فاضل ہیں، میں اُن کا بہت مدّاح ہوں؛ لیکن معلوم ہوا ہے کہ وہ دارالعلوم کو چھوڑ کر سعودی سفارت خانے میں منتقل ہو گئے ہیں، اُن کا نام مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ہے، عرض کیا گیا کہ شیخ! آپ کو اِس سے غلط فہمی ہوئی ہوگی کہ اُن کے بھائی مولانا عمید الزماں کیرانوی عرصے سے وہاں ملازم ہیں اور نام کے تشابہ اور کیرانوی کے اشتراک سے آپ نے یہ سمجھ لیا ہوگا۔ فرمایا الحمدللہ! مجھے اِس غلط فہمی سے بے حد تکلیف تھی، وہ بڑے ذہین، قادر الکلام اور عربی کے باصلاحیت اہلِ قلم ہیں، اُنھیں دارالعلوم ہی میں رہنا چاہیے، ہندوستان واپسی پر اُنھیں میرا سلام ضرور پہنچا دیجیے۔

مولانا بدرِ عالم میرٹھی اور ایک عرب بدو کا واقعہ

اِس موقع سے شیخ نے اپنی تحقیق کے ساتھ طبع شدہ ابن قیم الجوزیہ متوفی ۷۵۱ھ کی کتاب "المنار المنیف في الصحیح والضعیف" حقیر کو ہدیہ کی۔ ناچیز نے اُن سے ہدیے کے الفاظ اپنے قلم سے تحریر فرما دینے کی درخواست کی تو انھوں نے صحیح اور مکمل نام معلوم کیا۔ راقم نے (نور عالم خلیل الامینی) بتایا تو گراں قدر دعا دی کہ خدا آپ کو ہدایت کا نور اور تاریکیوں کو کافور کرنے والا بنائے۔ پھر ایک دلچسپ قصّہ سنایا کہ آپ لوگ علامہ بدرِ عالم میرٹھی کو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ وہ دارالعلوم کے ایک ذی علم فاضل اور ہندوستان کے کبارِ علما میں تھے۔ ایک روز وہ مسجدِ نبوی میں مُواجہہ شریف میں بیٹھے ہوے تھے کہ ایک عربی بدو آیا، اُس نے صلاۃ وسلام کے بعد اُن کو سلام کیا اور اُن سے مُتعارِف ہونا چاہا اور بدویانہ لہجے میں پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ آپ نے "بدرِ عالم" بتایا تو اُس نے ناز واعتماد کے عجیب وغریب ایمان افروز و محبت فروز لہجے میں کہا: "نہیں تم بدرِ عالم (دنیا کا ماہِ تمام) نہیں ہو سکتے، دنیا کا ماہِ تمام اور بدرِ عالم تو یہ ہیں۔ اُس نے حضور اکرم اَرواحنا فداہ ﷺ کی قبرِ اَطہر کی طرف

اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مولانا بدرِ عالم پر اِس کاشفِ حقیقت جملے سے جذب و مستی کی کیفیت طاری ہوگئی، وہ دیر تک سر دھنتے اور واہ واہ کرتے رہے۔

اَز دِل خیزد، بر دل ریزد

۲۹-۳۱/ مارچ ۱۹۸۵ء کو دار العلوم حیدر آباد میں "حدیث و سیرتِ نبوی" کے موضوع پر عالمی مجلسِ مذاکرہ منعقد ہوئی اُس میں یہ راقم بھی مدعو تھا، اُس میں امامِ حرم شیخ عبد الرحمٰن السدیس اور دیگر عربی وفود کے ساتھ، ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے شیخ ابوغدہ بھی تشریف لاکر مجلس کی رونق و وقار کا سبب بنے، ایک نشست میں سیرتِ نبوی کے موضوع پر اُن کی پر مغز و برجستہ تقریر ہوئی، عربی زبان کو سمجھنے اور نہ سمجھنے والے دونوں طرح کے سامعین؛ مقرر کے حسنِ بیان، فصاحت و بلاغت کے عطر و عنبر سے ڈھلی ہوئی اور حبِ نبوی سے منور زبان سے حد درجہ مُتاثّر ہوے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اُن کی تقریر برجستہ اور اچانک ہوگی ورنہ ٹیپ کرنے کا انتظام ضرور کرتا۔ تقریر کے بعد اُن سے ملنے کو بڑھا، میں نے علیک سلیک کے بعد شیخ سے پوچھا کہ شاید آپ مجھے نہیں پہچان سکے ہوں گے فرمایا: وَمَنِ الَّذِيْ لَا يَعْرِفُكَ مِنَ الْمُثَقَّفِيْنَ الَّذِيْنَ يُتَابِعُوْنَ الدَّاعِيْ" "الداعی" کو پابندی سے پڑھنے والا کون لکھا پڑھا آمی ہوگا جو آپ کو نہ جانے؟ پھر اپنے ساتھ ہی اپنی قیام گاہ پر چلنے کا حکم فرمایا، اِس طرح اپنے کئی احباب کے ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے تک اُن کی بزمِ منور سے بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا۔

۲۴-۲۶/ صفر ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۹-۳۱/ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو دار العلوم دیوبند نے عالمی مؤتمر برائے تحفظِ ختمِ نبوت کے انعقاد کا فیصلہ کیا، تو رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اُس وقت کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف (اور بعد میں دگر سرکاری و نیم سرکاری عہدوں کے حامل) کو مؤتمر کے افتتاح کے لیے اور علامہ ابوغدہ کو اُس کی صدارت کے لیے مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے راقم الحروف نے دیگر

اور بھی عرب فضلا کو خطوط لکھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہ خوشی دعوت کو قبول فرمایا؛ لیکن سابقہ مشاغل کی وجہ سے ۳۱/ اکتوبر کی نشست میں رونق افروز ہو سکے اور گراں قدر خطاب سے جلسے کی معتبریت میں اِضافہ فرمایا۔ اُن کی مکمل تقریر اور دارالعلوم کی طرف سے اُن کو دیے گئے سپاس نامے کا متن ''الداعی'' کے خصوصی شمارہ ''ختم نبوت'' مورخہ ۱۰-۲۵/ نومبر و ۱۰-۲۵/ دسمبر ۱۹۸۶ء کے مشترکہ شمارہ میں پڑھا جا سکتا ہے۔

شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی پہلے سے طے شدہ ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے شریکِ موتمر نہ ہو سکے، جس کا اظہار اُنھوں نے مہتمم صاحب کے نام معذرت نامے میں کیا تھا، اُن کا یہ مکتوبِ گرامی اُن کی تقریر ہی کی طرح اُن کی شگفتہ نگاری اور اُن کی انشا و تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو ترجمے میں چوں کہ اُس کی خوبیوں کو کماحقہ منتقل نہیں کیا جا سکتا، اِس لیے اُسے قلم انداز کیا جاتا ہے۔ ''الداعی'' کے مذکورہ ختمِ نبوّت نمبر میں اُس کا مکمل عربی متن محفوظ ہے، وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

رابطۂ عالم اِسلامی کی تیسری عمومی اِسلامی کانفرس اور لازوال مُقدّس و بابرکت یادیں

حیدر آباد کی ملاقات کے بعد طویل عرصے تک شیخ کی زیارت سے محروم رہا، تا آں کہ ۱۸-۲۲/ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱-۱۵/ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو رابطۂ عالم اسلامی نے مکہ مکرمہ میں تیسری عمومی اِسلامی کانفرنس منعقد کی، جس میں دنیا کے سات سو سے زیادہ علما و مفکرین اور اہلِ علم و صحافت مدعو تھے، ہندوستان سے بھی مدعووین کی ایک قابلِ لحاظ فہرست تھی، جن میں سرِ فہرست رابطے کے رکن تاسیسی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ(۱) تھے۔ دارالعلوم دیو بند سے وابستہ افراد میں راقم الحروف اور

---

(۱) اوراب بہ وقتِ اشاعتِ مضمون بہ شکلِ کتاب رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ (۱) بھی مدعو تھے۔

رابطے نے مہمانوں کے قیام کے لیے ہوٹل اِنٹر کانٹینینٹل (جس کے قاعة التضامن الإسلامي میں مؤتمر کے تمام پروگرام ہوے) جو حرم سے خاصے فاصلے پر ہے، نیز فندق الجیاد میں انتظام کیا تھا، آخر الذکر ہوٹل حرم پاک سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا، خوش قسمتی سے راقم الحروف کو حرمِ پاک سے متصل اِسی ہوٹل میں جگہ ملی، جس سے کعبۃ اللہ کا بار بار طواف اور حرم میں پنج وقتہ نماز کی ادائیگی میں سہولت رہی، فالحمد لله علی ذلك۔

اتفاق سے اِسی ہوٹل میں شیخ ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کی فِرودگاہ بھی تھی اور مؤتمر گاہ آتے جاتے ہوے اکثر ایک ہی بس یا کار میں جگہ مل جاتی تھی، میرے لیے یہ انتہائی سعادت کی بات تھی کہ خدا کے اِس مقدس ترین شہر اور خانۂ خدا کے پڑوس میں ہونے والی اِس کانفرنس کے طفیل میں بڑے بڑے علما و دانش وروں کے ساتھ ساتھ، شیخ ابوغدہ ایسے علامۂ یگانہ و خدا رسیدہ اور مُحِبِّ رسول و عاشقِ علم و علما کی طویل صحبت اور پیہم ملاقاتوں کی فرصت نصیب رہی۔ حسنِ اتفاق سے ہوٹل میں اُن کا اور میرا کمرہ ایک ہی منزل پر واقع تھے؛ اِس لیے اُن کی فرصت کے اوقات میں بھی اپنے بعض احباب کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اُن کے بحرِ علم و کمال کی موج ہائے بے پناہ کا تماشا ہی سہی، دیکھ کر دل کو فرحت اور دماغ کو لطف ملتا۔

حیف کہ اِس کے بعد شیخ سے کبھی ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہوسکی، کئی بار، ریاض جانا ہوا؛ لیکن میری حاضری کے وقت وہ اتفاقاً وہاں موجود نہ ہوتے کسی علمی اور ضروری سفر پر ہوتے۔

---

(۲) اور اب بہ وقتِ اِشاعتِ مضمون بہ شکل کتاب رحمۃ اللہ علیہ؛ اِس لیے کہ بہ روز دوشنبہ: ۷رمحرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۶ر فروری ۲۰۰۶ء کو انتقال فرما گئے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شد

حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ) کا برابر اِصرار رہا اور ہم اَساتذۂ دارالعلوم کی خواہشِ بے پناہ بھی کہ شیخ کو دارالعلوم میں کسی موقع سے ایک دو ماہ کے لیے بلایا جائے؛ تا کہ طلبہ واساتذہ اُن سے استفادہ کر کے اپنے مشائخ واکابر سے فیض یاب ہونے کی یاد تازہ کر سکیں؛ لیکن ہم لوگ یہ سوچتے ہی رہے، آج کل کرتے کرتے وقت بہت آگے نکل گیا اور شیخ کی عمرِ عزیز کا قافلۂ سبک خرام رواں دواں اپنی منزل کو جالیا۔ وقت کس کا انتظار کرتا ہے؟ اور لیل ونہار کی گردش کس کے لیے تھمتی ہے؟ رہے نام اللہ کا۔

خدا اُنھیں صلحا و اَتقیا اور اپنے برگزیدہ اَنبیا کے ساتھ جنت الفردوس کا مکیں بنائے اور اُن کے تمام اَعزّا واَقربا، تلامذہ ومحبین، متعارفین ومتعلّقین اور اُن کے لیے دعا کنندہ کو صبر جمیل دے اور اَجر جزیل سے نوازے۔ اے خدا ہم تجھی سے سہارا لیتے اور تیری طرف رجوع ہوتے ہیں اور تیری ہی حضور میں ہمیں جانا ہے۔ خدا کا درود وسلام اور رحمت وبرکت نازل ہو ہمارے حضرت، ہمارے نبی، ہمارے شفیع محمد پر، اُن کی آل واولاد پر اور اُن کے تمام اصحاب پر۔ ساری تعریفیں صرف سارے جہان کے پالن ہار کے لیے ہے۔

مختصر سوانحی خاکہ

۞ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ بن محمد بن بشیر بن حسن، ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء میں ''سیریا'' یعنی ملکِ ''شام'' کے شمالی شہر ''حلب'' میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب صحابیِ رسول خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اُن کے خاندان میں مکتوبہ شکل میں شجرۂ نسب محفوظ ہے۔ ''حلب'' کے علما ومشائخ سے کسبِ علم کیا، خصوصاً مدرسہ خسرویہ عثمانیہ میں جو اِس وقت ''مدرسہ ثانویہ شرعیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں سے ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء میں فارغ ہوئے۔ پھر مدرسۂ علم وثقافت ''قاہرہ'' کا

رخ کیا اور ''جامعہ ازہر'' سے ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء میں علوم شرعیہ میں سندِ فراغ حاصل کی اور وہیں سے ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۵۰ء میں کلیۃ اللغۃ العربیہ سے اُصولِ تدریس میں اختصاص کی سند حاصل کی۔

❁ شیخ کے بعض تلامذہ نے لکھا ہے کہ اُن کی روحانی تشکیل وتعمیر میں جن صاحبِ تاثیر علما کا بہ طور خاص حصّہ رہا ہے اُن میں علامہ وفقیہہ ومُربّی شیخ عیسیٰ بیانوی حلبی متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء مدفون بہ جنت البقیع مدینۂ منورہ، علاّمہ ومُحدِّث ومؤرخ وادیب شیخ محمد راغب طبّاخ حلبی متوفی ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء اور فقیہہ ولغوی علامہ مُصطفیٰ الزّرقا حلبی مدظلہ(۱) سرفہرست رہے ہیں۔

❁ ''جامعہ ازہر'' میں علامہ ابوغدّہ نے ایسے یگانۂ روزگار علما ومشایخ کے سامنے زانوے تلمّذ تہ کیا، جن کی نظیر اَب ''جامعہ ازہر'' میں یا دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ اُن میں قابلِ ذکر فیلسوفِ اسلام شیخ یوسف دجوی متوفی ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۴ء اور شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری متوفی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء، محدثِ جلیل علامہ احمد محمد شاکر متوفی ۱۳۷۸ھ/ ۱۹۵۸ء اور علاّمہ واُصولی ولغوی شیخ الازہر محمد الخضر حسین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین، ہیں۔

❁ قاہرہ میں جس شخصیت نے اُنھیں سب سے زیادہ مُتاثّر کیا اور جس کا اُن کے اوپر سب سے زیادہ رنگ چڑھا اور جس کی محبت وعقیدت اُن کے دل میں گھر کر گئی اور زندگی بھر اُس کے سحر میں گرفتار اور اُس کے فکر ونظر کے قدح خوار رہے وہ امام وقت، علامۂ زماں، مُحدِّثِ دوراں محمد زاہد الکوثریؒ متوفی ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۱ء کی شخصیت تھی۔ علامہ کوثری بھی علامہ ابوغدہ کی ذہانت، ذوقِ مطالعہ، شوقِ طلب اور جنونِ جستجو سے بہت مُتاثّر تھے، حتی کہ اگر حاضری میں زیادہ ناغہ کرتے، تو اُنھیں شاق گزرتا اور اِس سلسلے میں اُنھیں مُتنبّہ کرتے۔

❁ علامہ ابوغدہ کی زندگی وحالات کا مطالعہ کرنے والے اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ علامہ کے ہاں جو علمی تنوّع تھا، تحصیلِ علم میں زندگی بھر جو انہماک، لگن اور جاں سوزی رہی تھی، وہ اُن کے اندر علامہ کوثری ہی کی صحبت اور نفسِ گرم کی تاثیر تھی؛ کیوں کہ کوثریؒ بہت سارے علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔

❁ مصر میں علامہ نے میرِ کارواں امام حسن البنا شہید (ش ۱۹۴۹ء) کی نگہ بلند، سخنِ دل

(۱) اور اب بہ وقتِ اشاعتِ مضمون بہ شکلِ کتاب در ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ: وفات بہ روز شنبہ: ۳/ جولائی ۱۹۹۹ء مطابق ۱۹/ ربیع الاول بہ تقویم عربی، و۱۸/ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ بہ تقویم برِصغیر۔

نواز اور جانِ پرسوز سے رختِ سفر حاصل کیا، اُن کی اخوان المسلمون کے فکر ونظر کو اپنایا اور تا دمِ زندگی، عالمِ عرب کی نشأتِ ثانیہ کی اِس سب سے بڑی اور طاقت ور و ذی تاثیر جماعت وتحریک کے اعلیٰ قائدین میں اُن کا شمار رہا اور اپنے ملک کے اِخوانیوں کو نازک وقتوں میں نہ صرف سہارا دیا؛ بل کہ اُن کے قلب وعقل کو اپنے شرر ِشعلۂ محبت سے نئی زندگی بخشی۔

۞ مصر سے توشۂ علم وآگہی اور زادِ عشق ومستی ونظرِ حکیمانہ، گفتارِ دل برانہ اور کردارِ فاتحانہ کے ساتھ، اپنے وطن ''سیریا'' واپس آئے تو وہ یہاں کے اخوانیوں کی دعوتی، فکری اور تحریکی زبان اور اُن کے جذبات واحساسات کے ترجمان بن گئے۔ اُن کی علمی گیرائی وگہرائی، فرزانگی، وسعتِ قلبی، روشن ضمیری، حق گوئی وبے باکی، اندیشۂ شاہیں صفت اور سوز وتب وتاب کی وجہ سے اِخوانی اُن کے گرد اکٹھا ہوگئے اور وہ اُن کے ملجا وماویٰ بن گئے۔ باوجودے کہ وہ شہیدِ علم تھے اور علمی، دعوتی اور تصنیفی ومطالعاتی اشغال اُن کا اوڑھنا بچھونا تھے؛ لیکن وقت کی نزاکت نے اُنھیں کئی مرتبہ اِخوان کی انتظامی ذمہ داریوں کو اٹھانے پر بھی مجبور کیا؛ لیکن جلد ہی کسی لائق فرد کے سپرد کر کے سکندری پر، قلندری کو ترجیح دیتے رہے۔ ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء میں ایک مرتبہ پھر اُنھیں ''سیریا'' کی اخوان کا مُراقبِ عام بننا پڑا؛ لیکن ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء میں اُنھوں نے ڈاکٹر حسن ہویدی کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔

۞ اِخوان پسندی اور اخوانیوں کے ساتھ اِسلام ومسلمانوں کے مسائل کو اٹھانے اور سیریا (شام) جیسے خاص اسلامی وعربی ملک میں احکامِ اسلام کی پامالی کے خلاف آواز بلند کرنے کی وجہ سے ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء میں اُنھیں دعاۃ ومُفکِّرین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا اور ''تدمر'' کے صحرائی جیل میں وہ گیارہ (۱۱) ماہ تک قیدر ہے؛ لیکن ۵؍جون ۱۹۶۷ء مطابق ۲۶؍ربیع الاول ۱۳۸۷ھ کے اَلمیے کے بعد (جس میں اِسرائیل کے مقابلے میں عربوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور بیت المقدس نیز دریائے اردن کے مغربی کنارے اور صحراے سینا پر، اِسرائیل کے قبضے کا وہ حادثۂ جاں کاہ پیش آیا، جس کا زخم اب ناسور بن چکا ہے اور ذلت ورسوائی کا جو تسلسل ہنوز جاری ہے وہ اِسی غیرت شکن حمیّت سوز شکست کی دین ہے) اُنھیں اور اُن کے ساتھ قید علما ومفکرین کو رہائی نصیب ہوئی تھی۔(۱)

(۱) اخوان المسلمون، سیریا کا تعزیتی بیان، المجتمع کویت، شمارہ ۱۸؍۱۰؍۱۴۱۷ھ مطابق ۲۵؍۲؍۱۹۹۷ء۔

۞ ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں اُنھیں سیریائی پارلیامنٹ کا ممبر مُنتخَب کیا گیا، جو گویا سیریائی عوام کی طرف سے اُن کے حق میں خراجِ محبت تھا۔ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء میں ''سیریا'' کی وزارتِ معارف کی طرف سے منعقدہ مسابقۂ مدرسینِ تربیتِ اسلامی میں حصّہ لیا اور تمام شرکا میں نمبر ایک رہے۔ ''حلب'' کے مدارس ثانویہ میں ۱۱ر سال تک تربیتِ اسلامی کا مضمون پڑھایا نیز اُس مضمون کی درسی کتابوں کی تیاری میں سرگرم طور پر حصہ لیا؛ اِسی کے ساتھ ساتھ تربیتِ ائمہ ودعاۃ کے مدرسے موسوم بہ ''مدرسہ شعبانیۃ'' اور ''ثانویہ شرعیۃ'' یعنی سابق مدرسہ خسرویہ (جہاں اُنھوں نے خود بھی تعلیم حاصل کی تھی) میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ پھر اُنھیں دمشق یونیورسٹی کے کلیۃ الشریعہ کا استاذ مُنتخَب کیا گیا، جہاں تین سال تک اُصول فقہ، فقہِ حنفی، فقہِ مذاہب اربعہ کے مضامین پڑھائے اور ''معجم فقه المحلى لابن حزم'' کی تکمیل کی، جسے دمشق یونیورسٹی نے دو جلدوں میں شائع کیا۔

۞ اِس کے بعد وہ ۲۳ر سال ریاض سعودی عرب کی دونوں اہم جامعات میں تدریسی خدمات پر مامور رہے؛ چناں چہ ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۵ء تا ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء جامعہ اسلامیہ امام محمد بن سعود میں اور ۱۴۰۸ھ تا ۱۴۱۱ھ/۱۹۸۸ تا ۱۹۹۱ء جامعۃ الملک سعود میں وہ حدیث شریف کے ہر دل استاذ رہے۔ اِس مدت میں ہزاروں طلبہ نے اُن کے خوانِ علم سے خوشہ چینی کی۔ بعض حلقوں کی طرف سے اُن کے حنفی واِخوانی مذاق ومزاج اور زاہدانہ وصوفیانہ فکر ونظر کی وجہ سے اَذِیّت رسانی کا ارتکاب بھی کیا گیا؛ لیکن علمائے سلفِ صالحین کی طرح اُنھوں نے صبر واحتساب سے کام لیا اور مذکورہ حلقے کے جدال پسند ونقاش پیشہ وتنگ نظری شعار وسلامت روی بیزار علما کی طرح کبھی انتقامی کارروائی کی نہیں سوچی؛ بل کہ اپنا معاملہ صرف اپنے ربِّ شکور کے سپرد کر کے یک سو ہو گئے اور اپنے کردار، اپنے علمی مقام، اپنی گراں مایہ وبے نظیر علمی ودینی خدمات کو خدا اور خلقِ خدا کے روبہ رو شہادتِ ناطقہ رہنے دیا۔

علامہ کی اہم تالیفات وتحقیقات

تصنیف کردہ کتابیں

۱- صفحات من صبر العلماء على شدائد العلم والتحصيل ۴ ایڈیشن

٢– العلماء العزّاب الذی آثروا العلم علی الزواج ۴ ایڈیشن

٣– قیمة الزمن عند العلماء ۶ ایڈیشن

٤– الرسول المعلّم وأسالیبه في التعلیم

٥– لمحات من تاریخ السنة وعلوم الحدیث ۲ ایڈیشن

٦– أمراء المؤمنین في الحدیث

٧– الإسناد من الدین ومعه : صفحة مشرقة من تاریخ سماع الحدیث عند المحدثین

٨– السنّة النبویّة وبیان مدلولها الشرعي

٩– تحقیق اسمي الصحیحین واسم جامع الترمذي

١٠– منهج السلف في السؤال عن العلم وفي تعلیم ما یقع ومالم یقع

١١– من أدب الإسلام

١٢– نماذج من رسائل أئمة السلف وأدبهم العلمي

١٣– کلمات في کشف أباطیل وافتراء ات

١٤– مسألة خلق القرآن وأثرها في صفوف الرواة والمحدثین وکتب الجرح والتعدیل

تحقیق کردہ کتابیں

١– الرفع والتکمیل في الجرح والتعدیل — علامہ عبدالحی فرنگی محلی — ۳ ایڈیشن

٢– الأجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الکاملة — علامہ فرنگی محلی — ۲ ایڈیشن

٣– تحفة الأخبار بإحیاء سنة سید الأبرار — علامہ فرنگی محلی

٤– نخبة الأنظار علی تحفة الأخبار — علامہ فرنگی محلّی

٥– المنار المنیف في الصحیح والضعیف — امام ابن قیم جوزیہ — ۵ ایڈیشن

٦– المصنوع في معرفة الحدیث الموضوع — ملاعلی قاری — ۳ ایڈیشن

٧– قواعد في علوم الحدیث — شیخ ظفراحمد تھانوی — ۶ ایڈیشن

کتاب	مصنف	ایڈیشن
٨- قاعدة في الجرح والتعديل	تاج الدین سبکی	۵ ایڈیشن
٩- المتكلمون في الرجال	حافظ سخاوی	۴ ایڈیشن
١٠- ذكر من يعتمد قوله في الجرح والتعديل	حافظ ذہبی	
١١- الموقظة في علم مصطلح الحديث	حافظ ذہبی	۲ ایڈیشن
١٢- قفر الأثر في صفو علم الأثر	ابن الحنبلی	
١٣- لغة الأريب فى مصطلح آثار الحبيب	حافظ زبیدی	
١٤- جواب الحافظ المنذري عن أسئلة في الجرح والتعديل		
١٥- توجيه النظر إلى أصول الأثر	شیخ طاہر جزائری	
١٦- ظفر الأماني في شرح مختصر الجرجاني	علامہ فرنگی محلی	
١٧- كشف الالتباس عما أورده الإمام البخاري على بعض الناس	الغنیمی	
١٨- مكانة الإمام أبي حنيفة في الحديث	مولانا نعمانی	
١٩- التبيان لبعض المباحث المتعلقة بالقرآن	علامہ جزائری	
٢٠- تصحيح الكتب وصنع الفهارس المعجمة	علامہ احمد شاکر	
٢١- تحفة النساك في فضل السواك	علامہ میدانی	
٢٢- العقيدة الإسلامية التي ينشأ عليها الصغار	ابوزید قیروانی	
٢٣- الحلال والحرام وبعض قواعدهما في المعاملات المالية	شیخ الاسلام ابن تیمیہ	
٢٤- رسالة المسترشدين	امام حارث محاسبی	۷ ایڈیشن
٢٥- التصريح بما تواتر في نزول المسيح	علامہ محمد انور شاہ کشمیری	۵ ایڈیشن
٢٦- الإحكام في تمييز الفتاوى عن الأحكام وتصرّفات القاضي والإمام	امام قرافی	۲ ایڈیشن
٢٧- الترقيم وعلاماته	احمد زکی پاشا	

٢٨- سباحة الفكر بالجهر بالذكر	علامہ فرنگی محلی
٢٩- قصيدة " عنوان الحكم "	لأبي الفتح البستي
٣٠- رسالة الألفة بين المسلمين	امام ابن تیمیہ
ومعها رسالة في الإمامة	امام ابن حزم ظاہری
٣١- إقامة الحجة على أن الإكثار من التعبد ليس بدعة	علامہ فرنگی محلی
٣٢- فتح باب العناية بشرح كتاب النقاية "فقہ حنفی"	ملا علی قاری
٣٣- فقه أهل العراق وحديثهم	علامہ زاہد کوثری
٣٤- خلاصة تهذيب الكلام في أسماء الرجال	حافظ خزرجی(١)



(١) عربی تحریر شائع شدہ "الداعی" عربی، شمارہ ١١، جلد ٢٠، ذی قعدہ-ذی الحجہ ١٤١٧ھ مطابق اپریل ١٩٩٧ء، کالم "کلمۃ العدد/ اداریہ" اردو تحریر بہ قلم خود، شائع شدہ "ترجمان دار العلوم" نئی دہلی، و "ندائے شاہی" مراد آباد، و "اخبار مشرق" کلکتہ وغیرہ۔

داعی، مفکر اور منفرد اسلامی اہلِ قلم

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ

۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء — ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء

اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیِ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جس کی چشمِ گوہر بار کے

رفتید ولے نہ از دلِ ما

دوشنبہ ۲۷/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۵/مئی ۱۹۹۷ء کو تقریباً ساڑھے آٹھ بجے، شہر مظفر پور سے، میں نے دیوبند میں اپنے اہلِ خانہ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ آج ''ویشالی اکسپریس'' سے دہلی کے لیے روانہ ہورہا ہوں، اِن شاء اللہ کل علی الصباح دہلی اور دہلی سے ایک بجے چھوٹنے والی لدھیانہ سپر فاسٹ سے، ساڑھے تین بجے کے قریب دیوبند پہنچ جاؤں گا۔ ریسیور ہاتھ سے رکھنے سے پہلے، میں نے یوں ہی چلتے چلاتے پوچھ لیا کہ اور کوئی قابلِ ذکر بات تو نہیں؟ تو اہلیہ نے بتایا کہ ہاں، لکھنؤ میں کوئی مولانا منظور نعمانی تھے، اُن کا آج شب میں وہاں کے کسی نرسنگ ہوم میں ۸ بج کر ۳۴ منٹ پر انتقال ہوگیا ہے، دارالعلوم کے مناروں سے آج رات سے ہی بار بار اُن کی وفات کی خبر دی جارہی ہے، اِس وقت دارالعلوم میں ایصالِ ثواب اور تعزیتی جلسہ ہورہا ہے۔

میں نے ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھتے ہوئے، کانپتے ہوئے ہاتھ سے

ریسیور رکھ دیا۔ سوچنے لگا کہ اِن کے لیے تو ''کوئی مولانا منظور نعمانی تھے'' جن کا انتقال ہوگیا ہے؛ لیکن میرے لیے اور تمام ملتِ اسلامیہ کے لیے یہ کتنا بڑا سانحہ ہے؟! کتنے بڑے، کتنے مشہور، مولانا کا انتقال ہوگیا ہے؟ کیسا دیا بجھ گیا ہے اور کتنی تاریکی بڑھ گئی ہے؟ میں اُس غیر مسلم ''ایس ٹی ڈی' والے کے یہاں خاصی دیر تک اِسی سوچ میں کھویا، ایک طرف کو پڑی ہوئی بنچ پر بلا اِرادہ بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ میرے گاؤں کے دو ایک صاحبان جو تھے، وہ میرے اَلم آمیز تاثُّرات کو پڑھنے کے لیے میرے چہرے پر بار بار سوالیہ نظریں ڈال رہے تھے؛ پھر اُنھوں نے یہ کہہ کر میری خاموشی توڑ دی کہ اِن صاحب (ایس ٹی ڈی والے) کا حساب تو چکا دیجیے اور ہاں: اب ہمیں اسٹیشن کی راہ لینی چاہیے، دیگر ہم سفر شدّت سے انتظار کر رہے ہوں گے۔

سفر کی حالت میں ایک ایسے زبردست عالمِ باعمل ومفکرِ باکمال کے انتقالِ پُرملال کی اچانک خبر سے (جن سے دیرینہ وگوناگوں تعلقات کی بنا پر ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ایک شفیق باپ اور ہمدرد مربی ہیں) دل کو جو دھچکا لگا اُس کو الفاظ میں کیوں کر بیان کیا جائے؟ مظفر پور سے دہلی اور دہلی سے دیوبند تک کا سفر ذہنی کستگی وقلبی شکستگی کے ساتھ ہوا۔ دہلی میں اردو اخباروں کی تلاش رہی کہ دیکھیں اُن میں مولانا نعمانی کی وفات کے حوالے سے آج کیا چھپا ہے؟ ''ہمارے ایک عزیز ۶رمئی ۱۹۹۷ء کا قومی آواز لے آئے۔ اُس میں صفحہ اول پر نمایاں سرخی کے ساتھ دارالعلوم میں ہونے والے کل کے تعزیتی جلسے کی مختصر روداد کے ساتھ یہ خبر تھی کہ دارالعلوم کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ دارالعلوم کے دو ایک اساتذہ کے ساتھ، مولانا نعمانیؒ کے اَعِزّا سے تعزیت کے لیے ۶رمئی کو ہی لکھنؤ روانہ ہوگئے ہیں۔

یہ سوچ سوچ کر غم اور دوبالا ہو جاتا کہ اپنی خوبیوں کے اعتبار سے ایسے عالم یگانہ ومصنفِ بے بدل سے ہماری ملت جو محروم ہوگئی ہے، تو اُس کا اب کیا ہوگا؟ مولانا نعمانی جیسا عالم (جس نے اپنی تابناک علمی وقلمی خدمات سے ملت کا دامن بھر دیا ہو؛ جس کی

شخصیت خدائے پاک کی توفیقِ خاص کی دین ہو؛ بہت سے علمائے ربانیین کی دعاؤں اور تمناؤں کا ثمرہ ہو؛ جس کو سال ہا سال کی ریاضت و مجاہدے، فکر و نظر کی ہلچل اور سعی و عمل کی تابانی نے تراشا ہو) ملت کو اب کیوں کر نصیب ہو سکتا ہے؟۔ اِدھر چند سالوں کے دوران پرانی نسل کے وہ سارے علما، جو ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہ بانی اور جسمِ اسلامی کو خونِ تازہ کی فراہمی کی معززانہ ذمہ داری کو بہ حسن و خوبی انجام دے رہے تھے؛ یکے بعد دیگرے ہمیں بے سہارا کرتے چلے گئے۔ آزادی کے بعد کے روز بہ روز پیچیدہ تر ہوتے جارہے حالات میں، اِن بزرگوں کا وجود اِس دیار کے مسلمانوں کے لیے ''قندیلِ رہبانی'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ نازک حالات کی بے رحم تاریکیوں میں انھی کی فکری فیض بخشی کے طفیل راہِ صواب کی راہ نمائی حاصل کر لیتے اور بہت مرتبہ سر پر آئے ہوئے خطروں سے نہ صرف دھر اور سر کو بچا لے جانے کا جتن کرتے رہے؛ بل کہ فکر و نظر اور عقیدہ و شناخت کی شہ رگ کو ہر قسم کے خراش سے بھی محفوظ کیے رہے۔

مولانا نعمانی کی عظمت

مولانا نعمانیؒ نے دار العلوم دیو بند میں ایسے علمائے نام دار کے سامنے زانوے تلمّذ تہ کیا، جو عالم میں انتخاب اور علم و عمل کے آفتاب و ماہ تاب تھے۔ علم و عمل کی جامعیّت کے اعتبار سے اِس وقت اُن کی نظیر نہ صرف برِّ صغیر میں؛ بل کہ پوری دنیا میں نہیں مل سکتی۔ آج علم کی ''سرکشی'' اور معلومات کی ''دھماکہ خیزی'' و ''رستا خیزی'' کا دور ہے۔ عقل نے قلب کے خلاف اور علم نے عشق کے خلاف ''مسلح'' کام یاب اور افسوس ناک ''بغاوت'' کر رکھی ہے۔ ''زبانِ ہوش مند'' ''دلِ روشن'' پر غلبہ پایا چاہتی ہے اور مادّیت اپنے تمام کرّ و فر کے ساتھ روحانیت سے برسرِ پیکار ہے۔ سب سے زیادہ خطرے کی بات یہ ہے کہ بہت سی جگہ اور بہت سی مرتبہ اول الذکر، ثانی الذکر پر اُسی کی شکل و صورت میں حملہ آور ہوتی رہتی ہے؛ اِس طرح ''من کی دنیا'' کے مخلصوں اور ''تن کی

دنیا'' کے اہل کاروں میں بہت سے ظاہر بینوں کے لیے فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

لیکن مولانا نعمانی نے، جن برگزیدہ علماے یگانہ سے کسبِ فیض کیا، اُن کی اِخلاص وللّٰہیت کی قسم کھائی جاسکتی ہے؛ وہ بلاشبہہ صحابہ صفات تھے۔ دنیا کے موجودہ چوکھٹے میں اُن کی نظیر تو کیا کوئی تصویر بھی نظر نہیں آتی۔ جو اُن کے پروردہ، اُن سے فیض یافتہ اور اُن کی خوبیوں میں رچے بسے ہوے تھے؛ وہ بھی ایک ایک کر کے چلے گئے۔

مولانا نے جس دور میں دارالعلوم دیوبند میں علم حاصل کیا اُس وقت تک اُس کی یہ خصوصیت بڑی حد تک باقی تھی کہ نہ صرف اُس کے اَساتذہ وطلبہ؛ بل کہ اکثر ملازمین ودربان تک لذّتِ سحر خیزی وتہجد گزاری وگریۂ خلوت سے واقف ہوا کرتے تھے۔ لالہ زارانِ مشرق میں جو دانش کدے اور تعلیم گاہیں؛ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ یا بعد میں قائم ہوئیں اور ہو رہی ہیں، اُن کے درمیان دارالعلوم کا یہ امتیاز (اُس پر گزر جانے والے تمام طوفانوں کے باوجود) قائم ہے کہ وہ گفتار کی بہ جاے کردار کا ''غازی'' ہے۔ ربِّ کریم سے دعا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اُس کو، اپنے اِس امتیاز پر باقی رہنے کی توفیق بخشے؛ بل کہ اُس کو یہ توفیق بھی ارزانی کرے کہ وہ اِس حوالے سے اپنے عہدِ کہن کی طرف پوری آب تاب کے ساتھ لوٹ جائے۔

دیوبند میں مولانا نعمانی کے اساتذہ میں سرفہرست مُحدّث العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ (متوفی ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) تھے۔ علامہ کشمیریؒ کو اُن کے ربِّ حکیم نے ورع وتقوی کے ساتھ قوّتِ حافظہ اور ذکاوت کی وہ دولت دی تھی جو ہمارے کبارِ مُحدّثین اور علماے مجتہدین کا طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ عصرِ حاضر میں تو کیا خود اُن کے ہم عصروں میں اُن کی نظیر عرب وعجم میں شاید ہی موجود رہی ہو۔ بڑے سے بڑا عالم، زیادہ سے زیادہ معلومات کا حافظ اور مطالعہ میں گیرائی وگہرائی کا حامل ہوتا ہے اور اِسی قبیل کے عالم کو ''علامہ'' کہہ دیا جاتا ہے۔ علامہ کشمیری نہ صرف اِسلامی علوم وفنون کے حافظِ یگانہ اور راویِ بادرایت تھے؛ بل کہ "یَتَفَجَّرُ العِلمُ مِنْ جَوَانِبِہٖ" (یعنی علوم کے سوتے اُن سے ابلتے تھے) کا صحیح مصداق تھے۔ اُن کے دراز قامت ہم عصروں اور عالی رتبہ بزرگوں نے بھی

اُن کی علمی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اُن کا ادنیٰ شاگرد بھی آج کے "محقِّق" سے بڑا محقّق اور علم و مطالعے کے حوالے سے، اُس سے کہیں زیادہ معرفت آگاہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کو اپنے محدود مطالعے کی روشنی میں یہ معلوم نہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) کے بعد کے ہندوستان میں کسی جلیل القدر صاحبِ تدریس عالم کے تمام شاگردوں کو اپنے اُستاذ پر، اِس درجہ ناز و افتخار و اعتماد ہو جس درجہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے بادہ کشانِ علم و عمل شاگردوں کو اُن پر رہا ہے۔ مولانا نعمانیؒ اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے شائع ہونے والی اپنی آخری کتاب "تحدیثِ نعمت" یعنی اپنی خودنوشت میں فرماتے ہیں:

"یوں تو اُس وقت (یعنی مولانا نعمانی کی دارالعلوم دیو بند میں طالبِ علمی کے زمانے میں) دارالعلوم کے سبھی بڑے اساتذہ با کمال، اپنے اپنے فن کے امام اور صلاح و تقوی اور تعلق باللہ میں بھی، صاحبِ مقام تھے؛ لیکن اُن میں اُس وقت کے صدر المدرسین و شیخ الحدیث اُستاذنا العلاّم حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا خاص الخاص مقام تھا۔ جنھوں نے نہیں دیکھا وہ غالباً یہ تصوّر بھی نہ کرسکیں گے کہ چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اِس شان کا بھی کوئی مُتَبحِّر عالم ہوسکتا ہے۔ اُن کی علمی جلالت کا کچھ اندازہ، اُن کے معاصر اور قرین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (متوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کی اِس شہادت سے کیا جاسکتا ہے، جو اُنھوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف "فتح الملہم شرح صحیح مسلم" میں ایک جگہ اِن الفاظ میں ادا کی ہے:

"الشيخُ التَّقِيُّ النَّقِيّ، الَّذِي لَمْ تَرَ الْعُيُوْنُ مِثْلَهُ، وَلَمْ يَرَ هُوَ مِثْلَ نَفْسِهِ: وَلَوْ كَانَ فِي سَالِفِ الزَّمَانِ، لَكَانَ لَهُ شَأْنٌ فِي طَبَقَةِ أَهْلِ الْعِلْمِ عَظِيْمٌ".

(ج:۱،ص:۳۳۵)

وہ صاحبِ تقوی اور پاک سیرت شیخ جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کی آنکھوں نے نہیں دیکھی اور خود اُس نے بھی اپنی کوئی مثال نہیں دیکھی اور اگر وہ پچھلے دور میں ہوے ہوتے تو طبقۂ اہلِ علم میں اُن کی بڑی عظیم شان ہوتی۔

''اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کا یہ ملفوظ مشہور و معروف ہے اور غالباً حضرت کے ملفوظات کے کسی مجموعے میں طبع بھی ہو چکا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بارے میں فرمایا کہ (اُن کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک روشن دلیل ہے)''۔

''جن اصحابِ نظر نے ممدوح کو کچھ مدت تک قریب سے دیکھا، اُن سب کا اِحساس یہی ہوگا کہ وہ علومِ دین کے بحرِ زخّار اور ورع وتقوی کے لحاظ سے اُن خاصانِ خدا میں سے تھے؛ جن کی مِنْ جَانِبِ اللّٰہ منکرات ومعصیات سے حفاظت فرمائی جاتی ہے ـــــ صورت بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی حسین و جمیل اور معصومانہ بنائی تھی کہ دیکھنے والے بے ساختہ کہہ اُٹھیں: ''اِنْ ھٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ'' (۱)

مولانا نے دارالعلوم دیوبند میں صرف دو سال گزارے (۱۳۴۳-۱۳۴۵ھ) یعنی موقوف علیہ میں داخلہ لیا اور دورۂ حدیث شریف سے فراغت کے بعد پھر عمل کی دنیا میں آ گئے؛ لیکن اُنھوں نے اپنی خوش قسمتی سے اُن دونوں سالوں کو خوب اچھی طرح وصول کیا، لمحے لمحے سے فائدہ اٹھایا اور وقت کی گراں مایگی کے مکمل اِحساس کے ساتھ دارالعلوم کی علم ریز، روحانیت خیز، اِخلاص بیز اور زہد و اِتّقا سے لب ریز فضائے مسعود

---

(۱) ''تحدیثِ نعمت'' از مولانا محمد منظور نعمانیؒ، ص: ۳۳-۳۴، پہلا ایڈیشن: اپریل ۱۹۹۷ء ناشر: الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ۔

علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے علمی مقام و مرتبے کا فاضلانہ وعالمانہ، ادیبانہ و مفکرانہ اور چشم کشا اور تفصیلی تجزیہ، اُن کے ایک مایۂ ناز شاگرد: صاحبِ علم وقلم اور جامعِ عقل وعشق، فاضلِ اَجل مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء) کی کتاب ''اِحاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' میں پڑھیے، جو ابھی حال ہی میں دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔ دیکھیے ص ۸۷ سے ص ۱۳۸ تک)

سے اپنے علم وفکر کی جھولی بھرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا؛ چناں چہ اُن کے استاذِ عظیم اِمام العصر علامہ کشمیریؒ نے بھی شاگرد کی محنت کی داد دی اور شاگرد بھی سالانہ امتحان میں امتیازی نمبرات سے کام یاب رہا۔

مولانا نعمانیؒ فرماتے ہیں:

''دارالعلوم دیوبند میں، میری طالب علمی کا دور دو سال ۱۳۴۳ھ تا ۱۳۴۵ھ رہا۔ یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ، کی صدارتِ تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادے کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذِ کشمیری قدس سرہ، نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ ۱۷ سال بعد دورۂ حدیث کی جماعت میں اِتنے اچھے طلبہ اِس سال جمع ہوے ہیں۔

تعلیمی سال کے خاتمے پر، جب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا، تو اِس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اِس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اُس کا نام بھی رکھ دیا (اتنا کام امتحان کے لیے مقرر چند گھنٹوں میں نہیں ہوسکتا تھا؛ اِس لیے میں نے خصوصی طور پر درخواست کرکے عصر کی نماز تک کے لیے وقت بڑھوایا تھا) نتیجے میں بھی امتیاز حاصل رہا''۔ (۱)

جامعیت کا راز

دارالعلوم دیوبند کی تاب ناک تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی آدمی سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ یہاں کے طلبہ اپنے اساتذہ سے محض علم و معلومات ہی حاصل نہیں کرتے

(۱) ''تحدیث نعمت''، ص: ۳۰۔

تھے؛ بل کہ اس کے ساتھ ساتھ اِخلاص واحتساب، ورع وتقوی، زہد وصلاح، جذبۂ اِصلاح، دین کی تڑپ، دعوت وپیغام محمدی کا درد، مسلمانوں کی حالتِ زار کا غم، اِسلام کے حوضِ صافی کو گدلا کرنے کی کسی کوشش کی سوچنے والے کے خلاف ننگی تلوار بن جانے کا حوصلہ اور ساری توانائیوں، صلاحیتوں اور حاصل شدہ وسائل کو خدمتِ اسلام کے لیے وقف کردینے کی عزیمت کا بادۂ تیز وتند پی کر مست بھی ہوجایا کرتے تھے۔ یہاں کا کوئی فارغ، محض حاملِ علم، یا خشک عالم، یا بے نتیجہ رسمی سند یافتہ اور دراہم معدودہ کی تلاش میں صرف در در کی ٹھوکر کھانے اور اپنی محدود دنیا کو بنانے اور صرف اپنے متعلق سوچنے اور صرف اپنے تنِ خاکی کے تقاضے کو پورا کرنے کی تگ ودو پر، اپنی علمی وفکری ''میناکاری'' یا ظاہری لیاقت کو مرکوز کردینے کی کبھی نہیں سوچتا تھا؛ کیوں کہ اُس نے یہ ''سبق'' ہی نہیں پڑھا ہوتا تھا۔ وہ تو یہاں سے علم کے ساتھ عشق کی تیغِ جگر دار وتلوارِ بے نیام لے کر نکلتا اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتا تھا، جو شاہ عبدالعزیزؒ (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرف سے اُنھیں، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (صاحب تفسیر مظہری، متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کے یہ کہہ کر سپرد کیے جانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا کرتے تھے کہ اس کو قرآن سکھادیجیے ؎

روحِ پدرم شاد، کہ بہ اُستادِ مرا گفت:
کہ فرزندِ مرا، عشق بیاموز ودگر ہیچ!

(خدائے پاک میرے والد کی روح کو شاد رکھے کہ اُنھوں نے میرے استاذ سے فرمایا تھا کہ میرے بیٹے کو صرف عشق سکھادیجیے، باقی کسی چیز کی ضرورت نہیں)

شخصیّت کے تشکیلی عناصر

نیز سیر وسوانح کا طالبِ علم یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ جامعِ صفات وکمالات عالم اور دین کے مختلف میدانوں میں سرگرم کار داعی ومفکر آسانی سے اور چند روز میں پیدا

نہیں ہو جاتا، اُس کی تشکیل و تعمیر میں مختلف عناصر باہم گھل مل کر اپنا کردار ادا کرتے ہیں: وقت کا عنصر، محنت، توفیقِ الٰہی، خاندان، ماحول، تعلیم گاہ، اساتذہ کی دعاہائے نیم شبی، والدین کی آہِ سحر گاہی، سیاسی و اجتماعی صورتِ حال، سازگار اور معتدل یا سخت فضا اور امید افزا یا جگر خراش حالات، علما و صلحا کی صحبت، علوم جو اُس نے حاصل کیے، وہ پٹری جس پر اُس کی زندگی کی گاڑی متحرک رہی، وہ اہم اسٹیشن جو اُس کی زندگی کو کراس کرتے رہے، وہ غم و الم یا خواب و آرزو، جو اُس کے فکر و نظر کے آشیانے میں جنم لیتے رہے، وہ رُفقا جو راہِ عمل اور سفرِ حیات میں اُس کے ساتھ رہے، وہ بڑے اور ذہین لوگ جن سے اُس کو شعوری و لاشعوری استفادے کا موقع ملا، وہ مصائب جنھوں نے اُس کی مخفی صلاحیتوں کے سوتے جگا دیے اور وہ صلاحیتیں مطلوبہ معیار پر سرگرمِ عمل ہوگئیں، اُس کے ملک میں اٹھنے والے سیاسی طوفان اور اُس کے وطن کی مذہبی و گروہی کش مکشیں: یہ سبھی کچھ مل جل کر کسی شخصیت کو تراشتے ہیں۔

قدرتاً مولانا نعمانی کی تعمیر میں بھی اِن سارے عناصر نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک نسبتاً خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے، اُن کے گھر کا ماحول مائل بہ بدعت ہونے کے باوجود دینی تھا، اُن کے والد اپنے خاص عقیدے کے ساتھ بھی صالح اور عبادت گزار تھے، کثرتِ عبادت کی وجہ سے ہی ''صوفی'' اُن کے نام کا سابقہ بنا ہوا تھا اور وہ ''صوفی احمد حسین'' کے نام سے معروف تھے۔(۱)

اُن کے والد ''گیارہویں'' اور ''بارہویں'' شریف کے قائل ہونے کے باوجود، اپنے بیٹے کی دینی تعلیم کے لیے بے حد تڑپ رکھتے تھے اور اُس کو اچھے سے اچھا عالمِ دین بنانے کے لیے، ہر طرح کی دوا اور دعا کرتے رہتے تھے۔(۲) اپنے خصوصی اعتقادات کے باوجود خدا کی توفیق سے اُنھیں یقین تھا کہ دین کی اچھی تعلیم، دیوبندی مکتبِ فکر کے

(۱) پڑھیے ''تحدیثِ نعمت'' ص: ۲۵-۲۹۔

(۲) دیکھیے ''تحدیثِ نعمت'' ص: ۲۲-۲۴۔

مدرسوں ہی میں ہوتی ہے؛ چناں چہ اپنے بیٹے کو شروع سے ہی اُنھی مدرسوں میں تعلیم دلائی اور پھر دیوبند بھیج دیا۔ فرزندِ ارجمند کے یہاں داخلہ لینے کی برکت سے اُن کے اعتقادات بھی شدہ شدہ درست ہو گئے۔

دین کی ہمہ جہت خدمت کی راہ پر

ذکر کیا جا چکا ہے کہ دیو بند میں مولانا نعمانیؒ کی طالبِ علمی کا زمانہ، دیو بند کے سنہرے دور کا تسلسل تھا؛ اِس لیے اُس کی فضاؤں اور ہواؤں میں حجازی جلال و جمال اور دینی باغ و بہار کی کارفرمائی تھی۔ اُس ماحول کا پروردہ امت کے ہر درد کی دوا اور ملت کے ہر مسئلے کا حل ہوا کرتا تھا۔

وہ دیو بند سے نکلے تو صرف دو تین سال تک اپنے وطن ''سنبھل'' اور اپنے ضلع کے قصبہ اَمروہہ میں تدریس کا کام کر سکے۔ اُس کے بعد دین کے درد سے معمور اُن کے قلب و نظر نے اُنھیں مدرسے کی محدود دنیا سے، خدمتِ دین کے وسیع تر میدانوں میں ڈال دیا۔(۱)

انھوں نے اسلام و جاہلیت کے مابین جاری معرکوں کی نئی سمتوں، نئی حسیّت اور رویوں کا بہ غور مشاہدہ کیا۔ مغربی تہذیب کی شیشہ سازی، مکر بازی اور سحر کاری دیکھی اور دوسری طرف نسلِ نو کی اِسلامی تہذیب کے حوالے سے ''بیزاری'' کی حد تک پہنچی ہوئی ''بے اعتمادی'' دیکھی۔ انگریزی سامراج کے ہاتھوں ہندو مسلم دشمنی کے کاشت کردہ بیج کو تناور درخت بن کر برگ و بار لاتے ہوئے دیکھا۔ سیاسی تحریکات کی ہمہ ہمی، ملک کی آزادی اور پھر اُس کی تقسیم، اور تقسیم کے دوران، اور اُس کے بعد کے دل فگار فسادات دیکھے۔ خونِ مسلم کی ارزانی دیکھی، خواتینِ مسلم کی بے آبروئی دیکھی، میراثِ خلیل کی پامالی دیکھی، نبوتِ محمدی پر قادیانیت کی ناکام یلغار دیکھی اور عقیدۂ صحیحہ پر بدعتوں اور خرافات کی شبخوں بازی دیکھی۔ عقلِ نو کا مطالعہ کیا تو پایا کہ اُس کو اسلامی

(۱) دیکھیے ''تحدیث نعمت'' ص:۳۷-۳۹۔

تعلیمات کے سلسلے میں آسودگی اور یکسوئی نہیں۔ دوسری طرف یہ دیکھا کہ اِس ملک میں سیکولرزم کے پردے میں اسلام پر، اُس کی تعلیمات وعقائد پر، تہذیب اسلام پر اور اسلامی شناخت پر؛ منظّم، بھرپور اور پیہم حملے کے منصوبہ بند تیاری ہے۔ سیکولرازم کی فریب کاری اور عملی دنیا میں اُس کی تباہ کاری کا مشاہدہ کیا، وہ سیکولرازم جس کو اکثریت کا بڑا طبقہ یکسر مسترد کر چکا ہے اور ایک چھوٹا سا طبقہ اُس کو ''ہندوازم'' کے معنی میں لینے، اور ہندو مذہب کی ساری دیومالائی تہذیب و ثقافت وتعلیمات کو ملک کے تمام باشندوں پر تھوپ دینے کو ہی اصل سیکولرزم کہتا ہے؛ جس کو کبھی وہ ''قومی دھارا'' کا نام بھی دیتا رہتا ہے۔ جوانانِ مسلم کو دیکھا کہ وہ (خلافتِ عثمانیہ کے زوال اور اکثر اسلامی ملکوں پر سامراجی قبضے اور اب وہاں سامراجی فکر وفلسفے وطریقۂ حکومت وتہذیبِ مغرب کے عمل دخل اور وہاں کے تمام امور کی رگِ جاں کے پنجۂ مغرب میں آجانے کے بعد) اِحساسِ کمتری، ذہنی جھٹکے اور نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ جب کہ انگریزی وعصری تعلیم یافتہ مسلم طبقہ، مغربی طرزِ زندگی کا دل دادہ، اور حرف بہ حرف اُس کی تقلید کا داعی اور عامل ہے اور اِسی میں ساری دینی ودنیوی ترقیوں کا راز پوشیدہ دیکھتا ہے: اپنی اِس رائے سے مخالفت رکھنے والوں کو ''قدامت پسند''، ''تنگ نظر'' اور ''تاریک خیال'' اور نہ جانے کیا کیا سمجھتا ہے۔

یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اُس نے
بجلی کے چراغوں سے منور کیے افکار

اُنھوں نے یہ سب کچھ صلاحیت وذہانت کی نگاہ سے دیکھا، قلبِ حسّاس سے مشاہدہ کیا، غیرتِ مومن سے مطالعہ کیا، ایمان ویقین سے تجزیہ کیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور حاصل کردہ لیاقتوں سے دین وملت کی بہتری کے لیے زندگی بھر، سرگرم عمل رہنے کے لیے کمر کس لیا۔ اُنھوں نے جو کچھ کیا وہ خدا کی توفیق اور اُس کے نتیجے میں حسنِ انتخاب وعمل کی بہترین مثال ہے۔ وہ صحیح معنی میں وقت کے مطلوبہ ''اسلامی سپاہی'' تھے۔

اُنھوں نے داخلی اور خارجی دونوں طرح کے فتنوں کا خوب مقابلہ کیا۔ خارجی فتنوں میں آریہ سماج کی شدھی سنگٹھن تحریک کا فتنہ پیش پیش تھا اور داخلی فتنوں میں قادیانیت تو تھی ہی جس کے مبلغ و مناظر فرنگی شیشہ گروں سے "نفس" مانگ کر لاتے اور وارثانِ میراثِ خلیل و محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کا سرمایۂ دین و ایمان چھین لینے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ دوسری طرف بریلوی شرک و بدعت نے اُس وقت کے خاص حالات میں (۱) سر اٹھا رکھا تھا۔ مولاناؒ نے اِن سارے فتنوں کا زبان و قلم دونوں سے مقابلہ کیا۔ بریلویوں سے بہ طورِ خاص مُتعَدِّد مناظرے کیے۔ ہر مناظرے میں اُنھیں یا تو منھ کی کھانی پڑی یا مولانا کے مقابلے سے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں اُنھیں عافیت نظر آئی۔ (۲) اور قادیانیوں اور آریائیوں کی بھی اچھی طرح خبر لی۔ اِن باطل فرقوں اور قبوریوں کا مولاناؒ نے جس طرح مقابلہ کیا، حق یہ ہے کہ اِس کی بنا پر علماے دیوبند میں اِس سلسلے میں وہ صف اول کے علما میں شمار ہوتے ہیں۔ بدعت کے سلسلے میں مولاناؒ کا کام شاید حضرت مولانا گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲/ ۱۹۴۳ء) کے بعد علماے دیوبند میں بہت زیادہ روشن ہے۔

الفرقان: دینی خدمت کا مضبوط اور بے مثال پلیٹ فارم

محرم ۱۳۵۳ھ مطابق ۱۹۳۴ء میں خاص بریلی سے "الفرقان" جاری کیا؛ تاکہ اہلِ بدعت کی خود ان کے مرکز "بریلی" ہی میں سرکوبی کی جاسکے۔ شروع شروع میں الفرقان پر اپنے اولین مقاصد کے تحت مناظرے اور بحث و مباحثے کا رنگ غالب رہا؛ لیکن بعد میں خصوصاً ۱۹۴۲ء میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ/

(۱) اِن خاص حالات کی تفصیل مولانا نعمانیؒ کی کتاب "تحدیث نعمت" میں ص: ۳۷ پر پڑھیے۔

(۲) اِن مناظروں کی کچھ تفصیل "تحدیث نعمت" ص: ۴۰-۶۰ میں پڑھیے۔ نیز مولانا نعمانیؒ کی کتاب "دیوبند و بریلی کے اختلاف و نزاع پر فیصلہ کن مناظرہ" پڑھیے۔

۱۹۴۳ء) اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) سے جڑنے کے بعد اُس کا رنگ دعوتی، فکری، علمی اور پیغامی بن گیا۔

''الفرقان'' مولاناؒ کا ایک مستقل کارنامہ ہے۔ اُس کے ذریعے اُنھوں نے جس طرح ٹھوس بنیادوں پر دین و دعوت کی خدمت کی، بندگانِ خدا کی راہنمائی کی، قلب و ذہن کو سلجھے ہوئے اسلوب میں روحانی خوراک پہنچائی، متردد ذہنوں کو تشفی بخشی، ''عقل مندوں'' کو مطمئن کیا، بھٹکے ہوئے آہو کے پھر سوئے حرم آنے کا راستہ ہم وار کیا اور ہندی مسلمانوں کے پیش آمدہ مسائل و مشکلات پر جس طرح صحیح اور بروقت رائے دی؛ یہ سبھی کچھ ایک مستقل تحریر؛ بل کہ تحلیل و تجزیے کا عنوان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاید و باید ہی کسی دینی رسالے نے، اِتنی لمبی عمر پائی ہوگی اور اہلِ حق کی نگاہ میں اُس کو وہ اعتبار و وقار حاصل ہوا ہوگا جو ''الفرقان'' کو حاصل رہا ہے۔

''الفرقان'' کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی جیسا شان دار صحافی اور مایۂ ناز اسلامی اہلِ قلم دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا سنبھلی کی تشکیل و تعمیر میں جہاں اُن کے والدِ بزرگوار اور صاحبِ ''الفرقان'' مولانا نعمانیؒ کی کیمیا گری کو دخل ہے، وہیں ''الفرقان'' کے بابرکت پلیٹ فارم کو بھی اور مولانا نعمانیؒ کے چھوٹے صاحب زادے مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی تو اپنے قلم کے حوالے سے تمام تر ''الفرقان'' ہی کی دین ہیں۔

مولاناؒ کی خود مُتعَدّد تصانیف ''الفرقان'' ہی کے صفحات پر تیار ہوئیں، نیز اِس پلیٹ فارم سے دیگر کئی اہلِ قلم کی گراں قدر تصنیفات تیار ہوئیں، جن میں مولانا مفتی نسیم احمد صاحب فریدی وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ''الفرقان'' کے متعدد خصوصی اور تحقیقی شمارے، شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور مجدد الف ثانی رحمہما اللہ تعالیٰ (متوفی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) پھر مولانا محمد الیاسؒ، مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) وغیرہم پر

شائع ہوئے، جنھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ دینی و علمی شخصیّات پر اِس طرح کے خصوصی نمبرات نکالنے کی طرح غالباً اردو رسالوں میں سب سے پہلے ''الفرقان'' ہی نے ڈالی۔ اب تو علمی، ادبی اور سیاسی شخصیّات پر رسالوں کے آئے دن نمبر نکلنے لگے ہیں۔

اُس زمانے کا ایک زبردست فتنہ ''خاکسار'' تحریک کا فتنہ بھی تھا، جس کے بانی عنایت اللہ خاں (ولادت لاہور، ۲۵/اگست ۱۸۸۸ء وفات لاہور ۲۷/اگست ۱۹۶۳ء) نام کے ایک صاحب تھے جو ''علامہ مشرقی'' کے نام سے مشہور تھے۔ یہ تحریک مسلمانوں کے دین وعقیدے کے لیے ایک بڑی آزمایش بن گئی تھی۔ مولاناؒ نے اِس کا بھی بھرپور مقابلہ کیا۔ اپنے قلم سے مسلسل اِس کا اِبطال کرتے رہے اور ''الفرقان'' کی چھٹی جلد ۱۳۵۸ھ کے تین شماروں پر مشتمل ایک خاص نمبر اِسی تحریک کے بارے میں نکالا، جو سارا کا سارا مولاناؒ ہی کی تحریر پر مشتمل تھا۔(۱)

یہاں یہ ذکر کردینا ضروری ہے کہ اُس وقت کے ہندوستان کے مخصوص حالات، برطانوی سامراجی حکومت کی طرف سے ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ، اور ہندوستانیوں کو کچھ زیادہ حکومتی اختیارات دیے جانے سے جوصورت حال پیدا ہوئی تھی اور آیندہ ہندوستان کا نقشہ اور اُس نقشے میں مسلمانوں کی جو جگہ متعین ہونے لگی تھی، اُس کے پیشِ نظر اہلِ نظر واہلِ قلم پڑھا لکھا مسلمانوں کا طبقہ خاصا فکرمند ہوگیا تھا۔ مسلمانوں کے مستقبل کے تحفّظ کی اُس نقشے میں کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس طرح کے سوالات پر لکھنے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۲۰/شوال ۱۳۹۹ھ/۲۳/ستمبر ۱۹۷۹ء) سرفہرست تھے۔ مولانا نعمانیؒ حسّاس دل اور مسلمانوں کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔ مودودی صاحبؒ کی طاقت ورتحریروں میں بہ ظاہر مسلمانوں کے درد کا درماں دیکھ کر، وہ اُن سے مُتاثّر ہوگئے۔ قصہ طویل ہے وہ جماعتِ اسلامی کی اولین شکل

(۱) پڑھیے ''تحدیث نعمت'' ص:۷۱-۷۷۔

(جو تحریک دارالاسلام کے نام سے قائم ہوئی تھی) اور پھر دوسری شکل (جو شعبان ۱۳۶۰ھ مطابق اگست ۱۹۴۱ء میں ''جماعت اسلامی'' ہی کے نام سے بنی) کی تعمیر میں نہ صرف شریک رہے؛ بل کہ اُس کے داعی، قائد؛ بل کہ مولانا مودودی سے زیادہ پُر زور وکیل رہے؛ لیکن خدا کی توفیق، کتاب وسنت کی شناوری، دیوبند کی تعلیم وتربیت، علمائے صالحین کی صحبت وغیرہ کی وجہ سے مزاج کی سلامت روی نے شروع دن سے ہی اُنھیں مولانا مودودی کے پُر شکوہ ظاہر اور پوشیدہ باطن میں اختلاف اور اُن کے قول وعمل کی دوری نے اُنھیں اُن سے مطمئن ہونے نہیں دیا اور بالآخر وہ شعبان ۱۳۶۱ھ مطابق جولائی-اگست ۱۹۴۲ء میں اُن سے دل برداشتہ ہوکر اپنے وطن ''سنبھل'' آ گئے۔ اُس کے ایک دو ماہ بعد مولانا مودودیؒ نے دہلی میں اپنی جماعت کی شوریٰ کا کوئی اِجلاس رکھا، جس میں اُن کے اِصرار پر مولانا نعمانیؒ نے شرکت کی؛ لیکن وہ عملی اور قلبی طور پر علاحدہ ہو چکے تھے۔ ۵-۶ ماہ کے بعد ''الفرقان'' ربیع الاول وربیع الثانی ۱۳۶۲ھ میں مولاناؒ نے جماعت سے اپنی باقاعدہ علاحدگی کا اِعلان بھی کر دیا۔(۱)

مولانا نعمانی تحدیثِ نعمت میں لکھتے ہیں:

''یہ عاجز محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بہت بروقت اور صحیح رہ نمائی تھی اور اِس کے ذریعے اِس بندے پر خیرِ کثیر کا دروازہ کھلا اور پھر جب اِس بندے کے قدم اولاً اُس راہ کی طرف اُٹھ گئے جو اَب اُس کے نزدیک فکر ونظر کی ایک غلطی تھی؛ یعنی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے زیرِ قیادت

---

(۱) اِس سارے قصے کی باقاعدہ تفصیل اور اِس کا پس منظر جاننے کے لیے، مولانا نعمانیؒ کی مستقل تصنیف ''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف'' پڑھنا چاہیے، جو ہندی مسلمانوں کے ۷۰-۷۵ سالہ عہد کی ایک تاریخ بھی ہے اور شروع سے ہی مولانا نعمانیؒ کی دینی پختگی، اِسلامی حمیت اور بلند دعووں و پرزور وپُرشور قلم کے باوجود کھلے داعیوں اور طریقۂ سلف سے ہٹے ہوئے قائدین ومفکرین کی مزاج آشنائی کی دوربیں صلاحیت کی ایک ٹھوس دلیل بھی۔

"جماعتِ اسلامی" کی تاسیس؛ تب بھی توفیقِ الٰہی میری دست گیری کے لیے مہربان ہوئی اور بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ میرے قدم واپس ہوں اور اگرچہ الٹے پاؤں واپسی کا یہ مرحلہ نفسیاتی طور پر بڑا ہی سخت تھا؛ اِس لیے کہ اِس جماعت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں، میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا؛ نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اس کی طرف دعوت دی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اِس کی بھرپور مدافعت کی تھی؛ مگر بس ایک مختصر سی کشمکش کے بعد اللہ نے میرے لیے یہ واپسی کا فیصلہ بھی آسان کیا اور علاحدگی اختیار کرنے کے بعد اِس کا بہ قدرِ ضرورت اِعلان بھی "الفرقان" کے صفحات میں کردیا اور بلاشبہ یہ میرے مالک کا میرے اوپر بڑا اِحسان تھا کہ واپسی کے اِس فیصلے میں دنیا کی شرم دامن گیر نہ ہوسکی"۔(۱)

مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا شاہ محمد الیاس کاندھلویؒ سے وابستگی کے بعد، اُن کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ مولانا اِلیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کے وہ اور اُن کے رفیقِ دیرینہ و شریکِ دعوت و فکر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ(۲) شارح و ترجمان و وکیل بن گئے۔ اِن دونوں کی کوششوں سے پڑھے لکھے طبقے میں بہ طورِ خاص دعوت کے کام کا وقار بڑھا۔ مولانا الیاسؒ کی دعوت میں قلم اور پروپیگنڈے کو کسی قسم کا عمل دخل نہیں تھا، وہ کام پر زور دیتے تھے، بات سے بالکلیہ اجتناب تھا؛ لیکن یہ دونوں حضرات چوں کہ اہلِ قلم بھی تھے، اِس لیے دعوت کے کام کو قلم انداز نہیں کرسکتے تھے۔ ان کے قلم سے ہزاروں بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچا۔ مولانا نعمانیؒ ایک طاقت ور اور معتبر رسالے کے مدیر بھی تھے۔ اُنھوں نے رسالے کو بڑی حد تک اِس کے لیے مسخر کردیا۔

مولانا فرماتے ہیں:

---

(۱) تحدیثِ نعمت، ص:۷۹۔

(۲) وفات: بہ روز جمعہ: ۲۲؍ رمضان ۱۴۲۰ھ = ۳۱؍ دسمبر ۱۹۹۹ء۔

''حضرت مولانا محمد الیاس کی تحریک کا کام صرف دل و زبان اور عملی نقل و حرکت سے تعلق رکھتا تھا۔ قلم اور تحریر کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا، یا نہ ہونے کے برابر تھا؛ مگر میری ذات کے ساتھ ''الفرقان'' ایسا جڑا ہوا تھا کہ کسی علمی، دینی اور اِصلاحی خدمت کی مَیں توفیق پاؤں اور ''الفرقان'' اس سے الگ الگ رہے، اِس کا تصور ہی کرنا مشکل تھا۔ چناں چہ اب ''الفرقان'' کی بھی اصل دعوت یہی ہوگئی''۔(۱)

مولانا الیاسؒ کو اِس عاجز راقم نے دیکھا نہیں، صرف کتابوں میں پڑھا اور مولانا نعمانی، مولانا علی میاں ندوی اور اُن جیسے بزرگوں سے سنا ہے۔ اُن کے متعلق جو کچھ پڑھا اور سنا اُس سے اُن کے سلسلے میں یہ اعتقاد جازم ہوگیا کہ وہ دین کے حوالے سے کچھ صحابہ جیسی ہی تڑپ رکھتے تھے، مسلمانوں کی حالتِ زار پر دل کباب ہوگیا تھا، دین کے لیے تڑپنا، اُسی کو اپنا غمِ اول و آخر بنالینا، اُس کی دعوت کو عام مسلمانوں تک پہنچادینے کے لیے اُسی طرح بے چین رہنا، جیسے انگاروں پر لوٹنے والا رہا کرتا ہے اور مسلمانوں کو مسلمان بنادینے کی فکر میں، روز و شب گھلنا، پگھلنا اور اپنے خدا سے اِس کام کو آسان بنادینے کے لیے، رورو کر تنہائی میں آرزو کرنا اور دعاہائے سحر گاہی میں اِسی موضوع پر، اُس سے مناجات کرنا اور خدا کے ہر بندے سے منت و سماجت کرنا کہ وہ اِسی غم کو اوڑھ لے: ایسی خصوصیات ہیں جو دین کے سابقینِ اولین داعیوں کا وجہ امتیاز تھیں۔

چناں چہ مولانا الیاسؒ سے جو بھی لگا، جڑا، مُتاثّر ہوا اور اُن کی صحبت میں بیٹھا اُن کی دعوت و تبلیغ میں شریک ہوا، وہ مولاناؒ کے درد سے حصہ پانے سے محروم نہیں رہا۔ مولانا نعمانیؒ علما کی صف میں ایسے خوش نصیب لوگوں میں سرفہرست افراد میں تھے۔

چناں چہ اُن کی تحریر و تقریر کا رنگ و آہنگ ہی نہیں اُن کا تانا وبانا اور اُن کا باطن بھی تبدیل ہوگیا، برکت کا نور، عشق کی لپٹ، پیغامِ محمدی کی محبت کی تپش، ایمان کی

(۱) ''تحدیث نعمت'' ص:۸۰-۸۱۔

حرارت، یقین کی صلابت اور دلِ حسّاس کا بامقصد درد و مقدس غم؛ تحریر وتقریر کے لفظ لفظ؛ بل کہ حرف حرف سے پھوٹنے لگا۔ مولانا نعمانی اور اُن جیسے ''اِلیاسی بزرگوں'' کی اُس زمانے اور اُس کے بعد کی تحریر میں ایک کرنٹ ہے، ایک عجیب سی محبوبیّت ہے، ایک خاص قسم کا جادو ہے، جلے ہوے دل کی خوش بو ہے، محبوبِ اعظم محمد ﷺ کی محبت کی جاں فزا مہک ہے۔

ملی سرگرمیوں میں قائدانہ رول

لیکن ایسا نہیں ہوا کہ وہ مولانا اِلیاسؒ اور اُن کی دعوت سے مربوط ہوکر دین وملت کی تمام سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوگئے؛ بل کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل کے حل، اُن کی باعزت زندگی، اور دینی شناخت کی برقراری کے لیے قائدانہ رول ادا کیا اور قلم وزبان اور تگ ودو کے ذریعے متعدد تحریکوں، سرگرمیوں، اور کوششوں میں عملی اور فعال حصہ لیا۔ چناں چہ ۱۹۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل میں پیش پیش رہے، جس کا تخیل اس سے پہلے قاضی عدیل عباسیؒ (متوفی ۲۲/ مارچ ۱۹۸۰ء = ۱۳/ جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ) نے پیش کیا تھا اور وہ اپنے ضلع بستی کے حدود میں اس تخیّل کو اچھے ڈھنگ سے برپا بھی کرچکے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں ہفت روزہ رسالہ ''ندائے ملت'' کی تاسیس میں اور ۹/ اگست ۱۹۶۴ء کو مجلس مشاورت کی تعمیر میں حصہ لیا، جس کی دعوت ایک بڑے ملی وسیاسی قائد ڈاکٹر سید محمود (متوفی ۱۹۷۱ء) نے دی تھی۔ اِسی طرح دسمبر ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل میں قائدانہ رول ادا کیا، جس کی خشتِ اولین اُن کی اور دیگر علماے دیوبند (جن میں مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ سابق امیر شریعت بہار واڑیسہ متوفی ۱۴۱۱ھ = ۱۹۹۱ء سرفہرست تھے) کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند میں منعقدہ اجلاس بابت مارچ ۱۹۷۲ء میں رکھی جاچکی تھی اور تمام علماے ہند کے اتفاقِ رائے سے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ (متوفی ۱۴۰۳ھ = ۱۹۸۳ء) کو بورڈ کا صدر اور مولانا سید منت اللہ رحمانی کو اس

کا سکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ اس بورڈ نے اُس وقت سے اب تک مسلمانوں کی دینی شناخت کی بقا کی لڑائی جس کام یابی سے لڑی ہے، اس کی توفیق مسلمانوں کی کسی تحریک کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

۱۳۶۳ھ = ۱۹۴۳ء میں اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بنائے گئے اور اُس وقت سے تادمِ حیات اُس کے سرگرم ممبر رہے۔ ہمیشہ اُن کی عالمانہ، فاضلانہ اور حکیمانہ رائے کو وزن کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ اور گذشتہ اور حالیہ انتظامیہ دونوں کے دور میں اُنھوں نے ذمہ داروں کو اپنی گراں قدر رائے، جہاں بینی، دوررسی اور گہرے تجربات سے نہ صرف فائدہ پہنچایا؛ بل کہ مربیانہ راہ نمائی کی۔

اُن کی علمی ودینی ودعوتی شخصیت کی بنا پر ۱۹۶۵ء میں اُنھیں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا رکنِ تاسیسی منتخب کیا گیا اور تادم زندگی وہ اِس منصب پر فائز رہے۔ اِسی طرح تاحیات وہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلسِ انتظامی کے بھی رکن رہے۔ ہر جگہ اُن کی رائے کا وزن محسوس کیا گیا۔

قلمی خدمات

دعوتی ودینی وملی میدانوں میں سرگرمِ کار رہتے ہوے، مولاناؒ نے مختلف اِسلامی موضوعات پر گراں قدر تصنیفات اور تحریروں سے اِسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا۔ اِسلامی موضوعات پر ہندوستان؛ بل کہ برِّصغیر میں لکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں؛ لیکن دو باتوں کی بنا پر مولاناؒ اپنے معاصرین اہلِ قلم میں لاثانی نظر آتے ہیں:

۱- انگریزی تعلیم یافتہ اور مغرب کی مادّی تہذیب کے سحر میں گرفتار، مادی طریق فکر وسیاست وفلسفہ پر ایمان رکھنے والی اِسلامی تعلیمات سے بے زار یا بے گانہ اور تشکیک میں مبتلا نسلِ نو کو؛ مُدلّل، مُکمّل اور اُس کی عقل وخرد وقلب ونگاہ کو مُتأثّر کرنے والے زود ہضم اُسلوب میں؛ اسلامی تعلیمات اور دینی حقائق کو پیش کرنے کے

حوالے سے، مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا کام منفرد اور جداگانہ ہے۔ وہ اِس سلسلے میں جتنے کام یاب اور خدائے کریم کی طرف سے جس قدر توفیق یافتہ ہیں، کم ہی اہلِ علم وقلم کو یہ سعادت ملی ہوگی۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۱) فرماتے ہیں:

"جہاں تک اِس زمانے کا تعلق ہے، یہ کام (یعنی دینی تعلیمات وحقائق کو عصرِ حاضر کے ذہن وتقاضے کو سامنے رکھ کر، پیش کرنے کا کام) پہلے سے زیادہ دشوار اور نازک ہوگیا ہے، کہ ذراسی غفلت، کسی رجحان کے غلبے، یا ذہنی ردِّعمل کے نتیجے میں؛ دین کی تفہیم، زمانے کے اثرات سے مُتاَثّر، روح اور مقاصدِ دین سے دور اور رائج الوقت اور مقبولِ زمانہ فلسفوں، تحریکوں اور نظریات کی ترجمان بن سکتی ہے۔ اِس کام سے صحیح طور پر وہی شخص عہدہ برآ ہوسکتا ہے، جس نے ایک طرف دین کا علم، اُس کے ماہر اَساتذہ اور علمائے راسخین سے حاصل کیا ہو؛ کتاب وسنت سے بہ راہِ راست استفادے کی صلاحیت اور قدرت رکھتا ہو؛ تعلیم کے ساتھ علمائے راسخین کی صحبت بھی پائی ہو؛ پھر اِس کے ساتھ وہ عوام وخواص کے مختلف حلقوں میں رہا ہو؛ اُن کے حالات وخیالات سے واقف ہو؛ اُس نے زندگی کسی خیالی دنیا، علمی حصار یا "دینی جزیرے" میں نہ گزاری ہو؛ اہلِ حرفہ سے لے کر دانش وروں اور علما وواعظین سے لے کر سیاسی میدان میں کام کرنے والوں تک سے اُس کا اختلاط ونشست وبرخاست رہی ہو؛ پھر وہ (وہبی یا اکتسابی طریقے پر) دقیق مسائل کو سہل اور عام طریقے پر بیان کرنے اور سادہ سے سادہ زبان بولنے اور لکھنے پر قادر ہو؛ اِس سب کے علاوہ اُس کے اندر اِخلاص، سوزِ دروں اور دعوت کا طاقت ور جذبہ بھی پایا جاتا ہو؛ کہ اس کے بغیر کوئی کوشش مُؤَثّر اور انقلاب انگیز نہیں ہوتی۔

(۱) اور اب کتاب کی تیاری وطباعت کے وقت رحمۃ اللہ علیہ۔

...مجھے اِس حقیقت کے اِعلان میں مسرّت اور کسی قدر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رفیقِ محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر ''الفرقان'' نے اِس اہم اور نازک کام کا بیڑہ اٹھایا...''۔(۱)

۲- میرے علم میں نہیں کہ کسی اہلِ علم وقلم نے، عصرِ حاضر میں رکاکت یا عامیانہ پن اور سطحیّت سے بچتے ہوئے اِتنی عام فہم زبان میں، اسلام کی دعوت وتعلیمات کو عصرِ حاضر کے مطابق پیش کیا ہو؛ جس کو پڑھ کر علما و تعلیم یافتہ بھی بے مزہ نہ ہوں، اُکتائیں نہیں اور عوام پڑھیں تو ایک ایک لفظ اُن کے دل میں اُترتا چلا جائے؛ جس میں ادبی چاشنی تو مکمل طور پر پائی جاتی ہو؛ لیکن الفاظ کی بے جا شوکت وسرکشی اور ترکیب کی ''کوہ پیمائی'' اور ''ہمالیائی اونچائی'' سے بچا گیا ہو اور پڑھنے والے کو ایسا لگے کہ لکھنے والے نے ہر ہر لفظ کو محسوس کر کے لکھا ہے، ہر ہر جملے کو پیمایش اور تول کے بعد ہی، عبارت میں برقرار رہنے دیا ہو اور جیسے عوام وخواص کی میٹنگ بلا کر، اُس میں پڑھ کر، اُنھیں سنا کر اور اُن کی سمجھ میں آجانے کی اُن کی طرف سے تصدیقِ کامل کے بعد ہی، تحریر کو چھپنے اور شائع کرنے کی اِجازت دی ہو۔ مولاناؒ کے پاس دینی حقائق وتعلیمات کی عصری ترجمانی کے لیے ''سہلِ ممتنع'' کا جو اسلوب اُن کی تمام تحریروں میں کارفرما ہے اور اُن کی نگارشات کی شناخت بن گیا ہے؛ میرے محدود مطالعے میں علما کے ہاں، خواجہ الطاف حسین حالی (متوفی ۱۳۳۳ھ = ۱۹۱۵ء) کے بعد نظر نہیں آتا؛ گو کہ حالی کا میدان ادبی وسوانحی رہا تھا اِسلامی موضوعات پر (شعری قالب میں ''مسدس حالی'' کے علاوہ) اُنھوں نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں اِس حوالے سے مولاناؒ کا بے حد معتقد ہوں، مجھے اِس سلسلے میں ذاتی اور ذوقی تجربہ رہا ہے۔ میں یہ بات اَن گنت مجلسوں میں کہتا رہا ہوں، نئے فضلا اور طلبۂ مدارس کو مولاناؒ کی تحریروں کو پڑھنے اور اُن کی ''سہلِ ممتنع'' اردو کو دینی

(۲) مقدمہ ''دین وشریعت'' ص:۱۶، تیرہواں ایڈیشن ۱۹۹۴ء، الفرقان بک ڈپو، لکھنؤ۔

دعوت واسلامی حقائق کی شرح وترجمانی کے لیے اپنانے کی دعوت دیتا رہا ہوں۔(۱)

مولانا کی تحریری خوبی کی جان کاری کی تقریب

یاد بخیر کہ سب سے پہلے میرے لیے مولاناؒ کی اِس خوبی کی جان کاری کی راہ بے ساختہ طور پر ہند میں عربی زبان کو بہت سے عربوں سے بہتر، زندہ تر اور پائندہ تر اسلوب میں لکھنے والے: مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی شب جمعرات ۱۸ر رجب ۱۳۹۹ھ=۱۴ر جون ۱۹۷۹ء، بن مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی متوفی ۷ر مئی ۱۹۶۱ء=۲۲ر ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ برادرِ بزرگ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ(۲)) بانی وسابق مدیر ''البعث الاسلامی'' (دارالعلوم ندوۃ العلما کا ترجمان عربی ماہ نامہ) نے ہم وار کیا۔

صفر ۱۳۹۵ھ= مارچ ۱۹۷۵ء میں ایک روز عصر کے بعد، مولانا نعمانی کی کتاب ''دین وشریعت'' سے علاحدہ کردہ ایک مضمون، میری طرف بڑھاتے ہوے مولانا سید محمد الحسنی مرحوم نے کہا کہ بھئی! البعث کا تازہ شمارہ تیار ہے، دو ایک مضمون کی کمی رہ گئی ہے، تم اِس مضمون کی آج رات میں تعریب کردو، تو شمارہ وقت پر آسکتا ہے۔

میں سخت نزلے اور اُس کے اثر سے بخار میں مبتلا تھا۔ نزلے کی حالت میں

---

(۱) مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک کتابچہ ہے ''اِنسانیت زندہ ہے'' یہ چار حسب ذیل مضامین کا مجموعہ ہے (میں بھول نہیں سکتا؛ ۱۹۴۶ء کے ایک فرقہ وارانہ فساد کی یاد؛ ۱۹۴۷ء-۱۹۴۸ء کے خونی دور کا ایک سفر؛ دشمن دوست اور پتھر موم کیسے ہوجاتا ہے؟ ایک قرآنی آیت کا عملی تجربہ) راقم الحروف نے اِسے بلا مبالغہ بیسیوں بار پڑھا ہوگا، جب بھی وہ مشاغل سے اکتا جاتا ہے اور ذہن وفکر کو دباؤ سے آزاد کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، تو اِس کتابچے کو ضرور پڑھ جاتا ہے۔ راقم اِس کو مولانا کے حسنِ نگارش، ادبی چاشنی کے ساتھ سادگی، سادگی کے ساتھ پرکاری و دل کشی اور واقعہ نگاری؛ بل کہ موجودہ زبان میں ''افسانہ نگاری'' (ہر چند کہ اصطلاحی افسانے میں حقائق نگاری کم ہی ہوتی ہے) کا قابلِ تقلید اسلوب سمجھتا ہوں ہے یہ ناچیز نہ جانے کتنی مرتبہ طلبۂ عربی زبان سے اِس کے متعدد مضامین یا اُن کے بعض حصوں کا اردو سے عربی میں تعلیماً ترجمہ کرواتا رہا ہے کہ میری نگاہ میں مولانا کی زبان کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنا جتنا آسان ہے، شاید ہی کسی کی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ اِس درجہ آسان ہو۔

(۲) اور اب بہ وقت اشاعتِ مضمون بہ شکلِ کتاب در مئی ۲۰۱۰ء= جمادی الاخری ۱۴۳۱ھ، رحمۃ اللہ علیہ۔

کوشش کے باوجود لکھنے پڑھنے کے لیے ذہن تیار نہیں ہوتا؛ اِس لیے میں نے اُن سے ایک دو روز بعد کا وعدہ کیا۔

لیکن رات کو بستر پر لیٹے لیٹے خیال آیا کہ ذرا اِس مضمون پر یوں ہی ایک نظر تو ڈال لوں؛ کیوں کہ کسی مضمون کا اِجمالی خاکہ ذہن میں مُرتسم ہو جانے کے بعد اُس کی تعریب میں قدرے آسانی ہو جاتی ہے۔ اِس سے قبل مولاناؒ کی کسی تحریر کا ترجمہ کرنے کا سابقہ نہیں پڑا تھا؛ بل کہ اُن کی کسی کتاب کو بھی غور سے پڑھنا یاد نہیں۔ ''الفرقان'' میں اُن کی نگارشات پر سرسری نظر کبھی کبھی ڈال لینے کا اتفاق ہوا تھا، زبان کی خوبی وخرابی پر غور کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

حال آں کہ ذہن خاصا بجھا ہوا تھا، نزلے کی وجہ سے ایک طرح کی کبیدگی بھی تھی؛ لیکن اللہ جانتا ہے کہ مولاناؒ کی یہ تحریر مجھے اِتنی ہلکی معلوم ہوئی کہ لیٹے لیٹے ہی اُسے اُسی وقت عربی میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ میں جملے کو ذرا سا اِشارہ کرتا اور وہ عربی کا قالب اوڑھ لیتا، بڑی آسانی سے ایک اردو تعبیر، عربی کا لباسِ جمیل پہن لیتی۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی متوسط سائز کے چھ صفحات اردو سے عربی میں ہو گئے۔ مجھے زندگی میں بلامبالغہ ہزاروں صفحات اردو سے عربی میں کرنے پڑے ہیں؛ لیکن اِس مضمون کی تعریب میں طبیعت میں جو فرحت وانبساط اور خوش گوار لذّت محسوس ہوئی، وہ اب تک کسی مضمون کی تعریب کے حوالے سے یاد نہیں۔(۱)

---

(۱) یہ مضمون ''دین وشریعت'' ص ۹۵-۱۰۰ سے ماخوذ تھا۔ اِس کا عنوان تھا ''آں حضرت کا ایک دوسرا زندہ تاریخی معجزہ'' آگے ایک دوسرا ذیلی عنوان تھا ''ایک بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز مکالمہ''۔ میرا عربی ترجمہ ''البعث الاسلامی'' کے شمارہ (۱۰) جلد (۱۹) بابت جمادی الاولی ۱۳۹۵ھ مطابق جون ۱۹۷۵ء میں بہ عنوان "معجزة حية خالدة من معجزات محمد رسول الله ﷺ" شائع ہوا تھا۔ اُس کے شروع کے حصے کو حذف کر کے راقم الحروف نے ''الداعی'' کے شمارہ (۳) جلد (۶) بابت ۸/صفر ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۵/نومبر ۱۹۸۲ء بہ عنوان "مكالمة طريفة في إثبات معجزات النبي ﷺ" دوبارہ شائع کیا تھا۔

اِس مضمون میں مولانا نعمانیؒ نے اپنے خوب صورت اور دلچسپ اُسلوب میں وہ مکالمے نقل کیے ہیں، »»»

مولانا کی زبان میں یہ خوبی کیوں ہے؟

صبح ہوتے ہی مولاناؒ کے مضمون کی سادگی اور صحیح اردو تعبیرات و بندشوں کے حوالے سے، میں اپنے اِس رات والے تأثُّر کو فجر کی نماز کے بعد ہی اپنے کئی ایک اَحباب اور بزرگوں سے ذکر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اُن میں سرفہرست مولانا کے قریبی عزیز مولانا محمد عارف سنبھلی (۱) اور اُن کے ہم وطن نامور عالم مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ انِ دار العلوم ندوۃ العلما تھے۔ اُسی وقت ہم لوگوں نے یہ بھی طے کرلیا کہ آج عصر کے بعد (جو مولاناؒ کے عمومی ملاقات کا وقت ہے) اُن کے نئے مکان واقع ''نظیر آباد'' لکھنؤ میں اُن سے ملنے جائیں گے اور اپنے اِس تأثُّر کا اِظہار کر کے اُن سے زبان کی اِس سادگی، اُس میں روزمرہ کے اِس خوب صورت استعمال اور عوام وخواص دونوں کے لیے یک ساں طور پر دلچسپ ہونے کی وجہ معلوم کریں گے۔

اتفاق سے آج عصر کے بعد ملنے والوں کی تعداد بھی کم تھی، دیگر حضرات کو جلدی فارغ اور رخصت کر کے مولاناؒ نے ہم لوگوں کو اندر کے ملاقاتی کمرے میں بلوالیا۔ خبر خیریت کے تبادلے کے بعد، میں نے اپنے رات والے تأثُّر کا اِظہار کیا، تو اُنھوں نے جو بات کہی وہ جہاں اُن کی انتہائی تواضع کی غماز تھی، وہیں اُن بنیادی عناصر کی طرف مشیر بھی تھی، جن کی وجہ سے اُن کی زبان میں سادگی کے ساتھ بے پناہ حسن ہوا کرتا ہے اور اِتنی عام فہم ہونے کے باوجود وہ شیرینی وسلاست سے بھی بھرپور ہوتی ہے۔ پڑھنے والے کو ایسا لگتا ہے کہ کوئی ہم درد متکلم ایک ایک لفظ کو میٹھے شربت میں گھول کر پلاتا جا رہا ہے۔

«««» جو اُن کے ایک حقیقی چچا نے نیاز محمد خاں فتحپوری ایڈیٹر ''نگار'' (متوفی ۱۹۶۶ء) جو منکرین معجزات میں سے ایک تھے، کے ساتھ کیا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے اُنھیں کہنا چاہیے کہ معجزات کے سلسلے میں کم از کم اُس وقت تو قائل ہی کر لیا تھا۔

(۱) وفات: بہ روز جمعہ ۱۲/۵/۱۴۲۷ھ مطابق ۹/۶/۲۰۰۶ء۔

مولاناؒ نے فرمایا کہ بھئی! بات یہ ہے کہ میرے پاس زیادہ الفاظ اور مُترَادِف تعبیروں کی بہتات نہیں، میرے پاس محدود الفاظ ہیں میں اُنھیں کو بولتا اور اُنھیں میں لکھتا ہوں، محدود تعبیریں اور جملے ہیں اُنھیں کو بہ وقتِ ضرورت گھر میں اور پھر مجمع میں استعمال کرتا ہوں۔ میرے پاس اگر بہت سارے الفاظ ہوتے، طرح طرح کی تعبیریں ہوتیں، جملوں کی بندشوں کی مُتعَدِّد شکلیں ہوتیں، تو یقیناً میرے اُسلوب میں اُسی طرح کی پیچیدگی پیدا ہو جاتی جو با کمال اور قادر الکلام مقررین و مصنّفین کے ہاں نظر آتی ہے۔!

مولاناؒ نے بہت صحیح بات کہہ دی تھی کہ کثرتِ الفاظ و تعبیرات، عبارت کو بوجھل اور مضامین کو پیچیدہ کر دیتی ہے۔

لیکن مولانا کے ہاں ایک خوبی اور ہے۔ وہ یہ کہ جملوں کی بندش، زبان کے قاعدے سے اِتنی صحیح ہوتی ہے کہ بعض دفعہ ''وردی پوش'' ادیب، روایتی اہلِ قلم اور زبان کے ''جاگیردار'' اور ''ٹھیکے دار'' کے ہاں بھی نہیں ہوتی۔

یقیناً مولاناؒ نے یہ زبان خدا کی توفیق کے بعد، بندگانِ خدا کی حقیقی خدمت اور اُن کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے، بالاِرادہ حاصل کی اور اپنائی تھی۔

فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

مثلِ خورشیدِ سحر، فکر کی تابانی میں!
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

مولاناؒ کی بعض تصنیفات کی اہمیّت

اُنھوں نے اِسی مفید ترین اُسلوب میں بہت سی تصانیف کیں۔ اُن کی بعض تصنیفات تو اردو کی چند مشہور ترین اور بہت بکنے والی کتابوں میں آتی ہیں۔ جیسے ''اِسلام کیا ہے؟'' جس کا اِس وقت ۱۴۱۸ھ = ۱۹۹۷ء میں چالیسواں قانونی ایڈیشن میرے سامنے ہے، جب کہ غیر قانونی ایڈیشنوں کا کوئی شمار نہیں۔ اِس کتاب کا دنیا کی

متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا اُن تراجم کے بھی کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، برمی، ہندی، گجراتی، کنڑی وغیرہ زبانوں کے ترجمے بہت مشہور ہوے۔

یہ کتاب سادہ زبان میں اسلام کو پیش کرتی ہے۔ پڑھے اور بے پڑھے دونوں کے لیے اِس کے مشمولات کو سمجھنا آسان ہے۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو اِس سے فائدہ ہوا۔

اِس موضوع پر پڑھے لکھے لوگوں کے لیے اُن کی کتاب ''دین وشریعت'' ہے، جو اُس سے زیادہ مبسوط ہے اور جس کا مقصد بہ قول مولاناؒ یہ ہے کہ ''اِسلامی اصول وتعلیمات کو اِس طرح پیش کیا جائے کہ دلوں سے عہدِ حاضر کے شکوک وشبہات اور اہلِ زیغ وضلال کے مغالطات وتحریفات کی بھی صفائی ہو اور اُس کے ذریعے، علم وواقفیت کے ساتھ دین وشریعت کے بارے میں ذہنوں کو بصیرت اور قلوب کو یقین واعتماد اور سلفِ صالحین کے اختیار کیے ہوے مسلکِ اہلِ سنت کے بارے میں اطمینان بھی حاصل ہوتا جائے''۔(۱)

یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی، اِس وقت ۱۹۹۷ء میں اِس کا تیرہواں قانونی ایڈیشن میرے ہاتھ میں ہے۔

اِس وقت اِس مضمون میں مولانا کی کتابوں پر تبصرہ وتعارف مقصود نہیں، یقیناً بہت سے اہلِ قلم اِس کو اپنا موضوع بنائیں گے۔(۲) لیکن مولانا کی ایک اہم کتاب کے تذکرے کے لیے یہ حقیر قلم بے تاب ہے۔ وہ ''معارف الحدیث'' ہے جو بڑے سائز پر سات ضخیم جلدوں میں ہے اور ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔(۳)

---

(۱) دین وشریعت، ص:۲۱-۲۲۔

(۲) اس مضمون کے آخر میں مولانا کی اہم کتابوں کی ایک فہرست دی جارہی ہے۔

(۳) اِس کتاب کی آٹھویں جلد کی تالیف بھی مولاناؒ نے شروع فرمادی تھی۔ معذوریوں کی وجہ سے جب اُن کے لیے اِس کی تکمیل ممکن نہ رہی، تو یہ ذمے داری اپنے برادرزادے اور داماد مولانا محمد زکریا سنبھلی قاسمی اُستاذِ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلما کے سپرد کردی، اِس مضمون کی بہ شکلِ کتاب اشاعت سے دو تین سال قبل یہ حصہ اُن کے ذریعے پایۂ تکمیل کو پہنچ کر زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکا ہے۔ جزاہ اللہ خیرًا۔

یہ کتاب محض اردو میں حدیث کی کتابوں میں اِضافے کے لیے، حدیث کا ایک مجموعہ نہیں؛ بل کہ زمانے کے حالات وتقاضے کے مطابق دقتِ نظر سے حدیثوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مولانا کا عام فہم اور شیریں ترجمہ، نیز دل کش وروح پرور تشریح نے کتاب کو ہر مسلمان کی ضرورت بنادیا ہے۔ حال آں کہ یہ کتاب اِصلاحی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے تمام میدانوں میں مسلمانوں کو رسولِ مقبول ﷺ کی بات اور عمل سے راہ نمائی حاصل کرنا آسان ہوجائے؛ لیکن مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ حدیث پاک کی بہت سی تعبیروں کا صحیح اردو ترجمہ نیز بعض دقیق علمی بحثوں کی گرہیں، اِس کتاب میں جس آسانی سے کھلتی ہوئی نظر آتی ہیں، بہت کم جگہ یہ چیز نظر آئی۔

مولانا کی پہلی زیارت اور پھر باقاعدہ زیارت وتعارف

مولاناؒ کو اپنی طالبِ علمی کے زمانے میں سب سے پہلے دہلی میں صرف دیکھا، ملاقات نہیں کرسکا۔ وہ ندوۃ المصنّفین کی عمارت سے اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۴۰۴ھ = ۱۹۸۴ء) کے ہاں سے نکل رہے تھے اور میں جامع مسجد دہلی کے سامنے مٹیا محل والے چوراہے پر کھڑا تھا وہ ٹیکسی کرنا چاہتے تھے، اُن کے ساتھ اور بھی دو ایک عالم تھے۔ ہمارے ایک دوست نے جو مولاناؒ کو جانتے تھے، اِشارہ کیا کہ یہ دیکھو یہ تو مولانا محمد منظور نعمانیؒ صاحب ہیں۔

ملاقات کا موقع تب ملا جب اپنے عظیم استاذ، سراپا شفقت وشرافت: مؤرخِ اسلام ونامور اہلِ قلم مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی (متوفی ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء) کے حکم سے،۱۹۷۲ء کے اوائل میں، مخدوم گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ (۱) کے عنایت نامے کی رو سے، اُن سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ گیا۔ پھر مولانا ندوی کے حکم سے اور حضرت الاستاذ کی اِجازت سے، کچھ دنوں

(۱) اور اب بہ وقت اِشاعتِ ایں مضمون بہ شکلِ کتاب، رحمۃ اللہ علیہ

اُن کی خدمت میں رہا، اور پھر دار العلوم ندوۃ العلما میں مدرس ہو گیا۔

مولانا نعمانیؒ کا قیام اُس وقت اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ لکھنؤ کی تبلیغی جماعت کے مرکز واقع کچہری روڈ کی مسجد کے کمروں میں تھا، وہیں اُن کا دفتر ''الفرقان'' بھی تھا۔ مولانا ندوی اُن دنوں اپنی لکھنؤ آمد اور قیام کے دوران اکثر وہیں رہا کرتے تھے۔ ندوۃ العلما کے اُس وقت کے مہمان خانے میں ضرورت کے مطابق ہی نزول فرماتے تھے۔

مولانا ندویؒ کے ساتھ یہاں آمد ورفت کی وجہ سے یہیں مولانا نعمانیؒ سے متعارف ہوا؛ یہیں اُن کی علمی عظمت اور دعوتی اہمیت کا اندازہ ہوا، یہیں ''الفرقان'' سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، اِس سے پہلے صرف نام سنا ہوگا؛ یہیں اُن کے فرزندِ اکبر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سے دید وشنید ہوئی، پھر معلوم ہوا کہ وہ مولانا محمد عثمان فارقلیط (متوفی ۱۹۷۲ء) سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ ''الجمعیۃ'' کے بعد اردو کے زبردست اِسلامی صحافی ہیں؛ یہیں مولانا نعمانیؒ اور مولانا ندوی کے حلقہ بگوش پڑھے لکھے بہت سے اُن حضرات سے، تعارف کا اِعزاز حاصل ہوا، جو دینی وملی اور دعوتی کاموں میں امتیاز رکھتے تھے۔

راقم کی، اسلام کے دو سچے سپاہیوں کی صحبت سے بہرہ مندی

یہ بڑے خوب صورت، پر بہار اور بارونق دن تھے، اُن کا نقشِ لازوال میرے حافظے کی لوح پر اپنے دل کش منظر ناموں کے ساتھ ثبت ہے۔ میں دعوت وفکرِ اسلامی کے دو مخلص خادموں، رسول اللہ ﷺ کے دو عاشقوں اور اِسلام کے دو سچے سپاہیوں کو ایک ہی مجلس اور ایک ہی جلسے میں موجود پاتا تھا۔ دونوں اپنی باتوں، اپنی تقریروں اور اپنی نصیحتوں سے دلوں کی بھٹیاں گرماتے، جذبات کو سلگاتے، اِسلامی شعور ووِجدان پر سان چڑھاتے اور حاضرین کو حُبِّ نبوی اور عشقِ الٰہی کا جام پلاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ عاشقِ رسول مولانا مناظر احسن گیلانی (متوفی ۱۳۷۵ھ = ۱۹۵۶ء) مولانا عبدالباری ندوی (متوفی ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء) اور مولانا عبدالماجد دریابادی (متوفی

۱۳۹۹ھ = ۱۹۷۸ء) کے بعد، دو یا دو سے زائد عظیم درجے کے مشہور عالموں کے درمیان ایسی محبت، یگانگت، فکر و نظر کی مناسبت، اور ایسی اُخوت جو گویا خون کے رشتے سے مضبوط تر ہو (جو ساٹھ سال: ۱۹۳۸ء-۱۹۹۷ء کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہو) جذبات وخیالات کی ایسی ہم آہنگی، ایک دوسرے کی ایسی رعایت و پاس داری، ایک دوسرے سے ملاقات و مشورے کا اِتنا اہتمام اور مسلمانوں کے درد کی دوا ایک ساتھ مل جل کر ڈھونڈنے کی ایسی مثال؛ میں نے اپنے ناقص مطالعے میں تو نہیں پڑھی۔ دونوں ایک دوسرے کو ''رفیقِ محترم'' ہی لکھتے اور بولتے تھے۔ دعا ہے کہ خدائے کریم دونوں کو وہاں اپنی جنت الفردوس میں بھی رفیق بنائے۔ ایک ''رفیقِ محترم'' کے چلے جانے سے (۱) دوسرے رفیق کو (۲) فراق کی تلخی اور ہجر کی جو اذیّت محسوس ہو رہی ہے، تو خدا اُسے اِس کا بھی بہترین بدلہ و عمر دراز دے۔

میں ندوۃ العلما میں کم و بیش دس سال مدرس رہا، اِس دوران مولانا نعمانیؒ کی عظمت، دینی علوم میں رسوخ، قلم کی برجستگی و سادگی، دین وملّت کے لیے اُن کی ہمہ وجوہ خدمات، اور دعوت کے میدان میں اُن کی بھرپور تگ و دو کی معرفت بڑھتی رہی۔ اُن کی خدمت میں کبھی تنہا اور کبھی ہم عمروں اور بزرگوں کے ساتھ اَن گنت مرتبہ جانے اور فائدہ اُٹھانے کی سعادت حاصل رہی۔ کچہری روڈ سے نظیر آباد اپنے ذاتی خریدکردہ مکان میں منتقل ہو جانے سے، ہم لوگوں کو آمد و رفت میں زیادہ سہولت محسوس ہونے لگی کہ یہ نسبتاً زیادہ قریب تھا اور امین آباد کے چوراہے پر واقع ہونے کی وجہ سے گزرگاہ پر بھی۔

لیکن بار بار اور جلدی جلدی ملاقات و استفادے کی ایک دوسری صورت کئی سال بعد یہ پیدا ہوئی کہ اُنھوں نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ایک طالبِ علم کے

---

(۱) مراد اِس سے حضرت مولانا نعمانیؒ ہیں۔

(۲) مراد اِس سے حضرت مولانا ندویؒ ہیں، جو خود بھی اِس مضمون کے کتاب کی شکل میں چھپنے سے کئی سال قبل، رحمۃ اللہ علیہ ہو چکے ہیں۔

استفسار پر، ۱۳۹۸ھ = ۱۹۷۸ء میں اپنی کتاب ''شیخ محمد عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور ہندوستان کے علماے حق پر اُس کے اثرات'' لکھی۔ پھر ۱۹۷۹ء میں راقم الحروف کو اُسے عربی میں ترجمہ کرنے کی سعادت بخشی اور مارچ ۱۹۸۰ء میں منعقدشدہ دارالعلوم کے اِجلاس صد سالہ سے کچھ پہلے ''الدِّعَایَاتُ الْمُكَثَّفَةُ ضِدَّ الشَّيْخِ مُحَمَّد بنِ عَبْدِ الْوَهَّابِ وَتَأْثِيْرُهَا عَلَى الْعُلَمَاءِ ذَوِي الْعَقِيْدَةِ الصَّحِيْحَةِ فِي الْهِنْدِ'' کے نام سے ندوۃ العلما کے پریس سے چھپی۔ (۱)

اِس کتاب کے عربی ترجمے کی تکمیل سے چند ماہ قبل حضرت مولانا نعمانیؒ کو یہ خیال ہوا تھا کہ عربوں کے لیے یہ کتاب دوسرے انداز میں، مزید مؤثّر طور پر لکھی جائے؛ چناں چہ ایک خط میں اُنھوں نے ناچیز کو، جو اُنھوں نے میرے گھر کے پتے (ہرپور بیشی، اَورَائی، مظفرپور، بہار) پر بھیجا تھا، تحریر فرمایا:

۶رمئی ۱۹۸۰ء

برادرمکرم مولانا نورعالم صاحب! زیدمجدکم

سلام ورحمت۔ میں نے آپ کو لکھا تھا کہ کتاب کے صفحہ ۸۰ سے صفحہ ۱۴۴ تک جو مضامین ہیں، اُن میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی، آپ اُن کا ترجمہ کرلیں۔

لیکن بعد میں؛ میں نے مزید غور کیا تو میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ یہ پوری کتاب ہندوستان و پاکستان ہی کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ بعض چیزیں جو یہاں کے ذہنوں کے لیے بہت مؤثر ہوسکتی ہیں، وہ عربوں کے لیے بالکل مؤثر نہ ہوں گی؛ اِس لیے اب میں نے طے کیا ہے کہ میں عربوں کے ذہن کو سامنے رکھ کر، ازسرِنو ایک چیز لکھوں اور اُس میں کچھ چیزوں کا اِضافہ کروں۔

(۱) یہ کتاب عربی اور اردو: دونوں زبانوں میں، الفرقان بک ڈپو، ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیرآباد، لکھنؤ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

گذشتہ رات مغرب وعشا کے درمیان مولانا علی میاں تشریف لائے تھے،

اُن سے اِس سلسلے میں بات ہوئی، اُنھوں نے میرے خیال سے پورا اتفاق کیا۔

اب آپ ترجمے کا کام فی الحال نہ کریں، اب میں عربی ایڈیشن کے لیے جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، اُس میں دیر لگے گی۔ رات مولانا علی میاں نے بتایا کہ آپ اِن شاء اللہ جلد ہی ''رائے بریلی'' تشریف لائیں گے، پھر تو اِن شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

لیکن میں نے چوں کہ کتاب کے اکثر حصے کا ترجمہ کرلیا تھا؛ اِس لیے ذہن میں آیا کہ اس کو تو مکمل کر ہی لیا جائے، حضرت مولاناؒ اگر بعد میں کچھ لکھیں گے، تو اُس کی تعریب بھی اِن شاء اللہ ہو جائے گی۔ مولاناؒ کو کتاب از سر نو لکھنے کی فرصت نہیں مل سکی اور جزوی ترمیم کے ساتھ سابقہ کتاب ہی کا عربی ترجمہ چھپا اور وہی عربوں میں تقسیم ہوا۔

مولانا سے مزید ربط وتعلق

پھر خدائے پاک کی توفیق سے اور اپنے استاذ ومربی، برصغیر میں عربی زبان کے اُستاذِ یگانہ، مدرسی زندگی کے دورِ آخر کے مربیِ عبقری: مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) کے حکم سے مرکزِ علومِ نبوت دار العلوم دیوبند میں نصفِ شوال ۱۴۰۲ھ = نصف اگست ۱۹۸۲ء، میں ''الداعی'' کے مدیر اور اُستاذِ ادبِ عربی کی حیثیت سے یہاں آگیا؛ تو یہ میری سعادت مندی تھی کہ مُتعَدِّد اسباب کی بنا پر مولاناؒ سے ربط وتعلق میں اور اِضافہ ہوگیا۔

اُس وقت دار العلوم میں نئی انتظامیہ کی استواری کا عمل جاری تھا؛ اِس لیے قدرتی طور پر یہاں حالات غیر مستحکم سے تھے۔ ہم جیسے یک سوطبیعت آدمی کو اِن حالات میں

ایک طرح کی بے چینی یا کم از کم بے کیفی سی محسوس ہوتی تھی۔ اِس سلسلے میں مولاناؒ سے کئی بار بزرگانہ و مربیانہ مشورے کا طالب ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے مشورے نے تاریکی میں روشنی کا کام دیا۔ ہمارا ربّ اُنھیں بہت نوازے۔

ایک عریضے میں، ناچیز نے نئی انتظامیہ کی استواری کے بعد کی غیر استحکامی کیفیت، اُتھل پتھل کے حالات، صورتِ حال کی بے کیفی وغیرہ کو حضرت مولاناؒ کے سامنے تفصیل سے بیان کیا اور لکھنے پڑھنے کے لیے موجودہ حالات میں ماحول کی ناسازگاری اور اپنی پرسکون طبیعت کے اُچاٹ اُچاٹ سی رہنے کی بات بیان کی، تو حضرت نے مندرجۂ ذیل والا نامہ تحریر فرمایا:

۱۷/ذی الحجہ ۱۴۰۲ھ

برادرِ مکرم! أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْنَا وَإِلَيْكُمْ سلام ورحمت

آپ کا مفصل عنایت نامہ ملا۔ آپ نے اچھا کیا کہ اِس تفصیل سے لکھ دیا۔ مجھے اِس صورتِ حال کا اندازہ ہے؛ مگر اجمالی۔ گذشتہ ۱۰-۱۵ سال سے وہاں جو حال رہا ہے، اُس کے نتیجے میں یہی ہونا چاہیے۔

میرے بھائی! سب کی جڑ بنیاد، آخرت کی طرف سے بے فکری اور غفلت ہے۔ ہمارے بس میں تو اپنا دل بھی نہیں۔ بس اللہ تعالیٰ مُقلِّب القلوب کی رحمت ہی سے امید کی جاسکتی ہے، ہمارا فرض اِمکانی تدبیر وسعی اور اِلحاح وتضرّع کے ساتھ دعا ہے، اِس کے بعد بس ''وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْ إِلَى اللّٰهِ''۔ میرا سفر اگر بہت مشکل نہ ہوتا، تو مجھے بار بار جانا چاہیے تھا، وہاں دوستوں، عزیزوں اور رفیقوں کے سامنے بھی روتا اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں بھی۔ میں نے کہا تھا کہ ہر مہینے کسی ربّانی مخلص شخصیّت کو ضرور بلایا جائے۔ غالباً سوائے اِس کے کہ حضرت مفتی محمود صاحب کی آمد ورفت شروع ہوگئی ہے، ابھی اِس سلسلے میں کچھ اور نہیں ہوسکا ہے۔ جو ذمّے دار ہیں وہ بیچارے بہت سے اُلجھاؤں میں بھی

ہیں، عبوری دور چل رہا ہے۔ آپ کی تجاویز مثبت اور قابلِ توجہ ہیں (۱)۔ اِس وقت صرف اِتنا ہی عرض کروں گا، باقی اِن شاء اللہ عند التلاقی۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

حضرت مولاناؒ اُن دنوں سخت علیل تھے؛ لیکن یہ ناچیز جب بھی کوئی عریضہ اِرسال کرتا تو تمام معذوریوں کے باوجود عموماً اپنے قلم سے ہی جواب تحریر فرماتے۔ اُنھی دنوں کا یہ ذیل والا نامہ بھی ہے:

۲۰ر نومبر ۱۹۸۲ء

برادرِ مکرم! زید مجدکم   سلام ورحمت

اگلے ہفتے مجلسِ شوریٰ کے جلسے میں شرکت کا اِرادہ ہے، اِن شاء اللہ حاضری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مُقَدَّر و مُیَسَّر فرمائے۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ ''الداعی'' میں ترجمے کے لیے آپ نے ''اِنسانیت زندہ ہے'' کا کس بنیاد پر انتخاب کیا؟ اگر کتب خانے میں نسخہ ہو تو اِن شاء اللہ، میرے ساتھ آجائے گا۔

''الداعی'' کے پہلے شمارے کا آنا تو سجّاد میاں سے معلوم ہوا تھا، دوسرا بھی آیا ہوگا۔ مجھے اہتمام اور شوق سے اُس کو دیکھنا چاہیے؛ لیکن اب میں نے اپنے کو مطالعہ سے معذور قرار دے لیا ہے۔

عالمِ عربی کا مسئلہ بلاشبہ قابلِ فکر ہے۔

اِس وقت صرف اِتنا ہی عرض کر سکتا ہوں، ایسا حال ہے کہ یہ سطریں

---

(۱) میں نے حضرت کو لکھا تھا کہ آپ انتظامیہ سے کہیں کہ حضرت مفتی محمود صاحب سے باقاعدہ دار العلوم میں قیام کرنے کی درخواست کرے اور کم از کم ہر ماہ مولانا صدیق احمد باندوی اور مولانا شاہ ابرار الحق کی پند و نصیحت کا بھی انتظام کرے۔

مشکل سے لکھی ہیں، مختصر نویسی کے لیے مکرر معذرت خواہ ہوں۔

دعا کا محتاج وطالبِ دعا ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

اِس کے چار پانچ دن بعد ہی، دوسرا والا نامہ اِرسال ہوا، جس کا متن درجِ ذیل ہے۔

۲۵؍نومبر ۱۹۸۲ء

برادرِ مکرم! زیدمجدکم، سلام ورحمت

آپ کا ایک اِخلاص نامہ ملا تھا، میری طبیعت خراب تھی، مختصر جواب لکھ دیا تھا، ملا ہوگا۔ کبھی کبھی بلڈ پریشر بہت بڑھ جاتا ہے؛ اِس وجہ سے میں نے دفتر میں کہلوا دیا ہے کہ اخبارات ورسائل میرے پاس نہ بھیجے جائیں، پڑھنے کا مرض ہے اور وہ مضر ہوتا ہے۔

آپ کو خط لکھنے کے بعد ''الداعی'' کے بارے میں سجّاد میاں (۱) سے دریافت کیا تھا، اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ دونوں شمارے بہت کام یاب ہیں اور معیارِ سابق کے لحاظ سے بہت بلند ہیں۔ یہی توقع تھی۔

شوریٰ میں شرکت کی نیت ہے، اللہ تعالیٰ مُقدَّر ومُیَسَّر فرمائے۔

دعا گو اور دعا کا طالب ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

''الداعی'' کی ذمے داری لینے کے بعد، میں نے طے کیا کہ اِس کو کسی نہ کسی

---

(۱) صاحب زادۂ خرد مولانا نعمانی'': عالم صالح حضرت مولانا سجّاد نعمانی مدظلہ العالی فاضل دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ وفاضل مدینہ یونیورسٹی ومشہور اہلِ قلم وداعی الی اللہ۔

درجے میں داعی رہنا چاہیے اور ایسے دعوتی و فکری مضامین ہر شمارے میں آنے چاہئیں جن میں اِسلامی تعلیمات وحقائق کو نئے ذہن کے مطابق پیش کیا گیا ہو۔ فرزندانِ دیوبند نے، جو بھراپُر اگراں مایہ اسلامی کتب خانہ تیار کردیا ہے، میں نے اِس مقصد کی خاطر اُس پر ایک نگاہ ڈالی، تو باوجودے کہ یہ تصنیفات ونگارشات اپنی جگہ گراں بہا، بے مثال اور تمام علم وفن کی جامع ہیں؛ لیکن مجھے اِس بحر میں وہ دُرِّ مطلوب زیادہ آسانی سے نہیں مل سکا، جس کا میں متلاشی تھا یعنی یہ کہ دعوتی و فکری بات آسان زبان میں اور موجودہ ذہن کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہو۔ بالآخر مولاناؒ کی ''دین وشریعت''، ''قرآن آپ سے کیا کہتا ہے''، ''معارف الحدیث'' الفرقان کی فائلوں میں اُن کے مضامین اور اُن کے تقریری مجموعوں سے ہی اِس سلسلے میں فائدہ اٹھایا جاسکا۔

مولانا نعمانیؒ جہاں دینی علوم کے بڑے غوّاص تھے، عظیم داعی الی اللہ اور شریعت وطریقت کی جامعیّت کا نمونہ تھے، وہیں انتہائی زیرک، دنیوی معاملات سے باخبر، اِنسانی فطرت کے تجربہ کار اور انسانی معاشرے کی پیچیدگیوں نیز دینی کہے جانے والے ماحول کی تہ سے اُبھرنے والی خرابیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ ناچیز نے ''الداعی'' میں اُن کے مضامین کی تعریب کرکے موقع بہ موقع اُنھیں چھاپنا شروع کیا، تو حضرتؒ نے مندرجۂ ذیل مکتوب اِرسال فرمایا، جس سے اُن کی زیرکی اور اِنسانی طبائع کے اُن کے گہرے مطالعے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس خط سے دارالعلوم سے ان کی بے پایاں محبت اور اُس کی خیر خواہی کے جذبات کا بھی بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے:

۳؍جنوری ۱۹۸۴ء

برادرِ مکرم! زید مجدکم، سلام ورحمت

خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں، مہینہ سے بھی زیادہ مدت سے، آپ کو خط لکھنے کا دل میں تقاضا ہوتا تھا؛ لیکن خرابیِ صحت کی وجہ سے بس اُسی وقت خطوط وغیرہ لکھنے کی نوبت آتی ہے جب ضرورت کا اِحساس مجبور کردیتا ہے۔

ایک بات تو یہ لکھنا چاہتا تھا کہ آپ ''الداعی'' میں اکثر میرے نام سے کوئی مضمون شائع فرماتے ہیں، جو میری کسی تحریر کی تعریب ہوتی ہے، مجھے اِس سے خوش اور ممنون ہونا چاہیے؛ لیکن میں اِس کو آپ کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی مناسب نہیں سمجھتا، کبھی کبھی کوئی چیز آجائے، جیسے دوسرے حضرات کی بھی آتی ہے تو مضایقہ نہیں؛ لیکن اکثر شماروں میں آنا ٹھیک نہیں، لوگ آپ کے بارے میں بھی بدگمانی کریں گے اور میرے بارے میں بھی، جس سے بچنا ضروری ہے۔

دوسری بات یہ لکھنا چاہتا تھا کہ گذشتہ مجلسِ شوریٰ منعقدہ لکھنؤ میں پہلے دن مولانا علی میاں صدر تھے، میں بہت تھوڑی دیر کے لیے شریک ہوسکا تھا، عرب ممالک کے لیے وفود سے متعلق تجویز کے سلسلے میں، مولانا علی میاں نے ایک مفید مشورہ دیتے ہوے موجودہ ''الداعی'' کی تعریف کی اور فرمایا کہ اُس کے ذریعے عرب ممالک میں دارالعلوم کا اچھا تعارف ہوسکتا ہے اور مہتمم صاحب سے فرمایا کہ اِس وقت تو میں باہر جا رہا ہوں، سفر سے واپسی پر ایک دن کے لیے آپ تشریف لے آئیں تو میں وفود کے وہاں فضا بنانے کے سلسلے میں تفصیلی مشورہ دوں گا اور خواص کے پتے لکھوادوں گا، جن کو ''الداعی'' بھیجا جائے اور اُن سے رابطہ قائم کیا جائے۔

میرے دل میں تقاضا تھا کہ آپ کو مولانا کی اِس گفتگو کی اطلاع دوں۔ اِس کے بعد میں نے مہتمم صاحب کو ایک دفعہ لکھا تھا کہ آپ اِس کام کے سلسلے میں جب لکھنؤ تشریف لائیں، تو مولانا نور عالم صاحب کو بھی ضرور ساتھ لے کر آئیں۔

اِس سلسلے میں آپ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو میرا یہ پیغام پہنچادیں کہ مولانا علی میاں بمبئی وغیرہ کے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں، سنا ہے کہ یہ سفر ۲-۳ ہفتے کا ہوگا؛ اِس لیے اِس سفر سے واپسی سے پہلے، اِس کام کے

سلسلے میں لکھنؤ کے سفر کا اِرادہ نہ فرمائیں۔ میں مہتمم صاحب کو براہِ راست بھی
لکھوں گا، احتیاطاً آپ کو بھی لکھ دیا ہے۔ ڈاک کا نظام بہت خراب ہے۔
پچھلے دنوں جو ہنگامہ دارالعلوم میں ہوا، (۱) میں چاہتا ہوں کہ آپ پوری

---

(۱) اِس سے اِشارہ مولوی عثمان سہار نپوری صدر جمعیۃ الطلبہ دارالعلوم دیوبند اور اُس کے رفقا کی طرف سے، دارالعلوم میں کیے گئے ناگفتہ بہ ہنگامے کی طرف ہے۔ جمعیۃ الطلبہ کی بہ حالی اُن مُدّعوں میں سے ایک تھی، جن کی بنیاد پر دارالعلوم میں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی کی قیادت اور مولانا سید اسعد مدنیؒ کی سر پرستی میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی انتظامیہ کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی، جس کے نتیجے میں، اُن کی انتظامیہ برخاست اور نئی انتظامیہ بہ حال ہوئی، جس نے ۱۰ر فروری ۱۹۸۳ء کو باقاعدہ انتخاب کے ذریعے، مولوی عثمان سہار نپوری کو جمعیۃ الطلبہ کا صدر، مولوی ثناء الہدیٰ (اور اب مولانا مفتی ثناء الہدیٰ نائب ناظم امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ) کو جنرل سکریٹری چنا اور اُن کے تحت بہت سے ارکان وذمے داران جمعیۃ الطلبہ متعین ہوے۔

اِن میں سے اکثر طلبہ چوں کہ کیمپ دارالعلوم کے توسّط سے، دارالعلوم پر نئی انتظامیہ کے ذریعے ۲۴ر مارچ ۱۹۸۲ء کی رات میں ۲ بج کر ۴۵ منٹ پر قبضہ کرنے اور سابق انتظامیہ کے دارالعلوم کے اِحاطے کے اندر موجود لوگوں کو بھگا دینے میں شریک تھے؛ اس لیے یہ طلبہ اپنے کو دارالعلوم کا مالک سمجھ بیٹھے تھے، نوجوانی کی ناسمجھی اور بے جا جوش کی وجہ سے حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ سے، جو دارالعلوم کی نئی انتظامیہ کے قیام اور انقلاب کے اصل روحِ رواں تھے، اپنی خواہش کے مطابق اپنی آرزوؤں کی تکمیل کرانا چاہتے تھے، جو انتظام وقانون کی رو سے خود مولانا کے بھی بس میں نہ تھی۔ ۱۲ر فروری ۱۹۸۳ء کی رات میں دارالحدیث تحتانی میں، جمعیۃ الطلبہ کا جو باقاعدہ اِجلاس ہوا، جس میں طلبۂ جمعیۃ مولانا کو اُن کے گھر سے دولہے کی طرح لے کے آئے اور اُن کی مدح وثنا میں دو تین طلبہ نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی، اُس موقع سے بھی حضرت الاستاذؒ نے اُن طلبہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے کیمپ میں آپ سے جتنے وعدے کیے تھے،
وہ پورے نہیں کرسکتا اور نہ مجھے اس کی توقع ہے کہ وہ پورے ہو جائیں گے"۔

لیکن یہ طلبہ دن بہ دن اپنی شوخیِ گفتار وکردار کے مظاہرے میں اِضافہ کرتے رہے، کچھ دگر وحید الزماں مخالف طاقتوں کا آلۂ کار بھی بن گئے اور حضرت الاستاذ کے ساتھ بے ادبی کی تمام حدوں کو پار کرتے ہوے شنبہ ۱۱ر ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۳ء کی رات میں، جب حضرتؒ دارالحدیث تحتانی میں طلبہ کے ایک بڑے جلسے کو خطاب کر رہے تھے، دوسری منزل کی گیلریوں سے، حضرتؒ پر انڈے اور ٹماٹر وغیرہ »»»

»»» برسائے، اِسی اثنا میں منصوبے کے تحت صدر گیٹ پر واقع جنریٹر روم (اُس وقت دار العلوم میں یہ واحد جنریٹر تھا) میں جا کر جنریٹر کو بند کر دیا اور روم پر تالا ڈال دیا اور ایک کاغذ پر یہ لکھ کے لٹکا دیا کہ جو اِس کو کھولنے کی کوشش کرے گا، اُس کو قتل کر دیا جائے گا۔ دار العلوم کی بجلی لائن لوہے کی زنجیر ڈال کر اڑا دی گئی اور پورا دار العلوم تاریکی میں ڈوب گیا۔

دار العلوم نے، ان طلبہ کے خلاف سخت اور مناسب کارروائی کرتے ہوے، اِن کا ہمیشہ کے لیے دار العلوم سے اِخراج کر دیا۔ یہ کارروائی سموار ۱۳/ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹/دسمبر ۱۹۸۳ء کو عمل میں آئی۔

یہ مخرج طلبہ اور شرارت پر اُتر آئے، بعض شرارت پسند عناصر کی معاونت سے یہ بدھ: ۱۵/ربیع الاول ۱۴۰۴ھ = ۲۱/دسمبر ۱۹۸۳ء کو ظہر بعد ۲ بج کر ۷ منٹ پر دار العلوم کے جنوبی دروازہ معروف بہ ''معراج گیٹ'' سے دار العلوم کے دارِ جدید کے اِحاطے میں داخل ہو گئے۔ یہ طلبہ بندوقوں لاٹھیوں، سریوں اور پستولوں سے مسلّح تھے، کچھ ہتھ گولے بھی ان کے پاس تھے جنھیں اِنھوں نے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دہشت پھیلانے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ شرارتی طلبہ اور اُن کے ہم نوا شہری دارِ جدید میں تیزی سے ہر طرف پھیل گئے، طلبہ پر کنکروں، پتھروں اور اینٹ کے ٹکڑوں سے حملہ شروع کر دیا، بندوقوں کی آواز سے ماحول میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا، طلبہ نے اپنے کمروں کے دروازے بند کر لیے جنھیں اِن مفسدوں نے توڑنا شروع کیا، دار العلوم کے سبھی دروازے بھی مفسدین نے اندر سے بند کر لیے اور مسجدِ قدیم کے مائک پر قبضہ کر کے، اُس پر اپنی فتح کا اِعلان شروع کر دیا؛ لیکن جلد ہی طلبہ واساتذہ نے اِنھیں قبضے میں کر لیا، مولانا معراج الحقؒ نے مولوی عثمان سہارن پوری کی کمر پر اپنے ڈنڈے کو اس زور سے مارا کہ وہ فوراً بیہوش سا ہو گیا، مولانا سیّد ارشد مدنی دار العلوم کے دارِ جدید کے جنوب غربی حصے کے ایک کمرے کی ایک کم زور کھڑکی کو توڑ کے اپنی بندوق کے ساتھ آ گئے، پھر جلد ہی کایا پلٹ گئی اور ۱۴ مفسد طلبہ کو پکڑ لیا گیا، طلبہ نے اِنھیں بری طرح زدوکوب کیا؛ لیکن اِنھیں اساتذہ اور انتظامیہ کے لوگوں نے بچا لیا؛ ورنہ اگر کسی کی موت ہو جاتی تو حالات کا رخ بدل جاتا اور مفسدین کا مقصد پورا ہو جاتا۔

طلبۂ مفسدین نے، شر انگیز لوگوں کی پشت پناہی سے دار العلوم سے بہ حفاظت بچ نکلنے کے بعد، دار العلوم پر مقدمہ بھی قائم کر دیا کہ ہم اپنا سامان لانے دار العلوم گئے تھے، تو اساتذہ و طلبہ ہمارے قتل کے درپے ہوے اور ہم پر جان لیوا حملہ کیا۔

قابلِ ذکر ہے کہ مولوی عثمان سہارن پوری بعد میں مسلم یونیورسٹی کی جامعہ طبیہ کے طالبِ علم ہوے اور اپنی قیادتی لیاقت کی وجہ سے جس پر مولانا کیرانویؒ نے سان چڑھائی تھی، وہاں کی جمعیۃ الطلبہ کے صدر منتخب ہوے، ۲۰۰۵ء میں وہ ملائم سنگھ کی سماج وادی پارٹی کی طرف سے یوپی سنّی وقف بورڈ کے صدر منتخب ہوے۔

حضرت مولانا نعمانیؒ کے مکتوبِ گرامی میں اِنھی واقعات کی طرف اِشارہ ہے۔

آیندہ جب کوئی غیر معمولی واقعہ ہو تو مجھے مطلع کرنے کی زحمت کیا کریں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

شیعیّت کے موضوع پر مولاناؒ کی زندۂ جاوید تصنیف

''امام آیت اللہ روح اللہ خمینی'' (متوفی ۴؍جون ۱۹۸۹ء=۲۹؍شوال ۱۴۰۹ھ) نام کے ایرانی شیعی اثنا عشری عالم نے اِیران میں رضا شاہ پہلوی کی طاقت ورشاہی کا تختہ الٹ کر اپنے عقیدے کے مطابق ۱۳۹۹ھ=۱۹۷۹ء میں وہاں ''اِسلامی حکومت'' قائم کی، تو نہ صرف شیعی دنیا نے آسمان سر پر اٹھالیا؛ بل کہ وہ سنی العقیدہ مسلمان خصوصاً نوجوان جو ایک خاص قسم کی سطحی اِسلامی تحریک سے مُتأثّر ''حکومت الٰہیہ'' یا ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے قیام کے لیے نام نہاد کوشش اور مطلوبہ عمل واِخلاص کے بغیر محض کھوکھلے نعروں سے مسحور اور اِس سلسلے کے لٹریچر کے ''منشیات'' سے سرشار تھے؛ خمینی کے عقیدے، صحابۂ کرام پر اُس کے سب وشتم، ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم پر بہ طورِ خاص اُس کے لعن طعن اور ایسی اِلزام تراشی جو کسی نہایت ہی ضال، فاسق، اور بدکردار جماعت کے لیے بھی نہیں کی جاتی(۱) سے بالکلیہ صرفِ نظر کرتے ہوئے؛ اُس کو ایک صحیح، مطلوبہ اور مثالی حکومتِ اسلامی کا بانی، اسلامی انقلاب کا داعی ومؤسس اور قابلِ تقلید قائد سمجھنے، سمجھانے اور پوری دنیا میں اُس کا بول بالا کرنے کے لیے زبان، قلم، اور ذرائعِ اِبلاغ کی ایسی پرزور طاقت صرف کرنی شروع کردی اور خمینی سے عقیدت ومحبت کے اِظہار میں یہ لوگ اِس حد تک پہنچ گئے کہ اُس کے خلاف کوئی حرفِ تنقید زبان سے نکالنے والا اُن کے نزدیک گویا اتحادِ اسلامی کا مخالف، حکومتِ اسلامی کا دشمن، مسلمانوں کے انتشار کا داعی اور غلبۂ فکرِ اِسلامی وعروجِ اِسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے والا بن گیا۔

---

(۱) پڑھیے خمینی کی کتاب ''کشف الاسرار'' بہ زبان فارسی، ص ۱۱۰-۱۱۴۔

اِس صورتِ حال سے صحیح العقیدہ علماے دین بے چین ہوگئے؛ کیوں کہ فسادِ عقیدہ کے ساتھ کسی طرح کی ''اِسلامی حکومت'' کا قیام اور اِس سلسلے کی دعوت وتحریک محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں قابلِ قبول نہیں۔ خداے ذوالجلال کسی کرّ وفرّ، کسی مغربی طاقت کو للکار دینے، کسی بڑی طاقت کے لیے مشکلات پیدا کر دینے سے مُتأثّر و ''مرعوب'' نہیں ہوتا۔ اُس کے نزدیک اصل یہ ہے کہ شرک سے اجتناب کیا جائے، اُس کی اُلوہیت کو چیلنج کرنے کی تمام ظاہری و باطنی شکلوں سے بچا جائے، اُسی کو سارے کارخانے کا حاکم و مالکِ مطلق جانا مانا جائے۔

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اُس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اِن علماے حق میں سرِ فہرست مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تھے، جن کا قلم بدعت، قادیانیت اور دیگر باطل فرقوں کے مقابلے میں شرر بار رہ چکا تھا۔ مولاناؒ نے اپنے امراض، پیرانہ سالی، کم زوری: ساری چیزوں سے بے نیاز ہو کر شیعیت کا، اُس کی تاریخ کا، اُس کے قدیم مآخذ کا اور جدید مراجع کا نیز خمینی کی تصنیفات وتحریرات کا گیرائی و گہرائی سے مطالعہ کیا۔

اور بہ قول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ:(۱)

''اِس مطالعے نے اُن کے ضعیف اور بیماریوں سے زار و نزار جسم میں ایک نئی حرکت وقوت اور فکر و مطالعے کی ایک نئی صلاحیت پیدا کر دی۔ اُنھوں نے اِس محنت وانہماک کے ساتھ کام شروع کیا کہ بارہا اُن کی صحت خطرے میں پڑ گئی اور اہلِ تعلق کو اِس بارے میں فکر وتشویش لاحق ہوئی؛ لیکن مولاناؒ اپنی افتادِ طبع اور

(۱) وفات: بہ روز جمعہ: ۲۲؍رمضان ۱۴۲۰ھ = ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء۔

زندگی بھر کے معمول کے مطابق اپنے کو اِس فکر سے باز نہیں رکھ سکے"۔ (۱)

مولاناؒ نے اس مذہب کا معروضی، متکلمانہ وعالمانہ ومؤرخانہ جائزہ لیا، جس کے نتیجے میں اُن کی محققانہ کتاب "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" معرضِ وجود میں آئی جو مذہب شیعہ کی مکمل تاریخ، اُس کے عقائد اور کتاب وسنت کی روشنی میں اُس کے عقائد سے اخذ کردہ نتائج کا اِتنا جامع مُرَقّع بن گئی ہے جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ شیعیت کا یہ جدید ترین اور بہترین مطالعہ ہے جو کسی بھی پڑھے لکھے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

مولاناؒ نے جس وقت اِس کتاب کو بالاقساط لکھنا اور "الفرقان" کے صفحات پر شائع کرنا شروع کیا، اُسی وقت میرے جی میں آیا کہ یہ کتاب وقت کی ضرورت ہے اور ہمیشہ کے لیے عموماً اور اِس وقت خصوصاً، اِس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عرب دنیا بھی تشیّع کے فتنے، اُس کی تحریف کاری اور جسمِ اسلامی میں اُس کے سرطانی عمل سے واقف ہو۔ نیز خمینی کی اپنے سلف کی شدید پیروی، صحابۂ کرام سے اُس کی اور اُس کے سلف کی بیزاری، تبرّا، سب وشتم، اور دل گداز اِلزامات کی چارج شیٹ سے واقف ہو۔ پھر "حکومتِ اسلامیہ" کا بھرم بھی اُس کے سامنے کھل جائے اور عالمِ اسلام کے نعرہ باز نوجوانوں پر اُس کا جو طلسم چلا ہوا ہے، اُس کے ٹوٹنے کی راہ ہموار ہو۔

یہ سوچ کر میں نے اُسے عربی قالب میں "الداعی" میں شائع کرنا شروع کیا۔ اِس موقع سے قدرتی طور پر مولاناؒ کی بے پناہ توجّہات سے سرفراز رہا۔ وہ اپنے خطوط کے ذریعے جہاں دعائیں دیتے، حوصلہ بڑھاتے؛ وہیں کسی جگہ عبارت کو حذف کردینے، یا اُس کی تعبیر بدل دینے، یا پیراگراف کے اِضافے اور مزید حوالوں کی نشان دہی کرتے۔

یہاں یہ ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اُنھی دنوں مولانا نعمانیؒ سے پہلے اُن کے صاحب زادۂ گرامی اردو کے ادیب ومشہور اِسلامی اہلِ قلم مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہ

(۱) "ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" ص: ۱۶، ساتواں ایڈیشن: الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ، یوپی۔

العالی کے مضامین خمینی اور اُن کے انقلاب کے حوالے سے ''الفرقان'' میں چھپے، جن میں سے بعض قسطوں کا راقم نے ''الداعی'' میں عربی میں ترجمہ کیا، پھر مولانا نعمانیؒ کے مضامین اِس موضوع پر بالاقساط ''الفرقان'' میں چھپنے شروع ہوے۔ اُس وقت ناچیز کے دل میں شدید داعیہ پیدا ہوا تھا کہ عربی زبان میں مفصل اور مرتب طور پر کوئی کتاب خمینی صاحب اور اُن کے اِنقلابِ ایران کے حوالے سے لکھی جائے؛ تاکہ عربوں کو صحیح صورتِ حال کی جان کاری ہو۔ اِس سلسلے میں، راقم نے مولانا نعمانیؒ سے مشورہ کیا تھا، جس کا حضرت نے نہ صرف مثبت جواب دیا؛ بل کہ حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ، بعض مراجع کی بھی نشان دہی فرمائی۔ اِس سلسلے میں اُن کا ایک مکتوب مندرجۂ ذیل تھا جس میں اور بھی بہت سی باتیں تھیں:

۱۴ رذی الحجہ ۱۴۰۴ھ

برادرِ عزیز ومکرم! أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْنَا وَإِلَيْكُمْ ، سلام ورحمت

عنایت نامہ مؤرخہ ۴ رذی الحجہ ۱۴۰۴ھ، عید سے پہلے ہی مل گیا تھا، اُس سے معلوم ہوا کہ میرا عریضہ آپ کو بعد میں مل گیا۔

اِس وقت صرف اِتنا عرض کرنا ہے کہ آپ نے جو کتاب ایرانی انقلاب اور خمینی سے متعلق مُرتَّب کرنے کا اِرادہ کیا ہے، اُس میں تبدیلی ہرگز نہ کریں، وہ مستقل کتاب ہوگی اور اِن شاء اللہ بہت مفید اور مؤثر رہے گی۔

آپ اُس میں مولوی عتیق الرحمٰن کے مضمون سے اور میرے اُن مضامین سے کام لیں گے، جو ''الفرقان'' میں ۳ قسطوں میں شائع ہو چکے ہیں، آخری قسط ماہِ رواں کے شمارے میں شائع ہوئی ہے، وہ ایک ہفتہ پہلے روانہ ہو چکا ہے، پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ دوسرے مآخذ سے جو لیا جاسکے۔

میرے پاس ''کَشْفُ الْأَسْرَار'' کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے، ضخیم کتاب ہے، تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کی ہے۔ میں نے تو صرف ایک بحث دیکھ کر اپنا کام پورا کرلیا، پوری کتاب کے مُطالَعے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میرا خیال

ہے کہ آپ اگر اس کا مطالعہ فرمائیں گے تو اور بہت کچھ آپ کو مل جائے گا۔ اگر چاہیں تو اِس مقصد سے دو تین دن وقت نکال کے لکھنؤ آ جایئے۔

آپ میری طرف سے اور میرے اِس خط کے حوالے سے، مہتمم صاحب سے کہہ سکتے ہیں کہ "کشف الاسرار" اور "الحکومۃ الاسلامیۃ" کا نسخہ دار العلوم کے کتب خانے میں رہنا ضروری ہے۔ یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور ان دونوں کتابوں کے ملنے کی بہ ظاہر امید نہیں، صرف یہی ہوسکتا ہے کہ ان کی فوٹو کاپی لے لی جائے۔

میرے پاس "الحکومۃ الاسلامیۃ" کا نسخہ ذاتی نہیں ہے، مولانا علی میاں کا ہے، اُنھوں نے اِیران جانے والے ایک صاحب کے ذریعے اِیران سے منگوایا ہے۔

بہ ہر حال آپ مناسب سمجھیں تو میری طرف سے مہتمم صاحب سے یہ کہہ سکتے ہیں اور اِس مقصد کے لیے بھی لکھنؤ کا سفر کر سکتے ہیں۔

اِس کتاب کی نوعیّت یہ ہے کہ اِس کا ابتدائی حصّہ تو یہی ہے جو ''الفرقان'' کی تین قسطوں میں آ گیا۔ اِس کا تعلق اصلاً صرف انقلابِ ایران اور ''خمینی'' کی شخصیّت سے ہے، اگر چہ اِس میں شیعیّت کا بھی خاصا تعارف ہو گیا ہے۔ یہ کتاب کے تقریباً اسّی صفحات پر آیا ہے، اِس کے آگے شیعیّت پر جو میں نے بہ راہِ راست لکھا ہے وہ قریباً دو سو صفحات پر ہے۔ وہ دراصل الگ مستقل کتاب ہے؛ لیکن میں نے اُن دونوں کو ایک کر دینا اِس لیے مناسب سمجھا ہے کہ اِس طرح شیعیّت والا حصّہ بھی لوگوں کی نظر سے گزر جائے گا، جس کو میں ضروری سمجھتا ہوں۔

مولانا عبداللہ عباس (۱) اگر کر سکے تو اُن کو پوری ہی کتاب ترجمہ کرنا

---

(۱) مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ سابق استاذ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ و جامعہ ام القری مکہ مکرمہ و بعدہ معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔ وفات: بہ روز یک شنبہ: یکم جنوری ۲۰۰۶ء مطابق یکم ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ بہ تقویم سعودی عربیہ و ۲۹/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ بہ حساب تقویمِ برصغیر ہندو پاک۔

ہے؛ لیکن آپریشن کے بعد سے اُن کا کوئی خط نہیں ملا ہے۔ خدا کرے بہ عافیت ہوں اور وہ یہ کام کرسکیں۔

اُنھوں نے پہلی قسط کا ترجمہ کر کے بھیج دیا تھا۔ بعد کے دو رسالے اگر اُن کو ملے ہوں گے، تو آپریشن کے بعد ملے ہوں گے۔ اُنھوں نے مارچ اپریل کے مشترکہ شمارے میں مضمون پڑھ کر خود ہی مجھے لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ اِس کتاب کا ترجمہ کروں، میں نے اُن کو لکھ دیا تھا کہ مجھے بڑی خوشی ہوگی، اس کے بعد اُنھوں نے شروع کر دیا اور پہلی قسط کا ترجمہ کر کے بھیج دیا۔

مکرر یہ کہ آپ نے جس کتاب کے لکھنے کا اِرادہ کیا ہے، اُس کو ضرور لکھیں یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ اِس پر مختلف لوگوں کو لکھنا چاہیے۔

میرا حال یہ ہے کہ بلڈ پریشر اکثر بڑھا رہتا ہے اور ضعف کی رفتار بھی اب تیز ہے۔ بس یہی دعا ہے: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ خَيْرَ عُمْرِيْ آخِرَهٗ، وَخَيْرَ عَمَلِيْ خَوَاتِيْمَهٗ، وَخَيْرَ أَيَّامِيْ يَوْمَ أَلْقَاكَ فِيْهِ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ يَا أَكْرَمَ الْأَكْرَمِيْنَ.

آپ سے بھی دعا کا طالب اور آپ کے لیے دعا گو ہوں۔

اپنی بدخطی اور اُس کے ساتھ زود نویسی کی کوشش کے لیے، معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

۱۹ر محرم ۱۴۰۵ھ

برادرِ مکرم محترم مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام مسنون

خدا کرے ہر طرح بہ عافیت ہو، میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مولانا عبداللہ عباس ندوی اِس کتاب کا ترجمہ کررہے ہیں۔ وہ آپریشن سے صحت یاب ہو کر

یہاں لکھنؤ آئے تھے، قریباً دو ہفتے رہے۔

کتاب کا جو حصہ ''الفرقان'' کی تین اِشاعتوں میں آچکا ہے، اُس کا ترجمہ تو اُنھوں نے مکمل کر کے حوالے کر دیا، اب آگے کتاب کا کر رہے ہیں اور اُن کا اِرادہ جلد ہی چند ہفتوں ہی میں اس کو مکمل کر دینے کا ہے اور پھر میں چاہوں گا کہ یہیں لکھنؤ میں وہ جلد ہی چھپ بھی جائے۔

آپ جو کتاب لکھنے کا اِرادہ فرما رہے تھے، اُس کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ اُس میں اگر میرے مضامین کا حوالہ دینا ہو تو ''الفرقان'' کا نہیں؛ بل کہ کتاب ہی کا دیا جائے اور اِس کے لیے عربی ایڈیشن کی تیاری کا انتظار کیا جائے۔

اصل اردو کتاب کی کتابت بفضلہ تعالیٰ ہوگئی ہے، طباعت ہی کا مرحلہ باقی ہے۔ قریباً تین سو صفحات ہوگئے۔ میں اِس حال میں بالکل نہیں ہوں کہ محنت کا کوئی کام کر سکوں۔ یہ کام بس اللہ تعالیٰ نے کرا دیا؛ فَلَهُ الْحَمْدُ وَلَهُ الشُّكْرُ.

ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ ''الداعی'' میں میرے مضامین کا جو عربی ترجمہ آیا ہے، میں نے تو اُس کی صرف ایک قسط دیکھی تھی اور میں اس کا مبصر نہیں ہوں؛ لیکن سجّاد میاں نے بتلایا کہ ترجمہ غالباً آپ کا نہیں ہے، کسی شاگرد سے کرایا ہوگا۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ ترجمہ آپ کی اِصلاح وتہذیب کا محتاج ہے؛ لیکن آپ جو کتاب لکھ رہے ہیں، وہ تو خود آپ کی مستقل تصنیف ہوگی اور اُس کو تو آپ نے خود ہی لکھا ہوگا۔

میں اِس حال میں ہوں کہ اِس مجلس شوریٰ میں بہ ظاہر شریک نہیں ہوسکوں گا۔ مہتمم صاحب کو اِس کی اطلاع بھی دے دی ہے؛ لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے سفر کے لائق کر دیا، تو اِن شاء اللہ حاضری ہوگی۔ دعا گو اور دعا کا محتاج ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

کسی وجہ سے مولانا عبداللہ عباس ندویؒ، مولانا نعمانیؒ کی کتاب ''ایرانی انقلاب،

امام خمینی اور شیعیت'' کی اولین قسطوں کا، جو''الفرقان'' میں شروع شروع میں شائع ہوئی تھیں، ترجمہ کرنے کے بعد مکمل کتاب کا ترجمہ نہ کر سکے، تو مولانا نعمانیؒ نے اِس ناچیز کو ہی اِس کے ترجمے کا حکم فرمایا، اِس سلسلے میں حذف و اضافے کے تعلّق سے یادگر قسم کی ہدایات دینے کے لیے بہت سے خطوط لکھے، جن میں سے اکثر خطوط حسبِ سابق اپنے قلم سے تحریر فرمائے، شاید ایک آدھ ہی خط آپ نے صاحب زادۂ محترم مولانا خلیل الرحمٰن سجّاد نعمانی مدظلہ یا نواسہ مولانا یحییٰ نعمانی کے ذریعے اِملا کرائے، میں اِن میں سے چند اہم خطوط کو اِس لیے یہاں نقل کر رہا ہوں کہ وہ تاریخی حیثیت کے بھی ہیں اور وقت کے ایک منفرد عالمِ دین و داعی اِلی اللہ کی علمی و فکری یادگار بھی، جن سے ہر اہلِ علم و قلم کو فائدہ اٹھانے اور تاریخ و سوانح نگاری میں اِن شاء اللہ آسانی ہوگی۔

ایک خط مرسلہ ۱۹۸۴/۴/۵ء میں تحریر فرماتے ہیں:

برادرِ عزیز و مکرم مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام و رحمت

خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں اور آنکھ کی تکلیف سے نجات مل چکی ہو۔ آپ جیسے آدمی کا آنکھ کی تکلیف میں مبتلا ہونا، بڑی فکر کا مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کامل صحت و شفا عطا فرمائے۔

مولانا علی میاں سے شیخ عبداللہ الانصاری (۱) کے بارے میں، میں نے آپ کی بات پہنچا دی تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے اُن سے اِس وقت ایک مسئلے میں شرمندگی ہے؛ اِس لیے فی الحال میں اُنھیں خط لکھنا مناسب نہیں سمجھتا، جب یہ مانع باقی نہیں رہے گا تو اِن شاء اللہ لکھ دوں گا۔ میں نے تفصیل دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

(۱) راقم نے چاہا تھا کہ شیخ عبداللہ الانصاری ''الداعی'' کی معقول مدد کے لیے، اپنی حکومتِ قطر سے سفارش فرمادیں تو رسالے کو ڈیولپ کرنے میں مدد ملے گی۔ شیخ، قطر کے بڑے اور ذی رُسوخ عالم و داعی تھے۔ وہ اور امورِ مذہبی کے ذمے دارِ اعلیٰ بھی تھے۔

میں نے آپ کو لکھا تھا سفر (۱) سے پہلے، آپ ایک دفعہ لکھنؤ آسکیں، جیسا کہ آپ نے اِرادہ ظاہر کیا تھا، تو میں ایک خط شیخ ابنِ باز (۲) کو خود بھی آپ ہی سے لکھاؤں گا، اُس کا تعلق دار العلوم سے نہ ہوگا؛ لیکن وہ اِن شاء اللہ آپ کے مقصد کے لیے خاص طور سے مفید ہوگا۔ اِس کے باوجود اگر آپ کے پاس وقت میں گنجایش نہ ہو تو اِصرار نہیں۔

اِس خط کے ساتھ ہی ''الفرقان'' کا تازہ شمارہ آپ کے لیے، مولانا مرغوب الرحمٰن کے پاس بھیجا جا رہا ہے، اُن کے خط میں بھی لکھ دیا ہے کہ وہ آپ کو پہنچوا دیں اور رسالے پر اِسی لیے آپ کا نام بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اُس میں ایرانی انقلاب اور ''خمینی'' کے بارے میں جو مضمون ہے، آپ اُس کا اہتمام سے عربی میں ترجمہ فرمائیں۔ ''الداعی'' میں بھی شائع ہوتا رہے اور میں اُس کو کتابی شکل میں شائع کرانے کا اِرادہ کر رہا ہوں۔ یہ اصل کتاب کا ابتدائی حصہ ہے، جیسا کہ اِس کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔

دعا گو اور دعا کا طالب۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

مولاناؒ کی خواہش تھی کہ کتاب عربی میں شائع ہوکر، بعض اُن نئے عربوں کے لیے چشم کشا ہو، جو کسی بھی نئے نعرے سے، نوجوانانِ عجم کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی، مخمور

(۱) مراد اِس سے وہ سفر ہے جو راقم نے اواخرِ اپریل ۱۹۸۴ء میں عمرہ کے لیے کیا تھا، اور جدہ اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ و ریاض میں طویل قیام کا موقع ملا تھا۔

(۲) شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، سعودی عرب کے اپنے دور کے سب سے بڑے مقبول و محبوب صالح عالم و خدا ترس بزرگ، جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے، اُس کے قیام کے وقت سے عرصے تک وائس چانسلر رہے، پھر سپریم علما کونسل کے صدر اور اِدارۂ دعوت و قضا و افتا کے رئیس عام کے عہدے پر موت تک فائز رہے۔ اُن کی وفات بہ روز جمعرات، ۲۶ محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳ مئی ۱۹۹۹ء کو ہوئی۔

ہو جاتے ہیں اور پھر صحیح بات اُن کے ذہن کے کسی خانے میں جگہ نہیں لے پاتی۔

راقم الحروف یہ عربی ترجمہ مکمل ہی کیا چاہتا تھا کہ ایک روز اچانک رجسٹرڈ ڈاک سے مولانا نعمانی ہی کی طرف سے، اِسی کتاب کے عربی ترجمے کا چھپا ہوا ایک نسخہ مجھے ملا، میں نے پیکٹ چاک کیا تو اُس کے سرورق پر "الثَّوْرَةُ الإِيرَانِيَّةُ فِي مِيزَانِ الإِسْلَامِ" اور مُترجِم کا نام "الدکتور سمیر عبدالحمید ابراہیم" (۱) لکھا ہوا تھا۔ چوں کہ مترجم عربی نژاد ہیں؛ اِس لیے اُن کے ادبی، علمی کمال کے اعتراف کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی جاتی ہے کہ وہ اُس وقت تک اردو الفاظ کے مابین دقیق فرق اور مختلف اردو تعبیرات کی نزاکتوں پر عبور حاصل نہیں کر سکے تھے؛ چناں چہ ترجمے میں خاصے نقائص راہ پا گئے تھے، بہت سی جگہ افکار و خیالات اپنی کیفیات کے ساتھ عربی میں منتقل نہیں ہو سکے تھے، کہیں کہیں مطلب بھی بدل گیا تھا۔ مولانا ذہین ترین علما میں تھے؛ اِس لیے اُنھیں یہ بات گراں گزری اور اُن کا اِصرار رہا کہ راقم اپنے قلم سے ترجمے کی تکمیل کر دے؛ تاکہ کتاب صحیح شکل میں عربوں کے سامنے آ سکے؛ لیکن ایک عربی کے قلم سے ترجمے کے شائع وذائع ہو جانے کے بعد، مجھے اب اپنے ترجمے کی تکمیل "تحصیلِ حاصل" سی محسوس ہوئی اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اِطاعت کے بھرپور جذبے کے باوجود، میں اِس کے لیے اپنے کو تیار نہ کر سکا۔

---

(۱) یہ ڈاکٹر سمیر عبدالحمید ابراہیم ایک مصری فاضل اور جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض میں استاذ ہیں۔ عرصے تک پاکستان رہ کر اردو زبان محض اِس لیے سیکھی ہے تاکہ اسلامی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر سکیں۔ کئی اہم اسلامی اردو کتابیں اُن کی تعریب کردہ عالم عربی سے چھپ چکی ہیں، جن میں مولانا نعمانیؒ کی اِس کتاب کے علاوہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم الباکستانی (متوفی ۱۳۹۶ھ = ۱۹۷۶ء) کی کتاب "مقام صحابہ" کا عربی ترجمہ بھی میری نظر سے گزر چکا ہے۔ ابھی حال ہی میں اُن کی ایک محققانہ اور ضخیم کتاب "الألفاظ العربية في اللغة الأردية" آئی ہے، جس کی جمع و تالیف میں جہاں اُنھوں نے بہت سی کتابوں سے فاۂ اٹھایا ہے؛ وہیں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی (متوفی ۱۴۱۵ھ = ۱۹۹۵ء) کی "القاموس الجديد" اردو سے عربی، عربی سے اردو اور "القاموس الاصطلاحي" وغیرہ سے بھی استفادہ کیا ہے اور مراجع کے طور پر اُن کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ مشہور اسلامی اہل قلم ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کے دوستوں میں ہیں، ڈاکٹر عویس چند سال پہلے تک جامعۃ الامام محمد، ریاض میں استاذ تھے، میں اُن کی مجلس میں ڈاکٹر سمیر صاحب سے مل چکا ہوں۔

اِس سلسلے میں بھی حضرت مولانا نعمانیؒ نے ناچیز کو ایک سے زائد خطوط لکھے، وہ سب تو محفوظ نہیں رہ سکے؛ لیکن اُن میں سے ایک خط یہ تھا:

۶رشوال ۱۴۱۲ھ

برادر مکرم ومحترم جناب مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب! زید لطفکم،

سلام ورحمت

خدا کرے آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں، میرا اندازہ ہے کہ جب تک میرا یہ عریضہ دفتر "الداعی" پہنچے گا آپ ماہِ مبارک کی تعطیل وطن میں گزار کے واپس آجائیں گے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

مجھے یاد آتا ہے کہ میری کتاب "ایرانی انقلاب، خمینی اور شیعیت" جب "الفرقان" میں قسط وار شائع ہوئی تھی، تو آپ نے از راہِ عنایت "الداعی" میں اُس کو عربی میں منتقل کر کے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ خیال آتا ہے غالباً دو تین قسطیں "الداعی" میں شائع ہوئی تھیں۔

مصر کے عبدالحلیم عویس صاحب نے پوری کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا اور میری اِجازت سے خود ہی اُس کا ترجمہ کرا کے شائع کیا تھا۔ یاد آیا کہ وہ کتاب آپ کی نظر سے گزر چکی ہے۔

اب اصل کتاب، کافی اِضافوں کے ساتھ، شائع کرانے کا اِرادہ ہے۔ اردو ایڈیشن کا کام بفضلہٖ تعالیٰ مکمل ہو چکا ہے۔ عربی ایڈیشن کی بھی تیاری کا اِرادہ ہے۔ میں نے اب تک مصری ایڈیشن پر کہیں کہیں نظر ڈال لی تھی۔ اندازہ ہوا تھا کہ ترجمے میں نقائص ہیں، غلطیاں بھی ہیں۔ آج پہلے دن اُس کو شروع سے پڑھوا کر سنا، اندازہ ہوا کہ نقائص اور غلطیوں کے بارے میں جو پہلا اندازہ تھا، غلطیاں اُس سے زیادہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ "الداعی" میں اُس کے ابتدائی حصے کا جو ترجمہ شائع ہوا تھا، اُس کو لے لیا جائے۔ آپ زحمت فرمائیں اور جن شماروں

میں وہ شائع ہوا تھا، وہ رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کرادیں، ذرا جلد ہی۔

دلی تمنا ہے کہ اردو اور عربی ایڈیشن میری زندگی ہی میں شائع ہو جائیں۔

اِس سلسلے میں اگر آپ کو کوئی زحمت دینی ہوگی، تو بعد میں عرض کروں گا۔

میرا حال یہ ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ زندہ ہوں؛ لیکن اللہ کی عطا فرمائی ہوئی قوتیں ایک خاص رفتار سے، رخصت ہو رہی ہیں۔ بہت جی چاہتا ہے کہ دارالعلوم کے خاص تعلق رکھنے والے حضراتِ اساتذہ سے، جن میں آپ کا ایک خاص درجہ ہے، الوداعی ملاقات کی غرض سے حاضری کی توفیق مل جائے۔

اپنے حال کو دیکھتے ہوے کچھ زیادہ امید نہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت اور رحمت پر نگاہ رکھتے ہوے، مایوسی بھی نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم سے مُقدَّر فرمادے۔

دعاؤں کا محتاج اور طالب ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی
بہ قلم یحییٰ نعمانی

عشق جسور وفقر غیور کی جلوہ گری

مولانا نعمانیؒ کی تمام تصنیفات، نگارشات، اور علمی ودعوتی کاموں میں جو برکت نظر آتی ہے، ایک خاص قسم کی روشنی پھوٹی پڑتی ہے، ایسی کشش ہے جس کا سرچشمہ محض الفاظ کا حسن، تعبیرات کا جمال، ترکیب کی خوبی، بیان کی رعنائی، طرزِ ادا کی زیبائی، نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً جب ہم یہ ذہن میں رکھیں کہ اُن کے ہاں الفاظ کے بناؤ سنگار، اور تراش وخراش پر بالاِرادہ زور نہیں ہوا کرتا تھا۔ اِس کے باوجود اُن کی چھوٹی بڑی تمام تصنیفات بے حد مقبول ہیں۔ اُن کے تراجم بہت مُتدَاوَل ہیں۔ اُن کے ذریعے ہزاروں بندگانِ خدا کو دین کے جاننے، سمجھنے، اور اُس کے تقاضوں پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی ہے۔ اُن

کی تالیفات اور مطبوعہ تقریریں عام مسلمانوں کے لیے، دین سمجھنے کے حوالے سے ایک عام اور ناگزیر ضرورت بن گئی ہیں: یہ سبھی چیزیں وہ ہیں جو ایک بندۂ خدا، ایک مقبولِ بارگاہِ الٰہی، ایک ایسے عالم ہی کی تصنیفات واعمال میں ہوسکتی ہیں جس کو توفیقِ الٰہی کی دولت، خدا کے صالح بندوں کی صحبت، خاصان خدا کی تربیت، مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کی توجّہات سے سرفرازی اور اُن کی خصوصی دعاؤں سے بہرہ یابی حاصل رہی ہو۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

کوئی عالم، مصنف، اہلِ قلم، داعی، فقیہ، محدث، قائدِ دینی، مصلحِ اِجتماعی: بل کہ ادیب، شاعر اور فن کار؛ خواہ کتنا ہی قد نکال لے: وہ محض علم واطلاع کے بل بوتے پر اور صرف ذہانت وذکاوت، عقل وعبقریّت، دورنگاہی وروشن خیالی کے سہارے: اپنے کام میں برکت کا نور، مقبولیّت کی سحر کاری، قدر افزائی وپسندیدگی کی جاذبیّت پیدا نہیں کرسکتا؛ اگر اُس کے کام کا خمیر خونِ جگر، نورِ تقویٰ، تب وتابِ اِخلاص، بے تابیِ عشقِ رسول، سرشاریِ محبتِ الٰہی، لذّتِ سحر خیزی، ذوقِ عبادت اور شوقِ ریاضت سے نہ اٹھا ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو کسی عمل کو صاحبِ عمل کے لیے اور خلق خدا کے لیے، ذریعہ فائدہ رسانی اور باعثِ حیاتِ جاودانی بنا دیتی ہے۔

واقف ہو اگر لذّتِ بیداریِ شب سے
اونچی ہے ثُریّا سے بھی یہ خاکِ پُر اَسرار

مولانا نعمانی نے رائے پور (ضلع سہارن پور) کی خانقاہ اور مولانا محمد الیاسؒ کی صحبت ودعوت سے محبت کا جامِ آتشیں نوش کیا تھا؛ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے نفسِ گرم سے تاثیر حاصل کی تھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۳۹ھ=۱۹۲۰ء) کی زیارت سے فیض پایا تھا؛ عارف باللہ مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۴۷ھ= ۱۹۲۸ء) مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۳۴۸ھ

=۱۹۲۹ء) حکیم الامت حضرت تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ=۱۹۴۳ء) شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ=۱۹۵۷ء) شاہ وصی اللہ فتح پوری گورکھپوری ثم الالہ آبادیؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ=۱۹۶۷ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنیؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ=۱۹۸۲ء) اِمام اہلِ سنت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ (متوفی ۱۴۰۱ھ=۱۹۸۱ء) کی صحبت ومعیّت وعلمی استفادے اور روحانی استفاضے کے حوالے سے قدَح خوار رہے تھے اور اُن کی مومنانہ نگاہ سے اپنی ''تقدیر بدلوانے'' میں مدد لی تھی۔ محمد عربی مکی مدنی ہاشمی قرشی ﷺ کے اِن عاشقانِ پاک طینت ونیک سیرت سے، سلیقۂ عشق ومحبت اور دین کے لیے جینے مرنے کا ذوق حاصل کیا تھا؛ اِسی لیے اُن کی تحریر میں جو لذّتِ گفتار اور گرمیِ کردار ہے، وہ ہر عام وخاص کو مُتاَثّر کرتی اور گرویدہ بنا لیتی ہے۔ اللہ نے اُن کی مقبولیت کا نظارہ ہم لوگوں کو اِس طرح دکھا دیا کہ ایک ڈیڑھ لاکھ کے مجمع نے، اُن کی نمازِ جنازہ ادا کی اور سخت دھوپ میں ۸ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے لکھنؤ کے ''عیش باغ'' قبرستان میں اُن کی آخری آرام گاہ تک اُنھیں رخصت کیا۔

مولانا کی چند خصوصیّات

● مولاناؒ ذہین اور قوی الحافظہ تھے، اُنھیں درسی کتابوں کی عبارتیں، فقہ کے متون اور بہت سی اَحادیث زبانی یاد تھیں۔ بہ وقتِ ضرورت بالفاظہٖ زبانی، پڑھ جاتے تھے۔ کسی عالم کی گفتگو کو عرصے کے بعد بھی اُنھیں کے الفاظ میں لکھ اور بول لیتے تھے۔(۱) واقعات وحالات کو بغیر کسی کمی اور زیادتی کے بیان کرنے پر بھی اُنھیں عجیب سی قدرت تھی، اپنے ملنے والوں کو عرصے کے بعد بھی دیکھ کر پہچان لیتے تھے۔ سال ہا سال سے

(۱) ''تحدیث نعمت'' میں ص: ۱۳۹ سے ۱۸۶ تک، حضرت تھانویؒ کی خدمتِ اقدس میں اپنی بار بار کی حاضریوں کے ضمن میں بہت سے مسائل پر حضرت کے ساتھ تبادلۂ خیال اور گزارشات کے اپنے الفاظ اور حضرت تھانوی کے جوابات کے متون مولاناؒ نے اکثر جگہ سال ہا سال کے بعد، اپنے حافظے کی مدد سے لکھے ہیں اور اکثر جگہ فرمایا ہے کہ جہاں تک یاد پڑتا ہے اصل الفاظ یہی تھے۔

بیماری اور کم زوری کے باوجود موت سے ذرا پہلے تک بھی، اُن کا حافظہ اور دماغ صحیح طور پر کام کرتا رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیث وفقہ کے ساتھ، اُن کے مسلسل اور طویل اشتغال کی یہ برکت تھی۔ فقہا اور محدثین عموماً قوی الحافظہ اور ذہین ہوے ہیں؛ کیوں کہ قوتِ حافظہ خدائی روشنی ہے، جس سے صالحین کو سرفراز کیا جاتا ہے۔ امام شافعی کا زبان زدِ خاص وعام قطعہ ہے کہ ''میں نے اپنے استاذ حضرت وکیعؒ سے اپنے حافظے کی کم زوری کی شکایت کی تو آپ نے مجھے معاصی سے اجتناب کی تلقین کی کہ قوتِ حافظہ نورِ الٰہی ہے جو کسی عاصی کو نہیں دیا جاتا'' (۱)۔

● ذہانت کی بنا پر مولاناؒ مسائل کی تہوں اور اُن کے ممکنہ گوشوں تک بہت جلد پہنچ جایا کرتے تھے، پھر جلد ہی اُن کے مناسب حل تک بھی اُن کی رسائی ہو جاتی تھی۔

● وہ صائب الرائے اور دور بیں بھی تھے، طویل تجربات، سمجھ داری، زمانے کے نرم گرم سے مسلسل سابقہ اور زندگی کے دراز سفر نے اُنھیں یہ صفت عطا کی تھی۔ میں دیکھتا تھا کہ حسّاس مسائل اور ملک وملت کے نازک معاملات میں بڑے بڑے علما وقائدین، اُن سے رجوع کرتے اور اُن کی رائے معلوم کر کے اُسی پر عمل کرتے تھے۔

● حالاتِ حاضرہ اور تقاضاہاے زمانہ پر اُن کی گہری نگاہ تھی؛ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کس مسئلے کے لیے کیا اِقدام کرنا چاہیے اور دعوتِ دین کو عوام وخواص میں مقبول بنانے کے لیے، اِس وقت کن پتھروں اور روڑوں کو ہٹانے کی فی الفور ضرورت ہے اور اُنھیں کس طرح ہٹایا جانا چاہیے۔ مغربی تہذیب کے نشے سے چور اور عصری تعلیم سے مخمور ذہنِ نو کو کس طرح مُخاطَب کیا جائے؟ خوب جانتے تھے ''عصری حسیّت'' کے ماہر تھے اور حضرت علی بن ابی طالب کَرَّمَ اللّٰهُ وَجهَهٗ کے حکیمانہ مقولہ

---

(۱) وہ قطعہ یہ ہے:

شَكَوْتُ إِلَىٰ وَكِيعٍ سُوْءَ حِفْظِي ... فَأَرْشَدَنِي إِلَىٰ تَرْكِ الْمَعَاصِي

فَإِنَّ الْعِلْمَ نُورٌ مِنْ إِلٰهِي ... وَنُورُ اللّٰهِ لَا يُهْدَىٰ لِعَاصِي

"كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ" (لوگوں سے اُن کی سمجھ کے مطابق خطاب کیا جائے تاکہ وہ نادانی سے اللہ ورسول کی بات کی تکذیب نہ کریں) پر اچھی طرح عمل کرنا جانتے تھے۔ اُن کی تمام تحریریں اور تقریریں اِس کی شاہدِ عدل ہیں۔

● علمی مباحث ہوں، یا فرق ومذاہب، یا نظریات ورجحانات: اُن کے درمیان موازنہ اور تجزیہ ایسا کرتے کہ بڑے بڑے مدعیِ تحقیق کو بھی تشفی ہوجاتی اور ہر پڑھے لکھے کو اُن کی رائے دل لگتی بات محسوس ہوتی۔ باطل فرق ومذاہب اور دعوات وتحریکات، اُن کے مزاج ومذاق، اُن کے منشاے زیغ وضلال وطریقۂ اِضلال پر، اُن کی نگاہ ہمہ گیر تھی۔

● وہ اِظہارِ حق میں بھی جری واقع ہوے تھے، اِس سلسلے میں واقعی کسی ملامت کرنے والے کی ملامت، دوستوں کی ناراضگی اور اپنوں کے بُرا ماننے کی پروا نہ کرتے تھے، بشرطے کہ اُنھیں یقین ہوجائے کہ فلاں بات حق ہے، ضمیر کا یہی تقاضا ہے اور اللہ رب العزت کے نزدیک یہی پسندیدہ ہے۔ وہ پرانے کپڑوں کی طرح تبدیلیِ رائے سے بھی مکمل گریزاں تھے۔

● وہ رقیق القلب، بہ جلد آبدیدہ ہوجانے والے اور بہت گریہ کناں تھے۔ حضور ﷺ آپؐ کے صحابہؓ اور صلحاے امتؒ کے تذکرے سے روئے بغیر گزرنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ اپنے تمام اساتذہ ومشائخ کی یک ساں قدر کرتے تھے اور اُن کے اختصاص کے گوشوں میں اُن سبھوں سے استفادے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ہر چند کہ اُنھیں علامہ کشمیری، شیخ عبدالقادر رائے پوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور شیخ الحدیث زکریا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے زیادہ مناسبت تھی اور اُنھیں سے زیادہ اکتسابِ فیض بھی کیا۔

دارالعلوم دیوبند سے عشق

وہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے عاشقِ صادق، اُس کے مسلک کے سرگرم ترجمان،

بدعت وقبوریّت کے لیے شمشیرِ برہنہ اور ہمارے علما کی صف میں اِس سلسلے میں زیادہ واضح موقف رکھتے تھے۔ دارالعلوم سے اُن کا عشق ایک اِحسان مند کا اپنے محسن کے اِحسان اور اپنے مُنعِم کی بخششوں کی قدر دانی سے عبارت تھا۔ وہ زندگی بھر اُس کے آتشِ عشق میں جلتے اور اُس کی محبّت کی شراب صبوحی وغبوقی پیتے رہے۔ جب تک کسی طرح بھی دیوبند آنے کی سکت باقی رہی، مجلسِ شوریٰ میں بلاناغہ شرکت کی؛ لیکن جب طرح طرح کے اَمراض واَعذار نے چلنے پھرنے سے مجبور کردیا، تو ہمیشہ اُن کی تمنا رہی کہ کاش وہ ایک مرتبہ دارالعلوم آجائیں، دارالعلوم کے در و دیوار پر ایک نگاہ کسی طرح ڈال لیں، طلبہ واساتذہ سے آخری دفعہ ملاقات کرلیں، مجلسِ شوریٰ کے ارکان اور ذمہ داران میں حیات اپنے دوستوں کو الوداع کہہ لیں۔ دو ایک مرتبہ عشق نے جب زیادہ ستایا، تو اپنے کئی اعِزّا کے سہارے وہیل چیر پر بیٹھ کر نہ جانے کتنی مشقتوں سے ریل گاڑی کے ذریعے سفر کرکے دارالعلوم پہنچے۔

وہ آخر دم تک دارالعلوم کے اہم معاملات میں ذمہ داروں کو مشورے دیتے رہے، خصوصاً دارالعلوم کے موجودہ مہتمم مردِ صالح حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی کو، جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک مربی بزرگ اور سرپرست کو کھو کر بڑی تنہائی محسوس کررہے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راقم الحروف مولانا نعمانیؒ کے اِس عاجز کے نام مکتوبات میں سے چند اُن خطوط کو یہاں نقل کردے، جن سے جہاں اِس کم ترین کے ساتھ اُن کی غیر معمولی شفقت ومحبت کا انداز ہوتا ہے، وہیں دارالعلوم کے ساتھ اُن کے عشقِ بے پناہ کی بھی عکاسی ہوتی ہے، اُنھیں پڑھ کر قاری کو محسوس ہوگا کہ وہ ہر وقت اور ہر طرح دارالعلوم کی خیر خواہی اور بھلائی کی سوچتے رہتے تھے اور وہ دارالعلوم کے سچّے اور مخلص فرزند تھے، جس کو دارالعلوم کے کام ومقام اور کردار کی بصیرت مندانہ آگہی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ اُس کی بقا، برِّصغیر میں ملتِ اسلامیہ کی اپنے تمام تشخّصات کے ساتھ بقا کا سب سے بڑا اور طاقت ور ذریعہ ہے:

۱۱/جنوری ۱۹۸۳ء

برادرمکرم! زیدمجدکم سلام ورحمت

دسمبر کے غالباً آخری عشرے میں "الداعي" کا وہ شمارہ آیا تھا، جس میں آپ نے مدیر "المجتمع" (۱) کے نام مولانا علی میاں کا مکتوب شائع کیا تھا۔ میں نے اُس شمارے کا اکثر حصہ پڑھا تھا اور جی خوش ہوا تھا اور آپ کو خط لکھا تھا، جس میں جہاں تک یاد ہے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کو "دین وشریعت" اور "اِنسانیت زندہ ہے" بھیجنے کا اِرادہ ہے۔ اگر معلوم ہوجائے کہ شیخ الحدیثؒ نمبر آپ کو نہیں ملا، تو وہ بھی ساتھ شامل کردیا جائے گا۔

آپ کا خط نہ آنے سے شبہہ ہوتا ہے کہ یا تو میرا وہ خط آپ کو نہیں ملا، یا آپ نے لکھا ہو تو وہ مجھے نہیں ملا۔ کئی ہفتوں سے ڈاک کا نظام نہایت ہی خراب ہے۔

بہ ہرحال آج دفتر والوں نے بتایا ہے کہ وہ دونوں کتابیں اور میرا خط بہ نام شیخ محمد علی الحرکان (۲) امین عام "رابطہ عالمِ اسلامی" کی فوٹو کاپی آپ کو رجسٹرڈ روانہ کررہے ہیں۔

میں نے آپ کو لکھا تھا کہ "المجتمع" میں جب پہلی دفعہ دارالعلوم

(۱) ہفت روزہ "المجتمع" عربی جو کویت کی "جمعية الإصلاح الاجتماعي" کا ترجمان ہے اور اب بھی پابندی سے شائع ہوتا ہے، اُس میں دارالعلوم کی نئی انتظامیہ کے تعلق سے، اُس وقت بعض نامناسب باتیں شائع ہوئی تھیں۔ مولانا علی میاںؒ نے رسالے کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے، اُس کے مدیر کو خط لکھا تھا۔

(۲) محمد علی الحرکان ۱۳۹۶ھ میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سکریٹری جنرل منتخب ہوے، جس پر اپنی وفات ۸/رمضان ۱۴۰۳ھ تک برقرار رہے۔ وہ مدینہ منورہ میں ۱۳۳۳ھ = 1915ء میں پیدا ہوے، مدرسہ علوم شرعیہ (جس کو حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادیؒ نے مدینہ منورہ میں قائم کیا تھا) میں ۷ رسال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا اور ساری دینی تعلیم اسی میں اور مسجد نبوی میں حاصل کی۔ ۱۳۵۲ھ سے مسجد نبوی میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ ۱۳۵۶ھ میں "العلا" اور "جدہ" کے قاضی رہے، وہ بعد میں وزیرِ عدل بھی رہے۔ وہ بڑے عالم، انتہائی متواضع اور اچھے منتظم تھے۔

سے متعلق وہ مضمون شائع ہوا تھا، جس پر مولانا علی میاں کا فوٹو دیا گیا تھا، تو اُس کو دیکھ کر اور غالباً رجب ۱۴۰۲ھ کے ''البلاغ'' (۱) کے انتہائی زہریلے مضمون کو بھی دیکھ کر شیخ ''حرکان'' نے مجھے بھی استفساری خط لکھا تھا، اُس کا جواب میں نے تفصیل سے سجاد میاں سلمہ سے لکھوایا تھا، یہ اُس کی فوٹو کاپی ہے جو آپ کو بھیجی جارہی ہے، آپ اِس کو 'الداعی' میں شائع کر سکتے ہیں۔ مولانا علی میاں کا جو مکتوب آپ نے شائع کیا ہے، اُس کی فوٹو کاپی بھی میرے پاس تھی، وہ بھی ساتھ میں رکھ دی گئی ہے۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔

گذشتہ مہینے مولانا وحید الزماں صاحب (۲) کا عنایت نامہ ملا تھا کہ مجھے آپ کا خط مل گیا ہے، اِن شاء اللہ اگلے مہینے لکھنؤ آنے کی کوشش کروں گا؛ لیکن اگلا مہینہ جنوری شروع ہوا تو اپنے ساتھ ایسی سرد لہر لے کر آیا کہ ایسے میں بس اشد ضروری وہی کام کیے جاسکتے ہیں جو لحاف میں بیٹھ کر کیے جاسکتے ہوں۔ امید ہے کہ موسم کے معتدل ہونے پر مولانا موصوف سے ملاقات ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اُن کو کامل ہمت و توانائی عطا فرمائے اور دارالعلوم کو اُن کی صلاحیتوں اور قیمتی وجود سے نفع پہنچائے۔ دارالعلوم کا بڑا قابلِ فکر مسئلہ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کی جو اصل میراث تھی: اِخلاص و تقویٰ اُس سے ہم خالی ہوگئے ہیں اور بہت ہی پست قسم کے جذبات و اَغراض نے ہم پر قبضہ کرلیا ہے۔ میں خود اپنا جائزہ لیتا ہوں تو میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوسی نہیں ہے، وہ مُردوں میں بھی جان ڈال دیتا ہے۔ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و رحمت سے

---

(۱) ہفت روزہ 'البلاغ' عربی زبان میں کویت سے نکلتا ہے، اُس میں اُس وقت دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ پر سخت تنقید کی گئی تھی۔

(۲) متوفی: ۱۴۱۵ھ = ۱۹۹۵ء

دارالعلوم کو وہی بنادے جو اُس کو ہونا چاہیے۔ یہ عاجز دعا گو اور دعاؤں کا محتاج وطالب ہے۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

فروری ۱۹۸۳ء، ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ میں اِس عاجز کو پہلی بار سعودی عرب جانے اور حرمین شریفین کی زیارت وعمرہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ جامعۃ الملک سعود ریاض میں غیر عربوں کو عربی زبان کی تدریس کا کام کرنے والے اساتذہ کے لیے، وہاں تین ماہ کے مختصر ٹریننگ کورس میں حاضری، اِس سعادت کے حصول کی تقریب بنی۔ وہاں قیام کے دوران اندازہ ہوا کہ عالمِ عربی میں دارالعلوم کے تعارف کی شدید ضرورت ہے؛ کیوں کہ یہاں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی دارالعلوم سے شاید و باید ہی واقف ہے۔ اِس خواہش کا اِظہار ایک عریضے میں حضرت مولانا نعمانیؒ سے تفصیل سے کیا گیا اور سعودی عرب کے لیے بہ طورِ خاص ایک موقر وفد بھیجے جانے کی بات کہی گئی، جس میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء - ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) مولانا اکبر آبادیؒ (۱۳۲۵/ ۱۹۰۷ء - ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)، حضرت الاستاذ مولانا کیرانویؒ (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء - ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) وغیرہ کے شامل ہونے کی نشان دہی کی گئی، مولانا نعمانیؒ نے اُس کے جواب میں یہ مکتوب جامعۃ الملک سعود کے اُس وقت کے معهد اللغة العربية کے پتے: پوسٹ بکس نمبر ۴۲۷، ریاض، نزد وزارت دفاع، مطار اسٹریٹ پر ارسال فرمایا۔

ازطرف محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

۲۳ر اپریل ۱۹۸۳ء

برادرِ مکرم! زید مجدکم، سلام ورحمت

قریباً ایک مہینہ ہوگیا ہوگا، آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا تھا، اُس میں سب سے اہم بات وفد دارالعلوم کی عرب ممالک کے دورے سے متعلق

تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اِس بارے میں مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب سے گفتگو کر کے آپ کو متعین جواب لکھ سکوں، گذشتہ مہینے سے اُن کی آمد کا انتظار تھا؛ لیکن وہ اب آسکے۔

صورتِ حال یہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی طبیعت ناساز چل رہی ہے اور آپ نے بھی لکھا ہے اور میں بھی اُن کی شرکت ضروری سمجھتا ہوں۔ اُن کے علاوہ مولانا اکبر آبادی کو ہندوستان کے خاص شہروں کے دورے پر جانا ہے، اُس کے بعد رمضان سے پہلے وقت نہیں رہتا۔ بہ ظاہر اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو عرب ممالک کا دورہ آیندہ سال ہی ہو سکے گا۔ آپ بھی غالباً عن قریب ہی آنے والے ہوں گے۔ امید ہے کہ آپ کا یہ قیام خود آپ کے لیے بھی اور دار العلوم اور جماعت کے لیے بھی مفید ہوگا۔ اب بفضلہٖ تعالیٰ اِس حال میں ہوں کہ ضروری خطوط خود ہی لکھتا ہوں، اگر چہ مختصر ہی لکھ سکتا ہوں۔ آپ سے بھی مختصر نویسی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ آپ کی دل میں خاص جگہ ہے۔ خدا کرے کہ آپ حرمین شریفین کی حاضری کی سعادت حاصل کر چکے ہوں۔ دعاؤں کا محتاج و طالب اور دعا گو ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

۶ رشوال ۱۴۰۳ھ = ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء بہ روز یک شنبہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دار العلوم دیو بند کی وفات حسرت آیات کا واقعہ پیش آیا، جس نے پوری جماعتِ دیو بند کو شکستہ کر کے رکھ دیا، اس موقع سے مولانا نعمانیؒ نے مندرجۂ ذیل مکتوب ناچیز کے نام اِرسال فرمایا، جس سے دار العلوم کے تعلق سے اُن کی غیر معمولی دلچسپی اور حکیم الاسلامؒ سے اُن کے گہرے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے:

لکھنؤ، ۹ رشوال ۱۴۰۳ھ

برادرِ عزیز و مکرم! زید مجدکم، سلام و رحمت

عنایت نامہ ماہِ مبارک کے عشرۂ اخیر میں مل گیا تھا، میں نے اِرادہ کرلیا تھا کہ اِن دنوں میں جو خطوط آئیں گے، اُن کا جواب یا اطلاع: رسید بعد عید ہی دے سکوں گا۔ ڈاک کا ڈھیر ہے، جس کو دیکھ کے بھی ڈر لگتا ہے، چھو بھی نہیں سکا ہوں۔

اِس وقت آپ کو صرف اطلاع: رسید دے رہا ہوں۔ جو کچھ آپ نے لکھا تھا، اُس پر زبانی ہی بات ہو سکے گی، جب بھی اللہ موقع دے۔(۱) قاری صاحب علیہ الرحمۃ کا حادثہ، میرے لیے بہت رنج و دکھ کا باعث ہوا، کاش ہم اب سے دو سال پہلے اٹھا لیے گئے ہوتے لَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلُ وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ وَاعْفُ عَنْهُ .

یہ عریضہ ایسے وقت ملے گا کہ دار العلوم کھل چکا ہوگا، اِس وقت وہاں کی جو صورتِ حال ہے، خاص کر قاری صاحبؒ کے حادثے کے بعد جو فضا ہے اور جو ہو رہا ہے، وہ مجھ کو ضرور لکھ دیجیے۔ میں یہ زحمت صرف آپ ہی کو دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ مختصر مختصر جملوں میں حتی الوسع پوری صورتِ حال لکھ دینے کی کوشش کیجیے۔ میں منتظر رہوں گا۔ حتی الوسع جلدی ہی۔

میں اِن شاء اللہ اپنے احساسات ''الفرقان'' میں لکھنے کی کوشش کروں گا، جو امید ہے کہ ۱۰-۱۲ دن میں شائع ہوجائے گا۔ ڈاک کا آخری وقت ہے، انتہائی عجلت میں یہ سطریں گھسیٹ رہا ہوں، معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

حکیم الاسلامؒ کی وفات کے بعد دار العلوم اور دیو بند کی صورتِ حال ناچیز نے

(۱) میں نے دار العلوم کے احوال اور نئی انتظامیہ کے مکمل طور پر قدم نہ جما پانے کی وجہ سے رسا کشی، آپسی اختلاف اور اپنی اُلجھنوں اور دلی بے کیفی کا تذکرہ، مولاناؒ کے نام اپنے عریضے میں کیا تھا، مولانا نے اُسی کی طرف اِشارہ کیا ہے۔

تفصیل سے حضرت مولانا نعمانیؒ کو لکھی، تو اُن کا مندرجۂ ذیل جواب آیا:

"لکھنؤ، ۱۹؍شوال المکرّم ۱۴۰۳ھ = ۳۰؍جولائی ۱۹۸۳ء

برادرِ مکرم ومحترم! أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكُمْ وَإِلَيْنَا، سلام ورحمت

آپ کا مفصل مکتوب مؤرخہ ۲۷؍۷؍۱۹۸۲ء آج مل گیا، بڑی غیر معمولی سی بات ہے، آج کل یہاں ڈاک کا حال اِتنا خراب ہے کہ دیوبند اور دوسرے بعض قریبی مقامات کے خطوط دو دو ہفتے میں ملتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، آپ نے بڑی تفصیل سے صورتِ حال لکھ دی، مجھے اِس کے معلوم کرنے کی بڑی ضرورت تھی، اِس وقت اِن سطروں کے ذریعے، صرف اطلاع: رسید لکھ رہا ہوں؛ تاکہ آپ کو اطمینان ہو۔

آپ کی نظر سے مئی، رجب کا شمارہ نہیں گزرا، اُس میں غازی احمد صاحب اور اُن کی آپ بیتی "من الظلمات إلى النور" کا تعارف کرایا تھا۔ اُس میں، میں نے اِس کا ذکر کیا ہے کہ وہ ملک کی تقسیم سے پہلے ایک طالبِ علم کی حیثیت سے قریباً ڈیڑھ سال اپنے دار العلوم میں بھی رہے ہیں۔(۱)

مجھے تو اُن کے بارے میں شک وشبہہ ہوتا؛ لیکن اُنھوں نے کتاب میں جن حضرات کا ذکر کیا ہے، اُن میں کئی ایک میرے دوستوں میں ہیں اور حیات ہیں۔ اِس سلسلۂ "منتخبات" کی دوسری قسط اگست کے شمارے میں آرہی ہے، جو اِن شاء اللہ اِس ہفتے میں روانہ ہوجائے گا۔

کتاب کی اِشاعت کا بھی اِرادہ ہے۔ میں نے اُن کو لکھ بھی دیا ہے۔

---

(۱) راقمِ سطور نے اِس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرکے "الداعی" میں قسط وار شائع کیا، بعد میں یہ عربی ترجمہ راقم کے کرم فرما ڈاکٹر عبد الحلیم عویس مصری، سابق استاذ جامعہ امام محمد بن سعود ریاض، نے ریاض کے ایک مکتبے اور اپنے مکتبہ "دار الصحوۃ" قاہرہ کے اشتراک سے بڑے اہتمام سے شائع کیا، جس کا نام اُنھوں نے "مَأْسَاةُ شَابٍ هِنْدُوسِيٍّ اِعْتَنَقَ الإِسْلَامَ" رکھا۔

میری اُن کی اب خط کتابت ہے۔ بڑی غیر عمولی شخصیّت کا انکشاف ہوا۔ اِسلام لانے کے بعد اُنھوں نے عربی شروع کی اور ہمارے قدیم مدرسوں کے طرز پر پورا وقت صرف کر کے درسِ نظامی کی تکمیل کی، اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی، فاضل اور پھر بی اے، ایم اے بھی کیا۔

اگست ہی کے شمارے میں مرحوم مہتمم صاحب (قاری محمد طیبؒ) کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے۔ خدا کرے جلد ہی روانہ ہو جائے اور جلد ہی آپ کو بھی مل جائے۔ پریس میں ہے، غالبًا کل یا پرسوں چھپ جائے گا۔ مکرر یہ کہ آپ کی اِس زحمت کشی سے کہ پوری تفصیل سے صورت حال لکھ دی بڑی خوشی ہوئی۔ جَزَاکُمُ اللّٰہُ تَعَالیٰ۔ آگے کے لیے بھی مُکلّف کر رہا ہوں کہ کوئی خاص بات قابلِ اِطّلاع ہو تو، مطلع کرنے کی زحمت فرمایا کریں۔ خدا کرے ہر طرح عافیت ہو اور اِس عاجز کو بھی عافیت نصیب کرے۔

دعا گو اور دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

دارالعلوم کے سلسلے میں دردمندی و فکرمندی، مولانا نعمانیؒ کا علمائے معاصرین میں امتیازی وصف تھا؛ اِسی لیے اپنی معذوری، شدید کمزوری اور بڑھاپے کے بڑھتے ہوئے اَعذار کی وجہ سے جب وہ مجلسِ شوریٰ میں شرکت سے اپنے کو معذور سمجھنے لگے، تو اُنھوں نے اَرکان و ذمے دارانِ دارالعلوم سے شوریٰ کی رکنیت سے سبک دوش کر دینے کی درخواست دی، جو اُنھوں نے اُن کے دارالعلوم سے بے پناہ تعلق کی وجہ سے منظور نہیں کی۔ ایک مکتوب میں مولانا نے اِس راقم کو لکھا:

''از لکھنؤ، ۶/محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

برادرِ عزیز و مکرم! زید مجدکم، سلام ورحمت

عنایت نامہ مؤرخہ ۲۹ رذی الحجہ ۱۴۰۶ھ موصول ہوا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ آپ کو واپسی میں تاخیر ہوگئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ وہ کتاب (۱) اب تک بھی کہیں سے نہیں آسکی ہے، اُ کے دو چار نسخے آجائیں، تو اِن شاء اللہ ایک نسخہ آپ کو ضرور بھیجوں گا۔

دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ اب اکثر صفر میں ہوتی ہے، میں امید نہیں کرتا کہ شرکت کے لیے سفر کرسکوں گا، شاید آپ کو مولانا وحید الزماں صاحب کے ذریعے، یا کسی اور ذریعے سے معلوم ہوا ہو، گذشتہ مجلسِ شوریٰ منعقدہ شعبان میں، مَیں نے اِصرار سے حضرات ارکان کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اب میں سفر کے لائق نہیں رہا، ایسی صورت میں رکنیت کی جگہ گھیرے رہنا میں صحیح نہیں سمجھتا؛ اِس لیے میرا استعفا قبول فرمالیا جائے، ممکن خدمت سے اِن شاء اللہ دریغ نہ ہوگا؛ لیکن قبول نہیں فرمایا گیا۔ بہ ہر حال اِس حال میں ہوں کہ شرکت کا اِمکان بہت کم ہے۔ فی الحقیقت اب میں سفر سے معذور ہوگیا ہوں۔ معذوری اور ضعف کے علاوہ اب گھٹنوں میں بھی تکلیف ہوگئی ہے۔

دعا گو اور دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی

بہ قلم محمد ضیاء الرحمٰن

سعودی عرب کے ایک سفر کے دوران راقم کو شدید کم زوری، بہت پیاس اور بار بار پیشاب کا تقاضا ہونے، نیز ہونٹ وغیرہ کے خشک رہنے اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے

(۱) مراد اِس سے مولاناؒ کی کتاب ''ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت'' کا عربی ترجمہ ہے جو ڈاکٹر سمیر عبد الحمید ابرہیم مصری استاذ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض نے، ڈاکٹر عبد الحلیم عویس مصری استاذ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے ایما پر کیا تھا، اور آخر الذکر نے اپنے تجارتی ادارے ''دار الصحوۃ، القاہرہ'' سے شائع کیا تھا۔

سانس لینے میں پریشانی کا اِحساس ہوا۔ ہندوستان واپسی پر راقم نے سب سے پہلے اِس صورتِ حال کا تذکرہ اپنے مشفق و مربی استاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ سے کیا، اُنھوں نے سنتے ہی فرمایا کہ یہ تو شکر کے مرض کی علامتیں ہیں، تم فوراً دہلی جاؤ اور جہاں میں شکر کے عوارض کے تئیں ڈاکٹر سے علاج و مشورہ کرتا ہوں، وہاں اِس کا ٹسٹ کراؤ۔ راقم نے اُن کے حکم کے مطابق جیون نرسنگ ہوم، مہارانی باغ، دہلی میں ڈاکٹروں سے رجوع کیا، ٹسٹ کے بعد شکر ہی کا مرض ثابت ہوا۔ بہت تشویش ہوئی، راقم نے دوا کے ساتھ ساتھ، اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے دعا کی درخواست کے لیے عریضے لکھے، جن میں حضرت مولانا نعمانیؒ سرِ فہرست تھے، حضرتؒ کا اِس سلسلے میں یہ شفقت نامہ شرفِ صدور لایا:

۱۳ر ستمبر ۱۹۸۷ء

برادرِ مکرم و محترم جناب مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام ورحمت

تار وقت پر مل گیا تھا، کل کی ڈاک سے ۱۳ر محرم ۱۴۰۷ھ کا لکھا ہوا عنایت نامہ ملا، اسے پڑھ کر آپ کے بارے میں فکر و تشویش پیدا ہوگئی۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں، آپ پر کسی کام کا بار نہیں ڈالا جاسکتا؛ بل کہ دار العلوم کا جو کام آپ سے متعلق ہے، اُن میں بھی آپ کو تخفیف کرنی پڑے گی، یہی سنا ہے کہ اِس مرض میں جسمانی اور دماغی آرام و سکون کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ امید ہے کہ پورے اہتمام سے آپ علاج کرا رہے ہوں گے۔ یہ عاجز دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد ہی شفا عطا فرمائے۔

اب سے قریباً بیس سال پہلے پیشاب اور خون کے ٹسٹ سے میرے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا تھا، علاج بھی اہتمام سے کیا، پرہیز بھی بہت سخت رہا۔ یاد آتا ہے کہ چھ مہینے تک کسی قسم کا میٹھا استعمال نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے

فضل فرمایا اور مرض کا اثر نہیں رہا۔

بہ ظاہر ابھی مرض کا آغاز ہے، امید ہے کہ اِن شاء اللہ جلد ہی کنٹرول ہو جائے گا۔ خود بھی دعا کا اہتمام فرمائیں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی دعا کے اہتمام کی برابر توفیق عطا فرمائے اور اپنے کرم سے قبول فرمائے۔ یہ عاجز خود بھی دعا کا محتاج و طالب ہے۔

والسلام

محمد منظور نعمانی

راقم کے ایک عریضے کے جواب میں حضرتؒ نے جو مکتوب اِرسال فرمایا، اُس سے جہاں اِس ناچیز کے ساتھ، اُن کی حد درجہ محبت و شفقت کا اندازہ ہوتا ہے، وہیں اُن کی للّٰہیت، اِنابت اِلی اللہ، آخرت کے لیے تیاری اور اپنے رب سے انتہائی اچھی حالت میں جا ملنے کی اُن کی خواہش کا اِظہار ہوتا ہے، اِسی کے ساتھ دار العلوم سے اُن کے غیر معمولی قلبی تعلق کا بھی عندیہ ملتا ہے:

۱۹/ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ

برادرِ محترم و مکرم مولانا نور عالم امینی صاحب! زید مجدکم، سلام و رحمت

خدا کرے آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں۔ اِخلاص نامہ کل ملا، اب سے کئی مہینے پہلے ایک عنایت نامہ ملا تھا؛ لیکن اُس میں اطلاع تھی کہ آپ غالباً باہر کے سفر پر جا رہے ہیں؛ اِس لیے میں اُس کا جواب نہیں لکھا سکا، حال آں کہ دل میں داعیہ تھا کہ آپ کو جواب لکھا دوں۔

آپ نے حال دریافت کیا ہے، عمر کے ساتھ قدرتی طور پر ضعف بڑھ رہا ہے۔ بفضلہٖ تعالیٰ کوئی خاص بڑی اذیّت نہیں ہے۔ آپ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے فضل سے اور آخرت میں اپنی رحمت سے نوازے۔ خود دعاؤں کا سخت محتاج ہوں۔ اب سب سے بڑی حاجت صرف یہ ہے کہ زندگی

کے جودن باقی ہیں، ایمان، اَعمالِ مرضیہ کی توفیق، معاصی سے حفاظت، نعمتوں پر شکر اور سیّآت ومعاصیات سے استغفار کے اہتمام اور عافیت کے ساتھ، پورے ہوجائیں۔ حسنِ خاتمہ نصیب ہو اور اَرحم الرّاحمین محض اپنے رحم وکرم سے مغفرت فرمادے۔

یاد آتا ہے کہ آپ نے کئی مہینے پہلے والے اپنے خط میں، کوئی خاص بات کرنے یا لکھنے کا اِرادہ فرمایا تھا۔(۱) اگر دل میں کوئی داعیہ ہوتو بے تکلف تحریر فرمادیں۔ ویسے اب میں اِس حال میں ہوں کہ اِس کی کوئی امید نہیں ہے کہ جلسۂ شوریٰ میں شرکت کے لیے سفر کرسکوں، اِس سے پہلے جب آخری دفعہ حاضر ہوا تھا تو اِصرار کے ساتھ ارکانِ شوریٰ: اپنے رفقا سے عرض کیا تھا کہ اب میں سفر سے بالکل معذور ہو چکا ہوں، ایسی حالت میں، میں اپنے لیے درست نہیں سمجھتا کہ رکنیّت کی جگہ گھیرے رہوں، معذور سمجھ کر استعفا قبول فرمالیا جائے؛ لیکن اُن حضرات نے، اُس کو منظور نہیں فرمایا، اِسی پہ اِصرار کیا کہ رکنیت کا تعلق برقرار رہے، آنا نہ ہوسکے تو آپ معذور ہیں۔ اگر چہ میں اپنے حق میں اِس کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا؛ لیکن میرے اختیار میں، اِتنا ہی تھا کہ میں نے لکھ کردے دیا اور زبانی بھی اِصرار کیا۔ قلبی تعلق اور فکرودعا میں کوئی کمی نہیں ہے۔

اب اگر کبھی وطن کی طرف آپ کا سفر ہو، تو بہ شرطِ اِمکان وسہولت لکھنؤ اُتر کر ملاقات فرمالیں؛ ورنہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دارِ آخرت میں اپنے جوارِ رحمت میں ہمیں آپ کو جمع فرمادے۔ اُس کی رحمت سے یہی امید ہے۔

اِس کی شکایت ہے کہ آپ نے جوابی لفافہ بھیجا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد منظور نعمانی

---

(۱) حضرت مولاناؒ کو وقتاً فوقتاً دارالعلوم کی بھلائی کی خاطر بعض تجویزیں اور دارالعلوم کے تازہ حالات کی روشنی میں بعض آرا لکھا کرتا تھا، اِس طرح کی کوئی بات، راقم نے لکھنے کے لیے اِشارہ کیا ہوگا کہ بعد کے کسی عریضے میں لکھوں گا۔

ناچیز کے ایک عریضے کے جواب میں مولاناؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا، اُس سے عیاں ہے کہ اُنھیں ہر وقت دارالعلوم کی فکر دامن گیر رہتی تھی اور عمر کے آخری مرحلے میں اپنی معذوری کے بعد شوریٰ میں شریک نہ ہو پانے کا بہت افسوس تھا، اُنھیں ہمیشہ یہ تمنا رہتی تھی کہ کسی طرح دارالعلوم پہنچ کر اُس کی شوریٰ کے کسی جلسے میں شریک ہوں اور اپنے رفقا سے الوداعی ملاقات کر کے دارالعلوم کے حوالے سے اُنھیں آخری وصیت کر سکیں؛ لیکن اُن کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور جب تک ہوش میں رہے، خطوط کے ذریعے بعض تجویزوں کی ترسیل ہی پر اکتفا کرتے رہے:

از طرف حضرت مولانا نعمانی دامت برکاتہم

لکھنؤ، ۱۱رجنوری ۱۹۹۲ء

برادرِ مکرم و محترم مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب! زید مجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ میرے عریضے کے جواب میں، کل موصول ہوا۔ آپ نے جو صورتِ حال لکھی ہے، معلوم کر کے افسوس ہوا۔ یہ معلوم کر کے ایک درجے میں خوشی ہوئی کہ آپ کو بھی اِس بوڑھے کی طرح اِس تغیّر پر رنج و ملال ہے۔ خود اپنے بارے میں غور کیا تو محسوس ہوا کہ ہم بھی کسی نہ کسی درجے میں، اسی میں مُلَوَّث ہیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ اپنی تطہیر کی فکر کریں۔

معلوم ہوا کہ چند ہی روز پہلے دارالعلوم کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ ہوا تھا، اُس میں طے کیا گیا ہے کہ گذشتہ سالوں کے فارغین کی دستار بندی کا جلسہ، جو برابر ٹلتا رہا ہے، اِس سال شعبان میں تین سال کے فارغ طلبہ کی دستار بندی کا اِجلاس کر لیا جائے، اُس سے ایک دو دن پہلے شوریٰ کا بھی اِجلاس ہوگا۔ میں بہ ظاہر اِس حال میں نہیں ہوں کہ شعبان میں سفر کے قابل ہو سکوں۔ اِس کے باوجود دل میں تمنا ہے اور دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے

مجھے سفر کے لائق کردے، تو اِس موقع پر دارالعلوم پہنچ سکوں اور اپنی علومی برادری سے کچھ الوداعی باتیں کرسکوں۔ اگر ایسا نہ بھی ہوسکا تو امید ہے کہ نیّت کے ثواب سے محروم نہ رہوں گا۔ آپ بھی دعا فرمائیں۔

والسلام

بہ قلم یحییٰ نعمانی

خدائے پاک اُنھیں اپنی خاص رحمتوں سے نوازے اور انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے جوار میں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اُن کے تمام اعزّا، متعارفین، رُفقا، دعا گو اور محبّین و مُعتقدین کو صبرِ جمیل و اَجرِ جزیل سے نوازے۔ آمین۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ ایک نظر میں

- اسم گرامی: (مولانا) محمد منظور نعمانی
- ولادت: ۱۸؍شوال ۱۳۲۳ھ مطابق: ۱۸؍نومبر ۱۹۰۵ء
- جائے پیدائش: سنبھل، ضلع مراد آباد، یوپی
- ابتدائی تعلیم: سنبھل، و مدرسہ عبدالرب، دہلی
- متوسطات: دارالعلوم مئوناتھ بھنجن، یوپی
- اعلیٰ تعلیم: دارالعلوم دیوبند، یہاں وہ ۱۳۴۳ھ میں داخل ہوئے اور دو سال تعلیم حاصل کی ۱۳۴۵ھ میں فارغ ہوئے، دورۂ حدیث شریف میں سارے طلبہ میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔
- تدریسی خدمات: دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۳ سال ''امروہہ'' ضلع مراد آباد، حال ضلع ''جیپی نگر'' یوپی کے مدرسہ چلہ میں تدریسی خدمات انجام دیں، اُس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں ۴ سال شیخ الحدیث رہے۔
- الفرقان کا اِجرا: ۱۳۵۳ھ = ۱۹۳۴ء میں بریلی سے ''الفرقان'' رسالہ ماہ وار جاری کیا۔ شروع میں رسالے کا رنگ مناظراتی تھا، ۱۹۴۲ء = ۱۳۶۱ھ سے یہ ایک علمی اور دینی و دعوتی رسالے میں تبدیل ہوگیا۔

❁ **تبلیغی جماعت سے وابستگی:** ۱۳۴۳ھ سے حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی و دعوتی تحریک سے وابستگی اختیار کی جو موت تک باقی رہی۔

❁ **مجلس شوریٰ دارالعلوم کی رکنیت:** ۱۳۶۲ھ میں دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن منتخب ہوے اور وفات تک اِس منصب پر فائز رہے۔

❁ **رکن رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ:** رابطۂ عالمِ اسلامی کے قیام کے چند سال بعد سے ہی ۱۹۶۵ء سے تاسیسی رکن رہے۔

❁ **رکن مجلس منتظمہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ:** اِسی کے ساتھ وہ تاحیات دارالعلوم ندوۃ العلما کی شوریٰ کے بھی رکن رہے۔

❁ **راہِ سلوک:** حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ممتاز خلفا اور اہلِ دل بزرگوں میں تھے۔

❁ **شانِ امتیاز:** مولاناؒ دیوبند کے ممتاز فضلا اور علامہ کشمیریؒ کے نمایاں شاگردوں میں تھے، اُنھوں نے تقریر وتحریر کے ذریعے اہل بدعت، قادیانیوں اور باطل تحریکوں کے نمایندوں سے بڑے بڑے مناظرے کیے۔ اُن کی زبان اور علم دونوں میں بے انتہا سادگی اور سہلِ ممتنع کا رنگ غالب تھا، اُنھوں نے جو تحریری و تالیفی اثاثہ چھوڑا ہے، وہ علمی و فکری و دعوتی سرمایے کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کا بہترین نمونہ ہے۔ اِتنی آسان، شستہ، برجستہ، سادہ؛ لیکن زبان وادب کے اسلوب پر مکمل اُترنے والی زبان میں، اُن کے ہم عصر علماے دیوبند میں سے کسی کا اتنا سارا علمی و دینی، فقہی و دعوتی کام نظر نہیں آتا۔

اُنھوں نے اپنے قلم و زبان سے پوری نسل کو مُتاَثّر کیا ہے، کسی مؤرخ، اہل قلم، اور علمی و اَدبی، فکری و دعوتی کام کا جائزہ لینے والے کے لیے، اُنھیں ممتاز مقام دیے بغیر چارۂ کار نہیں۔

❁ **وفات:** یک شنبہ و دوشنبہ: ۲۶-۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۴-۵/ مئی ۱۹۹۷ء کی درمیانی شب میں تقریباً ۸:۳۰ بجے اُنھوں نے لکھنؤ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

❁ **مولانا کی اہم تالیفات**

۱-اسلام کیا ہے؟ ۲-دین و شریعت ۳-قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ ۴-معارف الحدیث ۷ جلدیں ۵-اَلْفِیَۃُ الحدیث (عربی زبان میں، جو دارالعلوم دیوبند اور دیگر مدارسِ عربیہ کے نصاب میں داخل ہے) ۶-نماز کی حقیقت ۷-ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت ۸-کلمۂ طیبہ کی حقیقت ۹-

برکاتِ رمضان ۱۰-حج کیسے کریں؟ ۱۱-تذکرہ مجدد الف ثانیؒ ۱۲-حضرت شاہ اسماعیل شہید اور معاندین اہلِ بدعت کے اِلزامات ۱۳-ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاسؒ ۱۴-قادیانی کیوں مسلمان نہیں؟ ۱۵-قادیانیت پر غور کرنے کا سیدھا راستہ ۱۶-بَوَارِقُ الْغَيْبُ عَلَى مَنْ يَدَّعِي لِغَيْرِ اللّٰهِ عِلْمَ الْغَيْبُ: مسئلہ علم غیب کا قرآنی فیصلہ ۱۷-دیوبند و بریلی کے اختلاف ونزاع پر فیصلہ کن مناظرہ ۱۸-نزولِ مسیح کے سلسلے میں قولِ صحیح ۱۹-سیفِ ایمانی بر فرقۂ رضا خانی ۲۰-تحریکِ ''خاکسار'' کتاب وسنت کی روشنی میں ۲۱-تصوّف کیا ہے؟ ۲۲-مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت اور اب میرا مؤقف ۲۳-شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور ہندوستان کے علمائے حق پر اُس کے اثرات ۲۴-دینی مدارس کے طلبہ سے: آپ کون ہیں، کیا ہیں اور آپ کی منزل کیا ہے؟ ۲۵-کفر واسلام کے حدود اور قادیانیت ۲۶-مسئلہ حیات النبی کی حقیقت ۲۷-تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور بریلوی حضرات ۲۸-عقیدۂ علم غیب ۲۹-نماز اور خطبہ کی زبان ۳۰-انسانیت زندہ ہے ۳۱-میری طالب علمی ۳۲-قربِ الٰہی کے دو راستے ۳۳-تحدیثِ نعمت: کتابِ زندگی کے کچھ صفحات۔(*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۲، جلد ۲۱، صفر ۱۴۱۸ھ = جون-جولائی ۱۹۹۷ء۔ اردو تحریر: بہ قلم خود ۸/ بجے صبح سہ شنبہ: ۳/ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ = ۵/ اگست ۱۹۹۷ء۔

داعی اِلی اللہ

مولانا محمد عمر پالن پوریؒ (*)

۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء — ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء

نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

عظیم سلف کے عظیم خلف

داعیِ اسلام و بانی تبلیغی تحریک و ترجمانِ دینِ حنیف حضرت مولانا محمد اِلیاس صاحب قدس سرہ (متوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۳ء) اور اُن کے عظیم صاحب زادے و سچے جانشین حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی (متوفی ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۵ء، مؤلف کتاب "حیات الصحابہ") کی زیارت کا شرف راقم الحروف کو حاصل نہیں؛ کیوں کہ اول الذکر کی وفات، راقم کی پیدائش (۱۸/۱۲/۱۹۵۲ء) سے دس سال قبل واقع ہوئی اور ثانی الذکر کی رحلت کے وقت، اُس کا بچپنا تھا؛ اِس لیے وہ اِن داعیوں کو دیکھنے کی سعادت حاصل نہیں کرسکا۔

البتہ شعور کی زندگی میں اِن دونوں شخصیات کے تعلق سے، سننے اور پڑھنے کا بھرپور موقع ملا۔ اِن کا صلاح و تقویٰ، دعوت و تبلیغ میں فنائیت، مسلمانوں کی ناگفتہ بہ دینی

(*) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی جاوید اشرف مدھے پوری قاسمی، جمادی الاولی ۱۴۱۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۹۷ء حک و اِضافہ بہ وقتِ اشاعتِ ایں مضمون بہ شکلِ کتاب ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء، بہ قلم مضمون نگار۔

حالت پر اُن کی بے قراری، سوزِ دروں اور وارفتگی، اور امتِ مسلمہ کو محض دنیاوی تکلّفات واہتمامات اور توجّہات سے ہٹا کر، از سرِ نو دین کی راہ اور آخرت کی فکر پر لگانے کے، اُن کے عجیب وغریب؛ لیکن سچے واقعات، کثرت سے، باوثوق ذرائع و مُعتبَر اَشخاص اور سچی زبانوں سے سننے میں آئے۔ جس کے بعد یہ یقین کرنا پڑا کہ یہ دونوں حضرات امت کے لیے خدا کی دین تھے، اُن کو خاص اِسی لیے بنایا اور مامور کیا تھا کہ وہ غفلت میں مست، اِس امت کو بیدار کریں۔ اُمت کو دین کی ڈگر پر لگانے، اِیمان کی بہار لانے، فنائیت کی حد تک، اللہ سے تعلق اور لَو لگانے اور بہ قول شاعرِ مشرق علامہ اقبال: بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے جانے کے باب میں، ان کو جو درک حاصل تھا، وہ انھی کا حصہ تھا۔ اِس سلسلے میں یہ اپنی نظیر آپ تھے۔ انھیں قدرت نے اپنے دستِ خاص سے، ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا تھا؛ تاکہ یہ پوری اُمت کے دل میں اِس بات کا شعور واِحساس پیدا کریں کہ اُسے از سرِ نو، اپنے دل پر قلعی اور اپنے ایمان کی بیٹری چارج کرانے کی ضرورت ہے، اپنی اور پھر دوسروں کی اِصلاح اور دعوت اِلی اللہ کا فریضہ انجام دینے کی ضرورت ہے۔ اگر اِس میں دقیقہ بھر تاخیر کی گئی تو یہ اُمت ذلّت وخواری کی اُس پستی میں گر جائے گی، جس سے نکلنا شاید کبھی نصیب نہ ہو۔ ہاں یہی پاکیزہ اِحساس اُمت کے دل میں پیدا اور بیدار کرنا، اِن کی زندگی کا اولین وآخری مقصد تھا، جس کو ان کی ذاتِ بابرکات سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ان حضرات کی مجلسیں اور اجتماعات تیر بہ ہدف ثابت ہوتے، دلوں سے نکلنے والی، تسنیم وکوثر سے دھلی ہوئی، سادہ باتیں، دلوں تک اپنا راستہ بنالیتیں اور رگ وپے میں سرایت کر جاتیں، ان کی تقریروں میں بجلی کی تاثیر اور پارس کی خاصیّت تھی کہ کوئی ہو، کہیں کا ہو، انھیں سنا نہیں کہ کندن بن گیا۔

الحاصل اسوۂ نبوی میں ڈھلے ہوئے اور دستِ نبوی کے بہ راہِ راست پروردہ صحابۂ کرامؓ اور اُن کے بعد ائمہ عظام اور مشایخ ومصلحینِ اُمت کے نقشِ قدم پر چلنے والے

اِن حضرات کو، گو دیکھنے کا موقع نہیں ملا؛ لیکن سننے اور پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ البتہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے شاگردِ رشید، پیکرِ زہد وتقویٰ مولانا محمد عمر صاحب پالن پوریؒ (جن کے متعلق یہاں اِظہارِ تاثر مقصود ہے) کو دیکھنے، سننے، برتنے اور اُن کی صحبت میں بعض دفعہ بیٹھنے کا شرف راقم کو حاصل ہے۔ وقتاً فوقتاً اُن کی مجلسوں میں شرکت کے ذریعے، اِیمان کو تازہ کرنے اور "اِجْلِسْ نُؤْمِنْ سَاعَةً" کی سعادت سے سرفراز ہونے کا کئی دفعہ موقع ملا ہے۔

مولانا کی پہلی پُر درد تقریر کی سماعت اور اُس کی لذّت وحلاوت

زمانۂ طالبِ علمی کا واقعہ ہے، ۱۹۷۱ء کی کوئی شام تھی، اپنے رفیقِ درس مولانا محمد برہان صاحب مرزا پوری، سہارن پوری پروفیسر طبیہ کالج جے پور کے ساتھ، مرکزِ جماعت تبلیغ: بنگلہ والی مسجد بستی نظام الدین اولیا، نئی دہلی، کے اِرادے سے نکلا، پہنچے تو مغرب کی نماز تیار تھی، نماز ختم ہوتے ہی، ایک صاحب نے کھڑے ہوکر اِعلان کیا: حضرات! سنن ونوافل کے بعد تشریف رکھیے، اِن شاء اللہ، دین واِیمان کی باتیں ہوں گی۔

سنتوں کے بعد، ہم اپنی جگہ پر جمے بیٹھے رہے اور دوسرے حضرات بھی، جو اِس شام، ایک بڑی تعداد میں شریکِ نماز تھے، بعد میں معلوم ہوا کہ جمعرات کی شام کو، اہلِ دہلی، بہ طورِ خاص یہاں آکر، وعظ ونصیحت سنتے اور اپنے اِیمان ویقین کو جلا بخشتے ہیں۔ چند لمحوں کے بعد، ایک نحیف الجثہ بزرگ، اِیمان ویقین کی شادابی، اور تازگی کے ساتھ تشریف لائے۔ یہ غیر معمولی شخص، ایک معمولی کرسی پر، جو قبل از آمد اُن کے لیے رکھ دی گئی تھی، جلوہ افروز ہوے۔ بیٹھتے ہی سلام کیا، حاضرین کے جواب سے، مسجد کی روحانی فضا گونج اٹھی اور اِیمان ویقین کی بھینی بھینی خوش بو، اُس کو معطر کرنے لگی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد جیسے یادوں کے ذخیرے، یا تجربات کے خزانے میں، کچھ تلاش کر رہے ہوں، چند آیاتِ قرآنی تلاوت کی۔ اللہ اکبر: ایسا دل کش، دل آویز، جیسے یہ آیت پہلی بار

کانوں میں پڑی ہو، اُس تلاوت سے خوف وخشیت، امید وبیم، اِنابت اللہ، اور سوزِ دروں کی تیز خوش بو پھوٹ رہی تھی۔

تقریر شروع ہوئی، لہجہ نرم، آواز قدرے پست تھی؛ لیکن لحہ بہ لحہ بلند سے بلند ہوتی گئی، پھر گھن گرج، اِیمان واہلِ اِیمان کو پکار، باطل اور اہلِ باطل کو للکار، جیسے ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرارہی ہو؛ دلوں کو ہلا کر رکھ دیا، مجمع پر ایک سناٹا طاری تھا، ہر شخص سانس روکے گوش برآواز تھا کہ مبادا کوئی لفظ دل وکان میں پڑنے سے قبل ہوا کے دوش پر اڑ جائے۔ ذَرَفَتْ مِنهَا الْعُيُونُ، وَوَجِلَتْ مِنهَا الْقُلُوبُ کا سماں بندھ گیا، ہر لفظ ہیرے جواہرات سے زیادہ گراں، آتشِ فروزاں سے زیادہ پرسوز، درد وکرب سے لبریز، درِ یتیم سے زیادہ صاف ستھرا، تخت طاؤس سے زیادہ قیمتی، اِخلاص ووفا سے دھلا ہوا، اِحتساب وللّٰہیت سے تاباں، خونِ جگر سے رنگیں، بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ دل کی بے چینی اور کرب وسوز، اَلفاظ وعبارات کے جامے میں تبدیل ہورہا ہے، اور اِخلاص ومحبت کا بے پایاں جذبہ، لشکر جرار بن کر، کفر وشرک کے اَڈوں، فطرت سے بغاوت وسرکشی کے مراکز، خدا سے دشمنی اور اس کے اَحکام کی خلاف ورزی کی کمین گاہوں پر حملہ آور ہونے کو ہے۔

یہ الفاظ وعبارات، رِستے زخموں کا مرہم اور روحانی وقلبی مریضوں کے لیے تریاق کا کام کررہے تھے، شکوک وشبہات کی تاریکی، اُن کی ایمان افروز ودل دوز تقریر کے بعد، شکست خوردہ لشکر کی ٹکڑیوں کی طرح پراگندہ وپریشان نظر آتی تھی، اور اُن کی شیر وشہد جیسی تقریر، جسم وجاں میں اِس طور پر نفوذ کرتی، جیسے اچھا خیال، یا اچھا کام قلب کو بالیدہ، جذبات کو رنگین اور خیالات کو بلند کردیتا ہے۔

جس کو دیکھیے اَشک بار، ماضی پر حسرت وندامت کے آنسو بہارہا ہے، اور مستقبل کو نیر وتاباں بنانے اور نیک اَعمال کا ذخیرۂ آخرت اکٹھا کرنے کا عہد وپیمان دل ہی دل میں کررہا ہے۔

خدا گواہ ہے کہ اپنی ۱۷-۱۸ سالہ عمر میں، میں نے اب تک اِتنی اثر انگیز، اور لخت لخت کو مست و مسرور کرنے والی تقریر نہیں سنی تھی اور جس طرح کا جذب و محویت اُن کی تقریر میں محسوس کی، کسی اور کی تقریر میں کبھی نہیں کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اِس کے بعد ہر جمعرات کو بنگلے والی مسجد، منزلِ مقصود ہوتی، مرحوم کی سحر انگیز، اور کرب و الم سے لبریز تقریر سننے اور اس وقت کی مختصر سی عمر کے بہ قدر، مستفید ہونے کی خاطر پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ ایک عرصے تک قائم رہا۔

جنت و دوزخ کی حقیقت کو
ایمان اَفروز انداز میں بیان کرنے والا مقرر

مارچ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے وسیع و عریض صحن میں، ایک عظیم تبلیغی اجتماع ہوا، ہزاروں کا مجمع تھا، اِجتماع کو امیرِ جماعت حضرت مولانا انعام الحسنؒ (متوفی ۱۰ر محرم ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۰ر جون ۱۹۹۵ء) اور دوسرے عمائدینِ جماعت نے خطاب کیا؛ لیکن حاضرین، مرحوم کی تقریر سے جس قدر محظوظ اور مُتأثّر تھے، کسی اور سے نہیں، مختلف مجلسوں میں مرحوم نے تقریر کی؛ لیکن سامعین کی پیاس بڑھتی گئی۔

ایک تقریر کا موضوع اب تک یاد ہے اور بھلایا بھی نہیں جاسکتا؛ ثواب و عقاب، نیکی و بدی، قیامت قائم ہونا، میزان، حساب و کتاب، نیک کا جنت میں، اور بدوں کا جہنم میں داخلہ، اول الذکر کے لیے موعودہ نعمتوں کی بارش، اور مؤخر الذکی کا مصائب و آلام، عذاب و عقاب کا سامنا کرنا، اہلِ جہنم کا احتجاجاً اِبلیس کے پاس جانا، اپنی گمراہی، بغاوت و سرکشری کا اِلزام اُس کے سر دینا، اِحتجاجی جلوس کے سامنے اِبلیس کی تقریر اور اُن کو دنداں شکن جواب دینا وغیرہ مختلف آیاتِ قرآنیہ میں یہ مضامین بکھرے پڑے ہیں، موصوف نے اُن کو ایک لڑی میں پرو کر، اِس انداز سے پیش کیا کہ قیامت کا حقیقی منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا، ایسا لگتا تھا کہ خطیب آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہے۔

مرحوم نے اِس موقع پر سورۂ ابراہیم کی ۲۱، ۲۲ اور سورۂ اعراف کی ۲۸ سے ۵۱ تک آیتیں تلاوت کیں جو اَب تک کانوں میں گونج رہی ہیں، جیسے کل کی بات ہو!

تین گھنٹے تک یہ تقریر جاری رہی، بیس ہزار سامعین شہرِ خموشاں بنے سنتے رہے، ایسا پرسکون و پر کیف منظر کہ اللہ اکبر، بیان سے باہر ہے، ایک سوئی بھی گر جائے تو آواز سنائی دے۔

دلوں کو تسنیم و کوثر سے دھل دینے، معصیت سے پاک کردینے والی، موقع و محل کے لحاظ سے نہایت مناسب اور جامع تقریر، جس میں وہ سب کچھ تھا، جو سامعین کو سننے، سنتے رہنے، رونے، اور اُس کے مضمون پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ فصاحت و بلاغت کی چاشنی، حکمت و دانائی کی چمک دمک اور مہک، دل دوزی و دل آسائی اور ایسی اثر انگیزی، جس کا سرچشمہ، مقرر کا ازخود باعمل ہونا، اپنی تقریر کے ہر ہر حصّے کو زندگی کا جزو بنانے والا ہونا اور قول سے قبل عمل سے اس کا داعی ہونا تھا۔ ایسا عالمانہ، ووالہانہ انداز، ایسا ایمان ویقین، جس نے ہر کسی کو یہ احساس دلا دیا کہ جیسے وہ جنت، اس کی نعمتوں، نوازشوں، جہنم، اس کی سزاؤں، بلاؤں، تپتے اَنگاروں، دہکتی آگ، اور ہلاکت وفلاکت کو دیکھ رہا ہو، جنت و جہنم اُس کی نظرِ تخیل اور مشاہدہ کے سامنے ہو۔

غریبی، نحوست

حسنِ بیان کی ساحری و یقین افروزی

آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ ایک مقرر کو، اپنی بات کا ایمان و یقین نہیں ہوتا، اُس کے قول و عمل میں یکسانیت نہیں ہوتی، اُس کے عمل کا لبادہ اُس کے قول سے تنگ ہوتا ہے، اُس کی باتیں دل سے نہیں؛ بل کہ صرف زبان سے نکلی ہوتی ہیں، اُس کے سینے میں خوف و بیم کی چنگاری، یا امید کی کوئی کرن نہیں ہوتی، جو روح کو تڑپا اور قلب کو گرما دے۔

اپنی خداداد تقریری صلاحیت و تاثیر، مُخاطَب کے ذہن و دماغ کی رعایت کے ساتھ بات کہنے کے حکیمانہ اصول و ضابطے، کی مکمل پابندی، سامعین کا اُن کی تقریروں

کے دوران کھونٹے کی طرح گڑ جانا، مقرر کی پیشانی سے اُن کی نگاہوں کا بندھ جانا، اُس کی ہر رائے سے مکمل اتفاق، اُس کی ہر بات کو ٹوٹ کر چاہنے، اپنانے اور برتنے کا جذبہ جیسے وہ مقرر کی اپنی بات نہیں؛ بل کہ خود اُن کے ضمیر کی آواز، اور اُن کے قلب کی پکار ہو، وہ اُس کو سننے کی تاک اور گھات میں تھے اور تقریر سن کر لوٹے تو اپنے آپ کو شرم وندامت کے آنسو سے دھل کر، توبہ واستغفار کی توفیق کے ساتھ، ایک سچے، پکے، مخلص باوفا مسلمان کی زندگی گزارنے کا عزم لے کر، ایسی زندگی جس کی بنیاد: تقویٰ، طہارت، عبادت اور تلاوت وذکر پر ہو؛ اس جیسی خوبیوں، اور خصوصیّات کی یہ دولت، مرحوم، جماعتِ تبلیغ کے روحِ رواں، بے قرار دل، اور صحیح ترجمان تھے۔ اِسلامی معاشرے میں صلاح وفلاح کی تخم ریزی کرتے، پوری انسانیت کو، سعادت، نیک بختی کا راستہ دکھاتے، خیر وبرکت عام کرتے، اِنسانوں کا رشتہ غیروں سے توڑ کر، اپنے خدا سے جوڑتے، اور دیکھتے ہی دیکھتے، اُن کی مخلصانہ کوششوں کا یہ باغ نمو پاتا، برگ وبار لاتا، مسجدوں میں نمازیوں کی بھیڑ جیسے شب براءت یا روزہ کے اَیام ہوں، جن علاقوں تک دعوت وتبلیغ کا کام اور نام پہنچتا وہاں اخلاقی، معاشرتی گندگیوں، خامیوں، اور خرابیوں میں محسوس طور پر کمی نظر آتی، شرک وبدعت سے وہ علاقے پاک ہوجاتے، خرافات کا ریلا وہاں رک جاتا، اِسلامی اخوت، ہم دردی اور اِنسانیت اُن کا امتیاز بن جاتا، اتحاد واتفاق، سکون واعتماد، قناعت وتوکل، اور کارِ خیر میں تعاون کی لہر پورے علاقے میں دوڑ جاتی۔

مرحوم کی رحلت، جماعتِ تبلیغ کا ناقابلِ تلافی خسارہ ہے، وہ جماعت کے اُن عمائدین کی آخری کڑی تھے، جن میں گہرا علم، رسا عقل، تبلیغی حکمت وہوش مندی، مطلوبہ دعوتی توازن جیسے وہ تمام دوسرے عناصر موجود تھے جن کے سبب جماعت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی اور نہ صرف مغربی ممالک کے اِسلامی حلقے، صلاح وفلاح، اور دین کی راہ پر گام زن ہوئے؛ بل کہ بہت سے تعلیم یافتہ مغربی یہود ونصاریٰ حلقہ

بگوش اِسلام ہو گئے۔

دارالعلوم دیوبند میں تبلیغی سرگرمیوں کی کثرت اور مولاناؒ کے اِیمان پرور بیانات

۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے، دارالعلوم دیوبند نے انتظامی کروٹ لی، نئی انتظامیہ استوار ہوئی، نئے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم، آئے، دارالعلوم کا نیا دور شروع ہوا، حالات معمول پر آگئے، تو حضرت مہتمم صاحب نے طلبۂ دارالعلوم کو دعوت وتبلیغ کی طرف متوجہ کرنا چاہا، یہ تجویز عمائدینِ جماعتِ تبلیغ کے سامنے پیش کی گئی، تو انھوں نے بہ صد شکر، اِس دعوت پر لبیک کہا، جس کے بعد سے دارالعلوم کی چہار دیواری، تبلیغی سرگرمیوں کا میدان بن گئی، اور یہ طے ہوا کہ مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری مرحوم سال میں ایک دوبار، دارالعلوم تشریف لائیں گے، چناں چہ تاحیات مرحوم نے اِس عہد کو پورا کیا، دارالعلوم تشریف لاتے، اَساتذہ وطلبہ کی الگ الگ مجلسیں ہوتیں، عمومی جلسہ ہوتا، تقریر ہوتی، تشکیل ہوتی، طلبہ جماعت کے کاموں میں لگتے، جماعت میں نکلتے، طلبہ واساتذہ یک ساں لطف ودلچسپی کے ساتھ، مشک وگلاب میں دھلی ہوئی، اخلاص ووفا میں بسی ہوئی اُن کی باتوں کو سنتے، حرزِ جاں بناتے، زندگی سنوارتے، دل کی دنیا روشن کرتے۔ کتنے ہی طلبہ کی زندگیوں میں صالح انقلاب آیا، حال کی اِصلاح اور مستقبل کو روشن بنانے کی دھن سوار ہوگئی، اُنھیں ذکر وعبادت وتلاوت کی حلاوت ملی، رات کی تنہائیوں میں، اپنے پیدا کرنے والے سے مناجات کرنے، گریہ وزاری اور تہجد کی نمازوں کی توفیق سے بہرہ ور ہوے اور اِس کے عادی ہو گئے۔

جماعت سے وابستہ طلبہ میں عموماً، بے کراں تواضع، حسنِ ادب، سچی خدمت کا جذبہ محسوس ہوا، یہ طلبہ ہم دردی کے پیکر ہوتے، دوسروں کے دکھ درد کو تقسیم کرنے کا پاکیزہ جذبہ، مریض کی عیادت، دوسروں کا غم غلط کرنے میں بازی لے جانے کی لگن،

امت مسلمہ کے رنج والم؛ امیدوں اور آرزوؤں میں شریک ہونے، اس پر خود کو قربان کردینے کی اُمنگ، حقوق کی ادائیگی میں فنائیت، وارثانِ علوم نبوت کی شان کے مخالف ہر قول وعمل سے گریز؛ یہ اوراس جیسی دوسری پاکیزہ، اعلیٰ اسلامی صفات واقداروروایات اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری محسوس ہوتی تھی؛ جو جماعتِ تبلیغ سے صحیح طور پر وابستہ حضرات کا طرۂ امتیاز اور نصب العین ہے۔

مرحوم کا ایک مشہور مقولہ تھا (جس کو وہ اکثر مجلسوں اور اجتماعات میں دہراتے تھے) کہ جدوجہد میں فنا ہوجاؤ، آخری سانس تک اس میں لگے رہو! ——— مرحوم جو کہتے، اُس پر پہلے خود عمل پیرا ہوتے تھے۔ وہ اپنے اس مقولے کی سچی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ عملی تصویر واقعتاً انھوں نے خود کو زندگی کے آخری سانس تک، دعوت وتبلیغ کے لیے وقف رکھا۔

مرض الموت

۲۱/ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۹/اپریل ۱۹۹۷ء کی بات ہے، مرحوم سفرِ حج سے، مرکز تبلیغ نظام الدین واپس آکر اپنے دینی مشاغل اور اذکار وعبادات میں لگ چکے تھے، ادھر دو سالوں سے قسم قسم کے امراض نے، ان کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، جس کا شکنجہ رفتہ رفتہ تنگ ہوتا جارہا تھا، ایک معمولی عارضہ کی بنا پر، اسپتال لے جائے گئے، چند گھنٹوں کے ضروری علاج ومعالجے کے بعد گھر آنے کی اجازت مل گئی، اور واپس مسجد نظام الدین آگئے۔

چند روز بعد اپنے آبائی گاؤں ''گھٹامن''، ضلع ''پالن پور'' گجرات تشریف لے گئے اور ایک سہ روزہ تبلیغی اجتماع میں شرکت فرمائی، واپسی میں طبیعت میں نشاط محسوس کرکے، اُنھوں نے اپنے ضروری مشاغل، ذکر واذکار، نماز وعبادات، تبلیغی وفود سے ملاقاتیں، مشورے اور فجر کے بعد مرکز کی مسجد میں معمول کی تقریر شروع کردی۔

۱۰/محرم کی صبح کو مرحوم نے ایک تقریر کی، اُس دن کی مناسبت سے اسلامی تاریخ کے

اہم عبرت ناک واقعات پر روشنی ڈالی۔ بہ حیثیت مسلمان ایک شخص کو کیا کرنا، یا کس چیز سے بچنا چاہیے، نیز جائز و ناجائز عبادات و اعمال، بدعت و حرام سب کی وضاحت فرمائی۔

۱۲ر محرم ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۰ رمئی ۱۹۹۷ء کا دن تھا، مرحوم کو مدراس (جنوبی ہند) کے ایک بڑے تبلیغی اجتماع میں، وفد کے ساتھ شرکت کرنی تھی، پروگرام یہ تھا کہ گنج ڈھنڈوارہ (ضلع ایٹہ، اتر پردیش) ہوتے ہوے، وہاں پہنچ جائیں گے، رات ہی سے گاڑی تیار رکھی گئی کہ تڑکے نکل سکیں۔ نمازِ فجر کے بعد ہلکا سا ناشتہ فرمایا اور فوری روانگی کا حکم دیا، تاکہ وہاں کے لوگوں کو انتظار کی گھڑیاں گننے کی ضرورت نہ پڑے، چند افراد کا یہ قافلہ، مرکز کی مسجد سے چلا، خورجہ (ضلع بلند شہر، اتر پردیش کا مشہور صنعتی شہر) پہنچنے سے قبل طبیعت دیگر گوں ہوگئی، اسی حالت میں خورجہ پہنچے۔ نڈھال و بے تواں۔ یہاں رفقا کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ سفر روک کر مولاناؒ کو دہلی واپس لے چلیں، حالات کچھ ایسے ہی تھے، سفرِ حج سے واپسی کے بعد عارضہ کے وقت جس اسپتال میں داخل کیے گئے تھے، اُس کے ڈاکٹر سے فون پر رابطہ قائم کیا گیا، اُس نے فوری طور پر دہلی واپس لانے کی وصیت کی۔ رفقاے سفر کا بیان ہے کہ خورجہ سے دہلی تک کے سفر میں مولانا ذکرِ الٰہی میں رطب اللسان رہے، ادعیۂ ماثورہ کا ورد جاری رہا۔

دہلی پہنچ کر، اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں داخل کیا گیا، مکمل طبی جانچ کے بعد، علاج شروع ہوا، دوا نے اپنا فوری اثر دکھایا، شام تک طبیعت بہ حال ہوگئی، مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ بہ جلد (پر) نظام الدین واپس چلیں؛ لیکن ایک مسلم ڈاکٹر کے ایما پر رات اسپتال میں گزارنی پڑی۔

وفات

۱۳ر محرم ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۱ رمئی ۱۹۹۷ء گیارہ بجے دن میں بہ عافیت مرکز آ گئے،

وہاں سے روانگی کے وقت مرحوم نے رفقا کو ظہر کی نماز کی تیاری کا حکم دیا۔ رات بھر اِصرار رہا کہ مرکز میں پہنچتے ہی اُن کو غسل دیا جائے، تا کہ سکونِ قلب کے ساتھ نماز ادا کر سکیں۔ اوراد و اذکار جاری رکھتے ہوئے، نظام الدین پہنچے، اُس بندۂ خدا کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ ایک لمحہ بھی خدا کی یاد کے بغیر گزر جائے!

گیارہ بج کر دس منٹ پر اپنے کمرے میں داخل ہوئے، عقیدت مندوں اور احباب کے ایک جمِّ غفیر کو، شوق و محبت کے جذبات کے ساتھ محوِ انتظار پایا، ۱۲ر بج کر ۳۵ منٹ پر اچانک سانس اکھڑنے لگا، پہنچتے پہنچتے وہ سب کچھ ہو چکا تھا جس کا اندیشہ تھا، مرحوم اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

رحمتِ الٰہی زبانِ حال سے یہ کہہ رہی تھی: یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝

شام تک نظام الدین کے گلی کوچوں میں، دہلی اور دور نزدیک سے آنے والوں کا ایک انسانی سیلاب نظر آتا تھا، تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، نمازِ عشا کے معاً بعد، مرکز سے قریب مقبرہ ہمایوں سے متصل میدان میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں ہزار ہا ہزار خلقِ خدا نے شرکت کی، مقبرہ ''پنج پیراں'' میں، مرحوم کا جسدِ خاکی دفن کیا گیا، اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اُن پر اپنی رحمتوں، نوازشوں، اور بخششوں کی بارش کرے، اُن کی پیہم جد و جہد، انتھک سعی کا اپنے شایانِ شان جزا دے ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

افسوس کہ علم و فہم کی جامع، عمائدینِ جماعت تبلیغ کی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی۔ یہ صرف جماعت کا رونا نہیں؛ بل کہ ہندوستان کے کسی ثقافتی، تعلیمی، دعوتی اور تربیتی اِدارے پر نظر ڈالیے، تو یہی اَلم ناک صورتِ حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ باصلاحیت و مطلوبہ شخصیتیں (جو جہدِ مسلسل، سعیِ پیہم، جامع صالح تربیت، اور ثقافت و تعلیم کی بھٹی میں تپ کر کندن کے مانند چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں) گزرتی جاتی ہیں اور اپنے پیچھے ایسا خلا

چھوڑ جاتی ہیں جو پُر ہوتا نظر نہیں آتا، جگہ خالی رہتی ہے، ذمہ داروں کو مستقبل کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ اِس سے انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے، ہر چیز کو ہر وقت بلاسبب پیدا کرسکتا اور اِسی سے کچھ امید قائم ہے، اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق، عزائم میں بلندی، حوصلے میں توانائی وطاقت عطا کرے۔

مرحوم، اپنی خداداد صلاحیتوں اور خوبیوں کے سبب، ہر ایک کو روتا چھوڑ گئے، اُن کی موت پر واقعتاً رویا گیا، بہت رویا گیا، خون کے آنسو۔ زبانی، خطوط، تار، فون اور جملہ ذارئع ووسائل سے تعزیتی پیغامات موصول ہوے۔

امام وخطیب وناظم اعلیٰ امورِ مسجد حرام جناب شیخ محمد عبداللہ السبیل نے مرحوم کے صاحب زادے حضرت مولانا محمد یونس صاحب کے نام اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا:

> ''آپ کے والد مولانا محمد عمر صاحب کی وفات کی اطلاع ملی، ہم، آپ کی، اہلِ خانہ، اعزہ واقارب، اور مشائخ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے ڈھانک لے۔ جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، سب کو صبر جمیل کی توفیق دے، وہ بڑا سننے والا، قبول کرنے والا ہے''۔

اسی طرح امام وخطیب مسجدِ حرام شیخ عبدالرحمٰن السدیس صاحب نے فون پر مولانا محمد یونس سے تعزیت اور صبر کی دعا کی۔

مختصر سوانحی نقوش

❁ وفات کے وقت مرحوم ۶۸ سال کے تھے، بیس بار حج وزیارت سے مشرف ہوے بیرونِ ملک کے ۸۱ سفر کیے، اندرون ہند کے اسفار کی تعداد نا قابلِ شمار ہے۔

❁ حرمین شریفین اور سعودی عرب کے مختلف شہروں کے علاوہ مرحوم نے جن ممالک کا دورہ کیا، اُن کے نام یہ ہیں:

بیت المقدس، بحرین، دبئی، ابوظہی، لبنان، شام، کویت، مصر، اردن، قطر، الجزائر، تیونس، مغربِ اقصیٰ، ترکی، یوگوسلاویہ، بلغاریا، فرانس، اسپین، امریکا، کناڈا، کینیا، زامبیا، روڈیشیا، جنوبی افریقہ، ری یونین، موریشش، آسٹریلیا، فیجی، سنگاپور، انڈونیشیا، ملیشیا، تھائی لینڈ، فلپین، سوڈان، پاکستان، بنگلہ دیش، اور روم وغیرہ۔

تبلیغی ضرورتوں کے پیش نظر بعض ممالک کے بار بار اَسفار ہوے۔

۞ مرحوم کے پس ماندگان میں پانچ صاحب زادے: مولانا محمد یونس، مولانا محمد عمر، مولانا محمد یوسف، مولانا محمد صہیب، مولانا سلمان، ایک صاحب زادی اور بیوہ ہیں، اللہ اُنھیں صبرِ جمیل کی توفیق دے۔

۞ مرحوم کا خاندان ایک زمانہ سے بمبئی میں مقیم ہے، گھڑیوں کے پرزوں کی تجارت مشغلہ تھا، یہیں مرحوم ۱۱-۱۲ ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۵-۱۶ ستمبر ۱۹۲۹ء بہ روز اتوار و دوشنبہ کی درمیانی شب میں پیدا ہوے۔ آٹھ سال کے تھے کہ والد ماجد جناب وزیرالدین صاحب چل بسے، یتیمی کا بوجھ، ان کے دوشِ ناتواں پر آپڑا، والدہ محترمہ نے بڑی تن دہی اور جگرسوزی کے ساتھ پرورش کی، ۲۵ سال کی عمر میں ۲۸ر ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو بوڑھی ماں نے بھی داغِ مفارقت دے دیا۔

۞ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد، مرحوم نے بمبئی کے سرکاری اسکول مدرسہ حنفیہ میں ۱۱ر ذی قعدہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۵ر جون ۱۹۳۹ء کو داخلہ لیا، جمادی الاولی ۱۳۶۱ھ مطابق جولائی ۱۹۴۲ء میں گرمی کی چھٹی گزارنے، اپنے آبائی وطن "گھٹامن" پالن پور تشریف لائے اور گھر والوں کے ایما پر، دنیوی تعلیم کی بساط لپیٹ کر، دینی تعلیم کا رخ کیا، ۶ر شوال ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۷ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو دینی تعلیم کا آغاز کیا۔

۞ دو سال کے دوران ابتدائی اور ثانوی درجات کی کتابیں پڑھ کر، اعلیٰ تعلیم کے لیے ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند میں شوال ۱۳۶۳ھ مطابق مارچ ۱۹۴۴ء میں داخل ہوے؛ لیکن ایک ناگہانی مرض نے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور کردیا۔ چناں چہ شعبان ۱۳۶۴ھ مطابق اگست ۱۹۴۵ء میں دارالعلوم سے چلے گئے۔ صحت یابی کے بعد، گھر والوں نے کوئی ذریعۂ معاش تلاش کرنے کی ترغیب دی؛ تاکہ بوڑھی ماں کا بوجھ ہلکا ہوسکے، جو اَب تک گھر کا خرچ سنبھالے ہوے تھیں۔ یہ دور مرحوم پر بڑی تنگی کا گزر رہا تھا، چناں چہ بمبئی کی ایک مسجد میں امام وخطیب بن گئے اور کئی سال تک اِس پر فائز رہے۔

۞ اتفاقاً مرکزِ جماعتِ تبلیغ دہلی کی ایک جماعت نے بمبئی کا دورہ کیا اور گھوم پھر کر وہ اسی مسجد میں پہنچ گئی، جہاں مرحوم مامور تھے، وہ جماعت کے مؤثر دعوتی انداز واسلوب سے متاثر ہوے بغیر نہ رہ سکے،

چناں چہ اس میں شامل ہوکر، اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کردیا، اُس وقت جماعتِ تبلیغ کے سربراہ اعلیٰ حضرت مولانا محمد یوسف تھے، مرحوم کی تبلیغی سرگرمیوں پر مولانا کی گہری نظر تھی اور اُن کی نگاہِ بصیرت نے، اُن کی پیشانی پر نبوغ وعبقریت کے عیاں نقوش پڑھ لیے اور جب اُن کو علم ہوا کہ بیماری کے سبب دارالعلوم چھوڑ دیا تھا اور فضیلت نہ کرسکے تھے، تو دوبارہ داخل ہوکر فراغت حاصل کرنے کا مشورہ دیا، دارالعلوم کو خیر باد کہے دس سال گزر چکے تھے۔ اس طویل انقطاع کے بعد موصوف نے دوبارہ شوال ۱۳۷۴ھ مطابق اپریل ۱۹۵۶ء میں، دارالعلوم میں داخلہ لیا۔ دورانِ تعلیم، جس وقت، جتنا وقت ملتا، جماعت میں اور اُس کی سرگرمیوں میں صرف کرتے، جماعت سے وابستگی قوی تر ہوتی رہی۔

❁ فراغت کے بعد، دعوت وتبلیغ کے ہوکر رہ گئے۔ اُن پر امیرِ جماعت حضرت مولانا محمد یوسف کی نظرِ خاص تھی۔ اُنھی کے دامنِ تربیت میں میں جگہ پائی، پلے، بڑھے، پروان چڑھے، جن کی دعوتی حکمتِ عملی وقولی کا ایک بڑا حصہ جذب کیا، اُن کی مجلسوں اور تقریروں میں صفِ اول میں نظر آتے، جس کی وجہ سے مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم کی خوبیاں اور خصوصیات بڑی حد تک اُن میں رچ بس گئی تھیں، جس نے اُن کو ایک بے مثال خطیب اور ہوش مند داعیِ اسلام بنادیا تھا، جہاں کہیں تبلیغی مجلس، یا اجتماع ہوتا، حاضرین دل وجان سے اُن کے دیدار اور اُن کی تقریر سننے کے لیے بے قرار رہتے۔ کسی جگہ نہ ہوتے، تو خلا محسوس ہوتا۔

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ دو بج کر ۵۵ منٹ پر بہ روزِ جمعہ ۲۹/ ذی قعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۲/ اپریل ۱۹۶۵ء کو پاکستان میں رحلت فرما گئے، جہاں ایک تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لیے جانا ہوا تھا، اِس کے بعد، مرکز میں فجر کے بعد والی یومیہ تقریر کی ذمے داری مولانا مرحوم کے حصے میں آئی اور تاحینِ حیات مرحوم نے اِس ذمے داری کو نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا، یومیہ فجر کے بعد ڈھائی تین گھنٹے تک تقریر فرماتے؛ لیکن امراض کے شدید حملے کے بعد اعضا مضمحل ہوگئے تو نصف گھنٹے، یا اس سے بھی کم گفتگو فرماتے۔

❁ مرحوم بے شمار خوبیوں کے مالک تھے: تواضع، اِنکسار، حلم اور جود وسخا کے پیکر، علم وعلما دوست، اُن کے بڑے قدرداں تھے، طلبہ پر خصوصی شفقت وتوجہ اُن کی طبیعت ثانیہ تھی، اُنھیں اخلاقی اور مادی مدد دیتے اور دعائیں لیتے، فقرا، مساکین، تنگ دستوں اور بیواؤں کی بڑی خبر گیری کرتے، خود اور دوسروں کے ذریعے

سے بھی اُن کے حالات معلوم کرتے رہتے، وہ اُن کے لیے عطیّہ ہائے فطرت کے مثل تھے۔ ہوا، پانی، اور روشنی کی طرح عام وارزاں۔ اُن پر جان چھڑکتے، کسی کے یہاں رنج والم کا موقع ہوتا تو سب سے پہلے حاضر ہوتے، بھاگے بھاگے پھر رہے ہوتے، اُن کو کھانا کھلانا، حسب ضرورت سامان دینا، اُن کی مزید ضرورتوں کو نظر میں رکھنا، اُن کی فکر کرنا، اپنے سر اوڑھ لیتے۔ بڑے چھوٹے ہر ایک کی خدمت، یک ساں احساسِ لذّت ومسرّت اور تن دہی سے کرتے، مکافات اور معاوضہ لینے کا اِحساس، شاید اُن کے اندر پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا، (لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا) کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔

❁ مرحوم کا مخلصانہ طرزِ عمل اور اِحسان، فقرائے ہند کے ساتھ خاص نہ تھا، بیرونِ ہند خصوصاً پاکستان وبنگلہ دیش کے بہت سے ضرورت مند حضرات اُن کے اِحسان مند ہیں۔ ہر جگہ مرحوم نے اپنے افراد مقرر کر رکھے تھے، جو اُن کے حالات کی خبر رکھتے اور مرحوم کو مطلع کرتے، مرحوم کی روانہ کردہ اِمداد اُن تک پہنچاتے۔ اُن کی وفات سے کتنے لوگ، بے کس وبے سہارا ہوگئے۔

❁ اُن کی توجہ کا ایک اہم پہلو مریض کی عیادت ہے، خود بھی کرتے، دوستوں اور احباب کو بھی اِس کی تلقین وتاکید کرتے کہ یہ سنت ہے، اور باعثِ اجر وثواب —— اُن کے یہاں ہر کام کو اپنے وقت پر انجام دینے کا بڑا اہتمام ملتا ہے، سستی، کاہلی اور اِضاعتِ وقت کے نام سے وہ واقف نہ تھے۔

❁ فقہ، حدیث اور حیاتِ صحابہ کے مطالعہ کے رسیا تھے، شب بیداری اور تہجد کے پابند تھے۔ سفر، حضر، مرض، صحت میں کبھی بھی، اِس معمول میں معمولی فرق بھی نہ آتا۔ سنتِ نبوی کا اتنا پابند کم دیکھنے میں آیا، اگر کوئی سنت چھوٹ جاتی، تو حسرت وافسوس کے مارے بے حال ہوجاتے تھے، احباب ورفقا کو حکم تھا کہ ہر چھوٹی بڑی سنت کی یاد دہانی کراتے رہیں۔

❁ طبیعت میں بلا کی مہمان نوازی تھی، اگر کسی وجہ سے اِس کا موقع نہ ہوتا، تو مہمان کو کچھ روپے نقد دے دیتے، جیسا کہ اکابر علمائے ہند، مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کا معمول تھا۔

❁ میانہ مائل بہ پستی قد، بڑا سا سر، چھریری ہلکی داڑھی، کشادہ پیشانی، گٹھے اعضاء، گندمی کھلتا ہوا رنگ، صلاح وتقویٰ کے سبب تاباں وروشن چہرہ، شب بیداری اور خوف خداوندی سے معمور آنکھیں، جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

❁ مرحوم نے مختلف حیثیتوں سے، بہت زیادہ مشکل حالات میں اور زیادہ مدت تک دین کی خدمت

کی: امام وخطیبِ مسجد، طالبِ علم، جماعتِ تبلیغ کے ایک عام فرد اور اَعلیٰ سربراہ۔ اُنھوں نے جو دینی خدمات جن سطحوں پر، جن پہلوؤں سے اور جس پیمانہ پر انجام دیں، کام یابی ملی اور قابل رشک کام یابی۔ مسلمان جس ناگفتہ بہ دینی ومعاشرتی حالات اور مذہب سے دوری کے شکار تھے، اگر بہ فضلِ خداوندی حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے جماعتِ تبلیغ کی بنیاد اور حضرت مولانا محمد یوسف اور مولانا مرحوم نے اِس کی توسیع وتنظیم نہ کی ہوتی تو مسلمانوں میں جو دینی جذبہ اور مذہبی رنگ وآہنگ موجود ہے، شاید دیکھنے میں نہ آتا۔

۞ مرحوم اُن لوگوں میں تھے، جن کو اہلِ علم وتقویٰ، اَعزا واَقارب، جلد بھولیں گے، نہ بھولنا گوارا کریں گے، یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

مرحوم کے تئیں اپنا یہی کچھ عقیدہ ہے جس کا سطورِ بالا میں اظہار کیا گیا۔ حقیت کا علم، اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اور نہ ہی اُس کو معلوم کرنے کی کوئی سبیل ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے، مغفرت کی بارش برسائے، جنت کا اَعلیٰ مقام عطا کرے اور اہل وعیال واَعزا واَقارب کو صبرِ جمیل کی توفیق دے، آمین یارب العالمین (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۴، جلد ۲۱، ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ = اگست-ستمبر ۱۹۹۷ء۔

عارف باللہ حضرت مولانا

قاری سیّد صدّیق احمد باندویؒ(*)

1923-1997 = 1341-1418

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ کی ۲۳ویں اور اگست ۱۹۹۷ء کی ۲۸ویں تاریخ تھی۔ پنجشنبے کا دن اور چاشت کا وقت تھا، گھڑی تقریباً سوا دس بجا رہی تھی، مشہور عالم ربانی اور صاحب زہد و تقوی شیخِ طریقت حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندویؒ، ایک دن پہلے دماغ پر فالج کا حملہ ہونے اور رگِ دماغ پھٹ جانے کی وجہ سے، لکھنؤ کے ایک پرائیوٹ نرسنگ ہوم میں زیرِ علاج تھے کہ اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے، جوارِ رحمت میں چلی گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْن.

خبرِ وفات بجلی کی طرح پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور مسلمانوں کو زبردست اور ناقابلِ بیان غم واندوہ سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت مرحوم اگرچہ دین ودعوت، تعلیم وتربیت اور خدمتِ خلق کی بے پناہ اور پیہم مشغولیتوں کی راہ میں، صحت وتندرستی کی طرف سے بے پروائی برتنے کی بنا پر مختلف بیماریوں کا شکار تھے؛ لیکن ایسی کوئی خطرناک یا پرانی بیماری نہیں تھی، جس کی بنا پر اُن کے عقیدت مند اور متعارفین پہلے سے ذہنی طور پر اِس بات کے لیے آمادہ اور تیار ہوتے کہ کسی بھی لمحے، اُنھیں حضرت کے

(۱) ترجمہ از عربی، بہ قلم مولوی جاوید اشرف مدھے پوری قاسمی رجب ۱۴۱۸ھ مطابق نومبر ۱۹۹۷ء۔

انتقال کی غم ناک خبر سننی پڑے گی؛ چناں چہ اُن کی خبرِ وفات واقعی ایک اَلم انگیز ناگہانی حادثہ تھی، جس نے اِس وسیع ملک کے تمام مسلمانوں اور دعوت و اِصلاح اور تعلیم و تربیت کا کام کرنے والوں کو بالخصوص اور تمام مسلمانانِ عالم کو بالعموم جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

بے پناہ مقبولیت و محبوبیت

خدائے پاک نے اِس اخیر زمانے میں اِسلامی ہند میں، جس طرح کی ہمہ گیر و عمومی مقبولیّت و محبوبیّت حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ کو عطا فرمائی تھی، اُس کی نظیر نہیں ملتی؛ حتیٰ کہ بہت سے غیر مسلم بھی آپ کی وفات پر غموں میں ڈوب گئے؛ اِس لیے کہ اُنھیں آپ کی ذات میں، صلاح و تقوی اور خیر و برکت کا ایک ایسا اِنسان نظر آیا، جس نے مذہب اور رنگ و نسل کی تفریق سے بالاتر ہوکر، خود کو اِنسانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جو کوئی بھی آپ سے متعارف ہوتا، دیکھ کر ہو یا سن کر، آپ کی ذات کے تئیں ایک عجیب گرویدگی اپنے دل میں پاتا، جسے لفظوں کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ جس کا بھی تھوڑا یا بہت آپ سے تعلق تھا، اُس نے محسوس کیا کہ ایک مبارک سایہ اُس کے سر سے اٹھ گیا ہے اور شفقت و ہم دردی کی ایک مضبوط بیساکھی اُس سے چھین لی گئی ہے، جو زندگی کے نشیب و فراز میں اُس کا سہارا بنتی تھی۔ اپنی جگہ ہر ایک کو یہ اَلم انگیز اِحساس ستانے لگا کہ وہ اُن کی وفات سے، اپنے دکھ درد میں شریک ایک مہربان دل سے محروم ہوگیا ہے، اُس کا وہ بازو شل ہو چکا ہے، جس کی قوت و طاقت اُس کے حوصلے کو مہمیز کرتی تھی، ایک ایسی شریف زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی ہے، جو ہمہ وقت ہر کسی کے پاس اُس کی سفارش کے لیے تیار رہتی تھی۔ واقعتاً اُن کا دل ساری دنیا کا غم خوار و درد منداور اُن کی ذات ہر ایک کا مسیحا تھی:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد، ہمارے جگر میں ہے

امتیازی اوصاف

حضرت قاری صاحبؒ محض ایک عالم دین ہی نہ تھے، کہ جسے صرف کتاب وسنت کا گہرا اور وسیع علم ہو، تعلیم وتربیت میں ید طولیٰ حاصل ہو اور صلاح وتقوی، زہد وامانت، اِخلاص وپاک نفسی سے حصّہ وافر پایا ہو اور بس! وہ یہ سب کچھ تو تھے ہی؛ لیکن اور بھی بہت کچھ تھے۔ اُنھوں نے طالبِ علمی کے زمانے سے ہی ایک مسافر کی سی زندگی گزاری۔ سادگی اور کفایت شعاری، اُن کی زندگی میں اِس طرح رچ بس گئی تھی، جیسے گلاب میں خوشبو اور تاروں میں روشنی۔ فرطِ تواضع اُن کا حسن اور اِنکارِ ذات اُن کی آرایشِ خودی تھی۔ آپ اُن پاکیزہ اخلاق نبوی - علی صاحبها أحسن الصلاة وأزكى التسليم - کے مکمل نمایندے تھے، جن کے سحر نے کتنے دشمنوں کو دوست، اور کتنے خوں خواروں اور جابروں کو مہربان ودردمند بنا دیا تھا۔

حضرت قاری صاحب مرحوم، اُس مطلوبہ اور خداداد صلاحیت سے مالا مال داعیِ اسلام کا بہترین اور قابل تقلید نمونہ تھے، جو سخت ضرورت کے وقت اللہ کی طرف سے منتخب ہوکر آتا ہے اور جو اپنے پروردگار، اپنے دین اور اپنے نبی کی سنتِ مطہرہ کی طرف دعوت کے لیے صرف لسانی صلاحیتوں سے کام لینے پر اکتفا نہیں کرتا؛ بل کہ خود اُس کا وافر علم وفضل، غیر معمولی تواضع وانکساری، پاکیزہ سیرت، مثالی زندگی، بے نظیر حلم وبردباری، سچی انسانیت، اپنے ہم جنس انسانوں کے تئیں اخوّت وہم دردی، بلند اخلاقی وغیرہ ساری چیزیں سراپا دعوت بن جاتی ہیں؛ کیوں کہ اُن کا پرتو، دین ومذہب، نظریات وعقائد، ذوق ورجحان اور عمروں کے اختلاف کے باوصف تمام لوگوں پر پڑتا اور اُنھیں اپنا شیدائی بنا لیتا ہے۔ چناں چہ کتنے ہی اخلاقی بے راہ روی کے شکار تھے، جن کے دلوں کی دنیا حضرت قاری صاحبؒ کی ایک مختصر سی ایمان پرور صحبت نے، یکسر بدل ڈالی۔ کتنے ہی ڈاکو، راہ زن اور جرائم پیشہ لوگ تھے، جن کی دشتِ ظلمت میں بھٹکتی

ہوئی زندگیوں کا رخ آپ کی ایک ملاقات کے طفیل یکسر بدل گیا اور اُنھوں نے اپنے غلط پیشے سے تائب ہوکر، پاکیزہ زندگی اختیار کرلی۔ تعصّب ونفرت کی چہار دیواری میں بند کتنے ہی غیر مسلم، جنھیں ایک بار آپ کی زیارت نصیب ہوگئی؛ مسلمانوں کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھنے لگے۔ آپ کے طفیل ہی، مختلف طبقوں کے غیر مسلموں کا اِسلام سے حسن ظن قائم ہوا اور وہ یہ کہہ اٹھے کہ: کہ اسلام وہی ہے، جسے ہم فرشتہ صفت انسان: ''ہتھوڑا والے بابا'' کی زندگی میں چلتا پھرتا دیکھتے ہیں، تو اُس کی بہتری کا کیا پوچھنا اور اُس کی خوبیوں کا کیا کہنا! یہ اعتراف اِس لیے تھا کہ حضرت باندویؒ محض قاریِ قرآن نہیں؛ بل کہ سراپا قرآن تھے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

جہدِ مسلسل اور سفرِ پیہم

حضرت قاری صاحبؒ دینی وتعلیمی اور دعوتی واِصلاحی مقاصد کے پیشِ نظر، برابر سفر میں رہتے تھے۔ قریبی علاقوں اور ملک کے گوشے گوشے کا بہت زیادہ دورہ ہوتا۔ ہر سفر کے بعد دوسرا سفر، ہر دورے کے بعد دوسرا دورہ اور ہر دوسرے کے بعد تیسرا، غرض ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ حضرت مرحوم بڑے جلسوں میں جانے سے کتراتے اور احتراز برتتے تھے؛ لیکن دیہاتوں اور گاؤوں میں، جہاں جانے کے لیے سہولیات مُیَسَّر نہ ہوں اور وہاں آرام وراحت کا کوئی نظم نہ ہو، چھوٹے چھوٹے جلسوں میں شرکت کے لیے پہنچ جاتے اور مقبولیت کا یہ عالم کہ لوگ جیسے ہی آپ کا نام سنتے، مشتاقانہ چل پڑتے اور پھر اِنسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہی دکھائی پڑتا۔ باندہ کے چاروں طرف وسیع خطۂ اراضی پر پھیلے ہوئے اَضلاع کے علاقوں میں آپ کے سفروں کا واقعہ تو حیرت انگیز ہے۔ اُن میں آپ کا اِس قدر بار بار آنا جانا ہوا کہ ہر چھوٹا بڑا، بچہ

بوڑھا، مرد عورت، مسلم غیر مسلم؛ حتی کہ بسوں، ٹرکوں اور ٹرینوں کے ڈرائیور بھی آپ کو خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ آپ لوگوں کے گھروں میں پہنچتے، اُنھیں دین کی باتیں بتاتے، اِسلام کی تعلیم سے آگاہ کرتے، اخلاقِ نبوی سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے کی ترغیب دیتے، دین واخلاق، صلاح وتقوی اور خیر واِصلاح کی راہ اپنانے کا جذبہ پیدا کرتے۔ بسا اوقات ان سفروں کا مقصد کسی کی دعوت واِصرار پر، تقریب شادی میں شرکت کر کے اُس کا دل خوش کرنا یا دو فریقوں میں صلح صفائی اور اُخوت ومحبت کی تخم کاری ہوتا۔ عموماً دور افتادہ، پس ماندہ، سہولیات سے خالی دیہاتوں میں، جہاں جاتے ہوئے مشہور دعاۃ ومبلغین گھبراتے اور پیچھے ہٹتے ہیں، وہاں کے جلسوں میں، اگر دعوت آتی، تو ضرور شرکت فرماتے۔ شہروں کے اِجلاس میں بھی جانا ہوتا، لیکن کم، وہ بھی اُس وقت، جب کہ اُس کا دار ومدار آپ ہی پر ہوتا۔ کسی تعلیمی اجتماع اور علمی سیمینار میں، دعوت قبول کرنے پر ہی تشریف لے جاتے۔ سفر کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ ضرورت پڑی، تو پیدل ہی چل پڑے، بھیڑ بھاڑ والی عام بسوں میں سوار ہو گئے، پسنجر یا اکسپریس کسی بھی ٹرین سے سفر کر لیا۔ پہلے سے کوئی رزرویشن نہیں ہوتا تھا۔ سامان سے لدی ہوئی ٹرک گاڑیاں ملیں، تو اُنھی میں بیٹھ کر، منزل تک پہنچ گئے۔ اُن ٹیکسیوں سے بھی راستہ طے کر لینے سے گریز نہیں کرتے، جن میں سواریوں کو اس طرح ٹھونس کر بٹھایا جاتا ہے کہ الامان! گویا وہ انسان نہیں، سیمینٹ یا چاول یا اور کسی چیز کی بوریاں ہوں۔

کثرتِ اسفار میں کم ہی لوگ آپ کی نظیر ہو سکتے تھے۔ کسی بھی عالمِ دین نے آپ سے زیادہ گاؤں اور شہروں کا بار بار دورہ اور سفر نہیں کیا ہوگا۔ مختلف جماعتوں، اداروں، مذاہب اور زندگی کے اَن گنت شعبوں سے تعلق رکھنے والے سبھی لوگ آپ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے اور آنکھوں میں بساتے تھے؛ چوں کہ آپ نے اُن کے لیے اپنا دل فرشِ راہ کر دیا تھا اور آپ اپنی بلندیوں کے باوجود، اُن کے متواضع خادم تھے اور اُن کے لیے ایک ایسے سادہ دل اور مخلص انسان تھے کہ کوئی بھی شخص، پہلے سے وقت

لیے بغیر، جس وقت چاہے، اُس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا، مل سکتا تھا اور اُس کے پاس بلا کسی روک ٹوک کے جا سکتا تھا۔ پہلے سے کسی طرح کے نظم وانتظام کا مسئلہ اور کسی نفسیاتی احتیاط اور ذہنی تیاری کی ضرورت نہ ہوتی تھی، جیسا کہ عموماً کسی بڑے عالم یا مشہور داعی سے ملاقات کے لیے، اِن دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بلا ریب حضرت مرحوم آفتابِ عالم تاب تھے، جس کی قوت بخش کرنیں، فقیروں کی جھونپڑیوں اور امیروں کی کوٹھیوں پر برابر برابر پڑتی ہیں اور جس کی حیات افزا شعاعیں میدانوں اور پہاڑوں سب کو یکساں طور پر روشن کرتی ہیں۔ آپ کی فیض رساں ذات، پانی اور ہوا کی طرح انسانوں کی ضرورت تھی کہ ہر کوئی اُس کا محتاج ہوتا اور کسی تکلف اور ہچکچاہٹ کے بغیر اُسے حاصل کرتا ہے؛ لیکن اب ع ''کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے'' ہر کچھ تو زندانیِ تقدیر ہے:

نغمۂ بلبل ہو، یا آوازِ خاموشِ ضمیر
ہے اِسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر

مقبولیت عامہ کا نمونہ

حضرت قاریؒ صاحب اُس مقبولیت عامہ کا نمونہ تھے، جو خدا اپنے کسی بندے کو اُس وقت عطا فرماتا ہے، جب اُس سے محبت کرتا ہے؛ چناں چہ آسمان میں، اُس کے فرشتے اُسے محبوب رکھتے ہیں اور زمین پر اُس کے بندے، اُسے دلوں میں بساتے اور پلکوں پہ بٹھاتے ہیں۔ ربِّ کائنات نے کچھ ایسی ہی مقبولیت ومحبوبیت حضرت قاری صاحبؒ کو عطا فرمائی تھی؛ چناں چہ آپ کی نمازِ جنازہ میں لاتعداد خلقت کا ہجوم تھا۔ کچھ شہروں کی بس یونینوں کی طرف سے تو اِعلان کر دیا گیا کہ اُن کی بسیں حضرتؒ کے جنازے میں شرکت کے لیے ''ہتھورا'' جانے والوں کو مفت لے جائیں گی۔ بہت سے ٹیکسی ڈرائیوروں نے، جن میں غیر مسلم بھی تھے؛ جنازے میں شرکت کے لیے جانے

والوں کو بلا کرایہ ''ہتھورا'' پہنچا دیا۔ اَن گنت عینی شاہدین کا بیان ہے کہ: کئی کلومیٹر تک صرف وہ بسیں، ٹرک، ٹیکسیاں اور کاریں ہی نظر آ رہی تھیں، جن پر جنازے میں شرکت کے لیے، غم خوار جوق در جوق آئے تھے؛ جب کہ اُن کی بڑی تعداد پیدل چل کر ہی ''ہتھورا'' آئی تھی۔ کیا شانِ محبوبیت ہے! اللہ اکبر

حضرت قاری صاحبؒ کی ذاتِ گرامی ایک چلتا پھرتا دعوتی و اِصلاحی مدرسہ تھی۔ جہاں بھی فرد کش ہوتے، علم و فضل اور دعوت و دین کی روشنیاں بکھیرتے، اُن کی شگفتہ روئی و خندہ پیشانی اور ہر انسان سے کھلے دل کے ساتھ اور مسکرا کر ملنا، دیکھنے والوں کے دل میں جگہ بنا لیتا اور وہ آپ سے محبت کرنے پر کچھ مجبور سے ہو جاتے۔

بَلائے جاں ہے غالب! اُس کی ہر بات
عبارت کیا، اِشارت کیا، اَدا کیا

اَسفار کے حوالے سے معمول

سفروں اور دوروں میں آپ کا یہ معمول بن گیا تھا کہ جس دینی و دعوتی مقصد سے جانا ہوتا، اُس کے پورا ہوتے ہی فوراً اپنی قیام گاہ ''ہتھورا'' لوٹ آتے، خواہ رات کا وقت ہو، یا شام کا، یا صبح کا اور جاڑے کے دن ہوں یا گرمی کے، موسم کی حرارت یا خنکی کی پروا کرتے اور نہ لوٹنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار۔ جیسا کہ عام عُلما و دُعاۃ کا شیوہ ہے؛ لیکن اِن ساری چیزوں کے باوجود، آپ نہایت پابندی کے ساتھ اسباق پڑھاتے اور مقررہ وقت پر درسی کتابیں ختم کرا دیتے۔ آپ دعوت و عبادت کے ذوق کے ساتھ ساتھ، درس و تدریس کا بھی پورا پورا مذاق رکھتے تھے؛ ورنہ عام طور پر تو یہی کہا جاتا ہے کہ کام یاب داعی، کام یاب مدرس نہیں ہوتا اور زاہد و متقی اور آہِ سحر گاہی سے بہرہ یاب آدمی، ذوقِ تدریس سے تہی دامن ہوتا ہے اور دعوتی مشن سے اچھی طرح عہدہ برآ نہیں ہو پاتا۔ حضرت مرحوم کتاب و سنت میں مہارت اور اُن کی گہری سمجھ اور فہم و اِدراک سے

مالا مال تھے۔ ساتھ ہی برِّصغیر ہند کے اِسلامی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون میں بھی اعلیٰ استعداد اور لیاقت رکھتے تھے۔ ان بوقلموں صفات وخصوصیات اور متضاد خوبیوں کی بنا پر حقیقتاً آپ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ آپ کی شخصیت ایک ایسا گلِ ہزار رنگ تھی، جس کا ہر جلوۂ رنگ آنکھوں کو بھاتا اور دل کو سرور بخشتا ہے۔

قاری صاحبؒ کے قائم کردہ مدرسے کی خصوصیت

حضرت قاری صاحبؒ نے اپنے گاؤں ''ہتھورا'' میں ایک مدرسہ قائم کیا، جو اُن کی مبارک کوششوں اور جدوجہد سے ہندوستان کے چند گنے چنے بڑے اِسلامی مدارس میں شمار ہونے لگا۔ اُنھوں نے روزِ اول سے ہی مختلف عربی واسلامی علوم: حدیثِ پاک اور فقہ وتفسیر وغیرہ کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو، ناظرہ وحفظ وتجوید وقراءت اور ہر لحاظ سے قرآنِ کریم کی معیاری تعلیم پر پوراز ور دیا۔ یہ مدرسہ آپ کی ذاتِ بابرکات کی جلوہ افروزی اور خصوصی طور پر آپ سے نسبت رکھنے کے طفیل، اسلامی تعلیمات کے مطابق، طلبہ کی عملی تربیت کے لحاظ سے مشہور وممتاز رہا ہے؛ چناں چہ وہاں سے دارالعلوم دیوبند یا ہندوستان کے دوسرے بڑے مدارس میں داخلے کے لیے آنے والے طلبہ اور اِسی طرح وہاں کے فارغین، اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، حسنِ سیرت واخلاق سے پہچانے جاتے؛ حتیٰ کہ اس مدرسے میں تعلیم پانا ہی، طالبِ علم کے پاکیزہ اخلاق ہونے کی علامت ہوتی تھی۔

عموماً اِنسان اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اور بیماری کے وقت، بیٹوں اور قرابت داروں کے متعلق ہی کچھ وصیت کرتا ہے۔ حضرت قاری صاحبؒ جب علاج کے لیے لکھنؤ لے جائے جارہے تھے- یہ عشا بعد کا وقت اور آپ کی زندگی کی آخری رات تھی- آپ نے صرف مدرسے کے سلسلے میں وصیت فرمائی اور باندہ شہر میں اپنے پاس موجود لوگوں سے کہا: ''مدرسے میں کام کرنے والے سبھی لوگوں کو میرا آخری سلام پہنچا دو اور کہہ

دو کہ مدرسے کا خیال رکھیں اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کو اہتمام سے انجام دیں۔"

وفات

۲۲؍ربیع الثانی مطابق ۲۷؍اگست کو عصر کے وقت، یعنی وفات سے ایک دن سے بھی کچھ کم پہلے، آپ پر فالج کا حملہ ہوا؛ لیکن خدا کی شان! آپ کی زبانِ مبارک پر برابر اللہ کا ذکر جاری رہا۔ ذکرِ خدا سے تر ہلکی ہلکی آواز سنائی بھی دے رہی تھی۔ خشیتِ الٰہی اور ذکرِ خداوندی کے عالم میں موت، اللہ تبارک وتعالی کو سب سے زیادہ پسند اور محبوب ہے اور ایسی موت اِن شاءاللہ نیک انجام کی علامت اور خاتمہ بالخیر کی دلیل ہے؛ چناں چہ حدیث پاک میں ہے:

إِنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ أَنْ تَمُوتَ وَلِسَانُكَ رَطْبٌ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ.(۱)

(اللہ پاک کو سب سے زیادہ یہ عمل محبوب ہے کہ تمھیں اِس عالم میں موت آئے کہ تمہاری زبان ذکرِ الٰہی سے تر ہو)

۲۳؍ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ کو، ٹیلیفون کے ذریعے، ساڑھے دس بجے، یعنی وفات کے چند منٹوں کے بعد، دار العلوم دیوبند میں جیسے ہی انتقال کی خبر ملی، پورے ماحول پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اساتذہ، طلبہ، ذمہ داران، خصوصاً مہتمم دار العلوم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم، حزن وغم کی تصویر بن گئے۔ دار العلوم دیوبند میں نمازِ ظہر کے بعد ایک دعائیہ مجلس منعقد ہوئی، جس میں تمام طلبہؑ واساتذہ، حضرت مہتمم صاحب اور نائب مہتمم حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب دامت برکاتہم (۲) نے شرکت فرمائی۔

دار العلوم دیوبند کے اُستاذِ حدیث اور نیک وصالح عالم: حضرت مولانا عبد الحق

---

(۱) (طبرانی وبیہقی)

(۲) اور اب بہ وقتِ اِشاعتِ ایں مضمون بہ شکلِ کتاب ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ، وفات: جمعرات ۱۹؍صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۴؍فروری ۲۰۱۰ء۔

صاحب اعظمی دامت برکاتہ نے مجلس کو خطاب کرتے ہوئے، قرآن کریم کی آیات: "کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ" (جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے) اور "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" (ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے) تلاوت فرمائیں اور حضرت قاری صاحبؒ کو بارگاہِ ایزدی سے عطا کردہ محبوبیتِ عامہ کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا: "آپ جہاں بھی جاتے، لوگ محبت واشتیاق میں پروانہ وار ٹوٹ پڑتے۔ ایمان وتقوی، صلاح وخیر، شب بیداری وآہِ نیم شبی اور رات کے سنّاٹے میں، جب کہ پورا عالم سورہا ہو؛ لذّتِ قیام کا نور اُن کے چہرے پر جگمگاتا تھا۔ اِسی بنا پر سارے لوگ؛ حتی کہ بہت سے غیر مسلم بھی آپ کی نورانی اور پیاری صورت دیکھنے کے مشتاق رہتے تھے۔

حضرت مولانا نے فرمایا: کسی نہ کسی دن ہر ایک کی زندگی کا سفر ختم ہو جائے گا؛ لیکن خوش نصیب لوگ وہ ہیں کہ جب دنیا سے جاتے ہیں، تو لوگ اُنھیں روتے ہوئے ڈھونڈتے اور تلاش کرتے ہیں اور پانی کی مچھلیاں تک بھی اُن سے محبت کرتی ہیں۔ ایسے لوگ خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہمیں بھی اُنھی جیسا بننا چاہیے اور اُن کے طور طریقوں پر چلنے اور اُن کے اخلاق وعادات کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں اُن لوگوں کی روش اختیار نہ کرنی چاہیے کہ جب مرتے ہیں، تو کوئی آنکھ اُن پر رونے والی نہیں ہوتی۔ اُن کا جینا مرنا سب برابر ہوتا ہے۔

یہ مجلس، مہتمم دار العلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم کی دعا پر ختم ہوئی۔

مختصر حالاتِ زندگی

آپ کی ولادت بہ روز جمعہ ۱۱ر شوال ۱۳۴۱ھ مطابق ۲۹ر اپریل ۱۹۲۳ء اپنے گاؤں "ہتھورا" ضلع باندہ اُتر پردیش میں ہوئی۔ یہ تاریخ ولادت، مظاہرِ علوم کے داخلے فارم میں درج شدہ سنہ پیدائش کے مطابق ہے۔ آپ کے والدِ ماجد کا نام "سید احمد" ہے آپ کا اسمِ گرامی (مولانا قاری) سید صدیق احمد بن سید احمد بن

سید عبد الرحمٰن ہے۔ سلسلۂ نسب سید قاضی محمد داؤد (جو سلطان شہاب الدین محمد غوری کے زمانے میں عراق کے شہر ''واسط'' سے ۶۱۱ھ میں ہندوستان وارد ہوئے تھے) کے واسطے سے امام زین العابدین بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔

۞ **پورا سلسلۂ نسب قاضی محمد داؤد تک اِس طرح ہے:** صدیق احمد بن سید احمد بن قاری عبد الرحمٰن بن ولی محمد بن سرمست علی بن وہاب علی بن یاد اللہ بن جان محمد بن روح اللہ بن عنایت علی بن مدد علی بن دیوان غلام مصطفیٰ بن محمد منصور بن قاضی محمد داؤد۔

۞ **تعلیم وسلوک ومعرفت:** آپ نے گاؤں ہی میں اپنے دادا قاری عبد الرحمٰن صاحب تلمیذ قاری عبد الرحمٰن صاحبؒ محدث پانی پتی سے ابتدائی تعلیم مکمل کی اور کلام پاک حفظ کیا۔ دادا کی وفات کے بعد حفظِ قرآن کی تکمیل اپنے ماموں سید امین الدین صاحب سے کی اور اُنھی سے فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر آپ ''کانپور'' آگئے اور یہاں کئی ایک اساتذہ سے عربی وفارسی مبادیات کی تعلیم پائی۔ پھر یہاں سے پانی پت چلے گئے اور وہاں شرح جامی (بحث فعل) تک کے درجے کی مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔ قراءتِ سبعہ کی تعلیم بھی آپ نے یہیں حاصل کی۔

شوال ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء میں مشہور تعلیم گاہ جامعہ مظاہرِ علوم سہارن پور میں داخلہ لیا۔ یہ حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب قدّس سرہ کی نظامت کا دور تھا اور صدر المدرسین حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحبؒ کامل پوری تھے۔ سلم العلوم اور کنز الدقائق کے درجے سے، دورۂ حدیث تک آپ نے مظاہرِ علوم میں تعلیم پائی اور ۱۳۶۳ھ میں یہاں سے فارغ ہوئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آپ نے درمیان سال میں مظاہرِ علوم سے آکر ۵/ جمادی الاولی ۱۳۶۲ھ کو مدرسہ شاہی میں داخلہ لیا اور اُس سال مشکوۃ شریف اور ہدایہ آخرین وغیر پڑھیں۔ مدرسہ شاہی کے رجسٹرِ نمبراتِ اِمتحان شعبان ۱۳۶۲ھ سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس امتحان میں آپ نے مشکوۃ شریف میں، کل نمبر ۵۰ میں سے ۵۱ اور ہدایہ آخرین میں ۵۰ نمبرات حاصل فرمائے (۱)۔ آیندہ سال مظاہرِ علوم میں پھر دورۂ حدیث میں داخل ہوئے؛ لیکن سہ ماہی امتحان

---

(۱) واضح ہو کہ مدارسِ اسلامیہ میں پہلے آخری نمبرات (۱۰۰) نہیں؛ بل کہ (۵۰) ہی ہوا کرتے تھے۔ دار العلوم دیوبند میں تو شعبان ۱۴۳۰ھ مطابق جولائی - اگست ۲۰۰۹ء کے سالانہ اِمتحان تک آخری نمبرات (۵۰) ہی تھے، البتہ اِمتحان سالانہ شعبان ۱۴۳۱ھ مطابق جولائی - اگست ۲۰۱۰ء سے مجلسِ شوریٰ نے آخری نمبر (۱۰۰) کردیے ہیں، جامعہ مظاہرِ علوم سہارن پور میں یہ تبدیلی کئی سال پہلے روبہ عمل آچکی ہے۔

دے کر مدرسہ عالیہ فتح پوری مسجد دہلی آ گئے اور یہیں دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ اُس وقت فتحپوری میں حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) استاذِ حدیث تھے۔ مظاہر علوم میں آپ نے بخاری جلد اول اور ابوداؤد، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے، بخاری جلد ثانی مولانا عبد اللطیف صاحبؒ سے، مسلم شریف مولانا منظور احمد صاحبؒ سے، ترمذی، شمائلِ ترمذی اور طحاوی مولانا عبد الرحمٰن صاحبؒ کامل پوری سے، نسائی مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے پڑھی۔

حضرت قاری صاحبؒ، مظاہرِ علوم کے ایامِ طالبِ علمی میں، ہمیشہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ (متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء) کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ آپ اُن کے علم وفضل اور صلاح وتقویٰ کے دل دادہ تھے۔ تزکیۂ واحسان اور سلوک وطریقت کے منازل اُن ہی کی نگرانی میں طے کیے اور آستانۂ رب پر جبہہ سائی کے طور طریقے اُنھی سے سیکھے۔ اُنھوں نے ۱۳۷۶ھ میں آپ کو خلافت واجازت کے خلعت سے بھی سرفراز فرمایا۔

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کے وصال کے بعد، وقت کے نامور علما و مشائخ سے سلسلۂ زیارت واستفادہ ومشورہ جاری رکھا، جن میں حضرت تھانویؒ کے خلفا مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ، مولانا شاہ عبد الغنی پھول پوریؒ، مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئیؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ اور مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ سرفہرست ہیں۔

۞ **تدریسی زندگی:** فراغت کے بعد تدریسی زندگی کا سلسلہ شروع ہوا۔ چند ماہ گونڈہ مدرسہ فرقانیہ اور چند سال فتحپور مدرسہ اسلامیہ میں تدریسی فرائض انجام دیے۔ اِس طرح تین سال گزر گئے۔ اُسی زمانے میں علاقے میں فتنۂ ارتداد اُٹھ کھڑا ہوا۔ حفاظتِ دین کے جذبے نے تقاضا کیا کہ اِس فتنے کا قلع قمع کرنے کے لیے کمربستہ ہوں۔ چناں چہ آپ نے ''فتح پور'' چھوڑ دیا اور فتنے کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ دن رات کی جدوجہد اور سعی، خدا کے فضل سے مقبول ہوئی اور فتنہ فرو ہو گیا، جو لوگ ارتداد کا شکار ہو گئے تھے، از سرِ نو اِسلام کے دامن میں آ گئے۔

۞ **ازدواجی زندگی:** ۱۹۴۶ء میں آپ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے، آپ کے دس لڑکے اور لڑکیاں ہوئیں: ۶ لڑکیاں اور ۴ لڑکے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بچپن میں فوت ہو گئے۔ باقی تین صاحب زادے، صاحبِ علم وکمال ہیں اور تدریسی ودعوتی وتربیتی کاموں میں اپنے عظیم والد کی جانشینی فرما رہے ہیں، جن میں سب سے بڑے مولانا سید حبیب احمد مظاہری، دوسرے مولانا قاری سید نجیب احمد قاسمی اور تیسرے مولانا قاری حسیب احمد مظاہری ہیں۔ چاروں صاحب زادیاں بھی متزوج اور صاحبِ اولاد ہیں۔

۞ **مدرسے کا قیام:** آپ نے علاقے کی بد دینی، لوگوں کی اِسلامی تعلیمات سے ناواقفیت، بدعت وجہالت کی پھیلی ہوئی تاریکی، کفر والحاد اور ارتداد کے روز افزوں حملوں اور علاقے میں اِسلامی تعلیمی ادارے کے عدمِ موجودگی کو دیکھتے ہوے، اپنے گاؤں ''ہتھورا'' میں ایک مدرسہ ''جامعہ عربیہ اسلامیہ'' کی بنیاد رکھی۔ حال آں کہ اِس کی راہ میں مشکلات کے سیلاب آتے رہے؛ لیکن آپ نے خونِ جگر سے، اُسے پروان چڑھایا اور مکتب کی منزل سے ترقی دے کر ہندوستان کی ایک اہم اِسلامی درس گاہ بنا دیا۔ مدرسے اور لوگ بھی قائم کرتے ہیں؛ لیکن طوفانوں میں شمع جلانا اور زمینِ سنگلاخ میں سنبل پیدا کر لینا، ہر ایک کا کام نہیں۔ آپ نے اِس مدرسے کے قیام کے علاوہ، دور دراز کے گاؤں میں بھی دینی تعلیم کے لیے بہت سے مکاتب قائم کیے۔

آپ نے بندوں کی اِصلاح، نیز بدعت وجہالت اور مسلم معاشرے میں پھیلے ہوے ہندوانہ رسوم ورواج کے قلع قمع کے لیے، اپنی پوری کوشش صرف کر دی اور پیغامِ اِسلام کی اِشاعت، خدمتِ خلق، تزکیۂ اخلاق اور اِسلامی وعربی علوم کی تعلیم وتدریس میں اپنی تمام تر توانائیاں لگا دیں۔ دعوتی وتربیتی ذمّے داریوں کی انجام دہی کے لیے باصلاحیت جماعتیں پیدا کر دیں۔ آپ کی پوری زندگی، جدّ وجہد، حرکت مسلسل اور گردشِ پیہم سے عبارت تھی۔ ہر سفر کا اختتام، دوسرے سفر کا آغاز ہوتا تھا۔ بہ قول عربی شاعر:

مَا ابَ مِنْ سَفْرٍ اِلَّا اِلٰی سَفَر

(وہ ایک سفر سے واپس آ کر دوسرا سفر ضرور شروع کر دیتا ہے)

بارہا ایسا ہوتا کہ سفروں اور دوروں سے رات کے اخیر حصے میں مدرسہ واپسی ہوتی، طلبہ کو اُٹھاتے اور وضو کے بعد درس گاہ میں اکٹھا ہو جانے کا اِعلان کر دیتے؛ پھر اُنھیں حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر علوم میں سے، جو اُس وقت پڑھانا چاہتے، پڑھاتے۔ تکان کا نام ونشان ہوتا اور نہ کسی طرح کی اکتاہٹ کا اِحساس، بیماری کی شکایت ہوتی اور نہ تھوڑی دیر ستا لینے کی خواہش۔ بس یوں سمجھیے کہ اُن کی پوری زندگی، مجاہدانہ تگ ودو، جنبشِ مسلسل، نشاطِ جاوداں اور جہادِ پیہم کا نام تھی۔ اِقبال کا یہ تخیل آپ کی زندگی میں حقیقت بن گیا تھا:

سفر زندگی کے لیے، برگ وساز

سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

۞ **تالیفات:** آپ کی متحرک زندگی، قلمی اشتغال کا موقع نہیں دیتی تھی؛ لیکن آپ نے تصنیف

وتالیف کا صاف ستھرا ذوق پایا تھا۔ بے پناہ مشغولیتوں کے باوجود، جو قلمی سرمایہ آپ کی یادگار ہے، وہ اِس بات کا شاہد عدل ہے۔ ذیل میں چند تصنیفات کے نام درج ہیں:

۱- تسہیل التجوید ۲- احکامِ میت ۳- آداب المعلمین والمتعلمین ۴- تسہیل المنطق ۵- حق نما ۶- فضائلِ نکاح ۷- تسہیل الصرف ۸- اِسعاد الفہوم شرح سلم العلوم ۹- تسہیل النحو ۱۰- فضائل علم ۱۱- قواعد فارسی ۱۲- سیرت نبوی پر سنن کی ترتیب سے واقعات کا بیان ۱۳- نماز کے موضوع پر ایک عمدہ کتابچہ ۱۴- منظوم مجموعۂ کلام ۱۵- تسہیل السامی شرح ''شرح جامی''۔

❁ **قاری صاحب اور شاعری:** قاری صاحبؒ کو اللہ تعالی نے گونا گوں علمی و عملی صفات سے نوازا تھا، جن میں ذہن وفکر کی موزونیت، طمانیتِ قلب، سکون دل، خاص نعمت تھی، جو اُنھیں خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی؛ اِسی لیے وہ اعلی پایے کے عارف باللہ اور ٹھوس علم والے عالم اور بے پناہ فیضان والے مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ، باکمال شاعر بھی تھے، اُنھوں نے حمد ونعت، وارداتِ قلب، دعوتِ دین، فکرِ اِسلامی وغیرہ موضوعات پر جو اَشعار کہے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں، جن میں انتہائی سادگی کے ساتھ، انتہائی پرکاری ہے اور الفاظ کی بے ساختگی کے ساتھ دل کا درد ہے، جو لفظ لفظ سے ٹپکتا ہے اور قاری کو دل کی دولت سے مالا مال کر جاتا ہے، اُن کے اشعار میں روانی اور آمد کا رنگ امتیازی حیثیت رکھتا ہے، جو علما وصوفیا کے یہاں اُسی وقت نظر آتا ہے، جب زبان پر گرفت کے ساتھ دردِ دل کی دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ اُن کے اشعار کے مجموعے ''کلامِ ثاقب'' اور ''فیضان صدیق'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اُن دونوں سے پہلے ''گل دستۂ ذوق'' اور ''صہبائے مدینہ'' کے نام سے بھی دو مجموعے شائع ہوئے تھے، جن میں دگر حضرات کا کلام بھی شامل کرلیا گیا تھا۔

اُن کی ایک نعت کا عنوان ہے ''مدینہ کی جدائی'' یہ نعت بہت مشہور ہے۔ یہاں دو ایک نعتوں اور دگر اشعار کے کچھ نمونے پیش ہیں:

﴿مدینہ کی جدائی﴾

کسی مجلس میں جب نعتِ شہِ عالم سناتے ہیں
فضائیں رقص کرتی ہیں، فرشتے جھوم جاتے ہیں
شبِ معراج میں ختمِ رُسُل کا مرتبہ دیکھو
جہاں کوئی نہیں پہنچا، وہاں تک آپ جاتے ہیں

کوئی اِعجاز تو دیکھے مرے قرآنِ ناطق کا
لقب اُمی ہے؛ لیکن علم کا دریا بہاتے ہیں
اُترتے ہیں فرشتے آسماں سے پاسبانی کو
چَرانے بکریاں صحرا میں جب سرکار جاتے ہیں
پلٹ آتا ہے سورج ڈوب کر حکمِ رسالت سے
اِشارے سے اُسے جب سرورِ عالم بلاتے ہیں
یہ ہے شانِ نبوت، چاند ہو جاتا ہے دو ٹکڑے
شہِ کون و مکاں جب ہاتھ کی انگلی ہلاتے ہیں
اُبل پڑتا ہے چشمہ بن کے برتن میں جو تھا پانی
شہِ دیں انگلیاں جب ہاتھ کی اُس میں لگاتے ہیں
لگا لیتے ہیں ہم سرمہ سمجھ کر آنکھ میں اپنی
مدینے پاک کی جس وقت بھی ہم خاک پاتے ہیں
مدینے کی جدائی اب بہت ہی شاق ہے ثاقب
نہ جانے کب تلک مولیٰ مجھے طیبہ بلاتے ہیں

﴿تمنّاے مدینہ﴾

تمنا ہے کہ گل زارِ مدینہ اب وطن ہوتا
وہاں کے گلشنوں میں کوئی اپنا بھی چمن ہوتا
بسر اب زندگی اپنی دیار قدس میں ہوتی
وہیں جیتا وہیں مرتا، وہیں گور وکفن ہوتا
مُیَسَّر بال وپر ہوتے تو میں اُڑ کر پہنچ جاتا
زہے قسمت کہ اپنا آشیاں اُن کا چمن ہوتا
نمازوں میں اُنھی کے در پہ میں کرتا جبیں سائی
تلاوت کا ترنّم اور جنّت کا چمن ہوتا

مقدر سے رسائی اُن کے در تک کاش ہو جاتی
متاعِ جاں، نثارِ روضۂ شاہِ زمن ہوتا

سبھی کچھ ہے مگر جب وہ نہیں، کچھ بھی نہیں حاصل
وہیں ہوتا جہاں اے کاش وہ جلوہ فگن ہوتا

خدا شاہد کہ ہم سارے جہاں پر حکم راں ہوتے
رسولِ پاک کی سنت اگر اپنا چلن ہوتا

تمنّا ہے کہ کٹتی عمر اُن کے آستانے پر
عنایت جلوہ گر ہوتی، کرم سایہ فگن ہوتا

خوشا قسمت کہ ہوتا کوچۂ محبوب میں مسکن
اُنھی کی راہ میں قربان اپنا جان وتن ہوتا

یہی ہے آرزو ثاقب، یہی اپنی تمنا ہے
کہ پیوندِ بقیعِ پاک، اپنا بھی بدن ہوتا

خفتہ امنگیں

تمنّا ہے کہ اب کوئی جگہ ایسی کہیں ہوتی
اکیلے بیٹھے ہوتے، یاد اُن کی دل نشیں ہوتی

وہاں رہتا جہاں پر، عالمِ آہ وفغاں ہوتا
وہاں بستا جہاں اشکوں سے تر، اپنی جبیں ہوتی

وہ مے خانے کہ جن میں سیکڑوں مستانے، رہتے تھے
وہ سب سُونے پڑے ہیں، اُن کی آبادی نہیں ہوتی

نہ ساقی اُن کا باقی ہے، نہ دورِ جام باقی ہے
کہیں پینے بھی جاتے ہیں، تو سیرابی نہیں ہوتی

غموں سے زندگی اپنی، بہت دو چار رہتی ہے
کسی دن بھی نہیں، خوش خاطر اندوہ گیں میری

مجھے مجرم بنانے کی جو اِسکیمیں بناتے ہیں
کبھی تقصیر پر ، اپنی نظر اُن کی نہیں ہوتی

مرا بس جرم اتنا ہے کہ مومن اور مسلم ہوں
حقیقت میں جو مجرم ہیں، گرفت اُن کی نہیں ہوتی

معافی مانگنے کو مانگ لوں سوبار میں لیکن
کوئی تقصیر تو میری کہیں ، اے ہم نشیں ہوتی

وفاداری کی میری کاش ، اُن کو قدر ہو جاتی
کبھی تو مرحبا کہتے، کبھی تو آفریں ہوتی

بدوں حبِّ نبی انسان ، جو دنیا میں رہتے ہیں
مکمل زندگی اُن کی ، کسی حالت ، نہیں ہوتی

نبی کی راہ سے ہٹ کر ، جو اپنی راہ چلتے ہیں
کبھی توفیق اُن کو ، خیر کی جانب نہیں ہوتی

پیمبر کی شریعت سے ، کبھی جب قوم ہٹتی ہے
خدا کی رحمت ونصرت ، اُسے حاصل نہیں ہوتی

پہنچ سکتا نہیں ، وہ منزلِ مقصود تک ہرگز
عنایت شیخِ کامل کی ، جسے حاصل نہیں ہوتی

قیامت میں ہے وعدہ دید کا، لیکن قیامت ہے
دلِ مضطر کی خواہش ہے، ابھی ہوتی یہیں ہوتی

مدینہ پاک تک ، میری رسائی کاش ہو جاتی
بتاؤں کیا کہ میری زندگی ، کیسی حسیں ہوتی

زیارت کے لیے، در پر مری جب حاضری ہوتی
میں سجدہ ریز ہوتا ، خاک آلودہ جبیں ہوتی

نظر جس وقت پڑتی ، روضۂ اقدس کی جالی پر
نگاہِ اولیں اپنی، نگاہِ واپسیں ہوتی

بڑی حسرت ہے ثاقبؔ کی کہ رہتا وہ مدینے میں
سپردِ خاک جب ہوتا، مدینے کی زمیں ہوتی

❁ **عہدے ومناصب:** حضرت قاری صاحبؒ مختلف بڑی اسلامی درس گاہوں اور مدارس کے معزز رکنِ مجلس شوریٰ تھے، جن میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلما، مدرسۃ الرشاد بنکی، ضلع بارہ بنکی اور دوسرے جامعات ومدارس ہیں؛ جب کہ غیر رسمی شکل میں بے شمار مدارس اُن کی نگرانی میں چل رہے تھے۔ ان سب مدارس کے ذمہ دار حضرات اُن سے مشورہ اور راہ نمائیاں حاصل کرتے، اُن کی رائے کے آگے سرِ تسلیم خم کردینا باعثِ سعادت سمجھتے اور اُن کے مشوروں وتجویزوں کی قدر کرتے۔ ہندوستان کے مسلمان عوام اُن کی راہ میں اپنی آنکھیں، اپنا قلب وجگر، متاعِ روح وجاں: سب کچھ بچھا ڈالتے تھے؛ چناں چہ جب کسی مدرسے کو امداد دینے کے سلسلے میں آپ کا دل مطمئن ہوتا اور مسلم عوام کو اُس مدرسے کے لیے، دستِ تعاون بڑھانے کا مشورہ دیتے، تو اُنھیں اس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بس اُن کا فرمان صداقت کی علامت ہوتا تھا۔

ایک عجیب سی دلکشی تھی، بے مثال ہر دل عزیزی تھی اور نا قابلِ بیان سحر طرازی تھی، اُن کی شخصیت میں۔ بزرگ بہت دیکھے اور سنے؛ لیکن سیرت رسول ﷺ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی سراپا رحمت اور فی الفور مانوس ہو جانے اور مانوس کر لینے والی شخصیت، اپنی مختصر سی زندگی میں "مولانا حافظ قاری سید صدیق احمد باندوی" رحمۃ اللہ علیہ ہی کی دیکھی، ایک ہی نظر میں آنکھوں میں بس جانے اور دل میں سما جانے والی شخصیت: ع

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا

خدائے پاک اپنی رحمتوں کی بارش اُن پر برسائے، اُن کی قبر کو بہشتی جھروکہ بنائے، اُنھیں اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے، اپنے نیک اور مخلص بندوں سا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے، انبیا وصدیقین اور شہدا وصالحین کے ساتھ اٹھائے۔ اُن کے اہل خانہ، رشتہ دار واقارب، متعارفین ومحبین اور اُنھیں بھلائی کے ساتھ یاد کرنے والوں کو صبر وشکیبائی عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ "الداعی" عربی شمارہ ۶، جلد ۲۱ جمادی الأخریٰ ۱۴۱۸ھ = اکتوبر ۱۹۹۷ء۔

منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندیؒ

لذیذ یادیں اور عزیز باتیں(*)

۱۳۳۱ھ/ ۱۹۱۳ء — ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۹ء

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اُخوّت کی جہاں گیری، محبّت کی فراوانی

راقم الحروف کو علم و فضل، صلاح و تقویٰ اور شہرت و ناموری رکھنے والے بہت سے مشاہیر پر لکھنے کا اِعزاز حاصل رہا ہے۔ مشاہیر پر لکھنا آسان بھی ہے اور اُن پر لکھنے کی ہر ایسے شخص کو خواہش ہوتی ہے، جو تحریری صلاحیت اور حسنِ بیان اور تصنیف و تالیف پر قدرت رکھتا ہو؛ بل کہ مشاہیر پر قلم اُٹھانے کے لیے، بعض دفعہ ہر کس و ناکس کے دل میں شوق پیدا ہوتا ہے، خواہ اُس کے پاس تحریری صلاحیت یا خوبیِ بیان نام کی کوئی چیز نہ ہو؛ اِس لیے کہ مشاہیر کا تذکرہ بسا اوقات تذکرہ کنندہ کی شہرت اور معاشرے میں اُس کی عمدہ ساکھ کا سبب ہوتا ہے اور کون ہے جو پاکیزہ شہرت اور نیک نامی کا خواہاں نہ ہو؟ مزید برآں مشاہیر پر لکھنے اور بولنے کے لیے، اکثر و بیشتر مواد کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اُن کے حوالے سے گفتگو کا میدان اِس قدر کشادہ ہوتا ہے کہ کسی مقرر یا مضمون نگار کے لیے کسی تنگی کا کوئی شکوہ تبھی ہوسکتا ہے، جب خود اُس کے قدم جواب دے جائیں۔

---

(۱) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی ثناء اللہ قاسمی مظفر پوری، شائع شدہ در رسالہ ''دارالعلوم'' شمارہ ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ مطابق مارچ ۱۹۹۹ء۔

محض علم اور علمی بڑائی، عمل کے بغیر کوئی چیز نہیں

لیکن میں آج کی صحبت میں ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں گفتگو کرنے جا رہا ہوں جو نہ عالم تھے، نہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، نہ کوئی گریجویٹ، نہ روایتی معنے میں کوئی ''شیخ'' اور نہ ہی آج کے اِنسانی معاشرے میں متعارف اصطلاح میں ''بزرگ ہستی''

علم کی عظمت و برتری، بحث و تحقیق کی اہمیّت، آگہی و معرفت کے سمندر میں غوطہ زنی کی قدر و قیمت، انکشافات اور دریافتِ معلومات کے حصول اور اِس راہ میں بھوک و پیاس سے بے نیاز رہ کر آفتاب کے برف کو پگھلا دینے کی طرح، اِرادے کو گھلا دینے والی مشقّتوں اور تکلیفوں کو سہہ کر، پیہم سفر کرتے رہنے کے مقام و مرتبے کے مکمل اعتراف کے ساتھ، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ محض علم اور علمی بڑائی و کمالِ آگہی کوئی چیز نہیں، جب تک کہ ایک اہلِ علم کو، علم کے کردار کو مکمل کرنے اور اُس کے مشن کو انجام تک پہنچانے والی چیز مُیَسَّر نہ ہو، یعنی جب تک صداقت و اَمانت، زندگی کے فرائض کے حوالے سے سعیِ پیہم، حقوق و واجبات کی ادائیگی، عہد و پیمان پر کاربندی اور اپنے بھائیوں یعنی معاشرۂ اِنسانی کے افراد سے خندہ روئی و نرم خوئی، دل جوئی و کشادہ نظری اور فراخ دلی اور مختصر لفظوں میں اِنسانی خصائل اور خدائی اخلاق کے ساتھ برتاؤ کرنے کا عادی نہ ہو۔

نسبتاً گم نام؛ لیکن انتہائی نیک نام

آج مجھے ایک ایسے آدمی کے سلسلے میں گفتگو کرنی ہے جو نسبتاً گم نام رہا؛ لیکن ہندوستان کی مشہور اور عظیم و قدیم جامعہ اسلامیہ ''دارالعلوم دیوبند'' میں مسلسل ۶۳ سال تک (از شوال ۱۳۵۵ھ مطابق نومبر- دسمبر ۱۹۳۶ء تا شوال ۱۴۱۸ھ مطابق جنوری ۱۹۹۸ء) دفتر تعلیمات کے محرر پھر منشی اور پیش کار کی حیثیت سے، اپنے کام کے دوران یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ اِسلامی اخلاق کا پابند مسلمان، اپنے رب کا شکر گزار نیک بندہ،

خادمِ خلقِ خدا اور بہت سے علما و تعلیم یافتہ حضرات سے بھی فائق اور تحقیق و مطالعہ میں مشغول رہنے والے بے شمار لوگوں کے لیے قابلِ رشک تھا۔ وہ امانت دار، محنتی، مخلص، ثواب کی نیت سے کام کرنے والا اور صبر و رضا کی خوبیوں سے متصف، اپنی ذمہ داریوں کا مکمل اِحساس رکھنے والے ملازم کا قابلِ تقلید نمونہ تھا؛ خدائے ذوالجلال نے سچ فرمایا ہے۔ "إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ" (۱) ترجمہ: کیوں کہ اچھا نوکر وہ شخص ہے جو مضبوط ہو اور اَمانت دار بھی ہو۔ (تھانویؒ)

دار العلوم سے وابستگی

منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ ۲۴ سال ہی کی عمر میں، یعنی ۷؍شوال ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۳؍نومبر ۱۹۳۶ء سے دفترِ تعلیمات میں محررِ اجیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے اُن کا سنۂ ولادت ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء ہے۔ ۶؍ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹؍جنوری ۱۹۳۷ء کو باضابطہ ملازم کی حیثیت سے محرر منتخب ہوئے۔ ۱۷؍جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۳؍جولائی ۱۹۳۷ء کو دار العلوم کی مجلس شوریٰ نے محرر کے عہدے پر اُنھیں مستقل کر دیا اور مجلس شوریٰ ہی نے ۵؍ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ۵؍جون ۱۹۶۵ء کو اُنھیں ترقی دے کر، اُسی دفتر کا منشی (پیش کار) بنا دیا، تا آں کہ مجلس عاملہ نے ۲۹-۳۰؍شوال ۱۴۱۸ھ کے اپنے اجلاس میں اُن کے فالج کا شکار ہو جانے اور نقل و حرکت سے معذور ہو جانے کے بعد، آغاز ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸؍فروری ۱۹۹۸ء سے اُنھیں پینشن دے دی۔

اس طرح دار العلوم میں اُن کی خدمت کے طویل زمانے کا دور ختم ہو گیا، جیسا کہ عمریں ختم ہو جاتی ہیں، خواہ کتنی ہی لمبی ہوں اور دنیا کو بھی ایک دن ختم ہو جانا ہے خواہ جتنے بھی دن آباد رہے۔

---

(۱) ۲۶؍سورۃ القصص۔

اَعلیٰ پائے کا اِنسان

موصوف صرف اسکول کے سکنڈری پاس تھے، کسی مدرسے میں علما سے تعلیم حاصل کیا نہ کسی شیخِ مربی سے تربیت پائی اور نہ ہی علما کے اُن خصوصی آداب سے واقف ہو سکے تھے، جن سے مدرسے کے ماحول میں زندگی گزارنے والوں کو آشنا ہونے اور ایک خاص ذوق ورنگ میں ڈھل جانے کا موقع ملتا ہے۔

لیکن آپ حیرت زدہ ہوں گے جب میں آپ سے یہ کہوں کہ اُن کی ملازمت کے اِس طویل عرصے میں، جو اکثر وبیشتر بہت سے اَفراد کی عمروں کا عرصہ ہوتا ہے، کسی شخص کو نہ اُن سے تکلیف پہنچی، نہ کسی چھوٹے بڑے کو اُن سے پریشانی کا اِحساس ہوا، نہ کسی ذمّے دار کو کبھی اُن سے شکایت کا موقع ملا، نہ اُن سے اَعلیٰ یا اَدنیٰ کارندوں کو اکتاہٹ محسوس ہوئی اور نہ کسی نے اُنھیں کسی خیانت یا فریب دہی، یا کسی ایسے معاملے میں جو قریب یا دور سے مروّت کے خلاف ہو تہمت دی۔

حال آں کہ وہ ایسی جگہ پر کام کرتے تھے کہ کام کے پورے اوقات؛ بل کہ اُن کی خدمت کے طویل عرصے میں، اُنھیں سینکڑوں آدمیوں سے ملتے رہنا ہوتا تھا، یعنی ایسے طلبہ سے جن میں اگر شریف، شایستہ، نیک، باعزت اور پاکیزہ خاندان سے آئے ہوتے ہیں، تو بعض غیر شایستہ بھی ہوتے ہیں، جنھیں تعلیم وتربیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا؛ بل کہ بعض دفعہ اُنھیں اِتنی بھی شُد بُد نہیں ہوتی کہ وہ انسان اور بے زبان جانور میں امتیاز کر سکیں اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ابھی تحصیل علم اور نشو ونما کی منزل میں ہوتے ہیں، مزید برآں یہ کہ اُن میں جوانی کا جوش، بچپنے کی نا سمجھی، نوعمری کی تیزی اور بچوں کی وہ جلد بازی ہوتی ہے، جس کی بنیاد نہ کسی باشعور سوچ، حسّ سلیم اور روشن ضمیری پر ہوتی ہے نہ کسی پختہ تجربے پر کہ وہ اپنے لیے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کے لیے محض مفید ثابت ہوں اور ضرر رساں یا تکلیف دہ منفی پہلوؤں سے اپنے کو اور دوسروں کو بچا سکیں۔

نیز ایسے علما واساتذہ سے اُنھیں سابقہ پڑا، جن میں ایک طرف متقی وپرہیزگار، بردبار ومخلص، اُسوۂ رسول ﷺ کے پیرو، متواضع اور خدا سے ڈرنے والے ہوتے تھے۔ جیسا کہ اُن میں دوسری طرف بعض ایسے بھی ہوتے تھے، جنھیں اپنی عقل وفکر اور علم وفہم پر ناز ہوا کرتا تھا، اُنھیں اپنی رائے وشخصیت پر بے جا اعتماد کا ضرورت سے زیادہ اِحساس ہوتا تھا، اُن میں جلد غصہ ہونے والے، بڑے حساس بھی ہوتے تھے اور اپنے آپ کو بے جا اہمیت دینے والے بھی، ہر وقت ناک وبھوں چڑھانے والے، ہر عمل سے پیشانی پر بل لانے والے، اپنا حق پورا پورا وصول کرنے والے اور دوسروں کا حق کم دینے والے بھی ہوتے تھے۔

بہ ہر حال طلبہ واساتذہ، پڑھنے اور پڑھانے والے سب کے سب انسان ہی ہوتے ہیں اور کون ابنِ آدم ہے جس سے غلطی سرزد نہ ہو؟ انسان خواہ کتنی ہی رفعت وبلندی کو پہنچ جائے فرشتہ نہیں بن سکتا کہ اُس سے خطا ونسیان کا صدور نہ ہو، یہی اللہ کی حکمت ومشیت ہے۔ ایک انسان محض علم کا لبادہ اوڑھ لینے سے فرشتۂ معصوم نہیں ہو جاتا؛ بل کہ حسبِ عادت وہ نقائص وفضائل سے مُرَکّب، خیر وشر اور صلاح وفساد کا مجموعہ ہی رہتا ہے۔ بسا اوقات بعض انسان اللہ تعالی کی حکمت وتوفیق سے اِتنی ترقی کر جاتے ہیں کہ فرشتوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہو جاتے ہیں اور بعض اِتنی پستی میں چلے جاتے ہیں کہ شیطان بھی اُن سے پناہ مانگنے لگتا ہے۔

وفات

دار العلوم کے اِس معاشرے اور طلبہ واساتذہ سے کھچا کھچ بھری اِس جگہ میں منشی محمد عزیز صدیقی، دیوبندی، رحمۃ اللہ علیہ نے (جو مرضِ فالج میں ایک سال نو ماہ از ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ تا رمضان ۱۴۱۹ھ گزار کر ۱۹؍رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۹۹۹ء جمعہ کی صبح چار بجے ربِّ حقیقی سے جا ملے) ۶۳ سال ملازمت کی اور ایسے تمام اوصاف کا

نمونہ چھوڑ گئے، جن سے ہر مسلمان ملازم اور مومن کارگزار کو آراستہ ہونا چاہیے، یعنی پختہ کاری، محنت، اوقات کی پابندی، نظام وقوانین پر کار بندی اور کام کو انجام تک پہنچانا خواہ وقتِ مقررہ کے علاوہ گھنٹوں مزید کام کرنا پڑے۔ اِس طریقے پر وہ ایک دن، دو دن، چند ہفتے، چند مہینے یا چند سالوں ہی کار بند نہیں رہے؛ بل کہ اپنی ملازمت کے پورے عرصے میں اُن کا یہی معمول رہا۔

منشی عزیز کا کمال

ہم میں سے ہر شخص کو اِس بات کا بہ خوبی علم ہے کہ ایسے منصب پر کام کرنا جہاں مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہو، پھر اتنے لمبے عرصے تک! انتہائی نازک کام ہے، طبعی طور پر اِس طرح کے ملازم سے اگر کچھ لوگ خوش ہوتے ہیں، تو کچھ لوگ ناراض؛ اِس لیے کہ معاشرے کے ہر فرد کی رضامندی ایک ناقابل حصول مقصد ہے۔ طلبہ کے معاشرے سے، خصوصاً دفتر تعلیمات کی پیچیدگیوں سے واقف کار کو، یہ بات بہ خوبی معلوم ہے کہ ایک ایسا ملازم جس کے ہاتھ میں، طلبہ واساتذہ سب کے انتظامی امور کی باگ ڈور ہو، اگر ایک شخص کو خوش کرنا چاہے گا، تو یقینی طور پر دوسرے کو ناراض کرنا پڑے گا؛ اِس لیے کہ بسا اوقات ایسے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں کہ بعض مراجعت کنندگان کو ذمہ داران یا منشی کی طرف سے کیے گئے فیصلے سے ضرور شکایت ہوتی ہے۔

لیکن منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ، جنھیں اللہ تعالی نے خوش اسلوبی وتواضع اور نرم خوئی سے نوازہ تھا، ہر شخص کے ساتھ اِس طرح پیش آتے رہے کہ کسی کو خفگی کا موقع نہیں ملا؛ بل کہ سبھوں کے دل اُن سے اتنے شاداں وفرحاں رہے کہ اُن کے دل اور زبان سے اُن کے لیے دعائیں نکلیں۔

اللہ تعالی نے اِتنی ساری مخلوق کی دعاؤں کو اُن کے حق میں واقعی قبولیت سے نوازا کہ اپنے جوارِ رحمت میں اُنھیں بلانے کے لیے، مبارک دن یعنی روز جمعہ کا اور اُس

مبارک مہینے کا انتخاب کیا، جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دار العلوم کے احاطۂ مولسری میں بعد نماز جمعہ دسیوں ہزار لوگوں نے اُن کی نمازہ جنازہ پڑھی، دار العلوم کے کبارِ مشایخ کے علاوہ کسی کی نمازِ جنازہ میں اِتنی بڑی تعداد نے شرکت نہیں کی ہوگی، کیوں کہ دیو بند کی دسیوں مساجد میں جمعہ ادا کرنے والوں نے اِس جنازے میں شرکت کی اور اُن کی آخری آرام گاہ ''مزارِ قاسمی'' تک اُنھیں رخصت کیا۔

منشی عزیز اور لذیذ یادیں

یادش بخیر کہ دار العلوم میں داخلے کے لیے، میں ۶ر شوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۶ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو دار العلوم کے اِحاطے میں ''باب قاسم'' نامی صدر گیٹ سے داخل ہوا، جب کہ فجر کی اذان اُس کے میناروں سے گونج رہی تھی، میرے ہم راہ میرے تعلیمی سفر کی بیشتر منزلوں کے ہم سفر برادرم مولانا مجیب الرحمٰن رائے پوری قاسمی اور برادر معظم جناب مولانا اویس القاسمی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۱۴۱۹/۶/۳ھ مطابق ۱۹۹۸/۹/۲۵ء) کے برادر اصغر مولانا عمیس اختر رائے پوری تھے۔

میں اِحاطۂ دفتر سے گزر کر، دفتر اہتمام کے نیچے والے دروازے سے داخل ہو کر اِحاطۂ مولسری میں جا نکلا، پھر دائیں جانب یعنی شمال مغرب کا رخ کیا، دار الحدیث اور درس گاہوں کے درمیانی راستے سے گزرا، پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کشادہ پارک ہے جس سے مختلف راستے پھوٹ رہے ہیں، یہ پارک دار جدید (یعنی دار العلوم کا مشہور دار الاقامہ) کا صحن ہے، بعد ازاں شمال کی جانب مدنی گیٹ کی طرف گیا اور اُس گیٹ کے پچھّم والے زینے سے پہلی منزل پر چڑھ گیا، مغرب کا رخ کیے کمروں سے گزر رہا تھا، تا آں کہ جنوب کی طرف کو ایک دو قدم مڑا اور سہ پایہ زینے سے ایک کمرے میں داخل ہوا جس کا نمبر اُس وقت $\frac{30}{3}$ تھا اور یہیں میں نے رختِ سفر کھول دیا، اِس سفر میں ہمارے بھائی عمیس اختر کی رہ نمائی رہی جو دار العلوم کے قدیم طالب علم تھے اور اُنھوں نے ہی

رات کے وقت ''سہارن پور'' اسٹیشن آکر ہمارا استقبال کیا اور دیوبند لے جاکر ہمیں اپنے کمرے میں اتارا۔

دار العلوم کی بھاری بھرکم دیواروں والی عمارت، کافی دور تک بہت سی عمارتوں کے پھیلاؤ اور پہاڑ کی سی اونچائی و بلندی اور پرشکوہ قلعے کی شان وشوکت نے، مجھے مرعوب کردیا تھا؛ کیوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اِس جیسے مدرسے کو کیوں دیکھا ہوگا، جو غریب مسلمانوں کے چندے سے دین کی خدمت اور کتاب وسنت کو زندہ کرنے میں شہرت کے حوالے سے اِس کا کسی بھی طرح ہم پلہ ہو۔

ہم نے فجر کی نماز دار العلوم کی قدیم مسجد میں ادا کی، آنے جانے میں ایک دوسرے راستے سے گزرے، جو دوسری پرشکوہ عمارتوں سے گزر رہا تھا، اب میری وہ مرعوبیت اور دو چند ہوگئی جو دوستوں، اساتذۂ کرام اور آنے جانے والے بے شمار لوگوں کی زبانی اُس کے متعلق سن کر میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔

منشی عزیز سے پہلی ملاقات

تقریباً ساڑھے سات بجے صبح دفتر کھلنے کا وقت ہوا، ہم امتحان داخلہ کی ابتدائی کاروائیاں انجام دینے کے خاطر، بھائی عمیس اختر صاحب کے ہم راہ دفتر گئے، اُس زمانے میں تقریری امتحان ہوا کرتا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دفتر میں سامنے میانہ قد، وجیہ الشکل اور حلیم وکریم ایک بزرگ ہیں، جو ہر آنے جانے والے سے زمیں کی سی خاک ساری سے ملتے ہیں۔ اُن سے ملتے ہی قلب پر چھائی دہشت وہیبت اور امتحانِ داخلہ اور اُس کے حوالے سے پیش آنے والی مشکل صورتِ حال کا خوف جاتا رہا۔ یہ بزرگ سنجیدگی وبشاشت کے جامع، متواضع، ہر ملنے والے کی طرف مکمل توجّہ دینے والے تھے۔ دفتر تعلیمات سے نکلتے ہوے ہم نے بھائی عمیس سے پوچھا: یہ بزرگ کون ہیں؟ اُنھوں نے بتایا: اِس دفتر کے منشی محمد عزیز ہیں۔

اِس پہلی ہی ملاقات میں منشی محمد عزیزؒ نے میرے دل میں ایک ایسا شیریں، خوش گوار اور راسخ نقشہ جمادیا اور میرے دماغ میں ایسا پاکیزہ دائمی چھاپ چھوڑ دیا، جو اُس پل بھر کی ملاقات کے وقت سے ہنوز مٹا نہیں ہے اور اِن شاء اللہ کبھی نہیں مٹ سکتا، ایسا تاثر جس کی برکت سے غیر شعوری طور پر مجھے یقین سا ہو گیا کہ آیندہ چند دنوں کے دوران ہونے والے امتحانِ داخلہ میں کام یاب ہو جاؤں گا اور میرا اِمدادی داخلہ بھی ہو جائے گا۔ چناں چہ واقعی وہی کچھ ہوا، جو میرے جی میں اِس خوش گوار اور بشارت آمیز تاثر کی وجہ سے آ رہا تھا کہ میرا اور میرے رفیق برادرم مجیب الرحمٰن کا تمام سہولتوں کے ساتھ داخلہ ہو گیا۔

۱۶/۱۰/۱۳۸۷ھ مطابق ۱۶/۱۲/۱۹۶۷ء کو دار العلوم میں داخلے کی کارروائیاں مکمل ہو گئیں، خوف و ہراس کا اِحساس جاتا رہا، ناامیدی آمیز رعب ختم ہو گیا، کیوں کہ تابناک یقین حاصل ہو چکا تھا اور پر کیف سرور سے قلب و جگر مُنوَّر ہو گیا تھا، جس کا اثر چہرے پر نمایاں تھا۔

منشی محمد عزیز کی اِنفرادیت

تعلیمی زندگی میں منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ سے اَن گنت بار ملنے کا اتفاق ہوا، ہر دفعہ میرے دل میں اُن کی محبت و قدر افزائی کے جذبات مزید پروان چڑھتے گئے؛ اِس لیے کہ میں نے اُنھیں ایک سچے مسلمان کے اوصاف و اخلاق کا نمونہ دیکھا اور برتا۔ یعنی حسن کارکردگی، ہر آدمی کا احترام، حسنِ عمل، فرض شناسی اور معاشرۂ اِنسانی کے سارے افراد کو سمو لینے والی خوش طبعی، جس کی وجہ سے سبھی لوگ اُن کے لیے دل اور آنکھیں بچھانے لگتے۔ اُنھوں نے اپنی شیریں معاملگی کی وجہ سے اپنے سے نیچے کے سارے ملازمین کی رضامندی اور اپنے سے اوپر کے تمام ذمہ داروں کی خوش نودی حاصل کر لی تھی، اُن میں ایسی اَعلیٰ ظرفی تھی کہ حسبِ موقع اپنے سے نیچے کے ملازمین

اور رفقائے کار کی ذمّے داری کو انجام دینے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔

تقریباً ۱۳؍سال تک (از ۱۰/۵/۱۳۸۹ھ تا ۱۵/۱۰/۱۴۰۲ھ تک) یہ راقم الحروف دار العلوم کے حوالے سے ہجر گاہ میں رہا، جہاں ہمیشہ دار العلوم کے لیے وارفتہ رہا، ہر وقت حتی کہ اپنے مادرِ وطن میں بھی دار العلوم کی یاد ستاتی رہی اور ہمہ وقت خیالوں میں دار العلوم ہی سمایا رہا، اُس کی در و دیوار اُس کی عمارتوں، میدانوں، اُس کے راستوں، پارکوں اور اُس کے دفاتر و کتب خانے کی یاد آتی رہی۔ دار العلوم کے اساتذہ، وہاں کے ملازمین جن میں سرِفہرست منشی محمد عزیزؒ تھے، کی یادوں میں وقت گزرتا رہا۔

رمضان ۱۴۰۲ھ جون ۱۹۸۲ء کو ہمارے اور ہماری ہم عصر نسل کے استاذ، مربی جلیل، عربی زبان کے معلم مثالی و استاذِ لاثانی حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۱۵ھ مطابق ۱۹۹۵ء) کا خط ملا، جس میں اُنھوں نے دار العلوم کی خدمت کے لیے، ناچیز کے انتخاب کی خوش خبری دی تھی، خط پڑھتے ہی ایسا لگا کہ دخولِ جنّت کا پروانہ مل گیا ہے۔

نصف شوال ۱۴۰۲ھ مطابق نصف اگست ۱۹۸۲ء کو شوق کے پروں سے اور یوں کہنا چاہیے کہ گویا محبت و اعتقاد کے اگلے اور پچھلے بازوؤں کے ذریعے اڑتا ہوا میں دار العلوم آیا اور مجلسِ شوریٰ کے فیصلے کے مطابق استاذ اور ''الداعی'' کے مدیر کی حیثیت سے خدمت انجام دینے لگا۔

دار العلوم کی تدریسی زندگی میں منشی محمد عزیز سے پہلی ملاقات

حسنِ اتفاق کہ طالب علم کی حیثیت سے دار العلوم سے جانے کے بعد جب میں استاذ کی حیثیت سے یہاں واپس آیا، تو منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ کو اُسی منصب پر کام کرتے ہوئے پایا، جس پر وہ میری طالب علمی کے زمانے میں فائز تھے، میں نے دیکھا کہ وہ اُسی طرح نیک نام اور حسنِ شہرت کے حامل ہیں، عوام؛ بل کہ علما اور راہِ خدا میں

لگے ہوئے طلبہ کی حسبِ سابق دعائیں لے رہے ہیں؛ وہی جاں فشانی، وہی تن دہی اور وہی رات و دن ایک کر دینے والی محنت، جس میں روٹینی وقتِ عمل اور خارج وقت میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا، حال آں کہ اب عمر زیادہ ہو چکی تھی، قویٰ کم زور ہو چکے تھے، اعصاب جواب دے رہے تھے، سن رسیدگی نے انگ انگ کو کم زور کر دیا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور پورے وجود سے اُن کے لیے دعائیں کیں۔

منشی محمد عزیز کی انسان نوازی

دار العلوم میں آنے کے بعد سے ہوا یہ کہ اول اِحساسِ ذمہ داری کی اپنی افتاد کی وجہ سے، دوم: اِنشا و ادب کی تدریسی خدمت انجام دینے کے ساتھ بھرپور صحافتی عمل کے مزاج کے تقاضے کی بنا پر، سوم: بدقسمتی سے مختلف بیماریوں کا شکار ہو جانے کی وجہ سے، راقم کو مجبور ہونا پڑا کہ صرف اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے دائرے میں اپنے کو محصور کر لے۔ لوگوں سے بڑی حد تک قطعِ تعلق کر لے اور مدرسوں کے ماحول میں کام کرنے والے اکثر بھائیوں کے طرزِ عمل کے برخلاف کہ وہ تعلقات پیدا کرنے اور تعلقات کی پختہ کاری میں خاصا وقت صرف کرتے رہتے ہیں (کہ بعض دفعہ یہ تعلقات اِس مادّی اور وسائل کی دنیا میں مفید بھی ہوتے ہیں) یہ ناچیز تعلقات سازی اور تعلقات داری سے بالکلیہ پرہیز کرنے پر مجبور ہوا۔

چناں چہ اِس طرح میرا دفترِ تعلیمات میں بھی آنا جانا کم ہو گیا اور یہ صورت ہو گئی کہ بغیر سخت ضرورت کے دفتر میں آنے جانے کے لیے، وقت نکالنا مشکل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے منشی محمد عزیزؒ کو جو ہمیشہ میرا اَحوال دریافت کرتے رہتے، اگر میں ایک دو ماہ تک اُن کی نظر سے اوجھل رہتا، تو بسا اوقات دریافتِ حال کے لیے، اپنے دفتر کے کسی دفتر دار کو میرے پاس ضرور بھیجتے، جب بھی اپنی ضرورت کے لیے اُن کے پاس کسی کو بھیجتا تو فوراً خوش خلقی کے ساتھ ضرورت پوری کر دیتے، وہ خدا ے

بزرگ و برتر خوب جانتا ہے جس نے میرے دل میں اُن کی بے پناہ محبت پیدا کردی ہے کہ میرے دل کے تمام گوشے؛ بل کہ میرا وجود اُن کی زندگی میں بھی اُن کے لیے دعاؤں اور ثنا خوانی میں رطب اللسان رہا کرتا تھا۔ دفتر تعلیمات میں منشی محمد عزیزؒ کی موجودگی، ہر اُس ضرورت کی تکمیل کی جو مجھے یا کسی اُستاذ یا کسی عزیز طالبِ علم کو پیش آتی، ضمانت ہوتی تھی؛ بل کہ اُن کی موجودگی ہمیشہ کام یابی اور بھلائی کی بشارت ہوا کرتی تھی۔

اُن کی یہ صفت بہت ساری صفات کی جامع تھی، کتنی بار مجھے آرزو ہوئی کہ کاش میں اُن کی اِس صفت پر بہت سی نام نہاد نیکیوں، روایتی تقوی، مصنوعی ''بزرگی'' فخر گزیدہ علم وفضل اور غرور آمیز عبادت گزاری کو قربان کرسکتا۔

حال آں کہ وہ خود اِس پہلو سے بھی اپنے ربِّ کریم کی طرف سے باتوفیق تھے؛ چناں چہ نماز باجماعت کی پابندی کے ساتھ، وہ تہجد گزار اور شب بیدار بھی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جن اخلاق وصفات کے حامل تھے اُن کا سرچشمہ درحقیقت اُن کی گہری دین داری، سچا تقوی اور دین وشریعت کی کماحقُّہ پابندی تھا۔

دارالعلوم کی عظمت کا راز

واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم کو اللہ تعالی نے جو عظمت دی ہے (جس کی نظیر اِس دیار کے دگر کسی اِدارے یا یونیورسٹی میں نہیں ملتی) اور جو عوامی مقبولیت دی ہے، جس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی، اِن دونوں باتوں کی بنیاد درحقیقت منشی محمد عزیزؒ جیسے مخلصین ہی ہیں، اُن مخلصین میں سرفہرست خود دارالعلوم کے بانیان ومشائخ اور یہاں کے اہل دل فضلا ہیں، خدائے بزرگ وبرتر کی یہ حکمت رہی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کسی زمانے میں بھی مخلصین سے خالی نہیں رہا۔ ہر چند کہ آج عصرِ حاضر میں اُن کا تناسب قابلِ افسوس حد تک کم ہوگیا ہے، دارالعلوم کا دور ماضی میں ایسا تھا کہ دربان تک فرض نماز تو درکنار تہجد ونوافل کے بھی پابند رہے ہیں۔

یہی وہ بنیادی قدر و قیمت ہے جس کی وجہ سے دارالعلوم کو لازوال و بے مثال وقار و اعتبار ملا ہے اور اِس ملک کی اسلامی تاریخ کے محراب میں کھڑے ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

مرض الموت اور دارالعلوم سے عشق کا مظہر

ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ مطابق اپریل ۱۹۹۷ء میں دارالعلوم کی طرف سے قانونی چھٹی کے موقع سے منشی محمد عزیزؒ پر فالج کا حملہ ہوا، جس کی وجہ سے وہ نقل و حرکت سے محروم ہو گئے، بالآخر گھر بیٹھنا پڑا، اِس بیماری اور اِس سے رونما ہونے والی تکالیف میں بھی، اپنے پروردگار سے خوش، صابر و شاکر اور اُس کے فیصلے کو ذریعۂ ثواب سمجھتے رہے؛ لیکن ہمیشہ دارالعلوم کے مشتاق رہے، جہاں اُنھوں نے ایسی محبت و اخلاص کے ساتھ اپنی عمر بِتا دی، جس کی مثال کبارِ مشایخ کے علاوہ شاید و باید ہی ملتی ہے۔ اُن کے بڑے صاحب زادے جناب محمد حسیب صدیقی (مینیجر مسلم فنڈ دیوبند و چیرمین نگر پالیکا دیوبند) اور چھوٹے صاحب زادے محمد ایاز صدیقی نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ منشی جی ایامِ مرض میں بھی، ہم لوگوں سے اِصرار کرتے رہے کہ میرے لیے کام فراہم کرو، اِس لیے کہ میں اِس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر تم لوگ مجھے کسی طرح دفترِ تعلیمات پہنچا دو، تو میں وہاں بیٹھ کر کام انجام دے سکتا ہوں۔ جب ایک روز اُن کا اِصرار طول پکڑ گیا، تو اُنھیں (Wheel chiar) ''وہیل چیئر'' پر بیٹھا کر دارالعلوم کے اِحاطے میں لے گیا اور اِحاطۂ مولسری سے اُن کے دفتر کو جانے والے زینے کے پاس رکا کر اُن سے پوچھا: ابو جان! آپ اِس زینے پر کس طرح چڑھ سکتے ہیں، جب کہ آپ میں نقل و حرکت کی بھی طاقت نہیں؟ ہم لوگ اُنھیں چند منٹ وہاں رکائے رہے، اُنھوں نے دارالعلوم کے وسیع و عریض اِحاطے اور در و دیوار پر حسرت بھری نگاہ ڈالی، پھر ہم لوگ اُنھیں واپس لے آئے۔

بے نظیر خادمِ دارالعلوم

جب منشی محمد عزیزؒ کو فالج کے مرض نے رہین خانہ بنا دیا اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ بیماری، اُن سے اُسی وقت جدا ہوگی جب وہ خود ہی اِس دنیا سے جدا ہو جائیں گے، تو میرے دل نے پوری طاقت سے کہا: دارالعلوم اِن شاء اللہ قائم رہے گا، اور اپنے مشائخِ کبار، علماے ربانیین اور مخلص خدام کے جانے کے بعد جس طرح اپنا کردار اَدا کرتا رہا ہے، جب تک خدا کو منظور ہوگا اُس کی گاڑی اِسی طرح چلتی رہے گی، اُس کا دفترِ تعلیمات بھی باقی رہے گا جہاں منشی جیؒ کام کیا کرتے تھے اور اُن کی جگہ کوئی دوسرا بھی آجائے گا اور زندگی کا پہیا اِسی طرح گھومتا رہے گا؛ لیکن اِس دفتر میں منشی محمد عزیزؒ جیسے منشی کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی، دوسرے سینکڑوں منشی اُن کی قائم مقامی نہیں کر سکیں گے۔

میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں (خدا گواہ) اِس سے میرا مقصد کسی بھائی کی قدر و منزلت گھٹانا نہیں، اللہ تعالی ہر ایک کو ہر خیر کی توفیق دے اور اچھے پیش رو کا سچا جانشین بنائے۔ منشی محمد عزیزؒ کی حیات ہی میں اُن کے دفترِ تعلیمات چھوڑ دینے کے بعد، اِسی طرح اُن کی وفات کے بعد مجھے دفترِ تعلیمات میں کئی متعلقہ ضرورتیں پیش آئیں، جن کے حوالے سے وہ بہت شدّت سے یاد آئے اور اُن کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ میں یہ تب کہہ رہا ہوں جب کہ وہ اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت میں جا چکے ہیں، خدا ہی اُن کے چھپے اور کھلے کو بہتر جانتا ہے۔ یقیناً وہ اُنھیں پورا پورا بدلہ دے گا اور میں یہ تب کہہ رہا ہوں کہ جب اُن سے میں کسی بدلے کی توقّع نہیں کر سکتا؛ بل کہ یہ محض ضمیر کی آواز کا اِظہار ہے۔

منشی محمد عزیزؒ کو دوسروں سے جو چیز ممتاز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ کام کو، خصوصاً اِس دارالعلوم میں کام کرنے کو، جس کی بنیاد روزِ اول سے ہی تقوی پر ہے، کسبِ معاش کا ذریعہ سمجھنے کی بہ جائے ایک جذبے اور شوق کی تسکین، نیز خوش نودیِ الٰہی کے حصول کا

محبوب مشغلہ سمجھتے تھے۔

دارالعلوم کی خدمت اُن کے نزدیک خدا کی عبادت

اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ دارالعلوم کی ملازمت ایک ایسی عبادت ہے جس کے ذریعے اپنی نیت ومحنت اور کوشش کے بہ قدر بندہ اپنے پروردگار سے قریب ہوتا رہتا ہے، وہ اپنے تمام تصرفات ومعاملات میں اِسی اُصول پر چلتے تھے اور اِسی نظریے کو بنیاد بنایا کرتے تھے۔ اُصول کی صحّت اور نظریے کی سچائی، ہمیشہ کام کی صورتِ حال، کردار کے طرز، کار کردگی کی کیفیت اور معاملے کے طریقے کو یکسر بدل دیا کرتی ہے، اِسی لیے منشی جیؒ، فرائضِ منصبی کی تمام اخلاقیات میں اپنے تمام ہم عصروں سے بالکل مختلف تھے۔

منشی محمد عزیز کے حوالے سے، دارالعلوم کے بڑوں کا اعترافِ کمال

منشی محمد عزیز رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد، اُن کے سلسلے میں جب یہ چند سطریں لکھنی چاہیں، تو میں نے سوچا کہ دارالعلوم کے محافظ خانے میں اُن کی خاص فائل پر ایک نظر ڈال لوں، ہوسکتا ہے کہ کوئی کام کی بات مل جائے اور یہ سطریں اِس مطالعے کے نتیجے میں گراں قدر بن جائیں۔ مذکورہ فائل پر نظر ڈالنے سے اُن کی متعدّد درخواستوں پر کبارِ اولیاء اللہ کے قلم سے لکھی ہوئی، طویل طویل سفارشوں پر مجھے چنداں تعجب نہیں ہوا، جن میں شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۴ء) سابق ناظمِ تعلیمات دارالعلوم دیوبند؛ عالمِ باعمل، مجاہدِ اِسلام، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۷ء) سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند؛ شیخ التفسیر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، دیوبندی، پاکستانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۴۹ء) سابق صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند؛ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی

۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا سید اختر حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء) سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند جیسے اساطینِ علم و فضل اور علماے ربانیین بھی ہیں۔

شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ کی شہادت

جہاں تک شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ہے تو جیسا کہ سبھوں کو معلوم ہے کہ بلا ضرورت کی مدح سرائی سے بالکلیہ اجتناب کے حوالے سے مشہور رہے ہیں؛ اِس کے باوجود، اُنھوں نے اپنی متعدد سفارشات میں منشی جیؒ کی حسنِ کارکردگی، محنت اور جاں فشانی سے اپنے فرائض انجام دینے کی بھرپور تعریف کی ہے، چناں چہ ایک سفارش میں فرماتے ہیں:

> "........لیکن مجھ کو اِس کا اعتراف ہے کہ منشی محمد عزیز صاحب نے ناتجربہ کار (۱) ہونے کے باوجود، تمام فرائض کو سمجھا اور جہاں تک مجھ کو علم ہے اپنی ضروریات کو بھی فرائضِ متعلقہ کے مقابلے میں بالائے طاق رکھا اور حیرت انگیز محنت کے ساتھ، تمام کاموں کو سنبھالا، تعلیمات کے کسی کام سے کسی وقت اِنکار تو کیا، چہرے پر شکن بھی نہ ڈالی (۲)........"

---

(۱) پیشِ نظر رہے کہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، منشی محمد عزیز صاحب کے متعلق اپنے اِن تاثرات کا اظہار دفتر تعلیمات میں اجیر محرر کی حیثیت سے، اُن کے صرف تقریباً ایک ماہ تک کام کرنے کے بعد ہی فرمارہے ہیں اور ابھی وہ باقاعدہ محرر کی حیثیت سے یہاں ملازم نہیں ہوئے ہیں۔

(۲) یہ سفارش ۱۳؍ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو تحریر ہوئی ہے۔

حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ نے استاذ اور ناظم تعلیمات کی حیثیت سے ۴۶ سال مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں خدمت کی یعنی ۱۳۳۰ھ سے ۱۳۷۴ھ تک۔ نظام الاوقات واوقات کی پابندی اور درس گاہوں میں بروقت تشریف لانے کے سلسلے میں، ضرب المثل کا درجہ رکھتے تھے۔ دارالعلوم کی تاریخ میں طلبہ کے سلسلے میں شفقت، فرائض منصبی میں انہماک اور پیدایشی طور پر مدرس ہونے کے حوالے سے وہ بے نظیر تھے۔ دارالعلوم »»»

اُس وقت کے ضروری حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد مزید فرماتے ہیں:

''...... چوں کہ مذکورہ بالا قسم کے طلبہ کے متعلق اہتمام یا صدارتِ اہتمام سے تاکیدی احکام آتے تھے، میں فوراً ہی منشی محمد عزیز صاحبؒ سے کہتا تھا اور وہ فوراً کام چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور شعبہ جاتِ متعلقہ میں ڈھونڈ کر فارم کا پتہ لگا لیتے تھے؛ اِس وجہ سے اُن کا اکثر حصّہ، اِسی دوڑ دھوپ میں گزرتا تھا اور فرائضِ متعلقہ کے لیے رات کا وقت رہ جاتا تھا، اِس کے علاوہ جس روز سے اُنھوں نے کام شروع کیا ہے، جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، کسی جمعہ کی تعطیل اُن کو نصیب نہ ہوئی، اِس سے فزوں تر ایک اور بات یہ ہے کہ اس گڑبڑ میں بھی منشی صاحب موصوف نے طلبۂ دار العلوم سے، جن میں ہر قسم اور ہر مزاج کے طالب علم ہیں درشتی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی جس کی عام شکایت رہی ہے(۱)........''

شیخ الادب کی دوسری شہادت

۱۳۵۸/۱۰/۸ھ کو منشی جیؒ نے ناظمِ تعلیمات کے ذریعے، حضرت مہتمم صاحب کی

»»» اور برصغیر کے مدارس اسلامیہ میں داخل اکثر کتبِ فقہ وادب وشعر پر اُن کے گراں قدر حواشی ہیں، جن کا ہر طالب علم اور مدرس، کتب فہمی میں احسان مند ہے۔ اُنھوں نے ۲۴ گھنٹے کے اَوقات کو اپنے خدا، اُس کے بندوں اور خود اپنے اہل خانہ کے درمیان بڑی دقتِ نظری سے تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ کم خوردن وکم خفتن وکم گفتن کے صحیح مصداق تھے، ان کا شاید ہی کوئی لمحہ مرضیِ خدا کے علاوہ کہیں اور صرف ہوا ہوگا۔

(۱) اِس سفارش پر ۲۴ر ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ کو مندرجۂ ذیل الفاظ میں اُس وقت کے صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اُس وقت جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل میں مدرس تھے منظوری دی۔

''...... میرے نزدیک مولانا محمد اعزاز علی صاحب کی رائے کے موافق منشی محمد عزیز کا تقرر مناسب ہے۔''

علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی نے ۱۳۲۸ھ تا ۱۳۴۶ھ کے عرصے میں دار العلوم میں تدریسی خدمت انجام دی اور ۱۳۵۴ھ سے ۱۳۶۲ھ کے عرصے میں صدر مہتمم کے عہدے پر فائز رہے۔ اللہ تعالی نے اُنھیں علمِ عمیق، وسیع مطالعہ اور گہری فکر کے ساتھ قلم وزبان کی دولتِ بے پناہ سے نوازا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل ہی وہ پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ ۲۱ر صفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو کراچی میں فوت ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔

خدمت میں درخواست پیش کی، جس میں اُنھوں نے اِس حوالے سے اپنی تنخواہ میں اضافے کی مانگ کی تھی کہ وہ چار سالوں سے کام کرتے چلے آرہے ہیں اور کافی تنگ دست (۱) اور کثیر العیال ہیں۔ یہ اضافہ اُن کے دلی اطمینان کا موجب بن کر، ذمہ داریوں میں پورے طور پر مشغول رہنے میں معاون ثابت ہوگا! چناں چہ شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ نے ۱۰/۱۰/۱۳۵۸ھ کو اِس درخواست پر پرزور سفارش لکھی، جس میں اُنھوں نے منشی جیؒ کے امانت دار، بااعتماد اور محنتی ہونے کی اِن لفظوں میں شہادت دی:

''احقر طبعی طور پر سفارش کرنے سے بچتا رہتا ہے اور حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ دخل در معقولات نہ کرے۔

''اِس وقت درخواست دہندہ کے حالات عرض کرنے ہیں، تاکہ اُن کو سن کر صحیح نتیجہ حاصل ہو سکے، منشی محمد عزیز صاحب نے دفتر تعلیمات کا بار، بالکل اٹھالیا ہے، وہ اپنی ذاتی ضرورتوں پر تعلیمات کی ضرورتوں کو مُقدَّم

(۱) قرآن پاک میں آیت نمبر ۸۲ سورۂ کہف میں اُس گرتی ہوئی دیوار کے حوالے سے، جسے حضرت خضر علیہ السلام نے کھڑی کردی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اِس پر اعتراض کیا تھا کہ جب اِس گاؤں والوں نے ہم بھوکوں کو کھانا تک نہیں کھلایا، تو آپ نے بلا اجرت یہ کام کیوں کردیا؟ جواباً حضرت خضر کی زبان میں اللہ تعالیٰ کا یہ اِرشاد ہے: ''وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا. فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ.''

ترجمہ: اور رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی تھی جو اِس شہر میں رہتے ہیں اور اِس دیوار کے نیچے، اُن کا کچھ مال مدفون تھا (جو اُن کے باپ سے میراث میں پہنچا ہے) اور اُن کا باپ (جو مر گیا ہے) ایک نیک آدمی تھا سو آپ کے رب نے اپنی مہربانی سے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی (کی عمر) کو پہنچ جاویں اور اپنا دفینہ نکال لیں اور (یہ سارے کام بہ الہام الٰہی کیے ہیں)'' (حضرت تھانویؒ)

یہ آیت صراحتاً بتاتی ہے کہ باپ کی نکوکاری، اپنی اولاد کے لیے باعثِ منفعت اور رحمتِ الٰہی کے مُتوجّہ ہونے کا محرک ہوا کرتی ہے۔

یہاں مجھے کہنے دیجیے کہ منشی محمد عزیزؒ کی نیکی، قناعت اور دار العلوم کی مخلصانہ خدمت نے، اُنھیں اور اُن کی اولاد کو مادّی نفع بھی، پہنچایا، چناں چہ اُن کے دونوں لڑکے مولانا محمد حبیب صدیقی اور محمد ایاز صدیقی ماشاء اللہ، اقتصادی طور پر خوش حال ہیں۔ اول الذکر کو تو خدا نے معاشرتی وجاہت وعزت سے بھی نوازا ہے۔

کرتے ہیں، تعلیمات کے کام میں نہ رات کا خیال ہے نہ دن کا، اِس کے ساتھ ہی ساتھ، نہایت امین اور معتمد علیہ ہیں۔ سہ ماہی، ششماہی، سالانہ امتحانات ذمہ داری کے کام ہیں اور دائرۂ اہتمام سے مخفی نہیں کہ اِس سے پہلے کارکن رشوت ستانی میں بدنام ہوتے رہے، لیکن بحمد اللہ اِس وقت تک درخواست دہندہ پہ اِس قسم کا کوئی حرف نہیں آیا، مجھ کو تمام ذمہ داری کے کاموں میں اُن پر پورا اعتماد ہے، کام کی تعداد سے قطع نظر کی جائے تب بھی تعلیمات کا بہت سا کام، اُن کے ذمّے ہے۔ تو اگر کسی کی خدمت قابلِ قدر دانی ہے تو منشی محمد عزیز صاحب اِس کے اور بھی مستحق ہیں۔"

(دستخط) محمد اعزاز علی غفرلہ

۱۰ر شوال ۱۳۵۸ھ

حضرت مدنی (۱) رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اِس سفارش کی اِس طرح تایید و تصدیق فرمائی:

---

(۱) عالم ربانی، مجاہد، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۱۵ھ میں دار العلوم سے فارغ ہوئے۔ سال ہا سال مسجدِ نبوی میں حدیث شریف کا درس دیا۔ ۱۳۴۶ھ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث منتخب ہوئے، اِس عہدے پر اپنی وفات مؤرخہ ۱۲ر جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۵۷ء تک فائز رہے۔ اِس سے قبل وہ اپنے عظیم استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء) کے ساتھ مالٹا کے جزیرے میں سالوں قید رہے، اِس کے علاوہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے اہم ستون کی حیثیت سے تاریخ میں آپ کا نام ثبت ہے۔ آپ ہی کے برادرِ حقیقی مولانا سید احمد فیض آبادی (متوفی ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۹ء) نے جو آپ ہی کے ساتھ ۱۳۱۵ھ میں دار العلوم سے فارغ ہوئے تھے، محرم ۱۳۴۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۲۱ء میں مدینۂ منورہ میں مسجد نبوی شریف کے باب جبریل سے متصل، مدرسہ علوم شرعیہ قائم فرمایا، جس نے دیارِ رسول ﷺ میں اُس تنگ دستی کے زمانے میں علم و آگہی کی روشنی پھیلائی اور وہاں سے بڑے بڑے علما، فقہا اور ادبا پیدا ہوئے۔ جن میں سعودی عرب کے ادباء کے قائد و نقیب اور باوقار و گراں مایہ ادبی رسالے "المنہل" کے بانی و مدیر شیخ عبد القدوس بن القاسم انصاری (۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء-۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) قابل ذکر ہیں، جنھوں نے مولانا سید احمد فیض آبادی پر اپنے پر بہار و گوہر بار ادبی قلم سے باقاعدہ کتاب "بناة العلم في الحجاز السيد أحمد الفيض آبادي" کے عنوان سے سپرد قلم کی۔

یہ مدرسہ شاہ فہد بن العزیز (۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۱ء-۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء) کے زمانے میں مسجد نبوی کی وسعت کاری کے حالیہ عمل کے دوران قبا کے راستے پر منتقل ہو گیا ہے۔ اب اس کا رنگ و آہنگ بھی بدل گیا ہے، رہے نام اللہ کا۔

''میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں'' [1]

(دستخط) ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دار العلوم دیوبند کے اُس وقت کے صدر مہتمم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ۵/محرم ۱۳۵۹ھ کو اپنے حکم نامے کے ذریعے، جو اُنھوں نے درخواست کے حاشیے پر تحریر فرمائی تھی (۱) اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (۲) (متوفی ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) نے بھی اِسی حاشیے پر تحریر کردہ اپنے فیصلے میں (۳) تین ماہ بعد دوبارہ درخواست دینے کا اشارہ فرمایا، چناں چہ منشی محمد عزیزؒ نے ۱۳۵۹/۴/۲۳ھ کو حسب الحکم

---

(۱) جس کے الفاظ یہ تھے:

''سر دست گریڈ کے سلسلے میں جملہ ملازمین کو ترقی دی جا رہی ہے اسی پر اکتفا کیا جائے، خصوصی ترقی کے متعلق تین ماہ بعد یاددہانی کی جائے۔''
شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم دار العلوم دیوبند
۵/محرم ۱۳۵۹ھ

(۲) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بن حافظ مولانا محمد احمد بن امام محمد قاسم نانوتوی، بانیانِ دار العلوم کے سرخیل حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتوی کے پوتے تھے۔ محرم ۱۳۱۵ھ میں مولود ہوئے ۱۳۷۷ھ میں دار العلوم سے فارغ ہوئے، ۱۳۳۷ھ تا ۱۳۴۳ھ کے عرصے میں دار العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۳۴۳ھ میں نائب مہتمم ہوئے اور ۱۳۴۸ھ میں عہدۂ اہتمام کو رونق بخشی اور ۱۴۰۱ھ تک اس عہدۂ جلیلہ کے لیے باعث عزت وافتخار رہے۔ اللہ تعالی نے اُنھیں بے نظیر تقریری صلاحیت اور حسنِ بیان سے نوازا تھا، جس کے ذریعے صحیح عقیدے کی اِشاعت، باطل فرقوں اور مذاہب کی تردید اور دنیا کے گوشے گوشے میں دار العلوم کے نام، کام اور مقام کو عام کرنے کا کام لیا۔ عالمِ اسلام کے مختلف اطراف واکناف کے علاوہ، برصغیر کا شاید ہی کوئی قابل ذکر شہر اور قصبہ ہوگا، جو اُن کی شیریں بیانی، قادر الکلامی، حاضر جوابی اور بلبل نوائی سے محظوظ نہ ہوا ہوگا۔ ۸۸ سال کی عمر میں ۶/شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷/جولائی ۱۹۸۳ء بہ روز یک شنبہ انتقال فرمایا اور مزار قاسمی میں آسودۂ خاک ہوئے۔

(۳) جس کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

''غالباً گریڈ کی ترقیات جاری نہ ہونے کی وجہ سے، یہ درخواست خصوصی طور پر کی گئی ہے۔ اجرائے گریڈ کے موانع اگر اُن کی خصوصی ترقی میں مانع نہ ہوں، تو میرے نزدیک منشی محمد عزیز واقعی طور پر مستحق ہیں.....''
محمد طیب غفرلہ
۱۳۵۸/۱۱/۱۷ھ

دوسری درخواست دی۔

شیخ الادب کی تیسری شہادت

اِس درخواست کو بھی حضرت شیخ الادبؒ نے ایک مؤثر تصدیق کی ذریعے، تقویت بخشی، جس میں آپ نے سابقہ تصدیق کی باتیں دہرائیں اور منشی جیؒ کے دیگر باریک خصائل کا بھی تذکرہ فرمایا:

''میں ذاتی تعلقات کی بنا پر سفارش کرنے کو ہمیشہ برا سمجھتا رہا ہوں اور طبعی خواہش ہے کہ کارکنوں کی ہمت افزائی اِس صورت میں ہو کہ وہ کام کریں۔

منشی محمد عزیز صاحب محررؔ تعلیمات کے متعلق میں ایک دفعہ نہیں، کئی بار عرض کر چکا ہوں، مجھ کو اُن کا تجربہ کئی سال سے ہے، یہ ہر کام میں جفاکش، شب و روز کام کرنے والے کسی کام میں حیلے بہانہ نہ کرنے والے کارکن ہیں، اِس کے ساتھ ہی یہ کہ پورے معتمد علیہ ہیں۔

فرائضِ متعلقہ ہی میں نہیں: بل کہ تعلیمات کے زوائد امور میں بھی، اُنھوں نے ہمیشہ پوری سعی سے کام لیا اور یہ بھی قابلِ عرض ہے کہ منشی محمد عزیز صاحب اُس جگہ پر مامور ہیں جس جگہ پر اُن کے سابقین سے طلبہ کے ہمیشہ جھگڑے قضیے رہا کرتے تھے، روزانہ نہیں تو ہفتے دو ہفتے میں ضرور کوئی قابلِ مداخلت جھگڑا پیش آ جاتا تھا؛ لیکن کئی سال کی ملازمت میں ایک دفعہ بھی طلبہ سے اُن کی کوئی خلش پیدا نہیں ہوئی۔

مجھ کو یقین ہے کہ میں نے اِس گزارش میں ایک لفظ بھی واقعیّت سے زائد نہیں کہا ہے۔''

محمد اعزاز علی غفرلہ

۴؍ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ

شیخ الاسلام کی شہادت

اِسی تاریخ کو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اِس سفارش کی اِن الفاظ میں تایید کی کہ:

''مجھ کو مولانا اعزاز علی صاحب کی تحریر سے اتفاق ہے، نیز یہ بھی خیال کرنا ضروری ہے کہ مجلسِ علمی کے تمام کاموں کو اُن کے ذمے کیا گیا ہے۔''

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۴ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۵۹/۵/۱۷ھ کو اُن کے حسنِ کارکردگی کو سراہتے ہوے، تنخواہ میں ایک روپے کے اضافے کی منظوری دی۔(۱)

شیخ الادب کی چوتھی شہادت

۱۷ محرم ۱۳۶۱ھ کو منشی محمد عزیزؒ نے، حضرت مہتمم صاحب کی خدمت عالیہ میں درخواست پیش کی کہ طویل خدمتوں اور بہت سی ضرورتوں کے پیش نظر، اُن کی تنخواہ میں اضافہ فرمایا جائے۔

---

(۱) منظوری کے الفاظ یہ تھے:

''چوں کہ منشی محمد عزیز صاحب کی کارکردگی قابلِ اطمنان ہے اور اُن کے کاموں میں اضافہ بھی ہوا ہے؛ اِس لیے ایک روپے ماہ وار کی ترقی یکم جمادی الاول ۱۳۵۹ھ سے منظور ہے، شعبہ جاتِ متعلقہ میں اطلاعات جاری کردی جائیں۔

محمد طیب غفرلہ، مہتمم دارالعلوم

۱۳۵۹/۵/۱۷ھ

چناں چہ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علیؒ نے اِس پر ایک گراں قدر سفارش لکھی اور اُن کی پرخلوص محنتوں اور مثالی کارکردگی کو یوں مختصراً بیان فرمایا:

حضرت والا!

''منشی محمد عزیز صاحب کی اَن تھک مساعی سے، میں بہت اچھی طرح واقف ہوں، دیانت، احتیاط، اِطاعت اور تمام امور ضروریہ کی انجام دہی کے اوصاف، اُن میں علی وجہ الکمال موجود ہیں، میں نے اُن کے حالات آں حضرت سے زبانی بھی عرض کیے ہیں اور جہاں تک میرا خیال ہے خدامِ والا بھی اُن کے حسنِ خدمت سے ناواقف نہیں ہیں؛ اِس لیے میں مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ اُن کی درخواست کے سلسلے میں اُن کی معتد بہ ہمت افزائی فرمائی جاوے، اُن کے متعلق زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، میں امیدوار ہوں کہ اُن کی درخواست کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا جاوے گا۔''

محمد اعزاز علی غفرلہ

۲۴/محرم ۱۳۶۱ھ

حضرت حکیم الاسلام نے اِس درخواست کو، حسنِ توجّہ سے نوازا اور ۱۳۶۱/۲/۱۶ھ کو ایک گریڈ خصوصی ترقی کی منظوری فرمائی۔(۱)

میرا مقصد اِن سطروں میں اُن ساری تحریری اور زبانی سفارشوں اور رپوٹوں کو جمع کرنا نہیں ہے، جن کا اظہار دارالعلوم کے نام وَر بزرگان دین، منشی محمد عزیزؒ کی ملازمت کے تمام دورانیے میں کرتے رہے تھے۔

(۱) منظوری کے الفاظ یوں تھے:

''حسبِ سفارشِ تعلیمات ایک گریڈ خصوصی ترقی یکم صفر ۱۳۶۱ھ سے جاری کیا جاتا ہے دفاترِ متعلقہ کو اطلاع دے دی جائے۔

محمد طیب غفرلہ

۱۳۶۱/۲/۱۶ھ

ناظمِ تعلیمات مولانا سید اختر حسین کی شہادت

چناں چہ اب میں حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب دیو بندی(۱) رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء) جو دار العلوم میں میری طالبِ علمی کے وقت ناظم تعلیمات تھے، کے قلم سے کی گئی ایک سفارش پر اکتفا کرتا ہوں، جو اُنھوں نے منشی جیؒ کی اُس درخواست پر لکھا تھا، جو اُنھوں نے حضرات ممبرانِ مجلسِ شوریٰ دار العلوم دیو بند کی خدمت میں پیش کار کے عہدے پر ترقی دیے جانے کے لیے، دی تھی کہ وہ عرصۂ دراز سے محرر کی جگہ کام کر رہے ہیں۔ حضرت مولانا سید اختر حسین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سفارش میں پر زور الفاظ میں فرمایا:

> "منشی محمد عزیز صاحب محرّرِ اول تعلیمات کی درخواست ترقی پیش ہے، بغیر کسی ادنی رکاوٹ کے عرض ہے کہ ہر دور میں اُن پر اعتمار کیا جاتا رہا ہے، میں بھی اُن پر پورا اعتماد رکھتا ہوں اور یہ ہر دور میں پیش کاری کے فرائض انجام دیتے رہے اور اب بھی دے رہے ہیں؛ اِس لیے پر زور سفارش کرتا ہوں کہ اُن کو پیش کاری کا گریڈ عطا فرما کر ممنون فرمایا جاوے۔" فقط والسلام
>
> سید اختر حسین
>
> ۲۶/۷/۱۳۸۴ھ

منشی محمد عزیزؒ کے جن صفات حمیدہ کی کبار علماے ربانیین نے تعریف کی ہے، اُن کی نہ صرف ہمارے زمانے میں؛ بل کہ ہر زمانے میں قدر کی جاتی رہی ہے۔ جب میں

---

(۱) حضرت مولانا سید اختر حسین بن مولانا سید اصغر حسین دیو بندیؒ شوال ۱۳۴۴ھ مطابق اپریل ۱۹۲۵ء سے اپنی وفات یکم ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۳/نومبر ۱۹۷۷ء تک دار العلوم میں استاذ رہے، حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸۳ھ/۱۹۶۷ء) کی وفات کے بعد سے، اپنی وفات تک ناظم تعلیمات بھی رہے نیز مولانا بشیر احمد خان متوفی ۱۳۸۶ھ مطابق ۱۹۶۶ء کی وفات کے بعد کچھ دنوں کے لیے نائب مہتمم کے فرائض بھی انجام دیے۔
مولانا سید اختر حسین دیو بند ہی کے باشندے، دار العلوم کے ممتاز عالم اور علامہ کشمیریؒ متوفی ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء کے شاگردوں میں تھے۔

دار العلوم کے محافظ خانے میں رکھے ہوئے اُن کے ذاتی کارناموں کے فائل میں، اُن کے سلسلے میں اِن سفارشوں کو پڑھا، تو خوشی سے اچھل پڑا؛ کیوں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: کہ منشی جیؒ کے اِن مکارمِ اَخلاق وحسنِ کارکردگی کا صرف میں اور معاصرین ہی قائل نہ تھے؛ بل کہ اُن کی اِن خوبیوں کے اللہ تعالی کے نیک اور پرہیزگار بندے بھی قائل رہے ہیں، جن میں سرفہرست شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ ہیں، جو کسی کی بے جا تعریف میں مبالغہ آرائی سے بھرپور احتیاط اور اجتنابِ کلّی میں ضرب المثل کا درجہ رکھتے تھے۔

اللہ تعالی اُن کے ساتھ نیک لوگوں جیسا برتاؤ کرے، جنتِ علیا میں اپنے متقی بندوں کے ساتھ داخل کرے اور اُن کے اہل وعیال، اَقارب ورشتہ دار اور اُن کے محبّین ومتعارفین کو صبر وسکون عطا کرے۔ وآخر دعونا أن الحمد لله رب العالمين.

مختصر سوانحی خاکہ

نام محمد عزیز صدیقی، تاریخِ پیدائش ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء، تعلیم ہائی اسکول تک، دار العلوم دیوبند میں ملازمت ۶۳ سال تک یعنی از شوال ۱۳۵۵ھ/نومبر-دسمبر ۱۹۳۶ء تا شوال ۱۴۱۸ھ/ جنوری ۱۹۹۸ء۔ محرر اجیر دفتر تعلیمات ۷؍شوال ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۳؍نومبر ۱۹۳۶ء۔ ۶؍ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹؍جنوری ۱۹۳۷ء کو باقاعدہ محرر تعلیمات۔ ۱۷؍جمادی الاولی ۱۳۵۶ھ مطابق ۲۳؍جولائی ۱۹۳۷ء کو استقلال ملازمت دی گئی۔ ۵؍ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ۵؍جون ۱۹۶۵ء کو پیش کار/منشی تعلیمات کے منصب پر بحال ہوے۔ ۱۸؍ذی قعدہ ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸؍فروری ۱۹۹۸ء کو مجلس عاملہ منعقدہ ۲۹-۳۰؍شوال ۱۴۱۸ھ نے فالج زدہ ہونے کے بعد، اُنھیں پنشن دے دی، مرض فالج میں ایک سال نو ماہ گزار کر بہ روز جمعہ صبح ۴ بجے ۱۹؍رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ مطابق ۸؍جنوری ۱۹۹۹ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے۔(*)



(*) تاریخ تحریر عربی ساڑھے دس بجے صبح، بہ روز جمعہ ۱۸؍شوال ۱۴۱۹ھ مطابق ۵؍فروری ۱۹۹۹ء، شائع شدہ "الداعی" عربی شمارہ ۱۲، جلد ۲۲، ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ = اپریل ۱۹۹۹ء۔

یکتاے زمن حضرت مولانا سیّد ابوالحسنؒ

۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء — ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اُس کا دلِ بے نیاز

حضرت مولانا علی میاںؒ نے شہرت و عزت، مقبولیت و محبوبیت اور اپنے علمی و فکری، ادبی و قلمی کارناموں اور تبلیغی و دعوتی اور تعلیمی و تربیتی بخششوں اور گفتارِ دلبرانہ، کردارِ مومنانہ، جذبِ قلندرانہ، ذوقِ خدائی و لذتِ آشنائی، مولانا صفاتی و ندائے آفاقی، ذہن ہندی اور نطقِ اَعرابی کے اکتسابات سے دنیا کے گوشے گوشے کو، اِس طرح بھر دیا تھا کہ اُن کے حسنِ بسیار اور شیوۂ ہزار کے سامنے الفاظ و تعبیرات کا سرمایہ، ایک قلم کار کی مکمل دست گیری نہیں کر پاتا۔ اُن کی خوبیوں کا ہجوم اُن پر خامہ فرسائی کرنے والے کو ششدر کر دیتا ہے کہ وہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کرے کہ مُتنوّع کمالات میں سے ہر کمال کا کرشمہ، دامنِ دل و قلم و زبان کو اپنی طرف کھینچتا ہے کہ ”جا ایں جاست“۔

ربِّ شکور کے ہاں اُن کی مقبولیت کی دلیل

تعلیم و تربیت کی توفیق پانے والا شاید ہی کوئی ایسا مسلمان؛ بل کہ انسان ہوگا جس کے دل میں عظمت و شہرت کے آخری مقام بلند تک پہنچنے کی خواہش چٹکیاں نہ لیتی ہو اور اِس آرزو کی تکمیل کے لیے اپنی سی کوشش کرنے سے باز رہتا ہو۔ ہر سلیم الطبع

انسان یہی چاہتا ہے کہ رزقِ حلال کی طرف سے اطمینان کے ساتھ، خدا اور خلقِ خدا کی نگاہ میں اُس کو اعتبار و وقار ملے اور دنیا میں سرخ رُو اور عقبیٰ میں بھی بامراد ثابت ہو؛ لیکن کم ایسے سعادت مند ہوتے ہیں، جنھیں اپنی اِس دنیا کی زندگی میں حینِ حیات اُس قدر اور اُس تسلسل کے ساتھ عزت و احترام کا خراج ملا ہو، جو مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو ملا، کیا خاص اور کیا عام اور کیا ہندو اور کیا مسلمان اور کیا عرب اور کیا عجم: معاشرے کے ہر طبقے اور دنیا کی ہر سمت میں اُن پر محبت اور مقبولیت کی موسلا دھار بارش ہوئی جو (حدیث پاک کی روشنی میں) ربِّ شکور کے ہاں، اُن کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔ موت بھی ایسی قابلِ رشک پائی کہ شاید و باید کسی کو نصیب ہوتی ہے، جمعہ کا دن، آخری عشرۂ رمضان، روزہ رکھے ہوئے، خط بنوانے اور غسل فرمانے کے بعد سورۂ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْمٍ (آپ اُس کو بخشش اور معزز انہ بدلے کی خوش خبری دے دیجیے) کی آیت پر لب خاموش اور دل گویا ہو جاتا ہے اور نفسِ مطمئنہ اور پاک روح، خاکی ڈھانچے کو چھوڑ اپنے رب کی اُور پرواز کر جاتی ہے اور عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ جاتا ہے۔

خدائے کریم کی خاص صنعت

خدائے پاک کی توفیق سے مولانا علی میاںؒ کو شروع سے ہی ایسے اسباب و عناصر مُیَسَّر آئے، جن کی وجہ سے اُنھیں وہی کچھ ہونا تھا جو وہ ہوئے۔ اُن کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ربِّ کریم نے اُنھیں خاص طور پر تیار کیا تھا اور ملت و اُمّت کے حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے موجودہ دائرے میں، اُن کے فکر و عمل کی تابانی، علم و قلم کی ضیا پاشی اور سرگرمیِ مسلسل کی از حد ضرورت تھی۔

خاندانی عظمت

۱- اُنھیں خاندانی عظمت و عزیمت ملی کہ وہ سلالۂ نبوت سے تعلق رکھتے تھے، وہ

سرزمین ہند میں صحیح النسب سادات کے خانوادے میں پیدا ہوئے(۱)۔ تقویٰ، زہد اور اِسلام کی سربلندی کے لیے، سرفروشانہ جدوجہد کی تابناک وراثت اُن کے حصے میں آئی۔ اُن کا حسنی خاندان جس کے مورثِ اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی (۱۰۳۳ھ/۱۶۲۴ء-۱۰۹۶ھ/۱۶۸۵ء) ہیں، ہمیشہ سے ظاہری و باطنی اخلاق و عادات، اسلامی روایات اور دین ودعوت کے لیے قربانیاں دینے میں ممتاز رہا ہے(۲)۔ امام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ علم اللہ حسنی کے پوتے میر محمد معین کے نام ایک خط میں اُنھیں مندرجۂ ذیل القاب سے یاد کیا ہے:

''سیادت ونجابت مآب، عزیز القدر، سلالۃ الکرام، میر سید معین سلمہ اللہ تعالیٰ''

اور پھر اُن کے خاندان کے امتیازات پر روشنی ڈالنے کے بعد لکھا ہے:

''آپ کے اسلافِ کرام نے جو کچھ پایا ہے ہمت عالیہ سے پایا ہے...
فقیر کا اعتقاد ہے کہ حضرت شاہ علم اللہ کی اولاد میں ہمت عالی اس وقت تک

---

(۱) مولانا علی میاںؒ اپنی خودنوشت سوانح ''کاروانِ زندگی'' میں تحریر فرماتے ہیں:
''اِس خاندان نے اپنے نسب کی حفاظت غلو اور مبالغہ کی حد تک کی ہے...اس خاندان نے ہمیشہ سادات ہی میں یا کبھی کبھی معروف النسب شیوخ میں رشتہ کرنا ضروری سمجھا اور اگر کبھی کسی نے کھلے طریقے پر کسی غیر کفو سے شادی کر لی تو خاندان نے اگرچہ اُس کو برادری میں شامل رکھا اور اخوت و مساوات کا معاملہ کیا؛ لیکن مصاہرت اور ازدواجی تعلقات منقطع کر لیے اور نسب نامہ میں اس فرد خاندان کے نام کے ساتھ اس اصول سے انحراف کی نشان دہی کر دی (ملاحظہ ہو ''سیرۃ السادات'' از مولوی حکیم سید فخر الدین صاحب خیالیؒ) اور یہ بات خاندان کے لوگوں کو ہمیشہ معلوم رہی۔'' (کاروانِ زندگی، ج:۱، ص:۲۱، طبعِ اول ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء مکتبۂ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ)

(۲) مولانا علی میاںؒ فرماتے ہیں:
''خاندانی تذکرے اور انساب کی تفصیلی کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا ایک امتیازی وصف جو اس کے اکثر تاریخی عہدوں میں قائم رہا، مردانگی، حمیت دینی اور جذبۂ جہاد ہے...اس خاندان کی تاریخ میں بار بار ان اولوالعزم قائدین یا مجاہدین کے نام آتے ہیں، جنھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں جہاد میں حصہ لیا اور شہادت سے سرخ رو ہوئے۔'' (حوالۂ بالا، ص:۲۳)

موجود ہے... سید اور سنی ہونا جو کہ نوادر میں سے ایک نادر شے ہے، حضرت سید موصوف کے خاندان میں ہم نے اپنی آنکھ سے مشاہدہ کیا ہے..."(۱)

دورِ آخر میں مولانا علی میاںؒ کے جدِّ امجد امام سید احمد بن عرفان شہیدِ کارزارِ بالاکوٹ (۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۶ء-۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے اِحیاے اسلام اور اِعلاے کلمۃ اللہ کے باب میں جو محیر العقول مساعی انجام دیں اور جس طرح اپنے پاکیزہ خون سے عزیمت کی تاریخ رقم کی، اُس کو ملّتِ اسلامیہ ہندیہ کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ اُن کے بعد کے ہمارے تمام علماے صادقین اور بزرگانِ دین، اپنی اپنی توفیق کے مطابق اِعلاے کلمۃ اللہ کے لیے سرفروشی کی تمنا کی پرورش اور دعوت وعزیمت کا سبق اُنھی کے جہد وعمل سے حاصل کرتے رہے ہیں۔(۲)

لذّتِ سحر گاہی سے آشنا والدین

۲- علم وعمل کے جامع، دعائے نیم شبی اور لذّتِ سحر گاہی سے آشنا والدین اور بہ قول ادیبِ بے مثال اور مُفسّرِ باکمال مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۳۰۹ھ/ ۱۸۹۲ء- ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) باپ- یعنی مولانا سید عبدالحیؒ حسنی صاحبِ "نزہۃ الخواطر" و "گل رعنا" (۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء- ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۳ء) اور بھائی - یعنی برادرِ اکبر سید عبدالعلی حسنی (۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء- ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء) یکے از تلامذۂ شیخ الہندؒ- دونوں نور علی نور، پاک صاف

(۱) نادر مکتوبات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ج:۱،ص:۳۰۳-۳۰۴،مرتبہ حضرت شاہ عبدالرحیم پھلتی،شرح وترجمہ مولانا نسیم احمد فریدی، طبع اول ۱۴۱۹ھ، پھلت، مظفر نگر (یوپی)

(۲) مولاناؒ کاروانِ زندگی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:
"ایک مرتبہ مسجد (تبلیغی مرکز حضرت نظام الدین، نئی دہلی) کے بالائی حصے میں ٹھہرا ہوا تھا، جہاں (حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی دہلویؒ کے) صاحب زادۂ گرامی مولانا محمد یوسف صاحب کا قیام رہتا تھا، مولانا (محمد الیاسؒ) چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں لے کر تشریف لائے، میری طرف پیالی بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ "مولانا! ابھی تک ہم لوگ حضرت سید صاحب کی تجدید کے سایہ ہی میں ہیں" (کاروانِ زندگی، ج:۱،ص:۲۸۱)

طاہر مٹی (جو تیمّم کے قابل ہو) سے بنے ہوئے (۱) کی گود میں پلنے بڑھنے اور تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

روشن دل وروشن دماغ اَساتذۂ کرام

۳- نیز متنوع العلم، روشن دل وروشن دماغ، وسیع النظر، سلیم الطبع اور معتدل الخیال اساتذۂ کرام کے سامنے زانوے ادب تہ کرنے کی توفیق ملی، جن میں علامہ خلیل عرب بن محمد انصاری یمانی (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء- ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی (جن کا تقرر ندوۃ العلما میں ۱۴؍ستمبر ۱۹۳۰ء کو ہوا تھا) مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی (۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء - ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء)، مولانا عبدالحیؒ فاروقی لکھنوی، مولانا احمد علی لاہوری (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء- ۱۳۸۱ھ- ۱۹۶۲ء) اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء - ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) سابق صدر مدرس وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی امروہوی (۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء- ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) شامل ہیں۔ اُنھوں نے ندوۃ العلما لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی (۲) کے علاوہ ایک طرف اِسلامی علوم وفنون کے ماہرین اور دوسری طرف عصری ثقافتوں کے اَصحابِ کمال سے استفادہ کیا اور انگریزی زبان بھی اِتنی حاصل کرلی کہ مغربی مصنّفین اور مستشرقین کی اسلامی موضوعات سے متعلق کتابوں کا بہ راہِ راست

(۱) ''معاصرین'' از مولانا عبدالماجد دریابادی، مطبوعہ ادارہ انشاے ماجدی، کلکتہ، ص: ۱۲۷۔

(۲) ۱۹۲۷ء میں اُنھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں مولانا خلیل عرب کے اِصرار پر داخلہ لیا، جو وہاں شعبۂ عربی کے اُستاذ تھے اور ۱۹۲۹ء میں فاضلِ ادب عربی کی ڈگری لی، اِس سلسلے میں مولاناؒ ۱۵-۱۶ سال کی اپنی نوعمری کی قابل رشک دینی غیرت اور اسلامی حمیت کو اِس طرح بیان کرتے ہیں:

''دسمبر ۱۹۲۹ء کو یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد (Convocation) میں گورنر یوپی ''سر مالکم ہیلی'' نے سندیں تقسیم کیں... اور یہ ستم ظریفی میری زندگی میں پیش آکر رہی کہ عربی ادب اور زبان کی سند ایک انگریز حاکم اور دشمنِ اسلام قوم کے فرد سے لی جائے'' ''کاروانِ زندگی'' ج:۱، ص: ۱۰۵)۔

مطالعہ اُن کے لیے آسان ہوگیا۔(۱)

اِن اساتذۂ کرام کی صحبت سے، اُنھوں نے اِس طرح فائدہ اٹھایا، جیسے شہد کی مکھیاں مختلف پھولوں اور پھلوں کا رس چوستی اور خالص، شفا بخش اور شفّاف شہد میں تبدیل کردیتی ہیں۔ متنوع ثقافتوں کی وجہ سے اُن کے قلب و دماغ نے، اُن کے موروثی اعتدال اور توازن پر رہنے کی صفت کو مزید جلا بخشا۔

اصحابِ عزیمت واستقامت صلحا و داعیانِ اسلام کی صحبت

۴- مولاناؒ کو مُوَحِّدِین، عاشقانِ نبی ﷺ، اصحابِ استقامت وعزیمت اور رہبان باللیل اور فرسان بالنہار، انسانیت پر ترس کھانے والے اور اُمّت کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے، انگاروں پر لوٹنے والے مربیان اور داعیانِ اِسلام کی پُرتاثیر اور طویل صحبتیں مُیَسّر آئیں۔ اُن داعیوں اور مُربّیوں میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری، بانیِ دینی دعوت وتبلیغی تحریک مولانا محمد اِلیاس کاندھلویؒ (۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء - ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۳ء) مولانا عبدالقادر رائے پوری (اندازاً ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء - ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء-۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) سرفہرست ہیں۔

(۱) مولاناؒ نے کسی اسکول کالج میں داخلہ لیے بغیر اپنے خاندان کے بعض انگریزی داں حضرات اور انگریزی کے دیگر ماہرین سے استفادہ کیا، بعد میں اس میں اُنھیں خاصا انہاک ہوگیا اور انٹرمیڈیٹ کے معیار کی کتابوں کو حل کرنے اور امتحان میں بیٹھنے کے ارادے کا اُن کی والدہ محترمہ خیر النساء بہتر صاحبہ کو علم ہوا، تو اُنھوں نے دردمندانہ خط کے ذریعے اُنھیں اِس ارادے سے باز رہنے اور انگریزی تعلیم سے، یکسر دست کش ہوجانے کا مشورہ دیا، جس میں والدہ نے اُنھیں لکھا کہ:

"علی! تم کسی کے کہنے میں نہ آؤ، اگر خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہو اور میرے حقوق ادا کرنا چاہتے ہو، تو اُن مردوں پر نظر کرو جنھوں نے علم دین حاصل کرنے میں عمر گزار دی، اُن کے مرتبے کیا تھے؟... علی! اگر میرے سو اولادیں ہوتیں، تو میں یہی تعلیم دیتی، اب تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ میری خوش نیتی کا پھل دے کہ سو کی خوبیاں، تم سے حاصل ہوں اور میں دارین میں سرخ رو اور نیک نام ہوں اور صاحب اولاد کہلاؤں، آمین ثم آمین یارب العالمین" (ذکرِ خیر ص:۵۳، کاروانِ زندگی، ج:۱، ص:۱۲۲-۱۲۳)۔

حضرت مدنیؒ سے نہ صرف اُن کے برادرِ بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی، اِرادت کا تعلق رکھتے تھے؛ بل کہ اُن کی صاحب زادیاں وغیرہ بھی اُن کے دست گرفتوں میں تھیں۔ اِسی لیے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں، حضرت مدنی کے کسی پروگرام میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ تشریف آوری کے موقع سے ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے برادرِ خرد مولانا علی میاں کو اُن کے حوالے کیا اور دیوبند میں، اُن کی خدمت سے مستفید ہونے اور اُن کے درسِ بخاری و ترمذی شریف میں شرکت کا حکم کیا۔ ماہ ربیع الاول سے رجب کے اواخر تک مولانا نے دیوبند میں نہ صرف حضرت مدنی کی شبوں کی گدازی، دن کی تپش اور دل کی خلش سے فائدہ اٹھایا؛ بل کہ شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ سے دیگر طلبۂ دارالعلوم کے ساتھ ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ/۱۶۰۶ء) کی مشہور کتاب ''شرح نقایہ'' بھی پڑھی۔ نیز ڈابھیل سے علامہ محمد انور شاہ (متوفی ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء-۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء) کی اُس دوران دو ایک مرتبہ دیوبند تشریف آوری کے موقع کو غنیمت جان کر، اُن کی مجلسوں میں بھی حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے رہے، نیز دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا قاری اصغر علی سے حفص کی روایت کے مطابق قراءت و تجوید بھی پڑھی (۱)۔ حضرت مدنی کی صحبت و تعلیم سے مولانا علی میاںؒ نے حمیت اور عزیمت کا سبق سیکھا، حوصلہ مندی، سخاوت اور انکساری و عاجزی کا عملی نمونہ دیکھا اور اسے جذب کیا (۲)۔ اُن کی عزیمت اور مجاہدے سے بھرپور زندگی نے خاک

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے ''کاروانِ زندگی''، ج:۱، ص:۱۲۸-۱۳۲۔

(۲) مولاناؒ ''پرانے چراغ'' میں فرماتے ہیں: ''میری کوتاہ نظر میں دو صفتیں آپ کی (یعنی حضرت مدنیؒ کی) زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں، جنھوں نے آپ کو اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا ہے: ایک عزیمت دوسرے حمیت'' (پرانے چراغ، ج:۱، ص:۱۰۵-۱۰۶، طبع سوم ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء مکتبۂ فردوس لکھنؤ)۔
دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''ہم نے اہلِ بیتِ کرام کی سخاوت و شہامت و حوصلہ مندی کے جو اقعات پڑھے ہیں، اُن کا پرتو مولانا کی زندگی اور اُن کے بعض معاصرینِ کبار کے اخلاق میں پایا ہے'' (حوالۂ بالا، ص:۱۱۳)۔
مزید فرماتے ہیں: ''اِس افتادِ طبع کے ساتھ (یعنی شخصیتوں کو غور سے دیکھنے اور اُن کی خصوصیات و اخلاق کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی عادت کی وجہ سے) جب مولانا (مدنیؒ) کو دیکھا، انسانیت و آدمیت، شرافت و سیادت او۔ اخلاق و کردار کی بڑی بلندی پر پایا'' (ص:۱۰۹)

ساری وجاں سپاری، انسانی خدمت کے جذبے سے سرشاری اور اِسلام کے لیے ہر طرح کی جاں نثاری کا حوصلہ بخشا اور نہ صرف ضیافت ومہماں نوازی کی نبوی موروثی صفات کو مہمیز کیا؛ بل کہ مہمانوں کا ''غلام'' بن جانے کا ذوق دیا۔(۱)

مولانا احمد علی لاہوریؒ سے نہ صرف تفسیر پڑھی؛ بل کہ شاہ ولی اللہؒ کی "حجة الله البالغه" بھی پڑھی اور اُن کی صحبت میں ایک عرصے تک باقاعدہ قلب ونگاہ کو مُزکّٰی بھی کیا، اُن کی صحبت میں خدا طلبی کا ذوق پیدا ہوا، خدا کے نام کی حلاوت اور مردانِ خدا کی محبت نے دل میں جگہ لی، ذوق ورجحان پرسان چڑھی، راست روی کی دولت ملی اور تعلق مع اللہ کے لیے بے قراری کی سعادت سے بہرہ یاب ہوے، اُن کی دم سازی وعیسیٰ نفسی نے اخلاص وعقیدے کو صیقل کیا اور عملی وفکری زندگی کو ایک نئی سمتِ سفر دی۔(۲)

مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی صحبتِ کیمیا اثر نے، اُنھیں دین کے لیے تڑپنا پھڑکنا سکھایا، اتّباعِ سنت، اِنابت اِلی اللہ کا ذوق، استقامت وعبادت کا شوق، اِیمان واحتساب کی کیفیت سے سرشاری، مقصد کا عشق، درد کی دوا اور درِ دِلا دوا، مسلمانوں کے

(۱) پرانے چراغ، ج:۱،ص:۱۱۲-۱۱۳۔

(۲) مولانا خود اِیمان کو تازہ کرنے والی کیفیت اور روحانی لذت کے ساتھ رقم طراز ہیں:

''میری زندگی میں وہ بڑا مبارک دن اور بڑی سعید گھڑی تھی، جب مولانا احمد علی صاحب لاہوری امیر انجمن خدام الدین، شیرانوالہ دروازہ، لاہور سے نیاز حاصل ہوا۔ میری زندگی کے دو بڑے موڑ ہیں، جہاں سے زندگی نے نیا راستہ (جہاں تک خیال ہے، بہتر اور مبارک راستہ) اختیار کیا: پہلا موڑ جب مولانا احمد علی صاحب سے تعلق پیدا ہوا، دوسرا موڑ اُس وقت پیش آیا جب خدا نے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچایا۔

''اگر مولانا احمد علی صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو، میری زندگی اچھی یا بری بہ ہر حال موجودہ زندگی سے بہت مختلف ہوتی اور شاید اس میں ادب وتاریخ اور تصنیف وتالیف کے سوا کوئی ذوق اور رجحان نہ پایا جاتا۔ خدا شناسی اور خدا رسی، راہ یابی اور راست روی، تو بڑی چیزیں ہیں، مولانا کی صحبت میں کم سے کم خدا طلبی کا ذوق، خدا کے نام کی حلاوت اور مردانِ خدا کی محبت، اپنی کمی اور اِصلاح وتکمیل کی ضرورت کا اِحساس پیدا ہوا'' (پرانے چراغ، ج:۱،ص:۱۳۴-۱۳۵)۔

دینی تنزل کا جامع اِحساس اور دعوت وتبلیغ کا بے پناہ ولولہ دیا اور نشانِ منزلِ جاناں سے باخبر کیا(۱)۔ اُن سے تعلقِ قلب ونگاہ کی دولت نے خود مولانا کے بہ قول، اُنھیں اِس صلاحیت سے بہرہ ور کیا کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ:

''ان دو دعوتوں اور کوششوں، قیادتوں اور طرزِ فکر و تفہیم میں کیا فرق ہوتا ہے؟ جن میں سے ایک کا سرچشمہ ذہانت، مطالعہ، وسعتِ علم اور کسی خاص فلسفہ اور تحریک یا صورتِ حال کا ردِ عمل ہوتا ہے اور دوسرے کا سرچشمہ، کثرتِ عبادت و اِنابت و دعا، قرآن مجید میں عمیق تدبّر، سیرتِ نبوی کا عاشقانہ مطالعہ اور مخلصانہ تتبع اور اِجتبا اور ہدایتِ ربانی ہوتی ہے''۔(۲)

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی صحبت اور تربیت اور تزکیے سے اِس اِحساس کی دولت ملی کہ مادیت کے بحرِ ظلمات میں جو چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، ایک ایسا جزیرہ بھی ہے، جہاں ذکر وفکر کے علاوہ کوئی شے موضوعِ گفتگو اور مشغلۂ زندگی نہیں، وہاں بے نظیر فنائیت و بے نفسی کا درس حاصل ہوا اور شفقتِ مادری جیسی شفقت ملی اور دل کی انگیٹھی کو گرم رکھنے کی کلید حاصل ہوئی۔(۳)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے مولانا کا تعلق گویا اپنے شیخ مولانا عبدالقادر ہی جیسا رہا۔ مؤخر الذکر کی وفات کے بعد تو گویا اول الذکر ہی اُن کے شیخ و مربی کے درجے میں رہے، اُن کی متعدد عربی کتابوں پر مقدمے لکھے، سہارنپور کا بار بار سفر کیا اور جگر سوزی، علم وعمل کی جامعیت، عبادت و ریاضت کے ساتھ تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کے مبارک اور مسلسل مشغلے سے بھرپور زندگی سے

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے ''حضرت مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت'' باب ہفتم وہشتم، ص:۱۹۶-۳۲۸، مطبوعہ ادارہ اشاعتِ دینیات، حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔

(۲) پرانے چراغ، ج:۱، ص:۲۸۴۔

(۳) پڑھیے: ص:۳۵۲-۳۵۳، کاروانِ زندگی، ج:۱، نیز ''سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری'' بہ قلم مولانا علی میاں ندویؒ۔

اثر پذیر ہوے۔ شیخ کے ساتھ اُن کا یہ تعلق وقت کے ساتھ اور بڑھتا گیا، چناں چہ جب تک وہ حیات رہے، زندگی کے اہم مسائل میں، اُن سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہیں اُٹھایا؛ کیوں کہ مولانا کا یہ عقیدۂ وعمل تھا کہ زندگی کی وادیِ پرخار میں کسی روشن دل، بیدار مغز مردِ مومن کی راہ نمائی کے حصار ہی میں سفر کرنا چاہیے، ورنہ حالات کے نکیلے کانٹوں سے دامن کے اُلجھ جانے کا یقینی خطرہ موجود رہتا ہے۔ محض علم ومطالعے اور ذہانت وفراست کے ذریعے جو لوگ، سمتِ سفر کا تعیّن کرتے ہیں، وہ اکثر کعبہ نہ پہنچ کر ''ترکستان'' کو نکل جاتے ہیں اور اُن کی عقل وخرد اور فکر ونظر کا جگر لہولہان اور ایمان وعقیدے کا دامن تار تار ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے ایک صبر آزما طالب اور جہاں دیدہ ونرم وگرم چشیدہ ہونے اور بے شمار انسانوں کا مطالعہ کرنے، دیکھنے اور تجربہ کرنے کی وجہ سے، وہ اِس حقیقت سے سب سے زیادہ واقف تھے۔

شاعرِ اسلام علامہ اقبال سے تأثُّر وعقیدت

۵- ہمالیے کی چوٹی؛ بل کہ آسمان کی بلندی سے اسلام کی عظمت، مسلمانوں کی رفعت؛ عرب کے ریگ زاروں، صحرانشینوں، سفر نصیب وصحرا گرد بدویّوں؛ اور خبر میں، نظر میں اذانِ سحر میں یکتاے کائنات غازیوں اور پُر اَسرار بندوں اور مومن کے مقامِ بلند اور کائنات میں اُس کی سیادت وقیادت کا پرسوز وسحر خیز ویقین ریز وولولہ انگیز اسلوب اور اونچے سروں اور اسرارِ خودی ورُموزِ بے خودی کی بے مثل لَے میں گیت گانے والے اور ''محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی'' کا لازوال ومسرت وتازگی وتوانائی بخش ترانا سنانے والے اور فرنگیوں کے فسادِ قلب ونظر، مغربی تہذیب کی لادینیت، اُس کے مادہ پرستانہ مزاج، مغرب کی خود پسند قومیت اور جانب دارانہ وطنیت، سینۂ بے نور میں محرومِ تسلّی دل، تہذیبِ جواں مرگ کی حرکت مذبوحی؛ کی بے باکانہ، باغیانہ اور غیرت مندانہ دھجیاں اڑانے والے اور آشیانۂ تہذبِ مغرب کا خود اُس کی بے تاب بجلیوں سے بیکاری

وعریانی و مے خواری و افلاس کی بے طرح فتوحات کی وجہ سے، یقینی خطرے میں گھر جانے کی بصیرت مندانہ خبر دینے والے، شاعرِ اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبال اور اُن کے فکروفن کے لافانی اثاثے سے مناسبت، محبت، اور اُس میں جینے اُس کو جذب کرنے اور اُس کو عالمِ عرب کے ایوان ہائے حکومت اور عشرت کدوں کے تن آساں قائدین اور مغربی تہذیب وتمدن کی بخششوں کی زرق برق روشنیوں سے مرعوب عرب کے خواص وعوام تک پہنچانے کی مولانا علی میاںؒ کو توفیق ملی۔

مولانا علی میاں نے بلاشبہہ اقبال کے حقیقت پسندانہ اور گہری بصیرت سے ترشے ہوئے اشعار: اُن کے صورِ اسرافیل، اُن کے بالِ جبریل اور اُن کی ضربِ کلیم؛ اُن کی آواز، انداز وامتیاز سے اپنے کو نتیجہ خیز طور پر ہم آہنگ کرلیا تھا۔ ولایتِ عشق کے قائد وسپاہی اور سپاہی ساز اور دیارِ مہر وفا کے راہی وراہ نما اقبال نے اُنھیں حرم میں بغاوتِ خرد سے آمدہ خطرے کے مقابلے کے لیے عشق ومحبت کی سپاہِ تازہ کی تیاری کا پیغام دیا، جسے عملی جامہ پہنانے کے لیے، مولانا علی میاںؒ نے پوری زندگی وقف کردی۔ بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوے حرم آنے اور شہر کے خوگر کو وسعتِ صحرا سے ہم کنار ہونے کی پیہم دعوت دیتے رہنے کے لیے اپنے قول وعمل، سیرت واخلاق، نشست وبرخاست، دعوت وملاقات، سیاحت واسفار اور قلم وزبان کی ساری توانائیاں جس حوصلے، ولولے اور دوام کے ساتھ مولانا علی میاںؒ نے صرف کیں، اُسے محض توفیقِ الٰہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اِقبال کے شعری وتخلیقی سرمایے نے مولانا کی عقل وفکر، دماغ ونظر کے بند کھول دیے، اِسلام کی ابدی حقیقتوں کی ترجمانی کے لیے طاقت ور وجادو انگیز، اثر آفریں وشعلہ بار وپرجوش تعبیریں دیں، جن سے تنِ مردہ میں زندگی کی بے انتہا طاقت وَرَرَو دوڑ جاتی ہے اور جمود وگراں خوابی کا سارا نشہ ہرن ہوجاتا ہے۔ اُس شاعرِ بے بدل کے سوز وساز اور درد وگداز نے، عقل کے مقابلے میں عشق کی طاقت وعظمت، اور تازہ کاری ومعجز نمائی اور لاتعداد حصول یابیوں اور فتح مندیوں کی قدر

وقیمت پر اِیمان تازہ کیا اور ساتھ ہی عقل کی زیاں کاریوں، ریابازیوں اور مکاریوں کا علاج، عشق ومحبت کی یقینی طور پر اور ہر حال میں شافی وکافی رہنے والی دوا کو بتا کر، ملّی خفتہ گان کو بیدار کرنے کی راہ پر تا حینِ حیات، محوِ سفر رہنے کا یارا دیا۔

اِقبال کے فکروفن اور شعروادب کو مولاناؒ نے اپنے خوابوں کا ترجمان، دل کی زبان، جذبات ومحسوسات کا بیان اور فکروعقیدے کی لسان پایا، چناں چہ اُنھوں نے اُسے پسند کیا، اپنایا اور اپنے تعبیری وتفکیری اثاثے اور تخلیقی وتعمیری، دعوتی وتبلیغی اور علمی وادبی سرمایے کا اُس کو خوب صورت، معنی آفریں، خیال افروز، حوصلہ آگیں، مشک بار اور عطر بیز حصہ بنالیا اور اپنی تحریر وتقریر میں اُس کو اِس طرح سمولیا، ''برگِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم'' اُسلوب اور اُسلوبیات کا ایک طالبِ علم آسانی سے یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ مولاناؒ کی زبان وقلم اور سوچنے اور کہنے کو اِقبال کے شعروفکر نے، غیر معمولی خوبی سے، غیر معمولی حد تک مُتأثّر کیا ہے۔

مولانا نے اِقبال کو بے حساب کیوں چاہا اور اُن سے ٹوٹ کر کیوں محبت کی؟ مولانا کے قلم سے اِس کی لذّت انگیز حکایت کا، ایک ٹکڑا آپ بھی پڑھیے اور لطف لیجیے:

''اِقبال کو پسند کرنے کے اسباب بہت سے ہوسکتے ہیں اور ہر شخص اپنی پسند کے مختلف وجوہ بیان کرسکتا ہے، اِنسان کی پسند کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو اپنے خوابوں کا ترجمان اور اپنے دل کی زبان پانے لگتا ہے۔ اِنسان بہت خود بیں وخود پسند واقع ہوا ہے، اُس کی محبت اور نفرت، تمناؤں اور دلچسپیوں کا مرکز ومحور بڑی حد تک اُس کی ذات ہی ہوتی ہے؛ اِس لیے اُسے ہر وہ چیز اپیل کرتی ہے، جو اُس کی آرزوؤں کا ساتھ دے سکے اور اُس کے اِحساسات سے ہم آہنگ ہوجائے۔ میں بھی اپنے کو اِس کلیے سے الگ نہیں کرتا، میں نے کلامِ اقبال کو عام طور پر اِسی لیے پسند کیا ہے کہ وہ میری پسند کے معیار پر پورا اُترتا اور میرے جذبات ومحسوسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

وہ میرے فکر وعقیدہ ہی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں؛ بل کہ اکثر میرے شعور اور اِحساسات کا بھی ہم نوا بن جاتا ہے۔

سب سے بڑی چیز، جو مجھے اُن کے فن کی طرف لے گئی، وہ بلند حوصلگی، محبت اور اِیمان ہے، جس کا حسنِ امتزاج، اُن کے شعر اور پیغام میں ملتا ہے اور جس کا اُن کے معاصرین میں کہیں پتہ نہیں لگتا، میں بھی اپنی طبیعت اور فطرت میں اُنھی تینوں کا دخل پاتا ہوں۔ میں ہر اُس ادب اور پیغام کی طرف بے اختیارانہ بڑھتا ہوں، جو بلند نظری، عالی حوصلگی اور اِحیاے اِسلام کی دعوت دیتا اور تسخیرِ کائنات اور تعمیرِ اَنفس وآفاق کے لیے اُبھارتا ہے؛ جو مہر ووفا کے جذبات کو غذا دیتا اور ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے؛ جو محمد ﷺ کی عظمت اور اُن کے پیغام کی آفاقیت واَبدیت پر ایمان لاتا ہے۔

میری پسند اور توجہ کا مرکز، وہ اسی لیے ہیں کہ وہ بلند نظری، محبت اور ایمان کے شاعر ہیں؛ ایک عقیدہ، دعوت اور پیغام رکھتے ہیں اور مغرب کی مادّی تہذیب کے سب سے بڑے ناقد اور باغی ہیں؛ وہ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور مسلمانوں کے اِقبالِ گذشتہ کے لیے، سب سے زیادہ فکر مند، تنگ نظر قومیت ووطنیت کے سب سے بڑے مخالف اور اِنسانیت اور اِسلامیت کے عظیم داعی ہیں"۔(۱)

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے داعیوں کی تحریروں کی تاثیر

۶- اسی کے ساتھ معنوی طور پر کتب واشخاص کے واسطے سے، شیخ حسن البنا مصریؒ (۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء-۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء) کی سیف وقلم کی جامع دعوت، جمال الدین افغانیؒ (۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء- ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء) کی اِسلام کی نشأۃ ثانیہ کی حوصلہ انگیز منصوبہ بندیوں کی حرارت خیز داستانوں اور غلام ہندوستان اور عالمِ اِسلام میں، خدا کی حکمت

(۱) "نقوشِ اقبال" بہ قلم مولانا علی میاں ندوی، ص:۳۳-۳۴، مطبوعہ مجلسِ تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، چھٹا اڈیشن ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء۔

وقدرت ومشیت سے، دورِ آخر میں پیدا ہونے والے، حوصلہ شعار واخلاص پیکر قائدین وعمائدین کی حرکت وعمل نے بھی مولانا کے حسّاس دل، اثر پذیر طبیعت اوراخذ واستنباط کی صلاحیت سے بھرپور ذہن اور اکتسابی استعداد کے حامل قلم کو نتیجہ خیز حد تک مُتأثّر کیا اور اُنھیں اُن ساری خوبیوں سے مالا مال کیا، جو کسی زوال آمادہ اُمّت ، اور سرِّ کلیم وخلیل کو اپنی اذانوں سے فاش کرنے کے وظیفے سے، وقتی طور پر لاتعلّق ہوکر خوابیدہ ہوجانے والی، ملّت اور لاقانونیّت و ''مے وقمار وہجوم زنانِ بازاری'' میں سرمست اوراخلاق واقدار، ودین ومروّت کے خلاف بغاوت کے نشے سے بدمست معاشرے کو بیدار کرنے اور راہِ مستقیم پر لانے والے داعی میں، خداے قدیر اپنی مرضی سے، وقت کی آندھیوں کا رخ موڑنے کے لیے، ہمہ وقت جہد وعمل کی لذّت سے سرشار رہنے کی خاطر پیدا کردیا کرتا ہے۔

فراستِ ایمانی ولذّتِ قرآنی، نورِ بصیرت ودینی عزیمت، اَخلاقی برہان وعملی قوّت کے حامل، رازہاے شریعت وطریقت سے باخبر اور حالات وزمانے کے اِشارات پر وسیع وعمیق نظر رکھنے والے علماے ربانی نے، مولانا علی میاںؒ کے سلسلے میں اُن کے عنفوانِ عمر سے جو بشارتیں دی تھیں، جو توقّعات وابستہ کیے تھے، جن بلند الفاظ سے اُنھیں یاد کیا تھا اور عرب وعجم کے نام ور علما واُدبا ومفکرین نے، اُن کی عظمت وامتیاز کے جس طرح گیت گائے تھے؛ مولانا کے علمی وفکری وادبی اور قیادتی واجتماعی کارناموں کو دیکھ کر، دنیا نے تصدیق کیا کہ اتنے سارے علما ومشائخ کا اندازہ اُن کے سلسلے میں اِتنا صحیح ثابت ہوا، جتنا شاید کسی بڑے سے بڑے سائنس دان کا اندازہ تجرباتی علوم اور برق وبخارات کے سلسلے میں بھی صحیح نہیں ہوتا، جب کہ ثانی الذکر اندازہ محسوسات ومشاہدات کی روشنی میں لگایا جاتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو اپنی دِقّتِ نظری، ذہانت اور علمی گیرائی وگہرائی کے لیے، شہرتِ عام رکھتے تھے، مولانا علی میاںؒ کے ایک خط کے جواب میں جو اُنھوں نے (حضر تھانویؒ نے) اُنھیں اُس وقت لکھا تھا، جب اُن کی عمر صرف ۱۹ سال

کی تھی، اُنھیں ''مجمع الکمالات'' لکھا تھا۔(۱)

شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ اپنے شاگرد مولانا علی میاںؒ کو ایک خط میں ''بمحترم المقام مولوی ابوالحسن صاحب'' لکھ کر "بَارَكَ اللّٰهُ فِي إِخْلَاصِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ" کی دعا دے کر گویا مولاناؒ کے اِخلاص اور حسنِ عمل کی گواہی دیتے ہیں۔(۲)

ایک دوسرے خط میں مولاناؒ کو لکھتے ہیں:

''چوں کہ آپ میرے ہیں؛ اِس لیے اللہ تعالیٰ کا جو فضل بھی آپ پر ہو؛ وہ میرے لیے باعثِ صد فخر ہے، مجھے جس طرح مولوی حبیب اللہ سلمہ (۳) کی ترقی سے فرحت ہوسکتی ہے، اُسی طرح؛ بل کہ واقعہ یہ ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر، اُس سے زیادہ خوشی و سرور آپ کے درجات کی ترقی سے ہوتا ہے۔ اب دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور موجودہ دورِ فتن میں تمام مصائب و آلام سے مامون رکھے۔ آمین یا اِلٰہَ العالمین''۔(۴)

ایک دوسرے مکتوب میں اُنھیں تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کی ہر کام یابی سے جتنا میرے دل میں سرور اور فرحت حاصل ہوتی ہے، غالبًا دنیا میں اور کوئی نہیں جسے، اُس درجہ کی راحت حاصل ہو، میرا دل آپ کی ترقی دارین کے لیے بارگاہِ الٰہی میں مُلتجی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمرِ دراز عطا فرمائے اور اپنی مرضی کے مطابق، عمر بھر اشاعتِ دین کی توفیق عطا فرمائے۔''(۵)

کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کی دعائیں اور تمنائیں مولانا علی میاںؒ کے سلسلے میں، بارگاہِ ایزدی میں حرف بہ حرف مقبول نہیں ہوئیں۔

(۱) پرانے چراغ، ج:۱،ص:۱۲۴۔
(۲) مکتوبات شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ، ص:۵۱۔
(۳) شیخ التفسیر کے فرزندِ اکبر۔
(۴) پرانے چراغ، ج:۱،ص:۱۶۱۔
(۵) حوالۂ بالا، ص:۱۶۲۔

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے، اپنی زندگی کی ایک آخری مجلس میں مولاناؒ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''مولانا! میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں، آپ کی کیا تعریف کروں؟ تعریف کرنا محبت کا اوچھا پن ہے۔''(۱)

ایک مکتوب میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ مولانا کو لکھتے ہیں:

''مخدومی و محترمی حضرت سید صاحب! دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

...آں محترم کی توجہاتِ عالیہ سے، تبلیغ کو جس قدر نفع پہنچا ہے، اب تک لگنے والوں میں کسی سے نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مقدس توجہات کو، اِس طرف اور زائد مبذول فرمائے...''(۲)

ایک دوسرے خط میں مولانا کو اِن القاب سے یاد کرتے ہیں:

''مخدوم ومکرم معظم محترم سلالۂ خاندانِ نبوت أَقَامَنَا اللّٰهُ وَإِيَّاكُمْ لِإِعْلَاءِ كَلِمَتِهٖ وَإِحْيَاءِ سُنَنِ نَبِيِّهٖ۔''

پھر آگے لکھتے ہیں:

''بہ خدمت عالی عمدۃ الآمال والأمانی مکرم محترم حضرت سید صاحب''(۳)

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''میری امیدوں اور تمناؤں کی ودیعت گاہ محترم سلالۂ خاندانِ نبوت''(۴)

ہے کوئی جس کو، ان آرزوؤں اور توقعات اور دعاؤں کے لفظ لفظ، بارگاہِ استجابت میں قبول ہونے میں ذرہ برابر شک کرنے کی جرأت ہو۔

---

(۱) کاروانِ زندگی، ج:۱،ص:۲۸۶۔

(۲) مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ص:۸۱۔

(۳) حوالۂ بالا،ص:۸۔ (۴) حوالۂ بالا،ص:۱۷۔

صلحائے زمانہ کی توقّعات کے سچے مصداق

مجھے یہاں مولاناؒ کے سلسلے میں تمام بڑوں کی دعاؤں وتوقّعات، کا اِحاطہ مقصود نہیں کہ قارئین کے لیے گراں چشم اور اُکتاہٹ کا باعث ہوسکتا ہے، ورنہ عالمِ عرب کے بڑے بڑے علما واُدبا اور عالمِ اسلام کے باکمال اہلِ علم وقلم کی لاتعداد عقیدت مندانہ ووالہانہ شہادتیں، ڈھیر ساری مولاناؒ کی اپنی لکھی ہوئی اور اُن کے سلسلے میں دوسروں کی تصنیف کردہ کتابوں میں موجود ہیں، اُنھیں اپنی جگہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے؛ لیکن یہاں صرف ایک بشارت بہ شکلِ خواب، جو خود اُن کی عالمہ وصالحہ، وعابدہ ونیک خو والدہ کی ہے، کو نقل کرنے کے لیے قلم بے تاب نظر آتا ہے، لہٰذا اُس کو درج کرنے پر اِکتفا کیا جاتا ہے۔

جس زمانے میں اُن کی والدہ محترمہ سیدہ خیر النساء صاحبہ (متوفی ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) کی شادی، اُن کے والدِ محترم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ صاحب کے ساتھ ہونے کی بات چل رہی تھی، اُنھی دنوں اُن نیک بخت وسعادت نصیب خاتون نے، جو بشارت آمیز خواب دیکھا، اُس کا قصہ خود وہ اپنے قلم سے یوں لکھتی ہیں:

> ”ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ خاص اُس مالک کریم، رحمٰن ورحیم کی عنایت ومہربانی سے، ایک آیتِ کریمہ مجھے حاصل ہوئی، صبح تک وہ زبان پر جاری تھی، مگر کچھ خوف ایسا تھا کہ میں بیان نہ کرسکی، منہ سے نکلنا دشوار تھا اور اُس کے معنی بھی مجھے معلوم نہ تھے، جب معنی دیکھے، تو خوشی سے پھول گئی اور تمام فکروغم بھول گئی، اپنی اِس خوش نصیبی پر فخر کیا اور اس خواب کو بیان کیا، ہر شخص سن کر رشک کرتا اور والدِ محترم، تو خوشی میں رونے لگے۔ وہ آیتِ کریمہ یہ ہے:
>
> فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ: سو کسی کو نہیں معلوم جو چھپا دھرا ہے، اُن کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک،

بدلہ اُس کا جو کرتے تھے"۔(۱)

کوئی حد ہے مولاناؒ کے آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کی، اپنے والدین کے لیے، اپنے اہلِ خاندان کے لیے، اپنے مربی برادرِ اکبر کے لیے، اپنے اساتذہ کے لیے، اپنے مربیوں اور شیوخ کے لیے، اپنے متعارفین ومحبین ودعا گویوں کے لیے اور اُن تمام مسلمانوں اور اِنسانوں کے لیے، جنھیں اُن کی تحریر وتقریر، اُن کی صحبت ومجالست، اُن کی ملاقات وزیارت، اُن سے عقیدت ومحبت، اُن کے سلوک وکردار، اُن کے اخلاقِ کریمانہ کے گوہرِ آب دار، اور اُن کی حبِّ نبوی اور اسلام پر فدا ہونے کی کیفیت، اُن کی جہدِ مسلسل وحرکتِ پیہم وسعیِ بے کراں سے بھرپور زندگی وبندگی، جاں سوزی وتابندگی سے، کسی نہ کسی شکل میں فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا رہا ہے، یا رہے گا۔

پرخلوص تحریر وتقریر کی جادوگری واثر انگیزی

میں نے صرف اردو میں نہیں عربی میں بھی تحریر کے بادشاہوں کو پڑھا ہے، تقریر کے جادوگروں کو سنا ہے، الفاظ کے شہنشاہوں کو برتا ہے، فصاحت وبلاغت کے دریا بہانے والوں کا تجربہ کیا ہے، مطالعہ ومعلومات کی گم نام اور تاریک سرنگوں میں، بے خطر بہت دور تک چلے جانے والے، بہت سے لوگوں کا علم ہے؛ لیکن دل کی اتھاہ گہرائیوں سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تحریر تقریر کے لفظ لفظ نہیں، حرف حرف پر اور ہر زیر و بم پر خلوص کا جو حسن، اِیمان ویقین کی جو مہر تابی، دردِ دل کی جو لذّت، انسانوں سے محبت کا جو جمال، اِعلائے کلمۃ اللّٰہ کا جو جلال، صدائے حق کی جو دل نوازی، اور سوزِ دروں کی جو تمازت اور فقرِ غیور وزہدِ پرنور کی، جو جاذبیت وحرارت، میں نے مولانا علی میاںؒ کے ہاں محسوس کی ہے، وہ میرے محدود علم ومطالعے میں، اُن میں سے کسی کے ہاں اِس

(۱) "الدعاء والقدر" مصنفہ سیدہ خیر النساء بہتر والدہ ماجدہ مولانا علی میاں ندویؒ، ص:۲۳ بہ حوالہ "کاروانِ زندگی" ج:۱،ص:۳۲-۳۳۔

بھرپور کیفیت اور طرزِ خاص کے ساتھ، نہیں ملتی۔

میں نے عربی میں ـــــ اور اُن کی عربی اردو دونوں یک ساں طور پر روحانیت اور ایمان ویقین میں ڈھلی ہوئی اور قلب وجگر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہیں ـــــ مولانا کی ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' ''کاروانِ مدینہ'' ''جب ایمان کی بہار آئی'' کو بالخصوص اور اُن کی دیگر کتابوں اور دعوتی وفکری کتابچوں کو بالعموم، ایک سے زائد بار پڑھا ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ بعض دفعہ وفورِ جوش وجذبات کی وجہ سے مجھے ایسا لگا کہ میرا سینہ چاک ہوجائے گا، چناں چہ میں بیٹھا ہوتا، تو کھڑا ہوجاتا اور کھڑا ہوتا تو ٹہلنے لگتا، نہ معلوم کتنی مرتبہ آنکھوں کو غسلِ صحت ملی، اور عصیاں شعار وتوبہ شکن دل پر قلعی ہوئی۔ میرے جیسے سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسے بندگانِ خدا ہوں گے، جنھیں مولاناؒ کی تحریر وتقریر سے اِس مبارک کیفیت کا توشہ ملا ہوگا اور اِن شاء اللہ ملتا رہے گا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ عرب کے بڑے بڑے شاہانِ قلم وزبان، اپنا اپنا تاجِ شہنشاہی، مولانا کے قدموں میں ڈال کر عقیدت کا خراج ادا کرکے، نا قابلِ بیان فرحت وانبساط محسوس کرتے رہے ہیں۔

وہ خلوص کے جادو سے لوگوں کا دل جیت لیتے تھے، مجلسوں اور کانفرنسوں پر چھا جاتے تھے۔ میں نے بعض مرتبہ یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ بعض بڑی کانفرنسوں میں، جہاں دنیائے عرب واسلام کے چیدہ وبرگزیدہ افراد جمع ہوتے تھے اور دردِ دل کے بیان کے لیے، بعض دفعہ الفاظ وتعبیرات کے ذخیرے اُن کا ساتھ نہ دیتے اور وہ اپنی پسند کی کسی بھرپور تعبیر کی تلاش میں اُلجھ جاتے، تب بھی مجمع پر سکینت طاری رہتی اور سارا مجمع اُن کے دل کی جلن کو الفاظ کی چبھن میں محسوس کرتا۔

مولانا علی میاںؒ، ایسے مجمع الکمالات تھے، جن میں سے ہر کمال اِنسان کے بڑا بننے کے لیے کافی ہوتا ہے اور اگر یہ سب کسی میں جمع ہوجائیں، تو مردِ مومن اور اِنسانِ کامل بننے کی ممکنہ صفات وصلاحیتوں کا حامل بن جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے یہ سب کسی

میں جمع ہو جائیں، تو وہ علی میاںؒ تشکیل پاتا ہے۔
برِ صغیر کے، اُن کے ہم عصروں میں بعضوں کو بیرونِ ملک شہرت تو اُن کی ایسی مل گئی؛ لیکن کسی کے ہاں علمی غرور وخود سری تھی، تو کسی میں فکری کجی، چناں چہ کسی کو بھی شہرت وعزت کے افتخار، عمل کی درخشندی سے حرماں نصیبی، توازن کے فقدان اور پھر خلوص، خلقِ خدا کی بے لوث اور بے انتہا محبت کی کمی کی وجہ سے، عظمت ومحبوبیت کا وہ اَعلیٰ واَرفع مقام عطا نہیں ہوا، جو مولاناؒ کا طرۂ امتیاز ہے۔

بے مثال خاک ساری ومنکسر المزاجی

مولانا علی میاںؒ کی یہ بڑائی بھی سبھوں پر بھاری ہے کہ تمام بڑوں کی محبت، عوام وخواص کے اعتقاد، پوری دنیا میں اُن کے ہر آن بڑھتے رہنے والے احترام اور شہرت کے آسمان پر پہنچ جانے کے باوجود، وہ علمی افتخار کا شکار ہوئے نہ زہد وریاضت کے غرور سے شکست کھا سکے؛ بل کہ وہ جیسے جیسے دنیا والوں کی نگاہ میں زیادہ محبوب ہوتے گئے، اُن کی خاک ساری میں ایسا محسوس اِضافہ ہوتا گیا، جسے کور چشموں کو بھی محسوس کرنا پڑا اور جس کی گواہی دنیا کے ہر اُس انسان نے دی، جس کو کسی طور اُن سے سابقہ ہوا۔
علم وفکر کی راہ سے بھی دین کی خدمت اور دعوت کا عمل انجام دیا جا سکتا ہے اور دیا جاتا ہے اور مولانا علی میاں اِس میدان کے بھی کم یاب شہ سوار تھے؛ لیکن بہتوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ علم وقلم کے لیے یک سو ہو جاتے ہیں، اُس کے پیچ وخم میں اِتنے اُلجھے رہتے، مطالعہ ومعلومات کے گرداب میں مسلسل اِس طرح پھنسے رہتے اور لکھنے پڑھنے کی دنیا کی لذّت انگیز وطرب خیز تنہائی اور تصنیف وتالیف کے ''عشرت کدوں'' کی آرام وراحت کے ایسے اسیر ہو جاتے ہیں کہ ملک وملّت کے مسائل، قیادت ودعوت اور اجتماعی خدمت اور اُمت کے درد والم میں شرکت کرنے کی، اُنھیں فرصت نہیں مل پاتی، یا اُس کے لائق ہی نہیں رہ جاتے؛ لیکن مولاناؒ نے علم وقلم کی شہ سواری کے باوصف، دنیا

کے چپے چپے کا جس طرح سفر کیا، ملکوں ملکوں جس طرح گئے، قریہ قریہ اور کو بہ کو جس طرح پھرے، گوشے گوشے میں جس طرح اِیمان ویقین کی صدا لگائی، عرب وعجم کو جس طرح محمدی پیغام کے ذریعے جھنجھوڑا، مغربی تہذیب کی فسوں کاری کا جس طرح پردہ چاک کیا، درد ومحبت کی جس طرح مینھ برسائی، معاشرے کے قلب پر جس طرح دستک دی، اہلِ اسلام کو جس طرح صورتِ خورشید بننے کا درس دیا، ہرنوع کی بولہبیوں کے خلاف جس طرح گرجے برسے اور پنجہ آزمائی کی، باطل کو للکارا، شب پرستوں کو رگیدا، وطن کی خدمت کا حق ادا کیا اور اپنے وطن میں مسلمانوں کے مسائل اور اُنھیں مسلمان جیتے رہنے کے حق کی بحالی کے لیے، جس طرح خداوندانِ حکومت سے پنجہ آزمائی کی، انسانیت اور آدمیت کا جو سبق باشندگانِ وطن کو دیا، تہذیب وتمدن کی جو سوغات اُن میں تقسیم کی ـــــــ اور جس طرح باہمہ و بے ہمہ رہے، اُس کی مثال، اُن لوگوں میں کوئی پیش نہیں کرسکتا، جنھیں ہماری نسل نے دیکھا اور برتا ہے۔

مولانا علی میاںؒ کی خدمت میں راقمِ آثم نے کم وبیش دس سال گزارے، میں نے اُن کے شب وروز دیکھے، اُن میں ظاہر وباطن کی ایسی یکسانیّت دیکھی، جس کا میں نے اِتنے طویل عرصے تک، کسی عالم میں مشاہدہ نہیں کیا؛ کیوں کہ کسی عالم کے ساتھ، اتنے طویل عرصے تک مجھے رہنے کا اِتفاق ہی نہیں ہوا۔

مولانا علی میاںؒ رحم دلی، اُنسیّت اور اِنسانیّت کا پیکرِ مجسّم تھے، ایسا لگتا تھا کہ اُن کا باطن صرف اعلیٰ انسانی صفات سے سنوارا گیا ہے۔ سنگ دلی، سخت گیری، سخت روی اور تلخ گوئی سے وہ نا آشنائے محض تھے۔ حسد، کینہ، بغض، چشمک، نام ونمود کی خواہش اور دوسروں کو دبا کر آگے بڑھ جانے جیسے امراض، جن سے علما کا منزّہ ہونا باعثِ تعجب ہوا کرتا ہے، سے اُن کے خمیر کو کوئی واسطہ نہ تھا۔

وہ خلوص ووفا کی تصویر تھے، اُن کے چہرے بشرے سے معصومیّت اُبلتی تھی، اندر کا فرشتہ صفت انسان باہر بھی جلوہ گر نظر آتا تھا، وہ کسی سے کسی قول وفعل یا کسی جنبش کے

ذریعے، کسی طرح کا اِنتقام لینے کی صلاحیت سے بالکلیّہ عاری تھے۔ اُن کے کسی ہم نشیں یا کسی دوست اور دشمن کو اُن کی طرف سے کسی رویّے کے ذریعے، کسی طرح کی ایذا رسانی کا کوئی خوف دامن گیر نہیں ہوتا تھا۔

اُن کی جلوت وخلوت کا میں باریک بینی سے عرصہ دس سال تک مُشاہِد رہا ہوں، اُنھوں نے — خدا شاہد ہے — ماں کے ایسی شفقت اور باپ کے ایسی مہربانی دی، بہت دفعہ ایسا لگا کہ میں اُن کے دل کے آئینے میں اپنی تصویر مجسم دیکھ رہا ہوں، وہ اپنے کشادہ دل میں لگتا تھا کہ مجھے سمالیں گے۔ میں ایک دور افتادہ، بے مایہ وبے ہنر اِنسان اُن کے ہاں دہلی سے بہ حیثیت مہمان وارد ہوا تھا؛ لیکن اُنھوں نے اپنی گھنیری چھاؤں سے نکلنے نہیں دیا، اپنے پاس روک لیا اور بالآخر مجھے اپنے اِدارے دار العلوم ندوۃ العلما میں مدرس بنالیا۔ یہ داستان بھی بڑی خوب صورت ہے جو دراز نویسی کی مُتَقَاضِی ہے، جس کو میں کسی اور مناسب موقع کے لیے (شاید اپنی خودنوشت کے لیے) اٹھا رکھتا ہوں۔ اُنھوں نے وہاں کی زندگی میں اور وہاں سے آنے کے بعد، دار العلوم ندوۃ العلما کے زمانے میں، میرے وطن ہرپور بیشی، اُدَ رائی، مظفر پور، بہار اور پھر دار العلوم دیو بند میرے آبسنے کے بعد بھی، مجھے موقع بہ موقع بیسیوں مکتوب تحریر فرمائے، جن سے اُن کی شرافتِ نفسی، نجابتِ علمی اور فکری رویّے (کہ انسان کی عام تحریریں، بالخصوص خطوط ومکتوبات اِن سب چیزوں کا بہ طورِ خاص آئینہ دار ہوتے ہیں) کے ساتھ ساتھ، ناچیز کے ساتھ اُن کی بے پناہ محبت، پرخلوص شفقت اور حقیقی پدرانہ سلوک کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ میں طوالت کے خوف سے صرف چند خطوط کے اِندراج پر اِکتفا کرتا ہوں:

اپنی مشہور درسی تالیف ''مختارات'' کی نئی طباعت سے پہلے، مولاناؒ نے اُس پر نظرِ ثانی اور تصحیح کا کام ناچیز کے ذمے فرمایا، اِس ذمے داری کی تکمیل کے بعد راقم نے مولاناؒ کے پاس، اُس کے اغلاط کی فہرست، صفحات اور سطروں کی تعیین کے ساتھ بھیجی، تو

اُنھوں نے اپنے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی سے، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں، راقم کے نام یہ مکتوب اِرسال فرمایا:

عزیز گرامی مولوی نور عالم سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ ''مختارات'' کا صحت نامہ دیکھا، آپ کی تمام تصحیحات سے اتفاق ہے، واقعی "بالشرح الغریب" غلط ہے، "بشرح الغریب" ہونا چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں آپ جیسے لوگ بھی ہیں، جن کی نظر اب ایسی باریک ہوگئی ہے کہ اُن پر تصحیح کے بارے میں اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ آپ کا ترجمہ (۱) ابھی دیکھنا نہیں شروع کیا ہے، اِن شاء اللہ وہ بھی حسب توقع ہوگا۔ محمد میاں (۲) بہت تعریف کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے۔ کسی دن موقع ہو تو ''رائے بریلی'' بھی آجایئے گا۔

والسلام

ابوالحسن علی ندوی

۹/مارچ ۱۹۷۹ء

رمضان ۱۳۹۶ھ/ستمبر ۱۹۷۶ء میں، یہ راقم چھٹی میں اپنے گھر پر تھا، جہاں سے کوئی عریضہ خبر خیریت معلوم کرنے کے لیے، مولاناؒ کو لکھا ہوگا، اس کے جواب میں، آپ نے یہ مکتوب اِرسال فرمایا:

---

(۱) مراد اُن کی تالیف ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' کے عربی ترجمے سے ہے، جو راقم نے "التفسیر السیاسي للإسلام" کے نام سے کیا تھا جو کئی بار ہندوستان اور بیرون ملک چھپ چکا ہے۔

(۲) مولانا محمد الحسنی بن مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی برادر زادۂ اکبر مولانا علی میاںؒ، سابق ایڈیٹر ومؤسس "البعث الإسلامی" عربی ترجمان دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔

رائے بریلی

۲۱؍رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ

عزیزِ گرامی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ ملا، آپ کی بہ خیر رسی کی خبر سے خوشی ہوئی۔ قصبات اور دیہاتوں کا ماحول تقریباً ہر جگہ ویسا ہی ہے، جیسا آپ نے لکھا ہے، اِلاّ ماشاء اللہ؛ لیکن اُن لوگوں کا آپ پر حق ہے: آپ اپنے زمانۂ قیام میں وہاں دعوت وتذکیر کی کوئی ایسی بنیاد ڈال آئیں، جس سے اُن لوگوں کو ہدایت ہو، شاید کچھ لوگ راستے پر لگ جائیں۔ ایک آسان صورت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اپنے بچوں کو دینی مدارس میں بھیجنے پر آمادہ کردیں، شاید اُن میں سے کوئی داعی پیدا ہوجائے۔

خیال تھا کہ ''قصص النّبیین'' کا چوتھا حصہ اِس سال نصاب میں داخل ہوجائے گا؛ لیکن ابھی تک آپ شروع بھی نہیں کرسکے ہیں (۱)۔ اگر آپ شوال میں جلد آجائیں اور آخری شوال تک اُس کی کتابت مکمل ہوجائے تو وہ جلد بلاک سے چھپ سکتا ہے۔

سیرت کے مُبَیَّضے کی ٹائپنگ تیزی سے ہورہی ہے، آپ کی جاں فشانی برابر یاد رہتی ہے (۲)۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا صلہ عطا فرمائے۔ مولانا محمد منظور صاحب سخت علیل ہوگئے ہیں، اُن کی صحت کے لیے دعا فرمائیں۔ اور سب خیریت ہے۔

---

(۱) اُن دنوں راقم دار العلوم ندوۃ العلما میں تدریس کے دوران جہاں دگر تحریری کام کیا کرتا تھا، مولانا کی کئی کتابوں کی خطِ نسخ میں کتابت کی سعادت بھی حاصل کی تھی، خصوصاً ''قصص النبیین للأ طفال'' کے کئی حصے میں نے اپنے قلم سے خوش خط لکھے، جو مکتبہ ندویہ نے شائع کیے، مولانا کے مکتوب میں اُسی کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) اِس کتاب کی تبییض کے لیے مولاناؒ نے ایک ماہ کے لیے راقم کو اپنے وطن تکیہ کلاں، رائے بریلی بلوالیا تھا، الگ سے اسٹو اور چائے کا نظم کردیا تھا، اُنھیں کسی کے ذریعے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ راقم چائے بہت اچھی پیتا ہے، اِسی لیے الگ سے بھائی عبد الرزاق (خادم خاص مولاناؒ) کے ذریعے دودھ، لپٹن گرین لیبل چائے کا پیکٹ ←

والسلام
دعا گو: ابوالحسن علی
۷ر ستمبر ۱۹۷۶ء

رمضان ۱۴۰۲ھ میں راقم کو حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کا خط مِلا کہ ''الداعی'' کی اِدارت اور تدریسی خدمات کے لیے، دار العلوم دیو بند نے تمھیں مُنتخب کرلیا ہے؛ اِس لیے شوال ۱۴۰۲ھ کے نصف سے پہلے تم دار العلوم پہنچ جاؤ۔ دار العلوم سے نا قابل بیان عقیدت و محبت، نیز حضرت الاستاذ کے حکم کی وجہ سے میں دار العلوم نہ آنے اور اُس کے انتخاب کو مسترد کر دینے کی جرأت نہ کرسکا اور ۱۵ر شوال کو میں دار العلوم حاضر ہو گیا؛ لیکن خجالت کی وجہ سے، مولانا علی میاںؒ کو اِس کی اطلاع دینے اور اُن سے اِس حوالے سے مشورہ کرنے کی ہمت جٹا نہیں سکا، مولاناؒ کو جب اِس کا علم ہوا، تو اُنھوں نے یہ مکتوب اِرسال فرمایا، جو اُن کی غیر معمولی کریم النفسی اور وسعتِ ظرفی کی غماز ہے:

عزیزِ گرامی قدر سلمہ اللہ تعالیٰ و بارک فیہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج ۱۰ر ذی قعدہ کو، آپ کا ۲ر ذی قعدہ کا لکھا ہوا خط، عین حالتِ انتظار و اشتیاق میں ملا۔ میں کئی روز سے آپ کو خود خط لکھنا چاہتا تھا؛ مگر تردّد تھا کہ کہاں لکھوں؟ مجھے مجلسِ شوریٰ ہی میں اِس پیش کش کا علم ہو گیا تھا اور میں نے ذمّے داروں کے پوچھنے پر کہا تھا کہ ہمارے یہاں مولوی سعید الرحمٰن، رابع اور واضح (۱) کے بعد اُنھی کا درجہ ہے اور وہاں

← میرے لیے منگوا کے مہمان خانے کے ایک کمرے میں رکھوا دیا تھا اور میری دلجوئی کے لیے، ناشتے کے دو ایک گھنٹے کے بعد فرماتے: مولوی نور صاحب! آپ کی چائے نہیں بنی، ورنہ میں بھی پیتا، ایسا اِس لیے فرماتے کہ میں ضرور چائے کی اپنی خواہش کو تسکین دوں۔ اللہ اُن کی اِس انسان نوازی کا بھرپور بدلہ اُنھیں عطا فرمائے۔

(۱) مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی حال مہتمم دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ و چیف ایڈیٹر رسالہ ''البعث الإسلامي'' عربی۔ مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ہمشیرہ زادہ مولانا علی میاںؒ، حال ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔ مولانا واضح رشید ندوی برادر خرد مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ایڈیٹر ''البعث الإسلامي'' و ''الرائد'' و اُستاذ و معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلما۔

بھی مولوی وحید الزماں کے بعد وہ سب پر فائق ہیں؛ لیکن تعلق کی بنا پر مجھے ہلکی سی شکایت پیدا ہوئی تھی کہ سارا معاملہ بالا ہی بالا طے ہوگیا اور مجھے بعد میں خبر ہوئی؛ لیکن آپ کی مجبوریاں میرے پیشِ نظر تھیں؛ اِس لیے میں نے آپ کی طرف سے خود ہی معذرت کرلی۔ آپ کے خط نے اُس اثر کو زائل کردیا اور میری شکایت جاتی رہی۔

مولوی تقی عثمانی صاحب کی کتاب پر، جس کا آپ نے ترجمہ کیا ہے (۱)، میں نے مقدمہ لکھ دیا ہے، ایک نقل اُن کو بھیج دی ہے، ایک نقل آپ کے دیکھنے کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ آپ اِن شاء اللہ دیکھ کر خوش ہوں گے، مبسوط مقدمہ آ گیا ہے۔ اِس وقت اِسی پر اکتفا کرتا ہوں؛ تاکہ جلد آپ کو خط مل جائے۔

والسلام

دعا گو: ابوالحسن علی

۱۰/ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کا قیام جب دیوبند کے ''گدّی واڑہ'' محلّے میں تھا، تو وہاں کی قدیم بوسیدہ مسجد کو، جس میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی پنج وقتہ نمازیں ادا فرمایا کرتے تھے، شہید کر کے ازسرِ نو تعمیر کرنے کی سوچی، اُنھی دنوں حضرت کے علم میں آیا کہ ''رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ'' کی طرف سے کوئی رقم مسجد وغیرہ کی تعمیر کے لیے سعودی سفارت خانے نئی دہلی میں آئی ہوئی ہے، اگر مولانا علی میاںؒ سفارش فرمادیں گے، تو اِس مسجد کی ضرورت کے مطابق، اس میں سے مدد مل سکتی ہے، اِس سلسلے میں حضرت نے مجھے واسطہ بنایا کہ تمھارا مولاناؒ سے گہرا تعلق ہے، تم اِس سلسلے میں اُن سے کہو، میں نے اِس کے لیے عریضہ لکھا تو مولاناؒ کا یہ جواب موصول ہوا:

---

(۱) مراد ''عیسائیت کیا ہے؟'' سے ہے، جس کا ترجمہ راقم نے ''ماهي المسيحية؟'' کے نام سے کیا تھا۔

۱۴/۱۲/۱۹۸۲ء

عزیزِ مکرم سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ عنایت نامہ ۱۱/دسمبر ۱۹۸۲ء وقت پر مل گیا، اس کے بعد متصلاً مولانا وحید الزماں صاحب کے بھیجے ہوئے مولوی صاحب پہنچے، اُن کو "رابع" کے پاس بھیج دیا؛ تاکہ وہ اُن کو طریقۂ کار بتادیں۔ اِن شاء اللہ اگر رابطہ کی طرف سے دریافت کیا گیا، تو تصدیق وتزکیے کے الفاظ لکھ دیے جائیں گے۔

ہمارا خط مولانا کے نام بہ راہِ راست نہیں پہنچتا؛ اِس لیے آپ کی وساطت سے یہ خط لکھتا ہوں۔ میرا سلام بھی پہنچا دیجیے اور یادآوری کا شکریہ۔

میں ۲۳/دسمبر سے ۱۵/جنوری تک باہر رہوں گا، آپ کی کام یابی اور سکونِ خاطر کے ساتھ کام کرنے کی دعا کرتا ہوں۔

والسلام

دعا گو: ابوالحسن علی

دیوبند آنے کے بعد، راقم کی اِس خواہش میں اِضافہ ہوتا گیا کہ مولانا کی عام تحریروں اور علمی وفکری ودعوتی نگارشات سے فائدہ اٹھایا جائے؛ کیوں کہ دوری کے بعد قرب واتصال کا یہی بہترین ذریعہ تھا۔ ایک عریضے میں، راقم نے مولاناؒ سے، اُن کی بعض تازہ شائع شدہ کتابوں کی خواہش ظاہر کی، تو آپ نے اُس کے جواب میں لکھا:

عزیزِ مکرم! حفظہ اللہ ورعاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۲۳/اکتوبر ۱۹۸۴ء کا خط مل گیا تھا؛ مگر میں دو ہفتے ایسی بحرانی کیفیت میں رہا کہ ڈاک بھی نہیں پڑھ سکا۔ آپ کی یاد آتی ہے، ۲۰/نومبر کو دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ لکھنؤ میں ہے، اگر اُس سے پہلے کوئی جانے والا ملا تو حصۂ پنجم (۱) مولانا سعید احمد اکبرآبادی یا مولانا

(۱) مراد تاریخِ دعوت وعزیمت کا حصۂ پنجم ہے۔

مرغوب الرحمٰن کے حوالے کردوں گا۔ اگر ممکن ہوا تو ''کاروانِ زندگی'' کی دوسری جلد بھی اور ''تاریخ ندوۃ العلما'' بھی۔ وطن جاتے ہوئے کبھی دو ایک دن کے لیے راستے میں اُتر جایا کیجیے۔ ''رسائل الأعلام'' کے نام سے ستّر خطوط کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے، جو مشاہیر عالم عربی کے ہمارے نام ہیں۔ آپ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اِس وقت اِسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

والسلام

مخلص: ابوالحسن علی

۶/۱۱/۱۹۸۴ء

اکتوبر ۱۹۸۶ء کے اواخر میں دارالعلوم دیوبند میں پہلی عالمی ختم نبوت کانفرنس ہوئی، جس میں مولاناؒ نے شرکت فرمائی اور قادیانیت کے موضوع پر انتہائی پرمغز تقریر کی، جس کا عربی ترجمہ راقم نے ''الداعی'' میں شائع کیا، جب یہ شمارہ مولاناؒ کو موصول ہوا، تو اُس میں اپنی تقریر کا عربی ترجمہ اچانک دیکھ کر، اُنھیں بے حد خوشی ہوئی اور اُنھوں نے ناچیز کو یہ شفقت بھرا خط لکھا:

دہلی

۸/ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

عزیز گرامی! زید توفیقہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ آپ بہ خیریت ہوں گے، اکتوبر کی آخری تاریخوں میں مجلس شوریٰ اور قادیانیت کے بارے میں مؤتمر کے انعقاد کے موقع پر، دیوبند جانا ہوا تھا اور دو دن رہنا ہوا تھا؛ مگر اتفاق سے آپ دہلی گئے ہوئے تھے، آپ سے ملاقات نہ ہو سکی، آپ کا سلام پہنچا تھا۔ اب ''الداعی'' کا تازہ پرچہ دیکھ کر آپ کو خط لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی، ہم سمجھتے تھے کہ ہماری تقریر بالکل نظر انداز کر دی گئی، ''آئینۂ دارالعلوم'' میں بھی محض ایک

اِشارہ تھا، یہ بھی اطمینان نہیں تھا کہ اُس کا کیسٹ محفوظ ہے؛ لیکن ''الداعی'' کا یہ پرچہ پڑھ کی بہت خوشی ہوئی، آپ نے حسبِ توقع اور حسبِ سابق اُس کا بہت کام یاب اور شیریں ترجمہ کیا ہے اور پوری تقریر اپنی صحیح روح اور طاقت کے ساتھ عربی میں آگئی ہے، ہم نے اس کو دیکھنا شروع کر دیا ہے، جہاں کسی اِجمال کی قدرے تفصیل یا مغربی فضلا کے اعتراف وشہادت کی اصل عبارتوں کے نقل کرنے کی ضرورت تھی اور ارتجالی تقریر میں اپنے الفاظ کے ساتھ نہیں کی جاسکتی تھی، اُن کو اُن کے اصل ماخذ سے نقل کر کے، اس میں اِضافہ کر رہے ہیں، اِن شاء اللہ تکمیل کے بعد وہ مستقلاً رسالہ کی شکل میں مجلس کی طرف سے شائع ہو جائے گی اور مترجم اور ناقل کی حیثیت سے آپ کا نام ہوگا۔ امید ہے کہ آپ اِس کو پسند کریں گے اور اِس کی اجازت دیں گے۔ اب آپ کو یہ تکلیف دینا ہے کہ اردو کا کیسٹ یا تو آپ محفوظ طریقے پر رابع سلمہ یا مولوی سعید الرحمٰن وغیرہ کو بھجوا دیں یا اُس کو تحریر میں منتقل کروا کے بھجوا دیں؛ اِس لیے کہ ہمارے پاس اُس تقریر کا کوئی کیسٹ نہیں ہے؛ اِس لیے آپ کو زحمت دے رہے ہیں۔
آج ہی ہم بمبئی روانہ ہو رہے ہیں، ۲۰-۲۵ ردسمبر تک اِن شاء اللہ واپسی ہوگی، اگر آپ بمبئی کے پتے پر جواب دینا چاہیں تو وہ یہ ہے:

معرفت حاجی غلام محمد صاحب

Bombay Andhra Transport

113, Bhandari street, Bombay-3

والسلام

مخلص: ابوالحسن علی

۱۱ردسمبر ۱۹۸۶ء

راقم نے مولانا کی خواہش کے مطابق اردو تقریر کو قلم بند کر کے بھیجا اور ساتھ ہی

کیسٹ بھی بھیج دی، تو آپ نے یہ مکتوب اِرسال فرمایا:

۲/۱/۱۹۸۷ء

عزیز گرامی قدر! زید توفیقہ وسعادتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کی پہلی توجہ وعنایت کا شکریہ ادا نہیں کرسکا تھا کہ اردو تقریر قلم بند کی ہوئی اور کیسٹ مل گئے۔ میں نے نظرِ ثانی کرلی، آپ کی محنت کی داد دی۔ ''تعمیر حیات'' میں بھی شائع ہوگی اور مجلس کی طرف سے علاحدہ بھی۔ عربی تقریر نظرِ ثانی کے بعد ٹائپ کرواکر ''المجتمع'' کویت کو بھیج رہا ہوں، مجلس کی طرف سے بھی اِن شاء اللہ شائع ہوگی۔ مجلس کو ہدایت کردوں گا کہ کوئی جانے والا ہو، تو آپ کو بھیج دیں۔ ''المسلمون في الهند'' کا نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔

والسلام

ابوالحسن علی

دیوبند میں مجھے ایک مرتبہ مولاناؒ کی شدید علالت کا علم ہوا، تو میں نے اُنھیں دریافت حال اور مزاج پرسی کے لیے خط لکھا، تو آپ نے بمبئی سے یہ شفقت نامہ اِرسال فرمایا:

بمبئی

عزیز گرامی قدر مولوی نور عالم خلیل الامینی صاحب/ حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۹/ ذی قعدہ کا لکھا ہوا خط لکھنؤ اُس وقت ملا جب میں دہلی بمبئی کے لیے پا بہ رکاب تھا۔ ۲۰/ رمضان المبارک سے علالت کا سلسلہ ہے، خون کی بہت کمی بتائی جاتی ہے اور ضعف بہت زیادہ ہے اور بھی شکایات ہیں۔ آپ کے فکر وتردّد اور احوال پرسی سے مسرّت اور تقویت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وقوت عطا فرمائے اور تادیر آپ سے علمی ودینی خدمت کا کام لے۔ کل ہی بمبئی پہنچا ہوں۔ دو ہفتے کے قریب قیام کا

اِرادہ ہے۔ خدا کرے یہ قیام راس آئے اور یہاں سے بہتر حالت میں اپنے مستقر پر واپسی ہو۔

والسلام

دعا گو و دعا جو

ابوالحسن علی

۲۰/ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ

مولاناؒ کے کسی قریبی عزیز کے انتقال کی اطّلاع ملی، تو راقم نے اُنھیں تعزیتی خط لکھا اور غم غلط کرنے کے لیے جو سمجھ میں آیا وہ لکھا، تو مولاناؒ نے مندرجۂ ذیل والا نامہ اِرسال فرمایا:

۲۸/جمادی الاولی ۱۴۱۰ھ

محبِّ عزیز و مکرم مولوی نور عالم صاحب امینی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا تعزیت نامہ مؤرخہ ۲۲/جمادی الاولیٰ کل ہی پرسوں پہنچا، جو عین توقع کے مطابق تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزاے خیر دے۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کا گرامی نامہ بھی ملا، میں نے اُن کو شکریہ اور مزاج پرسی کا خط لکھا ہے، آپ بھی دعاے مغفرت اور بہ آسانی جو کچھ ایصالِ ثواب ہو سکے کریں۔

اِس سے خوشی ہوئی کہ آپ کو ہمارے دونوں رسالے مل گئے۔ "في مسيرة الحياة" کی دوسری جلد بیروت میں تقریباً مکمل ہوگئی ہے؛ مگر وہاں کے حالات ایسے ہیں کہ ابھی وہ ناشر کے پاس نہیں پہنچی ہوگی، اِن شاء اللہ آئے گی، تو ایک نسخہ آپ کو ضرور بھیجا جائے گا۔

دعا ہے کہ آپ کے پاؤں کی تکلیف ٹھیک ہو جائے اور کوئی پیچیدگی اور طوالت نہ پیدا ہو۔ واقعی آپ سے عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی، کبھی کبھی دو

چار دن کے لیے اِدھر آجایا کیجیے۔

والسلام
دعا گو محتاجِ دعا
ابوالحسن علی ندوی
۲۸؍دسمبر ۱۹۸۹ء

مولاناؒ نے اپنا رسالہ "ترشيد الصحوة الإسلامية" بھیجا، راقم نے اُس کی رسید اِرسال کی، تو اُن کا یہ جواب مرحمت ہوا:

لکھنؤ: ۱۶؍شعبان ۱۴۱۱ھ

محبّ عزیز و مکرم! زید توفیقہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کا ۲۲؍فروری کا خط عین حالتِ انتظار؛ بل کہ اشتیاق میں ملا، مجھے رسالے کے پہنچنے کی اطلاع کا انتظار تھا اور آپ کے تأثر کا، خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ مزید چند عربی، اردو کے رسائل اور کتابچے بھیجوا رہا ہوں، ایک نئی کتاب "قصص من التاريخ الإسلامي" بھی بھیجی جا رہی ہے، امید ہے کہ آپ پسند کریں گے۔

مسئلہ معلوم میں (۱) "الداعی" آپ کی اِدارت میں جو کردار ادا کر رہا ہے، اس سے بڑی خوشی اور اطمینان ہے۔ امید ہے کہ آپ کے مضامین اور تحریریں، ملک کے دینی اور تعلیمی حلقے میں چشم کشا ثابت ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سمجھا جاتا کہ یہ تنہا ندوہ کے لوگوں کا تفرّد اور "بدعت" ہے۔

۳؍مارچ کو اِس سلسلے میں "جمعية المثقفين المسلمين" کی طرف سے جو جلسہ ہوا، اُس کی روداد اور ہماری تقریر کا خلاصہ ۴؍مارچ کے

(۱) اِشارہ خلیج کے اُس بحران کی طرف ہے، جو عراق کے کویت پر حملے اور قبضے سے پیدا ہوا تھا اور پھر اُس کے بہانے امریکہ نے خلیجی خطوں میں اپنی عسکری و اقتصادی موجودگی کو یقینی اور پایدار بنالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا کھیل از اول تا آخر امریکہ ہی نے کھیلا اور کھیل رہا ہے۔

''قومی آواز'' میں شائع ہوا ہے، اس کو ضرور پڑھیے گا، اُس میں آپ کو بہت توارد بھی محسوس ہوگا۔

عرصے سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ افسوس ہے کہ میں اپنی علالت اور نقل وحرکت کی معذوری کی بنا پر شوریٰ کے جلسے میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ امید ہے کہ آپ ہر طرح بہ عافیت ہوں گے۔

والسلام
ابوالحسن علی

انسان مگر فرشتہ

مولانا علی میاں بہ ہر کیف بشر تھے جس سے غلطی اور بھول چوک کا اِمکان بہ ہر کیف باقی رہتا ہے؛ لیکن بشر کی شکل میں فرشتہ ہونے کی زیادہ سے زیادہ خوبی میں نے اُنھی میں دیکھی ہے۔ اُن کی معصومیت کی قسم تو نہیں کھائی جاسکتی؛ لیکن جن بزرگوں کو میں نے دیکھا یا برتا ہے (اُن سب کے احترام اور اُن کے لیے دعاے خیر کے باوجود) میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ انسانیت وشرافت، مروّت واُنسیت، توازن وفروتنی، سادگی وبےنفسی، دنیا کے مال ومنال سے بےرغبتی اور بڑی سے بڑی قیمت پر نہ بکنے کی صفت میں، اُن سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ میں نے کم وبیش ۱۰ سال کی مدت مولاناؒ کی خدمت اور ندوۃ العلما کی تدریس میں گزارا ہے، جس کا شاید آدھا حصہ مولاناؒ کے ساتھ، مولاناؒ کے پاس اور اُن کی خدمت میں گزارا ہے، اُن کے تصنیفی وتالیفی کام میں اُن کا ہاتھ بٹانے کی سعادت سے بہرہ ور رہا ہوں، اُنھوں نے کبھی کسی کام کو کیوں کیا؟ کیوں نہیں کیا؟ نہیں کہا، وہ اپنی موہنی صورت، اداے دل نوازی، شیریں گفتاری، نرم خوئی ودل جوئی سے، دل میں گھر کر جاتے تھے، وہ ہر طرح سے صرف انسان لگتے تھے، کروفر، شان وشوک اور ٹیپ ٹاپ سے اُن کی ذات، اُن کا آشیانہ، اُن کا خورونوش، اُن

کی زندگی کا ہر لمحہ بالکل مُبرّ ا تھا۔ وہاں دربانوں کا ہجوم تھا نہ پہرہ داروں کی سختی، نہ خُدّ امانِ جفا کیش کی دھر پکڑ۔

بعض ایسے محرومِ توفیق وسعادت لوگ بھی نظر آئے (اور کیوں نہ نظر آتے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کے ناقدین ومعاندین بھی تو اِسی زمین پر بستے ہیں، تو انسان چاہے جتنا بڑا ہو جائے وہ حرف گیری کرنے والوں کی زد سے نہیں بچ سکتا کہ بھنگیوں کی نظر صرف گندگیوں کی تلاش میں رہتی ہے) جو مولانا علی میاںؒ کی سلامت روی اور توازن واعتدال کو، اُن کی کم زوری گردانتے تھے؛ بل کہ مداہنت سے تعبیر کرتے تھے، کہ وہ کسی مسئلے میں صاف لفظوں میں دوٹوک رائے قائم نہیں کرتے؛ لیکن اُنھیں کیا معلوم کہ یہ مولانا کی کم زوری نہیں؛ بل کہ بہت بڑی خوبی تھی۔ وہ مخالف سے مخالف فرد اور جماعت کے لیے، زبان اور قلم کو آخری حد تک جانے دینا تو درکنار، کسی طرح کی آلودگی سے ہمیشہ پاک رکھتے تھے۔ اُن کی خوبی تھی کہ وہ دل خراش اور مروت کو جراحت پہنچانے والے کسی بھی حرف وصوت سے بہ ہر حال گریزاں رہے؛ اِسی وجہ سے مخالف وموافق دونوں قسم کے لوگ ملکی وملی مسائل میں، اُن پر حد درجہ متفق تھے، مسلم وغیر مسلم دونوں ہی اُن کی عظمت کا دم بھرتے تھے، صلح جوئی اور نرم روی، اُن کا سب سے بڑا ہتھیار تھی، اُنھوں نے قلم وزبان سے اشتعال انگیز کوئی بات لکھی نہ کہی؛ اِسی لیے ہر طبقے اور ہر مذہب ورجحان کے لوگوں کے نزدیک وہ غیر معمولی طور پر مُتفق علیہ تھے۔

ہر پڑھا لکھا شہرت وعظمت واحترام کا خواہاں تو ہوتا ہے؛ لیکن وہ اُس کردار وسلوک پر کاربند نہیں ہو پاتا، جو مولانا علی میاںؒ کو ہر دل عزیزی دے گیا۔(*)

(*) اصل تحریر درعربی شائع شدہ ''الداعی'' خصوصی شمارہ بر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: ۱۱-۱۲، جلد ۲۳: ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ مطابق فروری - مارچ ۲۰۰۰ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود، شائع شدہ پندرہ روزہ تعمیر حیات دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ، ۱۰ر جنوری ۲۰۰۱ء۔

سوانحی نقوش

❁ **اسم گرامی:** علی ابوالحسن بن عبدالحی بن فخرالدین الحسنی۔ سلسلۂ نسب عبداللہ الاشتر بن محمد ذوالنفس الزکیۃ بن عبداللہ المحض بن الحسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے جاملتا ہے۔

❁ **تاریخ پیدائش:** ۶ر محرم ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ر دسمبر ۱۹۱۳ء۔

❁ **جائے پیدائش ووطن:** دائرۂ شاہ علم اللہ الحسنی معروف بہ تکیہ کلاں جو رائے بریلی کے مغربی جانب ایک مضافاتی گاؤں ہے۔

❁ **تعلیم وتربیت**

قرآنِ پاک ناظرہ اور اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنی والدہ صاحبہ کی نگرانی میں پڑھیں، جس وقت اُن کے والدِ محترم مؤرخ ومصنف مولانا عبدالحیؒ کا ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا، تو وہ نو سال کے تھے؛ اِس لیے اُن کی تمام تر تعلیم وتربیت اُن کی والدہ محترمہ اور اُن کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی سرپرستی میں انجام پائی، جو اُن سے عمر میں بیس سال بڑے تھے۔ تعلیم کے دوران مولانا نے حدیث، تفسیر اور ادب کے علوم کی تحصیل میں خصوصی دل چسپی لی۔ عربی ادب میں اُن کے دو اہم استاذ رہے تھے: ایک شیخ خلیل بن محمد انصاری یمانی دوسرے شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی۔ اردو ادب میں مولانا نے اپنے خاندان کے بعض محترم عزیزوں بالخصوص مولانا ابوالخیر صاحب برقؒ سے استفادہ کیا۔ ۱۹۲۷ء میں وہ لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبۂ عربی میں داخل ہوئے اور عربی زبان وادب میں فاضلِ ادب کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۸ء--۱۹۳۰ء کے عرصے میں اُنھوں نے انگریزی زبان کی استعداد بہم پہنچائی۔ ۱۹۲۹ء/ ۱۳۴۷ھ میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخل ہوئے اور مختلف علوم وفنون کی تحصیل کے مراحل طے کیے۔ حدیث شریف کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی سے حاصل کی۔ ۱۹۳۲ء/ ۱۳۵۱ھ میں اُنھوں نے مزید استفادے کے لیے کئی ماہ دارالعلوم دیوبند میں قیام فرمایا اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھیں، اُنھوں نے اِس موقعے سے فقہ میں شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علیؒ سے استفادہ کیا اور حفص کی روایت کے مطابق قاری اصغر علیؒ سے فنِ تجوید میں فائدہ اٹھایا، تفسیر اُنھوں نے اپنے عہد کے مشہور صاحبِ طرز استاذِ تفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے لاہور جاکر پڑھی۔

۞ عملی اور دعوتی زندگی

۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلما میں تفسیر وحدیث اور ادبِ عربی کے استاذ منتخب ہوئے۔ ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں اُنھوں نے پورے برّصغیر کا دورہ کیا اور اسلام کی دعوت اور اسلام کے فروغ کے سلسلے میں کام کرنے والوں کے متعلق معلومات حاصل کیں، اِس کی روشنی میں دعوتی و دینی مقصد کے لیے کام کرنے کی راہ منتخب کی۔ اِس سلسلے میں جہاں دین کے مختلف داعیوں اور مربّیوں سے ملاقات ہوئی، وہیں وقت کے اسلامی الفکر شاعر ڈاکٹر محمد اقبال سے بھی ہوئی۔ اُنھوں نے حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے ملاقات کی اور اصلاحِ باطن اور تزکیۂ نفس کے لیے، اُن سے خصوصی تعلق پیدا کیا، اِسی کے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریکِ دعوت واصلاح کو قریب سے سمجھنے کا اُنھیں موقع ملا، اُنھوں نے اِس تحریک کی اہمیت کو گہرائی سے محسوس کیا اور اُس میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ اِس کے نتیجے میں مولانا محمد الیاسؒ کی خصوصی توجہات اُنھیں حاصل ہوئیں، نیز جلیل القدر عالم وشیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے، عنفوانِ شباب سے ہی تعلق قائم ہوگیا، جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا، مولانا نے اُنھیں اپنے مربی اور سرپرست کی حیثیت میں رکھا۔

۞ وفات

اپنے وطن تکیہ کلاں، رائے بریلی میں، بہ روز جمعہ ۱۱ر بج کر ۵۵ منٹ پر بہ تاریخ ۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ = ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء اُنھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ تدفین در اِحاطۂ خاص برائے تدفین اہل خاندان نزد مسجد، جانب مشرق، تکیہ کلاں، رائے بریلی۔

۞ اہم تالیفات

اُن کی چھوٹی بڑی عربی تالیفات کی تعداد ۱۹۹ اور چھوٹی بڑی اردو تصنیفات کی تعداد ۳۰۴ ہے۔ اُن کی مشہور عربی تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" ہے جو ۱۹۴۹ء میں مصر کے ایک موقر ادارے کی طرف سے شائع ہوئی اور بے پناہ مقبول ہوئی، یہ اہم علمی کام اُنھوں نے اُس وقت انجام دیا جب اُن کی عمر صرف ۳۲-۳۳ سال کی تھی۔ یہ کتاب بالخصوص عربوں کے لیے، اتنی مؤثر اور مقبول ثابت ہوئی کہ عربوں نے اِسے بیسویں صدی کی ممتاز ترین تصنیفات میں سے ایک شمار کیا، چناں چہ کوئی اسلام پسند عربی، طالبِ علم سے لے کر استاذ کے طبقے تک، ایسا نہیں رہا جس نے کتاب کو

پڑھا نہ ہو اور اُس کی اہمیت کو محسوس نہ کیا ہو۔ مولانا کی بعد میں یکے بعد دیگرے بہت سی کتابیں اردو اور عربی نیز انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہوئیں؛ لیکن عالمِ عربی میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم یہی کتاب اُن کی اصل شناخت ثابت ہوئی۔ اُن کی دیگر مشہور عربی تالیفات یہ ہیں: رجال الفكر والدعوة في الإسلام، النبوة والأنبياء في ضوء القرآن، الصِّراعُ بين الفكرة الإسلامية والفكرة الغربيّة في الأقطار الإسلاميّة، الأركان الأربعة، مختارات من أدب العرب، قصص النبيين للأطفال، القراء ة الراشدة، السِّيرة النبوية، روائع إقبال، الصِّراع بين الإيمان والمادّيّة.

مشہور اردو تالیفات

سرت سید احمد شہید، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، نبی رحمت، کاروانِ مدینہ، منصبِ نبوت اور اُس کے عالی مقام حاملین، المرتضی، تاریخِ دعوت وعزیمت، مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت، مکتوبات مولانا محمد الیاسؒ، حیاتِ عبدالحیؒ، سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری، سوانح مولانا محمد زکریا کاندھلوی، کاروانِ زندگی جس کا "في مسيرة الحياة" کے نام سے عربی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، پرانے چراغ، نقوشِ اقبال، ارکانِ اربعہ، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیّت کی کش مکش، قادیانیت: تحلیل وتجزیہ، عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح جس کا عربی ترجمہ "التفسير السياسي للإسلام" کے نام سے راقم الحروف نے کیا تھا جو بار بار شائع ہوتا رہا ہے، معرکۂ ایمان و مادّیت۔

اسفار

مولانا نے پہلا سفرِ حج ۱۹۴۷ء میں دوسرا ۱۹۵۰ء میں کیا، جس میں کئی ماہ صرف ہوئے اور اُنھوں نے اِس موقع سے نہ صرف سعودی عربیہ؛ بل کہ مصر، سوڈان، شام، قُدس اور اُردن وغیرہ کا بھی دورہ کیا اور وہاں کے اہم علما، مفکرین، ادبا اور صحافت کے پیشے سے وابستہ افراد، نیز معاشرے کے مختلف سربرآوردہ لوگوں سے ملاقات کی۔

۱۹۴۸ء میں اُنھوں نے شام کا دورہ کیا اور وہاں ۴۸ دن قیام رہا، جس کے دوران اُنھوں نے دمشق یونی ورسٹی میں "شهادت العلم والتاريخ في قضية فلسطين" کے عنوان سے محاضرے پیش کیے، اِس دوران اُنھوں نے حمص، حماۃ، معرۃ النعمان اور حلب جیسے شہروں کا دورہ کیا اور وہاں کے چوٹی کے علما اور مفکرین سے اسلامی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ فلسطین کا دورہ کیا، مسجد اقصیٰ کی زیارت کی اور وہاں رمضان کے آخری دن گزارے اور وہیں عید الفطر کی نماز ادا کی نیز شہر "الخلیل"، بیت اللحم وغیرہ کا

دورہ کیا۔۱۹۵۶ء میں دوبارہ شام تشریف لے گئے اور دمشق یونی ورسٹی کے شریعت کالج میں ۳ ماہ کے قیام کے دوران "رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام" کے موضوع پر لکچرس دیے، اِسی سفر میں اُنھوں نے لبنان، بیروت، اور طرابلس کا دورہ کیا، تیز ترکی بھی تشریف لے گئے، جہاں دو ہفتے قیام رہا۔ اِس کے بعد ۱۹۶۴ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۹ء، ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۶ء میں بھی رابطہ ادبِ اسلامی کی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہاں جانا ہوا، کویت کا سب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں سفر ہوا، پھر ۱۹۶۸ء، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء میں بھی جانا ہوا، عرب امارات پہلی بار شارقہ کے امیر سلطان بن محمد القاسمی کی دعوت پر ۱۹۷۴ء میں تشریف لے گئے، پھر ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۳ء، ۱۹۸۸ء، اور ۱۹۹۳ء میں بھی وہاں کا سفر ہوا، ۱۹۹۰ء میں سیرت نبوی کانفرنس میں شرکت کے لیے قطر جانا ہوا، ۱۹۷۳ء میں رابطہ عالمِ اسلامی کے ایک وفد کی سربراہی کرتے ہوئے افغانستان، ایران، لبنان اور عراق، (جہاں پہلی بار ۱۹۵۶ء میں جانا ہوا تھا) سیریا اور اُردن وغیرہ کا دورہ کیا، ۱۹۸۴ء میں اُردن کے آلِ بیت ادارے کی دعوت پر وہاں جانا ہوا، جہاں کئی محاضرے اور تقریریں ہوئیں۔ ۱۹۷۶ء میں "رابطة الجامعات الإسلامية" کی دعوت پر مغربِ اقصیٰ کا سفر ہوا، جب کہ ۱۹۸۲ء نیز ۱۹۸۶ء میں "ملتقى الفكر الإسلامي" میں شرکت کے لیے الجزائر جانا ہوا۔ ۱۹۶۰ء میں برما کا سفر ہوا، اور ۱۹۶۴ء نیز ۱۹۸۸ء، ۱۹۸۶ء، میں کئی بار پاکستان کا سفر ہوا، ۱۹۸۲ء میں سری لنکا اور ۱۹۸۴ء میں بنگلا دیش کا سفر ہوا، ۱۹۶۲ء میں پہلی بار یورپ کا سفر ہوا جس میں جنیوا، لوزان، برن، پیرس، لندن، کیمبرج، آکسفورڈ، گلاسکو، ایڈمبرا وغیرہ کا دورہ ہوا، جہاں فضلاے عرب اور چوٹی کے مستشرقین سے ملاقاتیں ہوئیں اِسی سفر میں مڈریڈ یونیورسٹی میں لکچر دیا نیز طلیطلہ، اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ جیسے اسپین کے اہم شہروں کا دورہ کیا، ۱۹۶۴ء میں دوسری مرتبہ یورپ کا سفر ہوا جس کے دوران آپ نے لندن، برلین، آخن، میونخ، اور بون جیسے شہروں کا دورہ کیا۔

تیسری مرتبہ ۱۹۶۹ء میں یورپ کا دورہ ہوا، جس کے دوران جنیوا اور لندن جانا ہوا، نیز برمنگھم، مانچیسٹر، بلیک برن، ڈیوز بری، لیڈیز، گلاسکو، وغیرہ کا دورہ کیا اور وہاں تقریریں اور ملاقاتیں ہوئیں۔ چوتھی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں آکسفورڈ سینٹر براے اسلامک اسٹڈیز کی تاسیس کے موقع سے لندن جانا ہوا، ۱۹۸۵ء میں بلجیکا کا دورہ ہوا اور ۱۹۷۷ء میں امریکہ اور کناڈا کا سفر ہوا اِس موقع سے نیویارک، شکاگو، جرسی سٹی، فلاڈلفیا، بالٹی مور، لوس انجلوس، ٹورنٹو، واشنگٹن، بوسٹن، انڈیاناپولس، سالٹ لیک سٹی، سان فرانسیسکو، مین ہاٹن، مونٹرپال، ڈٹرائٹ وغیرہ کا دورہ بھی ہوا اور وہاں کی یونی ورسٹیوں میں تقریریں ہوئیں۔

۱۹۹۳ء میں دوبارہ امریکہ کا سفر ہوا۔ ۱۹۸۷ء میں ملیشیا کا سفر ہوا اور وہاں کے مختلف شہروں اور اطراف واکناف میں بڑے بڑے جلسوں اور سیمیناروں کو خطاب کیا۔ ۱۹۹۳ء میں تاشقند، سمرقند، خرتنک اور بخارا کا سفر ہوا۔ برصغیر کا تو شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شہر اور قصبہ ایسا ہوگا، جہاں کا مولانا نے دینی

ودعوتی سرگرمیوں کے لیے بار بار سفر نہ کیا ہوگا۔

مناصب، عہدے اور اِعزازات

- ناظم ندوۃ العلما
- رکن تاسیسی رابطہ عالمِ اسلامی، مکہ مکرمہ
- رکن مجلسِ اعلیٰ عالمی برائے اسلامی دعوت، قاہرہ
- صدر و مؤسس عالمی رابطہ ادبِ اسلامی
- صدر مجلسِ علمی، لکھنؤ
- صدر دینی تعلیمی کونسل، اتر پردیش
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر دارالمصنّفین اکیڈمی، اعظم گڑھ
- صدر آکسفورڈ سینٹر برائے اسلامک اسٹڈیز
- رکن مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- رکن رابطۃ الجامعات الاسلامیۃ، رباط، مراکش
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ عالمیہ، اسلام آباد، پاکستان
- رکن مجمع اللغۃ العربیۃ، دمشق
- رکن مجمع اللغۃ العربیۃ، قاہرہ
- رکن مجمع اللغۃ العربیۃ، اردن
- رکن شاہی اکیڈمی برائے تحقیقاتِ تہذیب اسلامی، ادارہ آلِ بیت اردن
- کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری برائے لٹریچر س۱۹۸۱ء
- فیصل ایوارڈ برائے اسلامی خدمت، ۱۹۸۰ء
- ایوارڈ ممتاز اسلامی شخصیت، دبئی

بے لوث خادم ملک وملت

مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوریؒ

سابق ناظم عمومی جمعیّت علماے ہند

۱۳۵۰ھ/۱۹۳۲ — ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

کیا کیا حسین صبح، حسین شام آئے گی
لیکن ہماری یاد، بھلائی نہ جائے گی

دوشنبہ: ۱۸رشعبان ۱۴۲۲ھ = ۵رنومبر ۲۰۰۱ء کے اخبارات میں، مشہور عالمِ دین اور مخلص قائد مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوری، سابق ناظمِ عمومی جمعیّت علماے ہند کے انتقال کی خبر پڑھ کر شدید صدمہ ہوا۔ اُن کا انتقال حرکتِ قلب بند ہوجانے سے، یک شنبہ: ۱۷رشعبان ۱۴۲۲ھ = ۴رنومبر ۲۰۰۱ء کو دہلی میں ہوا، جہاں وہ کم وبیش چالیس سال سے رہ رہے تھے اور یہیں کے باسی بن گئے تھے، وہ عرصۂ دراز سے شکر کے موذی مرض میں مبتلا تھے، جس نے اُن کے جسم وجان کو تو نچوڑ لیا تھا؛ لیکن اُن کی ہمت وحوصلے میں اُس سے کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ آخری سانس تک نہ صرف سرگرمِ کار رہے؛ بل کہ ملک وملت کے مفاد کے لیے، لحہ لحہ سوچتے اور سعی وعمل کی راہ پر انتھک دوڑتے بھاگتے رہے۔ ملی واجتماعی خدمتوں کی چاٹ اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، وہ اپنے شہر غازی پور

(اتر پردیش) کے مدرسے میں ابتدائی تعلیم کے حصول کے مرحلوں میں بھی ملی واجتماعی سرگرمیوں کے دل دادہ رہے۔ ملت کے اِس عظیم سپوت کی رحلت کی خبر سے آج میں دِلی تکلیف محسوس کررہا تھا اور بیسوی صدی عیسوی کی ساتویں دہائی کے اواخر وآٹھویں دہائی کے اوائل سے جب میں دہلی مدرسہ امینیہ کا طالب علم تھا، اُن کے حوالے سے جو کچھ جانتا تھا، میرے حافظے کی اسکرین پر، ایک ایک کرکے اُبھرنے لگا۔ باوقار شہری کی حیثیت سے اِس ملک میں جینے کے لیے ہماری ملت کو آزادیِ وطن کے بعد سے، جس جاں سوز جدوجہد کی ضرورت پڑی، اُس میں مولانا ہاشمیؒ کا مخلصانہ ومجاہدانہ غیر معمولی حصہ یاد آتا اور دل کو رُلاتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی زمین پر، رہنے کے لیے اپنی خاک کو، اپنی وابستگی اور وفاداری کا ثبوت دینے اور رہنے کا استحقاق ثابت کرنے کے لیے، اہلِ فلسطین کے استثنا کے ساتھ، شاید ہی کسی قوم کو ایسی پیہم جدوجہد اور قربانی دینے کی ضرورت پڑی ہوگی جیسی ہندی مسلمانوں کو یہاں ہندوستان میں دینی پڑی ہے، جس میں مولانا ہاشمیؒ جیسے اَن گنت مخلص اور بے لوث علما نے جہاد ونضال کی جو تاریخ رقم کی، اُس کی مثال خال خال ہی مل سکے گی۔

عظیم قائدین وعلما کے جانشین

اُمت کے ضمیر کو بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے والے عہدِ استعمار وغلامی (جس نے نہ صرف برِ صغیر؛ بل کہ سامراج کے ظلم وستم کے شکار سارے اسلامی وعربی ممالک میں، قومِ مسلم کے ضمیر پر دستک دے کر، اُس کو بروقت ہوشیار کردیا) کے بطن سے پیدا شدہ عظیم ترین نسل ہائے قائدین وزُعما، کے بڑی حد تک جانشیں سمجھے جانے والے باقی ماندہ علما وقائدین میں سے ایک مولانا سید احمد ہاشمی غازی پوری، اپنے رنگ وآہنگ میں یکتا اور محنت وجفاکشی کی بہت سی سمتوں میں فی الواقع بے مثال تھے۔

عالمی سامراج نے، جس نے بہ طورِ خاص مختلف الانواع اہداف کے تحت عالمِ

اسلام و عالمِ عرب کے سارے خطوں کو اپنی نوآبادیات بنالیا تھا، مختلف طریقوں سے سعیِ پیہم کے ذریعے، وہاں کے باشندوں کو ہر اعتبار سے پس ماندہ و ناخواندہ و درماندہ اور تہذیبی، ثقافتی، اقتصادی و فکری سطح پر دریوزہ گرِ اقوامِ مغرب بنا چھوڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی؛ کیوں کہ محض عسکری سطح پر اُن خطّوں کو غلام بنانا مقصود نہ تھا؛ بل کہ فکری، ثقافتی و اقتصادی حملوں کے ذریعے، صدیوں کے لیے اُنھیں قعرِ مذلت میں ڈھکیل دینا تھا؛ لہٰذا تاریخ کے مختلف ادوار میں عالمِ اسلام پر حملہ آور سارے دشمنوں سے سب سے زیادہ خطرناک دشمن، مغربی سامراج تھا، جس نے عالمِ اِسلام کو اِس طرح تہس نہس کیا کہ اُس کے اثرات اب تک نہ صرف باقی ہیں؛ بل کہ وہ آیندہ بھی نامعلوم زمانوں تک انڈے بچے دیتے رہیں گے، عالمِ اسلام پر یلغار کرنے والے سارے دشمنوں نے، امت کی ذہنی تطہیر اور دماغی آپریشن کا وہ عمل کیا نہ جانا، جو مغربی سامراج نے کیا اور دنیا کو پہلی بار متعارف کرایا اور امت کی ثقافتی میراث کو مُتأثّر کرکے، اُس کو صدیوں کے لیے گم کردۂ راہ اور بے سمت بناڈالا؛ لیکن شر سے خیر کو برآمد کرنے والے خداے قدیر نے، سامراج کی فکری تصادم کی اِسی پالیسی سے، امت کی فکری بیداری کا کام لیا اور عہدِ استعمار میں ایسے ایسے قدآور علما وزُعما وقائدین ومفکرین اور ہر سطح کے اولوالعزم مصلحین پیدا ہوے، جن کی مثال مابعد عہدِ استعمار میں اب تک مفقود ہے۔

مولانا ہاشمیؒ دِگر علماے متأخرینِ باکمال کی طرح، اُن اسلامی و دینی مدرسوں کے ساختہ و پرداختہ تھے، جو بڑی حد تک قدیم درسی نصاب پر کار بند ہیں اور جو اِس وسیع تر دیار میں علماے راسخین اور روحِ شریعت کے مزاج آشنا صلحاے ربانیین کی تخلیق میں اپنی شناخت رکھتے ہیں؛ لیکن اُنھیں خداے وہّاب کی طرف سے بے پناہ قائدانہ صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں: وہ عقلِ بیدار اور قلبِ ہوشیار کے ساتھ ساتھ دور رسی، بالغ نظری، حکمتِ عملی اور صحیح وقت پر صحیح اور مفید تر فیصلہ لینے اور اُس پر کار بند ہوجانے کی ناگزیر زعیمانہ صفات کے حامل تھے، جن کے طفیل ہی کوئی کام یاب اور باتوفیق

قائد، سنگ لاخ راہوں پر، دامن اُلجھائے بغیر، صحیح سمت میں محوِ سفر ہوتا اور بیاباں کی شبِ تاریک میں دِگر لوگوں کے لیے قندیلِ رَہبانی ثابت ہوتا ہے اور ایک ایسے ملک میں امتِ مسلمہ کے لیے روز روز پیدا شدہ نئی نئی پیچیدگیوں اور مسائل کے حل کے تعلق سے اجتماعی وملکی خدمتوں کا اہل ہوتا ہے، جہاں کے شہری بالعموم طرح طرح کے مذاہب، خیالات، رجحانات، ثقافتوں، تہذیبوں اور عصبیتوں اور آپسی تصادم کی راہ پر ڈالنے والی نت نئی تخریبی تحریکوں وتنظیموں کے سحرِ سامری کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور جہاں کی اکثریت اپنی حقیقی شہری ذمے داریوں اور انسانی قدروں کے تعمیری تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر ''مصنوعی مذہبی غیرت'' کے مُنشّیات کی لت میں گرفتار ہوتی رہتی ہے۔

مولانا ہاشمیؒ نے بچپن سے ہی، ہندوستانی مسلمانوں کی خوشیوں اور تکالیف کو بانٹنے کا سلیقہ وطریقہ سیکھنا شروع کر دیا تھا اور اُن کی اجتماعی وسیاسی خدمتوں کے جذبے سے سرشار ہونے لگے تھے، جب وہ مدرسہ دینیہ غازی پور —— جو مشرقی یوپی کا تاریخی شناخت کا حامل ممتاز شہر ہے —— کے طالب علم تھے، جس نے اپنے ہاں تعلیمی لیاقت اور تربیتی صلاحیت کے ساتھ ساتھ، سیاسی شعور کے حامل لائق اساتذہ کا ایک جتھا اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ سیاسی شعور اُس وقت کے سامراجی حالات کی وجہ سے اکثر علما و مثقفین اور تعلیم یافتہ حضرات میں ضرور پیدا ہو جاتا تھا؛ کیوں کہ حالات کی ستم ظریفی نے بالخصوص مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا تھا؛ اِس لیے کہ انگریزی سامراج نے مسلمانوں کے لیے اِس ملک کو، جس کو اُنھوں نے خونِ جگر سے سینچا تھا، اُن کے لیے نہ صرف بے گانہ بنا دیا تھا؛ بل کہ اُن کے عزیزوں کو ذلیل بنا چھوڑا تھا؛ لہٰذا علما اور مدرسین صرف کتابوں کے پڑھانے پر اکتفا نہیں کرتے تھے؛ بل کہ وہ طلبہ میں غیرت وحمیت، آزادی کا جذبہ اور استعمار کے خلاف شدید نفرت کی روح بھی بیدار کرتے رہتے تھے، جس نے زندگی کے سارے میدانوں میں اُنھیں پس ماندہ کر دیا تھا۔

مولانا ہاشمی کی قائدانہ شخصیت کے تشکیلی عناصر

مولانا ہاشمیؒ کے بچپن کے ساتھی اور تعلیمی سفر کے اُن کے رفیق مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری، جو اِس وقت مدرسہ دینیہ غازی پور کے مہتمم ہیں، نے، اپنے ماہ وار رسالے ''تذکیر'' میں مولانا کی وفات پر، پُرمغز مقالہ لکھا ہے، جس میں اُنھوں نے اُن کی زندگی پر معلومات افزا روشنی ڈالی ہے اور اُن عناصر کی طرف اِشارہ کیا ہے، جو اُن کی قائدانہ شخصیت، عالمانہ ذہنیت اور فکری وجود کی تخلیق میں کارفرما رہے تھے۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۰ یا ۱۹۴۱ء کی بات ہے کہ نوعمر سید احمد ہاشمی کو اُن کے بڑے بھائی حافظ سید محمد، مدرسہ دینیہ غازی پور کے مہتمم مولانا عمر فاروقؒ کے حوالے کر، شہر کلکتہ کی راہ لیتے ہیں اور کچھ دنوں بعد مدرسے کے مہتمم کو خط لکھ کر، اپنے برادرِ خرد کا احوال معلوم کرتے ہیں، تو مہتمم صاحب اُنھیں لکھتے ہیں کہ آپ کا بھائی بہت ہوشیار اور وقت کا انتہائی پابند ہے، وہ سبق سے کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا، وہ اِن شاء اللہ خاندان کے لیے باعثِ افتخار ہوگا۔
>
> ''مہتمم صاحب کی پیشن گوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی، مولانا ہاشمی نہ صرف اہلِ خاندان؛ بل کہ ملّت اور ہندی مسلمانوں کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوئے''۔

حسنِ اتفاق سے اُس وقت شہر ''غازی پور'' بالعموم اور مدرسہ دینیہ بالخصوص مُنتخَب روزگار زُعما و قائدین کے لیے ضیافت گاہ بنا ہوا تھا، جن کا سامراج کے خلاف جدوجہد اور جنگِ آزادی کے حوالے سے بڑا نام اور بڑا کام تھا، جس کی وجہ سے نوعمر سید احمد ہاشمی کے دل میں قومیّت اور آزادی کا جذبہ پیدا ہوا اور مُتعدِد قد آور زُعما کو قریب سے دیکھنے

کا موقع ملا، نیز ماضی میں علمانے جو قربانیاں دی تھیں، اُن کی قدر شناسی کی اُنھیں توفیق ملی اور اُنھیں یقین ہوا کہ آزادی کا آفتاب بہ جلد طلوع ہونے کو ہے۔

نوجوان سید احمد ہاشمی کا مدرسہ اور اُس کے ذمہ داران، آزادی کی سرگرمیوں میں مسلسل حصہ لے رہے تھے، کبھی کانفرنسوں کا نظام بناتے، کبھی رائے عامہ ہم وار کرتے، کبھی شہر میں وارد ہونے والے قائدین وعلما وزعما کے استقبال کے لیے عوام کی بھیڑ اکٹھی کرتے۔ اِن باتوں کی وجہ سے، نوجوان سید احمد ہاشمی اور اُن کے رفیقِ درس نوجوان عزیز الحسن صدیقی کے دِلوں میں اُن جلوسوں اور نعروں میں پر جوش حصہ لینے کی تحریک پیدا ہوتی، جو اُن کے ہندو مسلم معاصرین منظّم کرتے، گویا یہ ساری چیزیں خدائے عالم الغیب کی طرف مولانا ہاشمی کے لیے ٹریننگ کا ذریعہ تھیں؛ کیوں کہ اُنھیں آیندہ اِس حوالے سے ایک بھرپور، کارگر اور نتیجہ خیز کردار ادا کرنا تھا، جس کی ادائگی میں اُنھوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔

مولانا ہاشمی کا تعلیمی وتربیتی سفر اور قائدانہ بال و پر نکلنے کا آغاز

مولانا ہاشمیؒ غازی پور کے ایک شریف خاندان کے فرزند تھے۔ ۱۹۴۸ء میں شہر میں ایسا بھیانک سیلاب آیا کہ جس کی وجہ سے شہر میں بہت سے مکانات بہ گئے، جن میں محلّہ ''خدائی پورہ'' میں واقع اُن کے خاندان والوں کے مکانات بھی تھے۔ اُن کے بڑے بھائی سید حافظ محمد نے افرادِ خاندان کے ساتھ اُنھیں کلکتہ آجانے کو کہا، جہاں وہ تجارت کرتے تھے۔ مولانا ہاشمی کے والد سید محمد شفیع، جو علامہ سید سلیمان ندویؒ (متوفی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء) کے رفیقِ درس تھے؛ کیوں کہ دونوں دار العلوم ندوۃ العلما کے طالب علم رہ چکے تھے، کا سایہ اُن کے سر سے اٹھا تو وہ بہت کم عمر تھے؛ اِس لیے اُن کے بھائی جو درحقیقت اُن کے سرپرست تھے، نے اُن کی تعلیم وتربیت میں خاصی دلچسپی لی۔

مولانا ہاشمیؒ نے درجہ پنجم عربی تک مدرسہ دینیہ غازی پور میں تعلیم حاصل کی، پھر کلکتے جا کر اُنھوں نے مدرسہ عالیہ میں داخلہ لیا اور ''ممتاز المحدثین'' کی سند لے کر وہاں سے فارغ ہوے، تو اُن کے برادرِ بزرگ نے اُنھیں دارالعلوم دیوبند جانے کو کہا، یہاں ایک سال رہ کر دورۂ حدیث شریف کیا اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء سے بخاری شریف وترمذی شریف پڑھی، جو اُس وقت دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔

دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد ایک عرصے تک دہلی میں رہے اور پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات دیے، اِسی دوران اُن کا رابطہ بڑے اسلامی مصنف اور پختہ کار قائد مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ (متوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) سے ہوا، جو اُن دنوں جمعیّت علماے ہند کے ناظمِ عمومی تھے۔ اُن کی صحبت نے اُن کے حوالے سے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور ملّت کی خدمت، وطن کی محبت اور اُس کے لیے بلا امتیازِ مذہب وملت کام کرنے کی دھن اُن پر سوار کردی۔

چوں کہ افرادِ خاندان کی بود وباس کلکتے میں تھی؛ اِس لیے وہ پھر کلکتے آگئے۔ اُن کے برادرِ بزرگ نے جو تاجر تھے، اُنھیں تجارت یا کسی ایسے کام میں لگنے کا مشورہ دیا، جو اُن کے لیے کشادگیِ رزق کا ذریعہ بن سکے اور وہ عزت وآبرو کی زندگی گزار سکیں؛ لیکن وہ فطرتاً دینی وملی واجتماعی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے، جو مدرسہ دینیہ غازی پور کی تعلیم وتربیت سے اور بیدار اور دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کی صحبت سے فزوں تر ہوگیا تھا؛ اِس لیے ادارہ ''ندائے اِسلام'' کلکتے میں وہ مدرس اور ذمے دار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اِس ادارے کو اِسلامی خدمت کے جذبے اور ملی تڑپ کے حامل تاجر حاجی غلام رسولؒ نے قائم کیا تھا، جو ہڈی کے بڑے تاجر تھے، وہی اِس کا سارا صرفہ برداشت کرتے تھے۔ وہ اِس کے علاوہ بھی بہت سے اِداروں اور اِسلامی سرگرمیوں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔

مولانا ہاشمیؒ نے اِس ادارے کے مدرس اور ذمے دار کے دائرے میں اپنے کو محصور نہیں رکھا؛ بل کہ وہ جمعیۃ علما کے پلیٹ فارم سے مختلف سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے؛ کیوں کہ علاقۂ بنگال کی جمعیۃ کے وہ فعال کارکن اور ممبر تھے، اِسی طرح وہ اشتراکی منبر سے کام کرتے تھے؛ کیوں کہ وہ اِس خطے کے حالات کے حوالے سے کمیونسٹ پارٹی کو ملت کے لیے بھی مناسب سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے ایک ہفتہ وار اردو رسالہ ''اَرمغان'' نکالا، جس کی جگہ پھر دوسرا رسالہ ''کندن'' شائع کرتے رہے۔ سرگرم اجتماعی وملّی کاموں کی وجہ سے اُنھوں نے بہ جلد ترقی کی اور صوبۂ بنگال کی جمعیۃ کے ناظم منتخب ہوگئے۔

سوے اتفاق سے اُن دنوں کلکتہ میں ایک بڑا فرقہ وارانہ فساد ہوا، مولانا ہاشمیؒ نے اُس میں جان کی پروا کیے بغیر شب وروز راحت رسانی کا کام کیا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ملّت کے وفا کیش خادم اور مسلمانوں کے رحم دل قائد ہیں، اُنھوں نے شعلہ زن علاقوں میں جانے سے قطعاً پرہیز نہیں کیا اور حکومت اور حکم رانوں کو بُری طرح جھنجھوڑا اور مسلمانوں کی حالتِ زار اور غیر مسلموں کی جارحیّت سے تفصیل سے اُنھیں اِس مؤثر انداز میں آگاہ کیا کہ اِس سے اُن کی قائدانہ صلاحیت کا غیروں کو بھی اندازہ ہوگیا۔

پولس والوں سے رابطہ کیا، حکم رانوں کو آگاہی دی، زندہ ضمیر کے سیکولر ہندو زُعما کو حقیقتِ حال سے واقف کرایا، مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی اور ہر ممکن طریقے سے اُن کی اِمداد واِعانت کی راہ پیدا کی، لُٹے پٹے لوگوں اور اُجڑے ہوے انسانوں کی بازآبادکاری کے اِمکانات پیدا کیے، مستقبل کے تئیں اُن کے اندیشے دور کیے۔ اِن حالات نے اُن کی جرأت، ثابت قدمی، اولوالعزمی، ہوشیاری، اخلاص اور جاں سپاری کی اُن کی صفات کو نہ صرف الم نشرح کیا؛ بل کہ اُنھیں پختہ تر بھی کیا اور آیندہ اقدام وعمل کے لیے اُنھیں مانجھ دیا۔

اِس فساد کا سلسلہ کلکتے میں محدود نہیں رہا؛ بل کہ مختلف اطرافِ ہند میں اِس طرح پھیلا کہ مسلمانوں میں مایوسی اور مستقبل کے حوالے سے ناامیدی گھر کرنے لگی؛ چناں چہ جمعیۃ علماے ہند نے دہلی میں ایک عظیم تر قومی کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ کیا؛ تاکہ موجودہ نازک حالات پر غور وخوض کے بعد، آیندہ کے لیے ایسا لائحۂ عمل تیار کیا جائے کہ مسلمان مزید تباہی سے محفوظ رہیں۔ اِس موقع سے جمعیۃ علما نے تجربہ کار، جواں سال قائد مولانا سید احمد ہاشمی کو بھی دعوت دی کہ وہ دہلی آئیں اور اِس کنونشن کی کام یابی کے لیے اپنی حوصلہ مندانہ سرگرمیوں کو بروئے کار لائیں۔ اُنھوں نے شب وروز ایک کر کے کنونشن کو حسبِ توقع خوب مفید بنایا اور اُن اہداف کو پورا کرنے کی بھر پور کوشش کی، جس کے لیے اِس کا اِنعقاد کیا گیا تھا۔ اُس وقت ذمے دارانِ جمعیۃ کو اُن کی صلاحیت پر ایسا بھر پور اعتماد حاصل ہوا کہ اُنھوں نے یہاں مرکزی جمعیۃ کی ذمے داریاں اُن کے حوالے کرنے کی سوچی۔ سب سے پہلے اُنھیں روزنامہ الجمعیۃ کا منیجر متعین کیا، جو سخت مالی بحران کا شکار تھا، مولانا ہاشمیؒ نے اپنی حکمت ودانائی سے اُس کو مالی بحران کے بھنور سے نکالا، تو اُنھیں جمعیۃ کا ناظمِ عمومی بنا دیا گیا۔ اُنھوں نے اپنی بے باکی، جرأتِ مومنانہ، غیر معمولی سادہ زندگی اور بے پناہ خدمتوں کی وجہ سے اِس منصب کو چار چاند لگا دیے۔ ۱۹۸۸ء تک وہ اِس عہدے پر فائز رہے۔ اِس اَثنا میں اُنھوں نے ۱۹۷۷ء میں دہلی وقف بورڈ کی صدارت بھی کی ۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۶ء تک ہند کے اِیوانِ بالا کے رکن رکین بھی رہے۔ عموماً ارکانِ پارلیامینٹ اپنے اِس محترم عہدے کو لذّت کوشی، زرکشی اور آسایشِ حیات کی حصول یابی کا ذریعہ ہی بنا لیتے ہیں؛ لیکن مولانا ہاشمیؒ نے اِس محترم منبر سے جو بے لوث ملی وقومی ووطنی خدمتیں انجام دیں، وہ ہمارے قائدین کے لیے ایک مثال ہے اور مولانا ہاشمیؒ اور اُن کے درمیان خطِّ امتیاز بھی، اِسی کے ساتھ وہ اپنی وفات تک مجلسِ مشاورت کے رکنِ تاسیسی رہے۔ بستی ضلع کے حلقۂ انتخاب سے ۱۹۸۵ء میں اور غازی پور کے حلقۂ انتخاب سے ۱۹۹۱ء میں

اُنھوں نے ایوانِ زیریں، یعنی لوک سبھا کا الکشن بھی لڑا تھا۔

سابق مسلمان وزیر ریل مسٹر ''سی کے جعفر شریف'' جو عرصے تک وزیرِ ریل رہے تھے، مولانا ہاشمیؒ کے بڑے معتقد اور قدر داں اور اُن کی بے لوثی، جاں فشانی اور ملک وملت کے لیے قربانی کے بڑے قائل تھے؛ چناں چہ اُنھوں نے مولاناؒ کو مسافروں کے لیے سہولت رسانی کی کمیٹی (P A C) کا صدر نام زد کیا۔ اِس منصب کی ذمے داریوں کو نباہنے کے دوران مولاناؒ نے اعلیٰ سطحی پارلیمانی وفد کے ساتھ کئی ملکوں کا دورہ کیا، جن میں روس، سابق چیکوسلواکیا، یوگوسلاویا، سعودی عرب اور کویت وغیرہ ممالک شامل تھے۔

مولانا ہاشمی سے میری شناسائی

۱۹۷۰-۱۹۷۱ء کے عرصے میں، یہ ناچیز راقم الحروف مدرسہ امینیہ دہلی میں زیرِ تعلیم تھا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلویؒ (متوفی ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) جو بڑے اور ممتاز اسلامی اہلِ قلم، داعی اِلی اللہ، محدث وفقیہ اور مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث وصدر مفتی تھے، جمعیۃ علماے ہند کے اہم ذمے داروں میں تھے؛ اِس لیے گلی قاسم جان کے ''احاطہ کالے صاحب'' میں واقع اُن کے مکان پر اکثر میرا آنا جانا رہتا تھا، حسنِ اتفاق کہ گلی قاسم جان میں ہی پرشکوہ اور بڑی سی جمعیۃ بلڈنگ تھی، جس میں جمعیۃ کے اُس وقت کئی دفاتر تھے بالخصوص روز نامہ و ہفت روزہ الجمعیۃ کے آفس، جمعیۃ بک ڈپو، دفتر ''مباحث فقہیہ'' وغیرہ، اِسی بلڈنگ کے مشرقی شمالی گوشے میں مولانا ہاشمیؒ کی رہایش گاہ تھی، جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتے تھے اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک وہ اِسی میں قیام پذیر رہے۔

ادارہ ''مباحث فقہیہ'' کے چوں کہ حضرت مولانا سید محمد میاںؒ ہی ذمے دار تھے؛ اِس لیے جمعیۃ بلڈنگ میں میری آمد بہ طور خاص بہت ہوتی تھی، حضرتؒ سے

ملنے، یا اُن کی طرف سے مجھے سپرد کیے ہوے کسی کام کو انجام دینے کے لیے۔ میں اکثر دیکھتا کہ مولانا ہاشمیؒ جمعیۃ بلڈنگ کی پہلی منزل سے اتر رہے ہیں اور پیدل ہی گلی قاسم جان کے گلی کوچوں میں چل رہے ہیں اور پرانی دہلی اسٹیشن کی جانب شرق وجنوب میں اسٹیشن سے متصل ''فوارہ'' کے نام سے مشہور جگہ پر پہنچ رہے ہیں، جو جمعیۃ بلڈنگ سے بالیقین ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، یہاں سے وہ دہلی ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی کسی بس پر سوار ہو کر نئی دہلی کے آئی ٹی او (I.T.O.) کے علاقے میں پہنچ رہے ہیں، جو دہلی گیٹ کی بالکل سیدھ میں، دہلی گیٹ سے جانب جنوب میں، تقریباً پون کلومیٹر کے فاصلے پر پڑتا ہے؛ کیوں کہ یہاں تاریخی مسجد عبدالنبی میں جمعیۃ کا مرکزی دفتر ہے، جو اُس وقت بھی تھا، چوں کہ وہ جمعیۃ کے ناظم عمومی یا سکریٹری جنرل تھے؛ اِس لیے روزانہ اُنھیں یہاں آنا اور یہاں سے جمعیۃ بلڈنگ گلی قاسم جان، جانا ہوتا تھا اور اُن کے جانے آنے کا یہی روڈ اور ذریعۂ آمد و رفت سرکاری ٹرانسپورٹ کی بس ہوتی تھی۔

وہ کثرت سے پیدل لمبی مسافت طے کرنے کی وجہ سے بہت تیز گام ہو گئے تھے، ویسے بھی اُن کی فطرت میں چستی، تیز روی اور سرگرمی و جفاکشی داخل تھی۔ اُن کے جسم اور حرکات وسکنات سے چستی اور تیزی اُبلتی محسوس ہوتی تھی۔ اُن کے چہرے بُشرے سے حوصلہ مندی، پیش قدمی، عمل و اِقدام کا جذبہ، توقع اور امید کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی تھیں۔ اُنھیں ہر دیکھنے والا خواہ اُنھیں جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، محسوس کرتا تھا کہ یہ کوئی چستی اور پھرتی کا مجسمہ انسان ہے، یہ محنت اور سرگرمی کا رسیا معلوم ہوتا ہے، یہ بالیقین اِحساسِ ذمے داری سے سرشار ہے؛ اِسی لیے جائے عمل کی طرف برق رفتاری سے پہنچنا چاہتا ہے؛ لیکن اِسی تیز روی کے دوران اگر کوئی اُنھیں راستے میں روک کے اپنی ذاتی یا اجتماعی ضرورت سے واقف کراتا، تو وہ نہ صرف اپنے کانوں؛ بل کہ اپنے پورے وجود اور دل ودماغ سے اُس کی طرف مُلتفِت ہو جاتے، سکون سے اُس کی بات

سنتے اور پھر اُسی طرح برق رفتاری سے چل پڑتے۔ گلی قاسم جان کی جمعیۃ بلڈنگ اور فوارے کے درمیان راستے کے دونوں طرف واقع دکانوں کے تجّار و مالکان، کثرت سے اور روزانہ سال ہا سال سے آنے جانے کی وجہ سے کچھ تعارف کے ساتھ اور کچھ بلا تعارف، اُن سے آشنا ہو گئے تھے۔ اِس علاقے کے باشندے مسلمان بالخصوص اور دہلی کے باشندے مسلمان بالعموم اور بہت سے غیر مسلم حضرات بھی دل سے یقین کرتے تھے کہ مولاناؒ انتہائی بے لوث، محنتی، جفاکش، ملک وملّت کی ہمہ تن خدمت کرنے والے اور مسلمانوں کی راہ میں بچھائے جانے والے سارے کانٹوں کو ایک ایک کر کے اٹھا لینے کے لیے دل وجان سے محوِ عمل ہیں؛ تاکہ ہندی مسلمان ایک باعزت شہری کی حیثیت سے، اِس ملک میں رہ سکیں، جہاں کی اکثریت کی ایک معتدبہ تعداد بدقسمتی سے عصبیّت اور فرقہ پرستی کی وجہ سے جلی بھنی جا رہی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سارے لوگ، بالخصوص مسلمان، اُن کے بے حد مدّاح اور اُن کی تعریف میں اُس وقت رطب اللسان رہتے تھے۔ گلی قاسم جان کے باشندے تو سارے کے سارے اُنھیں اپنا فردِ خاندان، سرپرست اور ولیُّ الامر گردانتے تھے۔ میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ یہ اپنے بہترین پیش رو کے سچے جانشیں ہیں، یعنی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مفتیِ اعظم علامہ مفتی کفایت اللہ وغیرہ کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ اِس عینی اور اِدراکی تجربے کی وجہ سے میں بھی مولاناؒ کا اُسی وقت بے حد معتقد ہو گیا تھا؛ لیکن اپنی کم عمری، بے مایگی اور تعارف کی کسی تقریب کے پیدا نہ ہونے اور پیدا کرنے کی صلاحیّت سے عاری ہونے کی وجہ سے، اُس وقت مولاناؒ سے مُتعَارِف ہونے یا ملاقات کرنے کا شرف حاصل نہ ہوسکا؛ چوں کہ اُن سے ملنے کی کوئی ضرورت بھی پیش نہیں آئی؛ اِس لیے بھی حصولِ نیاز سے محروم رہا؛ لیکن مجھے دل ہی دل میں بے حد خوشی محسوس ہوتی رہی کہ اللہ نے مجھے ایک خادمِ ملّت، محبِّ ملک اور انسان سے سچی ہم دردی رکھنے والے ایک عالم وقائد

سے واقف ہونے کا موقع عطا کیا، جو اپنی صلاحیت کے سارے خزانوں کے ساتھ ہندی مسلمانوں اور ہم وطن انسانوں کی خدمت میں شب وروز مصروفِ عمل رہتا ہے۔

مولانا ہاشمی کے لیے خدمتِ خلق غذا، دوا اور ہوا کے درجے کی چیز تھی

دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ سے فارغ ہونے کے بعد میں مارچ ۱۹۷۲ء میں مولانا علی میاں صاحب ندویؒ (متوفی ۱۴۲۰/۹/۲۲ھ=۳۱؍ دسمبر ۱۹۹۹ء) اور بالآخر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بہ حیثیت استاد وابستہ ہوگیا، یہاں میں نے کم وبیش ۱۰ سال تک تدریسی خدمت انجام دی، اِس طویل عرصے میں مولانا ہاشمیؒ کو دیکھنے کا موقع تو نہیں ملا؛ لیکن آنے جانے والوں سے اُن کا تذکرہ سنتا رہا، یا اخبارات ورسائل میں اُن کی سرگرمیوں اور ملّت کی خدمت میں فنائیت کی اُن کی روداد پڑھتا رہا اور دور سے اُنھیں دعائیں دیتا رہا۔ تا آں کہ شوال ۱۴۰۲ھ=اگست ۱۹۸۲ء میں، میں بہ حیثیت مدرس اور رئیس تحریر الداعي دارالعلوم دیوبند آگیا۔ یہاں آنے کے بعد، مولانا ہاشمیؒ سے بار بار ملنے، اُن سے تبادلۂ خیال کرنے، اُنھیں قریب سے جاننے کی راہ پیدا ہوئی؛ کیوں کہ ''الداعي'' کی طباعت اور دِگر امور چوں کہ دہلی ہی میں انجام پذیر ہوتے تھے؛ اِس لیے بہ کثرت ہر پندرہ دن کے بعد ہی دہلی آنا جانا لگا رہتا تھا، حسنِ اتفاق کہ اُس وقت جمعیّۃ کے عربی ترجمان پندرہ روزہ ''الکفاح'' (۱) کا دفتر جمعیّۃ بلڈنگ گلی قاسم جان ہی میں واقع تھا۔ چوں کہ مولانا مزمل سے، حضرت الاستاذ کے شاگرد ہونے کے ناطے بے تکلّفانہ تعلق تھا؛ اِسی لیے سہولت کے لیے اِسی جمعیّۃ بلڈنگ میں ''الکفاح'' کے دفتر میں قیام

(۱) جس کے اصل چیف ایڈیٹر تو حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانویؒ متوفی ۱۴۱۵/ ۱۹۹۵ء تھے؛ لیکن اس کے تحریری کام عموماً مولاناؒ کے شاگردِ رشید مولانا مزمل الحق حسینی حال استاد سکنڈری ہائی اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی انجام دیتے تھے۔

کرتا، جس کے بغل میں متصلاً ہی مولانا ہاشمیؒ کی رہایش تھی؛ اِس لیے مولاناؒ سے پیہم ملتے رہنے کی تقریب، اللہ نے پیدا کردی اور طالب علمی کے زمانے میں اُن سے نیاز کے حصول کی محرومی کا مداوا ہوگیا۔

جمعیۃ بلڈنگ کے اِسی مشرقی شمالی گوشے میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس کو مولانا ہاشمیؒ بہ طور مہمان خانہ استعمال کرتے تھے، اِسی سے متصل دوسرا کمرہ ''الکفاح'' کا دفتر تھا۔ مولاناؒ کے مہمان خانے میں ہمہ وقت مہمانوں اور ملاقاتیوں کا ہجوم رہتا۔ اُن کے ملنے والوں میں ہر طبقے اور ہر نوع کے لوگ ہوتے، حکومت کے ذمے داران وافسران بھی، مختلف سیاسی زمروں کے اہل کار بھی، مسلم وغیر مسلم قائدین وزعما بھی، مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے سربراہان بھی، مدرسوں اور تعلیم گاہوں کے منتظمین ومہتممین بھی، مختلف میدان ہائے کار میں سرگرم عمل علما ودانش وران بھی، معاشرے کے عام ارکان اور شہر کے سربرآوردہ لوگ بھی، عصری جامعات کے اساتذہ اور جدید تعلیم یافتہ حضرات بھی؛ لیکن اُن میں سے اکثر لوگ اُن کے پاس عموماً اِسی لیے آتے تھے تاکہ وہ اُن کے لیے کسی مقصد کے حصول کے لیے سرکاری حکام وافسران، یا اُن لوگوں سے سفارش کردیں، جن کا حکام وافسران سے تعلق ہے، یا کسی وجہ سے وہ اُن کے مُقرّب ہیں، یا مولاناؒ سے مختلف الانواع مقاصد کے لیے سفارشی وتوثیقی تحریریں لینے آتے، تاکہ وہ بہ وقت ضرورت اُن سے فائدہ اُٹھاسکیں۔

بعض مخلص اجتماعی خدمت گزار حضرات اُن سے مختلف مسائل کے حوالے سے مشورہ کرنے بھی آتے؛ تاکہ حقوق وواجبات اور وسائل کی تقسیم کے حوالے سے حکومتی عملہ مسلمانوں کے تعلق سے، جو ناانصافی برتتا ہے، اُس کے اِزالے کی راہ ڈھونڈی جاسکے۔

میں ہمیشہ پاتا کہ مولانا ہاشمیؒ ہر ضرورت مند کی ضرورت کے پوری کرنے میں منہمک ہیں، اُن کے چہرے پر کوئی شکن ہوتی، نہ اُن کی بشاشت میں کوئی فرق آتا، نہ وہ جھنجھلاتے، نہ برا مانتے، نہ کسی بے وقت آنے والے کی آمد پر، اُس کو جھڑکتے؛ بل کہ

انتہائی خندہ روئی سے ہر ایک کا کام اُس کے منشا کے مطابق کر دیتے، یا اُن لوگوں کو فون یا خط سے متوجہ کرتے، جو اُن کے کاموں میں اُن کے معاون ہو سکتے تھے۔

اُنھوں نے عام لوگوں سے ملاقات کے لیے بھی اوقات مخصوص کر رکھے تھے، جن میں لوگ اُن سے ملتے اور اپنی ضرورتیں اُن کے سامنے پیش کرتے، اُنھوں نے اپنے بعض خردوں کو جو ہندی، انگریزی اور اردو سے اچھی طرح واقف تھے، چند گھنٹوں کے لیے اِس کام کے لیے متعین کر رکھا تھا کہ وہ ضرورت مندوں کے کاغذات لے کر، اُن کی جانچ پڑتال کر لیا کریں؛ تاکہ سفارشی وتوثیقی تحریر لکھے جانے کے وقت مطلوبہ پہلوؤں پر توجہ دلانے میں کوئی نقص نہ رہ جائے اور کام وقت پر نہ ہو سکے۔

یہ ساری باتیں ایسا لگتا ہے کہ میری آنکھوں میں آج بھی رچی بسی ہوئی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ اِس وقت بھی انجام پذیر ہو رہی ہیں۔ یہ روٹینی امور مولاناؒ کی شناخت اور وجہِ امتیاز بن گئے تھے۔ ایسا خدمت گارِ خلق لوگوں نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ ان کا یہ اندازِ کار اور اعلیٰ اخلاق ہی اُن کی محبوبیت اور ہر دل عزیزی کا سبب تھے۔ مولاناؒ ان کاموں کو عبادت کی طرح پابندی سے انجام دیتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ شاید یہ اُن کی غذا، دوا، یا ہوا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ پاتا۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریسی وتحریری ذمے داریوں کے اولین سالوں میں مولاناؒ سے بہت سے امور پر بہ طورِ خاص تبادلۂ خیال کا داعیہ پیدا ہوا اور تبادلۂ خیال کا موقع بھی ملا، خط وکتابت بھی ہوئی۔ مولاناؒ چوں کہ ملّت کے تئیں بڑے مخلص اور ہم درد تھے؛ اِس لیے بہت سے مسائل پر اُنھوں نے جس طرح کھل کے گفتگو کی کسی اور سے اِس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ دارالعلوم کے ۱۹۸۰-۱۹۸۲ء کے قضیۂ نامرضیہ کے حوالے سے بھی اُنھوں نے میرے بہت سے خلجان کو دور کیا اور بڑے سوز کے ساتھ متعلقہ مسائل پر اپنی رائے ظاہر کی۔

مولاناؒ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بہت مضبوطی کے ساتھ، صاف صاف اور

ٹھہراؤ کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، مطلوبہ مقصد اور نقطۂ نظر کو بیان کرنے کے لیے الفاظ وتعبیرات کا انتخاب کرتے اور صحیح جملوں اور مفردات میں اپنے زاویۂ نظر کو پیش کرتے، عجلت اور رواروی میں گفتگو نہ کرتے۔ ٹھہراؤ، خوداعتمادی، رائے کی پختگی اور سنجیدہ اندازِ تکلّم اُن کا مابہ الامتیاز تھا۔

مولانا ہاشمی کے ساتھ ایک یادگار اور تاریخی سفر

۱۹ - ۲۱/جنوری ۱۹۹۲ء (۱۶ - ۱۸/رجب ۱۴۱۲ھ) کو کویت کی وزارتِ ابلاغ نے ''عراقی حکومت کی جیلوں میں قید کویت کے قیدیوں اور محبوسین کی گلوخلاصی کے لیے عالمی اسلامی کانفرنس'' (اَلْمُؤتَمَرُ الإِسْلَامِيُّ الْعَالَمِيُّ لِلإِفْرَاجِ عَنِ الأَسْرَىٰ وَالْمُحْتَجَزِيْنَ الْكُوَيْتِيِّيْنَ وَغَيْرِهِمْ فِيْ سُجُوْنِ النِّظَامِ الْعِرَاقِيِّ) کے عنوان سے ایک بڑی عالمی اسلامی کانفرس منعقد کی تھی۔ ہندوستان کے دِگر علما وتعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ ساتھ وزارت نے، حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی نوراللہ مرقدہ (متوفی ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) مولانا سید احمد ہاشمیؒ اور راقم الحروف کو بھی مدعو کیا تھا، کام کی کثرت اور مشاغل کی بھیڑ کی وجہ سے شاید ہم لوگ اِس میں شریک نہ ہو پاتے؛ لیکن کویت کے اُس وقت کے سفیر برائے ہندوستان عالی جناب ضرار عبدالرزاق رزوقی اور مشیر کار جناب محترم متعب عثمان ربیح نے کویت پر عراقی حملے اور قبضے کے دوران راقم کے بے پناہ لکھنے اور طاقت کے ساتھ کویت کے موقف کی تائید کی وجہ سے، جو مذکورہ دونوں حضرات کے علم میں تھا، اِتنا اِصرار کیا کہ ہمیں سارے مشاغل کو پسِ پشت ڈال کر، کویت کا سفر کرنا ہی پڑا۔

اِس کانفرنس میں شرکت اور علما ومفکرین سے ملاقات وتبادلۂ خیال کے فوائد کے علاوہ، اِس کا بڑا فائدہ راقم کے حوالے سے یہ ہوا کہ دونوں بزرگوں: مولانا کیرانویؒ ومولانا ہاشمیؒ صاحبان کی صحبت اور سفر میں اُن کے اخلاقِ کریمانہ کے فیضان سے بہرہ ور

ہونے کا موقع ملا۔ کویت میں ہوٹل ''میریڈیان'' میں ہم لوگوں کے کمرے ایک ہی منزل پر پاس پاس ہی تھے۔ ہم تینوں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، کانفرنس میں شرکت کرنے، دعوتوں وسرکاری وغیرسرکاری ضیافتوں وغیرہ میں جانے اور دِگر دلچسپیوں میں ایک ساتھ رہتے۔ امیرِ کویت، ولی عہد، وزیرِ ابلاغ اور دگر وُزَرَا اور قدآور اشخاص نے بڑی بڑی پرلطف دعوتیں کیں، جن میں ہم تینوں ایک ہی میز پر بیٹھتے۔ آمدورفت میں ایک ہی کار پر سوار ہوتے اور ایک ساتھ اترتے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت، اُس کا اصل مزاج، صحیح افتادِ طبع وغیرہ سفروں میں ہی آشکار ہوتی ہے۔ حضرت مولانا کیرانویؒ تو زندگی کے سارے معاملات کے حوالے سے بے نظیر اور یکتاے معاصرین ہونے میں مشہور و مُسلَّم تھے ہی اور اُنھیں پہلے سے بھی یہ ناچیز، اُن کے اپنا استاذ ہونے کی وجہ سے جانتا تھا؛ لیکن مولانا ہاشمیؒ کو برتنے اور سمجھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہ سفر و حضر و قیام کے بہترین ساتھی ثابت ہوے۔ اُن کی تواضع، سادگی، خاکساری، بہ جلد مانوس ہوجانے اور مانوس کرلینے کی صفت اور حد درجہ اپنائیت کی وجہ سے ایسا لگا کہ ہم کسی اپنے ہم عمر اور بے تکلف ساتھی کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔ انسان کی غیر معمولی بڑائی غالباً یہی ہے کہ اُس کا ہم سفر یہ محسوس کرے کہ وہ کسی بے تکلّف فردِ خاندان کے ساتھ ہے، اُس کی طرف سے کسی ترفُّع اور بڑائی پسندی کا اظہار نہ ہو، اِس کو اُس کی جانب سے کسی طرح کی وحشت اور تکلّف کا انداز دیکھنے کو نہ ملے، ورنہ ہر لمحہ ایک اذیّت ناک عذاب ثابت ہوتا ہے اور سفر کی ساری لذّتیں کافور ہوجاتی ہیں۔

مولانا ہاشمیؒ میری ہی طرح یا مجھ سے زیادہ شکر کے شدید مریض تھے؛ لیکن وہ زیادہ پرہیز پر عامل نظر نہ آئے، مٹھائیاں اور پھل فروٹ خوب استعمال کرتے تھے۔ ہم تینوں ہی شکر کے مریض تھے؛ اِس لیے مجھے اور حضرت مولانا کیرانویؒ کو بہت ہنسی آتی، جب ہم دونوں کھانے سے فارغ ہوکے سولھویں منزل پہ واقع ڈائننگ ہال میں میز پر بیٹھے بیٹھے

مولانا ہاشمیؒ کے فارغ ہوجانے کا انتظار کرتے؛تاکہ ایک ساتھ پھل وغیرہ لینے جائیں؛ کیوں کہ وہاں سیلف سروس ہوتی تھی؛لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ مولاناؒ رازکی طرح میز سے تیزی میں کھسک جاتے اور شکر کے مریض کے لیے ضرررساں یا بے مضرّت پھلوں اور میٹھائیوں کا لحاظ کیے بغیر، پوری پلیٹ بھر کے واپس ہوتے ہوئے نظر آتے۔ ہمارے ہسنے پر فرماتے: سفر میں یہ چیزیں مضر نہیں ہوتیں؛ کیوں کہ مضرّت پیدا کرنے والے خدا نے سفر کے لیے اپنے احکام وعبادات میں بھی تبدیلی کر رکھی ہے۔

ایک لطیفہ یہ پیش آتا اور ناشتے اور دوپہر اور رات کے کھانے میں بھی ہم اِس کا مشاہدہ کرتے کہ مولاناؒ جیسے ہی پھلوں اور فواکہ کے لیے اُٹھتے، ضیافت پر مامور برتن اٹھانے والی لڑکی فوراً پلیٹ اور چمچے، جو ذرا بھی آلودہ ہوتے یا نہ ہوتے اٹھالے جاتی، ہم اُن کے واپس آنے سے پہلے بعض دفعہ پھل وغیرہ لینے کے لیے جاتے، تو وہ واپسی میں فرماتے تم کیوں چلے جاتے ہو، یہ لڑکیاں ہماری پلیٹ اور چمچے اٹھالی جاتی ہیں اور میں پریشان ہوتا ہوں، میں کہتا: حضرت! آپ دوسری صاف پلیٹیں اور چمچے منگوالیا کریں۔فرماتے اِس میں دیر ہوجاتی ہے اور وہ گندے کب ہوتے ہیں کہ یہ لے بھاگتی ہیں؟ میں عرض کرتا کہ یہ اُن کے آدابِ میزبانی میں داخل ہوگا؛ اِس لیے اِس پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔دیکھیے ہم دوسری جاکے لے آتے ہیں یا اِنھیں سے منگوائے لیتے ہیں، تو اِنھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

ایک روز ہوٹل کے استقبالیہ والوں نے اطلاع دی کہ سفیرِ ہند برائے کویت آپ لوگوں سے ملاقات کی خواہش رکھتے ہیں، آپ لوگ وقت بتادیں، تو وہ خود ملنے آئیں گے۔ ہم لوگوں نے مشورے سے طے کیا کہ ازخود سفارت خانہ ہولیں، اِس میں وقت کم خرچ ہوگا، اگر سفیر صاحب خود آئیں گے، تو انتظار اور دِگر ترتیبات میں وقت زیادہ صرف ہوگا اور کانفرنس کے پروگراموں کے پیہم ہونے کی وجہ سے اِس کی گنجایش نہیں۔ بہ ہر کیف ایک روز عصر کے بعد ہندوستانی سفارت خانے جانا

ہوا۔سفیر صاحب جو پنجابی ہندو تھے بہت کھل کے ملے، بہت اچھی شستہ وشگفتہ اردو میں بات کررہے تھے۔اُنھوں نے کہا کہ ہم ایک روز جس دن آپ پسند کریں، آپ تینوں حضرات کی دعوت کرنا چاہتے ہیں، ہم لوگوں نے اُس وقت تو یہی کہا کہ ہم ایک آدھ روز میں ہی بتادیں گے؛ لیکن ہمیں وقت میں بالکل گنجایش نظر نہیں آئی؛ اِس لیے سفیر صاحب کی خواہش پوری نہ کرسکے۔مولانا ہاشمیؒ جو کٹر نیشنلسٹ اور وطن پرست تھے، اُنھیں اِس کا بہت صدمہ رہا کہ وہ سفیر صاحب سے کیا گیا وعدہ وفا کرسکے نہ ہم لوگوں سے کرواسکے۔کویت میں چندروزہ قیام کے دوران بار بار کہتے رہے کہ بھئی یہ اچھا نہ ہوا کہ ہم لوگ سفیر صاحب کی دعوت کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔

ہمارے کمروں کے چند کمروں بعد پاکستانی وفد کا قیام تھا، جب اُنھیں معلوم ہوا کہ ہم دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم کانگریسی نقطۂ نظر کے لوگ ہیں، تو وفد کے سربراہ نے ہمیں مدعو کیا کہ ایک روز ہم مل بیٹھیں اور غیر رسمی باتیں اور ملاقاتیں کرلیں۔ہم دونوں استاذ وشاگرد: حضرت مولانا کیرانویؒ وراقم الحروف تو رضا مند ہوگئے کہ جب ہم لوگ پاس پاس ہی رہتے ہیں تو بیٹھ کے تبادلۂ خیال کرنے میں کیا حرج ہے؟ جب کہ یہ بھی مسلمان ہی ہیں؛ لیکن مولانا ہاشمیؒ نے یہ کہہ کے ٹال دیا کہ اِس میں سیاسی زمرے کے لوگ بھی ہیں، پتہ نہیں وہ کیا کہہ بیٹھیں، یہ لوگ چوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے تئیں کبھی مخلص نہیں رہے؛ اِس لیے اِن سے ملنا اور اِن کی باتیں سننا کچھ بھی سودمند نہیں۔حضرت مولانا کیرانویؒ نے مولانا ہاشمیؒ سے بار بار کہا کہ تبادلۂ خیال میں کیا نقصان ہے، ہوسکتا ہے اِس سے ملت کے مفادِ عامّہ کی کوئی سبیل نکل آئے؛ لیکن مولاناؒ چوں کہ واقعی کٹر نیشنلسٹ اور وطن پرست تھے؛ اِس لیے ٹس سے مس نہ ہوے۔اُس وقت میں سوچنے لگا کہ ہمارے ہندو برادران بھی اِتنے ہی وطن پرست ہوتے، تو آج ہندوستان میں ہندو مسلمان کا کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوتا اور وطن کی سالمیّت کے لیے جو خطرہ درپیش ہے، وہ ہرگز درپیش نہ ہوتا؛ لیکن شاید بڑے سے بڑا سیکولر ہندو لیڈر بھی اِتنا سیکولر

نہیں ہوتا، جتنا مسلمان سیکولر ہوتا ہے۔

اِس سے یہ اندازہ ہوا اور یقین بھی ہوا کہ مسلمان جب کسی اُصول کو مانتا ہے، تو اُس پر جی جان سے کار بند ہوتا ہے اور کسی حال میں اُس سے چشم پوشی نہیں کرتا اور اُس کے حوالے سے کسی طرح کی ثنویّت، دوہرے پن اور نفاق پر عمل پیرا نہیں ہوتا؛ لیکن غیر مسلم حضرات کے حوالے سے شاید ہی یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی اُصول پر دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں یکساں طور پر عمل پیرا ہوں گے؛ کیوں کہ نفاق سے براءت اور دوہرے پن سے پاک ہونا، صرف اسلام اور مسلمانوں کا خاصّہ ہے۔

مولانا ہاشمی کا سراپا اور سیرت و کردار

مولانا ہاشمیؒ سرخ و سفید، متوسط القامت اور باوقار شخصیت کے حامل تھے، اُن کے خوب صورت چہرے پر گھنیری داڑھی بہت زیب دیتی تھی۔ وہ دِگر جمعیّۃ اور کانگریس کے ہم نوا علما و قائدین کی طرح کھادی کے سفید لباس میں رہتے۔ اُن کی آواز اور لہجے میں خود اعتمادی، وضاحت اور طلاقت تھی۔ وہ مجلس اور بزمِ خطابت اور عام سیاسی اور دینی جلسوں میں بڑی مُدلّل اور مکمل گفتگو کرتے تھے، مسلمانوں پر توڑے گئے مظالم اور فسادات کے موقع سے کی گئی اُن کی تقریریں دردو سوز میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں۔ اُنھیں دلائل و شواہد بہت یاد رہتے تھے اور اُن سے استناد، اُن کے لیے برسرِ جلسہ بھی بہت آسان ہوتا تھا۔ اُن کی شخصیّت اور گفتگو دونوں ہی جاذب تھیں۔ اُن سے مل کے انسان متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ سیاسی اور مخلوط جلسوں میں انگریزی کے الفاظ عام سامعین کی تفہیم کے لیے بہ کثرت استعمال کرتے تھے۔ وہ اپنی مجموعی ادا اور رویّے سے بھی واقعی ایک اچھے لیڈر، مدبر اور عالم محسوس ہوتے تھے۔ اُنھیں خدمتِ ملک و ملت کے آداب کی بھرپور واقفیّت، اُن کا تجربہ اور اُنھیں برتنا آتا تھا اور دل کہتا تھا کہ واقعی اُنھیں اجتماعی خدمت کی انجام دہی کا قرینہ ہے۔ اُن سے ہر ملنے والے کو لگتا تھا کہ وہ

قائداورمدبر ہی مخلوق ہوے ہیں۔

افسوس ہے کہ عمر کے آخری مرحلوں میں اُن کی قدر نہیں کی گئی اور وہ جس شجر سے ہوش کی زندگی میں ہمیشہ وابستہ رہے، اُس سے بہ وجوہ وابستہ نہ رہ سکے اور بالآخر ایک دوسری جمعیّۃ ''ملی جمعیّۃ علما'' کے نام سے استوار کی گئی، جن کا اُنھیں ناظمِ عمومی منتخب کیا گیا؛ لیکن یہ زیادہ کچھ بال وپر نہیں نکال سکی۔ مولانا آہستہ آہستہ سمٹ سے گئے، شکر کے موذی مرض نے اُنھیں ویسے بھی نڈھال بنادیا تھا۔ دولت وثروت، وہ افتادِ شرافت ودیانت کی وجہ سے بٹور نہ سکے تھے؛ اِس لیے علاج ومعالجہ اور زندگی کی سہولتیں بھی، کچھ زیادہ میسر نہ تھیں، سادہ سی زندگی گزار کر، امراض کے اعذار کے ساتھ خاموشی سے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

مولانا ہاشمیؒ کے سلسلے میں ایک مؤرخ کو یہ ریکارڈ کرنا ہوگا کہ اپنے طویل سفرِ جدوجہد، قیادتی میدان میں سال ہا سال گزارنے کے بعد اور اعلیٰ سطح کے زُعماوحُکّام سے مضبوط رشتوں کے باوجود، اپنی ذات، اپنی فیملی اور اپنے لوگوں کے لیے اُنھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اُنھوں نے آخری لمحے تک انتہائی سادہ اور وسائلِ عیشِ فراواں سے خالی زندگی گزاری، جب کہ اُن سے کم تر درجے کے قائدین وخدمت گزاری کا دم بھرنے والے لوگوں نے دونوں ہاتھوں سے دولت وثروت لوٹی اور حلال وحرام کی کسی تمیز کو پیشِ نظر نہیں رکھا کہ اِس دنیا کی رنگینی اور چند روزہ باغ وبہار سے اکثر لوگ ہی دھوکہ کھا جاتے ہیں، بہت کم سعادت مند ہوتے ہیں، جنھیں سفرِ حیات کے دوران، سفرِ موت اور دارِ آخرت کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اُن کی لغزشوں سے درگزر کرے، جن سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں۔

مولانا ہاشمیؒ ایک نظر میں

❁ پیدائش: ۱۷؍جنوری ۱۹۳۲ء (۷؍شوال ۱۳۵۰ھ)

- ابتدائی تعلیم: مدرسہ دینیہ غازی پور ۱۹۴۰ - ۱۹۴۸ء کے دوران
- متوسط اور اعلیٰ تعلیم: مدرسہ عالیہ کلکتہ ۱۹۴۸ - ۱۹۵۴ء کے عرصے میں
- دورۂ حدیث شریف: دارالعلوم دیو بند ۱۹۵۵ء

● ۱۹۵۷-۱۹۷۴ء کے عرصے میں کلکتے میں قیام رہا، انجمن ندائے اسلام کے مدرسے میں تدریس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور صحافتی میدانوں میں سرگرمِ عمل رہے۔ ''ارمغان'' اور ''کندن'' نام کے ہفت روزے نکالے اور صوبۂ بنگال کی جمعیۃ علما کے ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا۔

● ۱۹۶۴ء میں کلکتے میں پھوٹ پڑنے والے ہندو مسلم فسادات میں، مسلمانوں کے لیے زبردست امدادی کام کیا اور اپنی قیادتی صلاحیت کا سکہ بٹھا دیا۔

● جمعیۃ علما کی طرف سے منعقد کیے جانے والے آل انڈیا اسلامی کنونشن کے لیے ۱۹۶۵ء میں دہلی بلائے گئے، اُس کے لیے بڑی تگ و دو کی اور کنونشن کو کام یاب بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

● اِس کے بعد روز نامہ ''الجمعیۃ'' کے منیجر، پھر جمعیۃ علما کے ناظمِ عمومی منتخب ہوے، اِس عہدے پر ۱۹۸۸ء تک فائز رہے۔ اِس دوران، ملت کی خدمت کے لیے، ملک کے اطراف و اکناف کا لاتعداد مرتبہ سفر کیا۔

● ۱۹۷۴ء میں راجیہ سبھا (ایوانِ بالا) کے رکن منتخب ہوے۔

● ۱۹۷۷ء میں دہلی وقف بورڈ کے صدر منتخب ہوے۔

● ۱۹۸۶ء میں دوبارہ رکنِ ایوانِ بالا منتخب ہوے۔

● ۱۹۸۸ء میں ملی جمعیۃ علما کے ناظمِ عمومی منتخب ہوے۔

● ۱۹۹۰ء میں دہلی کی اسلامی کانفرنس کے صدر منتخب ہوے۔

● نائب صدر آل انڈیا مجلسِ مشاورت۔

● ناظمِ اعلیٰ مدرسہ دینیہ غازی پور۔

● صدر انڈین ریلوے کی کمیٹی برائے سہولت رسانیِ مسافراں۔

● رکن تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیو بند۔

● رکن مدرسہ عظمتیہ دارالقرآن کلکتہ۔

● رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

● رکن کمیٹی برائے بحالی بابری مسجد۔

- رکن مجلس منتظمہ مدرسہ دینیہ غازی پور۔
- دومرتبہ حج وزیارت سے شرف یاب ہوے۔
- سعودی عرب، کویت، روس، چیکوا سلوا کیا اور یوگوسلاویا وغیرہ کا دورہ کیا۔
- تصوف واحسان میں حضرت مولانا صدیق احمد باندوی (متوفی ۲۳ر ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ مطابق ۲۸ر اگست ۱۹۹۷ء) سے ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء میں بیعت ہوے۔
- یک شنبہ: ۱۷ر شعبان ۱۴۲۲ھ مطابق ۴ر نومبر ۲۰۰۱ء کو وفات واقع ہوئی۔
- مسجد فتح پوری دہلی میں نمازِ جنازہ، مدرسہ عالیہ فتح پوری کے اُس وقت کے شیخ الحدیث مولانا عبدالغفار (متوفی بہ روز بدھ ۶ر صفر ۱۴۲۴ھ مطابق ۹ر اپریل ۲۰۰۳ء) نے پڑھائی۔
- اُسی روز ۱۷-۱۸ر شعبان کی درمیانی شب میں دہلی دروازہ کے قبرستان میں غازی عبدالرشید کی قبر کے قریب تدفین عمل میں آئی، جنھوں نے شاتمِ رسول ﷺ ''شردھانند'' کو قتل کیا تھا۔(*)

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۲، بابت ماہ رمضان وشوال ۱۴۲۹ھ مطابق ستمبر واکتوبر ۲۰۰۸ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود نصف شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق نصف اگست ۲۰۰۸ء۔

منفرد عالمِ دین

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی

۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء — ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ پر، راقم نے دو مضمون لکھے تھے، ایک مضمون وفات کے دو تین روز ہی بعد لکھا گیا تھا، جو ''راشٹریہ سہارا'' کے ضمیمہ سمیت متعدد اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوا تھا۔

دوسرا مضمون ''الداعی'' کے (الی رحمة الله) کے گوشے کے لیے لکھا گیا تھا، جو ''الداعی'' کے شمارہ ۳-۴، جلد ۲۶ میں شائع ہوا۔ اس مضمون کو راقم نے اردو کا قالب دیا، جو بہت سے روزناموں اور ماہ ناموں میں شائع ہوا۔

یہاں قارئین کے استفادے کے لیے بالترتیب دونوں مضامین درج کیے جارہے ہیں۔

جمعرات ۴راپریل ۲۰۰۲ء (۲۰ محرم ۱۴۲۳ھ) مغرب کی نماز کے ذرا دیر بعد، میں سہارن پور سے واپس آکر جیسے ہی گھر میں داخل ہوا کہ دیو بند کے ایک صاحب نے فون پر کہا کہ ابھی ابھی دہلی سے فون پر مجھے بتایا گیا ہے کہ میں آپ کو یہ خبر پہنچادوں کہ حضرت قاضی صاحب ابھی سات بج کر پانچ منٹ پر فوت ہوگئے۔ یہ خبر سنتے ہی دل دھک سے ہوگیا اور ایسا لگا کہ ملت کے چراغ کے تیل کا آخری قطرہ نچوڑ لیا گیا ہے اور

اب یہ چراغ خدانہ خواستہ مفلس ہی کا چراغ بن گیا ہے۔

قاضی صاحب عرصہ کئی سال سے، شدید علالت سے گزر رہے تھے۔ اِدھر کئی ہفتوں سے اُن کی صحت کی باقی ماندہ پو.جی بھی ختم ہورہی تھی اور اُن کے جسم وجان کا بچا کھچا سرمایہ بھی لحہ لحہ، تقدیرِ الٰہی کے ہاتھوں تیزی سے صرف ہورہا تھا۔ سارے اہلِ تعلق اُن کی زندگی سے مایوس ہونے لگے تھے اور بالآخر وہی ہوا جس کا کھٹکا لگا ہوا تھا؛ لیکن اُن کی زندگی کے حوالے سے طویل اور شدید علالت سے پیدا شدہ مایوسی کے باوجود، اُن کی وفات کے غم کی شدّت، اُسی طرح محسوس ہوئی جیسے کوئی جوان، توانا، زندگی کی اُمنگوں، رعنائیوں اور ولولوں سے سرشار اور اَن گنت کارناموں کو انجام دینے اور مُہمّات کو سر کرنے کی صلاحیّتوں کے تمام ہتھیاروں سے لیس کسی مخلص اور جاں باز ومنفرد قائد اچانک، عین لڑائی کے دوران؛ بل کہ محاذِ جنگ پر کام آگیا ہو اور سارے "سپاہی" اور ساری قوم پر غم والم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہو۔

ہمہ جہت عالم ودانش وَر

ہماری موجودہ صف میں نِرے عالم، نِرے مفتی، نِرے داعی، محض مُصنّف، صرف سحر انگیز خطیب اور صرف قائد ومُفکّر کی کمی نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں؛ لیکن جس شخصیّت میں یہ ساری صلاحیّتیں بھرپور انداز میں، توازن کے ساتھ، کارگر مقدار میں اور مطلوبہ معیار پر موجود ہوں، وہ اِس وقت صرف قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کی شخصیّت تھی۔ افسوس ہے کہ وہ واقعتاً دولتِ مستعجل ثابت ہوے۔

وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے پر بولتے یا لکھتے، تو اپنی شگفتہ اور مُرتّب ومربوط زبان میں سارے گوشوں کو، اِس طرح سمیٹ لیتے کہ لوگ عش عش کرنے لگتے، اُن کے لہجے میں بلا کی شیرینی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ذہانت وفطانت اور فہم وادراک کی دولتِ فراواں سے نوازا تھا۔ علوم شریعت اور فقہ واجتہاد کے لیے، جس خاص فہم وفراست کی ضرورت ہوتی ہے،

کہنا چاہیے کہ اُن کے معاصرین میں، برِّصغیر ہی نہیں، پورے عالمِ اسلام میں پاکستان کے مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کو چھوڑ کر، اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اُن سے گفتگو کرنے والے ہر پڑھے لکھے کو محسوس ہوتا تھا کہ علم وفضل اور فقہ وشریعت کا ایک بحرِ بے کراں اُس سے مُخاطَب ہے۔ وہ جس سرعت کے ساتھ کسی مسئلے کی تہ تک پہنچ جاتے تھے؛ جس متانت، وقار اور خود اعتمادی کے ساتھ مُخاطَب کو اپنی بات سے یا کسی علمی وفکری نقطے سے مُطمئن کردیتے تھے، مسلمانوں کی صف میں، اِس طرح کا اب کوئی عالم موجود نہیں رہا۔ اُن کی آنکھوں کی ذہانت، چہرے کی متانت، ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، اُن کے تمام رویّہ ہائے حیات کی شرافت، اُن کی علمی بے پناہی، فقہ وقضا میں اجتہاد کے درجے کی اُن کی صلاحیّت، قائدانہ لیاقت، مُفکِّرانہ سوز وگداز، ملّت کے لیے تڑپنے پھڑکنے کی اُن کی ادائیں، عالمی سطح پر اُمّت کی مظلومیّت، ٹھوس اور مُؤثّر قیادت کے خلا کے حوالے سے اِحساس کی وجہ سے اُن کے غم والم کی نہ ختم ہونے والی کیفیت ——— اور سب سے بڑھ کر علم ومطالعے کے سمندر کی تہوں میں، اُن کی غوّاصی، اُن کے علمی وفکری سوچ کے کارخانے میں ڈھلنے والے آب دار موتی، تہذیب وتمدن کے نئے نئے قافلوں کی چاپ کو اوّلیں وقت میں محسوس کرلینے کی، اُن کی قوّتِ اِدراک کا امتیاز، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی داخلی وخارجی سازشوں کے تانے بانے کو سرعت کے ساتھ باور کرلینے کی، اُن کی غیر معمولی خوبی، علما کی صف میں عربی، اردو کے علاوہ، انگریزی زبان پر عبور کے تعلّق سے اُن کی فوقیّت اور اِسلامی مسائل کے حوالے سے، جدید وقدیم اور مخالف وموافق دونوں طبقوں کے تمام شکوک وشبہات کو زبان کی حلاوت، فکر کے بانکپن، ذہانت کی گود میں پلی ہوئی سوچ اور عالمانہ فراست کی انفرادیّت کے ذریعے یکسر زائل کردینے کی، اُن کی خداداد لیاقت کو، نہیں معلوم کہ حقیقی قحط الرجال کے دور میں، ملّت کب تک روتی رہے گی۔

دوگرامی قدر انتسابوں کا فیضان

وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے شاگردِ رشید اور دارالعلوم کے

یگانۂ روزگار فاضل تھے۔ اُن دونوں گرامی قدر انتسابوں پر اُن کوں جس درجہ فخر تھا، وہ اُن پر جتنا مچلتے تھے، وہ جس طرح اُن دونوں سچائیوں کو اپنی زندگی کا مُقدّس سرمایہ سمجھتے تھے، ہر موقع سے اُن کا جس لب و لہجے میں اِظہار کرتے تھے: میں نے اُس کی مثال کسی فاضلِ دیوبند کے ہاں دیکھی نہ سنی اور نہ پڑھی۔

وہ دارالعلوم آتے، تو اُن کی زبان، اُن کے انداز اور اُن کے ہر سلوک سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی مچھلی خشکی سے پانی میں آگئی ہے اور زندگی کی حقیقی لذّتوں سے ہم کنار ہوگئی ہے۔

علم کی صنعت پر اُن کو عبور تھا۔ اِس میں اُن کی ذہانت اور محنت سے زیادہ، اُن کی اُس مذکورہ عقیدت ومحبّت کا اثر صاف طور پر محسوس ہوتا تھا؛ بل کہ اُن کے علمی وفکری جلال و جمال کی تمام گل گاریوں اور نقش نگاریوں میں اُس کا فیضان نمایاں نظر آتا تھا۔

تربیتِ فکر وآگہی کی لائقِ رشک دین

دارالعلوم سے فراغت کے بعد، وہ خانقاہِ رحمانی مونگیر میں مُدرس ہوے۔ یہاں اُن کو عصرِ حاضر کے ایک جسور وغیور، قائدانہ ذہانت کے بے پناہ خزانے کے مالک، رجال شناس ورجال ساز عالم مولانا سیّد شاہ منّت اللہ رحمانیؒ امیرِ شریعت بہار واڑیسہ کی علمی وفکری اور ماں باپ سے زیادہ ہم دردانہ ومشفقانہ ومربیانہ گود میں پلنے اور جس کام کے لیے خدا نے، اُن کا انتخاب کیا تھا، اُس کے لیے ڈھلنے کا موقع ملا اور شیخ الاسلامؒ کا یہ شاگرد مولانا رحمانی کی عالمانہ وقائدانہ تربیت کے نتیجے میں واقعتاً پختہ کار و پختہ ذہن عالم بن کر اُبھرا۔

مجھے کہنے دیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ مولانا سیّد منّت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء) کو اپنی صلبی اولاد مولانا سید شاہ ولی رحمانیؒ مدظلہ العالی سے زیادہ محبت تھی، یا قصبہ "جالہ" ضلع دربھنگہ کے مولانا عبدالاحد قاسمی ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء-۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء (شاگرد رشید شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) کے صاحب زادے مولانا مجاہد الاسلام سے زیادہ

پیارا تھا۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے جس معصوم دور کی روداد سنا رہا ہوں، اُس دور میں غالبًا مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ کو مولانا مجاہد سے اپنی صلبی اولاد سے زیادہ محبت اور اُن کو کام کا بنانے اور کام میں لگانے کے لیے زیادہ فکرمندی تھی کہ خدائے علام الغیوب نے اُنھیں اِس کام کا مُکلَّف بنایا تھا کہ وہ مِلّت کے لیے موجودہ دور کے بھنور میں کشتیِ ملّت کے کھینے کی خاطر، علم وفکر اور سمجھ داری سے مسلح کوئی ناخدا تیار کرنے کی کوشش میں جو حصّہ بٹا سکتے ہیں ضرور بٹائیں۔ الغرض اُنھوں نے اپنی تمناؤں، محبتوں اور شفقتوں کے گھنیرے اور بارآور سائے میں اُنھیں پروان چڑھا کر، امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ (اور اب جھارکھنڈ بھی) کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز کردیا۔ برِصغیر کے تمام دیانت دار وحق گوئی کی جرأت رکھنے والے علما گواہ ہیں کہ قاضی مجاہد نے، اپنی ذہانت اور علمی استعداد کی وجہ سے اِس منصب کو چار چاند لگا دیے اور علم وقضا وفقہ وفتویٰ واجتہاد کی دنیا میں، رہتی دنیا تک کے لیے، اپنا نام جلی اور روشن حروف سے کندہ کردیا۔

فقیہانہ بصیرت وقائدانہ لیاقت کا آمیزہ

حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ کی ممتاز قائدانہ صلاحیت اور قاضی مجاہد الاسلام کی فقیہانہ بصیرت ومجتہدانہ شان سے، جو آمیزہ تیار ہوا تھا، اُس نے ملک وملّت کو کتنا فائدہ پہنچایا؟ اُس کی ہمہ گیری کا اِس سرسری تحریر میں جائزہ نہیں لیا جاسکتا، یہ کام کسی سنجیدہ موقع کے لیے کسی بصیرت نصیب اہلِ قلم کے حوالے کرتا ہوں؛ لیکن صرف اِتنا کہنے دیجیے کہ حالات کے موجودہ چوکھٹے میں، قیادت کے اِس خوش گوار اور بافیض ”معجون“ کے دوبارہ تیار ہونے کے دور دور تک آثار نہیں۔

ایک دن وہ آیا کہ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی، اِمارتِ شرعیہ کے نقطۂ خیر یا محدود دائرے سے، ملّت کی علمی ودینی وفکری قیادت کے ہندگیر صحرائے بے کنار کی وسعتوں پر چھاتے چلے گئے۔ اُنھوں نے فقہ اکیڈمی کی طرح ڈالی، ملّی کونسل کا راگ بنایا، فقہ

وفتاویٰ کے موضوع پر ٹھوس تصنیفی و تحقیقی نقوشِ جاوداں کندہ کیے، علما و فضلا کی ایک بڑی تعداد کو سرگرمِ کار کیا، فقہ وفتاویٰ کے موضوع سے دل چسپی رکھنے والے علما کو بہ طور خاص نئے نئے مسائل پر سوچنے، اُن کا حل ڈھونڈنے، اُن کے حوالے سے کتاب وسنت اور اصولِ شریعت کے ثوابت سے روشنی حاصل کرکے، نئے دور کی پیچیدگیوں کی راہ کو منوّر کرنے کی نہ صرف دعوت دی؛ بل کہ راہ نمائی کی۔ ہاتھ پکڑ کے چلنا سکھایا، اِس راہ پر دوڑنے کے لیے، بال و پر دیے اور ایک بڑے قافلے کو محوِ سفر کر دیا۔

ملّت کی راہ نمائی کے موضوع پر ہندوستان کے اَطراف واَکناف میں، بڑے بڑے مجمعوں؛ خواص کی محفلوں؛ علما کی مجلسوں؛ وکلا کی بزموں؛ اخبار نویسوں کی کانفرنسوں؛ دانش وروں کی انجمنوں؛ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملے جلے جلسوں؛ فقہی سیمیناروں؛ عالمی اجتماعات، مدارس کے جلسوں اور ملّت کے دکھ درد کی دوا کی تلاش کی مشاورتی کونسلوں میں، اُن کی خوب صورت تقریروں، فکر ونظر کے موتیوں کے رولنے کا انداز، سامعین کو شیریں سخنی سے محظوظ کرنے کا نرالا پن، حاضرین پر جادو کرنے کی طرح، تبسم آمیز کلام، ذہانت ریز سوز وگداز اور ہر مُخاطَب کو اپنی محبت کے منفرد رویّے سے، اسیر کر لینے کی اُن کی روش، لوگوں کو زندگی بھر یاد رہے گی۔

ہمیشہ جینے کے لیے کون آیا ہے؟؛ لیکن جس جانے والے کو زندگیِ مستعار کو جینے والے، جیتے جی کبھی نہ بھولیں، اُس کا جینا اور مرنا دونوں قابلِ رشک ہیں اور اِتنی ساری خلقِ خدا کی گواہی، خالق کے یہاں لائقِ اعتبار ہے؛ اِس لیے کہ مخلوق، خدا کا کنبہ ہے۔ حق مغفرت کرے کہ وہ بہت سی خوبیوں کے اعتبار سے عالم میں فرد تھے۔ (۱)



(۱) یہ مضمون قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے صرف دو تین روز بعد روز نامہ ''راشٹریہ سہارا'' کے ہفت روزہ ضمیمے کے خاص نمبر میں جو مرحوم قاضی صاحب پر مخصوص تھا، شائع ہوا۔ یہ بڑی عجلت میں مخدومی مولانا اسرار الحق قاسمی بانی وصدر ملی وتعلیمی فاؤنڈیشن وحال رکن ایوانِ زیریں لوک سبھا کی فرمائش اور تقاضے پر لکھا گیا تھا۔ انتہیٰ

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی..ایک عظیم فقیہ

ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے، گریباں سے جدا میرے بعد

مولانا کے تعلّق سے راقم کی معصومانہ یادیں

قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کو سب سے پہلے میں نے اپنی ۶-۷ سال کی عمر میں اپنے گاؤں رائے پور ضلع مظفر پور (حال سیتامڑھی) بہار میں دیکھا۔ دن اور تاریخ تو یاد نہیں؛ لیکن چودہویں صدی ہجری کی، آٹھویں دہائی کے، کسی سال کی، کسی تاریخ کو وہ اپنے قصبہ ''جالہ'' ضلع دربھنگہ، بہار سے (جو ہمارے گاؤں سے مشرق میں ۸-۹ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے) ہمارے گاؤں میں، اپنے دوست مولانا محمد اویس القاسمی رائے پوری متوفی بہ روزِ جمعہ ۱۴۱۹/۶/۳ھ= ۱۹۹۸/۹/۲۵ء کی دارالعلوم سے فراغت کے جلسہ ٔجشن کے اصل مُقرِّر اور مُعزَّز مہمان کی حیثیت تشریف لائے تھے۔ جشن کی یہ تقریب ہمارے خاندان کے ایک عالی مقام عالم اور بزرگ مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کے صاحب زادوں کی کھلیان کے لان میں سرِ شام منائی گئی تھی۔ اُس وقت کی اُن کی کوئی شبیہ میرے خانۂ خیال میں موجود نہیں، اِتنا یاد ہے کہ پورے گاؤں میں ہر ایک کی زبان پر عرصے تک اِس کا چرچا رہا کہ بلا داڑھی والے ایک نوجوان مولانا صاحب نے اِتنی خوب صورت، پیاری اور جادو انگیز تقریر کی کہ اِس گاؤں والوں نے تو کیا پورے علاقے والوں نے ایسی تقریر ماضی میں شاید ہی کبھی سنی ہوگی۔

اِس پُر مسرت واقعے کے بعد دو تین سال کے دوران میرے عمر وشعور کا قافلہ،

خاصی منزل طے کر چکا تھا، میں اپنے گاؤں کے دیرینہ مکتب کے، نیک سیرت وبابرکت مُلّاَ اِبراہیم عرف مولوی ٹھکن کے پاس قرآنِ پاک ناظرہ اور ابتدائی اردو فارسی کی تعلیم کے بعد ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ متوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء کے خطۂ مشرق یعنی دیارِ بہار کے منفرد خلیفہ حاجی شیخ منور علی نستوی دربھنگوی متوفی ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء کے قائم کردہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ (تاسیس ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) میں مذکورہ مولانا محمد اویس القاسمی رائے پوریؒ کی وساطت سے داخل ہو چکا تھا۔ گاؤں رائے پور اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ دونوں جگہ جامعہ خانقاہ رحمانی مونگیر (اِحیائے نو ۱۹۴۵ء/۱۳۶۴ھ) کے شیریں زبان وتازہ علم وقادر الکلام مدرس اور اِفہام وتفہیم کے امام مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا اِتنی بار ذکرِ خیر سنا کہ وہ نہ صرف میرے اور میرے ہم قریہ رفقائے درس کے قلب ودماغ کا حصّہ بن گئے؛ بل کہ وہ ہمارے ایک بزرگ فردِ خاندان کی حیثیت اختیار کر گئے۔ مشکل تھا کہ مشرق کے اِس وسیع تر خطے کا علم وآگہی کے حوالے سے کوئی تذکرہ ہوا ور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا تذکرہ نہ آئے۔ مدرسہ امدادیہ چوں کہ امیرِ شریعت حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء کی سرپرستی میں تھا؛ اِس لیے اُن کے ممتاز مدرسہ جامعہ خانقاہِ رحمانی مونگیر کے نوعمر اور ذہین مدرس مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا تذکرہ امیرِ شریعت کے ہر تذکرے کے ساتھ ناگزیر تھا۔ یہ دونوں ہی سال میں دوتین مرتبہ دربھنگے ضرور آتے، نیز خطّے میں ہونے والی کسی بھی اِسلامی سرگرمی کی سرپرستی کے لیے وارد ہوتے، تو یہاں ضرور تشریف لاتے۔ دربھنگہ ویسے بھی مولانا مجاہد کا وطنِ ثانی تھا کہ دربھنگہ شہر کے محلّہ ''قلعہ گھاٹ'' کی جامع مسجد کے مغرب میں بہنے والی ندی کے پچھّم جانب متصلاً واقع گاؤں ''مِہْدَوْلی'' میں مولانا کا سسرال تھا۔ عجیب اتفاق کہ موت کے بعد یہی ''مہدولی'' گاؤں اُن کی آخری آرام گاہ بھی بنا اور رہتی دنیا تک کے لیے، وہ اِسی کی خاک کا پیوند بنے رہیں گے اور کل قیامت کے دن وہ اِسی کی خاک سے اٹھائے جائیں گے۔ رہے نام اللہ کا۔

ہمارے علاقے کے تین بافیض علما

ہمارے بچپن میں ہمارے علاقے کے دار العلوم دیوبند کے تین فضلا کی صنعتِ علم میں اُن کی غیر معمولی استعداد کا آوازہ بلند تھا۔ نوعمری اور ناسمجھی کے اِس دور میں بھی ہم لوگوں نے اُن کی عظمت کی جو دھوم مچی ہوئی دیکھی، جس طرح اُن کا غُلغُلَہ بلند ہوتا ہوا دیکھا، اُس کی وجہ سے ہماری نسل کے تمام لوگوں کی نظروں میں کوئی اور فاضل پہلے اور بعد کا اپنی فی الواقع بھرپور صلاحیتوں یا صلاحیتوں کو باور کرانے کی اپنی "غیر معمولی صلاحیتوں" کے باوجود، کسی طرح نہ جم سکا۔ اُن تینوں سے میری مراد مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جالوی در بھنگویؒ، مولانا اویس القاسمی رائپوریؒ اور مولانا محمد قاسم انگوا مادھوپوری مظفرپوری مدظلہ ہیں۔

دار العلوم سے مولانا مجاہد الاسلام نے مولانا محمد اُویس القاسمی سے دو سال قبل فراغت حاصل کی۔ وہ جامعہ رحمانی مونگیر کی مسندِ تدریس پر فائز ہوگئے۔ جب کہ مولانا محمد اُویس نے دار العلوم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ امدادیہ در بھنگہ سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا اور مولانا محمد قاسم نے مدرسہ رحمانیہ سوپول ضلع در بھنگہ میں تدریسی ذمے داری سنبھالی۔ اُس زمانے میں مجھ جیسا خردسال بچہ یعنی ذرۂ بے مقدار، مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جیسے آفتابِ علم وفضل تک رسائی اور اُن سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کی جرأت بھی نہ کرسکا؛ لیکن مدرسہ امدادیہ کی طالب علمی کے تین سالہ دورانیے میں بار بار اُن کی دید وشنید سے مستفیض ہوتا رہا اور جامعہ رحمانی میں مولانا مجاہد کی تدریس وتفہیم کی جادوگری کا شہرہ ہم بچوں کے کانوں میں بار بار پڑتا اور اُن کی عقیدت ومحبت میں اِضافہ کرتا رہا۔

مولانا مجاہد اور امارت کے گیسوے برہم کو سنوارنے کا عمل

مولانا سیّد منت اللہ رحمانی نہ صرف ایک جلیل القدر عالم وقائد تھے؛ بل کہ رجال

شناس ورجال ساز مفکر ومدبر بھی تھے۔ اُنھوں نے جلد ہی اندازہ کرلیا کہ یہ نوجوان فاضل اوراُن کے مدرسے کا آفتابِ عالم تاب کی طرح چڑھتا ہوا مدرس، خاص قسم کی غیر معمولی فقہی بصیرت، زرخیز ذہن، قائدانہ لیاقت اور علم وفن کے صدف کا آب دار اور بے مثال موتی ہے؛ چناں چہ جب امیرِ شریعت رابع کی حیثیت سے مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا انتخاب عمل میں آیا، تو اُنھوں نے امارتِ شرعیہ کے قاضی ومفتی کی حیثیت سے مولانا مجاہد کو پھلواری شریف پٹنہ بھیج دیا۔ اُنھوں نے امارت کے گیسوئے برہم کو اپنے رفقائے کار (جن میں بے لوث ومخلص عالم وانتظامی صلاحیت میں طاق اُس وقت کے ناظم امارتِ شرعیہ حضرت مولانا سیّد نظام الدین مدظلہ سرِفہرست ہیں) کے مخلصانہ اشتراک وتعاون سے اِس طرح سنوارا کہ نہ صرف علم وقضا اور فقہ وفتویٰ کے منصب کو چار چاند لگ گئے؛ بل کہ امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ (اور اب جھارکھنڈ بھی) اُن کے نام کا عنوان اور اُن کی زندگی کا حصّہ بن گیا اور ایک کا تصوُّر دوسرے کے بغیر ممکن نہیں رہا۔ امارت کی جدّت کاری اور ترقی کے عمل میں جس طرح اُنھوں نے اور اُن کے رفقا نے خون پسینہ ایک کیا؛ بل کہ جگر کو خون کیا؛ جاں کاہی اور کوہ کنی کی جو زندگی بسر کی؛ ذہانت، فراست، بصیرت اور علم وآگہی کے خزانے کو جس طرح لٹایا؛ وسائل کی کمی، حالات کی سنگ دلی اور وقت کی جس بے التفاتی کا، کاروانِ امارت کو اُس زمانے میں سامنا رہا، وہ خود ایک مستقل تاریخ ہے اور خدّامِ اِمارت کی عزیمت کا نشانِ امتیاز بھی۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے کم وبیش ۳۵ سال تک یہاں قضا واِفتا کا جام اِس طرح لنڈھایا کہ ''قاضی'' اُن کے نام کا ہمیشہ کے لیے سابقہ بن گیا اور اب لوگ اُنھیں ''مولانا مجاہد الاسلام قاسمی'' کی بہ جاے ''قاضی مجاہد الاسلام قاسمی'' کہنے لگے۔ اُنھوں نے سیکڑوں معاملات کے اِسلامی شریعت کی روشنی اور فقہ واجتہاد کے اصول کی بنیاد پر نہ صرف فیصلے کیے؛ بل کہ سیکولر اور غیر اِسلامی ہندوستان میں اِمارتِ شرعیہ کے برپا ہونے کی صورت کو اُجاگر کیا اور عملی شکل میں مختلف صوبوں اور خطوں میں اُس کے قیام کی بارآور کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے بوریہ نشیں قاضی مجاہد اور اُن کے

اِخلاص پیشہ رفقا کی سعی کو قبولیت سے نوازا اور پھلواری شریف کی تنگ گلی کے دو ایک تنگ کمروں سے نکل کر امارتِ شرعیہ کا مرکز پھلواری شریف کی شاہ راہِ عام پر اپنے نئے، کشادہ، خوش منظر اور حوصلہ بخش دفتروں میں آ گیا اور اُس کی خدمات بھی ہندی مسلمانوں کی مُتنوّع ضروریات اور جذبات کا اِحاطہ کرنے لگیں؛ چناں چہ کئی عدد ٹیکنیکل اِنسٹی ٹیوٹ قائم ہوے، سجاد ہاسپٹل بنا، اَلْمَعْھَدُ الْعَالِيْ لِلْقَضَاءِ کا قیام عمل میں آیا، دار العلوم امارتِ شرعیہ کی بنیاد گزاری روبہ عمل آئی اور ملّت کی تمناؤں کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی مختلف شکلیں پیدا کی گئیں، بہار کے مدارس کو ایک نظام کے تحت مربوط کیا گیا، ریلیف کا کام وسیع پیمانے پر استوار کیا گیا، مکاتب کا جال پھیلایا گیا، اُمّت کے نوع بہ نوع دکھ درد کی زود اثر اور اصلی دوائیں اِیجاد کرنے کی طرح ڈالی گئی۔ اِس طرح امارت کا نام نہ صرف مسلمانوں بل کہ کم از کم بہار کی سطح پر حکومتِ وقت کی نگاہ میں مُعْتَبَر بن گیا، مشکل تھا کہ ملتِ اسلامی کے حوالے سے بہار گورنمنٹ کوئی قدم اٹھائے اور امارتِ شرعیہ کے چشم و ابرو کے اِشارے سے صرفِ نظر کر لے۔

تعمیرِ ذات وصفات کے عناصر ترکیبی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو اللہ تعالیٰ نے چند ایسی صفات سے نوازا تھا جو اُنھیں اپنے معاصرین و اَقران سے بالکل ممتاز کرتی تھیں۔ اُنھوں نے طالبِ علمی کے زمانے میں تحصیلِ علم میں کماحقُّہٗ محنت کی، خداداد فطانت اور حوصلہ مندی نے اُن کا ساتھ دیا، توفیقِ الٰہی ہم رکاب رہی، اَخّاذ اور بیدار ذہن نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے دینی، دعوتی، فکری وثقافتی وجود کی سب سے بڑی علامت کی حیثیت رکھنے والے اِدارے دار العلوم دیوبند پہنچے، یہاں اُنھیں دیگر یگانۂ روزگار اساتذہ کے ساتھ، بطلِ حریّت اور حقیقی معنی میں عالم باعمل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء کے سامنے زانوے

ادب تہ کرنے کا موقع ملا۔ دارالعلوم اُس زمانے تک حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کے اَنفاس کی گرمی کے طفیل، اپنے دیرینہ وبابرکت طرزِ کہن پر گام زن تھا۔ دارالعلوم کے اکثر اساتذہ شب بیدار تھے، دربان اور ملازمین میں بھی عبادت وریاضت کی سرمستی پائی جاتی تھی، خیروبرکت در وبام سے ابلتی تھی، چپے چپے پر ذکرِ الٰہی کا نقش نمایاں تھا، علومِ شریعت کی جامع تلقین کے ساتھ ساتھ، دل کی دنیا کی آبادی؛ بل کہ تابنا کی اور عقل وخرد کی پاکیزگی اور دعوت اِلی اللہ کے ذوق وشوق کی دلوں میں آب یاری اور امت کے مسائل اور دکھ درد کے مدوجزر پر ہمہ وقت، ہمہ گیر اور گہری نظر رکھنے کی صلاحیّت سازی کا اہتمام پایا جاتا تھا۔ مولانا مجاہدالاسلامؒ حضرت مدنیؒ کے فیضِ تعلیم وتربیت اور دارالعلوم کے اِس روح پرور ومردساز ماحول کے طفیل، خدا کی توفیق سے اَعلیٰ پایے کے عالم بن کر نکلے۔ اُن کے علم وفضل میں خیروبرکت کی بنیادی وجہ یہ بھی تھی کہ اُنھیں اپنے دیگر عالی مرتبت اساتذہ کے ساتھ ساتھ، شیخ الاسلامؒ اور اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے لاثانی اور لافانی عقیدت ومحبت تھی۔ اُنھیں اِن دونوں انتساب ہائے گرامی پر حد درجہ اِفتخار تھا، وہ جب بھی اِن دونوں کا، یا دونوں میں سے کسی ایک کا تذکرہ کرتے، تو بے طرح مچلتے اور جھومتے اور ایسے وقت میں اُن کے لہجے میں اِس قدر شیرینی اور عشقِ کرشمہ ساز کی وارفتگی پائی جاتی کہ سننے والا بھی وجد کرنے لگتا، وہ دارالعلوم سے عشق اور شیخ الاسلام سے تلمّذ کو مُقدّس ترین سرمایۂ زندگی سمجھتے تھے۔ وہ دارالعلوم آتے، تو اُن کے ہر رویّے سے ایسا محسوس ہوتا جیسے مچھلی، خشکی کی اذیّت سے پانی کی راحت میں آگئی ہے اور زندگی کی لذّتوں سے دوبارہ ہم کنار ہوگئی ہے۔ اُن کے تمام حرکات وسکنات سے ایسا لگتا کہ ایک عاشقِ محروم کو، حقیقی وصال کی لذّت اندوزیوں کا موقع مل گیا ہے۔ دارالحدیث فوقانی میں اُن کی عرصہ ۱۷-۱۸ سال پہلے (۱) کی ایک تقریر کے یہ جملے، میرے کانوں کو لگتا ہے کہ اب بھی محظوظ کررہے ہیں:

(۱) یہ عرصہ اس تحریر کے ربیع الاول ۱۴۲۳ھ/مئی ۲۰۰۲ء میں لکھے جانے کے اعتبار سے ہے۔

''دوستو! میں یہاں بیٹھ کر آپ سے مُخَاطَب ہوتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں؛ کیوں کہ میرے کانوں میں شیخ الاسلامؒ کی آواز، اِس کونے سے اب بھی آرہی ہے، صاف وشفّاف آواز، عشقِ رسولؐ کے آبِ زُلالِ سے دھلی ہوئی زبان کی پرسوز آواز: حدیثِ رسولؐ کی تلاوت کی آواز، اُن کا عربی لہجہ، اُن کا مدنی طرزِ ادا، اُن کی عالمانہ شان، اُن کی مجاہدانہ آن بان، اُن کا منور و پاکیزہ چہرہ، یقین پرور اندازِ کلام، دلوں میں گھر کر جانے والا خلوص۔ میں کہاں سے اَلفاظ لاؤں اور کس طرح میں اَلفاظ کو معانی وحقائق کی صحیح صحیح تجسیم کی طاقت بخشوں کہ وہ اُن اِحساسات وجذبات کی ترجمانی کا حق ادا کرسکیں، جو دارالعلوم میں آنے کے بعد، میرے قلب کی پہنائیوں اور دل کی اتھاہ گہرائیوں میں موج زن ہوجاتے ہیں۔ میں جذبات کے طوفان کو زبان سے کانوں تک منتقل کرنے سے قاصر ہوں۔ یہاں کے چپے چپے پر مہر ووفا کی جو جلوہ گری ہے، عشقِ بے خطر کی دولتِ بے بہا کا جو دریا یہاں رواں ہے، مکتب کی جو واقعی کرامت اور فیضانِ نظر کا جو کرشمہ یہاں ہر آن نظر آتا ہے؛ علم وفضل کی بے پناہی کے پہلو بہ پہلو آدم سازی اور قلب کی صیقل گری کا جو کارخانہ یہاں مصروفِ کار ہے، دینِ وسط اور توازن واعتدال کے ساتھ ساتھ، تعمیرِ نو کا جو درس یہاں دیا جاتا ہے؛ میں — سچی بات یہ ہے کہ — اُس کی تصویر کشی سے عاجز ہوں۔ یہاں آکر طالبِ علمانہ کھلاپن، طفلانہ معصومیّت، حوصلہ مندانہ نوعمری، لاپرواہ کم سنی، خودرائی شعار نوجوانی، یادوں کی بارات، ماضی کے خوب صورت نقوش، اُساتذہ کی شفقتیں، اُن کی فیّاضانہ ساقی گری؛ سبھی باتیں حافظے کے کینوس (Canvas) پر اُبھر آتی ہیں...''

کہا جاسکتا ہے کہ علم کی صنعت پر مولانا مجاہدؒ کو جو عبور تھا، وہ صرف اُن کی محنت وخوے جستجو، یا ذوقِ طلب وشوقِ سفرہی کا نتیجہ نہ تھا؛ بل کہ مذکورہ عشق وعقیدت کا بھرپور

فیضان تھا۔ شجر سے وابستہ رہنے کی عادتِ حسنہ، بہار اور اَن گنت نئے نئے برگ و بار کی ضامن ہوتی ہے۔ وابستگی کا منکر کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتا ہے، جس کی کوئی منزل ہوتی ہے، نہ راہ، نہ کارواں۔ مولانا مجاہدؒ کی علمی و فکری فتوحات کی بوقلمونیوں اور گل کاریوں میں مذکورہ فیضان ہر سطح پر نمایاں نظر آتا تھا۔

غیر معمولی ذہانت

اُن کا دوسرا امتیاز وصف یہ تھا کہ وہ غیر معمولی ذہین تھے۔ اُن کی ذہانت، محض کتابی علم اور مطالعہ و معلومات کی اسیر نہ تھی۔ وہ حالات، زمانہ، انسان، زندگی، معاشرے کے بھی نبض شناس تھے اور ہر نازک اور پیچیدہ مرحلے میں ''صحیح ترجیح'' یا ''پسند'' کو اختیار کرنے کے حوالے سے اُنھیں دیر نہیں لگتی تھی۔ ذہانت ہی کے طفیل وہ جوہر شناسی میں بھی طاق تھے، نیز ہر انسان سے اُس کے پسندیدہ رویّے کے مطابق پیش آنے اور اُس کو اپنا بنا لینے اور اپنا بنائے رکھنے اور صلاحیت کے مطابق فائدہ اٹھانے کا گُر جانتے تھے۔ اِس طرح اُنھوں نے اپنے گرد باصلاحیت افراد کو اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ اکٹھا ہو جانے والے مُتَنَوِّعُ الاستعداد افراد نہ کبھی اُن کے کارواں سے ٹوٹے، نہ کبھی خود اُن سے روٹھے، نہ اُن کے علم و عمل کے حرم سے بدگماں ہوئے۔ یہ اِس بات کی روشن دلیل ہے کہ علم و عمل کی اُن کی راہ مستقیم تھی، ورنہ زندگی کا تجربہ بتاتا ہے کہ کج مج کردار کے حامل اِنسان سے، لوگ بدگمان ہو کر، اُس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور محض علم کا گھنیرا پن اُس پیارے اور راحت بخش سایے کو وجود نہیں دے پاتا، جس میں آنے کا شوق لوگوں کو کھینچتا ہے اور اُس سے فائدہ اٹھانے کی آرزو مختلف الاقسام انسانوں کو اُس سے مربوط رکھتی ہے۔ مولانا مجاہد سے اگر کوئی کبھی بدگمان ہوا ہو گا، تو یقیناً، اُن کی ذات یا صفات کی وجہ سے نہیں؛ بل کہ اِرد گرد کے بعض افراد اور مشیرانِ کار کے غلط سجھاؤ کو بھی اِس میں دخل رہا ہو گا۔ نیز یہ کہ مولانا مجاہدؒ بہ ہر کیف ایک انسان تھے اور اپنے ماحول اور عصر ہی کی پیداوار تھے۔ اِنسان

بہ ہر کیف غلطی کرسکتا ہے؛ اِس لیے کسی انسان کو اُس کے مجموعی رویّوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیے؛ اِس لیے کہ صرف مولانا مجاہدؒ اور اُن کی قد کے لوگ یا اُن سے کم تر لوگ ہی انسان نہیں تھے؛ بل کہ ہم سبھی لوگ بھی انسان ہی ہیں اور ہم سبھوں کے اَعمال و کردار صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔

ذہانت ہی کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے کتابی علم کو نکھارا، اپنے مطالعے اور معلومات کو صیقل کیا اور اپنی آگہی کا دائرہ اِتنا وسیع کرلیا تھا کہ مُعاشَرے کے ہر طبقے کے لوگ اور جدید و قدیم دونوں حلقوں کے اَفراد، حتیٰ کہ مسلمان و غیر مسلم حضرات، اُن سے مل کر اور اُن کے افکار و خیالات سن کر یک ساں، طور پر نہ صرف مطمئن ہوتے تھے؛ بل کہ محظوظ بھی ہوتے تھے۔

شانِ ہائے امتیاز

اُن کو دوسروں سے یہ چیز بھی ممتاز کرتی تھی کہ اُن کا ملنے اور آنے جانے والوں کا استقبال کرنے کا انداز، اَلبیلا تھا۔ وہ اِس طرح مسکراتے ہوئے پیار سے ملتے اور اُن کے مُصَافِحے اور مُعَانَقے میں ایسی گرم جوشی اور اپنائیت ہوتی کہ بعض دفعہ آدمی ایک ہی ملاقات میں، اُن ہی کا ہو کے رہ جاتا۔ اُن کی شیریں گفتگو، عالمانہ تواضع، قدرتی انکسار، سادہ انداز، تصنّع کی آمیزش سے مکمل طور پر مُنزَّہ اچھے، سچے اور کھرے انسان کی ادا؛ ہر ملنے والے کا دل موہ لیتی تھی۔ چند منٹ کے لیے جائیے؛ لیکن ادائے دل نوازی، اُن کے پاس سے ہٹنے کی اِجازت نہ دیتی، اِلاّ یہ کہ آپ خود اُن کی مشغولیّت کو دیکھ کر واپسی کی اِجازت لے لیں؛ لیکن اِجازت لینے پر بھی بسا اوقات آپ کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں رکھ کر بھینچ لیتے اور کہتے بھائی اور بیٹھو، ابھی جی نہیں بھرا، کیا جلدی ہے؟ کتنے دن بعد آئے ہو، جلدی جلدی ملا کرو، تم سے ملنے کو جی چاہتا رہتا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے: علمائے مشاہیر میں، اُن کی طرح دل میں سما جانے والا، اسیر

کر لینے والا، اپنوں سے زیادہ اپنا بن جانے اور اپنا بنا لینے والا، کسی کو نہیں دیکھا۔ اُن کی خوش اَخلاقی اور دل آویزی کے ساتھ ساتھ، ملنے والے کو اُن کی ذہانت، علمی بے پناہی، فکر و فراست کا امتیاز اور امت کی مجبوری اور رَنجوری کی عالم گیر کیفیّت کے اِزالے کے لیے کارگر تدبیر تک رسائی کی، اُن کی کوششِ پیہم کا استحضار؛ اُن کی محبت کا ہمیشہ کے لیے اسیر کیے بغیر نہیں چھوڑتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کے دل کی وسعت کے سامنے دنیا کے ہر صحرا کی وسعت ہیچ ہے۔ ملنے والے کا دل گواہی دیتا تھا کہ گویا وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ، اُن کے دل میں جگہ پا سکتا ہے اور دیگر تمام ملاقاتیوں کے لیے بھی اُس کی وسعتیں کم نہ ہوں گی۔

شیریں یادوں کے اُجالے

اِس سلسلے کے ایک دو واقعات کا تذکرہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔ اوائلِ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ/ اواخرِ جنوری ۱۹۸۰ء کی بات ہے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں میری تدریس کے زمانے میں وہ اچانک وارد ہوے، اپنے اُسی محبت بھرے لہجے میں دعا وسلام کے بعد فرمایا کہ میں ایک ضرورت سے یہاں لکھنؤ آیا تھا، پھر ندوہ آنا ناگزیر تھا۔ یہ خیال بھی یہاں لے آیا کہ میری عرصے سے ایک تمنّا ہے کہ میں تم سے درخواست کروں کہ امارتِ شرعیہ کا اچھا سا تعارف، تم اپنی خوب صورت عربی میں لکھ دو اور جلدی لکھ دو۔ میں کچھ عذر کرنا چاہتا تھا؛ لیکن اُنھوں نے کوئی جملہ ادا کرنے نہ دیا اور فرمایا: میں سمجھتا ہوں، تم مدرس ہو، پڑھانے کے علاوہ دیگر بہت سے لکھنے پڑھنے کے مشاغل ہیں، مولانا علی میاں صاحبؒ (متوفی جمعہ ۲۲/ رمضان ۱۴۲۰ھ = ۳۱/ دسمبر ۱۹۹۹ء) کے تحریری کاموں میں بھی حصہ لینا رہتا ہے؛ لیکن تم کو اِس کے لیے بہ ہر صورت وقت نکالنا ہے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! وہ فلاں میرے دوست تو فلاں جگہ میں ہی رہتے ہیں، جہاں آپ یقیناً زیادہ آتے جاتے ہیں، اُن سے ربط کرنا بھی، میری بہ

نسبت زیادہ آسان ہوگا، آپ اُنھیں حکم فرمادیں، شاید کام اچھا ہو اور زیادہ جلدی۔ فرمایا: پھر تم نے بکواس شروع کردی۔ بھائی میں تم سے ہی یہ کام لینا چاہتا ہوں۔ اُن کی محبت وشفقت کے سامنے میں بے بس ہوگیا اور کوئی عذر نہ کرسکا کہ اُن کے پیار اور اپنائیّت کے انداز کے سامنے اظہارِ عذر، گناہ سا معلوم ہوا۔ یکم ربیع الثانی ۱۴۰۰ھ مطابق ۱۸؍فروری ۱۹۸۰ء بہ روز یک شنبہ کو میں مظفر پور سے پٹنہ آمد ورفت کے قدیم راستے یعنی ''پہلیجا گھاٹ'' سے اسٹیمر کے ذریعے، اُن سے کیے ہوئے مذکورہ وعدے کو وفا کرنے کے لیے، زندگی میں پہلی بار پٹنہ اور وہاں سے بہ ذریعہ تانگا، پھلواری شریف پہنچا۔ میں وہاں تین دن رکا۔ اِمارت کا دفتر پھلواری شریف قصبے کے بالکل اندر تنگ گلی کے ایک گھر میں واقع تھا۔ مولانا مجاہدؒ نے اِتنی محبت دی، اپنائیت، خوش اخلاقی، مہمان داری اور خورد نوازی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ میرے الفاظ اُس کی تصویر کشی سے قاصر ہیں، اکثر اوقات ساتھ ساتھ رہتے، دل لگاتے، چھوٹی سی مسجد میں پنج گانہ نماز میں ساتھ ہوتے، اکثر ساتھ ہی ناشتہ کرتے اور دو پہر کا کھانا کھاتے۔ ایک روز میرے ایک ندوی شاگرد یعنی مولانا شاہ عون احمد صاحب قادری خانقاہِ مجیبیہ والے کے بڑے صاحب زادے، جن کا نام غالبًا نصر احمد تھا، دعوت دینے آئے کہ والد صاحب نے آج رات کو کھانے پر مدعو کیا ہے اور رات کا قیام خانقاہِ مجیبیہ ہی میں تجویز کیا ہے۔ مولانا مجاہدؒ بڑی مشکل سے رضا مند ہوئے، عشا بعد خانقاہ کے لیے اپنی متبسمانہ ادا کے ساتھ، ہاتھ کو ہاتھ میں لے کے، اِس طرح رخصت کیا کہ جی چاہا کہ اپنے عزیز شاگرد سے معذرت کردوں کہ بھئی پھر کبھی دعوت کرلینا، اب کی بار تو مولانا کی صحبت سے محروم نہ کرو؛ لیکن مولانا مجاہدؒ نے یہ کہہ کر میری مشکل آسان کردی کہ جاتے ہو تو جاؤ؛ لیکن فجر کے بعد فوراً آجانا، ناشتہ میرے ساتھ کرنا ہے۔

○ شنبہ ۲۳؍رجب ۱۴۰۰ھ = ۳؍جون ۱۹۸۰ء کو میں اِمارت شرعیہ کے تعارف والے عربی کتابچے کا مسودہ مکمل شکل میں لے کر، صرف ایک روز کے لیے، اُسی

''پہلیجا گھاٹ'' کے اسٹیمر والے راستے سے ''مہندرو گھاٹ'' پٹنہ اور وہاں سے بہ ذریعہ ٹیمپو پھلواری شریف پہنچا۔ مولانا مجاہدؒ اُسی محبت اور گرم جوشی سے ملے؛ بل کہ عربی میں اِمارت کے تعارف والے کتابچے کو ''مالِ غنیمت'' سمجھ کر سوا خوشی کا اِظہار کیا۔ پھر تین دنوں بعد ہی واپسی کی اِجازت دی۔ بہت سی کتابوں اور منصوبوں کو عربی شکل دینے کے لیے رائے مشورہ کیا اور اِمارت کے قضا کے کاموں کی تفصیلات بتائیں۔ اُن دنوں کو یاد کرتا ہوں تو دل بھر آتا ہے۔

○ سہ شنبہ ۷ار شعبان ۱۴۰۰ھ = ار جولائی ۱۹۸۰ء کو میں اپنے وطن مظفر پور سے، لکھنؤ کے لیے روانہ ہوا۔ اُس زمانے میں مظفر پور سے ''سون پور'' تک تو بڑی لائن بن چکی تھی؛ لیکن اُس سے آگے لکھنؤ تک چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں تبدیل کرنے کا کام جاری تھا؛ اِس لیے لکھنؤ جانے والے مسافر، اکثر بس یا جیپ وغیرہ کے ذریعے سون پور پہنچ کر، وہاں سے بہ ذریعہ ٹرین سفر شروع کرتے تھے۔ میں مظفر پور سرکاری بس اڈے کے باہر ایک جیپ والے سے سون پور کے لیے بات ہی کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کرتے کو کھینچتے ہوے کہا نور عالم! میں نے جو مڑ کے دیکھا تو مولانا مجاہدؒ کو اچانک پا کر اِتنی خوشی ہوئی جیسے اُس شخص کو ہوتی ہوگی جسے عین مشکل کے وقت کوئی مخلص غم گسار مل جائے۔ فرمایا چلو ساتھ چلتے ہیں، سون پور تک ساتھ رہے گا، میں اِسی جیپ سے ''پہلیجا'' چلا جاؤں گا، تم سون پور میں اُتر جانا۔ جیپ پر سوار ہونے کے بعد میں نے خبر خیریت دریافت کرتے ہوے عرض کیا کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا ابھی چند روز قبل گرامی نامہ ملا تھا، اُنھوں نے حکم فرمایا تھا کہ ۲۴-۲۶ جون ۱۹۸۰ء کی کسی تاریخ کو میں پٹنہ یا مونگیر حاضر ہو کر نیاز حاصل کروں؛ لیکن خط تاخیر سے ملا؛ اِس لیے میں اِس سعادت سے محروم رہا۔ اُنھوں نے اپنے مکتوب میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ امارت شرعیہ پر تمھارا مقالہ ''خِدمَةٌ دِينِيَّةٌ عَظِيمَةٌ'' مستقل کتابچے کی شکل میں چھپا ہوا عزیزی ولی سلمہ (مولانا سید شاہ ولی رحمانی) نے دیا۔ تحریر بہت بلند ہے؛ لیکن طباعت ناقص ہے۔ یہ

سنتے ہی مولانا مجاہدؒ نے اپنے بیگ سے کتابچے کا ایک نسخہ نکال کر مجھے عنایت کیا۔ میں نے پوچھا کہ حضرت! آپ پھلواری شریف سے کب تشریف لائے؟ فرمایا میں ۱۸ر جون کو "جالہ" آیا تھا اور اِس وقت وہیں سے پھلواری جارہا ہوں۔ مولانا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوے فرمایا کہ دسیوں سال سے ہم آپ سفر کررہے ہیں؛ مگر کسی سفر میں ساتھ نہیں ہوا، حسنِ اتفاق کہ آج ساتھ ہوگیا۔ میں کتابچے کے مطالعے میں لگ گیا اور مولاناؒ انگریزی اور اردو اخبارات پڑھنے میں منہمک ہوگئے۔

مظفرپور سے سات کلومیٹر کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ جیپ والے نے یہ منحوس خبر سنائی کہ اُس کی گاڑی کا انجن بیٹھ گیا ہے؛ اِس لیے ہم لوگ کوئی دوسری سواری کی سوچیں۔ ہم لوگ بہت متفکر ہوے کہ کیا کریں۔ اِتنے میں ایک ٹرک آیا، جیپ کے دیگر مسافر اُس پر چڑھ گئے۔ مولانا، میں اور اُن کے رفیقِ سفر وہیں پڑے رہے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک چائے کی دکان میں جیسے ہی پہنچے کہ چند سوٹ بوٹ والے نوجوان نمودار ہوے، مولاناؒ کو دیکھتے ہی اَچنبھا ہوے، واقعہ کا علم ہوا، تو وہ معقول سواری کی تلاش میں لگ گئے، اِتنے میں ایک پرائیوٹ بس آئی اور اُن لوگوں نے احترام کے جذبات کے ساتھ، ہمیں اُس پر سوار کردیا اور ہمارے سارے سامان بھی ہاتھوں ہاتھ اُس پر ڈال دیے۔ بس چل پڑی تو میں نے مولاناؒ سے عرض کیا کہ یہ کون لوگ تھے؟ مولاناؒ نے فرمایا: بھئی! میں بھی نہیں جانتا؛ لیکن میں نے اُن سے یہ پوچھنا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ مروّت کے خلاف سمجھا، وہ اپنے دل میں سوچتے کہ یہ کیسے مولانا ہیں کہ میں اِنھیں پہنچانتا ہوں اور یہ مجھے نہیں پہچانتے؟ اندازہ یہ ہے کہ یہ لوگ ٹریننگ اسکول کے طلبہ ہیں کیوں کہ اِس گاؤں کا نام "ترکی" ہے اور یہاں کا یہ اسکول بہت مشہور ہے۔

اِس واقعے سے مولانا کی خوش خلقی، شرافت اور خوے اِنسانیت عیاں ہے۔ اِسی ہتھیار سے، اُنھوں نے ہزاروں دلوں کو فتح کیا اور ہزاروں آنکھوں کو اپنے بعد اشک بار چھوڑ گئے۔ غیر معمولی علم وفراست اور فطانت وذہانت کے ساتھ ملنساری، خوش اخلاقی

اور خندہ روئی کی اِتنی بڑی دولت، کم لوگوں کو ہاتھ آتی ہے؛ لیکن جن لوگوں کو ہاتھ آتی ہے، خلقِ خدا کی بڑی تعداد، اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے بعد، پھر اپنا ہاتھ کبھی نہیں کھینچتی؛ کہ دلوں کا فاتح، فاتحِ زمانہ ہوا کرتا ہے۔

○ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں، دارالعلوم دیوبند آمد کے بعد، مجھے متعدد مرتبہ امارتِ شرعیہ پھلواری شریف حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اب اِمارت کے سارے دفاتر پھلواری شریف پٹنہ شاہ راہِ عام پر، کشادہ اور شان دار عمارتوں میں منتقل ہو چکے ہیں۔ مولاناؒ سے ہر مرتبہ مل کر نہ صرف جی خوش ہوتا؛ بل کہ اُن کی اپنائیت اور شفقت میں اِضافہ محسوس ہوتا رہا۔ ایک آدھ مرتبہ میں بلا وقت بھی اُن کی خدمت میں جا دھمکا۔ ایک مرتبہ مجھے اپنے بعض مسائل کے حل کے لیے، بعض آزمودہ کار حضرات کے مشورے سے، مرحوم سے مدد لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اُنھیں ذاتی اور ناگزیر کام کے لیے زحمت دینے آیا تھا۔ وہ سابقہ تمام ملاقاتوں سے زیادہ خندہ پیشانی سے ملے، اُسی وقت پٹنہ کے سرکاری دفاتر کے بعض شناسا اور متعلق افسران کو انگریزی میں خطوط لکھے اور نتیجے کا انتظار کرنے کی تلقین کے ساتھ، مجھے اُسی ادائے دل داری کے ساتھ رخصت کیا اور فرمایا کہ بہ صورتِ دیگر مجھ سے دوبارہ ربط کرنا۔

○ دیوبند کے میرے اب تک کے ۲۰ سالہ دورانیۂ عمل کے دوران (۱) وہ کئی بار دیوبند تشریف لائے۔ وہ جب بھی تشریف لاتے، فوراً کسی کے ذریعے، جن لوگوں کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کا اہتمام فرماتے، اُن میں راقم الحروف بھی ہوتا۔ ایک بار مجھے دارالعلوم کے مہمان خانے میں تشریف آوری کے فوراً بعد، بہ جلد حاضر ہونے کا حکم فرمایا۔ میں جیسے ہی حاضر ہوا علیک سلیک کے بعد، مہمان خانے سے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے نیچے اترے، میں نے سمجھا کہ شاید میری قیام گاہ افریقی منزل قدیم تشریف لے جانا چاہتے ہیں؛ لیکن وہ دارالعلوم کی مسجدِ قدیم والے چوراہے کی طرف مڑے اور اُس

(۱) یہ سطریں ۱۴۲۳ھ=۲۰۰۲ء میں لکھی جارہی ہیں۔ امینی

کو میرا ہاتھ پکڑے ہوئے عبور کر گئے اور فوراً حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی (صاحب زادۂ گرامی حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ متوفی ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء) کے مکان میں داخل ہوگئے۔ میں نے اُنھیں جب دیکھا کہ یہ حضرت میرے ساتھ "ریڈلائن" (Redline) پار کررہے ہیں ——کیوں کہ دونوں دارالعلوموں: دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف دیوبند، میں جو دوری ہے، اُس کی وجہ سے ایک دارالعلوم کے اَساتذہ کا دوسرے دارالعلوم کے اَساتذہ سے ملنا جُلنا عملاً تقریباً بند ہی ہے (۱)—— تو میں نے اپنا ہاتھ جھٹکنا چاہا۔ مولانا نے جھٹ فرمایا:

چوں در دوستی مخلصم یافتی عنانم زصحبت چرا تافتی؟

اور فرمایا آؤ تو سہی مجھے تم سے ضروری کام ہے۔ حضرت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ کی بیٹھک میں جیسے ہی ہم لوگ داخل ہوئے، وہاں اخبار نویسوں کو دیکھا کہ وہ مولانا مجاہدؒ سے انٹرویو کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد واپس تشریف لائے اور سیدھے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اُن سے ملاقات کے بعد مہمان خانے واپس آئے۔ فرمایا کہ عزیزم! میں نے کویت کی وزارتِ امور مذہبی واوقاف کی طرف سے شائع کردہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کا اردو ترجمہ کروانے کا پروگرام تشکیل دیا ہے۔ اِس سلسلے میں تم سے زیادہ امیدیں وابستہ ہیں، دیگر فضلا کا بھی انتخاب کرلیا ہے؛ لیکن تمھیں سب سے زیادہ زحمت دینی ہے۔ یہ

(۲) اللہ جزائے خیر دے مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ اور مرحوم مولانا سید اسعد مدنیؒ کو کہ دونوں نے ذاتی طور پر پہل کر کے اواسط ذی الحجہ ۱۴۲۵ھ اواخرِ جنوری ۲۰۰۵ء سے اِس دوری کو ختم کردیا اور دونوں دارالعلوموں کے تقریباً سارے حجابات دور کردیے۔ سموار ۱۸رمحرم ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۸رفروری ۲۰۰۵ء کو مولانا سیّد اسعد مدنیؒ نے مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ کو اپنے گھر پر عصرانے پر مدعو کیا اور ۳ر مارچ ۲۰۰۵ء مطابق ۲۱رمحرم ۱۴۲۶ھ کو عشائیے پر مدعو کیا۔ اس کے دو تین ماہ بعد حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ نے مولانا سید اسعد مدنیؒ، اُن کے سارے اہل خاندان، دارالعلوم کے تینوں مہتممین اور دارالعلوم کے سارے درجۂ علیا کے اساتذہ کی زبردست اور پرتکلف دعوت، اپنے مکان پر کی۔

کہتے ہوے اُنھوں نے ایک جلد کا آدھا حصّہ، میرے سپرد کرتے ہوے فرمایا کہ اِتنے کا ترجمہ تو بہ جلد ہی کردو۔ یہ ناچیز دیوبند آمد کے دوایک سال کے بعد سے ہی مجموعۂ امراض سا ہوگیا ہے، کارہاے مفوضہ کی انجام دہی کے بعد، دیگر کوئی کام مشکل سے کرپاتا ہے؛ لیکن محبت افشانی اور پیار پاشی کے اُن کے انداز کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہ کرسکا؛ مگر دو ڈھائی سو صفحات کا ترجمہ بہ مشکل تمام ایک سال میں مکمل ہوسکا، جس کو فقہ اکیڈمی کے مولانا امین عثمانی صاحب ندوی کے سپرد کرکے میں نے بڑی شرمندگی کے ساتھ، اُن سے معذرت کرلی۔

○ وہ کئی مرتبہ از خود اور بعض دفعہ میری درخواست پر، میری قیام گاہ افریقی منزل قدیم نزد چھتہ مسجد دیوبند تشریف لائے۔ ایک بار تو خاص میری عیادت کو آئے، فرمایا سنا ہے کہ تمھیں تلوے میں اکثر زخم رہا کرتا ہے، دیکھیں کہاں ہے؟ میں نے زخم کھول کر دکھایا، تو پوچھا کہ تم کہاں علاج کراتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اکثر دیوبند ہی میں کسی ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہوں کہ یہ آسان ہے، جب زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، تو دہلی میں "آشرم" کے علاقے میں واقع "جیون نرسنگ ہوم" کا قصد کرتا ہوں کہ حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ متوفی ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء —— جو اُن دنوں الحمدللہ حیات تھے —— اکثر اپنا علاج بھی وہیں کراتے ہیں۔ فرمایا: دیکھو یہ کوئی ادب اور زبان کا مسئلہ نہیں ہے کہ تم مولانا کیرانوی کی اِس سلسلے میں بھی تقلید کرتے ہو۔ تم ایک آدھ بار یا تو پٹنہ آؤ؛ ورنہ دہلی میں میری موجودگی کے وقت کبھی دہلی آؤ، تمھارا علاج میں کسی اچھی جگہ کروانا چاہتا ہوں۔ میں آج کل کرتا اور سوچتا ہی رہا کہ مولاناؒ کے حکم کے مطابق دہلی میں اُن کے توسُّط سے، کوئی کارگر علاج کسی موقع سے ضرور کراؤں گا کہ اِتنے میں مولانا خود انتہائی بیمار اور لاچار؛ بل کہ رہینِ فراش اور آخرش بسترِ مرگ پر دراز ہوگئے۔ وقت، موقع اور حالات کس کا انتظار کرتے ہیں کہ میرا یا مولانا مجاہدؒ کا کرتے؟!۔

○ یوں تو وہ عرصے سے شکر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور اُس کے عوارض روز افزوں تھے؛ لیکن اپریل ۱۹۹۸ء (ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ) میں اِس تشخیص کے بعد کہ اُنھیں کینسر کا جان لیوا مرض لاحق ہو گیا ہے، علاج کے لیے، اُن کا مستقل قیام دہلی ہی میں رہا۔ پہلے وہ حضرت نظام الدین ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک مخلص کے مکان میں کئی ماہ رہے، پھر (۱۶۶) ذاکر باغ اوکھلا، میں سکونت اختیار کی۔ وہ بار بار اپولو ہسپتال میں داخل ہوتے رہے، یا اُسی ہسپتال کے ڈاکٹر کے مشورے اور نگرانی میں اُن کا پیہم علاج ہوتا رہا۔

دہلی کے اِس طویل قیام کے دوران، مُتعَدِّد مرتبہ عیادت اور ملاقات کے لیے حاضر ہوا، بیماری کے باوجود تصنیفی و تحقیقی مشاغل اور ملّت کے ہمہ جہت مسائل کے حوالے سے، ہمہ وقت متفکر رہنے کی وجہ سے؛ اُن کا وقت اِنتہائی مصروف رہا کرتا تھا، مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے بعد، اُن کی ذمے داریاں دو چند ہو گئی تھیں؛ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی رفیقِ کار یا خادم نے اُن سے یہ کہا ہو کہ دیوبند سے نور عالم آیا ہے اور اُنھوں نے اُسی وقت اندر نہ بلا لیا ہو۔ جب بھی ملتا سراپا محبت و شفقت نظر آتے، مصافحہ کرتے وقت دیر تک ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے رہتے اور فرماتے تم ایسے چند مخلصوں سے مل کر زندگی پر اعتماد بہ حال ہو جاتا ہے۔ کبھی فرماتے اِتنے دنوں بعد کیوں آئے ہو؟۔ اِدھر آخری چند ہفتوں سے وہ اپنی زندگی سے مایوس سے ہو گئے تھے؛ لیکن خوش اَخلاقی اور خندہ روئی کا خزانہ وہ حسبِ سابق لٹاتے رہے۔

غیر معمولی قادر الکلامی

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو، اُن کے مُعاصِرِیْن و اَقْرَان علما سے یہ بات بھی ممتاز کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے، اُن کو غیر معمولی قدرتِ گویائی سے نوازا تھا۔ گویائی کے دعوے دار ہماری صف میں بہت سے لوگ نکل آئیں گے، جو بے ہنگم طریقے سے

(۱) بے ہنگم: بھونڈا، غیر موزوں

شور مچانے اور بے تکان گھنٹوں سمع خراشی اور گلے کی مشق کی بَلا کی صلاحیت رکھتے ہیں؛ لیکن میری مراد یہ نہیں۔ مولانا مجاہدؒ بھرے مجمع میں تقریر کرتے، یا کسی مجلس میں کوئی گفتگو کرتے، تو مُتعلِّقہ موضوع کو ترتیب کے ساتھ، خوش اُسلوبی کے ساتھ اور اُس کے تمام ممکنہ گوشوں کا اِحاطہ کرتے ہوے، اِس طرح مُدلّل، منظّم، با قاعدگی، خوداعتمادی اور ڈھنگ سے پیش کرتے کہ مُخاطَب نہ صرف مُتاثّر ہوتا؛ بل کہ مرعوب ہو جاتا تھا۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بڑے ماہر تھے، تعبیر کی خوبیوں اور خرابیوں اور طرزِ ادا کے محاسن ومعائب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ موضوع خواہ مسلم پرسنل لا کا ہو، اِسلامی فقہ کا ہو، ملکی اور بین الاقوامی قانون سے تعلق رکھتا ہو، تفسیر وحدیث کا موضوع ہو، یا عربی زبان وبیان اور اُس کے قواعد کی بات ہو، یا تازہ ترین حالات پر تبادلۂ خیال ہو، یا ہندی مسلمانوں کو درپیش چیلنج زیرِ غور ہو، یا اخبار نویسوں کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مطمئن کرنا ہو؛ مولانا مجاہدؒ کی شگفتہ، شُشتہ، برجستہ، نپی تلی، بلیغ، موقع ومحل کے لیے موزوں، موتیوں کی طرح پروئی ہوئی، حشو وزوائد سے پاک اور حجت وبرہان سے مستحکم گفتگو؛ مخاطب کو زبانِ حال اور بعض دفعہ حال اور قال دونوں کی زبانوں سے یہ کہنے پر مجبور کردیتی تھی کہ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ قانونی پہلو والی پیچیدہ اور طویل گفتگو کو حیرت ناک انداز اور آسان زبان میں مختصراً پیش کرنے میں طاق تھے۔ یعنی بہ وقتِ ضرورت کسی بھی موضوع کا خلاصہ، یا اُس کا جوہر نکال کر مُخاطَب کے سامنے رکھ دینے کی عجیب سی قدرت رکھتے تھے اور اگر کسی موضوع کو شرح وبسط کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے، تو قطرے کو سمندر اور ذرّے کو بیاباں بھی بنا دیتے۔ یعنی مقام اور موضوع کا جیسا تقاضا ہوتا، ویسا کرتے۔

پھر عجیب سی بات یہ تھی کہ مخاطبین خواہ علما ہوں، یا مفتیانِ کرام، مفکرینِ اسلام

ہوں، یا دانش ورانِ قوم، زُعمائے وطن ہوں، یا اخبار نویس، وکلا ہوں، یا ڈاکٹر، انجینیر، یا انگریزی تعلیم یافتہ اور نئے طبقے کے لوگ ہوں، یا قدیم طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، یا سیاست داں ہوں؛ پھر یہ کہ صرف مسلمانوں کا مجمع ہو، یا صرف غیر مسلموں کا، یا دونوں فرقوں کا؛ مولانا مجاہدؒ سبھوں سے اپنی چشم کشا اور بصیرت افروز گفتگو سے، اپنے خیالات کی سچائی اور نقطۂ نظر کی صحت کو منوا لینے میں فرد تھے۔

اِس سلسلے میں اُن کی ذہانت، علمی جامعیّت، شیریں سخنی، موضوع پر قابو، مطالعے کی وسعت، حالاتِ حاضرہ سے آگاہی اور اردو وعربی کے علاوہ انگریزی زبان پر دست رس بھی اُن کا ساتھ دیتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے بعد (جو دراصل حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی تحریک وفکر، مولانا مجاہد کی منصوبہ بندی اور ہندی مسلمانوں کے گوہرِ شب چراغ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیادت وسرپرستی میں معرضِ وجود میں آیا) حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور مولانا مجاہدؒ کی ملی خدمات کا قافلہ، جب بہار سے پورے ملک کے لیے سرگرمِ سفر ہوا اور محبانِ دین کو دونوں غازیانِ کردار وگفتار کے خلوص اور قائدانہ صلاحیّت سے واقفیت ہوئی، تو اکثر لوگوں کو کہتے سنا کہ مولانا منت اللہ رحمانی اگر ملّت کی گاڑی کا مضبوط انجن ہیں، تو مولانا مجاہدؒ اِس انجن کا پٹرول ہیں۔ یعنی اول الذکر کا دماغ ایک نقشہ بناتا ہے اور ثانی الذکر کا علم وفکر اُس میں رنگ بھرتا ہے اور اپنے علم کی تازہ کاری اور فکر کی بالیدگی اور زبان وبیان کی شیرینی سے، ملی خدمات کے نئے نئے علاقوں کو فتح کرتا ہے۔

مولانا مجاہدؒ کی قادر الکلامی اور ذہانت وفطانت کی پروردہ بلاغتِ لسانی کے حوالے سے، ایک واقعے کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا۔ لکھنؤ میں چار باغ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک مسلم مسافر خانہ نیا نیا بنا تھا، اواخرِ جمادی الاولی ۱۳۹۸ھ/ اوائلِ مئی ۱۹۷۸ء میں اُسی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کی اہم میٹنگیں منعقد ہوئیں، جن

میں بورڈ کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی، اُس وقت کے قاضی شریعت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، اُس وقت امارتِ شرعیہ کے ناظم اور اِس وقت امیر شریعت وسکریٹری جنرل بورڈ مولانا سید نظام الدین، ندوۃ المصنّفین دہلی کے بانی وسرپرست اور ممتاز اسلامی قائد مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی متوفی ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء، مدرسہ امینیہ دہلی کے سابق استاذ مفتی ضیاء الحق دہلویؒ، امیر جماعتِ اسلامی مولانا یوسفؒ، سابق امیر جماعت مولانا ابواللیث ندویؒ، آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر ابراہیم سلیمان سیٹھؒ اور اُس کے اہم لیڈر غلام محمود بنات والاؒ، نیز مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ اور عالم وداعی اِلی اللہ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ متوفی ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء، لکھنؤ کے فرنگی محلی عالم مولانا ہاشم میاںؒ، ندوہ کے شیخ التفسیر مولانا محمد برہان الدین سنبھلی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے شرکت کی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ (جنھیں اعترافِ حق کی غیر معمولی توفیق سے خدائے بخشندہ نے نوازا تھا اور جو خود بے نظیر اور عالَم میں انتخاب عالم ومفکر وادیب وخطیب تھے) جب بھی مذکورہ میٹنگ کی کسی نشست میں شرکت کے بعد، دار العلوم ندوۃ العلما کے مہمان خانے میں تشریف لاتے، جہاں اُن کا لکھنؤ آمد کے وقت قیام رہا کرتا تھا، تو وہ اُس میں ہونے والی گفتگو اور مسائل پر ہونے والے تبادلۂ خیال سے زیادہ، والہانہ انداز میں، بار بار مولانا مجاہدؒ کے حسنِ بیان، قانونی نزاکتوں اور فقہی نقطوں کی دیدہ ورانہ تشریح کا، منھ بھر بھر کے اور مزے لے لے کر تذکرہ کرتے اور فرماتے کہ مولانا مجاہدؒ ہندی مسلمانوں کا قیمتی سرمایہ ہیں، اللہ نے عجیب سی قدرتِ گفتار سے نوازا ہے، جس بات کو دیگر علما گھنٹوں میں بیان نہیں کر سکتے، مولانا مجاہد نے منٹوں میں اِس طرح بیان کر دیا کہ لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ ضرورت ہے کہ اُنھیں آگے بڑھایا جائے اور ملک وملّت کے مسائل کے حل کے لیے، اُن کے تازہ وبھرپور علم، قادر الکلامی اور حیرت ناک ذہانت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

فقہ وقضا و اِفتا کے لیے قدرتی طور پر ڈھلا ہوا ذہن

برِّ صغیر کے علما میں وہ اِس بات میں بھی ممتاز تھے کہ اُن کا ذہن، علمِ فقہ اور قضا و اِفتا کے لیے خدائے علیم نے خاص طور پر ڈھالا تھا، ایسا لگتا تھا کہ وہ عصرِ حاضر میں، اِس صنعت کے خاص عالم کی حیثیت سے پیدا ہوئے تھے۔ اُن کو اِس باب میں جو مہارت وبصیرت تھی، اُس میں پاکستان کے مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کے بہ جا طور پر استثنا کے ساتھ، اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اِس دعوے کو شاید ہی کوئی اِنصاف پسند اور حق گو عالم چیلنج کر سکے۔ اُن کی شہرت جب اندرونِ ملک سے بیرونِ ملک پہنچی اور عالمِ عرب وعالمِ اسلام کے علما ہی نہیں، وہاں کے قانون دانوں کو اُن کی ہمہ گیر فقہی بصیرت کا علم ہوا، تو سبھوں نے اُن کا لوہا مانا، چناں چہ عالمِ عرب کے علاوہ دیگر مغربی اور افریقی ممالک میں اُنھیں فقہی، شرعی اور علمی سمیناروں میں دعوت دی گئی، وہاں کے مُتعدّد فقہی و علمی اِداروں کے ممبر اور سرپرست مُنتخَب ہوئے، ہر جگہ نہ صرف اُن کی پذیرائی ہوئی؛ بل کہ فقہ وقضا واجتہاد میں اُن کی انفرادیّت کا ماہرینِ فن اور مفکرین نے کھل کر اعتراف کیا۔ کویت، سعودی عرب اور مصر کے علما وارباب ِعلم و دانش نے تو بہ طورِ خاص اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جامعہ ازہر کے موجودہ شیخ سید طنطاوی(۱) اُن سے بہت مُتاَثّر تھے۔ علومِ شریعت میں اُن کی گہرائی کو خراجِ عقیدت ہی کی بات تھی کہ اُنھیں اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ، اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ، علمی اکیڈمی شام، ہیئۃ خیریہ اسلامیہ کویت وغیرہ کا، رکن منتخب کیا گیا اور اندرونِ ملک تو وہ اِسلامی فقہ وقضا کا عنوان؛ بل کہ اُس کی آبرو تھے۔ عالمِ اسلام کے علما وفقہا، اُن سے ایک ملاقات کے بعد ہی اُن

---

(۱) اِس مضمون کو کتابی شکل میں شائع کرنے کے لیے پروف ریڈنگ کے دوران آج بہ روز چہارشنبہ: ۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۰ مارچ ۲۰۱۰ء کو سعودی عرب میں (جہاں وہ فیصل ایوارڈ لینے کے لیے آئے ہوئے تھے) انتقال ہو گیا، مسجدِ نبوی میں نمازِ جنازہ اور مدینہ منورہ کے مشہور ومبارک قبرستان ''جنت البقیع'' میں اُن کی تدفین ہوئی۔

کے گرویدہ ہوجاتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ سعودی عرب کے محکمۃ العدل ریاض میں تشریف لے گئے، قاضیوں سے ملاقات ہوئی، فیصلوں کے طریقوں پر تبادلۂ خیال ہوا۔ مولانا مجاہدؒ نے جب وہاں کے قاضیوں کو اِس راہ کے اپنے طویل تجربوں اور امارتِ شرعیہ میں اپنے فیصلوں کے انداز پر، عربی میں فاضلانہ گفتگو کی، تو وہ لوگ اُن کا منھ دیکھتے رہ گئے۔ اُس وقت اُن قاضیوں نے طے کیا تھا کہ وہ وقتاً فوقتاً مولانا مجاہدؒ کو مدعو کرکے، اُن کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھائیں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ بعد میں اِس پر عمل ہوا کہ نہیں۔

مدینہ منورہ میں شیخ عطیہ سالم مالکیؒ سے ایک مرتبہ تفصیلی ملاقات ہوئی، وہ مولاناؒ کے علم وتفقہ سے حد درجہ مُتاَثّر نظر آئے اور فرمایا کہ اگر میں اِس وقت قضا کے منصب پر ہوتا، تو آپ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی، مجھے آپ جیسے عمیق العلم اور ذہین علما کی جستجو رہتی ہے۔

فکر ونظر کی بھرپور وسعت

مولانا مجاہدؒ کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ اُن میں فکر ونظر کی بھرپور وسعت پائی جاتی تھی؛ لیکن ساتھ ہی اُن میں مومن کا توازن اور علومِ شریعت میں گہرائی رکھنے والے عالم کی شانِ اعتدال اور ثوابت ومبادی پر جمنے کی خوبی بھی پائی جاتی تھی۔ وسعتِ نظری کی وجہ سے، اُن میں وسیع الظرفی تھی اور وسیع الظرفی اور کشادہ قلبی کی وجہ سے، اُن کے اندر دوسروں کو برداشت کرنے اور کلمۂ توحید کی بنیاد پر، امتِ مسلمہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور اتحادِ ملّت کی دعوت کو زور وشور سے ہر موقع سے، ہر بزم میں، اور اجلاسِ عام وجمعِ خاص میں، پیش کرنے کا نہ صرف داعیہ پیدا ہوا؛ بل کہ اُنھوں نے اِس دعوت کو عملی طور پر برپا کرنے کے لیے، اپنی تمام صلاحیتوں اور اِمکانات کا لیاقت کے ساتھ استعمال کیا۔ اُنھوں نے اپنے قول وعمل سے ہر جگہ یہ ثابت کردکھایا کہ امت اور ملّت کی وحدت اصل ہے اور باقی تمام سرگرمیاں، تحریکیں، تنظیمیں، اِدارے، انجمنیں،

جماعتیں اِس کی فرع ہیں۔ مسلک اور نقطۂ نظر کا اختلاف، امت کے اتحاد کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے؛ ورنہ ملّت کا وجود ہی معرضِ خطر میں آجائے گا، خصوصاً ہندوستان جیسے ملک میں جو دستور کے اعتبار سے خواہ سیکولر ہو؛ لیکن اکثریت کی بڑھتی ہوئی جارحیت اور ہندو مذہب کی جارحانہ تعبیر و عمل کی وجہ سے، تمام سرکاری اداروں اور مشینریوں کی سمتِ سفر میں تیزی سے جو خطرناک تبدیلی رونما ہو رہی ہے، وہ ننگی تلوار بن کر ملت کے سر پر لٹک رہی ہے؛ اِس لیے اب اگر تحزّب، تعصّب، تنگ نظری اور مسلکی اختلافات کو دین بنالینے کی کوشش کی گئی، تو یہ بڑے جرم کی بات ہوگی اور ایسا کرنے والوں کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (جس کے وہ شدید علالت کے زمانے میں، مفکرِ اسلام مولانا علی میاں کی رحلت کے بعد صدر بھی ہو گئے تھے) تو شروع سے ہی، ہندی مسلمانوں کا سب سے زیادہ مضبوط اور وسیع البنیاد پلیٹ فارم رہا، جس کو مولانا مجاہدؒ نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی سرپرستی میں، اول دن سے ملّت کے اتحاد و اتفاق کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد کے لیے پرسنل لا بورڈ نے جو کوششیں کیں اور ملّت کی ملی و شرعی زندگی سے متعلق مسائل کے سلسلے میں جو اجتماعی فیصلے کیے، اُس کی نظیر آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کسی اور تنظیم کے حوالے سے ہرگز نہیں پیش کی جاسکتی۔

مولانا مجاہد اور ملی کونسل

اتحادِ ملّت ہی کے جذبے سے اُنھوں نے کئی سال قبل آل انڈیا ملی کونسل کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد گزاری کی؛ تاکہ ہندی مسلمانوں کے مسائل کو متحدہ پلیٹ فارم کے ذریعے مؤثر طور پر پیش کیا جاسکے۔ مولاناؒ کے اِس اقدام سے نہ صرف مسلمانوں کی صفوں کے سیاسی طالع آزماؤں کو قلبی اذیّت ہوئی؛ بل کہ علما کی صف میں

اُن کے بہت سے مخلصوں کو بھی اُن کے اِس فیصلے سے آخر وقت تک اختلاف رہا۔ ثانی الذکر لوگوں کا اختلاف سچی نیت پر مبنی تھا؛ کیوں کہ اُن کو بہ جا طور پر اندیشہ تھا، جو بعد میں حقیقت بن کر سامنے آیا، کہ مولانا مجاہدؒ جیسے عالمِ جلیل اور فقیہِ وقت کو پرسنل لا بورڈ اور امارتِ شرعیہ، نیز فقہ اکیڈمی کے بعد کسی اور پلیٹ فارم کی ضرورت نہ تھی کہ کسی درجے میں بھی سیاسی شناخت رکھنے والی تنظیم سے اُن کے انتساب کی وجہ سے، سیاسی قسمت آزما لوگ اُن کو اپنا حریف بنالیں گے اور بلاضرورت اُن جیسا بلند نگاہ، مخلص اور علومِ فقہ وقضا کا بے بدل عالم، سیاسی اختلافات اور حریفانہ کش مکشوں کا نشانہ بن جائے گا اور ملّت کی فقہی راہ نمائی، شرعی گرہ کشائی اور نئے نئے مسائل کے لیے دینی حل کی راہ پر، جس قافلے کو اُنھوں نے سرگرمِ سفر کیا ہے، اُس کی رفتار سست پڑ جائے گی؛ بل کہ ہوسکتا ہے کہ یہ قافلہ اپنا سفر ہی روک دے۔

اہلِ علم وفکر کے بہت سے اِقدامات سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا رہے گا؛ اِس لیے مولانا مجاہدؒ کے اِس فیصلے یا دیگر اِقدامات سے اختلاف کرنے والوں کو کون روک سکتا ہے؛ لیکن اُن کے خلوص اور نیک نیتی سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ ملی کونسل نے ملی خدمات کے میدانوں میں اپنی نوعمری، مولانا مجاہد کی ہمہ قسم کی علالت، مخلص اور معتد بہ تعداد میں لائق افرادِ کار کی عدمِ دست یابی اور بعض دیگر رکاوٹوں کے باوجود؛ مُتعَدّد ایسے کام انجام دیے، جو کسی اور تنظیم اور جماعت نے انجام نہیں دیے۔ مثلاً مسلمانوں کی حقیقی بیداری کے جو بہت سارے خاکوں میں رنگ بھرا گیا، اُنھیں تعلیمی اور عصری ثقافت کی سطح پر خصوصاً ٹیکنیکل اور طبی تعلیم کے میدان میں معقول بلند سطح تک پہنچانے کی جو کوشش کی گئی، اس طرح کے جو تعلیمی ادارے قائم کیے گئے؛ نیز سرکاری مشینری کے ظلم کے شکار مسلمانوں کے لیے، ہر علاقے میں قانونی چارہ جوئی کا جو مؤثر نظام برپا کیا گیا اور ٹاڈا جیسے ظالمانہ اور فسطائی قانون کے خلاف جو فعّال قدم اٹھایا گیا؛ اِسی طرح مسلم سیاست دانوں کو باقاعدہ طور پر جوڑنے کی جو کارروائی کی گئی، ملک کے دانش وروں اور

چوٹی کے زعما و قائدین سے بلا تفریقِ مذہب و ملت، جس طرح رابطہ استوار کر کے، ٹھوس بنیادوں پر مسلمانوں کے مسائل و مشکلات سے اُنھیں آگاہ کر کے اور اُن مسائل کو انسانی بنیادوں پر حکومتی، سیاسی، اِبلاغی اور عوامی سطح پر پیش کرنے کی اُنھیں جس طرح دعوت دی گئی؛ یہ سب کارنامے ملی کونسل کو دیگر مسلم جماعتوں سے امتیاز کی سند عطا کرنے کے لیے کافی ہیں اور ملی کونسل کے حوالے سے یہ سارے کارنامے مولانا مجاہدؒ کے اور ثانیاً اُن کے خلوص کیش رفقا کے نامۂ اعمال میں اِن شاء اللہ درج ہوں گے۔

فقہ اکیڈمی انڈیا

مولانا مجاہدؒ کا یہ کارنامہ بھی ممتاز اور نا قابل فراموش ہے کہ اُنھوں نے فقہ اکیڈمی انڈیا کی تاسیس، اُس کے سمیناروں اور فقہی اجتماعات کے ذریعے، نہ صرف یہ کہ اَن گنت نئے نئے مسائل کے شرعی حل پیش کیے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے طرز پر، عمل کرتے ہوئے اجتماعی اجتہاد کے نقطۂ نظر کو عملی جامہ پہنایا، عام کیا اور علما کو اس کا عادی بنایا؛ بل کہ اُس پلیٹ فارم کے ذریعے اُنھوں نے نوجوان علما و فضلا کو نئے حالات و مسائل پر سوچنے، لکھنے، غور کرنے اور بولنے کے لیے، حوصلہ دیا اور نوجوان علما کی ایک بڑی جماعت کو صحیح وقت پر صحیح سمت میں سرگرمِ سفر کر دیا اور بہت سے لوگ فقہ و اجتہاد کے متنوع موضوعات پر لکھ کر مصنف و مؤلف بن گئے اور بنتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ اُن کا اِحسان نہ بھی مانیں تو شکر گزار اللہ کے یہاں تو مولانا مجاہدؒ کے سارے اِحسانات ریکارڈ ہیں۔ فقہ اکیڈمی کے سمیناروں میں جو مقالات پڑھے گئے، وہ بہ جائے خود عظیم فقہی سرمایہ ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ سارے مقالات و تحقیقات مطبوعہ شکل میں موجود ہیں، کاش اُن کے سچے خلف اُنھیں عربی زبان میں منتقل کروا سکتے۔

اِس کے علاوہ فقہ اکیڈمی ہی کی طرف سے اُنھوں نے ''بحث و نظر'' کے نام سے جو وقیع علمی و فقہی رسالہ جاری کیا اور جو آخر تک جاری رہا، وہ مستقل کارنامہ ہے، اُس

کے ذریعے بہت سے علمی، فقہی، تحقیقی مقالات اہلِ علم اورارباب فقہ وفتویٰ کے لیے چشم کشا ثابت ہوئے اور بہت سے لوگوں کے لیے فکر وعمل کی تحریک کا ذریعہ بنے۔

علمی نقوش

قائدانہ، مفکرانہ، فقیہانہ اور سیاسی وسماجی وملی سطح پر بے پناہ مشاغل اور اِدھر سال ہا سال سے شدید قسم کی علالت کے باوجود، مولانا مجاہد نے جو علمی وتالیفی نقوش چھوڑے ہیں، وہ بھی معیار ومقدار دونوں اعتبار سے غیر معمولی ہیں اور مرنے کے بعد بھی اُن کے لیے نہ صرف باعثِ زندگی؛ بل کہ صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گے۔

اُن کی مشہور تالیف تو ''اسلامی عدالت'' ہے جو واقعی ایک عالم کی علمی بصیرت اور قاضی کی فراست وپختہ ذہنی کی آئینہ دار ہے۔ وہ عرصہ پہلے چھپ کر عام ہو چکی ہے۔ عربی میں اُس کا ترجمہ "نظام القضاء في الإسلام" کے عنوان سے بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔ اِسی طرح قضايا فقهيه معاصرة، فقه المشكلات، الذبائح، دراسات فقهية، دراسات علمية، بحوث فقهية اور الوقف کے عنوان سے کئی عدد کتابیں اردو سے عربی میں ترجمہ ہوکر، عالم عربی میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ جلسہ ہائے عام میں کی ہوئی اُن کی بعض تقریریں بھی چھپ چکی ہیں، اُنھیں پڑھنے والے کو بھی زبان کی لذت، فکر کی ندرت، گفتار کی گل افشانی اور جہاں دیدہ مفکر کا سوز وساز ایک خوب صورت آمیختہ کی شکل میں نظر آتا ہے۔

عین بیماری کے زمانے میں جب کہ کہنا چاہیے کہ وہ بسترِ مرگ پر تھے، "صنوان القضاء" نام کی عظیم فقہی کتاب کو چار جلدوں میں ایڈیٹ کیا۔ وہ کویت کی وزارتِ اَوقاف وامورِ مذہبی کی طرف سے شائع ہوکر، وفات سے قبل اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کے سرور کا باعث بن چکی ہے۔ مولانا مجاہدؒ نے نہ صرف زمانۂ صحت میں؛ بل کہ علالت کے پورے عرصے میں جب کہ کئی سال پہلے تیمار دار اور ڈاکٹر، اُن کی زندگی سے

مایوس ہو چکے تھے، نہ تو ملی مسائل سے صرفِ نظر کیا اور نہ دادِ تحقیق و تالیف دینے سے باز رہے۔ اُن کا یہ وصف اُنھیں عظیم علماے سلف کی صف میں کھڑا کرتا ہے، جنھوں نے آخری لمحے تک قرطاس وقلم کا ساتھ چھوڑا نہ اَسپ فکر ونظر کی پشت سے نزول کیا اور اَلْمِحْبَرَۃ إِلَی الْمَقْبَرَۃ (یعنی دوات کا تو قبر تک ساتھ رہے گا) کی زندہ جاوید، درس انگیز اور حوصلہ افزا مثل پر عمل کر کے خود ضرب المثل بن گئے۔

جمعرات ۴/اپریل ۲۰۰۲ء (۲۰/محرم ۱۴۲۳ھ) کو عرصے کے بعد میں ایک مختصر اور ناگزیر سفر پر "رائے پور" اور "مرزاپور پول"، ضلع سہارن پور، گیا ہوا تھا۔ مغرب کی نماز کے ذرا دیر بعد ہی، جیسے ہی گھر میں قدم رکھا کہ ایک صاحب نے فون پر بتایا کہ دہلی سے ابھی ابھی فون آیا ہے کہ مولانا مجاہدؒ سات بج کر پانچ منٹ پر اللہ کو پیارے ہو گئے، تو ایسا لگا جیسے کوئی مجنوں ہماری اِس دنیا کے جنگل کو اُداس کر گیا۔ فکر ونظر کے میدان کا مجنوں، ملی خدمتوں کے صحرا کا مجنوں، دین وشریعت کے جنگل کا مجنوں اور اُمت کی ہمہ گیر ترقی کے لیے تڑپنے، نقش بنانے اور اتحاد واتفاق کی لیلیٰ پر جان چھڑکنے والا مجنون —— اور اب: ع

مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

مولانا قاضی مجاہد الاسلامؒ اب دنیا میں نہیں رہے، اُن کا چھیڑا ہوا اور چھوڑا ہوا بہت سا کام ابھی باقی ہے؛ لیکن اُن کے ایسا عاشقِ سوختہ جاں اور اور عاشقی کی تمام اداؤں کا راز داں؛ بل کہ کاروبارِ عشق کا ماہر؛ ہر روز اور آسانی سے پیدا نہیں ہوتا۔ اُن کی روح گویا اُن کے بعد کے علما وقائدین سے بہ جا طور پر مخاطب ہے:

ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا، میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مَے مرد اَفگنِ عشق
ہے مُکَرَّر لبِ ساقی پہ صَلا، میرے بعد

اللہ اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ملّت کو اپنی قدرتِ کاملہ سے اُن کا نعم البدل عطا کرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ.

سوانحی نقوش

❁ اسم گرامی: (مولانا قاضی) مجاہدالاسلام بن (مولانا) عبدالاحد بن (سرکار) اِرادۃ اللہ بن (قاری) عنایت اللہ بن (بیرسٹر) قاضی تبارک اللہ جن کا سلسلۂ نسب حضرت علی کے صاحب زادے محمد بن حنفیہ سے جاملتا ہے۔

❁ تاریخ ولادت: ۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ)

❁ ابتدائی تعلیم: قرآن مجید ناظرہ اپنی والدہ سے پڑھا، اردو و فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی مولانا زین العابدین صاحبؒ (والد ماجد مولانا خالد سیف اللہ رحمانی) سے پڑھیں۔ میزان الصرف اپنے والد مولانا عبدالاحد سے پڑھی۔

❁ متوسط وثانوی تعلیم: مدرسہ محمود العلوم دَمْلَہْ ضلع مدھوبنی، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں متوسط وثانوی تعلیم کے مراحل طے کیے۔

❁ اعلیٰ تعلیم: ۱۹۵۱ء (۱۳۷۰ھ) سے ۱۹۵۵ء (۱۳۷۴ھ) یعنی ۴ سال تک دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ سے آپ نے بخاری شریف پڑھی، آپ نے حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ، مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا فخرالحسن مرادآبادیؒ، مولانا بشیر احمد خانؒ، مولانا نصیر احمد خانؒ اور مولانا معراج الحقؒ سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھیں۔

❁ جامعہ رحمانی مونگیر میں: ۱۵؍شوال ۱۳۷۴ھ کو حضرت امیرِ شریعت مولانا سیّد منت اللہ رحمانی کا، مولانا مجاہد الاسلامؒ کو اپنے وطن ''جالہ'' میں خط موصول ہوا کہ جامعہ رحمانی میں اُن کا تقرر کرلیا گیا ہے، مولانا مجاہد ۲۱؍شوال ۱۳۷۴ھ کو جامعہ رحمانی پہنچ گئے، یہاں آپ نے مجموعی طور پر ۸ سال تدریسی خدمت انجام دی۔

❁ امارت شرعیہ آمد: یکم شوال ۱۳۸۴ھ کو حضرت امیرِ شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی خواہش پر

امارتِ شرعیہ کی نظامت اور قضا کا عہدہ قبول کرتے ہوے پھلواری شریف پٹنہ تشریف فرما ہوے، یہاں آپ نے تین حیثیتوں سے کام کیا: ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء بہ حیثیتِ ناظم، ۱۹۶۲ء تا وفات قاضیِ شریعت و قاضی القضاۃ، ۱۲ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۴ رجون ۱۹۹۰ء تا وفات نائب امیرِ شریعت۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام میں قاضی صاحب کا حصّہ

● امیر شریعتِ رابع حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ کی تحریک پر حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے ذریعے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا، جس کے تانے بانے کے بننے میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی شروع سے شریک رہے اور دار العلوم دیوبند میں منعقدہ اُس کے اولیں اِجلاس کی تیاری کے لیے ایک ماہ دار العلوم میں قیام فرمایا۔

● ۲۲ را پریل ۲۰۰۰ کو، قاضی صاحب کو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے انتقال کے بعد صدر بورڈ منتخب کیا گیا، ۳ سال سے بھی کم عرصے تک وہ بورڈ کے صدر رہے؛ کیوں کہ عمر نے وفا نہیں کی۔

۞ **مجلّہ بحث ونظر کا اجرا:** ۱۹۸۸ء میں آپ نے تحقیقی رسالہ ''بحث ونظر'' کا اِجرا فرمایا۔

۞ **فقہ اکیڈمی کا قیام:** اپریل ۱۹۸۹ء میں اُنھوں نے فقہ اکیڈمی قائم کی، جس کا پہلا فقہی اِجلاس یکم تا ۳ را پریل ۱۹۸۹ء، نئی دہلی میں ہمدرد یونیورسٹی کے سیمینار ہال میں ہوا۔

۞ **آل انڈیا ملی کونسل کی تاسیس:** مئی ۱۹۹۲ء میں آپ نے آل انڈیا ملی کونسل کی بمبئی کے اجلاس منعقدہ ۲۳-۲۴ رمئی ۱۹۹۲ء کو اساس گزاری کی۔

۞ **مرض الوفات اور وفات:** اپریل ۱۹۹۸ء میں، دہلی میں ڈاکٹروں نے یہ انکشاف کیا کہ اُن کی ریڑھ کی ہڈی میں پائے جانے والے گودے میں کینسر ہے۔ اِس بیماری کا علاج جاری تھا کہ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ کے بعد اُن پر نمونیہ کا حملہ ہوا۔ ۱۲ رفروری ۲۰۰۲ کو حالت، زیادہ نازک ہوگئی اور اُنھیں پھر اپولو اسپتال میں داخل کرنا پڑا، جہاں اُن کا مسلسل علاج ہو رہا تھا؛ لیکن مہنگے علاج کے باوجود جاں بر نہ ہو سکے اور جمعرات: ۲۰ رمحرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۴ را پریل ۲۰۰۲ء کو دہلی اپولو اسپتال میں سات بج کر پانچ منٹ پر، جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ یعنی اُن کا انتقال جمعرات جمعہ: ۲۰-۲۱ محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۴-۵ ر اپریل ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں ہوا۔

● ۲۱ رمحرم ۱۴۲۳ھ کو ۷ بجے صبح جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں، اُن کی پہلی نمازِ جنازہ مولانا عبداللہ مغیثی نے پڑھائی، دوسری نمازِ جنازہ دہلی میں پالم ایرپورٹ پر گیارہ بجے کے قریب مولانا محمد یعقوب بلند شہری استاذ

مظاہر علوم وقف سہارن پور نے پڑھائی۔ تیسری نمازِ جنازہ امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں ۳ر بجے سہ پہر کے قریب امیرِ شریعت مولانا سید نظام الدین نے پڑھائی جس میں لاتعداد لوگوں نے شرکت کی۔ چوتھی نمازِ جنازہ دربھنگہ میں C.N. کالج کے وسیع وعریض میدان میں پڑھی گئی، جس میں تقریباً ۲ لاکھ کے مجمع نے شرکت کی، اِس جنازے کی امامت مولانا کے برادرزادے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے کی اور ساڑھے گیارہ بجے شب میں اُن کی تدفین اُن کے سسرال ''مہدولی'' میں ہوئی۔

ایوارڈس واِعزازات

- الامین ایجوکیشنل ٹرسٹ کی جانب سے کمیونٹی لیڈر شپ ایوارڈ۔
- انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کی طرف سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ۔
- ''افمی''یعنی امریکن فیڈریشن آف مسلم کی طرف سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ۔
- ''میسی''یعنی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی جانب سے بہترین اسلامی شخصیت ایوارڈ۔
- احکامِ شریعت اسلامی کی تطبیق کے لیے قائم حکومتِ کویت کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی کی طرف سے فقہی ایوارڈ
- حکومتِ مراکش کی طرف سے بہترین اسلامی اور علمی خدمات پر گولڈ میڈل۔ (جو عین اُس دن اکیڈمی کے دفتر کو موصول ہوا جس دن آپ کی وفات ہوئی تھی)

عہدے ومناصب

- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔
- صدر و مؤسس اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا۔
- صدر و مؤسس آل انڈیا ملی کونسل۔
- قاضی القضاۃ و نائب امیر شریعت امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ۔
- صدر وفاق المدارس الاِسلامیہ، بہار۔
- صدر مولانا سجاد اسپتال امارتِ شرعیہ۔
- صدر المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء۔
- صدر مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ۔
- رکن گورننگ باڈی آف انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز۔
- رکن شرعیہ بورڈ آف الامین اسلامک فائنانشیل فاؤنڈیشن بنگلور۔

- رکن اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ۔
- اکسپرٹ ممبر انٹرنیشنل، اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ۔
- رکن المجمع العلمي العالمي دمشق۔
- رکن اعزازی الهيئة الخيرية الإسلامية العالمية، کویت۔
- تاسیس جالہ ایجوکیشنل کیمپ۔

❁ **اسفار:** سعودی عرب، عرب امارات، قطر، بحرین، کویت جہاں کا آپ نے بار بار سفر کیا۔ امریکہ، برطانیہ، پاکستان، بنگلہ دیش، ایران، روس کی آزاد مسلم جمہوریائیں، مراکش، جنوبی افریقہ۔

❁ **اسفارِ حج:** پہلا سفرِ حج ۱۹۶۹ء، دوسرا سفرِ حج ۱۹۹۶ء۔

❁ **تالیفات وتحقیقات وعلمی کارنامے:** اسلامی عدالت، مسلم پرسنل لا کا مسئلہ تعارف وتجزیہ، مباحث فقہیہ، خطبات بنگلور، چند مطبوعہ خطبات، فتاویٰ امارتِ شرعیہ، كتاب الفسخ و التفريق، مآثر سجاد کی بازیافت، فقہی مجلّات، آداب قضا، موسوعہ فقہیہ (کے اردو ترجمے کا اہتمام)، صنوان القضاء وعنوان الإفتاء، فقه المشكلات، النظام القضائي الإسلامي، فقہی مجلّات کے عربی تراجم۔(۱)



(۱) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۳-۴، جلد ۲۶، ربیع الاول وربیع الثانی ۱۴۲۳ھ مطابق مئی - جولائی ۲۰۰۲ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود، جو ترجمان دار العلوم نئی دہلی، ندائے شاہی مرادآباد، ترجمان دیوبند اور اذانِ بلال آگرہ میں شائع ہوئی۔

اسلامی عربی اہلِ قلم

مولانا فصیح الدین دہلویؒ

۱۳۶۰ھ/ ۱۹۴۱ء — ۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء

کون سا جھونکا بجھا دے گا کسے معلوم
زندگی کی شمع روشن ہے ہوا کے سامنے

چہار شنبہ: ۱۰؍رجب ۱۴۲۳ھ کو صبح سویرے حسبِ معمول اخبارات کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ''عربی کے عالم وادیب مولانا فصیح الدین دہلوی کی وفات'' پر رک گئی۔ میں نے خبر پڑھی تو معلوم ہوا کہ سموار۔ منگل ۹-۱۰؍رجب ۱۴۲۳ھ = ۱۷-۱۸؍ستمبر ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں، سوا گیارہ بجے وہ ربّ کریم کے جوار میں پہنچ گئے۔ اللہ جانتا ہے کہ اِس خبر کو اچانک پڑھ کر کس درجہ دل کو ٹھیس لگی۔ عرصے سے مولانا فصیح الدین دہلویؒ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ کئی ماہ سے قومی آواز میں، جس میں وہ بہت چھپتے تھے، بھی اُنھیں نہیں پڑھ سکا تھا۔ بار بار خیال ہوا کہ اپنے اور اُن کے دہلی کے اہلِ تعلّق سے پوچھوں کہ مولانا فصیح الدین بہ خیر تو ہیں؛ لیکن خدا بھلا کرے مشاغل کا کہ خواہش کے باوجود، بات آج اور کل پر ٹلتی رہی کہ جلدی کیا ہے پھر معلوم کرلیں گے۔ بہ ہرصورت یہ خبر بجلی بن کر گری اور دل بیٹھ سا گیا۔ بعض دفعہ جان پہچان والوں کی اُن کی زندگی میں تو قدر نہیں ہوتی؛ لیکن اُن کی موت کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اُن سے کتنا تعلق تھا اور وہ دل ودماغ پر کس درجہ چھائے

ہوے تھے۔ بار بار یہ محسوس ہوا کہ شاید یہ خبر غلط چھپ گئی ہے، مولانا فصیح الدین دہلوی کا انتقال نہیں ہوا ہے۔ شدّتِ تعلق کی وجہ سے بہت سے اہلِ تعلق کی وفات کے وقت ایسا ہی کچھ محسوس ہوا؛ لیکن معصوم تمناؤں سے دنیا کے حقائق کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اپنے وقت پر برپا ہوتی ہے اور کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی۔

جب اَلفاظ، اِحساسات کی ترجمانی نہیں کرپاتے

بہت سے اِحساسات وجذبات ایسے ہوتے ہیں، جن کی صحیح تعبیر کے لیے انسان اپنی تمام نثری وشعری وادبی صلاحیتوں کے باوجود، صحیح الفاظ ڈھونڈنے میں ناکام رہتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ الفاظ کے سارے خزانے میں، اُن کی ترجمانی کے لیے کوئی موزوں لفظ موجود نہیں ہے۔ مولانا فصیح الدین دہلوی کی وفات کی خبر پڑھ کر میں اِسی طرح کے اِحساسات سے دوچار رہا اور اب تک ہوں۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اِس درجہ رچے بسے ہوے ہیں۔ اُن کی سادگی، بے ساختہ گفتگو، ذہانت، قوتِ حافظہ، اپنی رائے پر جمنے کی اُن کی خو، حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ، عالمِ اسلام کے دکھ درد کی وسعتوں پر اُن کی گرفت، عربی، اردو اور انگریزی پر اُن کی یک ساں قدرت، اُن کی سادہ سی شروانی، لباس میں تراش خراش سے اُن کی بے نیازی، آب وہوا سے زیادہ آسانی سے دوستوں کو اُن کے مُیَسَّر آجانے کی ادا، صاف شفاف گفتگو، اُن کی پیاری آواز اور بے پناہ اپنائیت کا رویہ: یہ سبھی کچھ حافظے کے کینوس پر اِس طرح اُبھرنے لگا جیسے وہ ہمارے سامنے ہوں، ہاتھ سے سیاہ رنگ کا اپنے کاغذات کا بیگ ابھی ابھی دفترِ جمعیۃ علما مسجد عبدالنبی کے کسی کمرے میں رکھ کر اپنے ہاتھ میری طرف مصافحہ کو بڑھایا چاہتے ہیں۔ آہ اُن کے ہاتھوں کی اپنائیت بھری گرمیِ جواب کبھی نہیں مل سکے گی۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ انسان کی محض علمی صلاحیتیں اور ثقافتی لیاقتیں، اُس کو اپنے

جاننے والوں کے دلوں میں ایسی پیاری جگہ نہیں دے پاتیں (جیسی مولانا فصیح الدین کو اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں، اُن کی علمی صلاحیتیں دے گئیں) جب تک علم وفضل کے عناصر کے علاوہ مطلوبہ مقدار میں وہ مجموعی انسانی رویّہ اُس میں موجود نہ ہو، جس کے بغیر انسان چوبِ خشک ہوتا ہے؛ بل کہ محض علم، علم کا پندار، لیاقت سے پیدا شدہ اِحساسِ برتری، اہلِ علم کو لوگوں کے دلوں سے اِس درجہ دور کر دیتی ہے کہ ایک جاہل کے لیے بھی اُن کے دلوں میں اِس درجہ دوری نہیں ہوتی۔ مولانا فصیح الدین اپنے مجموعی رویّے سے ہر ملنے والے کا دل موہ لیتے تھے، اُن کا علم وفضل اُن کو برتنے والے کے لیے مزید باعثِ کشش ہوتا تھا۔

مولانا فصیح الدین کے انتقال کی خبر پڑھ کر دل پر بہت بوجھ رہا کہ کس سے ربط کروں، کس سے تعزیت کروں؟ صبح کے نو بج چکے تھے، ہمارے اور اُن کے دہلوی "عربی خاندان" کے اَفراد کے دفاتر چلے جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ مولاناؒ کے گھر کا فون نمبر معلوم نہیں تھا، میں نے شام کا انتظار کیا، شام کے وقت بھائی بدر (مولانا بدرالزماں قاسمی کیرانوی پسرِ اکبر حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ) سے ربط کر کے میں نے اُن کی بیماری اور وفات کی تفصیل معلوم کی اور ایک دوسرے کی تعزیت کر کے غم غلط کرنے کی کوشش کی۔ مولانا فصیح الدین کے گھر کا فون نمبر معلوم کر کے اُن کے بچوں سے تعزیت کی؛ لیکن دل نہیں بھرا کہ اُنھیں غالباً؛ بل کہ یقیناً اُن کے بچوں سے زیادہ اُن کے بعض دوسرے احباب جانتے تھے اور اُن کے "عربی خانوادے" کے افراد اُن کے زیادہ قدرداں اور اُن پر زیادہ دل وجان چھڑکنے والے تھے۔ میرے دل نے مشورہ دیا کہ میں راہِ علم وثقافت کے، اُن کے دیرینہ دوست اور اُن کے افکار وخیالات کے مخلص ساتھی مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی سے تعزیت کروں کہ بعض دفعہ برادرِ فکر ونظر، برادرِ پدر ومادر سے زیادہ مخلص وغم گسار اور ہم راز ودم ساز ہوتا ہے۔ میں نے اُن سے فون پر تعزیت کر کے محسوس کیا کہ میں نے بہت اچھا کیا کہ اُن کے دوست کی اُن سے تعزیت کی، وہ غم والم سے شکستہ نظر آئے اور ایسا لگا کہ اُن کے الفاظ بھی رنج والم کے دباؤ میں ہیں۔

عربی زبان کے ہنرمند قلم کار

مولانا فصیح الدین دہلوی، ہندوستان میں عربی زبان کے ماہر عالم اور جدید اخباری ڈپلومیٹ عربی زبان کے ہنرمند قلم کار تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عربی سے انگریزی اردو اور انگریزی اردو سے عربی میں ترجمے میں گزارا۔ وہ دہلی میں عربی ممالک کے متعدد سفارت خانوں میں کم وبیش چالیس برس عربی کے مترجم اور رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اُنھیں تیز ترجمہ کرنے اور تیز لکھنے کی زبردست مہارت تھی، حالاتِ حاضرہ پر گہری اور بھرپور نظر تھی، عالم اسلام خصوصاً عالمِ عربی کے حالات سے اِس طرح واقف تھے، جیسے خاص عربی دنیا کا صحافی واقف ہوا کرتا ہے۔ اللہ نے اُنھیں تحلیل وتجزیے کی زبردست صلاحیت سے نوازا تھا۔ سفارت خانوں میں خطوط ورسائل اور رپورٹوں کے لیے جو زبان استعمال کی جاتی ہے، اُس میں بڑی نزاکت ملحوظِ خاطر ہوتی ہے۔ سفارت کاروں کے مزاج میں کہنا چاہیے کہ صنفِ نازک سے زیادہ حسّاسیت ہوتی ہے، وہ بعض دفعہ ایک لفظ کے بے جا استعمال سے بہت ناراض اور کسی لفظ کے بہ جا استعمال سے بہت خوش ہوجاتے ہیں، اول الذکر صورت میں بنابنایا کام خراب ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جب کہ ثانی الذکر صورت میں بگڑا ہوا کام بھی بن جاتا ہے۔ مولانا فصیح الدین دہلوی کو اپنے طویل تجربے کی وجہ سے اِس میں بڑی مہارت تھی، خصوصاً اِس لیے کہ وہ عربی، انگریزی اور اردو پر یک ساں قدرت رکھتے تھے۔ کئی زبانوں میں مہارت کی وجہ سے، ہر زبان کے صحیح متبادل کی جان کاری میں اُنھیں آسانی ہوتی تھی اور اُن کے تراجم اُن نقائص سے بالکلیہ پاک ہوتے تھے، جن سے صرف ایک دو زبان کی جان کاری رکھنے والے یا کئی زبانوں کی ناقص معلومات رکھنے والے کے تراجم، آلودہ ہوجاتے ہیں۔

اُن کے دوستوں، عربی انگریزی میں کام کرنے والوں، خصوصاً دہلی کے ''عربی

خاندانوں'' کواُن کی شانِ امتیاز کا اعتراف تھا۔ وہ عربی زبان کے ممتاز عالم واہل قلم کی حیثیت سے اپنے امتیاز کی وجہ سے، دہلی میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ اُن کی خوش اخلاقی، اسلامی اقدار کی اُن کی نمایندگی، سفارت خانوں میں، جہاں کا ماحول آزاد اور بعض دفعہ نامعقول حد تک کھلے پن کا نمایندہ ہوتا ہے، کام کرنے کے باوجود، اسلامی شناخت اور شعائرِ اسلام کی پابندی کی وجہ سے بھی وہ قابل تعریف تھے۔ اُن کے بہت سے سفارت خانوں میں کام کرنے والے ساتھیوں نے کبھی داڑھی بڑھالی کبھی گھٹالی، کبھی پینٹ میں آگئے، کبھی داڑھی سے سبک دوش ہوگئے؛ لیکن اُنھوں نے ماحول سے صلح نہیں کی؛ بل کہ ماحول کو اسلامی اقدار سے صلح کرنے پر مجبور کیا۔ میں سچ کہتا ہوں مجھے اُن کی یہ ثابت قدمی، اسلام پسندی، دینی حمیّت اور مذہبی شناخت پر کاربندی کی ادا بہت پسند آئی۔ وہ جہاں رہے وقار سے رہے، اپنی رائے اور ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ اپنی رائے پر سفارت خانوں کی دنیا میں رہتے ہوئے جمنے والا، اُن کے جیسا میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ مولانا فصیح الدین، نفاق اور ڈبلنگ (دوہرے پن) سے دوری اور ظاہر و باطن کی یکسانیت میں بھی ممتاز تھے۔ وہ بعض دینی جماعتوں میں عرصے تک عربی کا کام کرتے رہے؛ لیکن کویت عراق والے مسئلے میں، اُنھیں اُن جماعتوں کے قائدین کی دوہری پالیسی سے شدید اختلاف رہا اور اُنھوں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ دل اور ضمیر کے خلاف اُن سے جڑے رہیں، چناں چہ اُنھوں نے علاحدگی اختیار کرلی اور اپنے اختلاف کا اُنھوں نے ہر جگہ، برملا اظہار کیا۔

علمی آبرو کا پاس اور احترام

غالبًا پڑھا لکھا اور اپنے علم وکمال کا پاس رکھنے والا، اُنھیں کی طرح خود دار، بے لچک اور صاف شفّاف پالیسی کا حامل ہوتا ہے، اِسی لیے وہ اپنے ساتھیوں میں محبوب رہے۔ وہ اپنی صلاحیت، صلاحیّت کی آبرو کا لحاظ رکھنے کی ادا، مُتعلِّقہ کام کو پختگی کے

ساتھ کرنے، اِحساسِ ذمے داری، وقت کی پابندی، وسعتِ نظری، وسعتِ قلبی اور نرم خوئی وغیرہ کی وجہ سے، ہر جگہ مقبول ومحبوب رہے۔

اُن کی یہ خوبی بھی تھی کہ وہ صرف متعلقہ کاموں کے اسیر نہ تھے، الگ تھلگ اور گوشہ گیری سے اُنھیں حد درجہ نفرت تھی۔ وہ امت اور ملت کے مسائل سے بھرپور دل چسپی رکھتے تھے اور اپنے علم وفکر کی روشنی میں اُن کا حل ڈھونڈنے کے لیے کوشاں رہتے تھے، ورنہ عموماً سفارت خانوں سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم ہر طرح کے ''دخل در معقولات'' سے پرہیز کرتے ہیں، جیسے سفارت خانوں سے باہر بھی اُن پر ہر جگہ ہر طرح کی پابندی عائد ہو؛ بل کہ یہ وہاں ملازمت کی شرط ہو۔

مولانا فصیح الدین دہلوی کو اپنی رائے اور اپنے اخذ کردہ نتائج پر بہت اعتماد تھا، اپنی ذات، اپنی رائے اور اپنے افکار وخیالات پر بہت سے قلم کاروں کو اتنا اعتماد نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ ہر نظریے کے سلسلے میں شک وشبہے کا شکار رہتے ہیں۔ اُن کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا تھا؛ لیکن اُن کے اِخلاص اور امت وملت کے تئیں اُن کی بے لوثی سے کسی کو اختلاف کی گنجایش نہ تھی۔

۱۹۷۱-۱۹۷۲ء (۱۳۹۰-۱۳۹۱ھ) میں، میں ہندوستان کے مایۂ ناز مؤرخ وفقیہ مولانا سید محمد میاں دیوبندی دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء سے استفادے کی غرض سے مدرسہ امینیہ دہلی میں زیرِ تعلیم تھا، اِس موقع سے کئی مرتبہ مولانا فصیح الدین دہلوی کا نام اور اُن کی صلاحیت کا تذکرہ سنا؛ لیکن ۱۹۸۲ء میں جب میں دارالعلوم دیوبند میں استاذ منتخب ہوا اور ''الداعی'' کی ادارت کی ذمے داری تفویض ہوئی، تو اُس موقع سے بار بار دہلی آمد ورفت کا موقع ملا کہ اُس وقت میں خود ''الداعی'' کی طباعت کے لیے دہلی آیا جایا کرتا تھا۔ گلی قاسم جان میں واقع جمعیۃ بلڈنگ کے ایک کمرے میں پندرہ روزہ جریدہ ''الکفاح'' کا دفتر تھا، وہیں مولانا مزمل الحق حسینی صاحب کے پاس قیام رہتا، اُس موقع سے روزانہ شام کو مسجد عبدالنبی جانے کا موقع ملتا اور وہاں مولانا فصیح الدین سے ملاقات

کا شرف حاصل ہوتا۔ وہ مغرب بعد عموماً تشریف لاتے اور جمعیۃ علما کے عربی کے مفوضہ کاموں کو انجام دیتے۔ سال ہا سال اُن سے ملاقات ہوتی رہی، اُن کی علمی عظمت، عربی پر عبور، انگریزی کی ٹھوس مہارت، کی جان کاری بڑھتی اور اُن کی عقیدت و محبت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اُسی دوران خصوصاً ۱۹۹۰ء میں کویت پر عراق کے قبضے کے بعد مجھے بار بار دہلی میں کویت سفارت خانے جانے کا اتفاق ہوا اور سفارت کاروں کی خواہش پر، اُن سے ملاقات کا موقع ملتا رہا، اُس موقع سے مولانا فصیح الدین کی ملاقاتیں، اُن کی خوش اخلاقی اور اپنائیت کا بار بار تجربہ ہوا۔

دو ایک سال تو یہ سلسلہ جاری رہا؛ لیکن میں اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے سفارت کاروں سے زیادہ دنوں مجاملہ کا تعلق نہیں رکھ سکا؛ کیوں کہ تعلقات پیدا کرنا اور اُنھیں نباہنا بھی ایک فن ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھے اِس کے لیے پیدا نہیں کیا ہے؛ ورنہ جس طرح سعودی اور کویتی سفرا کو اُس وقت میری تحریر پسند تھی، جس طرح وہ مجھ سے محبت کرنے لگے تھے، اگر میں تعلقات گری کا فن جانتا، تو کم از کم اپنی دنیا کو سنوارنے کی راہ ضرور پیدا کر لیتا۔

بہ ہر صورت کئی سال کے بعد اچانک مخدومی جناب مولانا عمید الزماں صاحب کیرانوی سے معلوم ہوا کہ مولانا فصیح الدین اب کویتی سفارت خانے سے علاحدہ ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر دل دھک سے رہ گیا، پھر میں نے سوچا کہ یہ دنیا ہے، یہاں ہر طرح کی اَن ہونی ہو جاتی ہے۔ تعلقات، ملازمتیں اور وفاداریاں بھی اُسی طرح حادث ہیں جیسے خود دنیا؛ لیکن بہ ہر صورت نامانوس بات کو سن کر حیرت ہوتی ہی ہے۔ پھر اُنھوں نے سبک دوشی کی کچھ تفصیل بیان کی تو دل پر اور چوٹ لگی، معلوم ہوا کہ مولانا فصیح الدین کی خودداری اور خوداعتمادی، جس پر وہ کسی سے کبھی صلح کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، یہاں بھی رنگ لائی۔ اُنھوں نے زندگی اور صحت کے اِس مرحلے میں سفارت خانوں کے گلیاروں میں مزید بھٹکنا مناسب نہیں سمجھا اور وہ لکھنے پڑھنے کے لیے یک سو ہو گئے۔

علمی وثقافتی کام

اُنھوں نے قومی آواز وغیرہ میں سیاسی اور تجزیاتی موضوعات پر لکھنا جاری رکھا، نیز ایک بہت مفید کتاب "معین المترجم" تالیف کی، جس میں عربی سیکھنے والوں کے لیے، اردو تا عربی اور عربی تا اردو ترجمہ کرنے، نیز جدید عربی لکھنے اور سمجھنے کے لیے راہ نما اُصول بتائے۔ عربی واُردو نصوص کے ترجمے بھی کر کے دکھائے، نیز مفردات کے مُتبادَل کو سمجھنے کی راہ بھی سجھائی۔ بہت مفید کتاب لکھی، خیال تھا کہ وہ دو چار سال میں دو چار اِسی طرح کی مفید کتابیں لکھ کر سفات خانوں کی دنیا میں ضیاعِ وقت کی تلافی کر کے، اپنے لیے ذخیرۂ آخرت، سرمایۂ شہرت اور دوسروں کے لیے فائدہ اُٹھانے کا سامان بہم پہنچائیں گے؛ لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور میری معلومات کی حد تک، اِس ایک قیمتی کتاب سے بات آگے نہ بڑھ سکی، جس کو ہمارے برادر مولانا بدرالزماں قاسمی کیرانوی نے آب تاب سے اپنے مکتبہ وحیدیہ دیوبند سے شائع کیا۔ یہ کتاب دیوبند کے سارے کتب خانوں میں دست یاب ہے۔

ہمیشہ جینے کے لیے کون آیا ہے؟ تو بھلا مولانا فصیح الدین کیسے ہمیشہ جیتے رہتے؟ لیکن اُن کے کچھ اور جینے سے "فلکِ پیر" کا کوئی نقصان نہ ہوتا اور ہم دوستوں کو، اُن سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا۔ وہ غالب کے شاگرد "عارف" کی طرح "جواں" تو نہ تھے؛ لیکن کچھ بہت عمر دراز بھی نہ تھے، سب سے بڑی بات یہ کہ وہ جوانوں کی طرح تیز کام کرنے کے عادی تھے، اِس لیے غالب کے شعر کو ہمیں بھی دہرانے کا حق ہے۔

ہاں اے فلکِ پیر! "جواں" تھا ابھی "عارف"
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مولانا فصیح الدین نہیں رہے، ہم سبھوں کو بھی کب تک رہنا ہے؟ لیکن ہم لوگ

جب تک زندہ رہیں گے مولانا یاد آتے رہیں گے۔ اُن کی سادگی، اُن کی نرم گوئی، اُن کی صلاحیتوں کے نتائج، اُن کی خُرد نوازی، اُن کی اَحباب پروری یاد آتی رہے گی۔

اللّٰهم اغفر له وارحمه.

مولانا فصیح الدینؒ سے مراسلت کی کبھی ضرورت نہیں پڑی، اُن سے تعارف و بے تکلفی کے بعد، دہلی میں ہی حسب ضرورت ملاقات ہوجایا کرتی تھی؛ اِس لیے کسی کام کے لیے ہمیں آپسی خط وکتابت کا سہارا نہیں لینا پڑا، حال آں کہ مراسلت کا کلچر اُن کی وفات تک خاصی حد تک باقی تھا، اب ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء میں جس وقت اِن تحریروں کو بہ شکلِ کتاب مدوّن کر کے شائع کرنے کے لیے تیار کیا جارہا ہے یہ موروثی و انتہائی مفید ثقافت دم توڑتی ہوئی محسوس ہورہی ہے۔

البتہ ایک بار مولاناؒ نے اپنے نئے گھر کے پتے پر ''الداعی'' بھیجنے کو کہا اور پرانا پتہ، جس پر اُنھیں اِرسال کیا جاتا تھا، کاٹ دینے کی تاکیدی بات کہی اور فرمایا کہ اُس پر ڈاک بے وجہ ضائع ہوجاتی ہے، اِس لیے آپ یاد سے دفتر کے مُتعلِّقہ ملازمین سے پتہ تبدیل کروادیں۔ ناچیز نے دہلی سے آکر فوراً اس پر عمل درآمد کروایا اور ''الداعی'' کا تازہ شمارہ تبدیل شدہ پتے پر اُنھیں ملا، تو اُنھوں نے عربی زبان میں، جو دہلوی ہونے کے باوجود، اردو سے زیادہ اُن پر سوار رہتی اور اُن کے لیے، لکھنے اور بولنے میں آسان لگتی تھی، ذیل کی چند سطری تحریر کے ذریعے شکریے کے ساتھ، اِس کی اطلاع دی، جو عربی ہی میں، یہاں یادگار کے طور پر ثبت کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی اردو خواں حضرات کے لیے اُس کا ترجمہ بھی پیش کیا جارہا ہے:

الأخ الفاضل الأستاذ نور عالم المحترم

تحية أخوية، وبعد.

وصلتني نسخة من مجلّة الداعي، (العدد الأخير) وذلك على عنوان منزلي الجديد؛ فشكراً جزيلاً على هذا الاهتمام.

أرجو أن تكون صحتكم جيدة ، خصوصاً "السكر" بنسبة صحيحة.. ونتمنى اللقاء بكم ؛ فأرجو التكرم في المرة القادمة التي تأتون فيها إلى دلهي .

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته .   أخوكم

فصيح الدين الدهلوي

١٩٩٩/٨/٩م

برادرمکرم! مولانا نورعالم صاحب

برادرانہ سلام کے بعد یہ کہنا ہے کہ رسالہ الداعی کا آخری شمارہ، میرے نئے گھر کے پتے پر مجھے مل گیا، اِس توجہ دہی کے لیے، میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔

توقع ہے کہ آپ بالکلیہ بہ خیر ہوں گے، بالخصوص ''شکر'' کا تناسب موزوں ہوگا۔ آپ سے ملاقات کی خواہش ہے۔ آیندہ دہلی آمد کے موقع سے آپ سے کرم فرمائی کی امید ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا بھائی

فصیح الدین دہلوی

۱۹۹۹/۸/۹ء

سوانحی نقوش

- نام: (مولانا) فصیح الدین دہلوی بن عبدالقدیر دہلوی بن عظیم الدین دہلوی۔
- تاریخ پیدائش: ۳۰ر ستمبر ۱۹۴۱ء (۸ر شوال ۱۳۶۰ھ)
- جاے پیدائش: مکان نمبر (۶۶۱) گلی شیخ صاحب، محلّہ قصاب پورہ، صدر بازار، دہلی۔
- مولانا فصیح الدین دہلویؒ کے دادا جناب عظیم الدین صاحب دہلوی بانیِ تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد

الیاس صاحبؒ کاندھلوی دہلوی سے بیعت تھے، اُنھیں نے موصوف کا نام ''فصیح الدین'' رکھا تھا۔ موصوف کے والدِ محترم جناب عبدالقدیر صاحبؒ بھی ایک نیک عالمِ دین مولانا مقبول حسن صاحب گنگوہیؒ سے بیعت تھے، جو صدر بازار کی مسجدِ شاہ گل میں اُس زمانے میں رہا کرتے تھے۔ مسجد نواب والی، قصاب پورہ، صدر بازار میں جب مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ تشریف لاتے تھے، تو اُن سے ملنے کے لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی بھی تشریف فرما ہوتے تھے اور اکثر جناب عبدالقدیر صاحب کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ موصوف کے خاندان کا شروع سے ہی علما و صلحا اور مشائخِ دیوبند سے عقیدت و محبت کا تعلق رہا تھا۔

❁ خاندانی طور پر یہ لوگ چمڑے کے بڑے تاجر تھے، جرمنی اور روس چمڑا ایکسپورٹ ہوتا تھا، ۱۹۳۸ء-۱۹۴۰ء میں جنگی حالات کی وجہ سے یہ کام ماند پڑ گیا اور ۱۹۴۷ء میں بالکل ختم ہو گیا، موصوف کے ماموں دوست محمد صاحب قریشی بن الحاج شہاب الدین قریشیؒ چمڑے اور اُس کی مصنوعات، بالخصوص جوتے کے آج بھی ممتاز ایکسپورٹروں میں ہیں۔

❁ تعلیم: مولانا فصیح الدین نے قرآن پاک ناظرہ اور حفظ مولانا حافظ محمد قمر صاحب جھنجھانویؒ سے کیا، ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ) میں حفظ کی تکمیل کی۔ حافظ محمد قمر صاحب ہی اُن کے اصلی مربی تھے، اُنھیں اُن سے بڑی عقیدت تھی؛ اِسی لیے وہ اُن کے گھر جھنجھانہ بھی آیا جایا کرتے تھے، جس کا بڑی محبت سے وہ تذکرہ کرتے تھے، اُس کے بعد از ابتدا تا انتہا، اُنھوں نے ساری دینی تعلیم مدرسہ عالیہ فتح پوری میں حاصل کی اور یہیں سے ۱۹۶۱ء (۱۳۸۰ھ) میں فارغ ہوئے، اُن کے ممتاز اساتذہ میں مولانا قاری سید محمد میاںؒ، مولانا قاضی سجاد حسین بجنوری، کرتپوری، قاسمی (۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء-۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء) اور مولانا عبدالسمیع میواتیؒ تھے۔ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں دارالعلوم دیوبند میں قیام کیا اور عربی زبان وادب میں کمال بہم پہنچایا۔ یہاں اُنھوں نے فلسفہ اور اصولِ فقہ کی بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ وہ اپنے کو دارالعلوم دیوبند کا فاضل ہی تصور کرتے تھے اور ہر موقع پر اپنی بے پناہ محبت وعقیدت کا اِظہار کرتے تھے، ویسے بھی درسِ نظامی کے برِصغیر کے سارے اَن گنت مدرسے غیر رسمی طور پر دارالعلوم دیوبند ہی کی شاخیں ہیں اور اُن میں سے کسی جگہ کا فارغ گویا دارالعلوم دیوبند ہی سے فیض یافتہ ہوتا ہے اور اُس کو اپنی خاص مادرِ علمی سے زیادہ دارالعلوم دیوبند ہی سے عقیدت ہوتی ہے۔

❁ ۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں پنجاب یونیورسٹی سے ''آداب عربیہ عالیہ'' (High Profeciencyian Arabic)

کی فرسٹ ڈویژن سے ڈگری حاصل کی نیز جامعہ اردو علی گڑھ سے اردو ادب وزبان کی سند حاصل کی۔ نیز جامعہ اردو علی گڑھ سے انگریزی زبان کا ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔

۞ **تدریسی وعملی زندگی:** ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء (۱۳۸۳-۱۳۸۴ھ) کے عرصے میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں نحو اور عربی زبان وادب کے استاذ رہے۔

۞ ۱۹۶۵-۱۹۶۸ء کے دوران انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنس (Indian Council for cultural relations) جو وزارتِ خارجہ کے تحت ایک سرکاری اِدارہ ہے، رسالہ "ثقافة الهند" بہ زبان عربی کی اِشاعت وایڈیٹنگ کی سرپرستی کی۔

۞ ۱۹۶۹ء سے پانچ سال تک نئی دہلی میں اردن کے سفارت خانے میں بہ حیثیت مترجم خدمات انجام دیں۔

۞ ۱۹۷۴ء-۱۹۷۵ء میں دوسال تک سفارت خانہ عراق نئی دہلی میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔

۞ کچھ عرصے مراکش کے سفارت خانہ، نئی دہلی میں بھی کام کیا۔

جولائی ۱۹۷۵ء سے اگست ۱۹۸۸ء تک کویت سفارت خانے میں، بہ حیثیت مترجم سیاسی اموراور بہ حیثیت محاسب، عربی اور انگریزی میں گراں قدر خدمات انجام دیں، سفارت خانے کے اعلیٰ ذمے داروں بالخصوص سفراے کویت کو اُن کی صلاحیت اور علمی خوبیوں کا بڑا اعتراف رہا۔

اِسی کے ساتھ ساتھ اردو اور عربی زبانوں میں مختلف اسلامی سیاسی اور اجتماعی حالات پر گراں قدر مضامین ور پورٹیں لکھیں، جو ہندوستان کے کثیر الاِشاعت اخبارات میں شائع ہوتی رہیں اور بڑے شوق سے پڑھی گئیں۔ دہلی کی علمی وادبی دنیا میں اُن کا ایک ممتاز مقام رہا، اور ہر مجلس میں اُنھوں نے اپنی علمی وفکری شناخت چھوڑی جو بہت دنوں تک یادرہے گی۔

۞ **بیماری اور وفات:** نومبر ۱۹۸۸ء میں شدید بیمار ہوے، دونوں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا، فروری ۱۹۸۹ء میں ممبئی میں علاج ہوا اور بڑی حد تک صحت بہ حال ہوگئی؛ لیکن پہلی سی چستی وپھرتی باقی نہیں رہی۔

۞ اپریل ۲۰۰۲ء میں پھر بیمار ہوے، یہ بیماری بڑھتی گئی اور صحت بہ حال نہ ہوسکی بالآخر سموار منگل ۹-۱۰ر رجب ۱۴۲۳ھ مطابق ۱۷-۱۸ر ستمبر ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں سوا گیارہ بجے اُنھوں نے آخری سانس لی۔ سہ شنبہ (منگل) ۱۰ر رجب ۱۴۲۳ھ کو دس بجے صبح اُن کی نمازِ جنازہ صدر جمعیۃ علماے ہند مولانا سید اسعد مدنیؒ (۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء-۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء) نے پڑھائی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں پیوند

خاک ہوے۔

۞ لائق ذکر ہے کہ مولاناؒ، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء-۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) سے بیعت تھے۔

۞ **پس ماندگان:** اُن کی اولاد میں چھ صاحب زادے ہیں، جن میں سے ۵ دہلی میں رہتے ہیں اور ایک لڑکا انگلینڈ میں زیرِ تعلیم ہے۔

۞ مولانا کے بڑے بھائی محمد عاقل دہلوی کی رہائش کلکتہ میں ہے۔ اُن سے چھوٹے ۲ بھائی دہلی میں رہتے ہیں، سب سے بڑی ہمشیرہ کراچی، پاکستان کی باسی ہیں، جب کہ دگر تین بہنیں ایک مولانا سے بڑی اور دو چھوٹی بہنیں دہلی کی باشندہ ہیں۔ (۱)(*)



---

(۱) مولانا کے سوانحی نقوش کے سلسلے میں اُن کے بڑے صاحب زادے جناب محمد ارشد دہلوی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۲۴، رمضان وشوال ۱۴۲۳ھ مطابق نومبر ودسمبر ۲۰۰۲ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود سہ شنبہ (منگل): ۲:۳۰ بجے دوپہر ۱۳/ رمضان ۱۴۲۳ھ = ۱۹/ نومبر ۲۰۰۲ء۔

مفتی نسیم احمد قاسمی مظفر پوریؒ

ایک نوجوان اور فعّال عالمِ دین(*)

۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء—۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۳ء

کتنے عالَم ہیں جو غنچے پہ گزر جاتے ہیں
تب کہیں جا کے وہ رنگین قبا ہوتا ہے

۳۰/جنوری ۲۰۰۳ء مطابق ۲۶/ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ بہ روز جمعرات کو ابھرتے ہوئے نوجوان عالمِ دین، اور لائق صاحبِ قلم مفتی نسیم احمد قاسمی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اُن کی اچانک وفات، علمی و دینی حلقوں کے لیے افسوس ناک اور باعثِ رنج والم تھی، اِس لیے کہ یہ ایک ایسے پُرعزم اور بیدار مغز نوجوان کی وفات تھی، جس نے اپنی زندگی کی محض ۳۶ بہاریں دیکھی تھیں۔ صلاحیت مند با حوصلہ نوجوان کی موت، ان اکابر اور عمر رسیدہ افراد کی موت کے مقابلے میں زیادہ الم ناک اور اندوہ گیں ہوتی ہے، جو عزم و حوصلے سے ہمت ہار جاتے ہیں اور جن کی توانائیِ حیات مفقود ہو جاتی ہے، اُن کے بارے میں عام طور پر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ چند دنوں کے مہمان ہیں، جو کسی وقت بھی کوچ کر سکتے ہیں۔

ایک ذی استعداد نوجوان

مفتی نسیم احمد قاسمی ایک ایسے قابلِ فخر، ذی استعداد نوجوان تھے جو اگر ایک طرف

(۱) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی مفتی خالد حسین قاسمی نیموی۔

تحریر وتقریر میں کمال رکھتے تھے، تو دوسری طرف فقہ وفتاویٰ میں بھی۔ موصوف پڑھنے کے زمانے میں دار العلوم دیوبند کے ممتاز اور نمایاں طلبہ میں سے تھے، وہاں سے امتیازی نمبرات کے ساتھ فارغ التحصیل ہوے، اس کے بعد اُنھوں نے ہندوستان کے جلیل القدر فقیہ، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (متوفی ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۲ء) کی معیّت اور صحبت اختیار کی، حضرت قاضی صاحب نے امارتِ شرعیہ، ملی کونسل اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے علمی فقہی اور سیاسی امور میں اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے اُن کا انتخاب کیا۔ قاضی صاحب کی اُمّیدوں پر بھرپور اُترتے ہوے مفتی نسیم نے اُن تمام میدانوں میں انتظامی، تحریری، تقریری، اور ہندوستان کے بہت سے خطّوں بالخصوص مشرقی علاقوں کے عوام کے ساتھ رابطہ استوار کرنے میں فعّالیّت اور پرجوش حرکت کے ذریعے، اپنی صلاحیتوں کا بھرپور سکہ بٹھایا اور یہ سب اُنھوں نے انتہائی کم عمری میں انجام دیا۔

ذہانت اور بذلہ سنجی

ابھی کل کی بات لگتی ہے کہ وہ دار العلوم دیوبند میں، اپنی طالب علمی کے زمانے میں، میرے حجرے سے متصل ایک کمرے میں رہا کرتے تھے اور بالعموم صبح وشام کی تفریح اور دسترخوان پر شریک اور دوسرے بہت سے اُمور میں میرے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے؛ یہاں تک کہ وہ میرے عزیز وقریب کے مانند ہوگئے تھے۔ اُنھیں مجھ سے بہت تعلق تھا، میرا بڑا احترام کرتے تھے، اللہ اُنھیں جنت میں بہترین بدلہ عنایت فرمائے اور اُن کے گھر والوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ مرحوم ظریف الطبع اور ہنس مکھ تھے، جس کی وجہ سے اُن کے ہم نشیں اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے بہت جلد اُن سے مانوس ہوجاتے تھے اور اُن کی بذلہ سنجی سے لطف اندوز ہوتے تھے، اِسی طرح اُنھیں اللہ نے ذہانت وفطانت سے نوازا تھا، جس کی وجہ سے علمی اُمور اور لوگوں کے معاملات و مشکلات کو فوراً سمجھ لیتے تھے۔

وہ دراز قد، خوش اَخلاق، خوش مزاج، نرم خو، کشادہ جبیں تھے، ناک کھڑی، گھنیرے بال، آنکھیں قدرے بڑی، چہرہ کتابی مائل بہ بیضوی، رنگ گندمی تھا۔ طالبِ علمی میں چھریرے بدن کے تھے، عمل کی زندگی میں آنے کے بعد ہی اُن کا بدن بھاری بھرکم ہوتا گیا، توند بھی نکل آئی تھی، وہ جب بھی مجھ سے ملتے میں کہتا کہ آپ وزن اور توند پر کنٹرول کیجیے، بالآخر یہی موٹاپا اور چربی کی کثرت، اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔

وہ عصر کے بعد روزانہ اپنے کمرے سے (جو میرے کمرے کے سامنے ذرا اوپر کو واقع تھا) فوراً میرے کمرے میں (جو دارِ جدید میں فوقانی منزل پر فارسی خانے اور معراج گیٹ سے آتی ہوئی کمروں کی رَو کے سنگم پر واقع ہے اور جو حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں قاسمی کیرانوی کا کمرہ اور اُن کی علمی و تربیتی تگ و تاز کا تقریباً ربعِ صدی تک مرکز رہا تھا) آجاتے اور تفریح کے لیے آمادہ کرتے، وہ جب تک اس کمرے میں (تقریباً دو سال تک) رہے ہمیشہ مجھے تفریح کرانے لے جاتے، کبھی کبھی تکان یا عدمِ فرصت کی وجہ سے یا اُس زخم کی وجہ سے جو شکر کے موذی مرض کے بعد عموماً، میرے دونوں پاؤں کے تلووں میں سے کسی میں ہوجایا کرتا ہے، اگر تفریح کو آمادہ نہ ہوتا، تو وہ اپنی خوش اَخلاقی اور نیاز مندانہ اداؤں کے ذریعے، تھوڑی بہت دور دارالعلوم کے اِحاطے سے باہر ضرور لے جاتے۔ عموماً ہم لوگ دارالعلوم کے مغرب میں عیدگاہ پارک کے پاس سے مدرسہ اصغریہ دیوبند کی نئی عمارت کے نزدیک بھائلہ روڈ سے جا ملنے والی سڑک سے ریلوے گومتی (کراسنگ) پار کرکے پھر دوسری سڑک پکڑ لیتے، جو جانبِ شمال میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاکر، قاسم پورا کو کراس کرکے، جی ٹی روڈ سے جا ملتی ہے، ہم لوگ قاسم پورا ہی سے ایک دوسری سڑک سے، جو دیوبند کی عیدگاہ کے پاس سے ہوتی ہوئی دارالعلوم کے مدنی گیٹ سے آملتی ہے، دارالعلوم آجاتے، مغرب کی نماز عموماً اُنھیں کی اِمامت میں قاسم پورا میں ایک صاحب

کے کھیت میں نماز کے لیے بنے ہوئے چبوترے (مصلی) پر ادا کرتے۔

مفتی نسیم احمدؒ ظریف الطبع بھی تھے، اُن کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی، اُن کی ذہانت، ذہن کی زرخیزی، علمی مسائل پر تبادلۂ خیال، مختلف اہلِ علم اور مسلم جماعتوں وتنظیموں پر تبصرے، ملکی وبین الاقوامی حالات کی تازہ خبروں پر رائے زنی، دار العلوم کے بعض مسائل پر آزادانہ ومعصومانہ تجزیے وغیرہ سے، تفریح کا یہ سفر بہت جلدی طے ہوجاتا۔

راحت رساں رفیقِ سفر

دہلی، گنگوہ اور آس پاس کے کئی مدرسوں میں اُن کی رفاقت میں جانا ہوا۔ وہ بڑے آرام دہ، جی لگانے والے اور سفر کے تقاضوں میں مکمل ہاتھ بٹانے والے رفیقِ سفر ثابت ہوئے۔ وہ میرے لیے اُس عرصے میں ایسے ہم دم بن گئے تھے کہ کسی سفر میں اور بے تکلفی کی مجلس میں، اگر میرے ساتھ اپنی طالبِ علمانہ مشغولیتوں کی وجہ سے نہ ہوتے، تو مجھے اُن کی کمی محسوس ہوتی تھی، وہ ہوتے تو مجھے سہارا محسوس ہوتا اور جو کام جس طرح ہونا چاہیے، وہ اُسی طرح ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ کھانا پکانے، ناشتہ بنانے اور سلیقے سے کھلانے پلانے کا بھی سلیقہ رکھتے تھے؛ ورنہ عموماً محنتی طلبہ اِس حوالے سے خاصے گھامڑ ہوتے ہیں۔

اُن سے دار العلوم میں پہلی ملاقات ۳۰/۳ دارِ جدید میں ہوئی، جو دار العلوم کی طالبِ علمی کے زمانے میں میرا بھی کمرہ رہا تھا، دار العلوم میں جب تک رہا اِسی کمرے میں رہا۔ برادرِ معظم مولانا محمد اویس القاسمی (متوفی جمعہ ۳/ جمادی الاخری ۱۴۱۹ھ = ۲۵/ ستمبر ۱۹۹۸ء) دار العلوم دیوبند آئے تو طلبۂ مظفر پور وسیتا مڑھی وویشالی نے، اُسی کمرے میں اُن کے لیے جلسۂ استقبالیہ ترتیب دیا، مفتی نسیمؒ نے بہ حیثیتِ ناظمِ انجمن اُن کے تعارف وتعریف میں خیر مقدمی تقریر کی، جو بہت اچھی تھی، دل نے کہا کہ یہ طالبِ علم اِن شاء اللہ دار العلوم سے فراغت کے بعد، اچھا فاضل اور لائق عالم ثابت ہوگا۔

قاضی مجاہد کے قافلۂ علم وفکر سے وابستگی

دار العلوم سے فراغت کے بعد جب وہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء-۱۴۲۳ھ/ ۲۰۰۲ء) کے قافلۂ علم و عمل سے جڑ گئے اور اچھے معاون ومددگار اور کام یاب مقرِّر و منتظم اور اُن کی دین وملت کے تئیں سرگرمیوں کے نقشے میں رنگ بھرنے والوں میں سے ایک لائق فرد ثابت ہوئے اور اُن کا قیام امارتِ شرعیہ پھلواری شریف کے ایک فعّال کارکن کی حیثیت سے پھلواری شریف میں ہوگیا، تو یہ راقم ایک بار اپنی ایک شدید ضرورت سے قاضی صاحبؒ سے ملنے اور ضرورت پوری کرنے کے لیے گزارش کرنے کے لیے، اچانک جمعہ کے دن جمعہ کی نماز کے بعد اُن کی قیام گاہ محلّہ ''سیّدانہ'' میں حاضر ہوا، وہ انتہائی پرتپاک طریقے سے، بے پناہ خوشی کے ساتھ ملے، جیسے کوئی بڑا قیمتی خزانہ اچانک اُن کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ اُنھوں نے خاطر تواضع کا انتظام کیا، امارتِ شرعیہ میں رہایش کی معقول جگہ فراہم کی، پھر قاضی صاحب سے ملوایا، میں ڈیڑھ دو روز اُن کی ضیافت اور اِکرام واِحترام کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر، دوسرے دن کسی وقت واپس ہونے کو تیار ہوا، تو اُنھوں نے باچشمِ نم مجھے رخصت کیا، جیسے کوئی نعمت اُن سے چھینی جارہی ہو۔

وہ کئی بار میرے پاس دار العلوم میں اور پھر میری عائلی رہایش گاہ افریقی منزل قدیم میں، کبھی قاضی صاحب کے ساتھ، کبھی کسی اور مہم سے جو قاضی صاحب نے چھیڑی ہوتی تھی اور کبھی اپنے اِمارت کے رُفقا کے ساتھ اچانک وارد ہوئے اور تھوڑی دیر رک رک کے ہی واپس ہوگئے، میں اُن سے شکایت بھی کرتا کہ اب ملنے کو وقت نہیں ہے اور کبھی ہمہ وقت ساتھ رہنے کو بے تاب رہتے تھے، تو وہ کہتے! حضرت اب آپ ہی لوگوں نے (یعنی قاضی صاحب اور اِمارت شرعیہ کے علما نے) ایسا مشغول کردیا ہے کہ کہیں چین سے چند منٹ بیٹھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ میں اُن سے کہتا اچھا ہے، آپ

جوان ہیں، تازہ دمی ہے، توانائی ہے، حوصلہ کی کمان چڑھی ہوئی ہے، اِس لیے جو کچھ بن پڑتا ہے، کرتے جایئے، یہی منزل کام کرنے کی ہے، کچھ ہی سالوں بعد علم وعمل کی راہ پر چلنے میں تھکاوٹ سی محسوس ہوگی، ہم لوگ اب تھکاوٹ ہی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ مسکراتے ہوئے مصافحہ کرتے اور سلام کرتے ہوئے رخصت ہوجاتے۔

وہ کوہ کن کی بات پر اُن کے تاثُّرات

۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء میں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی وفات کا جاں کاہ سانحہ پیش آیا، تو دل چھلنی ہوگیا، چند ماہ بعد ہی میں نے اُن پر اپنی تأثُّراتی کتاب: ''وہ کوہ کن کی بات'' شائع کی جو الحمدللہ توقع سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اُن کی خواہش پر میں نے کتاب کا ایک نسخہ اُنھیں بھیجا اور اُن سے ''فقہ اکیڈمی'' کے ترجمان مجلّہ ''بحث ونظر'' میں تبصرہ کرنے کی خواہش ظاہر کی، تو اُنھوں نے اُس پر تبصرہ کرنے کے وعدے کے ساتھ یہ خط اِرسال کیا:

> مخدوم ومحترم حضرت مولانا نور عالم امینی صاحب! ادام اللہ ظِلَّہ
>
> خدا کرے مزاجِ گرامی بہ عافیت ہو۔
>
> آپ کی اِرسال کردہ کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' موصول ہوئی۔ یہ میرے لیے بہترین اور سب سے قیمتی تحفہ ہے۔ اِس موقعے پر یادآوری وخصوصی توجہ کے لیے بے حد ممنون ومشکور ہوں۔ بلاشبہہ آپ نے حضرت مولانا کیرانویؒ کی سوانحِ حیات لکھ کر، قاسمی برادری اور فضلاے دیوبند کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے اور حضرت علیہ الرحمۃ سے آپ کو جو خصوصی عقیدت وتعلق تھا، اُس کا کماحقُّہ حق ادا کردیا ہے۔ اللہ آپ کو بہترین صلہ دے۔ آمین
>
> حضرت علیہ الرحمۃ کی ذاتِ گرامی نہ صرف ہندوپاک کے لیے؛ بل کہ پوری دنیا کے لیے خدائی عطیہ تھی، اُن کی ذات سے ملّتِ اسلامیہ کو جو فائدہ

پہنچا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آپ نے حضرت علیہ الرحمۃ کی زندگی کے جن گوشوں اور خدمات کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اُن پہلوؤں پر آپ کے علاوہ کوئی اور فاضلِ دیو بند کا لکھنا مشکل تھا۔ یہ کتاب نہ صرف حضرتؒ کی خدمات وروشن کارنامے پر مشتمل دستاویز ہے؛ بل کہ مرحومؒ کے بے شمار تلامذہ و منتظمین کے حالات کا بیش قیمت ذخیرہ ہے، یہ کتاب ظاہری ومعنوی خوبیوں سے مالا مال ہے، کتاب کی سطر سطر میں مرحوم سے آپ کے خلوص وعقیدت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ جب یہ کتاب مجھے ملی اور میں نے کھول کر دیکھا، تو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کتاب ہندوستان سے چھپی ہے، خیال تھا کہ پاکستان کے کسی کرم فرمانے ارسال کی ہے، یہ کتاب آپ کے اعلیٰ ذوق کی شاہ کار ہے۔ یقیناً مولانا مرحومؒ کی روح خوش ہوگئی ہوگی۔ عجلت میں یہ چند جملے لکھ رہا ہوں۔ میرے جیسا آدمی تبصرہ کیا کرے گا۔ البتہ اپنے تأثرات کا اظہار کیا جائے گا۔

والسلام
نسیم احمد قاسمی
۲۸ر ستمبر ۱۹۹۰ء

تحریری سرگرمیاں

مفتی نسیمؒ اپنے مشغول ترین اوقات میں سے، کچھ وقت تصنیف وتالیف کے لیے بھی نکال لیا کرتے تھے، چناں چہ اُنھوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں، جو شائع ہوئیں، اِسی طرح اُنھوں نے مُتعدِّد فقہی مقالات بھی لکھے، جو حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب کے جاری کردہ فقہی اردو مجلّہ ''بحث ونظر'' اور امارتِ شرعیہ پھلواری شریف کے ترجمان ہفتہ وار ''نقیب'' اور ملی کونسل کے ترجمان ماہ نامہ ''ملّی اتحاد'' میں شائع ہوتے رہے۔ بہت سے سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے، نیز

دعوتی وتبلیغی مقاصد کے لیے، موصوف نے ہندوستان کے بے شمار شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کیا، خاص طور پر حادثات اور فرقہ وارانہ فسادات کے مواقع پر اِمداد اور ریلیف کا کام کرنے کے لیے، حادثے سے مُتاثّرہ علاقوں کا مسلسل سفر کیا اور وہاں کے مسلمانوں اور مصیبت زدہ خاندانوں کی اشک شوئی اور باز آبادکاری کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔

ہم لوگوں کو بہت ساری امیدیں اور توقُّعات مفتی نسیم سے وابستہ تھیں، خاص طور پر اِس لیے بھی کہ ایسے علما بہت تیزی کے ساتھ رحلت فرماتے جارہے ہیں، جن سے ہندوستانی مسلم سماج روشنی حاصل کرتا تھا اور فرقہ پرستوں کی طرف سے پیدا کردہ تمام تر نامساعد اور پریشان کن منفی حالات میں اُن کا سہارا لیا جاتا تھا؛ لیکن ظاہر ہے کہ اِنسان اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے بے بس ہے۔

مفتی نسیم احمد قاسمی کی پیدائش ۲۵/دسمبر ۱۹۶۷ء مطابق ۲۲/شوال ۱۳۸۷ھ میں ہوئی، اُن کا وطن مظفرپور، صوبۂ بہار، کا ایک گاؤں ''بیل پکونہ'' تھا، اُنھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے دربھنگہ اور مدرسہ دینیہ غازی پور یوپی میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی، جہاں سے اُنھیں ۱۴۰۶ھ میں فضیلت کی ڈگری ملی، اِس کے بعد شعبۂ افتا میں داخل ہوے اور ۱۴۰۸ھ میں اِفتا کی تربیت مکمل کی، اِس کے بعد ایک سال تک معین مفتی کا کام کرتے رہے۔

بعدازاں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی نے اُنھیں امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ آنے کی دعوت دی اور ایسے کام اُن کے سپرد کیے، جن سے اُن کی فقہ وفتاویٰ اور تصنیف وتالیف کی صلاحیّت کو جلا ملی، پھر جب مسلمانوں کی صف کو متحد کرنے کے لیے ملی کونسل ۱۹۹۲ء میں قیام عمل میں آیا، تو مفتی نسیم، حضرت قاضی صاحب کے سرگرم اسفار اور شہر ودیہات کے دوروں میں اُن کے ساتھ رہے، جس نے اُن کی ذہانت میں چار چاند لگادیے، اُن کی فکر ونظر میں خاصی وسعت پیدا کردی اور وہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود

اور اُن کی نکبت وپستی کو دور کرنے کے لیے مختلف میدانوں میں ایک دیدہ ور اور تجربہ کار کی طرح کام کرنے کا اہل ہو چلے تھے؛ لیکن زندگِ مستعار کے اِتنے ہی دن اُنھیں ملے تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ (*)

سوانحی نقوش

۞ نام: نسیم احمد بن محمد ہاشم بن محمد سلیم بن محمد یعقوب بن محمد فرزند علی بن محمد امیر الدین بن محمد عطاء اللہ بن محمد جعفر بن عبد القادر بن مولوی سعید الحق۔

۞ پیدائش: ۵/دسمبر ۱۹۶۷ء (۲/شوال ۱۳۸۷ھ)

۞ آبائی وطن: بھروارہ کے مضافات میں تقریباً دو کیلو میٹر دور جانبِ مغرب ایک معروف ومشہور بستی ''بیل پکونہ'' ہے، اُس کا ڈاک خانہ ''بھروارہ'' بلاک ''کٹرہ'' اور ضلع ''مظفر پور'' ہے۔

۞ تحصیلِ علم: ابتدا میں میاں جی انظار صاحب مرحوم پھر حافظ عبد الصمدؒ سے ناظرہ قرآن شریف اور اردو قاعدہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ ''مدینۃ العلوم بھروارہ'' (یہ مدرسہ اِس وقت بھی مکتب کی صورت میں ہے) کم وبیش ایک سال زیرِ تعلیم رہے، اس کے بعد مولانا قمر الزماں صاحب نقشبندی مجدِ دی (۱) سے فارسی اور کچھ عربی کتابیں اور حساب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، اِس کے بعد مولانا موصوف کے مشورہ سے مولانا عزیر اختر قاسمی استاذ دار العلوم ''بالا ساتھ'' کے ساتھ دیو بند گئے (مولانا اُس وقت دار العلوم دیو بند میں زیرِ تعلیم تھے) سوئے قسمت بیمار ہو گئے گھر واپس آ گئے۔ علاج ومعالجہ سے صحّت یابی ہوئی؛ لیکن سال یوں ہی ختم ہو گیا، بعد رمضان تقریباً شوال کی ۱۳ یا ۱۴/ تاریخ کو مولانا قمر الزماں صاحب نے اُنھیں مدرسہ ''خزینۃ العلوم'' پوپری بازار میں داخل کرایا۔ درجۂ فارسی ابتدائی میں پڑھنے لگے، تعلیم شروع ہو گئی تھی، کم وبیش ایک مہینہ گزرا تھا کہ زبردست بارش ہوئی، سیلاب کے نتیجے میں مدرسہ پانی میں ڈوب گیا، بارش کا وہ تسلسل تھا کہ ابر تھمتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ بالآخر ایک روز بارش کچھ رکی

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۱-۲، جلد ۲۷، محرم وصفر ۱۴۲۴ھ = مارچ واپریل ۲۰۰۳ء۔

(۱) مفتی نسیم کے ہم وطن یعنی ''بیل پکونہ'' کے ایک خوش اوقات تعلیم یافتہ جو ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر رہے، ذوقِ عبادت نے اِس ذمّے داری سے سبک۔ دوش ہو جانے پر مجبور کیا، اِن سطور کے ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء میں تحریر کیے جانے کے وقت حیات ہیں۔

تو گھر واپس آ گئے۔

کچھ دنوں بعد مدارس میں عیدالاضحیٰ کی فرصت ہوئی، چھٹی ختم ہونے کے بعد مولانا قمرالزماں صاحب نے مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے دربھنگہ میں داخل کردیا۔ مدرسہ امدادیہ میں گلستاں بوستاں اور میزان وغیرہ کتابیں پڑھیں، پورے سال مدرسہ امدادیہ میں تعلیم حاصل کی۔ یہ ۱۹۷۸ء-۱۹۷۹ء کا سال تھا۔ سال ختم ہونے کے بعد مولانا قمرالزماں اُنھیں ۱۹۷۹ء کے آخر میں مدرسہ دینیہ غازی پور لے کر پہنچے۔ اُس زمانے میں قاری شبیر احمد صاحب (حال ناظم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھرواره دربھنگہ) ومولانا محمد صفی الرحمٰن صاحب (صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ شکر پور) بھی مدرسہ دینیہ کے اُستاذ تھے۔ اِس لیے شمالی بہار کے طلبہ کا اُس مدرسے میں تعلیم کا غیر معمولی شوق اور رجحان پایا جاتا تھا؛ لہٰذا چند لڑکوں کے ساتھ اُن کا بھی داخلہ مدرسہ دینیہ میں ہوگیا۔ درجہ عربی اول سے یہاں تعلیم شروع کی۔

مدرسہ دینیہ غازی پور میں درجۂ عربی اول سے درجۂ عربی پنجم تک تعلیم حاصل کی، ایک موقع پر کسی وجہ سے بعض ساتھیوں کے ہم راہ مئو جا کر دارالعلوم مئو میں درجۂ عربی چہارم میں داخلہ لے لیا تھا؛ لیکن وہاں اُنھیں دلجمعی اور اطمینان میسر نہیں آسکا۔ اُنھوں نے دوبارہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں داخلہ لینا چاہا؛ لیکن اب وقت گزر چکا تھا انتظامیہ نے داخلہ سے معذرت کردی؛ لیکن قاری شبیر احمد صاحب سے مل کر جب اُنھوں نے صورتِ حال کا اِظہار کیا، تو موصوف نے مہتمم عزیز الحسن صدیقی صاحب کو سمجھا بجھا کر دوبارہ مدرسہ دینیہ میں داخلہ کرادیا۔

❁ **دارالعلوم دیو بند میں داخلہ اور فراغت:** درجۂ عربی پنجم (جو مدرسہ دینیہ غازی پور میں درجۂ ششم کے مساوی ہے) کی کتابیں مکمل کرلیں تو ۱۴۰۴ھ میں مادرِ علمی دارالعلوم دیو بند میں داخلہ لیا، امتحان داخلہ میں اچھے نمبرات سے کام یابی حاصل کی۔

دارالعلوم دیو بند میں درجۂ عربی ہفتم سے تعلیم کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۶ء میں دورۂ حدیث سے فراغت ہوئی۔ ۱۹۸۷ء میں دارالِافتا میں داخلہ لیا۔ ضابطہ کے مطابق سال بھر کی مدت اِس شعبے میں اُنھوں نے گزاری۔ دو سال کے لیے دارالِافتا میں معین المفتی کی حیثیت سے اُن کا تقرر رہا۔

❁ **عملی زندگی:** اِسی دوران قاری شبیر احمد صاحب کی معیّت میں حضرت مونا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ مفتی نسیم صاحب کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کیا، حضرت قاضیؒ اُن کی جانب متوجہ ہوے اور فقہ وفتاویٰ سے متعلق اُن سے کئی سوالات یکے بعد دیگرے کیے، حضرت موصوف

نے اندازہ کرلیا کہ طالبِ علم باصلاحیت ہے، اگر بہتر ماحول اور مواقع مل جائیں تو آیندہ علمی ترقی کا بہت کچھ اِمکان ہے۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے قاری صاحب سے فرمایا کہ جب یہ دیوبند سے اپنا کام ختم کر کے آجائے، تو اِنھیں امارتِ شرعیہ میرے پاس بھیج دیجیے۔

چناں چہ مفتی نسیمؒ ۱۹۸۹ء سے حضرت قاضی صاحبؒ کے ساتھ امارتِ شرعیہ میں کام کرنے لگے، اُن کی رہ نمائی میں امارتِ شرعیہ نیز فقہ اکیڈمی کے بعض کام اُن کے سپرد ہوئے۔ حضرت قاضی صاحبؒ کی صحبت اور بہ حیثیت مجموعی اِمارت کے علمی ماحول سے مرحوم مفتی نسیم کی صلاحیتوں کو خاصی جلا حاصل ہوئی، اُن کے مطالعے اور معلومات میں وسعت پیدا ہوئی۔ چند ہی سال بعد اُن کی تحریری وتقریری صلاحیت نے عوام وخواص کے حلقوں میں، اُنھیں متعارف کرادیا۔ غازی پور میں باضابطہ عربی تعلیم کے آغاز کے ساتھ ہی تحریر وتقریر کی موصوف نے اپنے اساتذہ کی نگرانی میں نہایت ذوق وشوق سے مشق شروع کردی تھی۔ زمانۂ تعطیل میں جب وہ اپنے وطن آتے، تو اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر مختلف موضوعات پر چھوٹے بڑے مضامین لکھتے اور اِصلاح کی غرض سے قاری شبیر احمد صاحب کو پڑھ کر سناتے۔ حضرت قاضی صاحبؒ نے اُن کی علمی وانتظامی صلاحیت کے پیشِ نظر، اُنھیں آل بہار ملی کونسل کا معاون سکریٹری بنادیا، اُس زمانے میں جنرل سکریٹری کے عہدہ پر ایڈوکیٹ راغب حسن صاحب فائز تھے۔ آگے چل کر موجودہ امیرِ شریعت سابق ناظم امارتِ شرعیہ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے اُنھیں نائب ناظم امارتِ شرعیہ کا عہدہ سپرد کیا، اُنھوں نے اِن ذمہ داریوں کو تادمِ آخر، نہایت حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا۔

❁ **تالیفات:** اپنی مختصر سی عمر میں مفتی نسیم نے چھوٹی بڑی جو کتابیں تالیف کیں، وہ مندرجۂ ذیل ہیں:

- اسلام اور نکاح
- اسلام اور طلاق
- اسلام اور وراثت
- اسلام اور زکوٰۃ
- اسلام اور عورتوں کے حقوق

❁ **والد صاحب کی خدمت:** اپنے والد بزرگوار ہاشم صاحب کی رحلت کے بعد وہ ڈیڑھ دو سال ہی زندہ رہ سکے۔ اُن کے والد جس شخص کے یہاں ملازم تھے، تقسیمِ ملک کے بعد جب مشرقی پاکستان منتقل ہوگئے، تو مفتی نسیم کے والد بھی اُن کے ہم راہ مشرقی پاکستان چلے گئے، پھر جب پاکستان بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا تو اپنے سیٹھ کے ہم راہ ہاشم صاحب کو بھی کراچی منتقل ہونا پڑا۔ عمر کے آخری حصے میں وہیں فالج کا حملہ ہوا۔ مفتی صاحب کو جب اطلاع ہوئی تو کراچی پہنچ کر اپنے ساتھ والد صاحب کو پٹنہ لے آئے۔ جہاں تک ممکن ہوسکا، اُن کا علاج معالجہ کرایا؛ لیکن صورتِ حال روز بہ روز پیچیدہ ہوتی گئی۔ جب صحت

وشفا کی امید باقی نہیں رہی، تو اُنھیں اپنے آبائی وطن ''بیل پکونہ'' مظفر پور لے آئے۔ بالآخر ۲۷/ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۹/جولائی ۲۰۰۱ء کو ہاشم صاحب اِس دنیاے فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

❁ **وفات:** والد کی وفات سے جہاں اُنھیں غیر معمولی رنج وغم ہوا، وہیں اب خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی بہ راہِ راست اُن کے کندھوں پر آپڑا۔ دوسری طرف امارتِ شرعیہ کے کاموں سے دور ونزدیک کے مسلسل اَسفار نے اُن کی صحت وتوانائی پر خاصا ناخوش گوار اثر ڈالا۔ ذیابیطس اور امراضِ قلب سے اُنھیں کم عمری ہی میں سابقہ پڑا، جس کی تشخیص بروقت نہیں ہوسکی۔ بیرونِ ملک کے ایک طویل سفر سے جب وہ دہلی آئے، تو ڈاکٹروں نے انکشاف کیا کہ بہ یک وقت اُنھیں کئی امراض لاحق ہیں۔ علاج معالجے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، مگر ہوا وہی جو نوشتۂ تقدیر تھا، یہاں تک کہ ۲۶/ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ مطابق ۳۰/جنوری ۲۰۰۳ء کو اُن کا پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

سب سے پہلے اُن کی نمازِ جنازہ دہلی میں پڑھی گئی، بعد ازاں بہ ذریعہ ہوائی جہاز اُن کی لاش کو پٹنہ لے جایا گیا، جہاں امارتِ شرعیہ کے کیمپس میں امیرِ شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب نے دوسری بار نمازِ جنازہ پڑھائی، تیسری بار اُن کی نمازِ جنازہ مولانا قمر الزماں صاحب نے جنتا ہاٹ رام پٹی میں پڑھائی، جو مفتی نسیم مرحوم کے گاؤں سے تقریباً نصف کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ تدفین آبائی قبرستان ''بیل پکونہ'' میں ہوئی۔ (۱)



(۱) ''سوانحی نقوش'' کے سلسلے میں زیادہ تر قاری شبیر احمد صاحب (مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکر پور بھرواڑہ ضلع دربھنگہ) کی تحریر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

خادمِ علم ودین

مولانا محمد تسلیم سِدھولوی در بھنگویؒ (*)

۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۰ء — ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء

خوگرِ پرواز کو ، پرواز میں ڈر کچھ نہیں
موت اِس گلشن میں ، جُز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

تعلیم وتربیت اور دعوت وتبلیغ کی خدمت میں منہمک رہنے والے عالم، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، جامعہ رحمانی خانقاہ ''مونگیر'' کے نائب ناظم، مدرسہ اِمدادیہ، دربھنگہ کے سابق ناظم اور ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' کے رکنِ رکیں، مولانا ''محمد تسلیم صاحب در بھنگوی'' اپنے وطن یعنی دربھنگہ کے ایک گاؤں ''سِدھولی'' میں ۲۶ رمحرم الحرام ۱۴۲۴ھ مطابق ۳۰ر مارچ ۲۰۰۳ء بہ روز اتوار شام چار بجے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وفات کے وقت مولانا کی عمر ۷۲ برس تھی، آپ نے اپنی ساری زندگی دین اور امتِ مسلمہ کی خدمت میں گزاری۔

مولانا کے سانحۂ ارتحال کا علم مجھے اخبارات کے ذریعے ہوا، تو میرے اوپر بجلی گرگئی؛ کیوں کہ مولانا مرحوم سے مجھے والہانہ محبت وعقیدت تھی، اِس محبت وتعلق کی وجہ یہ تھی کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ دینی تعلیم کی خدمت اور کتاب وسنّت کے نہج پر مسلمان نسل کی تربیت سازی کی راہ میں مسلسل سرگرمی کے خوگر تھے اور یہ اوصاف اُنھوں نے اپنے بلند پایہ، مایۂ ناز استاذ، عالِم باعمل، برِّصغیر میں ''شیخ الاسلام'' کے لقب سے مشہور حضرت مولانا سید

(*) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی حارث عبدالرحیم لکھنوی قاسمی۔

حسین احمد مدنیؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) سے اَخذ کیے تھے۔ چند ماہ سے مولانا کی صحت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی؛ جس کی بنا پر آپ نے جنوری ۲۰۰۳ء سے جامعہ رحمانی مونگیر کی اپنی ذمے داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ علاج ومعالجے کا سلسلہ برابر "کلکتہ" (آج کل کے "کولکاتا") سے رہا۔ چند ہفتوں سے اپنے وطن "سِدھولی" میں تھے، اُسی گاؤں میں ۲۷؍محرم مطابق ۳۱؍ مارچ بہ روزِ دوشنبہ آپؒ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ جنازہ کی نماز میں علما کی ایک بڑی جماعت کے علاوہ، گاؤں کے باشندے، آپؒ کے عزیز واقارب اور ملنے جلنے والوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

مولاناؒ کی سیرت وصورت

مولانا محمد تسلیم صاحبؒ نے ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۰ء میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی اور متوسط تعلیم اپنے مُعاصِرین کی طرح اپنے گاؤں کے مکتب نیز پڑوسی گاؤں کے مدارس میں حاصل کی، درجاتِ ثانویہ تک مدرسہ اِمدادیہ دربھنگہ اور مدرسہ شاہی مرادآباد میں تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، جہاں سے ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد کچھ دنوں ضلع پورنیہ اور ضلع مدھوبنی کے مدرسوں میں مُدرِّس رہے، پھر مدرسہ اِمدادیہ دربھنگہ میں مدرس وذمہ دار ہوگئے۔ راقم الحروف نے ۱۳۸۰ھ مطابق ۱۹۶۱ء میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مدرسہ اِمدادیہ میں داخلہ لیا، تو اُس وقت مولانا ہی مدرسہ کے ناظم تھے، میں نے وہاں اردو، عربی کی ابتدائی اور فارسی زبان کی بڑی کتابیں، خاص طور سے شیخ سعدی شیرازی (مصلح الدین متوفی تقریباً ۶۹۰ھ مطابق ۱۲۹۱ء) کی مشہور ومعروف کتابیں "گلستاں" و"بوستاں" وغیرہ پڑھیں۔ مجھے مولانا کی چستی وپھرتی بہت اچھی لگتی تھی، وہ اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات چیت، سفر وحضر میں ہر جگہ اور ہر وقت پھرتیلے نظر آتے، مولانا پان بہت استعمال کرتے تھے، جس سے اُن کے ہونٹ بیداری کی حالت

میں ہمہ وقت شوخ گلابی رنگ میں رنگے رہتے تھے۔ وہ اپنی گفتگو سے مخاطب کو بہت متأثر کر لینے میں فرد تھے۔ اُن کے قالب پر عالمانہ وقار بہت سجتا اور جچتا تھا۔ مولاناؒ زندگی کے ہر کام کو اپنے وقت پر انتہائی مہارت اور پوری تن دہی کے ساتھ کرنے کے عادی تھے۔ اُن کے اوپر جب بھی میری نظر پڑتی ایک شعلۂ جوّالہ کا تصوّر میرے ذہن میں اُبھرتا، وہ واقعی تن دہی وچستی کی مورت لگتے تھے۔ کھادی کا سفید بے داغ لباس زیبِ تن فرماتے تھے، جو اُن تمام زُعما کا لباس تھا جو انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا رمز سمجھے جاتے تھے۔ کپڑے کی اِس قسم کو دست کاری کے اُس طریقے سے بُنا جاتا ہے جس سے مہاتما گاندھی (م ۱۸۶۹ھ- ۱۹۴۸ء) نے روشناس کرایا اور فروغ دیا تھا۔
مولانا تسلیم صاحبؒ اُس وقت دبلے پتلے چھریرے بدن کے تھے۔ مولانا کا رنگ صاف، قد متوسط اور کچھ نکلتا ہوا، ناک ستواں، سر کے بال گھنیرے، کھوپڑی بڑی، آواز بلند تھی، گفتگو صاف ستھری کرتے تھے، شیریں زبان اور قادر الکلام تھے اور خوش گفتار مقرر بھی، حاضرین پورے انہماک کے ساتھ اُن کی تقریر سنتے تھے، اُن کی تقریر سے (جس میں سنجیدگی کے ساتھ مزاح کی آمیزش بہت ہوتی تھی) اپنے احوال کو سدھارنے اور اپنی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے حوالے سے بہت زیادہ استفادہ کرتے تھے۔ مولانا کی تقریر سادہ، آسان، پُراثر، زندگی کے حقائق سے لبریز ہوتی تھی؛ اِس لیے بہت مفید ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم ننھے مُنّے طالب علم اپنی سادہ لوحی، بھولے پن، گفتگو کے اَسرار و رُموز سے نابلد ہونے کے باوجود، طلبہ کے مجمع یا شہر کے اِجلاس میں وقتاً فوقتاً مولانا جو تقریریں یا وعظ و نصیحت کرتے تھے، اُس سے لُطف اَندوز ہوتے تھے۔ اُن کی تقریریں سن کے اٹھتے تو ہمارے دامن اُن قیمتی موتیوں سے بھرے ہوتے، جن کو مولانا نے اپنی دینی باتوں میں بکھیرا ہوا تھا۔ چناں چہ اِس کے باوجود کہ تدریسی اوقات کے باہر بھی ہمیشہ لکھنے پڑھنے کے کاموں، سبق یاد کرنے، اسباق کو دوہرانے، تکرار کرنے کی ذمے داریوں سے ہم لوگ بوجھل ہوتے تھے؛ اُن جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، جن کے

بارے میں ہمیں پہلے سے علم ہوجاتا کہ اُن میں مولانا کی تقریر ہوگی۔

مولاناؒ سے دید وشنید

مدرسہ اِمدادیہ ہماری تعلیمی زندگی کا وہ پہلا اسٹیشن تھا، جہاں ہم نے گاؤں سے نکل کر قیام کیا۔ اِس سے پہلے ہم گاؤں سے باہر نہیں نکلے تھے۔ اِس مدرسے میں داخلہ لینے سے پہلے مدرسے اور ہاسٹل کی زندگی کے طور طریقوں سے کوئی واقفیت نہ تھی، یہاں آکر پہلی مرتبہ اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہوے۔ جن طلبہ کے ساتھ ہم رہتے تھے، وہ نہ صرف عمر میں ایک دوسرے سے مُتفاوِت تھے؛ بل کہ طرزِ زندگی، معیارِ معیشت، اَخلاق وکردار، عادات واَطوار اور زندگی کے مختلف معاملات کے حوالے سے، وہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے۔ ہم اپنی زندگی کے پہلے دہے میں تھے کہ یہ بات پہلی مرتبہ معلوم ہوئی اور نقش کالحجر ہوگئی کہ مدرسہ میں طلبہ کے لیے جماعت سے نماز پڑھنا لازمی ہے اور وہ فجر کی نماز میں شریک ہونے کے لیے صبح سویرے بیدار کیے جاتے ہیں۔ اِس سلسلے میں کسی قسم کی سستی برتنے پر اُن کی پٹائی بھی ہوتی ہے۔ چوں کہ ہم لوگ اپنے وطن یعنی گاؤں "رائے پور" ضلع سیتامڑھی - سابق ضلع مظفر پور- سے "پوبری" کے "جنک پور روڈ" اسٹیشن کے راستے، زندگی میں پہلی دفعہ، دربھنگہ جانے والی ٹرین میں سوار ہوکر عصر کی نماز کے وقت مدرسے پہنچے تھے؛ لہٰذا جب پہلی رات مدرسے میں گزاری اور صبح سویرے مولانا محمد تسلیمؒ کی گرج دار آواز ہمارے اوپر کوڑے کی طرح پڑی، تو ہم خوف زدہ ہوگئے۔ وہ پکار رہے تھے "اے عزیزو! نماز۔ اے عزیزو! نماز۔ صبح سویرے کے پر سکون وقت میں ہم بیدار ہونے کے عادی نہیں تھے؛ کیوں کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب نیند ہم جیسے بچوں کی آنکھوں کو اِس طرح تھپتھپاتی ہے جس طرح شفیق ماں کا ہاتھ تھپتھپاتا ہے۔

مولانا محمد تسلیمؒ کی آواز ہر صبح ہمارے ہوش اُڑادیتی تھی۔ مولانا کا یہ طرزِ عمل ہم بچوں کے نزدیک ہر اعتبار سے نہایت "ظالمانہ" تھا۔ ہم مدرسہ اِمدادیہ میں جتنے دن بھی

رہے، مولانا مرحوم کی جانب سے اِس سلوک کے علاوہ کسی چیز سے پریشانی نہیں ہوئی؛ اُن کے اِس رویّے کی وجہ سے ہم بچے دل ہی دل میں کہتے تھے: مولانا تسلیم صاحبؒ کتنے ظالم ہیں، ہم چھوٹے بچوں کے اِحساسات سے کس قدر ناواقف ہیں، کاش یہ بھی بچے ہوتے، ہماری طرح سوچتے، ہماری نظر سے دنیا کی سچائیوں کو دیکھتے، پھر وہ ہمارے سکون میں اِس انتہائی خوش گوار اوقات میں خلل انداز نہ ہوتے، ہم کو سوتا چھوڑ دیتے اور ہم لوگ پڑھائی شروع ہونے کے وقت سے کچھ پہلے از خود بیدار ہو جاتے۔

مولاناؒ کے ساتھ ایک یادگار تجربہ

مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ فجر، عصر اور عشا کی نماز میں امام کے سلام پھیرنے کے معاً بعد، مسجد سے نکل جاتے تھے اور اپنے دفتر کے پاس سے (جو کہ مسجد کے بغل میں مغربی وشمالی کونے پر مدرسے کی عمارت کے دائیں جانب جنوبی رخ پر پہلے نمبر کے کمرے میں واقع تھا) طلبہ کے رہائشی کمروں پر ایک مُتجسِّسانہ نگاہ ڈالتے تھے۔ ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ عصر کی نماز چھوڑنے کے جرم میں ہم پکڑے گئے، مولانا نے ہمارا تعاقب کیا؛ لیکن ہم اپنے کمروں سے ایک تنگ راستے کے ذریعے، مدرسے کے جنوب مشرق میں واقع مشہور ''لائٹ ہاؤس سنیما'' کو جانے والی گلی میں بھاگ کھڑے ہوے۔ ہماری سربراہی ہمارے گاؤں ہی کا ایک طالبِ علم کر رہا تھا۔ یہ طالبِ علم، عمر میں ہم سے بڑا تھا، پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا، وجہ یہ تھی کہ وہ پیدایشی طور پر لاپرواہ واقع ہوا تھا، کسی بھلائی سے اُس کو کوئی سروکار نہیں تھا، برائی میں پیش پیش رہتا تھا؛ اِس وجہ سے نام کا عالم تو ہو گیا؛ لیکن علمِ دین اور عالمِ دین کی ضروری صفات سے آراستہ نہ ہونے کی وجہ سے، دین ودنیا میں وہ کوئی نام پیدا نہ کر سکا۔ جب مولانا مرحوم نے ہم کو پکڑا، تو ہم نے اُس دن اُن سے بتا دیا کہ اِس نامراد طالبِ علم کے اِیما پر، ہم نے عصر کی نماز چھوڑی تھی۔ مولاناؒ ہمارے نام سے واقف تھے؛ کیوں کہ ہم مولانا محمد اویس القاسمی (متوفی ۳؍ جمادی الاخری

۱۴۱۹ھ مطابق ۲۵ر ستمبر ۱۹۹۸ء) کے گاؤں کے تھے، وہ ہمارے قریبی رشتے دار بھی تھے اور ایک ہی حویلی میں ہم دونوں کی رہایش تھی، مولانا محمد اویس صاحب اُس وقت مدرسے کے کام یاب، نوجوان اور ذی استعداد و باصلاحیت مُدَرِّس تھے۔ چناں چہ مولانا مرحومؒ نے جوں ہی ہمارا نام پکارا، ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی اور میں نے کہا کہ لو پکڑے گئے، میں زمین پر گر پڑا، جس کی وجہ سے گھٹنا چِھل گیا، گھٹنے پر کا پاجامہ پھٹ گیا۔ ناچار مولاناؒ کے پاس حاضر ہو کر معافی طلب کی۔ مولانا نے پھر کبھی کوئی جماعت نہ چھوڑنے کی شرط پر معاف کر دیا۔ یہ واقعی ہماری زندگی کا تاریخی واقعہ تھا، اِس کے بعد ہی ہم نماز کے پابند ہو گئے اور کسی شدید بیماری یا زبردست عذر ہی کی بنا پر، اِس کے بعد کوئی نماز چھوٹی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اُن پر بارانِ رحمت نازل فرمائے۔

مولاناؒ کی راقم کو دعا اور شاباشی

کسی بڑے انسان کے تذکرے میں خواہی نہ خواہی اپنا تذکرہ بھی شامل ہو ہی جاتا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ بر بنائے خود ستائی نہیں؛ بل کہ یہ کسی بڑے انسان کے تذکرے کا ہی ایک ناگزیر حصّہ ہوتا ہے۔

مدرسہ اِمدادیہ میں میری تعلیم کا دوسرا سال تھا، اِس راقم نے دیکھا کہ مدرسے کے میدان میں غربی، شمالی اور جنوبی ہاسٹلوں سے جو راستے آتے ہیں وہ آڑے ترچھے اور ''خودرو پودوں'' جیسے ہیں، جن سے بدنمائی ٹپکتی ہے؛ اِس لیے میں نے رسیاں خریدیں، کھرپا خرید کے لایا اور رسیوں کی مدد سے اُن سارے راستوں اور گزرگاہوں کو کھرپے سے تراشا اور اُن کے کناروں کے سبزوں اور گھاسوں کو کاٹ کر گزرگاہوں کو سیدھی اور خوب صورت بنا دیا۔ ایک روز یہ کام کرتے ہوے مولانا کی نظر میرے اوپر پڑ گئی، پوچھا یہ کام تم کیوں کر رہے ہو؟ میں ڈر گیا کہ شاید اِنھیں یہ برا لگ رہا ہے، پھر فرمایا: تم نے یہ بہت اچھا اور خوب صورت کام کیا ہے، اب یہ سارے راستے بہت خوش نما لگ

رہے ہیں؛ لیکن تمھارے جی میں از خود کیسے یہ آیا کہ ایسا اور اِس طرح کرنا چاہیے؟
میں نے کہا میں چوں کہ کسان آدمی ہوں، اپنے کھیتوں میں اِس طرح سبزوں کو کاٹنے
تراشنے وغیرہ کا کام کرتا رہتا ہوں؛ اِس لیے اِس سلسلے میں ایک ذوق سا پیدا ہو گیا ہے،
شجرکاری سے قدرتی مناسبت بھی ہے؛ اِس لیے میں اِن گزرگاہوں کی بے ہنگمی کو دیکھ
کر اِنھیں درست کرنے کے لیے بہت بے تاب ہو گیا، اگر حضرت والا کو میرا یہ عمل
ناگوار گزرا ہو تو معاف فرمائیں۔ مولانا نے مجھے سینے سے لگالیا اور فرمایا تمھارا یہ کام
تمھاری سلیقہ مندی اور ہونہاری کا غمّاز ہے، اِن شاء اللہ تم آیندہ زندگی میں بھی اپنی
سلیقہ مندی، محنت اور لگن کی وجہ سے کام یاب اور بامراد ہوگے۔ تمھارے اِس کام سے
میرا جی بہت خوش ہوا، میں سوچتا تھا کہ ہفتہ عشرہ سے اِس میدان کا نقشہ جو بدلتا جارہا
ہے، وہ کون بدل رہا ہے؟ اگر میں کسی مزدور سے یہ کام کراتا تو شاید اِتنے سلیقے کا نہ ہوتا
اور کئی سو روپے مزدوری کے صرف ہو جاتے۔

ہمارے آبائی گاؤں ''راے پور'' میں
مولاناؒ کی آمد اور خوش گوار یادیں

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مولانا علیہ الرحمہ مولانا محمد اویس القاسمی کی دعوت پر مہمان
بن کر ہمارے گاؤں آئے تھے، گاؤں والوں نے ایک یادگار دینی جلسہ کا انتظام کیا تھا،
جس میں مولاناؒ کا قیمتی بیان ہوا۔ یہ جلسہ دیر گئے رات تک ہوا، گاؤں کی جامع مسجد کے
وسیع میدان میں پنڈال نصب کیا گیا۔ یہ دن ہم بچوں کے لیے لائقِ ذکر و ناقابلِ
فراموش جشن کا دن تھا۔ ہم کو ایسا لگ رہا تھا کہ پورا مدرسہ امدادیہ ہمارے گاؤں میں اٹھ
آیا ہے؛ اِس وجہ سے کہ اِس مدرسے کے زیرک ناظم و ماہر مقرر کے قدم ہمارے گاؤں
میں پڑے تھے۔

مولانا محمد تسلیم مرحوم برابر ہمارے حافظے کے نہاں خانے میں جلوہ گر رہے۔ مجھے

ایسا لگ رہا ہے کہ میں اِس وقت بھی اُنھیں دیکھ رہا ہوں اور وہ اپنی شستہ زبان میں بات کرر ہے ہیں، جلسوں میں تقریر کرر ہے ہیں، مدرسے میں طلبہ کو جگا رہے ہیں، اپنے دفتر میں مہمانوں کا استقبال کرر ہے ہیں، مدرسے کے میدان میں سالانہ جلسے کا انعقاد کرر ہے ہیں، مہمان علما و بزرگانِ دین کے بغل میں تشریف فرما ہیں، مدرسے کے سالانہ جلسے کی نظامت کرر ہے ہیں، امیرِ شریعت حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانی (متوفی ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹۹۱ء) اور دار العلوم دیو بند کے سابق مہتمم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (متوفی ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء) اور اُن کے علاوہ دیگر حضرات کے ناموں کا تقریر کے لیے اعلان کرر ہے ہیں۔

مدرسہ امدادیہ اور جامعہ خانقاہ رحمانی میں مولاناؒ کی خدمات

میں مدرسہ اِمدادیہ دربھنگہ سے، دار العلوم مئو ناتھ بھنجن آ گیا، پھر چند سال بعد دار العلوم دیو بند منتقل ہو گیا، رسمی فراغت کے بعد ''عالم'' بن گیا بعد ازاں میرا بھی شمار ''علما'' میں ہونے لگا اور پھر میں مدرس بن کر علمی زندگی میں داخل ہو گیا، اِس اَثنا میں، مولانا کے بارے میں زیادہ کچھ معلومات نہ ہو سکی، پھر اچانک یہ بات سننے میں آئی کہ مدرسہ اِمدادیہ کے حالات بدل گئے ہیں، مولانا محمد تسلیم جنھوں نے اُس مدرسے کی خدمت میں اپنی انتہائی محنت صرف کی تھی، ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں مدرسہ امدادیہ چھوڑ اپنے وطن ''سدھولی'' میں مقیم ہو گئے ہیں، پھر کئی سال بعد معلوم ہوا کہ وہ جامعہ رحمانی مونگیر منتقل ہو گئے ہیں۔ اُس وقت سے لے کر اپنی آخری سانس تک تقریباً اٹھائیس سال آپ مونگیر کے اِسی مدرسہ میں نائب ناظم کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ مولانا کی دائمی سرگرمی، مسلسل عوامی تقریروں، دعوتی دوروں، تعلیمی اَسفار (جن کی وجہ سے عوام سے اُن کے تعلقات مستحکم اور مختلف علاقوں کے لوگوں سے اُن کے رشتے مضبوط ہو گئے تھے) اور نظم و نسق کی اُن صلاحیت، خوش اخلاقی، حسنِ معاملت اور لوگوں کے

مزاج سے واقفیت نے، جامعہ کو بہت نفع پہنچایا۔

مولانا محمد تسلیم صاحبؒ اُن لائق لوگوں میں سے ایک تھے، جو حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ کی تربیت کا ثمرہ تھے، حضرت والا ہی سے تصوُّف وسلوک میں بیعت ہوے اور اُن ہی سے بیعت کرنے کی اجازت بھی حاصل ہوئی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ جو کہ مولانا رحمانی کی کوشش ومنصوبہ بندی اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (سابق مہتمم دار العلوم دیو بند) کی توجہ اور فکرمندی سے وجود میں آیا تھا، آپؒ اس کے رکنِ اَساسی بھی تھے۔

تقریروں میں مولانا کی زبان سے سنے ہوے اشعار کی لذت

مولاناؒ اپنی تقریروں میں اردو کے مندرجۂ ذیل اشعار بہت پڑھتے تھے، جو بہار کی مقامی اردو کے زیادہ مشابہ ہیں:

کلی کلی کل جوڑا رے   مولی مالی بڑا گیانی

جو چاہا سو توڑا رے   کچے پکے کا حال نہ جانے

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی روح قبض کرنے کے لیے، اِس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ یہ شخص بوڑھا ہوجاے اور اپنی تمام دنیاوی خواہشیں وآرزوئیں پوری کرلے، تب اُس کو موت دے؛ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ادھیڑ عمر والوں اور بوڑھے لوگوں کو موت کا مزہ چکھاتا ہے، اُسی طرح بچوں، جوانوں، حتی کہ شیر خوار بچوں کو بھی موت سے دوچار کرتا ہے اور کبھی ایسا کرتا ہے کہ بوڑھے آدمی کی زندگی اتنی طویل کردیتا ہے کہ وہ درازیِ عمر کی وجہ سے خبط الحواس ہوجاتا ہے۔

توعقل مند وہ شخص ہے، جس نے زندگی اور موت دونوں سے نصیحت حاصل کی، اپنی زندگی ہی میں مرنے کے بعد والی زندگی کا توشہ تیار کرلیا، جہنم سے بچ کر جنت میں داخل ہوا اور آخرت کی کام یابی حاصل کرلی۔

مولانا اِن اشعار کو بھی بہت پڑھا کرتے تھے:

یہ بلڈنگ جو تم کو نظر آ رہی ہے　　تکبُّر سے اپنے جو اِترا رہی ہے
ذرا اِن کے گملے کے پھولوں کو سونگھو　　تو خونِ غریباں کی بو آ رہی ہے

مولانا اِن اشعار کو اپنے مؤثر انداز اور درد بھرے لہجے میں پڑھتے، تو ایک سماں بندھ جاتا، لوگوں پر اِن اشعار کا غیر معمولی اثر ہوتا، بہت سے لوگ اُسی وقت گناہوں سے تائب ہو جاتے اور آیندہ زندگی کو، اللہ و رسول کی مرضیات کے مطابق ڈھال لینے کا عزم کر لیتے تھے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ مال دار و اہلِ ثروت کی یہ مال داری اور غرور کی مظہر بلڈنگ، جو تم کو اچھی لگ رہی ہے اور تم کو رَشک میں مبتلا کیے دے رہی ہے اور تم زبانِ حال سے گویا کہہ رہے ہو "اے کاش! مجھے بھی فلاں کی طرح ثروت و مال ملا ہوتا، وہ تو بہت خوش نصیب آدمی ہے"۔ جب تم اِس کے قریب جاؤ گے اور اُس طریقے کو جان لوگے، جس پر عمل پیرا ہو کر یہ مستحقِ ملامت مال داری حاصل ہوئی ہے اور جس کے نتیجے میں یہ پرشوکت، خوب صورت، جاذبِ نظر بلڈنگ تعمیر ہوئی ہے، تو تمھارے علم میں یہ بات بھی آجائے گی کہ درحقیقت یہ دولت اُن فقیروں اور محتاجوں کی بیگاری کا نتیجہ ہے، جنھوں نے حقیر سی ملنے والی اُجرت کے عوض اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ کتنے ہی ایسے غریب ہیں، جن کے حقوق کو پامال کیا گیا، اُن سے اُن کا حصہ چھین لیا گیا؛ (بل کہ حقیقت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مال داری کے پیچھے غریبوں کے حقوق کی ناقدری، محنت کشوں پر ظلم و زیادتی، مزدوروں اور محنت کشوں کی زبوں حالی، اور کم زوروں و بے بسوں کی حرماں نصیبی ہی ہوتی ہے) لہٰذا کسی پُر شوکت محل، یا کسی فلک بوس عمارت پر رشک نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی رال ٹپکانے اور منھ میں پانی لانے والی کسی آسودہ زندگی کی چمک دمک پر لٹو ہونا چاہیے۔ اللہ کی رحمت ہو حضرت مولانا محمد تسلیم صاحب پر، اللہ اُنھیں صدّیقین اور شُہدا کے قریب جگہ دے اور اُن کے رشتہ داروں، گھر والوں، ملنے جلنے والوں کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مدرسہ اِمدادیہ کے تعلق سے مولاناؒ کی مجاہدانہ و بے لوث قربانیاں

ہم جن دنوں کا تذکرہ کررہے ہیں، یہ بڑے سخت دن تھے، مدرسہ امدادیہ کی مالی حالت اُن دِنوں دیگر مدارسِ بہار کی طرح بہت خراب تھی، اِس مدرسے کے عالی حوصلہ ناظم مولانا محمد تسلیم صاحبؒ، اِس قدیم مدرسے کو چلانے کے لیے (جو کہ اس ملک کے مشرقی حصے میں دارالعلوم دیوبند سمجھا جاتا تھا اور جس کے بانی الحاج مُنوَّر علی صاحب متوفی ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہی کے خلیفہ تھے جنھوں نے ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء میں یہ مدرسہ قائم کیا) عوامی امداد حاصل کرنے کے لیے، محنت شاقہ برداشت کرتے تھے، وہ اِس کے لیے راتوں کو جاگتے، دن میں دوڑ دھوپ کرتے، دیہاتوں کا دورہ کرتے، اپنے کو اِس کے پیچھے نڈھال کرلیتے تھے، متموِّل اور مال دار لوگوں سے اپنے تعلقات واثر رسوخ اور اپنی عقل وفہم کو کام میں لاتے۔ بسا اوقات یہ تمام الجھنیں اُن کے چہرے سے رونما ہوتیں تھیں اور اُن کے چہرے پر انھیں صاف طور پڑھا جاسکتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مولاناؒ مدرسے کے زیرِ کفالت پڑھنے والے طلبہ کی رہائش پر آنے والے خرچ کے بوجھ سے بچنے کے لیے، مدرسے میں تعطیل کا اعلان کردیتے، خاص طور پر جولائی واگست کے مہینوں میں؛ کیوں کہ اِن دونوں مہینوں میں بارشِ اور سیلاب کا زور بہت ہوتا تھا، اِن دنوں بہ طورِ خاص آمدنیوں میں بہت تخفیف ہوجاتی تھی؛ کیوں کہ اِن مہینوں میں عوام خود اقتصادی پریشانیوں کا شکار ہوتے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ برِّصغیر میں اسلامی مدارس اُن دنوں اپنی مالی اِمداد کے حوالے سے اندرونِ ملک عوام کے چندوں پر ہی بھروسہ کرتے تھے، بیرونی امداد کے حصول کے بارے میں کوئی سوچتا نہ تھا۔ جب کہ آج کل بہت سے مدارس بیرونی امداد کا ہی سہارا لے رہے ہیں اور کچھ مدارس تو صرف بیرونی امداد ہی سے چل رہے ہیں، خاص طور سے ’’اہلِ حدیث‘‘ اور دوسری جماعتوں کے قائم کردہ مدارس۔

مولانا محمد تسلیمؒ اور اُن جیسے دین کے مخلص و غیّور علما و صلحا کی کوششوں کی بنا پر، اِسلام کا شجرۂ طوبیٰ اِس ملک میں سرسبز و شاداب ہے اور اسلامی تعلیم و دعوت پھل پھول رہی ہے اور اسلام اپنی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیے جانے کے باوجود لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرتا جا رہا ہے۔ مدرسہ اِمدادیہ میں اپنی طالبِ علمی کے اِس دور کے بعد مولاناؒ سے پھر کبھی ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی؛ لیکن اُن کی شخصیت کا نقشِ جمیل ہمیشہ میرے خانۂ تصور میں زندہ، متحرک اور گردش کرتا رہا اور خدا جانتا ہے کہ وہ کبھی میرے حافظے کے اسکرین پر دھندلا نہ ہوا اور تا حیات کبھی بھی مدھم نہ ہوگا، اِن شاء اللہ۔

سوانحی نقوش

- نام: (مولانا) محمد تسلیم بن محمد منیف بن شیخ نوبت علی
- وطن و جاے پیدائش: موضع ''سِدھولی'' Sidhauli، ضلع دربھنگہ Darbhanga، صوبہ ''بہار''
- تاریخ پیدائش: ۱۹۳۰ء (۱۳۴۸ھ)
- ابتدائی تعلیم: قاعدۂ بغدادی، قرآن پاک ناظرہ، اردو پڑھنا لکھنا اور فارسی زبان ''گلستاں'' و ''بوستاں'' تک اپنے وطن ''سدھولی'' میں مولانا مقبول احمد صاحبؒ سے پڑھی جو بہ وقتِ تیاری ایں کتاب براے طباعت ماہ صفر ۱۴۳۱ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۹ء و جنوری ۲۰۱۰ء لہریا سراے (دربھنگہ) کی جامع مسجد کے امام و خطیب مولانا قاری ابرار احمد قاسمی سِدھولوی دربھنگوی کے والد بزرگوار تھے۔
- متوسط تعلیم: عربی اول سے عربی چہارم تک مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں تعلیم حاصل کی۔
- ثانوی تعلیم: عربی پنجم و عربی ششم درجات کی تعلیم جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں حاصل کی۔ وہیں تقریر کی طرف راغب ہوے اور اُس کی مشق ذاتی شوق سے جی جان سے کی۔ وہ فرماتے تھے کہ مدرسہ شاہی کی طالبِ علمی کے زمانے میں، میں کمرہ بند کر کے تقریر کی مشق کرتا تھا۔
- اعلیٰ تعلیم: موقوف علیہ اور دورۂ حدیث شریف دار العلوم دیوبند میں کیا اور ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء میں وہاں سے فارغ ہوے۔

❁ **تدریسی خدمات:** تعلیم کے بعد آپ نے تدریس کا آغاز ضلع ''پورنیہ'' صوبہ ''بہار'' کے ایک مدرسے کیا جہاں چند ماہ آپ نے تدریسی خدمت انجام دی، اُس کے بعد مدرسہ ''فلاح المسلمین'' ''راگھوپور''، ضلع ''مدھوبنی'' میں درس وتدریس کی ذمے داری بہ حسن وخوبی انجام دی۔

❁ **نظامت مدرسہ اِمدادیہ دربھنگہ:** ۱۹۶۰ء میں مدرسہ امدادیہ کے عظیم دیرینہ خادِم اور اُس کے ناظم حضرت مولانا عبدالرحیم دربھنگوی (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۸ء-۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء) کی ۶/صفر ۱۳۸۰ھ مطابق ۳/جولائی ۱۹۶۰ء کو وفات کے بعد، اُن کی وصیت کے مطابق ۱۳۸۰ھ ۱۹۶۰ء میں مولانا محمد تسلیم صاحبؒ کو مدرسہ اِمدادیہ کا نائب ناظم منتخب کیا گیا، پھر چھ ماہ بعد ناظمِ اَعلیٰ چُنا گیا، اُس وقت سے ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) تک وہ بڑی شان وشوکت اور تندہی سے اِس فریضے کو انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) سے ۴/سال تک اپنے وطن ''سدھولی'' میں مختلف اجتماعی ومِلی ودعوتی اُمور انجام دیتے رہے۔

❁ **نظامت خانقاہ رحمانی مونگیر:** ۱۹۷۶ء (۱۳۹۶ھ) میں حضرت امیرِ شریعت مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء) نے اُنھیں اپنے فیضان بخش مدرسے جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کے نائب ناظم کے عہدے پر سرفراز فرمایا، جس پر وہ تاحیات فائز رہے۔

❁ **وفات:** مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۴/ماہ کینسر کے جان لیوا مرض میں مبتلا رہ کر بالآخر بہ روزِ اتوار ۴/بجے شام ۲۶/محرم ۱۴۲۴ھ مطابق ۳/مارچ ۲۰۰۳ء کو اپنے وطن ''سدھولی'' میں اللہ کو پیارے ہوگئے، تدفین ''سدھولی'' ہی میں اپنی تعمیر کردہ مسجد کے بغل میں ذاتی قبرستان میں عمل میں آئی۔ (۱)(*)

(۱) سوانحی نقوش کے سلسلے میں بڑی حد تک مولانا مرحوم کی ہمشیرہ کے داماد مولانا قاری ابرار احمد سدھولوی دربھنگوی امام وخطیب جامع مسجد لہریا سرائے دربھنگہ کی فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۴، جلد ۲۷، ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ = جون ۲۰۰۳ء۔

منفرد ادیب وخطیب

مولانا محمد رضوان القاسمی

۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء — ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء

یہ آدمیوں کی بھیڑ اور ایسا سناٹا
کہ دور دور کوئی آدمی نہیں پیارے!

تقریباً ایک ماہ تک موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا رہ کر، بالآخر برادرِ محترم مولانا محمد رضوان القاسمیؒ دوشنبہ ۲۵؍شعبان ۱۴۲۵ھ مطابق ۱۱؍اکتوبر ۲۰۰۴ء کو سہ پہر تقریباً ڈھائی بجے، اِس دارِ فانی سے دارِ بقا کو کوچ کر گئے۔ تقریباً ایک ماہ قبل اُنھیں برین ہمبرج ہوگیا تھا، جس کے بعد شہر حیدرآباد کے بہت اچھے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ہر طرح کی تدبیر وچارہ سازی اور فکرمندی سے کام لیا گیا؛ لیکن وقتِ موعود آ گیا تھا؛ اِس لیے علاج معالجے کی سعیِ بے پناہ کے باوجود، وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ اُن پر اِس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ ہارٹ اٹیک کا حملہ ہوا تھا؛ لیکن اب کی بار وہ شروع سے ہی ایسے بے ہوش رہے کہ سارے اہلِ تعلّق کو اُن کی دوبارہ صحت یابی کے حوالے سے، شک وشبہہ پیدا ہو گیا تھا اور اُن کی وفات کی خبر سننے کے لیے، وہ بادلِ ناخواستہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر چکے تھے، وہ شکر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور اُس کے بڑھتے ہوئے عوارض کا شکار ہو گئے تھے؛ لیکن طالبِ علمانہ زندگی سے اُنھیں علمی، دعوتی اور تعلیمی وملی کاموں کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ صحت، وقت اور ملت کے حوالے سے اپنی زندگی کے گراں مایہ ہونے کے اِحساس کے ہر دباؤ سے وہ لاپروا ہو کر، آخر تک سرگرمِ

سفر ہے۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جو محوِ عمل رہنے کو ہی، ہر بیماری کا علاج اور صحت کے حوالے سے، ہر خطرے کی تدبیر سمجھا کرتے ہیں۔

خلقِ خدا کے لیے افادیت کے بہ قدر ہی لوگ جانے والوں کو رویا کرتے ہیں

دنیا میں ہر ایک اِسی لیے آیا ہے کہ اُسے جانا ہے، اُس کا آنا ہی اُس کے جانے کی دلیل ہے، روز ہزاروں آدمی آتے اور ہزاروں آدمی جاتے ہیں۔ آنے جانے کا یہ سلسلہ ایسا معمول سا ہو گیا ہے کہ لوگ اِس پر کچھ زیادہ توجّہ نہیں دیتے؛ اِسی لیے سیّد التابعین حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے: "مَا رَأَيْتُ حَقًّا أَشْبَهَ بِبَاطِلٍ مِنَ الْمَوْتِ" یعنی موت سے زیادہ کسی سچائی کو میں نے جھوٹ سے رلا ملا نہیں پایا۔ واقعی یہ واحد ایسی زبردست حقیقت ہے جس کو لوگ افسانہ سمجھا کرتے ہیں، جب کہ وہ کسی کو بھی کسی بھی وقت، آدبوچتی ہے اور ساری تدبیریں دھری رہ جاتی ہیں۔

لیکن اِس کائنات میں خلقِ خدا کے لیے جو جتنا مفید ہوتا ہے، اِس دنیا سے جاتے وقت لوگ اُس کو اُسی قدر رویا کرتے ہیں۔ مولانا محمد رضوان القاسمیؒ بھی اُنھی خوش نصیب لوگوں میں تھے، جنھوں نے جیتے جی اپنی علمی صلاحیّت، فکری و دعوتی لیاقت، تعلیمی و ملی سوجھ کے ذریعے، اُمّت اور مِلّت کو بھرپور طور پر فائدہ پہنچانے کی کوشش کی اور اُمّت کے اَن گنت عظیم لوگوں کی فہرست میں اپنا نام خوب صورت حروف میں درج کرایا؛ اِسی لیے آج ہم اُن کو رو رہے ہیں اور اُن کے فراق پر ہمارے دل پارہ پارہ ہو رہے ہیں؛ ورنہ باقی تو وہ ہماری ہی طرح کے اِنسان تھے، کھاتے پیتے تھے، سوتے اور جاگتے تھے، حوائجِ بشریہ کو پوری کرنے کے لیے مجبور و مضطر تھے، ہماری ہی طرح خاک کے بنے ہوئے تھے اور ہماری ہی طرح اِسی خاک پر چلتے پھرتے تھے؛ لیکن جو چیز اُنھیں ہم سے ممتاز کرتی تھی وہ اُن کی علمی و فکری لیاقت اور اُن کے دعوتی و ثقافتی اور تربیتی نقوش ہیں، جو اُن کے

بعد بھی اِن شاء اللہ اُجاگر اور شوخ رہیں گے اور ہمیں اُن کے لیے دعا گو رہنے اور اُن کی یاد میں رطب اللسان رہنے پر مجبور کرتے رہیں گے۔

منفرد نیّرِ تاباں

اُن کی عمر تقریباً ۶۰ر سال تھی، یعنی وہ ۱۹۴۴ء میں مولود ہوے تھے؛ اِس لیے وہ مجھ سے تقریباً ۹ر سال بڑے تھے؛ کیوں کہ اِس راقم کا سنہ پیدائش ۱۹۵۲ء ہے۔ اُنھوں نے اِسی کم عمری میں ملّی اور تعلیمی ودعوتی میدانوں میں، اپنی صلاحیّت، ہنر مندی اور خُلقِ حسن کی وجہ سے، اپنی عظمت وانفرادیت کا لوہا منوالیا تھا۔ تقریر، تحریر، انتظام وانصرام اور ملّت کے زخموں کی مرہم سازی ومرہم نہادگی کے جامع ترعمل کا کون سا پہلو ہے، جس میں اُنھوں نے لیاقت کے ساتھ بڑھ چڑھ کے حصہ نہیں لیا؟ ہندوستان کے کئی مُعتَبَر تعلیمی وملّی اِداروں کے بانی یا تاسیسی رکن تھے۔ فقیہِ عصر قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (متوفی ۲۱ر محرم ۱۴۲۳ھ = ۵ر اپریل ۲۰۰۲ء) کی قائم کردہ مِلّی کونسل اور فقہ اکیڈمی تو خصوصی طور پر اُن کے مشورے اور فکری منصوبہ بندی سے معرضِ وجود میں آئی تھی؛ چناں چہ وہ از اوّل تا آخر اُن دونوں میں فعّال کردار ادا کرتے رہے؛ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے منصوبہ ساز اور اُس کی بنیاد گزاری کے اصل مُحرِّک تو امیرِ شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء - ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء) تھے، جو دیگر مُتعَدّد علماے باوقار (بالخصوص مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ) کی طرح اُن کے بھی شروع سے روحانی وعلمی سرپرست اور اُن کی محبت وعقیدت کا اصل سرچشمہ تھے؛ اِس لیے طبعی طور پر وہ شروع سے بورڈ کے اولیں قافلے میں شامل رہے اور ملّت کا مخلص اور فعّال اِدارہ امارتِ شرعیّہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ تو شروع سے ہی اُن کے فکر وعمل کا محور رہا تھا اور دمِ آخر تک اُنھوں نے اُس کے لیے وہ سب کچھ کیا، جو مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور مولانا سیّد نظام الدین مدظلہ کے حقیقی ساختہ

و پرداختہ اور مُحِبّ و مُعتَقِد اور اُن کے خاندانِ علم و فکر کے سچے خادم اور ہنر مند فرد کو کرنا چاہیے؛ اِسی کے ساتھ ملّی خدمات کی ہمہ گیری اور تعلیمی و تربیتی عمل کی جامِعیَّت و توازن کی وجہ سے مرحوم ہندوستان کے تقریباً سبھی قابلِ ذکر و لائقِ ستایش اِسلامی مکاتبِ فکر کی نظروں میں مقبول ہوگئے تھے؛ چناں چہ دارالعلوم دیوبند کے فضلا کی تنظیم ابنائے قدیم نے اُنھیں نائب صدر کا عہدہ سپرد کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے اُنھیں اپنی مجلسِ عاملہ کا رکن نام زد کیا اور حیدر آباد اور آندھرا پردیش کے علمی اُفق پر تو وہ اِس طرح منفرد انداز میں چمکے کہ کہنا چاہیے کہ اُن کے حینِ حیات سارے ملّی اور علمی و دعوتی ستاروں کی روشنی اُن کے منفردنیّرِ تاباں کے سامنے واقعی ماند تھی۔

اپنے مُتَوَازِن مگر جامع فکر اور عصری شعور و آگہی کے بھرپور جذبے کو تسکین دینے اور اپنے اچھوتے اندازِ نظر کے تراشیدہ نقشے میں رنگ بھرنے کے لیے، اُنھوں نے شہرِ حیدر آباد میں ''دارالعلوم سبیل السلام'' کے نام سے ایک ہمہ گیر اِدارے کی بنیاد ڈالی اور اپنی جاں کاہی، بے لوث محنت اور اِنتظام و اِنصرام کی خداداد اعلیٰ قابلیّت اور سب سے بڑھ کر اپنے یقینِ محکم، عملِ پیہم اور فاتحِ عالم محبت کی وجہ سے چند سالوں میں، اُس کو ملک کی بہت سی دیرینہ اسلامی درس گاہوں کے لیے قابلِ رشک اور لائقِ تقلید بنا دیا۔ یہاں اُنھوں نے نہ صرف دینی مدرسوں میں مُرَوَّج نصابِ تعلیم میں عصری حسن کی قلم لگانے کے ساتھ ساتھ، سارے علوم و فنون کی تدریس کا انتظام کیا؛ بل کہ سیرتِ نبوی پر تحقیق و جستجو کے لیے ایسا نظام برپا کیا، جس کی نظیر ملک کے کسی مدرسے میں نہیں پائی جاتی۔ اِسی کے ساتھ اُنھوں نے مُتَعَدِّد اسلامی موضوعات پر اختصاص کا شعبہ بھی قائم کیا، نیز اُنھوں نے قدیم و جدید موضوعات پر، بیرونِ ملک و اندرونِ ملک چھپی ہوئی اچھی سے اچھی کتابوں پر مشتمل کامل و کارآمد کتب خانے کی تعمیر کی، جس کے لیے اپنے شوق اور مزاج و مذاق کی مدد سے مطالعہ و تحقیق کا جو نظام کار وضع کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ دراصل کتاب کے عاشق تھے اور کتب خانے سے اُن کا اُنس طبعی تھا، ہر انسان کی ''ممتاز خواہش'' ہوتی ہے، غالباً مولانا

محمد رضوان القاسمیؒ کی ممتاز خواہش، کتاب کی چاہت تھی۔ کتاب کے حسنِ ظاہر و باطن پر، وہ پڑھنے کے زمانے میں بھی ریجھ جایا کرتے تھے۔

نسبتاً کم عمری ہی میں عزّت وشہرت سے بہرہ وری

مولانا مرحوم نے نسبتاً کم عمری ہی میں جو علمی مقام اور دعوتی وفکری میدان میں عزّت وشہرت حاصل کرلی، وہ دنیا میں اُنھی کی طرح کے گِنے چُنے خوش نصیبوں ہی کے حصّے میں آیا کرتی ہے، جو علم وفضل کے ساتھ نرم خوئی، شرافت ومروّت، ملّی اور اجتماعی کاموں کے رسیا اور اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے ہمہ وقت اور ہمہ حال اُسی طرح دل چسپی لیتے ہیں، جس طرح اُنھوں نے لی کہ حقیقت پسندانہ اِسلامی شعور، کھلے ہوے قلب وذہن، عصری تقاضے سے آگہی اور حالاتِ حاضرہ کی بصیرت اور اِسلام کو درپیش چیلنجوں کے اِدراک اور سب سے بڑھ کر اِسلام کی صحیح سمجھ سے اللہ نے اُنھیں بھرپور طور پر نوازا تھا۔ اُنھوں نے دنیا کے اکثر ملکوں کو دیکھا تھا، عالمِ عربی وعالمِ اسلامی کے اکثر ملکوں کا بار بار سفر کیا تھا، مسلمانوں کے مسائل کو، اُن کا عملی حل ڈھونڈنے کے ذریعے، صحیح دائرے میں سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اِسلام اور مسلمانوں کے مسائل اور پریشانیوں سے نمٹنے کی بات، وہ صرف شکوہ سنجی کے لیے نہیں کرتے تھے، جیسا عام طور پر علما ودانش ور اور مسلم اہلِ قلم کیا کرتے ہیں؛ اِسی لیے اُنھوں نے اِس حوالے سے کام کی نئی نئی کارآمد اور ٹھوس جہتیں تلاش کرلیں، جن کے ذریعے، اُنھوں نے وہ کچھ کیا، جو دیگر معاصرین نہیں کرسکے۔ ملّی ودینی اُمور کو بہ روئے کار لانے کے لیے، اندرونِ ملک بھی اَطراف واَکناف کا وہ پیہم سفر کرتے رہتے تھے، بہار، یوپی، دہلی اور حیدرآباد، تو گویا اُن کے لیے گھر آنگن بن گئے تھے۔ وہ دینی کاموں میں نہ صرف شرکت کرتے؛ بل کہ اُن میں اِنتظامی اور اَخلاقی طور پر دخیل وشریک رہتے، جلسوں اور سیمیناروں میں تقریریں کرتے اور اُن کی شرکت سے اُن میں نئی جان پڑتی، اسلامی تقریبات کی اَکثر شکلوں کی سج دھج

میں اُن کا حصہ ہوتا، اہم اِسلامی شخصیات سے بار بار ملتے، علم وفکر اور دعوت وتبلیغ کے میدان کے شہ سواروں سے بار بار مشورہ کرتے، اس سلسلے میں نہ وہ مرض کی پرواہ کرتے، نہ شخصی اُلجھنوں کو خاطر میں لاتے؛ بل کہ اُن کے پیشِ نظر، اوّل وآخر صرف اِسلام ومسلمان اور اُن کے مسائل ومشکلات ہوتے اور بس۔

سلیس، بلیغ اور خوب صورت قلم کے دھنی

وہ اردو میں انتہائی سلیس، بلیغ اور خوب صورت قلم کے مالک تھے، عام اِسلامی موضوعات پر عموماً اور گرم مسائل پر خصوصاً، اُن کا قلم ہمیشہ گہر بار رہتا۔ اُن کے قارئین اُن کی تحریروں کے حوالے سے سراپا اِنتظار رہتے۔ حیدرآباد کے اَخبارات ورسائل اُن کی نگارشات سے تو مُزَیَّن ہوتے ہی، ملک کے دیگر علاقوں کے اِسلامی رسائل بھی، اَہمیّت کے ساتھ اُن کی تحریریں چھاپتے، اُن کی ہر تحریر شرینی، اَعلیٰ ادبی مذاق، لسانی صنعت، طبعی ظرافت، زبان کی پختگی، مطالعے کی وُسعت، تاریخِ عروج وزوالِ اُمم و مِلَل کی نتیجہ خیز معرفت، زندگی کے گوناگوں تجربات، کتاب وسنّت کے نصوص کی فراست پر مبنی سمجھ اور اِسلام کے مختلف اَدوار میں اِسلامی موضوعات پر تالیف کردہ علماے کبار وحکماے اِسلام کی گراں بہا کتابوں کی بصیرت مندانہ ورق گردانی؛ پر مبنی ہوتی تھی۔ اُن کی بہت سی تحریریں خوب صورت، جاذبِ نظر اور دل رُبا کتابوں کی شکل میں بازار میں آچکی ہیں اور اہلِ نظر اور صاحبِ ذوق قارئین سے ظاہر وباطن کی خوبیوں میں اِمتیاز کے حوالے سے، خوب خوب دادِ تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر باقاعدہ کتابیں بھی لکھیں جن کی وجہ سے علم واَدب دونوں کے جوہریوں سے اُنھوں نے دعا وآفریں کی سوغات پائی۔ بعض دفعہ آدمی قلم وزبان کا تو اچھا ہوتا ہے؛ لیکن طباعت کے جمال، کتاب کی ظاہری نزاکت اور اِشاعتی عمل کی حسن کاری کے حوالے سے کوئی مذاق نہیں رکھتا۔ مولانا محمد رضوان القاسمی اپنی نستعلیق شخصیت، مُتَبَسِّم سراپا، حسنِ

اَخلاق میں ڈھلی ہوئی سیرت کی طرح کتابوں کے ظاہر و باطن کے حوالے سے بھی اَعلیٰ پایے کے جمال پسند واقع ہوئے تھے۔ اُنھوں نے اپنے ہاں سے شائع کردہ، جتنی کتابیں میرے پاس بھجوائیں، میں اُن کے باطن میں صرف اِسی لیے نہیں جھانک سکا کہ اُن کے ظاہر کی غیر معمولی جاذبیّت نے مجھے محوِ حیرت رکھا۔

ممتاز فاضلِ دار العلوم

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ برِ صغیر کے اُمُّ المدارس: دار العلوم دیوبند کے اِس وقت کے چند ممتاز فضلا میں تھے۔ وہ زمانۂ طالبِ علمی سے ہی تحریر و تقریر میں بال و پر نکالنے لگے تھے۔ اپنی محنت، پڑھائی لکھائی میں ہمہ تن مصروفیّت، لایعنی باتوں سے بالکلّیہ احتراز، سنجیدگی و متانت اور اچھے طالبِ علم کے واقعی اَوصاف کا حامل ہونے کی وجہ سے، ایک مثالی طالبِ علم تھے۔ مجھے یاد ہے طلبہ، جن چند طلبہ کو پورے دار العلوم میں اہمیّت دیتے تھے، اُن میں سے ایک مولانا محمد رضوان القاسمی بھی تھے، چھریرے بدن، لمبے قد، کشادہ پیشانی، کشادگی مائل آنکھیں، تبسّم ریز چہرہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، لفظی صنعت کی مہارت، بات میں بات پیدا کرنے میں اِمتیاز، اَلفاظ کی خوبیوں کا پرکھ رکھنے میں یکتائی، حسنِ تحریر اور حسنِ خط کی جامعیّت، دل کی گدازی، آنکھ کی حیا، مروت کی فراوانی اور اُنسیّت و محبت سے بنی ہوئی شخصیّت کے حامل ایک طالبِ علم کو، میں دار العلوم میں معراج گیٹ سے آتے اور دار العلوم سے معراج گیٹ سے جاتے اور دارِ جدید کے فوقانی دو کمروں ۳۰/۳ اور ۲۷/۳ کا طواف کرتے ہوئے ہر روز دیکھتا تھا۔ اوّل الذکر میں راقم الحروف نور عالم اور اُس کے ہم قریہ و ہم ضلع و ہم صوبہ کئی طلبہ رہتے تھے اور ثانی الذکر، قاری شبیر احمد دربھنگوی، دستگیر احمد دربھنگوی، مولوی بلال دربھنگوی اور مولوی بدر الحسن دربھنگوی کا مسکن تھا۔ آہ! وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ نوجوان ہماری آنکھوں کے سامنے دار العلوم کی اِن گزرگاہوں، اِن گیلریوں اور اِن

برآمدوں میں آتا جاتا نظر آتا تھا، آج ۶۰ سال کا اُدھیڑ عمر ہو کر اپنے رب سے بھی جاملا۔ رہے نام اللہ کا۔ یہ طالبِ علم دارالعلوم میں طلبہ کی نگاہوں میں تو محبوب تھا ہی، جب دارالعلوم سے نکلا تو حیدرآباد کے عابڈ روڈ کی مسجدِ عامرہ کے اِمام وخطیب کی حیثیت سے اِس شہر میں وارد ہوا، جہاں وہ نمازِ جمعہ سے قبل اردو میں ڈیوٹی ادا کرنے کے لیے ہر جمعہ کو تقریر کا پابند تھا۔ اپنی ڈھلی ہوئی زبان، حسنِ اَخلاق کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شخصیّت، اپنی وضع داری، شرافت، ظرافت، مروّت، انوکھی نکتہ سنجی، حالات وواقعات سے نتائج اَخذ کرنے کی صلاحیّت، لفظ ومعنی کی عجیب سی ہم آہنگی ورعایت اور اپنی تقریر کے از دل ریزد، بردل خیزد ہونے کی وجہ سے، دیکھتے دیکھتے اِسلامی تہذیب وثقافت کے اُس دیرینہ ومنفرد پایۂ تخت کا فاتح بن گیا؛ کیوں کہ اُس کی شہرت عابدروڈ کے علاقے سے تجاوز کرکے، سارے شہر میں پہنچ کر دلوں میں اُس کے لیے گھر بنا چکی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ عالموں سے بھرے پُرے خطۂ آندھراپردیش کے دو تین ممتاز عالموں میں سے ایک بن گیا، اُس کے دوستوں، بہی خواہوں اور اُس پر جان ودل نثار کرنے والوں کا حلقہ، بڑا اور اِنتہائی کارآمد بن گیا۔ اِسی کے ساتھ اُس نے تحریر کا جادو جگایا، تو نہ صرف وہاں کے علما کی صف میں؛ بل کہ ملک کے سارے علما کے درمیان ''ممتاز اِسلامی اہلِ قلم'' کا بہ جا طور پر لقب پانے کا ہر طرح مستحق بن گیا۔ اور اب وہ بہ حیثیت مجموعی ایسا بن گیا کہ حیدرآباد کی خصوصاً اور ملک کی عموماً کوئی ثقافتی مجلس، اِسلامی ادارہ، دینی تقریب، دعوتی جلسہ، اُس سے بالکلیہ صرفِ نظر کرکے اپنی نامُعتبَریّت پُر مہر لگوانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ حال آں کہ وہ حیدرآباد میں اَجنبی اور نو وارد بن کر آیا تھا۔ وہ بہار کے غیر منقسم دربھنگہ سے تعلق رکھتا تھا؛ لیکن فضل وکمال کسی ایک خطے یا ملک کے لوگوں کی جاگیر نہیں ہوتی، علم وہنر اور شرافت ولیاقت کے موتیوں کو جو بھی سلیقے سے رولنا جانتا ہو، لوگ اُس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ میں نے برِّصغیر کے دورِ آخر کے خاتم الخطبا والواعظین حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء-۱۴۰۳/۱۹۸۳ء) سے اُن کی نکتہ

ریز تقریروں میں ایک سے زائد بار سنا کہ جمال، کمال اور مال والا آدمی کبھی بھی "یوسفِ بے کارواں" نہیں رہتا۔ اُن میں سے کسی کا حامل اِنسان، جہاں جاتا ہے مقبول ومحبوب رہتا ہے، کسی جگہ وہ اَجنبیت اور ناقدری کا شکار نہیں ہوتا، اُس کے لیے ہر فصل، فصلِ گل اور ہر زمین، زرخیز اور ہر خطّے کا اِنسان، جودوسخا کا نمونہ بن جاتا ہے۔

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ، اپنے سارے ملنے جلنے والوں میں محبوب تھے، اُن کے کسی ہم نشیں کو، کبھی بھی اُن کے بے مزہ ہونے کا شکوہ نہیں کرنا پڑا، چہ جائے کہ "بے فائدہ" ہونے کا؛ کیوں کہ وہ صرف دینی، علمی، ادبی اور فکری شخصیّت کے ہی حامل نہ تھے؛ بل کہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہونے کے ساتھ ساتھ، انتہائی سادہ، ظاہر وباطن میں یکسانیت کے حامل اور خود پسندی وغرورِ نفس سے بالکل مُبرَّا تھے، حال آں کہ خود پسندی وغرورِ نفس، وہ بیماری ہے، جس سے آج کل کے علما کا مُبرَّا ہونا خارج از اِمکان سمجھا جاتا ہے۔ یہ اُن کی ممتاز صفت تھی کہ اُن کی عزّت وشہرت میں جس درجہ اِضافہ ہوتا گیا، اُن کی کسرِ نفسی، سادگی اور متنوّع اِسلامی عمل میں اُن کی شراکت بڑھتی گئی۔ مسکراہٹ، بذلہ سنجی، لفظی صنعت اور ضلع جگت میں مہارت کے ساتھ، روح کی پاکیزگی، قلب کی شفافیت، نفس کی عِفّت اور اپنے سارے مُتعَارِفین کے لیے مخلصانہ محبت، اُن کی شخصیّت کے لیے شانِ امتیاز تھی۔

میرا اُن کا دیرینہ تعلق

میں اُنھیں، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہاں درجہ ششم اردو میں، یہ راقم گلستاں، بوستاں وغیرہ کے درجے میں داخل ہوا، تو مولانا محمد رضوان القاسمیؒ وہاں مُتوسّطات کے طالبِ علم تھے۔ مدرسے کے مُعتَبَر استاذ برادرِ معظم مولانا محمد اُویس القاسمیؒ (متوفی جمعہ ۳/ جمادی الثانی ۱۴۱۹ھ مطابق ۲۵/ ستمبر ۱۹۹۸ء) بن شیخ محمد حبیب رائے پوری (ضلع سیتامڑھی، سابق مظفر پور) سے اُن کا چوں کہ فردِ خاندان جیسا تعلق

تھا؛ اِس لیے اُسی زمانے میں، ہم لوگوں سے بھی اُسی طرح کا تعلق قائم ہوگیا تھا۔ پھر میں اور میرے چند ساتھی مئوناتھ بھنجن کے بابرکت مدرسے دارالعلوم مئو میں کئی سال زیرِ تعلیم رہ کر، جب ۱۹۶۷ء (۱۳۸۶ھ) میں دارالعلوم دیوبند آئے، تو مولانا محمد رضوان، دارالعلوم سے فارغ ہوکر، اُسی کے ایک شعبے "مطالعۂ قرآنیہ" میں (سال ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء) داخل تھے۔ یہ شعبہ ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۹۶۴ء میں قائم ہوا تھا اور حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ العالی، اُس کے نگراں وسرپرست تھے، مولاناؒ نے اُس شعبے کے نصاب کے مطابق، مفتی صاحب مدظلہ کی نگرانی میں کماحقُّہ محنت کی اور قرآنی علوم کے اہم موضوع "قرآن کا عطا کردہ نظامِ حیات" پر، اُنھوں نے ایک ضخیم رسالہ تیار کیا۔ مجھے اکثر وہ اپنے ہاتھ یا بغل میں معتد بہ مقدار میں لائقِ تحریر وتسوید سفید عمدہ کاغذ سے بھرا خوب صورت فائل لیے ہوے، کبھی کتب خانۂ دارالعلوم میں، کبھی مفتی صاحب کے کمرے پر اور کبھی ہم لوگوں کے کمروں کے پاس سے گزرتے ہوے، یا ہم لوگوں سے مل کر اپنی مسجد کی اُور جاتے ہوے، یا وہاں سے آتے ہوے نظر آتے۔ اِس راقم کا اُس وقت خط، الحمدللہ بہت پاکیزہ تھا اب تو زودنویسی اور کثرت سے لکھنے کی وجہ سے، نیز شکر کی بیماری کے عوارض سے انگلیوں کے مُتأثّر ہوجانے کے سبب، وہ بات باقی نہیں رہی۔ مولانا محمد رضوانؒ نے دارالعلوم دیوبند میں، اُس موقع سے، میرے داخل ہوجانے کو غنیمت جانا؛ کیوں کہ اُس وقت نہ تو ٹائپ رائٹر کی فراوانی تھی اور نہ کمپیوٹر کا چلن تھا۔ اُنھوں نے مجھ سے اپنی سابقہ معرفت اور تعلّق کی وجہ سے مجھ سے فائدہ اٹھانے کی سوچی۔ وہ اکثر میرے کمرے، میری درس گاہ، یا دارالعلوم میں میرے موجود رہنے کی جگہوں کا چکّر لگاتے اور چھوٹے بھائی پر شفقت آمیز دباؤ اور ترغیب کے ذریعے، اپنے مُسوّدے کی تبییض کے لیے آ پکڑتے۔ وہ مجھے اکثر بھائلہ روڈ پر واقع مسجد میں (جس میں وہ امامت کرتے تھے) ساتھ لے جاتے یا فرصت کے اوقات میں آجانے کی، تاکیدی دعوت دے کے چلے جاتے۔ میں نے اَن گنت راتیں اور دن کے فرصت کے

اَوقات اُن کے ساتھ، اُن کی مسجد میں گزارے، وہ راتوں کو میرے ساتھ جاگتے، چائے تیار کر کے لاتے اور مُسوَّدے کی چستی سے تبییض کے لیے، میرے ذہن اور ہاتھ کو تیار کرتے۔ وہ حیدرآباد سے درآمد کردہ "لمسا" چائے بھی بہت پلاتے، گو مجھے اُس سے دلچسپی نہیں ہو پائی؛ کیوں کہ میں ہمیشہ دارجلنگ کی لپٹن گرین لیبل چائے کا عاشق رہا۔ اُس وقت مولانا محمد رضوان، حیدرآبادی "لمسا" چائے، بہت شوق سے استعمال کرتے تھے۔ غالباً قدرت کی طرف سے یہ اشارہ تھا کہ ایک دن، اُنھیں حیدرآبادی ہی ہو جانا اور اُسی کی خاک کا ہمیشہ کے لیے پیوند بن جانا ہے۔

مولانا رضوانؒ سے، مدرسہ اِمدادیہ کے زمانے کا جو تعلّق تھا، وہ اب زیادہ گہرا، پایدار اور اَن مِٹ ہو گیا، اب ہم دونوں نے اِس تقریب سے ایک دوسرے کو زیادہ قریب سے دیکھا، سمجھا، برتا اور ایک دوسرے کے دل میں آہستہ آہستہ، اس طرح پیوست ہو گئے کہ دونوں کو قلبی طور پر ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں رہا۔ یاد پڑتا ہے کہ بعض دفعہ میں اُن کے علمی کام میں، اُن کا تعاون کرنے سے اُسی طرح دریغ کرتا، جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے کاموں سے بعض دفعہ ناز اور اعتماد کی وجہ سے کرتا ہے، تو وہ طرح طرح سے مناتے اور میری "سرتابی" و "سرکشی" پر قابو پانے کی کوشش کرتے۔ اُن کی مذکورہ مسجد کے کمرے میں، راقم نے اَن گنت مرتبہ عمدہ، لذیذ اور محبّت کی گھنیری چھاؤں میں ناشتہ کیا، جس کی لذّت اب تک یاد ہے۔ اُس کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں اچھے اچھے کھانے کھائے، بڑی بڑی شاہی، امیری اور کانفرنسوں کے ذیل میں کی جانے والی دعوتوں میں شرکت کی، سیکڑوں اَقسام کے ایسے ایسے کھانے دیکھے اور چکھے، جن کی یقیناً میرے پُرکھوں کو بھی ہوا نہ لگی ہوگی؛ لیکن مولانا رضوانؒ کے اپنے ہاتھ سے تیار کردہ ناشتہ کی بے مثال لذّت، اب تک یاد ہے، اُس کی مثال کہیں نہ مل سکی۔ اُسی کمرے میں اُنھوں نے کئی مرتبہ ہند کے مایۂ ناز عبقری و جری عالمِ دین، امیرِ شریعت و محرِّک تاسیس و سکریٹری جنرل اوّل آل انڈیا

مسلم پرسنل لا بورڈ: مولانا سید منت اللہ رحمانی (متوفی درمیانی شب ۲-۳ رمضان ۱۴۱۵ھ = ۱۹-۲۰/مارچ ۱۹۹۱ء) اور متعدد ارکانِ شوریٰ دار العلوم کی دعوت کی۔ میں جب تک دیوبند میں رہا، مولانا محمد رضوانؒ بڑے اور شفیق بھائی کی طرح ہم لوگوں کے نہ صرف بھائی اور دوست رہے؛ بل کہ نگراں وسرپرست بھی رہے۔

مہمان نوازی میں طاق

مولانا محمد رضوانؒ بڑے مہمان نواز بھی تھے، ایسا لگتا تھا کہ وہ مہمان نواز ہی پیدا ہوئے تھے، اُنھیں اللہ پاک نے وہ ساری خوبیاں دی تھیں، جن کا حامل آدمی ہی سچا مہمان نواز ہوسکتا ہے۔ یعنی سیر چشمی، کشادہ نفسی، نرم خوئی، نستعلیقیت، سلیقہ مندی، رَواداری، اِیثار، بردباری، نرم روی، ٹھہراؤ، سنجیدگی اور اپنے سے زیادہ دوسروں کو گوارا کرنے کا بے تحاشا جذبہ۔ مذکورہ مسجد کے اُن کے کمرے ہی میں، میں نے پہلی مرتبہ اُن کی نشست گاہ کے سامنے کی بڑی الماری میں مُتنوّع اِسلامی موضوعات پر اردو کی اَعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں دیکھی۔ وہ نئی نئی، عمدہ اور اچھی سے اچھی کتابوں کے حصول کے رسیا تھے۔ اُن کی الماری کی ہر کتاب نہ صرف مفید اور علمی طور پر گراں قدر ہوتی؛ بل کہ ساری کتابیں، حسنِ طباعت، حسنِ تجلید، ٹائٹل کی دیدہ زیبی اور کاغذ کی رعنائی کے لحاظ سے چیدہ ہوتیں اور صاف معلوم ہوتا کہ اِن کتابوں کا حاصل کرنے والا، کتابوں کے حوالے سے ہمہ گیر مذاق کا حامل ہے۔ مولانا رضوانؒ، اپنی معمولی سی یافت میں سے کسی نہ کسی طرح پس انداز کر کے کتابوں کے حصول کے، اپنے ذوق کو ہمیشہ تسکین دیتے رہتے تھے، حال آں کہ وہ ہماری ہی طرح نادار طالبِ علم تھے اور طالبِ علم گھر کا مال دار ہو، تب بھی مدرسے کی زندگی میں مفلوک الحال ہوتا ہے، یہ طالبِ علموں کی فطرت اور اُن کی قسمت ہے۔ اللہ نے ایسا ہی چاہا ہے؛ تاکہ وہ توفیقِ الٰہی کی ہم رکابی کی صورت میں، کچھ تو حاصل کرسکیں، ورنہ ہمارے ایک دوست بہت صحیح کہا کرتے تھے کہ طالبِ

علم کو سہولت مُیَسَّرْ ہو تو اُس کی صلاحیت استوار نہیں ہوتی۔

دار العلوم دیوبند میں ہماری یادگار مجلسیں

دار العلوم میں طالبِ علمی کے زمانے میں، ہم لوگ جمعرات وجمعہ کی درمیانی شب میں اپنے ایک باذوق، نستعلیق ساتھی مولانا قاری اَبرار احمد سدھولوی دربھنگوی (حال اِمام وخطیب جامع مسجد لہریاسرائے، دربھنگہ) کے کمرے ۴۲ باب الظاہر (دارِ جدید) میں اکٹھا ہوتے، اِس مجلس کے میر تو مولانا قاری شبیر احمد دربھنگوی (حال مہتمم وذمے دار مدرسہ اسلامیہ، شکرپور بھروارہ) ہوتے؛ لیکن اِس کے روحِ رواں مولانا رضوانؒ القاسمی ہوا کرتے تھے۔ اُس کے شُرَکا میں اکثر مولانا دستگیر احمد دربھنگوی اور میرے ہم سبق مولانا بدرالحسن قاسمی ہوا کرتے تھے، (جو سرِ دست کویت کی وزارتِ اوقاف واُمور مذہبی میں اہم عہدے پر فائز ہیں) یہ مجلس جو عموماً ضلعی انجمنوں کے ہفتہ واری پروگراموں کے اختتام کے بعد (نصف شب کے بعد) ہوتی تھی، ہم لوگ اِس میں ادبی وثقافتی موضوعات پر آزادانہ تبادلۂ خیال کرتے تھے؛ لیکن جو موضوع بھی چھڑ جاتا، دیر تک مُسَجَّع و مُقَفّٰی عبارت میں اُسی کی پیروی ہوتی۔ مُسَجَّع اور موزوں عبارتوں میں، ہماری طالبِ علمانہ نوآموزی وناتجربہ کاری کی وجہ سے بہت سی دفعہ ''ہمارا قافیہ'' تنگ ہوجایا کرتا تھا؛ بل کہ بعض دفعہ ہم محسوس کرتے تھے کہ ہم ''مسدود راہ'' پر پہنچ گئے ہیں، جس کو کھولنا ہمارے لیے دشوار گزار ہے؛ لیکن خدا بھلا کرے قاری شبیر احمد اور مولانا رضوانؒ کا کہ یہ دونوں حضرات اپنی مہارتِ لسانی، ذہانت، اور طالبِ علمی کے باوجود، نثری قدرت کے ساتھ ساتھ، شعر وسخن کا ماہرانہ مذاق رکھنے کی وجہ سے، جاری موضوع کی رعایت کرتے ہوئے، پہلے سے زیر استعمال ''وزن وقافیہ'' کی بند راہ اِس طرح کھول دیتے کہ ہم لوگ عَش عَش کرنے لگتے، اِس مجلس میں اِیمان لانا پڑا کہ مولانا محمد رضوان اور قاری شبیر کو، اللہ نے لفظی صنعت کے استعمال، دو یا اُس سے زیادہ معنوں

والے اَلفاظ کی رعایت اور محاورہ وروزمرہ میں، اِس نوعمری میں بھی خاص کمال سے نوازا ہے۔ اللہ اپنے فضل سے جس کو چاہتا ہے، کسی بھی غیر معمولی کمال سے نواز دیتا ہے۔ بے شک وہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ دونوں حضرات، عمل اور تجربے والی اپنی بعد کی زندگی میں بھی اپنی اس خوبی اور اِمتیاز کے لیے مشہور رہے۔ مولانا رضوان ؒ کی تقریر کو سننے اور تحریر کو پڑھنے والا ہماری اِس بات کی بہ خوبی تایید کرے گا۔

اِحاطۂ دارالعلوم سے نکلنے کے بعد، میرے اُن کے روابط

دارالعلوم سے نکلنے کے بعد، ہم لوگ زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا شکار رہے، قدرت کے قانون وعمل کے مطابق، تدریسی اور تعلیمی کام میں ہم لوگ مختلف علاقوں میں بٹ گئے، ہم لوگوں میں مکانی مسافت حائل رہی؛ لیکن ہمارا قلبی اور روحانی رشتہ چوں کہ اٹوٹ تھا؛ اِس لیے نہ صرف قائم رہا؛ بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ، مستحکم سے مستحکم ہوتا گیا۔ مراسلات اور آنے جانے والوں کے ذریعے، نیز اِس آخری سالوں میں ٹیلی فون کے نظام کے عام ہوجانے کے بعد، اُس کے ذریعے، ہم لوگ ایک دوسرے سے ہمیشہ جُڑے ہوے رہے اور ایک دوسرے کی علمی ودینی ترقی اور ہم میں سے بعضوں کی مادّی فارغ البالی کی خبروں سے ہمیشہ خوش ہوتے اور مزید ترقّیات کے لیے دعاؤں کے تبادلے کی سعادت حاصل کرتے رہے۔ ایک سچا اور اچھا بھائی دوسرے بھائی کے لیے، ہمیشہ یہی کچھ کرتا ہے اور کرسکتا ہے، سو ہم خدا کی توفیق سے اِس پر کاربند رہے۔ کبھی کبھار ہم ایک دوسرے سے بہ راہِ راست مل کر بے پناہ خوش ہوتے، جیسے چھوٹا بھائی اپنے بے پناہ مخلص اور شفیق بڑے بھائی سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ خدا جو عالم الغیب ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی محبت اور تعلق پر کس قدر اعتماد تھا، اِتنا کہ بعض دفعہ ایک ماں اور ایک باپ کی دو اولادوں کے درمیان بھی نہیں ہوتا۔ عربی میں کتنی سچی بات کہی گئی ہے: رُبَّ أَخٍ لَمْ تَلِدْهُ أُمُّكَ (تمھارے بعض بھائی ایسے

ہوں گے، جسے تیری ماں نے نہیں جنا ہوگا)۔

ایک مرتبہ یک شنبہ: ۱۸؍رجب ۱۳۹۸ھ = ۲۵؍جون ۱۹۷۸ء کو تقریباً دس بجے دن میں، اچانک مولانا محمد رضوانؒ اپنے دیرینہ رفیق اور میرے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے رفیقِ درس مولانا بدرالحسن قاسمی دربھنگوی دارالعلوم ندوۃ العلما میں، میری تدریس کے زمانے میں، مجھ سے ملنے کے لیے اور کچھ اور ضروری کاموں سے اچانک لکھنؤ میرے پاس وارد ہوئے، تو ایسی خوشی ہوئی جیسے لگا کہ مجھے کوئی غیبی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔ تین روزہ قیام میں، مَیں دونوں کے ہر وقت اور ہر جگہ سایے کی طرح ساتھ رہا۔ کئی بار اُن کے ساتھ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء-۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء) کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ سہ شنبہ (منگل) ۲۰؍رجب ۱۳۹۸ھ = ۲۷؍جون ۱۹۷۸ء ۷ بجے صبح کو مولانا بدرالحسن تو دیوبند کے لیے روانہ ہوگئے؛ لیکن مولانا محمد رضوان ۱۰ بجے صبح کو پھلواری شریف، پٹنہ، اِمارتِ شرعیہ، وہاں سے کلکتہ اور کلکتہ سے حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے۔ دونوں حضرات کو اسٹیشن پر چھوڑتے وقت ایسا لگا کہ میں نے کوئی گراں قدر، اَن مول اور نایاب سرمایہ دانستہ گم کر دیا ہے، جس کی کسک کئی روز تک؛ بل کہ لمبے عرصے تک محسوس ہوتی رہی۔

مولانا محمد رضوانؒ جب پھلواری شریف پہنچے، تو وہاں سے یہ محبت بھرا خط لکھا، جس سے اُن کی ظرافت، خوش مزاجی، زندہ دلی، زبان و بیان پر قدرت اور تعبیر وتحریر کی ندرت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے:

۲۴؍رجب ۱۳۹۸ھ، شنبہ

از: پھلواری شریف پٹنہ

اخی الاعز زاداللہ علماً وشرفاً السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوا گیارہ بجے ٹرین لکھنؤ اسٹیشن پر آئی، وہ بھی پلیٹ فارم نمبر سات پر۔ قلی جو مسلمان نام بتانے پر ایک حد تک رفیق تھا، وہ بھی انتظار کی تاب نہ لاکر

چپکے سے کہیں غائب ہوگیا۔اب میں تھا، میرا سامان اور پلیٹ فارم نمبر سات، ویسے تنہا منتقل ہونے اور جگہ کی تلاش میں کوئی دِقّت پیش نہیں آئی — ٹرین پسنجر تھی، اور پسنجر کا حال معلوم ہی ہے، اُس کی پالیسی ''خوش کن'' ہوتی ہے۔ وہ رہ گذر کے کسی اسٹیشن کو ناراض کرنا نہیں چاہتی، خواہ اِس میں طویل مسافت کا مسافر بیٹھا ہوا ''بور'' ہوا کرے، اُسے اِس کی کوئی پروا نہیں۔ وہ لکھنؤ اور پٹنہ کے درمیان ہر اسٹیشن پر رکتی رہی، کچھ کو اُتارتی اور کچھ کو سوار کرتی، پھر کچھ بات چیت کے بعد ''خدا حافظ'' کی سیٹی دیتی ہوئی روانہ ہوتی — اور ہاں طبیعت اُس کی بڑی، مسکین ہوتی ہے، تواضع اور اِنکساری کی صفت تو اُس کے رگ و پے میں سرایت ''بڑوں کا احترام'' بھی خوب جانتی، میل اور اکسپریس ٹرین آجائے تو، اُن کے اِعزاز میں گھنٹوں کھڑا رہنا گوارا، مگر کیا مجال کہ اُس سے آگے بڑھنے کی جرأت یا گستاخی کرے۔ بہ ہر حال اس ''البیلی ٹرین'' کے ذریعے دوسرے روز شام کو ۶ بجے دانا پور پہنچا، پھلواری شریف جانا وہاں سے آسان تھا، میں وہیں اُتر گیا، قُبیلِ مغرب اپنے مقام پر پہنچا، یعنی

ع کتنے اوہام سے گذرے تو یقیں تک پہنچے

ندوہ میں آپ سے مل کر طبیعت بہت مسرور ہوئی، بھولی بسری باتیں یاد آئیں، دعا ہے کہ وہاں آپ ترقی کے زینوں کو طے کرتے رہیں، اور شہرت و رفعت کے بامِ عروج تک پہنچیں۔

اسٹیشن تک آپ ''الوداع'' کہنے آئے، پھر ''تنہا'' مجھے چھوڑ کر واپس جانا آپ کو گوارا نہیں تھا، آپ تو میرے اِصرار پر گئے، وہ بھی عالمِ بے تابی میں۔ دلِ محسوس نے اِسے خوب محسوس کیا، اِس اخلاص اور کرم کا خدا بدلہ دے — مولانا رابع صاحب، مولانا محمد میاں صاحب، مولانا شمس الحق صاحب، مولوی انس صاحب اور مولانا اِقبال صاحب سے بشرطِ یا دو ملاقات سلام فرما دیجیے، اِن

حضرات کی عنایتوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں — ہفتہ عشرہ میں حیدر آباد پہنچوں گا، اِن شاء اللہ۔

مولانا محمد رابع صاحب مدظلہ کے نام بھی ایک خط شکریے کا لکھ رہا ہوں۔

امید ہے کہ گاہ گاہ ہی سہی؛ مگر آپ خط لکھتے رہیں گے۔

والسلام، طالبِ دعا

محمد رضوان غفرلہ

حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ کی وفات کے بعد دو تین ماہ کے دوران ہی، اُن پر راقم نے تاثُّراتی کتاب ''وہ کوہ کون کی بات'' لکھی اور شائع کی، جو الحمد للہ بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اُس کا ایک نسخہ، مولانا محمد رضوان کو بھی بھیجا گیا، حسبِ توقع وہ بہت خوش ہوے اور مندرجہ ذیل مکتوب کے ذریعے، راقم کے حوصلے کو مہمیز کیا۔ اللہ اُنھیں اِس کا بدلہ اپنی اَعلیٰ جنت کا مکین بنا کر دے اور حضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کا جوار نصیب کرے۔ آمین:

اخی الاعز زاداللہ علماً وشرفاً السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ملا اور حضرۃ الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی علیہ الرحمۃ پر آپ کی تحریر کردہ کتاب ''وہ کوہ کن کی بات...'' بھی نظر نواز ہوئی، اِس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مولاناؒ کی ذات والا صفات اپنی گونا گوں خوبیوں، علمی وعملی کمالات اور اپنی تعلیمی وتربیتی اور اِنتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اُن کی پہلودار اور ہمہ جہتی وہمہ رُخی شخصیّت میں ایک مُعلّم کی دردمندی ودل سوزی، ایک مربی کی شفقت نوازی وکرم گستری، ایک خطیب کی جادو بیانی وسحر انگیزی، ایک مصنّف ومؤلف کی وسعتِ ظرفی وبلند فکری، ایک مُدَبِّر ومنتظم کی بیدار مغزی وحوصلہ مندی اور ایک صحابی کی دور اندیشی ودیدہ وری نظر آتی ہے، علم وعمل کے صبر آزما سفر میں، وہ حقیقی معنوں میں ''کوہِ

استقامت'' تھے، ہمت وشجاعت، اعلیٰ ظرفی وبلند حوصلگی کے وہ پیکرِ مجسم تھے۔ عربی زبان وادب کی اُنھوں نے جولازوال اور قابلِ رشک علمی خدمات انجام دی ہیں، وہ نہ صرف دارالعلوم دیوبند؛ بل کہ پورے برّصغیر کی علمی ودینی جامعات، تحریکات اور شخصیّات کے لیے باعثِ افتخار ہیں، قحط الرجال کے اِس ور میں اُنھوں نے ''مردم سازی'' کا جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے — میری نظر میں اُن کی تمام قابلِ ذکر اعلیٰ صفات میں سب سے بڑی صفت ''مردم سازی'' کی تھی، اُن کی اِس صفت نے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی کا سلیقہ سکھایا ہے، اُن کی خفیہ صلاحیتوں کو اُبھارا ہے، چھپے ہوئے جوہر کو چمکایا ہے اور میدانِ کار میں اُتار کر کام کرنے کا مثالی حوصلہ بخشا ہے، مگر اب تو

ع وہ کوہ کن کی بات گئی، کوہ کن کے ساتھ

آپ نے دارالعلوم دیوبند کی ایک عظیم عہد ساز شخصیّت پر، جس دقتِ نظری اور وسعتِ فکری کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، اِس پر آپ یقیناً قابلِ مبارک باد ہیں، طرزِ نگارش اور اُسلوبِ بیاں بھی خوب ہے، ہر صاحبِ ذوق آپ کی اِس کتاب کو شوق کے ہاتھوں لے کر قدر کی نگاہوں سے پڑھنے پر مجبور ہے، مولانا مرحوم سے متعلق آپ کے تأثّرات اور اِحساسات کا یہ مجموعہ، مولانؒا کے بعد ایک مخلص مُعلّم اور مشفق مربی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اُن کی بافیض صحبت کا ایک بدل ہے، آپ نے اپنی اِس کتاب میں، اپنے پُرتاثیر قلم کا جادو کچھ، اس طرح جگایا ہے کہ کتاب کے اوراق میں مولانا ہمیشہ چلتے پھرتے نظر آئیں گے، اور اُن کو دیکھنے والے اور نہ دیکھنے والے دونوں یک ساں طور پر اُن کی اس نقل وحرکت اور آمد ورفت سے لطف اندوز اور مستفید ہوتے رہیں گے، اور جگر کا یہ شعر پڑھ کر آپ کو داد دیتے رہیں گے۔

وہ آئے کب کے، گئے بھی کب کے، نظر میں اب تک سما رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

تاہم اُن کے بعض خواب، بعض جھمیلوں میں پھنسنے یا پھنسا دینے کی وجہ سے جو اَدھورے رہ گئے، اور لغت نویسی کے جدید خاکوں میں جو رنگ نہیں بھرے جاسکے۔ اِس کا افسوس تو ہم جیسے شاگردوں کو ہمیشہ رہے گا، دارالفکر سے دارالمؤلفین کا علمی اور فکری سفر بھی اُن کا خوب ہے، کاش یہ ''شجرِ طوبیٰ'' اپنی بہارِ جاں فزا مزید دکھلا سکتا، اور اُسے مستحکم بنیادیں فراہم ہوسکتیں۔

ہاں! یہ بھی آپ نے اچھا کیا کہ مولانا کے آخری دور کے تذکرہ پر ''مصلحتوں'' کی چادر ڈال دی، اور یہ موقع نہیں دیا کہ لوگ کہیں ؏

سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اور یہ بھی کہ:

اُس نے دل رکھنے کو بس اِتنا کیا	وعدہ پورا کرنے کا وعدہ کیا
وہ تمھارے ملنے والوں میں سے ہے	جس نے تم کو جا بہ جا رسوا کیا

میں دوبارہ اِس کتاب کی تالیف وترتیب اور حسن طباعت واِشاعت پر تہنیت ومبارک باد پیش کرتا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ خوبیوں کی حامل شخصیت پر، خوبیوں کے حامل قلم نے، اپنی خوبیوں کا جو جوہر دکھایا ہے، وہ بہت خوب ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے دین وعلم کی اور عربی زبان وادب کی خدمت لیتا رہے اور آپ کا مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہو اور قلم کسی طرح کے تعب اور تھکن سے آشنا نہ ہو۔

نوٹ: جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، اِس کے لیے معذرت خواہ ہوں، آپ نے اپنی یادگار کتاب میں زمانۂ ماضی کو کُریدتے ہوئے میرا بھی تذکرہ کیا ہے، اِس محبت کے لیے شکرگزار ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ کتاب کا نیا ایڈیشن آنے والا ہے، یہ جب بھی آئے، اِس کے ۲۵ نسخے قیمتاً مدرسے کے

پتے پر ضرور اِرسال فرمادیں۔

۱۲/ جمادی الاخری ۱۴۱۶ھ   والسلام، طالبِ دعا

۶/ نومبر ۱۹۹۵ء   محمد رضوان القاسمی

ناظم دار العلوم سبیل السلام، حیدر آباد

اندرونِ ملک تو ہم دونوں گاہے بہ گاہے ملتے ہی تھے۔ مُتعدّد بار عالمِ عربی، خصوصاً دل اور روح کا نشیمن ہونے کی حیثیت رکھنے والے ملک سعودی عرب میں بھی اُن سے ملنے اور اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا مجھے موقع ملتا رہا۔ ایک بار تو ماہِ رمضان میں خاص مطاف میں اُن سے اچانک ملاقات ہوئی اور اِتنی خوشی ہوئی کہ میں اِس کو الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کرسکتا۔ وہ اِحرام میں ملبوس تھے اور عمرے کا طواف کر رہے تھے اور میں طوافِ نفل کر رہا تھا، اِس کے بعد اُن کی جائے رہائش پر بار بار حاضری ہوئی، وہ اُسی طرح خوش ہوئے جیسے ہمیشہ بے طرح خوش ہوتے رہتے تھے۔

دارالعلوم میں اپنی مدرسی کے بعد اُن سے طویل ملاقات کی ایک تاریخی تقریب

مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں، یہاں سے جانے کے بعد، اُن سے پہلی ملاقات مارچ ۱۹۸۰ء/ جمادی الثانی ۱۴۰۰ھ میں اِجلاسِ صد سالہ کے موقع سے ہوئی۔ وہ دارِ جدید کے مدنی گیٹ سے باہر اپنے مدرسے دارالعلوم سبیل السلام کا خاص قسم کا تاریخی معلومات پر مشتمل کیلنڈر بغل میں دبائے، گھوم پھر کر خود سے ہی فروخت کر رہے تھے اور کوئی ممتاز عالم یا بے تکلف دوست مل جاتا تو مُفت ہی پیش کر دیتے۔ اُن کی جیسے ہی میرے اوپر نظر پڑی، اپنی مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کیلنڈر کے بنڈل کو زمین پر ڈال، میری طرف لپکے، ہم دونوں بغل گیر ہوئے اور ایک دوسرے کی خبر خیریت دریافت کی، کئی روز وہاں ہم لوگوں کا قیام رہا اور بار بار ہم ملتے رہے اور طالبِ علمی کی لذّت بھری

یادوں سے لطف لیتے رہے۔ اُن کا یہ کیلنڈر بہت مقبول ہوا، اِس سے اُن کے علمی ذوق، ادبی شوق، تاریخی مذاق اور ثقافتی نستعلیقیت اور اِشاعتی شایستگی وفن کاری کی عکاسی ہوتی تھی، جس نے دیکھا اُس نے بلاتردّد خرید لیا۔ اُس وقت سے کیلنڈر کو اِس خاص تاریخی وعلمی معلومات اور دعوتی وتعلیمی روح کے ساتھ، شائع کرنے کا اُن کا معمول بن گیا اور اِس خاص طرز کا کیلنڈر شائع کرنا بھی اُنھی کا امتیاز رہا۔ بعد میں بہت سے اَفراد اور اِداروں نے اِس کی نقل کرنے کی کوشش کی؛ لیکن بہ قولِ حریری: أَنّیٰ يَبْلُغُ الضَّالِعُ شَأْوَ الضَّلِيعِ یعنی لنگڑا ایک طاقت ور کے حوصلے کو کب پا سکتا ہے؟ چناں چہ اُن کی شانِ امتیاز ہمیشہ قائم رہی۔

دارالعلوم دیو بند میں، میرے تدریسی ذمے داری سنبھالنے کے بعد، وہ حیدرآباد سے کئی بار تشریف لائے، اُن سے مل کے اور اُن کی ضیافت کرکے، اللہ جانتا ہے دل اتنا خوش ہوا، جتنی روح اُس وقت خوش ہوتی ہے جب اُس کو اُس کی صحیح غذا ملا کرتی ہے، مادرِ علمی میں اُن سے تفصیلی ملاقات، استاذِ نسلِ نو ومربیِ طلبۂ دارالعلوم ومُعلّمِ عبقری حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی (متوفی درمیانی شب ۱۴-۱۵/ذی قعدہ = ۱۵-۱۶/اپریل ۱۹۹۵ء) کی آخری مایۂ ناز تالیف ''القاموس الوحید'' کے اِجرا کے موقع سے ہوئی، جو فقیہ الہند حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ (متوفی شبِ جمعرات وجمعہ ۲۰-۲۱/محرم ۱۴۲۳ھ = ۴-۵/اپریل ۲۰۰۲ء) کے ہاتھ شبِ شنبہ یک شنبہ ۴-۵/صفر ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۸-۲۹/اپریل ۲۰۰۱ء کو عمل میں آیا۔ شنبہ کے دن عصر بعد وہ یکا یک تنہا ہماری رہایش گاہ، افریقی منزل قدیم میں آدھمکے، عام معاصر علما کی طرح اُن کے ساتھ خدَم وحَشَم کی کوئی جماعت نہ تھی۔ وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے، مختلف علمی وفکری اور ملی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، جو طالبِ علمی کے زمانے تک جا پہنچی۔ اُس وقت کی صحت، فراغت، بے فکری، نوعمری وغیرہ کا تذکرہ چل نکلا تو مولاناؒ کی آنکھوں سے آنسو چھلک آئے۔ میں نے گفتگو کا رُخ موڑنا چاہا؛ لیکن اِس میں کام یاب نہ ہوسکا؛ کیوں کہ وہ

ماضی کی راہوں پر اپنی سوچ کے ذریعے بہت دور نکل گئے تھے، چناں چہ وہ سنجیدگی سے سوچتے رہے۔ دراصل وہ بھی شکر کے مریض تھے اور میں بھی اُس کا شکار ہوں، ہم دونوں الحمدللہ اُس وقت (دورِ طالب علمی میں) مکمل صحت منداور نوعمری کی تازگی، چستی اور پھرتی سے لبریز تھے۔ مولاناؒ کو اپنی صحت کے حوالے سے خاص طور سے بڑی تشویش تھی، گو وہ اُس کی دیکھ ریکھ پر بہت توجہ نہیں دے پاتے تھے کہ علمی وملّی ودعوتی کاموں کی درازی اور تسلسل اُنھیں اِس کا موقع ہی نہیں دیتا تھا؛ اِسی لیے جب میں نے اُن کے سامنے ''عہدِ زرّیں'' کو یاد کیا، تو اُن کی آنکھیں بھرآئیں۔ مولاناؒ نے اِس موقع سے میرے اوپر بہت زور دیا کہ میں بار بار حیدرآباد آؤں اور کم از کم سال میں ایک مرتبہ تو ضرور آؤں اور اُن کے مدرسے میں ہفتہ عشرہ قیام کروں؛ تا کہ ماضی کی ملاقاتوں کا جو انقطاع رہا ہے، اُس کی تلافی ہو سکے؛ لیکن دنیا کی اکثر تمناؤں کی طرح یہ تمنّا بھی خدا کی مشیّت سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکی۔ میں اپنی صحّت کی بے طرح ناہمواری، مشاغل کی کثرت اور اُلجھنوں کی بہتات کی وجہ سے، سفر کے حوالے سے بالخصوص بالکل بے ہمّت واقع ہوا ہوں۔ اللہ جزائے خیر دے میرے چند مخلص گجراتیوں کو کہ اُنھوں نے پچھلے سالوں کے درمیان اپنی محبّت کی بے پناہی کی وجہ سے، اپنے مدرسوں کا مجھ سے بار بار سفر کرالیا اور یہاں دارالعلوم میں اپنے ہونہار طلبہ کو اِس سلیقے سے میرے اوپر سفر کے لیے ذہنی تیاری کے حوالے سے مُسلّط رکھا کہ اُن کے حسنِ عمل کی میں کسی بھی طرح داد نہیں دے سکتا۔

مولانا سے راقم کی آخری ملاقات

مولانا محمد رضوانؒ سے اُن کی زندگی میں آخری ملاقات اُن کی موت سے دو سال قبل دیوبند ہی میں رواروی میں ہوئی۔ وہ بعد مغرب اچانک اپنے منجھلے بھائی برادرم سلمان اور اپنے پسرِ خُرد نعمان بدر سلّمہٗ (بعد میں مولانا نعمان بدر) کے ساتھ ہمارے ہاں دہلی سے وارد ہوئے اور ابھی ٹھیک سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ فرمانے لگے کہ ایک ضروری

کام سے ہم لوگ دیو بند آئے تھے اور ابھی دہلی لوٹ جانا ہے؛ کیوں کہ علی الصباح وہاں مَیں بعض ناگزیر پروگراموں سے مربوط ہوں۔ میں نے بے وفائی سمجھی کہ دیو بند آکے تم سے ملے بغیر چلا جاؤں۔ سلمان سلّمہٗ کا بھی اِصرار واشتیاق تھا کہ تم سے چند منٹ کے لیے ملنا ضروری ہے۔ چناں چہ صرف چائے وائے پر اکتفا کیا گیا۔ میں نے کھانے کو اِصرار کیا، تو فرمایا کہ واپسی میں بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ آب و گِل کی اِس دنیا میں اُن سے میری یہ آخری ملاقات ہے، گذشتہ شعبان میں اُن پر غشی کی کیفیت طاری ہوئی تو اپنی کم زوری اور معذوری کے باوجود، جی چاہا کہ میں اُن کی عیادت کو حیدرآباد ضرور جاؤں؛ لیکن میرے بعض اعزّا کے ساتھ اُن کے گاؤں کے بے دین مسلمانوں کی طرف سے، ایسا سنگین معاملہ پیش آگیا کہ اِس حوالے سے مجھے ذاتی طور پر تگ ودو میں مصروف ہونا پڑا اور میں برادرِ محترم مولانا محمد رضوانؒ کی عیادت کو حیدرآباد نہ جاسکا اور وہ بالآخر اپنے رب سے جا ملے۔ اُن کی کشادہ قلبی اور وسیع النظرفی کی وجہ سے یقین ہے کہ ہماری اِس کوتاہی کو معاف کردیں گے اور اپنے رب کے حضور میں میری اِس کوتاہی کے لیے شکوہ سنج نہ ہوں گے۔ خلقِ خدا کی نگاہ میں محبوبیّت اِس بات کی دلیل ہے کہ خدا کا یہ بندہ، اپنے رب کے یہاں بھی محبوب ہے۔ اِن شاء اللہ وہ اِس کو بہت نوازے گا اور اپنے دامنِ عفو ورحمت ومغفرت میں جگہ دے گا۔

اُن کا اِدارہ، اُن کی بہترین یادگار

اُن کی علمی سرگرمیاں، دعوتی کام، تعلیمی وتربیتی کارنامے، اِسلامی خدمات، دینی ومِلّی مساعی، اِن شاء اللہ اُن کے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گی۔ خصوصاً اُن کا ممتاز تعلیمی وتربیتی کارنامہ جو دارالعلوم سبیل السلام کی شکل میں حیدرآباد کی اِسلامی وتاریخی عظمت واہمیّت میں اِضافے کا باعث بنا ہے، اُن کے لیے پیہم ثواب کا ذریعہ رہے گا۔ اُنھوں نے اِس کی تاسیس، ترقّی اور بامِ عروج تک لے جانے کے لیے، اپنے گراں قدر

اوقات، بہترین مساعی اور شب و روز کی محنت سے کام لیا۔ اللہ کی ذات سے یہی امید ہے کہ وہ اِس اِدارے کے لیے مخلص خُدّام کا اِنتظام کرتا رہے گا اور مولانا کی وفات کے بعد یہ کسی ایسے اختلاف یا کش مکش اور جدال کا شکار نہ ہوگا، جس کا عام طور پر ہمارے ملّی اِدارے اُن ہنرمند و قدرآور رِجالِ کار کے اٹھ جانے کے بعد ہو جایا کرتے ہیں، جو اُنھیں اپنی زندگی میں اپنی ہوشیاری و قدآوری کی وجہ سے ہر طرح کے فتنوں سے بچائے رہتے ہیں؛ لیکن ریاکار اور اَغراض و مقاصد کے غلام لوگ، اُن کے اٹھ جانے کو غنیمت جانتے ہوئے اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ملّی اِداروں کو اپنی ہوس کا شکار بنا کے، وہاں طرح طرح کے فتنے جگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر اُس پاک پودے کی حفاظت کرے، جو اِسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے لگایا گیا ہو؛ تاکہ اُس کی جڑیں زمین میں پیوست رہیں اور اُس کی شاخیں آسمان میں دراز ہوں اور وہ خدا کی مرضی سے برابر اپنا میٹھا پھل دیتے رہیں اور مسلمانوں کی نسلوں کو اُس سے وہ فائدہ پہنچتا رہے، جس کی اُس سے توقّع کی گئی تھی۔

مولانا کی علمی میراث، بہترین صدقۂ جاریہ

مولانا محمد رضوانؒ آج ہمارے درمیان نہیں؛ لیکن اُن کے مختلف علمی و مِلّی کارنامے اور حسنِ اخلاق کی میراث ہمارے درمیان باقی ہے، جس کو ہم سلیقے سے تقسیم کر سکتے ہیں اور اُن کے طرز پر چل کر، اُن کی یادوں کو قائم و دائم رکھ کر، اُن کی محبت کا صحیح طور پر دم بھر سکتے ہیں اور اُنھی کے ایسی مقبولیّت و محبوبیّت حاصل کر کے، دین و ملّت اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ مفید بن سکتے ہیں۔

آج اُن کے اہلِ خاندان نے اُنھیں کھو کر خاندان کے والی کو کھو دیا ہے، بھائیوں نے اپنے شفیق بھائی کو کھو دیا ہے، دوستوں نے وفادار دوست کو کھو دیا ہے، ملی و دینی اِداروں نے اپنے فعّال اور مخلص کارکن کو کھو دیا ہے، مجھے ذاتی طور پر یہ غم کھائے

جارہا ہے کہ میں نے ایک ایسے غم گسار و دم ساز برادرِ کبیر کو کھو دیا ہے، جس کو میرے مفادات سے، میری ہی طرح، یا شاید اس سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک ایسے وفادار دوست کو کھو دیا ہے، جس کی وفاداری اب زندہ اہلِ علم و فضل دوستوں میں دور دور تک نظر نہیں آتی، ''اہلِ علم و کمال'' کی کمی نہیں، کمی اُس ہمہ گیر وصف کی ہے، اُس جامع اَخلاق کی ہے جو مولانا محمد رضوانؒ کو دوسروں سے ممتاز کرتا تھا۔ غالباً کسی اِنسان کو دوسرے اِنسان میں جو بہت کمی محسوس ہوتی ہے، وہ اِسی طرح کے جامع اخلاق کی کمی ہوتی ہے، جو مولانا محمد رضوانؒ کا وجہِ امتیاز تھی اور جس کے بغیر انسان، نامکمل اور ناقص انسان رہتا ہے، خواہ وہ علم کا پہاڑ اور ڈھیر سارے کمال کا حامل کیوں نہ ہو۔ مولانا محمد رضوانؒ جیسی ہمہ گیر صفت اور جامع الاَخلاقی کے ذریعے ہی ایک انسان کو اِرد گرد کا اِنسان مونس و غم خوار تصور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ اِس دنیا میں تنہا نہیں؛ بل کہ ایک شفیق بھائی، ایک مخلص دوست، ایک وفادار ساتھی، اُس کے دنیا و آخرت کے سارے معاملات میں اُس کا ہم رکاب و شریکِ کار ہے، لہٰذا مشکل سے مشکل حالات میں اُس کو اِس دنیا سے، مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اور دنیا کے انسانوں سے بالکلّیہ اعتماد اٹھا لینے کے لیے، اُس کے پاس وجہِ جواز نہیں۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

کیا کوئی مہربان میرے لیے مولانا محمد رضوانؒ جیسا انسان فراہم کرسکتا ہے اور اُن ڈھیر سارے اِنسانوں کے شر سے میرے لیے ڈھال بن سکتا ہے، جنھیں ''اہلِ علم'' کا عنوان دیا جاتا ہے؛ لیکن اُن کے کبر و غرور اور اِنسانیّت سے اُن کے عاری ہونے کو دیکھتے ہوئے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُنھیں اُس اِسلامی اَخلاق کی ہوا تک بھی نہیں لگی، جس نے مولانا محمد رضوانؒ کو مُعاصرین کے درمیان علم، تحریر، تقریر اور خدمتِ دعوت و دین کے میدان میں شہرت سے پہلے ہی ''دراز قد'' بنا دیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اِسلامی

اَخلاق کے حوالے سے اِفلاس کے شکار ''اہلِ علم وکمال'' سے اسلام کو اپنی پوری تاریخ میں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے، اسلام کو سارا فائدہ اُن ''اہلِ علم وفضل'' سے ہی حاصل ہوا ہے جو اِسلامی اَخلاق اور صحیح انسانی صفات کے زیور سے آراستہ تھے؛ کیوں کہ یہی لوگ درحقیقت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کے وارث تھے، جنھیں ابوبکر وعمر وعثمان وعلی، عشرۂ مبشرہ اور سارے صحابہؓ اور اُن کے سچے متبعین کی سیرت وسلوک کے واقعی پیرو ہونے کا اِعزاز حاصل رہا۔

اِلٰہی! ہمارے خلیق ومحترم بھائی مولانا محمد رضوان القاسمیؒ کی قبر پر رحم وکرم کی موسلا دھار بارش نازل فرما؛ اَنبیا، صدیقین، صلحا اور شہدا کے جوار میں اُنھیں اپنی اَعلیٰ جنت کا مکین بنا؛ اُن کے اَعزا واقربا، متعارفین ومحبین اور دعا گویوں کو صبرِ جمیل واَجرِ جزیل عطا فرما اور ہمیں اُن کے بعد اپنی راہِ مستقیم پر گام زن رکھ اور ہمیں اُن کی جدائی کے غم کا اجر عنایت فرما اور اُن کے بعد ہر طرح کے فتنوں سے محفوظ رکھ۔

سوانحی نقوش

- نام: محمد رضوان القاسمی۔
- ولدیت: الحاج محمد حبیب الحسن صاحب حسینی بن محمد سلیم بن چراغ علی عرف بھکاری بابو رحمہم اللہ۔
- تاریخ پیدائش: ۱۱/۷/۱۹۴۴ء (۱۸/شعبان ۱۳۶۳ھ)
- جاے پیدائش: بھاگ رتھ پور سابق ضلع دربھنگہ، حال ضلع مدھوبنی، (بہار) جو اُن کی نانیہال ہے۔
- وطنِ اصلی: ''رسول پور بڑھولیا'' ضلع دربھنگہ (بہار) جو اُن کے پردادا نے بسایا تھا، جن کا نام ''چراغ علی'' عرف بھکاری بابو تھا، جو اُس علاقے کے بڑے زمین دار تھے اور کئی گاؤں کے مالک تھے، بڑے دین دار، تہجد گزار اور پابندِ شریعت آدمی تھے، پہلے اِسی علاقے میں اُن کا گاؤں اُسی جگہ واقع تھا، جہاں غیر مسلم آبادی زیادہ تھی، وہ بالخصوص وقتِ سحر اپنی عبادت گاہوں میں گانا بجایا کرتے، تو اُنھیں نمازِ سحر گاہی میں تکلیف ہوتی، اِس لیے اُس سے قدرے دور اپنا دوسرا گاؤں بسالیا، اُنھیں ''بھکاری بابو'' اِس لیے کہا جاتا تھا

کہ وہ فقیروں کو بہت نوازتے رہتے تھے، اور اُنھیں کسی بھی حال میں خالی ہاتھ واپس ہونے نہیں دیتے تھے۔

❁ **موجودہ جائے سکونت:** H.No. 3-5-783/20A کنگ کوٹھی، حیدرآباد 500029 (A.P.)
H.No. 5-8-629/1 مسجدِ عامرہ، عابڈس، حیدرآباد 500001 (A.P.)

❁ **موجودہ مراسلت کا پتہ:** دارالعلوم سبیل السلام، مدینۃ العلم
(صلالہ، بارکس) حیدرآباد 500005 (A.P.)

Darul Uloom Sabeelus Salam, Madinatul Ilm
(Behind Salala, Barkas) Hyderabad. 500005, A.P. INDIA
Phone: 0091-40-24440450, 2444691, 9246599169.
Fax: 0091-40-24441835

❁ **تعلیمی لیاقت:** ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے حاصل کی، پھر جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر میں، پھر ڈھاکا، ضلع چمپارن کے مدرسہ حسینیہ میں، بعدہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں، اعلیٰ تعلیم دارالعلوم دیوبند میں۔

❁ **فضیلت:** دارالعلوم دیوبند، ۱۹۶۷ء (۱۳۸۷ھ)

❁ **اختصاص فی علوم القرآن:** مقالہ بہ عنوان ''قرآن کا عطا کردہ نظامِ حیات'' دارالعلوم دیوبند ۱۹۶۸-۱۹۶۹ء

❁ **خدمات:** ● ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی بنیاد رکھی اور تاحیات اُس کے ناظم رہے ● مسجدِ عامرہ عابڈس حیدرآباد میں جمعہ کی خطابت اور مختلف نمازوں کے بعد درسِ قرآن اور درسِ حدیث کا سلسلہ بھی تاحیات جاری رہا۔ حیدرآباد میں وہ ۱۹۶۹ء میں مسجدِ عامرہ کے خطیب وامام کی حیثیت سے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہ، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کے انتخاب سے تشریف لائے تھے؛ کیوں کہ مذکورہ مسجد کے ذمّے داروں نے، اِس منصب کے لیے آپ سے کسی باصلاحیت اور لائق فاضلِ دارالعلوم کو منتخب کر کے بھیجنے کی درخواست کی تھی ● اِصلاحِ مُعاشرہ اور مختلف علمی، دینی، ادبی اور اصلاحی موضوعات پر منعقد ہونے والے سیمیناروں و کانفرنسوں اور اجتماعات میں شرکت کی اور خطبات ومقالات پیش کیے ● مختلف مدارس اور دینی وملّی اِداروں کی سرپرستی بھی کی۔

❁ **صحافت:** ● روزنامہ ''سیاست'' سے تقریباً تیس سال سے وابستگی رہی اور اُس کے مستقل کالم نویس رہے۔ ''آپ کے سوال'' کے عنوان سے، ہر ہفتے لوگوں کے مختلف النوع دینی، مذہبی، ادبی اور سماجی قسم کے سوالات کا جواب دیتے رہے، اور اُسی اخبار میں ہر ہفتے ادبی، اِصلاحی اور سماجی مضامین بھی

شائع ہوتے رہے ہیں ● مدیر سہ ماہی ''صفا'' و پندرہ روزہ ''قرطاس وقلم''۔

۞ تصنیف وتالیف: ● صلاۃ وسلام ● ظہورِ قدسی ﷺ ● اے انسان! وقت کی قیمت پہچان ● چراغِ راہ ● باتیں اُن کی یاد رہیں گی ● دینی مدارس اور عصرِ حاضر ● زکاۃ و صدقۂ فطر- احکام ومسائل ● عید الاضحیٰ- احکام ومسائل ● جرائم- مرض اور علاج ● گلدستۂ سنت ● گنج ہائے گراں مایہ ● سفرِ آخرت- احکام ومسائل ● عصرِ حاضر کے فقہی مسائل ● اسرار احیات ● متاعِ قلم

۞ عہدے ومناصب: ● ناظم دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد ● رکنِ تاسیسی وعاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ● نائب صدر فقہ اکیڈمی، انڈیا ● رکن مجلسِ شوریٰ ندوۃ العلما لکھنؤ ● رکن اصحابِ حل وعقد امارتِ شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔ ● رکن تاسیسی المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء، پٹنہ ● نائب صدر تنظیم ابنائے قدیم، دار العلوم دیوبند ● رکن تاسیسی وعاملہ آل انڈیا ملی کونسل ● رکنِ تاسیسی مجلسِ علمیہ آندھرا پردیش ● نائب صدر دینی مدارس بورڈ، آندھرا پردیش ● نائب صدر یونائیٹڈ مسلم فورم، آندھرا پردیش

۞ مولانا کے بھائی بہن: ۱- محمد سلمان (گریجویٹ ماسٹر آف کامرس) حیدر آباد اور پونا میں تدریسی لائن سے جڑے، اُس کے بعد بمبئی میں ایک کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے سروس کی، ۱۹/اگست ۱۹۸۰ء میں دبئی چلے گئے، جہاں اپنی فیملی کے ساتھ ہنوز مقیم ہیں، وہاں ''بن فارس'' گروپ میں جنرل منیجر ہیں، اُن کے اپنے بھی کئی کاروبار ہیں، اُن کے ۴/لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

۲- حافظ محمد عرفان۔ پہلے سال ہاسال تک دبئی میں عطر وعود کے کاروبار سے منسلک رہے۔ اب تجارتی سرگرمیوں کے لیے حیدر آباد میں مقیم ہیں۔

۳- مفتی محمد حسّان قاسمی۔ کویت میں وزارتِ اوقاف کے تحت بعض اہم ذمّے داریاں انجام دے رہے ہیں، ساتھ ہی دار العلوم سبیل السلام کی نظامت کی ذمّے داریوں سے بھی بہ حسن وخوبی عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

۴، ۵- شاہدہ خاتون وراشدہ خاتون۔ دونوں اپنے اہل وعیال کے ساتھ حیدر آباد ہی کی باسی ہیں۔

۞ مولانا کی اولاد: مولاناؒ کی پہلی شادی اپنے علاقے دربھنگہ، بہار میں ہی ہوئی، پہلی اہلیہ سے ۳/اولاد ہوئی:

۱- عارفہ فرزانہ، اُن کی شادی حیدر آباد ہی میں ہوئی، صاحبِ اولاد ہیں۔

۲- محمد عمران، ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ایم ڈی کر رہے ہیں۔

۳- کاشفہ خاتون، بی اے اور عالمہ ہیں۔

دوسری شادی ۱۶/ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو حیدر آباد میں ہوئی، جس سے ۳/ اولاد ہوئی:

۱- محمد ریحان، کمپیوٹر انجینئر ہیں، الہلال اسلامک بینک میں پروجیکٹ انجینئر ہیں۔

۲- نکہت فوزیہ، ایم بی بی ایس، ڈاکٹر ہیں، اپنی کلینک ہے اور ''اسری ہسپتال'' حیدر آباد میں شعبۂ ولادت کی ذمّے دار ہیں۔

۳- مولانا محمد نعمان بدر، دار العلوم ندوۃ العلما سے عالمیت اور دار العلوم دیو بند سے فضیلت کے ساتھ ساتھ ایم بی اے بھی کیا ہے، اب دار العلوم سبیل السلام کے مدیر کی ذمّے داری، لیاقت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی، شمارہ ۱۱-۱۲، جلد ۲۸، ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۴۲۵ھ مطابق جنوری وفروری ۲۰۰۵ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود ۱۱ ربجے صبح، بہ روز بدھ ۱۶/ ذی قعدہ ۱۴۲۵ھ = ۲۹/ دسمبر ۲۰۰۴ء۔

سوانحی نقوش کے سلسلے میں اُن کے پسر خُرد مولانا نعمان بدر سلّمہٗ اور ان کے بھائی محترم سلمان صاحب کی فراہم کردہ معلومات سے مدد لی گئی ہے۔

مولانا قاری شریف احمد گنگوہیؒ (*)

۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۸ء — ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء

محفل سے اُٹھ کے، رونقِ محفل کہاں گئی؟
کُھل اے زبانِ شمع! کہ کچھ ماجرا کھلے

۲۴؍ربیع الاول ۱۴۲۶ھ = ۴؍مئی ۲۰۰۵ء چہار شنبہ کی صبح کو ساڑھے نو بجے قاری شریف احمد گنگوہیؒ، اپنی عمر کی ۷۸ بہاریں دیکھنے کے بعد، اِس جہانِ فانی سے اُٹھ گئے۔ مرحوم دینی تعلیم کے میدان میں سرگرم ایک معروف عالمِ دین تھے، اُنھوں نے اپنی عمر کا بیش تر حصہ دینی و تعلیمی سرگرمیوں اور مسلم نسلِ نو کو دین و عقیدے اور ملک و قوم کی خدمت کا اہل بنانے میں گزارا۔

مرحوم وسعتِ علمی اور تحریر و تقریر کے حوالے سے کوئی مشہور عالم نہ تھے اور نہ ہی ایسے پیر و مرشد تھے، جو اِرادت مندوں کی تربیت و تزکیہ میں یک سُوئی کے ساتھ مصروفِ عمل ہو؛ لیکن اُنھوں نے انتہائی خاموش اور ہر قسم کے صلے اور ستائش سے بے پروا ہو کر قصبہ ''گنگوہ''، ضلع ''سہارنپور'' میں ایک دینی مدرسے کی داغ بیل ڈالی، جس کا آغاز بھی برِصغیر کے دگر اِسلامی مدارس کی طرح، مکتب ہی کی شکل میں ہوا اور شبانہ روز محنت اور لگن کی وجہ سے اِس خطے کے مدرسوں میں ممتاز حیثیت کا حامل بنا دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ گنگوہ، مشہور محدث و فقیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۴/ ۱۸۲۹ھ - ۱۳۲۳ھ/

(*) ترجمہ از عربی بہ قلم مولوی ابرار احمد اِجراوی قاسمی۔

۱۹۰۵ء) کی جائے پیدائش ووفات ہونے کی وجہ سے تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

مرحوم انتہائی جاں فشانی اور دل سوزی کے ساتھ مدرسے کی ظاہری اور باطنی توسیع وترقی میں لگے رہے، تا آں کہ وہ رفتہ رفتہ اُن کی زندگی ہی میں ایک بڑا مدرسہ بن گیا، جس میں ابتدائی اور متوسطات سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور حفظ وقراءت کے وہ تمام روایتی شعبے قائم ہیں، جو ہمارے برِ صغیر کے کسی بڑے مدرسے میں عام طور پر ہوتے ہیں۔ اُن کا مدرسہ دیگر مدارس سے کئی اعتبار سے ممتاز بھی ہے؛ چناں چہ اُس کا رقبہ بڑا وسیع وعریض اور جائے وقوع، آب وہوا کے حوالے سے خوش گوار اور بڑی پُر فضا ہے، بازار کے شور شرابے اور گنجان آبادی کے مسائل سے بالکل الگ تھلگ ہے، اُس کی عمارتیں خوب صورت اور دل فریب اور درس گاہیں کشادہ اور سلیقے کی ہیں، یہ مدرسہ انتظام وانصرام کی باقاعدگی میں بھی، اُن کے زمانے میں اِمتیازی شان رکھتا تھا، مدرسین محنتی اور ذمے داران بے تکلف اور سادگی پسند تھے۔

قاری صاحبؒ سے ملاقات وتاثُّر

میرا کئی بار اُن کے مدرسے جانا ہوا۔ پہلی بار جون ۱۹۸۴ء = شعبان ۱۴۰۴ھ کو عربی کے عبقری معلّم اور خداداد انتظامی صلاحیت کے مالک حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ ـــــ سابق استاذ ومعاون مہتمم دارالعلوم دیوبند ـــــ متوفی ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء کے ساتھ میرا وہاں جانا ہوا۔ حضرتؒ نے ایک دن دارالعلوم کے اِحاطے میں، میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کو تیار کھڑی کار میں یہ کہتے ہوئے بٹھالیا کہ آؤ! گنگوہ چلتے ہیں، مجھے ایک ہنگامی ضرورت پیش آگئی ہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد گاڑی ایک مدرسے کے پاس رُکی، ہم گاڑی سے اُتر کر مدرسے میں داخل ہوئے۔ حضرت الاستاذ کے ساتھ میں قاری شریف احمدؒ کے کمرے میں داخل ہوا، علیک سلیک اور خبر خیریت دریافت کرنے کے بعد ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت

الاستاذ، جس کام کے لیے گنگوہ آئے تھے، اُس کی تکمیل میں لگ گئے۔ میں قاری صاحبؒ ہی کے پاس بیٹھا باہم ملاقات وتعارف میں مشغول رہا۔ اُن کی گفتگو میں بلا کی سنجیدگی، شائستگی اور جماؤ تھا، اُن کی ہر حرکت وسکون میں نظم وضبط نمایاں تھا، اُن کے گرد وپیش کی ہر چیز صفائی وستھرائی اور نفاست پسندی کا اعلیٰ نمونہ تھی، اُن کے کمرے کے فرش، کپڑے، برتن، چائے کی پیالیاں اور چائے دانیاں انتہائی سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اُن کے کمرے میں وضو کرنے، ہاتھ دھونے، جوتے چپل اُتارنے، استنجا اور وضو کے لوٹے رکھنے کے لیے الگ الگ مخصوص جگہیں تھی۔ میں نے چائے کے ساتھ پیش کیے جانے والے ہلکے ناشتے کے دستر خوان پر، چائے اور برتنوں کے ساتھ، اُن کے رکھ رکھاؤ کو بہ غور دیکھا، یہ سب کچھ دیکھ، سُن اور برت کر میرے دل ودماغ پر ایک گہرا نقش ثبت ہوگیا اور میں اُن کے روبرو، مہمانوں کے ساتھ اُن کے اِس ہنرمندانہ طریقے سے پیش آنے پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ جس پر اُنھوں نے فرمایا: یہ سب کچھ مظاہر علوم اور دارالعلوم کے اکابر علما ومشائخ کی بابرکت صحبت کا، رہینِ منت ہے، جن کی دانش مندانہ تربیت سے میں نے بے پناہ فائدہ اٹھایا ہے۔

خوش خلقی وخندہ روئی

شام کے وقت حضرت الاستاذؒ اپنے مذکورہ کام سے فارغ ہوے، چناں چہ ہم دیو بند روانگی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے، قاری صاحبؒ نے ہمیں مدرسے کے صدر دروازے پر الوداع کہا اور گاڑی چل پڑی۔ واپسی میں گنگوہ سے دیو بند تک، دوپہر ۱۲ بجے سے شام ۶/ بجے تک، گنگوہ کے مذکورہ مدرسے میں قاری صاحبؒ کے ساتھ ملاقات کے دورانیے کے، اُن کے سارے طرزِ عمل کی ہر تصویر، میرے خانۂ خیال میں گردش کرتی رہی، یعنی اُن کی خوش خلقی، خندہ روئی، کام کی باتوں میں ہی لگے رہنے اور مہمانوں کی تعظیم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنے —— یہاں تک کہ مہمانوں کو

محسوس ہوتا کہ وہ اپنے گھر میں یا اپنے گھر سے بھی کہیں زیادہ آرام و آسایش میں ہیں
——— کے حوالے سے اُن کا ہر رویّہ میرے ذہن کے پردے پر از خود متحرک ہوتا رہا۔
جب میں نے اپنا مذکورہ تاثّر حضرت الاستاذؒ سے بیان کیا تو فرمایا: ہاں! ٹھیک کہتے ہو، وہ ہمارے مخلص اَحباب میں ہیں، مزاج کی یگانگت اور میری ہی طرح ہر چیز میں نظم و نسق اور ڈسپلن کی پابندی کی وجہ سے، میرے اور اُن کے درمیان ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے۔ وہ علاقے کے اِس حوالے سے، گِنے چُنے علما میں ہیں اور اپنی اِس شناخت کی بنا پر اِس خطّے کے ممتاز اور لائقِ اِحترام عالمِ دین سمجھے جاتے ہیں۔
میں جوں ہی دیو بند واپسی کے لیے، قاری صاحبؒ کے پاس سے اُٹھا، اُنھوں نے مجھ سے یہ عہد و پیمان کرالیا کہ میں وقتاً فوقتاً، اُن کے مدرسے آتا جاتا رہوں گا، خصوصاً جب وہ مجھے اِس کی یاددہانی کرائیں گے۔ چناں چہ اُن کی وفات سے آٹھ دس سال قبل تک وقتاً فوقتاً، اُن کے مدرسے میں میری آمد و رفت جاری رہی، جب بھی میری وہاں آمد میں ذرا زیادہ فاصلہ ہو جاتا، وہ بہ راہِ نوازش مجھ سے فون پر رابطہ کرتے اور کرایے کی ٹیکسی پر بہ جلد آنے کے لیے اِصرار کرتے۔ مرحوم کرایہ بڑے اِصرار کے ساتھ خود ہی دیتے؛ بل کہ یہ شرط لگا دیتے کہ میں ایسے کرایے کی گاڑی سے ہی آمد و رفت کروں، جس کا کرایہ وہ خود اَدا کریں گے۔ وہ اِس بات کے روادار نہ تھے کہ میں بسوں میں سفر کروں اور خواہ مخواہ بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اذیّت اُٹھاؤں۔ میرا جب بھی گنگوہ جانا ہوا، اُنھوں نے مجھے مدرسے سے کچھ ہی فاصلے پر واقع اپنے ذاتی مکان میں قیام کرایا، میں ہمیشہ رات وہیں گزارتا اور فجر کی نماز اُنھی کے گھر سے متصل مسجد میں اُن کے ساتھ ہی اَدا کرتا۔ ناشتہ میں انواع و اقسام کی مرغوب اشیا دسترخوان پر سلیقے سے سجی ہوتیں، اُن کا ناشتہ بڑی حد تک ہمارے شمالی بہار کے باشندوں کے ناشتوں سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ شمالی بہار والے ناشتے کو انتہائی لذیذ بنانے اور نوع بہ نوع کرنے پر جتنی توجہ دیتے ہیں، اِتنی دوپہر اور رات کے کھانے پر نہیں دیتے۔

وہ اپنے دفتر میں مدرسے کی ترقی اور اُس کی کارکردگی کو مزید فعّال بنانے کے لیے برابر مجھ سے صلاح و مشورہ اور تبادلۂ خیال کرتے، جس سے اِس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تدریسی طریقۂ کار کے ساتھ ساتھ، نصابِ تعلیم کو مزید بہتر اور فعّال بنانے کے لیے بڑے فکرمند رہتے تھے۔

میں اُن کے مدرسے میں کم و بیش پانچ بار تنہا یا برادرِ عزیز مفتی نسیم احمد مظفر پوری کے ہم راہ(۱) گیا۔ اِدھر تقریباً دس سالوں سے قاری صاحبؒ ایک عمارتوں: کتب خانہ، طلبہ کے دارالاقاموں اور عالی شان صدر دروازے وغیرہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے، فنڈ کی فراہمی کے مقصد سے بیرونِ ہند کے بڑے بڑے اَسفار میں کچھ اِس طرح کھو گئے کہ اُنھیں میری یا دوسروں کی فکر کیوں کر ہو سکتی تھی؟ میں خود بھی چند سالوں سے مجموعۂ اَمراض ہونے کے علاوہ بہت ساری مصروفیّات کی بندش میں جکڑ سا گیا اور اِس دوران اُن کے ہاں جانے اور ملاقات و مکالمت کا موقع نہ مل سکا، تا آں کہ میرے گھر والوں نے مجھے ۲۴؍ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ - ۴؍ مئی ۲۰۰۵ء بہ روز چہار شنبہ یعنی اُن کی وفات کے دن ہی یہ اندوہ ناک خبر بہ ذریعہ فون دی کہ گنگوہ کے کسی صاحب نے فون پر، اُن سے کہا کہ میں مولانا نور عالم صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ جب اُنھیں بتایا گیا کہ میں اِس وقت سفر میں ہوں، تو اُنھوں نے کہا کہ مولانا کو یہ خبر کر دیجیے کہ قاری شریف احمد گنگوہیؒ کا آج انتقال ہو گیا، وہ مرحوم کے لیے دعاے مغفرت کے ساتھ اگر ہو سکے، تو اپنی عربی تحریروں میں مرحومین کے صفحات پر اُن کا بھی تذکرہ کر دیں؛ اِس لیے کہ مرحوم اور مولانا کے درمیان دیرینہ تعلقات تھے۔ جب گھر والوں نے یہ الم انگیز خبر

(۱) جو ۳۵-۳۶ سال کی عمر میں ہی بہ روز جمعرات ۲۶؍ ذی قعدہ ۱۴۲۳ھ = مطابق ۳۰؍ جنوری ۲۰۰۳ء کو اِس جہانِ آب و گل سے اُٹھ گئے، وہ دارِ جدید دارالعلوم دیو بند میں میرے برابر والے کمرے میں رہتے تھے اور اپنے طالب علمانہ مقررہ کاموں سے فراغت کے بعد، میرے ہی ساتھ وقت گزارا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور روزِ آخرت اِس کا بھر پور بدلہ دے۔

دی، تو مجھے سخت دھچکا لگا اور میں نے دل میں کہا: میدانِ تعلیم وتربیت کا ایک مضبوط اور عالی شان ستون گر گیا۔

مرحوم نے ''اشرف العلوم رشیدی'' کے نام سے اپنے قائم کردہ چھوٹے سے مکتب کو قلیل عرصے میں، طویل وعریض رقبے، بہت ساری عمارتوں اور فیض یافتہ گان کی کثرت کے حوالے سے علاقے کے ممتاز ترین بڑے مدارس کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کر دیا۔ درحقیقت یہ سب کچھ اُن کی تنظیمی اور تربیتی صلاحیت اور اُس تاریخی اور مبارک قصبے میں تعلیم وتربیت کے عظیم مینارے کے قیام کے لیے اُن کی بے انتہا لگن اور تڑپ کی وجہ سے ہی ممکن ہوسکا۔

مختصر تعارف

۞ قاری شریف احمد کی پیدائش ۲۶ رصفر ۱۳۴۸ھ = مطابق ۱۳ راگست ۱۹۲۸ء بہ روز پیر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن قصبہ گنگوہ میں اپنے دادا حافظ عبدالرحمٰن سے حاصل کی۔ حضرت گنگوہیؒ کے ایک تربیت یافتہ بزرگ حافظ قرآن ''عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم'' کے پاس تکمیلِ حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں تجوید وقراءت کی تعلیم کے لیے قاری عبدالخالق کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، جو محلّہ قاضی، ضلع سہارن پور میں مدرسہ تجوید القرآن کے شعبۂ تجوید وقراءت کے مدرس اور شہر کی جامع مسجد کے امام تھے۔ ۱۹۴۲ء = ۱۳۶۱ھ میں وہاں سے وہ بہترین قاری بن کر نکلے۔ اِس کے بعد مشہور محدث وفقیہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (متوفی ۱۴۱۷ھ = ۱۹۹۶ء) —— سابق صدر مفتی دارالعلوم دیوبند —— سے ۱۹۴۳ء = ۱۳۶۲ھ میں لدھیانہ، صوبہ پنجاب کے کسی مدرسے میں سلسلۂ تلمذ قائم کیا، وہ یہاں چھ مہینے رہے۔ پھر تجوید وقراءت کے ذوق کو مزید جلا بخشنے کے لیے مدرسہ تجوید القرآن میں قاری عبدالخالق کے پاس واپس چلے آئے، اُنھوں نے اِس دوران عربی، فارسی اور ابتدائی دینی عربی تعلیم بھی حاصل کی۔

۞ ۱۹۴۴ء = ۱۳۶۳ھ میں مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا اور وہاں مسلسل تین سال رہ کر متوسطات تک کی تعلیم مکمل کی، ۱۹۴۷ء = ۱۳۶۶ھ میں دارالعلوم دیوبند آئے اور یہاں بھی تین سال رہ کر ۱۹۴۹ء = ۱۳۶۸ھ میں سندِ فضیلت حاصل کی۔

۞ دارالعلوم اور مظاہرِ علوم میں پڑھنے کے دوران مرحوم نے اپنے چھوٹے سے مدرسے پر بھرپور توجہ

دی، جسے اُنھوں نے سہارن پور کے ایامِ طالبِ علمی میں اپنے استاذ اور مظاہرِ علوم کے ناظم مولانا سید عبداللطیف صاحبؒ (متوفی ۱۳۷۳ھ=۱۹۵۴ء) کے اِیما پر قائم کیا تھا۔ وہ چندے کی فراہمی اور تعلیمی ترقی کے حوالے سے برابر اُس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہے۔ اُنھوں نے جوں ہی دارالعلوم سے فراغت حاصل کی، علماومشائخ —— جن سے وہ مدرسے کے سلسلے میں صلاح ومشورہ کرتے تھے —— نے اُنھیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ مدرسے کے مستقل ذمے دار کی حیثیت سے اِس کی ترقی کے لیے کام کرنے کو کہا؛ چناں چہ وہ اِس اہم کام میں ہمہ تن لگ گئے۔ کئی بار اُنھیں مخالفت اور مصائب ومشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا؛ لیکن اُن کے قدم نہیں ڈگمگائے؛ بل کہ وہ علماوصلحا کی دعاؤں اور مخلصانہ مشوروں کے طفیل، ثابت قدمی اور مکمل عزم وحوصلے کے ساتھ اپنی مقررہ راہ پر رواں دواں رہے اور توفیقِ خداوندی سے ایسی کامیابی حاصل کی، جس سے کوئی خدا کا باتوفیق بندہ ہی سرفراز ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں روزِ آخرت بھرپور بدلہ مرحمت فرمائے، اُنھیں اپنی فردوسِ بریں میں داخل کرے اور اُن کے اہلِ خانہ اور محبین ومتعارفین کو صبر واجر سے نوازے۔(*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۶-۷، جلد ۲۹، جمادی الاخری ورجب ۱۴۲۶ھ مطابق جولائی واگست ۲۰۰۵ء۔

حضرت مولانا شاہ اَبرار الحق حقیؒ
شخصیت اور شانِ امتیاز(*)

۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء — ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء

نہ تخت وتاج میں، نَے لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

ہندوستانی مسلمانوں نے انتہائی رنج وغم کے ساتھ عالمِ ربانی، مصلح کبیر، پیرو مرشد اور دینِ حق کے عظیم اور بے لوث داعی: محی السنۃ حضرت مولانا شاہ "ابرار الحق حقیؒ" کو الوداع کہا، جنھوں نے اپنی حیاتِ مستعار کی ۸۶ منزلیں طے کرنے کے بعد ۸/ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ = مطابق ۱۷/مئی ۲۰۰۵ء کی شب میں تقریباً پونے نو بجے، اپنے وطن ہردوئی میں داعیِ اَجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن.

داعیانِ حق کے سلسلے کی آخری کڑی

مرحوم اُن چنیندہ علماء، صلحاے اُمت اور داعیانِ حق کے سلسلے کی آخری کڑی تھے، جنھیں برِ صغیر کے عوام وخواص میں یکساں مقبولیت اور اعتماد واستناد حاصل تھا، وہ اِس وقت خلقِ خدا کی دینی آرزوؤں کا مرکز، علماے عظام کی جاے امید، دعاۃ ومصلحین، نیز اتباعِ سنت، دین کی عملی تعلیمات کے حصول، عقیدے کی درستگی اور تعلق مع اللہ کی

(۱) ترجمہ از عربی، بہ قلم مولوی ابرار احمد قاسمی اجراوی، بہ روز جمعہ: ۱۵/جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۲/جولائی ۲۰۰۵ء۔

مضبوطی اور استحکام کی لگن اور تڑپ رکھنے والوں کا واحد اور آخری مرجع تھے؛ اِس لیے اُن کے اُٹھ جانے سے، اِس دیار کے مسلمانوں کو ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے اُن کے سروں سے سعادت وخوش بختی کا ایک ایسا گھنیرا سایہ اُٹھ گیا ہے، جو— توفیقِ خداوندی سے — اُنھیں مادّیت کی تیز آندھی، دنیا سے غیر معمولی وابستگی اور روز روز سر اُبھارنے والے اُن ڈھیر سارے فتنوں کے طوفانِ بلاخیز کی اذیّت رساں ''ٹھنڈک'' اور آگ برساتی ''دھوپ'' سے بچائے رہتا تھا، یعنی اُن فتنوں کی بلاخیزی سے جو بندگانِ خدا کو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لینا چاہتے ہیں۔

دنیاوی مقبولیت ومحبوبیت، نقد خدائی بدلہ

تزکیہ واِحسان کی دنیا میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰-۱۳۶۲ھ=۱۸۶۳-۱۹۴۳ء) کے خلفا میں صرف مولانا مرحوم ہی اب تک بہ قیدِ حیات تھے، جو بندگانِ خدا کو سیدھی راہ دکھلانے اور اپنی شبانہ روز کی بے پناہ کوششوں کے ذریعے، اُن کا خدا سے رشتہ جوڑنے اور اُنھیں سنتِ نبویؐ اور شریعتِ محمدیؐ کے قالب میں ڈھالنے کے لیے، ہر وقت فکر میں گھلتے اور پگھلتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُنھیں عامۃ الناس کی نگاہوں میں اِتنی مقبولیت اور محبوبیت سے نوازا، جو ہمیں اِس بات کا یقین دلاتی تھی کہ قبل از مرگ یہ ربِ کریم کی بارگاہ سے ان کو نقد ملا ہوا بدلہ تھا۔ رہا روزِ محشر کا بدلہ تو وہ بھی اِن شاء اللہ اُنھیں بلاکم وکاست مل کر رہے گا۔ اُن کی وفات کی خبرِ وحشت اثر کے پھیلتے ہی ہزاروں معتقدین ومحبین کو ایسا صدمہ اور ایسا رنج پہنچا جسے قیدِ تحریر میں نہیں لایا جاسکتا۔ غم واندوہ کے مارے اُن کی حالت ایسی دگرگوں ہوگئی، جیسے کسی نے اُن کی متاعِ حیات چھین لی ہو؛ چناں چہ اُن کی وفات کی خبر ملتے ہی وہ ذکر واذکار، تلاوتِ قرآن ودعا اور اُن کی روح کو ثواب پہنچانے میں ہمہ تن مصروف ہوگئے اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی سعادت سے بہرہ یابی کے لیے، جنھیں بھی صحت اور

تندرستی، طاقت اور توانائی اور عزم و حوصلے کی دولتِ بے بہا ہم دست تھی، اُن سے بروقت جس طرح بھی بن پڑا، شہر ''ہردوئی'' کے لیے روانہ ہو گئے؛ تاکہ اگر موقع ملے تو وہ اُن کے جسدِ خاکی کا آخری دیدار کر سکیں۔ حال آں کہ نمازِ جنازہ کا مقررہ وقت ۹ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ = مطابق ۱۸ مئی ۲۰۰۵ء چہار شنبہ صبح نو بجے تھا، مگر مجمع کی کثرت کی وجہ سے پونے دس بجے ہی نمازِ جنازہ کی ادائیگی کی صورت نکل سکی۔ اُن کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے والے اور اُنھیں آخری آرام گاہ تک لے جانے کے سفر میں شامل ہونے والے علمائے دین نے بتایا کہ حاضرین کی اکثریت چیدہ لوگوں: علما، بزرگانِ دین، طالبانِ علوم دینیہ، دین داروں، پابندگانِ صوم وصلوۃ، احکامِ شرع پر چلنے والوں اور نیکو کاروں ہی پر مشتمل تھی۔ ہجوم کی کثرت کے باوجود مجمع اِنتہائی منظّم اور پُرسکون تھا، کوئی ایسی بد نظمی، انتشار اور افراتفری نظر نہیں آئی، جیسا کہ عام طور سے اِس قسم کے جمِ غفیر میں، جس میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ضرور دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُن کی نمازِ جنازہ محدث کبیر حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ (متوفی ۱۴۰۳=۱۹۸۲ء) — جو جنت البقیع مدینہ منورہ میں آسودۂ خواب ہیں — کے دست گرفتہ اور مرحوم کے دیرینہ رفیقِ کار، قاری ''امیر حسن'' نے پڑھائی۔

بیماری کے باوجود پابندیِ اوقات

سِن رسیدگی اور ہلکے پھُلکے امراض کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوارض کو اگر چھوڑ دیا جائے، جن سے ہر شخص دو چار رہتا ہے، تو مرحوم عموماً صحت مند اور بہت چست رہتے تھے، اپنے مقررہ کام پابندی سے بغیر کسی کوتاہی کے سر انجام دیتے تھے؛ لیکن تین سال قبل اُنھیں برین ہمبریج ہو گیا تھا، جس سے لکھنؤ اور ممبئی جیسے بڑے شہروں میں بروقت علاج معالجے اور گہری طبی نگہ داشت، ساتھ ہی اُن کے نیکو کار عقیدت مندوں اور محبّین علما، بزرگانِ دین، خصوصاً ہندوستان اور عموماً دنیا کے مختلف

خطوں سے تعلق رکھنے والوں کی سحر گاہی دعاؤں اور سب سے بڑھ کر توفیقِ خداوندی سے وہ بہت جلد شفایاب ہوگئے۔ اِس ناسازیِ طبع کی سنگینی کو پیشِ نظر رکھتے ہوے، اُنھیں ڈاکٹروں نے احتیاط وتحفظ برتنے کی صلاح دی تھی، مگر وہ عمر کے آخری ایام میں اُن کے صلاح ومشورے پر کار بند نہ رہ سکے، گویا اُنھیں یہ محسوس ہوگیا تھا کہ زندگی کے ایام گنے چُنے اور اُس کے لمحات محدود ہیں؛ لہٰذا وہ پہلے سے کہیں زیادہ جوش وجذبے کے ساتھ اِصلاح کے مشاغل، دعوتی اَسفار اور تربیتی سرگرمیوں میں لگ گئے۔ اُن کی حد درجہ بھاگ دوڑ — جس کی روبہ زوال صحت اجازت نہیں دیتی تھی — کی وجہ سے اُن کے محبّین ومخلصین اور رُفقاے کار کو اُن کے حوالے سے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی تھی کہ مبادا کوئی حادثہ پیش آجائے۔

مرحوم معمول کے مطابق منگل ۱۴۲۶/۴/۸ھ = ۲۰۰۵/۵/۱۷ء کو اپنی مجلس میں بعد نمازِ عصر تشریف رکھتے تھے کہ یکا یک بہت زیادہ بلغم آنے لگا۔ اس کے بعد کم زوری محسوس ہوئی، تو گھر چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دماغ کی رگ پھٹنے کی وجہ سے بلغم کی بجائے خون آنے لگا۔ بہ مشکل تمام مغرب کی نماز ادا کر پائے تھے کہ خون منھ اور ناک سے بھی بہنے لگا نتیجۃً سارا خون رگوں سے نکل کر باہر آگیا۔ فوراً ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا، جنھوں نے بہ جلد شہر ''ہردوئی'' کے ہسپتال میں اِنتہائی نگہ داشت والے یونٹ میں بھرتی کرانے کا مشورہ دیا۔ لیکن ابھی اُنھیں ایمبولینس میں سوار کرایا ہی تھا اور گاڑی مدرسے سے باہر بھی نہیں جانے پائی تھی کہ اُنھوں نے اپنی آخری سانس لی اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردیں۔

مرحوم کے پس ماندگان میں دو بھائی ہیں: ایک پاکستان میں رہتے ہیں اور دوسرے علی گڑھ میں۔ تین بھائی اور ایک بہن اُن کے حینِ حیات ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اُنھوں نے اپنے پیچھے نیک بیوی اور اولادِ جسمانی میں اکلوتی بیٹی چھوڑی ہے، جو طبِ یونانی کے ماہر حکیم جناب الحاج ''کلیم اللہ'' کی زوجیت میں ہیں، جنھیں اُن

کے تمام دعوتی، تربیتی اور تعلیمی اُمور کے حوالے سے، اُن کا جانشیں مُنتَخَب کیا گیا ہے۔
لڑکی کے بطن سے چھ اولاد: تین بیٹے (علیم الحق، فہیم الحق، سلیم الحق) اور تین ہی بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کو خدا نے ایک متقی، پرہیز گار اور نیک بخت لڑکے (اشرف الحق) سے بھی نوازا تھا، مگر عمر نے وفا نہ کی اور نوعمری (۲۸/سال کی عمر) ہی میں ۱۳۹۵ھ = ۱۹۷۵ء کو دارِ بقا کو سدھار گئے۔

مرحوم کے زیرِ نگرانی تزکیہ واِحسان وسلوک کی تربیت پانے والوں کی مجموعی تعداد ۱۳۹ ہے۔ اُن میں سے مجاز بیعت کی تعداد ۱۰۳ ہے، جب کہ مجازِ صحبت کی تعداد ۳۶ ہے۔

پہلی قسم کے خلفا دنیا کے مختلف ممالک میں اِحسان وسلوک کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ چناں چہ ہندوستان میں ۶۰، پاکستان میں ۶، برطانیہ میں ۱، امریکہ میں ۱، افریقہ میں ۳، سعودی عرب میں ۱۵ اور بنگلہ دیش میں ۳۷ خلفا موجود ہیں۔

نقوشِ حیات

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ نے ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ = مطابق ۲۰/ دسمبر ۱۹۲۰ء کو اتر پردیش کے شہر "ہردوئی" کے ایک دین دار گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ والد صاحب کا نام "محمود الحق" تھا، جو حضرت تھانویؒ کی بزمِ اِصلاح وتربیت کے نامور رکن (مجازِ صحبت) تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وکالت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ اُن کا شمار "ہردوئی" کے نامور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ اُن کا آبائی وطن "دہلی" کے نواح میں قصبہ "پلول" تھا؛ لیکن اُن کا خاندان پہلے شہر "میرٹھ" منتقل ہوا، پھر شہر "ہردوئی" میں مستقل سکونت پذیر ہوگیا۔ اُن کا سلسلۂ نسب ہندوستان کے مشہور محدث شیخ عبد الحق بن سیف الدین دہلویؒ (۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء — ۱۰۵۲/۱۶۴۲ء) سے جاملتا ہے؛ اِسی لیے اُن کے نام کے ساتھ "حقی" کا مشہور لاحقہ لگا ہوا ہے۔

اُن کے والد صاحب انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور وکالت کا پیشہ کرتے تھے؛ لیکن اُنھوں

نے خدائی فیصلہ کے مطابق — جس میں خیر ہی خیر ہوتا ہے — اپنے سعادت مند لڑکے کے لیے یہی پسند کیا کہ وہ ایک اچھا اور باصلاحیت عالمِ دین بنے۔ اُن کے سوانح نگاروں کا کہنا ہے کہ اُن کی تعلیم کی بسم اللہ دارالعلوم کے سابق اُستاذ اور خدارسیدہ بزرگ مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۴ء) نے کرائی۔ آٹھ سال کی عمر میں ہی تکمیلِ حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کرلی۔ اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم ''ہردوئی'' میں ''جمعیتِ اسلامیہ'' کے زیرِ انتظام چلنے والے مدرسے میں مولانا انوار احمد انبیٹھوی مظاہریؒ سے حاصل کی۔ یہ انجمن اُنھی کے والدِ محترم کی قائم کردہ تھی، جنھیں وکالت کے پیشے کی ڈھیر ساری مصروفیات کے باوجود، دینی اور رفاہی کاموں سے بے پناہ دل چسپی تھی، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ کم عمری میں ہی علومِ شرعیہ کی تحصیل میں ترقی کرتے چلے گئے۔ دس سال کی عمر میں وہ ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۱ء میں مدرسہ ''مظاہر علوم'' سہارنپور چلے گئے، جو ''دارالعلوم'' کے بعد برِّ صغیر کی دوسری سب سے بڑی اِسلامی درس گاہ ہے، وہاں داخل ہوکر ابتدائی عربی تعلیم کے حصول میں ہمہ تن منہمک ہوگئے۔

مثالی طالبِ علم

اُنھوں نے حصولِ تعلیم میں محنت اور لگن، ذکر و عبادت کی پابندی اور وقت کے صحیح استعمال کے حوالے سے، ایک مثالی طالبِ علم کے مطلوبہ معیار پر پورا اُترتے ہوے، ابتدائی سے لے کر اعلیٰ اور تخصصات تک کی تعلیم کے تمام مراحل بہ حسن و خوبی طے کیے۔ وقت کے کسی بھی لمحے اور وقفے کو اُنھوں نے رائیگاں نہ جانے دیا۔ وہ تہجد کی نماز کے طالبِ علمی کے زمانے میں بھی پابند تھے۔ مدرسہ ''مظاہر علوم'' کے زمانۂ طالب علمی میں وہ اپنے استاذ مولانا عبداللطیف صاحبؒ کے خادمِ خاص تھے، جو اُس وقت ''مظاہر علوم'' کے ناظم کے عہدے پر فائز تھے۔

اُنھوں نے تعلیمی سال ۱۳۵۵-۱۳۵۶ھ میں دورۂ حدیث شریف کا ششماہی

امتحان اول نمبر سے پاس کیا، جس سے خوش ہو کر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے، اُنھیں اپنے استاذ، محدثِ کبیر مولانا ''خلیل احمد سہارن پوری'' (جاے پیدایش نانوتہ: ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء جاے وفات مدینۂ منورہ: ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء) کی ابوداوٗد کی مایۂ ناز عربی شرح ''بذل المجہوٗد'' مکمل سیٹ اِنعام میں دی؛ لیکن وہ اچانک بہت زیادہ علیل ہو گئے، جس کی وجہ سے مذکورہ تعلیمی سال میں دورۂ حدیث کا سالانہ امتحان نہ دے سکے؛ چناں چہ تعلیمی سال: ۱۳۵۶-۱۳۵۷ھ میں اُن کا اِعادۂ سال ہو گیا اور ماضی ہی کی طرح ریکارڈ کام یابی درج کرتے ہوے اول نمبر سے سالانہ امتحان پاس کیا۔ آیندہ دونوں تعلیمی سال: ۱۳۵۶-۱۳۵۷ھ اور ۱۳۵۸-۱۳۵۹ھ مظاہر علوم ہی میں گزارے اور معقولات ومنقولات کی معرکۃ الآرا کتابوں میں گیرائی اور گہرائی حاصل کی اور دونوں سالانہ امتحانوں میں امتیازی نمبرات سے کام یاب ہوے۔ اُن کی بے پناہ علمی قابلیت، تعلیمی صلاحیت، ساتھ ہی صلاح وتقویٰ اور دین داری کی اِس شہادت سے زیادہ قوی اور مضبوط کوئی شہادت نہیں ہو سکتی، جس کا اِظہار فقہِ حنفی کی مستدل احادیث کی انسائیکلوپیڈیا ''اِعلاء السنن'' (۲۰ جلدوں) کے مصنف اور حضرت تھانویؒ کے بھانجے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی دیوبندی تھانویؒ (۱۳۱۰-۱۳۹۴ھ=۱۸۹۲-۱۹۷۴ء) نے کسی مدرسے کے مہتمم کے نام اِرسال کیے گئے اپنے ایک خط میں کیا تھا، جس کی توثیق حضرت تھانویؒ نے اپنے دست خط کے ذریعے یہ لکھتے ہوے کی تھی: ''بندۂ عاجز اشرف علی درجِ بالا مکتوب کی حرف بہ حرف توثیق کرتا ہے''۔ خط کے مندرجات درجِ ذیل تھے:

> ''میں مولوی اَبرار الحق سلمہ کو اچھی طرح جانتا ہوں، یہ انتہائی دین دار اور ذی استعداد عالم ہیں، اِن کی صلاحیت پر ''مظاہر علوم'' کے مدرسین اور ناظم صاحب کو ـــــ جہاں تک مجھے علم ہے ـــــ پورا اعتماد ہے۔ اِنھوں نے مظاہرِ علوم میں مقررہ تعلیمی نصاب کے مطابق انتہائی محنت اور لگن کے ساتھ علومِ شرعیہ کی

تحصیل کی ہے۔ ماشاءاللہ حافظِ قرآن اور قاری بھی ہیں۔ یہ تحصیلِ علم کے ساتھ ساتھ، تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ طلبہ اِن کے اُسلوبِ تدریس کے دل دادہ ہیں۔ یہ اپنے ہم عصروں سے تقویٰ، پرہیز گاری اور علم وعمل میں حددرجہ، بڑھے ہوے ہیں"۔ (ذکرِ اَبرار، ص:۱۵)

صلاحیت وقابلیت کا تعلق اخذ واکتساب سے ہے، اِس لیے یہ اسی وقت آسان اور ممکن ہوتا ہے، جب کہ معلم باکمال اور مطلوبہ صلاحیتوں کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ، صلاح وتقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ومستحکم تعلق سے بھی سرفراز ہو۔ حضرت مرحوم کو یہ سب کچھ اُس مدرسے میں بآسانی مُیَسَّر آیا، جو سربرآوردہ علما، نام ور محدثین اور بزرگانِ دین کے وجودِ مسعود سے بہرہ یاب تھا؛ چناں چہ آپؒ کے اساتذہ میں ناظمِ مدرسہ مولانا عبداللطیفؒ (متوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۴ء) صدر مدرس مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ (متوفی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا بن یحیٰ کاندھلویؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) مولانا منظور احمد خانؒ (متوفی ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء) مولانا اَسعد اللہ رام پوریؒ (متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۸ء) صدر مفتی: مفتی سعید احمدؒ (متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) مولانا ظریف احمدؒ (متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) مولانا عبدالجبار اعظمیؒ (متوفی ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۸ء) اور مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (متوفی ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء) جیسے بڑے بڑے علماے دین تھے۔

توفیقِ الٰہی کی ہم رکابی

فضلِ خداوندی اور اپنے والد بزرگ وار کی دعاؤں کے صدقے، ہمیشہ توفیقِ الٰہی اُن کے ہم رکاب رہی اور رُوزِ اول ہی سے علومِ شرعیہ میں پختگی اور مہارت کے ساتھ، تقویٰ وپرہیز گاری اور تعلق مع اللہ کی استواری میں ہمہ تن لگے رہے۔ چناں چہ وہ جہاں ایک طرف محنتی طالب علم تھے، وہیں دوسری طرف تہجد گزار اور پنج وقتہ نمازوں

کے پابند بھی تھے۔ اِسی محنت و لگن اور مجاہدے کو دیکھ کر، اُن کے استاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ نے بڑے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہا تھا:

''مولوی ابرار الحق'' کو خدا نے زمانۂ طالب علمی ہی میں اِحسان و سلوک اور اپنے ساتھ تعلق کی بے بہا نعمت سے نوازا ہے''۔(۱)

بعض مطالعہ کنندہ کو حضرت کی طالب علمی کے زمانے میں لکھے گئے چند نوٹ بک اور یادداشتیں ملی ہیں، جن میں وہ اپنا روز نامچہ مکمل پابندی کے ساتھ درج کیا کرتے تھے، حال آں کہ اُن کی عمر اُس وقت صرف ۱۳ سال تھی۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

''میں رات کو تہجد کے لیے بیدار ہوا۔ ناظم صاحب (مولانا عبد اللطیف) کے لیے وضو کا پانی لایا، پھر میں نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد اُن سے ''مختصر المعانی'' کا مقررہ سبق پڑھا اور دگر کتابوں کے اَسباق کی تیاری کی''۔

حضرت تھانویؒ کی دست گرفتگی

مظاہرِ علوم میں پڑھنے کے دوران ہی حضرت تھانویؒ سے وہ وابستہ ہو گئے۔ اُن کے گھر کا ماحول چوں کہ خالص علمی اور دینی تھا؛ اِس لیے بچپن ہی سے احکام الٰہی پر کار بند رہے۔ اُن کی نشو و نما دینی ماحول میں ہوئی تھی؛ اِس لیے صلاح و تقویٰ اُن کی فطرت بن گیا تھا۔ وہ ایام طالبِ علمی میں ہر ہفتے اپنے پیر و مرشد کی زیارت کے لیے ''تھانہ بھون'' جاتے، اُن کی تعلیمات و ہدایات سے رشد و ہدایت کا چراغ اپنے دل میں روشن کرتے، اپنے رب کی چوکھٹ پر جبینِ نیاز خم کرنے کا سلیقہ سیکھتے اور حضور ﷺ کی محبت سے محظوظ ہونے اور آپ ﷺ کی سچی پیروی کے راز و انداز کی معرفت حاصل کرتے تھے۔ وہ اپنی چھٹی کے سارے ایام اپنے شیخ کی خدمت ہی میں گزارتے اور

(۱) علمائے مظاہر علوم، ج:۱،ص:۴۸۸۔

وہاں رہ کر اپنے اندر شریعت کی روح کو جذب کرتے، اِخلاص کے معانی ومفاہیم کی آگاہی سے بہرہ ور ہوتے اور مکمل دین پر عمل کرنے کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ حضرت تھانویؒ اپنے مریدوں اور اپنے ہاں تربیت پانے والوں کی کڑی نگرانی کیا کرتے تھے؛ اِسی لیے وہ بیعت وخلافت اور تربیت وتزکیۂ باطن کی اِجازت صرف اُسی شخص کو دیا کرتے تھے، جس کو وہ مکمل راست روی، بھرپور دین داری اور زندگی کے تمام شعبوں میں امانت ودیانت کے مطلوبہ معیار پر، پورا اُترتا ہوا پاتے تھے۔ حضرت تھانویؒ نے اُنھیں سنہ ۱۳۶۱ھ/۱۹۴۲ء ہی میں اِجازت وخلافت کے اِعزاز سے سرفراز فرمادیا، جب کہ اُن کی عمر ۲۲ سال کی بھی نہ تھی۔ اِس سے اِس بات کا بھی بہ خوبی پتہ چلتا ہے کہ صلاح وتقویٰ اُن کے رگ وریشے میں پیوست تھا۔ شاید ہی کسی عالم کو اِس نوعمری میں بیعت وخلافت کی اِجازت حضرت تھانویؒ جیسے دقیق النظر شیخ سے ملی ہوگی۔ حضرت تھانویؒ کا کسی کو بیعت وخلافت کی اِجازت سے نوازنا، درحقیقت اِس بات کی پختہ دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ دین داری اور ظاہر وباطن کی پاکیزگی کے حوالے سے قابلِ اعتماد، مادیّت کے میل کچیل سے دُھلا ہوا اور ہوائے نفس کی آلودگیوں سے پاک صاف ہے۔ تاہم اِجازت ملنے کے بعد مولانا ابرار الحق صاحبؒ نے اپنے آپ پر اعتماد کیا اور نہ اپنے آپ کو اِصلاح وتزکیے سے بے نیاز تصور کیا؛ چناں چہ وہ حضرت تھانویؒ سے استفادہ کرنے اور اُن کے سامنے اپنا اَحوال پیش کرنے کے لیے، برابر اُن سے مراجعت کرتے رہے۔ اپنے خاص پیر ومرشد کے دنیا سے چلے جانے کے بعد، اُنھی کے ایک خلیفہ حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ (متوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) سے وابستہ رہے۔ اُن کے بھی دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد حضرتؒ کے دِگر خلفا: مولانا عبد الرحمٰن کامل پوریؒ (متوفی ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) مولانا عبد الغنی پھول پوریؒ (متوفی ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) سے تعلق قائم رکھا۔ جب یہ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، تو مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ

(متوفی ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء) اور دار العلوم کے مفتیِ اعظم حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ (متوفی ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۶ء) سے رابطہ رکھا۔

تدریسی خدمات

۱- مظاہرِ علوم سے فراغت اور علومِ عقلیہ ونقلیہ میں تخصصات کے شعبوں کے نصاب کی تکمیل کے بعد وہیں معین مدرس رکھ لیے گئے۔

۲- کچھ عرصے بعد، اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کے حکم پر اُنھی کے قائم کردہ مدرسہ ''جامع العلوم کان پور'' میں تقریباً، دو سال تک تدریس کے فرائض انجام دیے۔

۳- پھر اُنھی کے مشورے پر مدرسہ اسلامیہ فتح پور، ہنسوہ چلے گئے، جہاں دو سال تک تدریس کی خدمات انجام دی۔

۴- حضرت شیخ ہی کی ہدایت پر اپنے وطن ہردوئی میں ''اَشرف المدارس'' کے نام سے ۱۳۶۱ھ/ ۱۹۴۲ء میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی اور وقت کو صحیح مصرف میں خرچ کرتے ہوے، مسلم بچوں کی تعلیم وتربیت، اُن میں دین کی صحیح تخم ریزی اور مادیّت کے سیلابِ بلاخیز میں بہ جانے سے بچاؤ کے عظیم مقصد سے، اِنتہائی فروتنی وانکساری اور جاں فشانی کے ساتھ، عرصۂ دراز تک تنہا ہی مقررہ درسی کتابوں کی تدریس کی ذمے داری، سرانجام دیتے رہے۔

دینی ودعوتی وتربیتی خدمات اور کارنامے

اُنھوں نے ۱۳۷۰ھ/ ۱۹۵۰ء میں اپنے پیر ومرشد حضرت تھانویؒ کی قائم کردہ ''مجلس دعوۃ الحق'' میں از سرِ نو جان ڈالی۔ اِس مجلس کا مقصد تھا: بدعات وخرافات کو بیخ وبن سے اُکھاڑ پھینکنا، مسلم معاشرے میں صلاح وتقویٰ کی روح پھونکنا، اُسے غیر اسلامی رسم ورواج کی آلایشوں سے پاک صاف کرنا، تعلیمی پس ماندگی کے خاتمے، مسلم بچوں

میں تعلیمی بے داری لانے اور اُنھیں دین کی اُن بنیادی تعلیمات سے واقف کرانے کے لیے، بڑے پیمانے پر مہم چلانا، جن کے بغیر اُن کا مسلمان رہنا ممکن نہیں، نیز دینی مکاتب قائم کرنا، دعوتی پروگرام اور اجتماع منعقد کرنا اور اُس کی وساطت سے بڑوں اور چھوٹوں کو دین حاصل کرنے اور اُس پر عمل کرنے کی راہ پر لگانا۔ چوں کہ حضرت تھانویؒ کی وفات کے بعد یہ مجلس بے جان ہو کر رہ گئی تھی؛ اِس لیے اُنھوں نے اِس کا ازسرِ نو آغاز کیا اور ملک اور بیرونِ ملک میں اِس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے انتھک کوشش کی؛ چناں چہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اثرات ہندوستان سے تجاوز کر کے افریقہ، یورپی ممالک، امریکا، عرب ممالک اور پاکستان و بنگلہ دیش پہنچ گئے، جہاں آپؒ بار بار تشریف لے گئے اور جہاں کے مسلمان تربیت وتزکیے کے تعلق سے آپؒ سے وابستہ ہوے۔ حضرتؒ نے اپنی زندگی میں صحت وتجوید کے ساتھ قرآنِ کریم اور دین کی بنیادی باتوں کی تعلیم کے لیے ۹۶ مکاتب قائم کیے، جو ضلع ''ہردوئی'' کے اَطراف اور دگر ریاستوں میں پھیلے ہوے ہیں۔ نیز اِن مکاتب کے طرز پر جنوبی افریقہ، برطانیہ، امریکا اور بنگلہ دیش وغیرہ میں بھی مکاتب کا قیام عمل میں آیا، جہاں کے مسلمانوں کی بڑی تعداد، آپؒ کی دست گرفتہ ہے اور آپ کی صحبت وتربیت سے فیض یاب ہوتی رہی ہے۔

چندہ کے سلسلے میں اُن کا مسلک

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ نے، مکاتب اور اپنے مدرسے ''اشرف المدارس'' میں عوامی چندوں پر تکیہ کرنے، پیشے کے طور پر چندہ اکٹھا کرنے اور اُس کو کمائی کا ذریعہ بنالینے سے مکمل گریز کرنے کے حوالے سے، اپنے شیخ حضرت تھانویؒ کے ہی اُصول اور طریقۂ کار پر عمل کیا؛ چناں چہ اُنھوں نے اپنے مدرسے اور مکاتب کی بنیاد ہی مال داروں کی کاسہ لیسی سے بالکلیہ احتراز پر رکھی؛ اِسی لیے اُنھوں نے ''چٹکی'' کا انوکھا اور مثالی نظام قائم کیا اور مسلم عورتوں سے یہ اپیل کی

کہ وہ تینوں وقت: صبح، دوپہر اور شام آٹا اور چاول میں سے بہ قدر چٹکی نکال لیا کریں کہ اہلِ خانہ کی خوراک میں کمی نہ ہو اور اُسے کسی برتن میں جمع کر کے مکاتب میں زیرِ تعلیم چھوٹے بچوں کے ہاتھ بھجوادیں۔

لیکن وہ اُن لوگوں کے چندے کو خندہ پیشانی سے قبول کیا کرتے تھے، جو انتہائی مخلص ہوتے تھے، شہرت و نام وری سے دور اور صرف آخرت کے اجر و ثواب کے طلب گار ہوتے تھے۔ مولاناؒ اپنے آدمیوں کو، اپنے مدرسے یا مکاتب کی اِمداد کے لیے کسی طرح کے اِشارے سے بھی کلی اجتناب کا حکم دیا کرتے تھے۔ اِس لیے کہ وہ اپنے پیر و مرشد حضرت تھانویؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوے اِس بات پر مکمل ایمان رکھتے تھے کہ علما، دعاۃ اور مذہبی لوگوں کا بہ ذاتِ خود چندہ کرنا اور اِس کے لیے مال داروں اور تاجروں کی خوشامد کرنا، اُن کے وقار کو جراحت پہنچاتا اور اُن کی حیثیت و وقعت کو خاک میں ملا دیتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ کوئی مال دار یا تاجر اُن کی زیارت کے لیے آتا، تو وہ اُن کے ساتھ اپنے مدرسے ''اشرف المدارس'' یا کسی مکتب کا گشت نہیں کرتے تھے؛ لیکن علماے دین، صوفیاے کرام اور نیکو کاروں کو از خود مدرسہ اور مکاتب گھوم پھر کر دکھایا کرتے تھے، جن کا آپؒ کے پاس آنا جانا لگا رہتا تھا؛ تا کہ آپؒ سے شرفِ ملاقات کے علاوہ مسلمانوں کے نونہالوں اور نسلِ نو کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے، آپؒ کے ہاں معمول بہ جن طریقہ ہائے تعلیم و تربیت کو صالح، نفع بخش اور کارآمد پائیں، اُنھیں اپنا کر اپنے ہاں کے مدارس و مکاتب میں نافذ کریں اور وہاں کے نافذ العمل طریقۂ تعلیم و تربیت میں کسی اِصلاح یا تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں، تو اپنے تأثُّراتِ میں اِظہار کریں؛ تا کہ اس کی اِصلاح کی جا سکے، جیسا کہ وہ خود اِس کا تاکیدی حکم دیتے تھے۔

سنن نبویہ کا اِحیا

جو چیز اُنھیں معاصر علما سے ممتاز کرتی تھی، وہ اُن کا سنن نبویہؐ کے اِحیا کا حد درجہ

اہتمام، لگن اور تڑپ تھی۔ اِسی وجہ سے اُنھیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں ''محی السنہ'' کے لقب سے جانا جاتا تھا؛ چناں چہ وہ خود بھی زندگی کے تمام شعبوں: چلنے، پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، آرایش وزیبایش، پوشاک ولباس، گھر اور مسجد، خلوت وجلوت، صبح وشام، لوگوں سے ملاقات وزیارت، مریض کی عیادت وغیرہ اور عبادات ومعاملات سے لے کر اجتماعی اور انفرادی زندگی میں اتباعِ سنت کے پابند تھے اور اپنے رفقا اور واردین وصادرین کو بھی اِس کا پابند بناتے اور اُن سنتوں کی قدر وقیمت کا دھیان دلاتے، جنھیں معمولی سمجھ کر عوام خاطر میں نہیں لاتے۔ اپنے خطبات، پند ونصائح، مجلسی گفتگو، نیز سفر وحضر میں اور اپنی تحریروں، پمفلٹ، ہینڈبل وغیرہ کے توسط سے اس طرف اُن کی توجہ مبذول کراتے تھے۔ حضرت اپنے مصاحبین وخدام کے تعاون سے خود اِن چیزوں کی تیاری میں دل چسپی لیتے اور اپنی قیام گاہ ہردوئی یا دعوتی اور اِصلاحی دوروں میں مختلف مقامات پر اپنے ملاقاتیوں میں اِنھیں تقسیم کرتے تھے۔

ماہِ شعبان ۱۴۲۳ھ = ۲۰۰۲ء کو راقم السطور کا ممبئی جانا ہوا اور وہاں کے بعض ہسپتالوں میں شکر کے مرض اور اِس سے پیدا ہونے والے خطرناک عوارض کے علاج کے سلسلے میں، پورا ایک مہینہ وہاں قیام رہا۔ اِس دوران میری ملاقات کو بہت سے پُرانے اہلِ تعلق اور اُن کے محبین ومتعارفین آتے رہے، جنھیں وہاں میری موجودگی کا علم ہوا۔ اُن میں سے اکثر لوگ مولانا شاہ ابرارالحق صاحبؒ کے علاج کے لیے، ممبئی تشریف لانے کا تذکرہ کرتے تھے؛ کیوں کہ حضرتؒ وہاں میرے پہنچنے سے کچھ ہی دنوں پہلے، واپس تشریف لے گئے تھے۔ میری عیادت کو آنے والے، اکثر لوگ نہایت لذّت اور تأثر کے ساتھ بعض ہسپتالوں میں علاج معالجے کے دوران، اُن کی عیادت کرنے والے اہالیانِ شہر کے قلوب پر اُن کی مختصر صحبت کی اثر انگیزی کو بیان کرتے تھے، اُنھوں نے بتایا کہ بہت سے چھوٹوں اور بڑوں نے، مریض کی عیادت ودعا کے تعلق سے حضور ﷺ سے منقول دعائیں یاد کرلیں؛ بل کہ وہ لوگ میری عیادت کے وقت بھی وہی

دعائیں پڑھتے تھے۔ اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ

"حضرتؒ کے مبارک اَسفار اور وقتاً فوقتاً ہمارے درمیان اُن کی مختصر یا طویل اِقامت سے ہمیں بے پناہ فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ سنتوں کے سیکھنے، اُن کی تکرار اور ہر موقع سے اُن پر بغیر کسی اکتاہٹ کے عمل کرنے کی عادت ڈال لینے کا زریں موقع ہوتا ہے؛ اِس لیے کہ حضرت ہمیں اُن کی تعلیم اس طرح دل آویز انداز میں دیا کرتے ہیں کہ وہ کسی پر گراں نہیں گزرتا اور سنتیں معمول کی زندگی کا جزو بن جاتی ہیں"۔

مُنکَر پر نکیر

آپ کو ایسے بہت سے عالمِ دین اور داعی آسانی سے مل جائیں گے، جو اَمر بالمعروف کرتے اور خیر کی دعوت دیتے ہیں؛ لیکن منکر پر نکیر کرنے والے شاذ و نادر ہی ملیں گے۔ دعوتی میدان کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ امر بالمعروف داعیوں کے لیے، نہیں عن المنکر سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ چوں کہ امر بالمعروف ایک مُثبت عمل ہے، جو آمر پر گراں بار ہوتا ہے، نہ مامور پر اور نہ ہی یہ عموماً، مامور کی طرف سے آمر کے خلاف کسی سرکشی، روگردانی، یا منفی ردِ عمل کا سبب بنتا ہے؛ لیکن نہی عن المنکر دونوں ہی فریق کے لیے یکساں دشوار گزار ہے؛ اِس لیے کہ نہی عن المنکر کرنے والے شخص کو، مُخاطَب کی جانب سے اکثر و بیشتر، روگردانی، اِعراض، بغض و عداوت اور منفی ردِ عمل کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ ایسا اِس لیے ہوتا ہے کہ اَمر بالمعروف ایسا ہے، جیسے مامور کو کسی بخشش یا عطیہ سے نوازنا اور نہی عن المنکر ایسا ہے، جیسے مُخاطَب سے اُس کی کوئی محبوب اور عزیز ترین چیز چھین لینا اور کسی بھی انسان پر یہ بات ناقابلِ برداشت حد تک گراں گزرتی ہے کہ مفت میں اُسے اپنی مملوکہ چیز سے ہاتھ دھونا پڑے۔ امر بالمعروف کی بہ نسبت نہی عن المنکر کا دشوار عمل ہونا، اِس بات سے بھی عیاں ہے کہ نبی ﷺ نے عزم و حوصلے اور جرأت و استقامت کے لحاظ سے نہی عن المنکر کرنے والے کی تین قسمیں بتائی ہیں، فرمایا: "جو شخص کسی منکر کو دیکھے، تو

وہ اُس کا اولاً اپنے ہاتھ سے اِزالہ کرے، اگر اِس کی استطاعت نہ رکھے تو اپنی زبان سے اُس کے اِزالے کی کوشش کرے اور اگر اِس کی بھی استطاعت نہ رکھے تو دل میں اُس کو برا سمجھے۔ یہ ایمان کا سب سے کم تر درجہ ہے" (مسلم) لیکن آپ ﷺ نے امر بالمعروف کرنے والے کی تین قسمیں نہیں بتائیں۔ گویا کہ نہی عن المنکر کرنے والا صرف اِیمان کے اعلیٰ درجے کا حامل نہیں ہوتا؛ بل کہ وہ اَقویٰ، اَضعف اور اَوسط میں سے کسی درجے کا حامل ہوتا ہے۔

مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے، جو دین کے معاملے میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں نہیں لاتے اور برائیوں کا جو کوئی بھی ارتکاب کرتا بے چین ہوجاتے اور اُس پر نکیر کیے بغیر نہ رہتے۔ وہ اِس سلسلے میں حکمت و مصلحت، حالات کی رعایت اور نہی عن المنکر کے عظیم فریضے کی انجام دہی میں دانش مندانہ آہستہ روی کے ساتھ، جرأت مندی سے بھی کام لیتے تھے؛ اِس لیے کہ وہ حضرت تھانویؒ کی تربیت گاہ کے تربیت یافتہ تھے، جو "حکیم الامت" کے لقب سے پوری دنیا میں اِسی وجہ سے مشہور ہوے کہ وہ دینی احکام کے دونوں شعبوں: اوامر و نواہی میں ایسی حکمت اور دانش مندی سے بھرپور طور پر کام لیا کرتے تھے، جس پر قرآن و حدیث نے بے انتہا زور دیا ہے۔

مرحوم نے مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی بہت ساری غلطیوں کی اِصلاح کی اور اخلاق و آداب، عبادات و معاملات، حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے، اِسلامی اَحکام سے ناواقفیت یا برادرانِ وطن کے ساتھ بود و باش کے نتیجے میں جو خرابیاں معاشرے میں در آئی ہیں، اُن کا بڑے حکیمانہ انداز میں اِزالہ کیا؛ چناں چہ وہ بے حیائی و بے حجابی کی تمام شکلوں، ٹخنوں سے نیچے لباس پہننے، داڑھی مونڈوانے، یا مشت بھر سے کم داڑھی کو ترشوانے، تصویر کشی، غیبت، چغل خوری، بے ہودہ گوئی، اجنبی عورت پر نظر ڈالنے، کسی پر بُری نگاہ ڈالنے، مال میں اِسراف اور فضول خرچی، خوشی و مسرت کی تقریبات خصوصاً شادی بیاہ اور موت میں غیر اِسلامی رسومات؛ والدین کی نافرمانی، رشتہ داروں سے بدسلوکی اور اُن

سے قطع تعلق، ٹیلی وژن دیکھنے، سنیما بینی اور اس کے علاوہ جتنی برائیوں کے جراثیم مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں سرایت کر گئے تھے؛ اُن سب سے روکا کرتے تھے۔

منکر پر نکیر کے تعلق سے مرحوم کا دور دور تک شہرہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے سامنے منکرات کے دائرے میں آنے والے کسی بھی عمل کے ارتکاب کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی اور وہ اُن کی نکیر سے پہلے ہی اُس سے رک جاتا تھا۔

قرآنِ کریم کی تصحیح و تجوید کا غیر معمولی اہتمام

قرآن کریم کو اُس کے حروف کی صحیح ادائگی: یعنی تجوید و قراءت کے قواعد کی مکمل رعایت کرتے ہوئے پڑھانے کو، اُنھوں نے اپنے تدریسی سفر کے آغاز سے ہی؛ اپنا مشن بنالیا تھا، اُنھوں نے اِس مشن کو بڑے پیمانے پر برپا کیا اور اِس بات کا پختہ عہد کرلیا کہ وہ آخر دم تک اپنے کو اِس راہ سے الگ نہیں کریں گے؛ چناں چہ اُنھوں نے اور اُن کے مدرسین نے صرف مجلس ''دعوۃ الحق'' کے ماتحت چلنے والے مکاتب میں قرآن کی تعلیم کو محدود نہیں رکھا؛ بل کہ اِس شعور کو عامۃ المسلمین میں بیدار کیا اور اُنھیں یہ نصیحت کی کہ وہ اِس اہم کام کے لیے اپنی اپنی مسجدوں میں فجر کی نماز کے بعد دس یا پندرہ منٹ فارغ کریں؛ تاکہ ائمہ کم از کم ایک آدھ آیت کے حروف کے مخارج کی تصحیح کرادیا کریں۔ بسا اَوقات وہ بنفسِ نفیس اِس عظیم اور مہتم بالشان کام میں شریک ہوتے اور مسلم عوام وخواص کو اِس کی قدر وقیمت کی طرف توجہ دلاتے۔ اُنھوں نے اِس اہم کام کے لیے تجوید وقراءت کے بنیادی قواعد پر مشتمل متعدد رسالے بھی ترتیب دیے اور مکاتب کے مدرسین کو یہ حکم دیا کہ وہ اُن قواعد کو چھوٹے بچوں کو حفظ کرائیں اور قرآن کی تعلیم میں اِس کا نفاذ کریں۔ مرحوم اِس مقصد سے وقتاً فوقتاً تربیتی اِجلاس بھی منعقد کرتے تھے، جس میں مدرسہ اشرف المدارس اور ''ہردوئی'' کے دگر مکاتب میں کام کرنے والے اساتذہ، اِجلاس میں ملک بھر سے آنے والے مندوبین کو ٹریننگ دیا کرتے تھے۔

حضرتؒ کی اِس تحریک نے — جس سے وہ مرتے دم تک لگے رہے — ملک بھر میں پھیلے مدارس ومکاتب میں ہمہ گیر اثر چھوڑا، جس کی بازگشت سے بیرونِ ہند کے مدارس ومکاتب کے بام ودر بھی گونج اٹھے؛ چناں چہ عصرِ حاضر میں قرآنِ کریم کو صحتِ حروف اور قواعدِ تجوید کے ساتھ پڑھنا پڑھانا محبوب مشغلہ بن گیا ہے اور عامۃ الناس بھی، اِس سے کافی حد تک دلچسپی لینے لگے ہیں؛ بل کہ اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ ایسا عالمِ دین جو تجوید کے قواعد سے نا آشنا ہو، حلقۂ مدارس میں ''اچھوت'' یا ''اچھوت جیسا'' محسوس ہونے لگا ہے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں ایسا مسرت بخش ماحول نہیں تھا، اُس زمانے میں اکثر علماے دین، قرآن کریم کو عجمی لب ولہجے میں پڑھا کرتے تھے، جس کو عربیّت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ میں اور میرے ہم درس وہم عصر اُن کی قراءت میں درآنے والی خرابیوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوے کہا کرتے تھے: ''فلاں شخص قرآن کو اردو میں پڑھتا ہے''۔ اب جب کہ ہم اپنی عمر کے چھٹے دہے میں ہیں تو ہماری نسلِ نو، خدا کا شکر واحسان ہے کہ قرآنِ کریم کو قواعدِ تجوید کے بھرپور لحاظ کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں بے پناہ دلچسپی کا مظاہرہ کررہی ہے، جو ہماری طالب علمی کے زمانے میں ناپید تھی۔ اِس خوش گوار تبدیلی میں جہاں بہت سے اسباب دخل ہے، وہاں بنیادی دخل حضرت مولانا شاہ ابرار الحقؒ کی تحریک ودعوت کا ہے۔

اذان واِقامت کی تصحیح کا اہتمام

تصحیحِ قرآن کے ساتھ، مرحوم اذان واقامت کی تصحیح کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ اِسلام کے اِن دونوں اہم ارکان سے ہمارے برِصغیر کے عوام اور بعض خواص بھی - اللہ اُنھیں ہدایت دے - یہ تصور کرتے ہوے غفلت وبے اعتنائی اور سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ بھلا اذان واِقامت بھی کوئی ایسی چیز ہے، جس پر توجّہ دی جائے۔ اِسی وجہ سے وہ لوگ اپنی مسجدوں میں ایسے مؤذنوں کا تقرر کرتے ہیں، جنھیں اذان دینے اور

اذان واِقامت کے کلمات کی ادائیگی کا کوئی شعور نہیں ہوتا، عام طور پر وہ بھونڈی آواز اور مکروہ لب و لہجے والے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے ایامِ طفولت میں سنا تھا کہ ایک عیسائی کو اِسلام کے غیر جانب دار مطالعے اور اُس کی حقیقت سے جان کاری کے بعد اسلام لانے کی توفیق ہوئی۔ اتفاق سے اس نے برِصغیر کے بعض ممالک کا دورہ کیا۔ جیسے ہی اُس نے اذان دیتے وقت مؤذنوں کی بھدی اور بے مزہ آواز سُنی، اُس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ اتار پھینکا اور کہنے لگا: میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمان، دینِ اسلام کے سب سے بڑے شعار کی ادائیگی کے لیے اِس قسم کی بھونڈی اور مکروہ آواز سے بُلاتے ہوں گے۔

بہ ہر کیف اُنھوں نے اذان واِقامت کے حوالے سے، مسلمانوں کی حد درجہ غفلت شعاری کا اِدارک کرلیا اور ان دونوں کی اِصلاح کو اپنے دعوتی مشن کا ایک اہم حصہ بنالیا، جس سے وہ جیتے جی دست بردار نہ ہوئے؛ چناں چہ وہ صرف ان دونوں کے حروف وکلمات کی تصحیح پر ہی اکتفا نہ کرتے؛ بل کہ مدّات کی درستگی، درازگیٔ الف، خصوصاً لفظ ''اللہ'' کے درمیانی الف کو کھینچنے وغیرہ سے منع کرنے پر بھی اپنی توجُّہات مرکوز رکھا کرتے تھے۔ مؤذنین، ائمہ اور طلبہ کو اذان واِقامت کے الفاظ خود سکھاتے تھے، قراءت میں تجوید کے قواعد اور ترتیل کے اُصولوں کی ماہرانہ رعایت کرتے تھے۔ چوں کہ اذان واِقامت، مذہبِ اِسلام کے سب سے بڑے رکن میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ بنابریں دروازہ کو بھی اِتنا خوب صورت اور شان دار ہونا چاہیے؛ تا کہ اندر کی عمارت کی خوب صورتی کا پتہ دے؛ اِس لیے وہ مسلمانوں میں اذان واِقامت کی اہمیت کے شعور کی بیداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے تھے۔

تصحیح نماز کی تحریک ودعوت اور اِس کے لیے سرگرمیِ پیہم

نماز اِسلام کے چاروں ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے، وہ کفر واِیمان کے

مابین واضح حد فاصل ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہ قول اس کی مذہبِ اسلام میں اتنی اہمیت ہے کہ جس نے اُسے ضائع کردیا، وہ دگر ارکان کو بہ درجہ اَولیٰ ضائع کردے گا؛ اِسی لیے حضرت شاہ ابرار الحق صاحبؒ نماز کو فرائض وسنن اور مستحبات کے مضبوط سانچے میں ڈھال کر ادا کرنے کی دعوت دیتے تھے؛ تاکہ ادائیگی میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اُنھوں نے یہ اِدراک کرلیا تھا کہ مسلمان عموماً نماز چھوڑ دیتے ہیں اور اِس کی پابندی نہیں کرتے اور جو مسلمان اِس حوالے سے باتوفیق واقع ہوا ہے، وہ اس کی کما حقّہٗ ادائیگی میں کوتاہی برتتا ہے اور سنن ومستحبات کو جانے دیجیے، وہ فرائض وواجبات کے ساتھ بھی نماز ادا نہیں کرتا؛ چناں چہ اُنھوں نے نماز کو اُس کے تمام ارکان: فرائض وسنن اور مستحبات کی رعایت کے ساتھ ادا کرنے کی مسلمانوں کو ٹریننگ دینے کا اہتمام کیا۔ وہ اِس بات کے لیے بے تاب رہا کرتے تھے کہ ہماری نمازیں آپ ﷺ کی نماز جیسی ہوں۔ اِسی غرض سے اُنھوں نے متعدد چارٹ تیار کیے، جن میں فرائض وسنن اور نماز کے تمام ارکان درج ہوتے، جس کو وہ اپنے ہاں آنے جانے والوں کے توسط سے عام کیا کرتے تھے، اُن ارکان اور سنن ومستحبات کو یاد کرنے اور نماز کی ادائیگی کے دوران اُس پر عمل کرنے پر زور دیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی خانقاہ اور اپنے مدرسے میں نماز کو اُس کے تمام آداب کی رعایت کے ساتھ ادائیگی کی عملی ٹریننگ کے لیے، ایک مضبوط نظامِ کار وضع کررکھا تھا، جس کی تنفیذ نمازِ فجر کے فوراً بعد عمل میں آتی تھی؛ چناں چہ ہر طالبِ علم، ہر مدرس اور اُن کی خانقاہ میں زیرِ تربیت ہر شخص، نماز اِس طرح ادا کرتا تھا، جو سنتِ نبویؐ سے قریب تر ہوتی تھی۔ مرحوم، سفر وحضر میں بھی اِس کا بھرپور خیال رکھتے اور ہندو بیرونِ ہند جہاں بھی قیام فرماتے، مسلمانوں کو اس کا پابند بناتے تھے۔

دعوتی و دینی رسائل اور کتابیں

مرحوم نے مختلف اِسلامی موضوعات پر پچیس (۲۵) سے زائد کتابیں اور رسالے

لکھے اور اُن کی اِشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ تمام کتابیں اور رسائل دین کی طرف امتِ مسلمہ کی بازگشت کی دعوت، مسلمانوں میں در آنے والی برائیوں کی اِصلاح اور اُمت کی کجی و بے راہ روی کو درست کرنے کی فکر جیسے بنیادی اور اہم موضوعات پر مشتمل ہیں؛ چناں چہ وہ زندگی بھر اِسی غم میں گھلتے اور پگھلتے رہے، اُمت کے ہر فرد کے اِصلاح کی فکر اُن کے اندر اِس طرح پیوست ہو چکی تھی کہ رات اور دن کے کسی بھی لمحے اور وقفے میں اُنھیں سکون مُیَسَّر نہ آتا۔ آپؒ کی تقریر و تحریر، دورے و اسفار اور مجلسی گفتگو کا محور، یہی رفیع الشان اور عالی قدر مقصد ہوتا، یعنی امتِ مسلمہ کے بنیادی دینی و عقائدی ڈھانچے کو پاش پاش کر دینے والی مہلک بیماریوں کا علاج، جس کے نتیجے میں وہ اِس طرح بے راہ روی کا شکار ہو گئی ہے کہ وہ اپنے اندر، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور خالقِ کائنات پر اِیمان رکھنے والی امت کی طرح اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت نہیں پاتی۔ وہ اپنے آپ پر بھی توجُّہ نہیں دے پا رہی ہے چہ جائے کہ وہ دوسروں کی خبر گیری، اِنسانوں کو بندوں کی عبادت کی تاریکی سے خدائے واحد کی عبادت کی روشنی میں، دنیا کی تنگی سے اُس کی کشادگی میں اور دگر مذاہب و ادیان کے ظلم و جور سے اسلام کے عدل و اِنصاف کی طرف لانے کی فکر کرے۔ جو اپنے آپ کو فراموش کر دے، وہ بھلا کس طرح دوسروں کی خبر گیری کرے گا؛ اِسی لیے امتِ مسلمہ کو اپنی اِصلاح کی ذمے داری کی سطح پر لانا، تا کہ وہ دوسروں کی اِصلاح کی اہل ہو جائے اور اپنے رب کی جنت میں داخلے اور اجر و ثواب کی مستحق ہو جائے؛ یہی کچھ زندگی بھر اُن کا اوڑھنا بچھونا رہا؛ چناں چہ وہ ہر صغیرہ و کبیرہ گناہ کی طرف مسلمانوں کی توجُّہ مبذول کراتے تھے، جس کی اِصلاح، تصحیح اور تبدیلی ضروری ہوتی۔

مرحوم کی یہ عادت تھی کہ وہ جن برائیوں میں لوگوں کا ابتلائے عام دیکھتے، اُن کے علاج کے لیے ناگزیر موضوعات پر کتاب اور رسالہ تیار کرتے، پھر اُس کی اِشاعت اور بڑے پیمانے پر عام کرنے کا حکم دیتے، جہاں بھی وارد ہوتے، اُنھی موضوعات پر گفتگو کرتے اور اپنے رفقا، ہم نشینوں اور ملاقاتیوں کو اِس جانب متوجّہ کرتے۔ کہنا

چاہیے کہ کسی بھی بیماری سے کوئی مسلمان دوچار ہوتا، تو وہ یہ تصور کرتے کہ یہ بیماری مجھے آ لگی ہے؛ اِسی لیے اُنھوں نے دوسروں کے غم کو اپنا غم اور دوسروں کو خرافات وبلیات کی آمیزشوں سے پاک کرنے کو، اپنے آپ کو اُن سے پاک کرنا بنالیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے سچے اور حقیقی وارثوں میں تھے۔

اُن کے پیر ومرشد حضرت مولانا تھانویؒ، فنِ تربیت اور علمِ تزکیۂ نفس کے گوہر نایاب تھے؛ اِسی لیے وہ اُن کی کتابوں میں سے جن باتوں کو اپنے ہم عصروں اور نسلِ نو کی اِصلاح کے لیے ضروری سمجھتے، اُن کا انتخاب کرکے رسالوں اور لٹریچروں کی شکل میں زود فہم اور آسان اُسلوب میں، کتابت وطباعت کی رنگینی اور چمک دمک سے بالکلیہ اجتناب کرتے ہوے، انتہائی سادہ انداز میں الگ سے شائع کراتے تھے۔ اُن کے بعض فیض یافتگان نے اُن کی مجلسی گفتگو کو، کئی جلدوں میں ''مجالسِ ابرار'' کے نام سے یک جا کرکے پاکستان میں شائع کرایا ہے، جس کو کماحقُّہ شوق ورغبت کے ساتھ لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ یہ اُن اَمراض کے لیے شفا بخش نسخہ ہے، جن سے آج امتِ مسلمہ دوچار ہے۔

امتیازی اوصاف

پابندیِ اوقات

اوقات کی پابندی اُن کی شخصیت کی شناخت تھی، جسے اُنھوں نے اپنے مربی حضرت تھانویؒ سے اخذ کیا تھا، جن کے ہاں ہر وقت کے لیے کام اور ہر کام کے لیے ایک متعین وقت ہوا کرتا تھا، جس میں وہ کسی بھی حالت میں خلل اندازی گوارا نہ کرتے تھے اور اپنے رفقا کو بھی اِس کا سختی سے پابند بناتے تھے؛ اِسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے پیچھے نادر ونایاب کتابوں سے بھرا پُرا ایک زبردست کتب خانہ چھوڑا۔ حضرت تھانویؒ،

اُمتِ محمدیہؐ کے کثیر التالیف علما میں تھے۔ ان کے تمام دست گرفتہ بھی توفیقِ خداوندی سے، وقت کے بڑے پابند واقع ہوے؛ چناں چہ وہ زندگی کے کسی بھی لمحے کو بے مقصد اور رایگاں جانے نہ دیتے تھے۔ مولانا ''ابرار الحق صاحبؒ'' بھی اُسی دانا مربی یعنی حضرت تھانویؒ کی تربیت گاہ کے فُضلا میں تھے؛ اِسی لیے وہ اِس صفت میں اور اِس کے علاوہ دگر صفات میں بھی اُن کی ٹو کاپی کہے جاسکتے تھے۔

اوقات کا پابند آدمی، خود بھی مشقت و پریشانی سے محفوظ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اِس سے بچاتا ہے، وعدہ خلافی کرتا ہے اور نہ مقررہ اَوقات کی خلاف ورزی۔ ہر کام وقت پر کرتا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادایگی کا پورا پورا اہتمام کرتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں ڈھیر سارے کام کرلیتا ہے۔ وہ چوں کہ اپنے اوقات کی حفاظت کرتا ہے؛ اِسی لیے دوسروں کے اوقات کی بھی پاس داری کرتا ہے، اپنے وقت کو بے جا اِسراف سے بچانے کا رسیا ہوتا ہے؛ اِسی لیے وہ دوسروں کے اوقات کے عظیم سرمایے کی قدر کرنا بھی جانتا ہے؛ لیکن جو لوگ وقت کے اِستعمال کے حوالے سے بے ہنگم واقع ہوے ہیں، اُنھیں مذکورہ بالا اُمور سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی؛ اِسی لیے اُن کے کارنامے تھوڑے، اُن کی اِفادیت کا سرمایہ نا کے برابر اور اُن کی کارکردگی اور تخلیقی عمل کی مقدار تھوڑی اور معمولی ہوتی ہے، وہ اپنے لیے بھی باعثِ اذیت ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی، وہ اپنے اوقات کا خون کرتے ہی ہیں؛ اِس لیے دوسروں کے اوقات کے، اپنے اوقات سے بھی زیادہ بے قدرے ہوتے ہیں۔ مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ وقت کے بڑے پابند تھے، یہ کبھی نہ سُنا گیا کہ اُنھوں نے اپنے وقت کا کوئی منٹ؛ بل کہ سکنڈ بے کار اور رایگاں جانے دیا ہو۔

نظم و نسق پر کار بندی

اِسی کے ساتھ حضرتؒ، زندگی کے ہر گوشے میں نظم و نسق کو پسند کرتے تھے،

بدنظمی، بے اُصولی اور انتشار سے اُن کا دل دکھتا تھا۔ یعنی وہ حد درجہ اُصول پسند تھے، وہ خود بھی اِس پر عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اِس کا پابند بناتے تھے، یا چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اِس کے پابند ہوں۔ جن لوگوں کو اُن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی، یا اُن سے سابقہ پڑا، وہ اُن کے انتظام وانصرام اور اصول پسندی کی شہادت دیں گے۔ جس نے بھی اُن کی خانقاہ اور اُن کے مدرسے ''اشرف المدارس'' کو دیکھا، اُس کو وہاں کی ہر چیز میں نظم وضبط کے مظاہر دیکھنے کو ملے۔ طلبہ اپنے جوتوں اور چپلوں کے اتارنے اور اُنھیں سلیقہ مندی سے متعینہ مقام پر رکھنے تک کے پابند تھے۔ مدرسے میں کہیں بھی کاغذ کا کوئی ایسا ٹکڑا نہ ملتا، جو ہوا کے دوش پر اِدھر اُدھر اڑ رہا ہو اور نہ مدرسے کی در و دیوار پر پان کی پیک کے دھبوں کا کوئی نام ونشان۔ ہر سامان اور ہر ضرورت کی چیز، مناسب جگہ پر رکھی ہوئی ہوتی۔ مرحوم، جہاں ملاقاتیوں اور ملنے ملانے والوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھتے، اُنھیں لائن میں لگنے کا حکم دیتے؛ تاکہ سہولت اور آسانی کے ساتھ، تھوڑے وقت میں یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔

میرا کئی بار اُن کے داماد، طبِ یونانی کے مشہور وماہر حکیم الحاج کلیم اللہ (جو علی گڑھ میں مطب کرتے ہیں) سے ملنا ہوا، تو میں نے اُن کے ہاں زندگی کے تمام اُمور میں نظم وضبط کے ساتھ دیواری گھڑیوں کو عام گھڑیوں سے پانچ منٹ آگے پایا، جن پر ایک چٹ آویزاں تھی اور اُس پر یہ لکھا ہوا تھا: ''یہ گھڑی عام گھڑیوں سے پانچ منٹ آگے ہے''۔ میں نے اُن سے دریافت کیا: آپ نے یہ وضاحتی پرزہ کیوں لکھا ہے؟ فرمایا: اپنے شیخ مولانا ابرار الحق صاحب کے حکم سے، جو کہا کرتے تھے: ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ آگے رہنے والی گھڑیوں سے دھوکہ کھا جائیں اور پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔ میں نے کہا: تو پھر آپ نے اِنھیں کیوں آگے رکھا ہے؟ عام گھڑیوں کے مطابق ہی کیوں نہیں کر دیتے؟ فرمایا: میں اور اِسی طرح بہت سے آدمی ہر چیز میں سبقت اور اولیت کو پسند کرتے ہیں؛ چناں چہ میں اور میرے جیسے تمام لوگ جب ہماری

گھڑیوں کو ٹھیک پانچ منٹ آگے پاتے ہیں، تو راحت محسوس کرتے ہیں۔

صفائی ستھرائی کا اہتمام

مرحوم، صفائی ستھرائی کو بہت زیادہ پسند کرتے تھے؛ چناں چہ اُن کے کپڑے سمیت اُن کی ضرورت کی ہر چیز پاک اور صاف ستھری ہوتی۔ مدرسے کا ہر ہر گوشہ صفائی اور نظم و نسق کی منھ بولتی تصویر ہوتا، اُن سے متعلق کسی بھی چیز میں میل کچیل اور گندگی کا دور دور تک نام و نشان نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ صفائی کو شریعتِ اسلامیہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے؛ بل کہ اس کا حکم اور اس کی تاکید کی گئی ہے؛ لیکن افسوس ہے کہ دینی حلقوں سے تعلق رکھنے والے، اکثر لوگ دین کے اِس پہلو پر دھیان نہیں دیتے؛ بل کہ وہ لوگ گندگی کو سادگی کی دلیل سمجھتے ہیں؛ چناں چہ اگر کسی ایسے عالمِ دین یا مذہبی آدمی سے، اُن کی ملاقات ہو جائے، جو صاف ستھرا ہو، تو وہ یہ باور کر لیتے ہیں کہ اُنھیں سادگی سے کوئی لینا دینا نہیں اور اگر وہ نستعلیق ہو، تب تو وہ اُن کے نزدیک انتہائی لائقِ ملامت ہوتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مرحوم نے اپنی زندہ و پایندہ سیرت سے، اِس بات کی تعلیم دی کہ صفائی ستھرائی جزوِ ایمان ہے، اہلِ علم اور دعوت کا کام کرنے والوں پر واجب ہے کہ وہ اِس کا اہتمام کریں؛ اِس لیے کہ لوگ صاف ستھرے لوگوں کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں اور میلے کچیلے رہنے والوں اور گندگیوں میں لتھڑے ہوئے لوگوں سے وہ دور بھاگتے ہیں، خواہ وہ کتنے ہی بڑے اہلِ علم اور اہلِ فضل و کمال کیوں نہ ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اِس واضح فرق کو محسوس نہیں کرتی، حال آں کہ یہ آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہے۔

زہد و ورع کی تصویرِ مجسّم

حضرتؒ، حقیقی معنی میں زاہد تھے۔ اُنھیں دنیاوی مشاغل سے کوئی لینا دینا نہ تھا،

دنیاوی جاہ وجلال کے پرستاروں اور مال ودولت کے بندوں سے کوئی ضرورت نہ تھی؛ چناں چہ وہ اُن کی اِس طرح خوشامد اور چاپلوسی نہیں کرتے تھے، جس طرح بہت سے ایسے اہلِ علم کیا کرتے ہیں، جنھیں علم کی قدر ومنزلت اور ''علما'' کی حرمت وعظمت کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا۔ اُنھوں نے اپنے ملنے والے کئی علماے دین سے —— جن کے ساتھ اُنھوں نے مدرسے کا گشت کیا —— یہ بات کہی: میں کسی تجارت پیشہ یا مال دار شخص کے ساتھ مدرسے کا گشت نہیں کرتا؛ تا کہ یہ لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں اُن کے مال واَسباب کا ضرورت مند ہوں۔ اُن کا خیال تھا کہ علما کا مال داروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور گرے پڑنا، علم اور دین دونوں کی تحقیر وتذلیل ہے؛ لہٰذا اِس طرزِ عمل سے ہر حال میں بچنا ضروری ہے، خواہ اِس بچنے کی وجہ سے، بہ ظاہر نقصان کیوں نہ ہو۔

خوش اَخلاقی ونرم خوئی

وہ اللہ کے نیکوکار بندوں کی طرح، نرم مزاج ونرم خو اور خوش خلق واقع ہوے تھے، خلقِ خدا کے ساتھ رحم دلی سے پیش آتے، مسلمانوں کی غم گساری اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرتے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی، تو وہ غم زدہ اور بے تاب ہو جاتے، قرض داروں کے قرض کی ادائیگی، مریضوں کے دوا وعلاج اور گردشِ لیل ونہار کے ماروں کی اَشک شوئی کے لیے ہر دم کوشاں رہتے۔ وہ کسی سائل کو اپنے ہاں سے لوٹاتے نہ تھے۔ شیریں کلامی اُن کی امتیازی شان تھی، جو اُنھیں دگر داعیوں سے ممتاز کرتی تھی، وہ اِسی نرم گوئی کی وجہ سے دلوں میں گھر کر لیتے تھے۔

حضرت مولاناؒ، طلبہ کی ضرورتیں پوری کرنے سے بڑی دل چسپی رکھتے تھے، وہ مدارس اور تعلیمی اِداروں کے ذمے داروں کو اِس کی سختی سے تاکید کرتے تھے؛ اِس لیے کہ اُن کا خیال تھا کہ اِس حوالے سے ذمہ دارانِ مدارس میں غفلت شعاری عام ہے، وہ لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ بھلا طلبہ بھی کوئی ایسی قوم ہیں، جس کے حقوق کی رعایت اور اس کی

حاجتیں پوری کی جائیں؛ چناں چہ اُن کا ہردوئی کا مدرسہ طلبہ کی خدمت کے اعتبار سے دگر مدارس سے ممتاز تھا کہ وہاں نہ صرف طلبہ کی بڑی ضرورتوں کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا؛ بل کہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں پر بھی دھیان دیا جاتا تھا۔ وہ اِس بات سے تکلیف محسوس کرتے تھے کہ ہمارے برِ صغیر کے ذمہ دارانِ مدارس عموماً ذیلی اور غیر ضروری امور پر جتنی توجہ دیتے ہیں، اُتنی توجہ ضروری اُمور پر نہیں دیتے؛ چناں چہ وہ عالی شان عمارتوں کی تعمیر، ظاہری چمک دمک اور فلک بوس گنبدوں اور مناروں کی تراش وخراش میں اِسراف کی حد تک روپے خرچ کرتے ہیں اور طلبہ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اور اُن کی تعداد کے مطابق بیت الخلاؤں کی تعمیر اور سال کے مختلف موسم کے مطابق پانی گرم اور ٹھنڈا کرنے کے نظام پر بہ قدرِ واجب بھی خرچ نہیں کرتے۔ نہ جنریٹر فراہم کرتے ہیں کہ جب بجلی غائب ہوجائے تو پنکھے چلانے، بجلی کے بلب جلانے اور پانی کی ٹنکی بھرنے کے لیے اُس سے کام لیا جاسکے؛ اِسی طرح صبح وشام کی خوراک اور ناشتے کو عمدہ بنانے، نہ آسمان چھوتی مہنگائی کے حساب سے، نقد تعلیمی وظائف کی مقدار میں اِضافے پر خرچ کرتے ہیں اور نہ ہی تعلیم وتربیت کے نظام کو ترقی دینے اور تعلیم وتفہیم کی مطلوبہ صلاحیّت سے عاری اَساتذہ کی جگہ لیاقت مند اور باصلاحیّت اَساتذہ کی تقرری پر خرچ کرتے ہیں۔ مرحوم اِس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ مدارسِ اسلامیہ میں اِن اُمور کی اِصلاح اور تبدیلی کی از حد ضرورت ہے۔ یعنی باطن پر ظاہر سے زیادہ توجہ دینی چاہیے اور ذمہ داروں کو قول وعمل میں سچا اور حقیقت پسند ہونا چاہیے۔

طلبہ ومریدین کے لیے شفیق باپ

مرحوم، طلبہ اور اپنے مریدین سے شفیق باپ کی طرح پیش آتے تھے۔ شفقت ورحم دلی ایک ایسی کلید تھی، جس کے ذریعے وہ دل پر لگے تالوں کو بہ آسانی کھول لیتے تھے، اُن کی یہ صفت بڑی مُؤثر اور دل ودماغ کو فتح کرلینے والی تھی؛ چناں چہ وہ

آپ ﷺ کے اِس قول پر مکمل یقین رکھتے تھے کہ ''جس چیز میں نرمی ہو وہ مزین اور خوب صورت بن جاتی ہے اور جس چیز میں نرمی نہ ہو وہ معیوب اور بدنما ہو جاتی ہے'' (مسلم) ''اللہ تعالی رحیم ہیں اور رحم دلی کو پسند فرماتے ہیں اور رحم دلی کی وجہ سے اُس چیز سے نوازتے ہیں، جس سے تشدد اور سختی پر نہیں نوازتے'' (بخاری، مسلم) اِسی وجہ سے ترش رو اور متشدد داعی و معلّم کی کوششیں اُتنی نتیجہ خیز اور بار آور نہیں ہوتیں، جتنی کہ بُردبار اور رحم دل داعی و معلم کی کوششیں نتیجہ خیز اور بار آور ہوتی ہیں۔ مرحوم اُن داعیوں اور مربیوں میں تھے، جن کے ہاتھوں اللہ تعالی نے بہت ساری بھلائیاں دنیا میں پھیلائیں۔

مذکورہ بالا اوصاف و امتیازات کی روشنی میں، مرحوم بے بدل عالم و داعی اور مربی تھے، جن کے قول و عمل میں یکسانیت تھی؛ بل کہ اُن کی بات کا منبع و سرچشمہ ہی عمل ہوتا تھا۔ وہ اپنے دست گرفتوں، مریدین اور طلبہ کو ایسا مطلوبہ انسان بن کر نکلنے پر زور دیتے تھے، جو اپنے اور دوسروں کے لیے یکساں نفع بخش ہو اور جو اپنی اِصلاح کے بعد دوسروں کی اِصلاح کی فکر کرے؛ اِس لیے کہ جو چیز کسی کے پاس نہ ہو، وہ دوسروں کو وہ چیز کیوں کر دے سکتا ہے؟ وہ اپنی سیرت و اخلاق، اپنے رویے، طرزِ عمل اور زندگی کی ہر نقل و حرکت کے حوالے سے مصلح و داعی تھے، وہ ایسے داعی نہ تھے، جو صرف زبانی جمع خرچ کرنے اور کاغذی گھوڑے دوڑانے کا عادی ہوتا ہے؛ اِسی لیے اُنھیں دعوت و تربیت کے میدان میں ہمہ گیر اور نمایاں کام یابی ملی۔ اُنھوں نے اپنے پیچھے راست طور پر استفادہ کرنے والوں یا اپنے فیض یافتگان کی دعوت سے متأثر ہونے والوں کی ایک بڑی کھیپ چھوڑی ہے۔ اِس عظیم اور وسیع تر دیار (برِ صغیر) کے مسلمان اُن کی کمی ہمیشہ محسوس کریں گے۔

اُن کے سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ اُنھوں نے زائد از پچاس حج اور ساٹھ سے زائد عمرے کی سعادت حاصل کی، پچیس سے زائد ممالک کا دورہ کیا اور اپنے پیچھے عقیدت مندوں، محبّین، تربیت یافتوں، نیز حکمت و نصیحت کے ذریعے اِصلاح و تربیت اور اِسلام، اِسلامی اَحکام اور سنت نبویؐ کی دعوت دینے میں اپنے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی نا قابلِ شمار

تعداد چھوڑی ہے۔ اے اللہ تو مرحوم جیسے لوگوں کی اِس دنیا میں کثرت کردے، اُن کے تذکرے کو زندۂ جاوید بنادے، اُنھیں اپنی فردوسِ بریں میں داخل کر، اُنھیں وہاں نبیوں کی صحبت نصیب فرما، اُن کے اہلِ خانہ، رشتے داروں، محبین متعارفین، رفقا، خلفا اور عقیدت مندوں کو، صبرِ جمیل عطا فرما۔ اللہ کا درود وسلام اور اُس کی برکت نازل ہو، اُس کے بندے اور رسول ہمارے آقا اور روزِ محشر ہمارے شفاعت کنندہ یعنی رسولوں کے سردار حضرت محمد ﷺ پر اور آپ ﷺ کے سارے آل واصحاب پر، نیز قیامت تک آپؐ کی سچی پیروی کرنے والوں پر۔ (*)

مختصر سوانحی نقوش

❁ **اسم گرامی:** (حضرت مولانا شاہ) ابرار الحق حقی بن محمود الحق۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء-۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) سے جاملتا ہے؛ اِسی لیے آپ کے نام کے ساتھ ''حقی'' کا لاحقہ لگا ہوا ہے۔ آپ کے والدِ محترم محمود الحق صاحب پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے، حضرت تھانوی کے دست گرفتہ اور اُن کے مُجازِینِ صحبت میں تھے۔

❁ **ولادت:** ۲۰ردسمبر ۱۹۲۰ء (۷رجمادی الاولیٰ ۱۳۳۹ھ)

❁ **جائے ولادت:** شہر ہردوئی، یوپی۔ اصل وطن ''پلول'' (Palwal) ہے جو دہلی کے قریب صوبہ ''ہریانہ'' میں واقع ہے۔

❁ **تعلیم کی بسم اللہ:** آپ کی بسم اللہ مولانا سید اصغر حسین دیوبندی (۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء-۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۴ء) نے کرائی۔

❁ **ابتدائی تعلیم:** آٹھ سال کی عمر میں حفظِ قرآنِ پاک کی تکمیل کی۔ اُس کے بعد اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم ہردوئی کی ''انجمن اسلامیہ'' کے مدرسہ میں، مولانا انوار احمد انبیٹھوی مظاہری سے حاصل کی۔

❁ **دورۂ حدیث شریف:** دورۂ حدیث شریف کی تکمیل، بہ وجہ علالت دوسال میں ہوئی۔ پہلے سال

(*) عربی تحریر جمعہ: ۸رجمادی الاخری ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۵رجولائی ۲۰۰۵ء کو لکھی گئی اور ''الداعی'' عربی، شمارہ ۶-۷، جلد ۲۹، جمادی الاخری ورجب ۱۴۲۶ھ مطابق جولائی-ستمبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔

۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ اور حضرت مولانا اِنعام الحسن کاندھلویؒ آپ کے رفقاے درس میں تھے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے ششماہی امتحان میں اوّل آنے والے طالبِ علم کو "بذل المجهود" کا سیٹ دینے کا اِعلان فرمایا تھا، اپنے ساتھیوں میں اِس اِنعام کے مستحق صُرف آپ ہی قرار دیے گئے؛ لیکن بیماری کی وجہ سے امتحانِ سالانہ میں شریک نہ ہوسکے۔

● ۱۳۵۶ھ میں جب آپ سترہ سال کے تھے دوبارہ دورۂ حدیث شریف میں شریک ہوکر اعلیٰ نمبرات سے کام یابی حاصل کی۔ ۱۳۵۷ھ سے ۱۳۵۸ھ تک تکمیلِ فنون کیا اور منقولات و معقولات کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور اعلیٰ نمبرات حاصل کیے، لہٰذا نہ صرف بہت سی کتابیں اِنعام میں ملیں؛ بل کہ ۵ روپے نقد اِنعام بھی حاصل کیا، جو اُس وقت ایک معتد بہ رقم تھی۔

۞ **تدریس:** ۱۳۵۸ھ میں فنون کی تکمیل کے بعد، مظاہر علوم میں معین مدرس منتخب ہوے، پھر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے حکم سے جامع العلوم پٹکاپور، کان پور میں تدریسی خدمت انجام دی۔ اِس کے بعد دو سال مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے وابستہ رہے۔

● ۱۹۴۲ء میں ہردوئی میں ''اَشرف المدارس'' کا سنگِ بنیاد رکھا۔

● ۱۹۵۰ء میں ''دعوۃ الحق'' تحریک و تنظیم کا آغاز فرمایا۔

● ۱۹۵۳ء میں مکاتب کے قیام کا سلسلہ شروع فرمایا۔

● ۱۹۷۳ء میں پہلا مکتب موضع ''اَسہی اَعظم پور'' ہردوئی میں قائم کیا۔

۞ **بیعت و خلافت:** دورانِ تعلیم ہی حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوے، ۱۳۶۱ھ میں جب کہ آپ کی عمر صرف ۲۲ سال تھی، حضرت تھانویؒ نے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا۔

● حضرت محی السنۃ مولانا شاہ ابرار الحق کے خلفاے مجازینِ صحبت کی تعداد ۳۶ اور خلفاے مجازینِ بیعت کی تعداد ۱۰۳ ہے۔

۞ **مرضِ وفات و وفات:** ۸ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۷ مئی ۲۰۰۵ء بہ روز شنبہ عصر سے قبل و بعد عصر تا مغرب ایک مہمان کے ساتھ اہم امور میں مشغول رہے، بعد مغرب بھی بہت سے مہمانوں سے ملاقات ہوئی۔ پھر چند منٹ بعد کھانسی آئی اور ساتھ میں خون ظاہر ہوا اور پھر خون کی آمد بڑھتی گئی، معالجین کو اطلاع دی گئی، آپ کے خصوصی معالج فوراً آ گئے؛ لیکن ممتاز ڈاکٹروں کی ساری کوششوں کے باوجود ۸-۹ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ = ۱۷-۱۸ مئی ۲۰۰۶ء کی درمیانی شب میں ۸ بج کر ۲۵ منٹ پر، آپ

کی روح، قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

❁ **جنازہ وتدفین:** دوسرے روز: چہار شنبہ ۹؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ = ۱۸؍مئی ۲۰۰۶ء کو تقریباً ۱۰:۳۰ بجے، آپ کی نمازِ جنازہ مولانا قاری امیر حسن (صدر مدرس مدرسہ اشرف المدارس وخلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ) نے پڑھائی، جس میں کئی لاکھ علماو صلحاو طلبہ اور عام مسلمانوں نے شرکت کی۔

❁ **پس ماندگان:** آپ کے پانچ بھائی اور ایک بہن تھیں، بھائی سب وفات پاچکے ہیں، آپ کی اہلیہ محترمہ کا یک شنبہ: ۱۵؍رمضان ۱۴۳۰ھ = ۶؍دسمبر ۲۰۰۹ء کی صبح کو ۹ بجے بمبئی میں انتقال ہوگیا، وہیں تدفین عمل میں آئی۔ آپ کی صاحب زادی حیات ہیں، جو آپ کے جانشین: الحاج حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ کو (جو عرصے سے علی گڑھ میں، جسمانی طبابت کے ساتھ ساتھ، روحانی علاج ومعالجے میں خلوص، لگن اور ہمت وحوصلے کے ساتھ ہمہ تن مصروفِ کار ہیں) منسوب ہیں۔ آپ کے ۳ نواسے اور ۳ نواسیاں ہیں۔ نواسوں میں جناب علیم الحق مجازِ بیعت ہیں۔ آپ کے (حضرت شاہ ابرار الحق کے) ایک صاحب زادے، جن کا نام اشرف الحق تھا، ۲۸ سال کی عمر میں طویل بیماری کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔

داعیِ اسلام و عاشقِ رسول ادیب

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء — ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۶ء

یوں خونِ دل میں ڈوب کے نکلی مری غزل
جیسے کوئی چھلکتا ہوا جام آگیا

عرصے تک بیماری کو مغلوب کیے رہنے کے بعد، بالآخر اُس سے مغلوب ہوکر، یک شنبہ یکم جنوری ۲۰۰۶ء مطابق یکم ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ (بہ تقویم سعودی عرب) و ۲۹ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ (بہ تقویم ہندوستان) کو ۱۲ر بج کر ۱۰ر منٹ پر، ہندوستانی ثم السعودی عالم و داعی و ادیب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے، جدہ سعودی عرب کے ایک ہسپتال میں، ہجری جنتری کے مطابق ۸۲ سال اور عیسوی کلنڈر کے مطابق ۸۱ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اپنی شان کے مطابق اِس خادمِ دین و دعوت کو نوازے۔ آمین

یک شنبہ - دوشنبہ: ۱-۲ر جنوری ۲۰۰۶ء، مطابق ۱-۲ر ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ کی شب میں عشا کی نماز کے بعد حرمِ مکی میں، امام حرم نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں لاکھوں نمازیوں نے شرکت کی، جن میں اکثر عازمینِ حج تھے، جو دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے تھے۔ پھر مکۂ مکرمہ کے تاریخی اور مقدس قبرستان "جنت المعلاۃ" میں صحابہ وصحابیات (رضی اللہ عنہم اجمعین) وتابعین وتابعات اور صلحائے امت (رحمۃ اللہ علیہم

اجمعین) کے پہلو میں، اُنھیں اِس خاکی دنیا میں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

قابلِ رشک موت

مولانا رحمۃ اللہ علیہ، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مُعتَمَدِ تعلیم تھے، نیز ہندوستان اپنا اصلی وطن بھی تھا؛ اِس لیے سعودی عرب کا مُتَوَطِّن ہو جانے کے باوجود، ہندوستان بالخصوص لکھنؤ بار بار اور طویل طویل وقفوں کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ ہندوستان میں کسی قیام کے دوران ہی اُن کا آخر وقت آجاتا اور اُنھیں بادلِ ناخواستہ یہیں کی خاک کا پیوند ہو جانا پڑتا؛ لیکن اللہ پاک نے اُن کے لیے، ساری دنیا کے مسلمانوں کے اصلی وطن اور ایمان وروح کے نشیمن مکۂ مکرمہ (جہاں کے وہ جسمانی باشندے بھی ہو چکے تھے) کی خاک میں ملنا مُقدَّر کر رکھا تھا۔ چناں چہ جدہ میں طائرِ روح نے پرواز کیا اور جسدِ خاکی کو مکہ مکرمہ میں قرار ملا۔ اِس سے یہی اِشارہ ملتا ہے کہ خدائے کریم نے اُنھیں اپنی رحمتِ خاص سے نوازنا چاہا تھا اور یہ کہ وہ ذات جو سِرّ اور اُس سے مخفی تر کو جانتی ہے، اِس دنیائے عمل میں کی گئی، اُن کی سرگرمیوں اور بھلائی کی حرکات وسکنات کو شرفِ قبولیت سے نواز چکا ہے۔ اُنھوں نے تعلّم ومطالعہ، تدریس وتعلیم، تحریر وتصنیف، دعوت وتبلیغ اور علم وعمل کے لیے چلت پھرت کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ، آپ کے صحابہؓ حرمین شریفین کے آخری پیغام کے سرچشمے، رسول ﷺ کے مولد ومدفن وجائے بعثت کی سچی اور مخلصانہ محبت سے لبریز اور جگمگاتی ہوئی، ایسی زندگی گزاری جو دین ودعوت اور علم ثقافت کے میدان میں سرگرمِ عمل اَن گنت اِنسانوں کے لیے، باعثِ رشک ہوگی، جو خواہش اور تڑپ کے باوجود، اُن کی ایسی سعادت سے سرفراز نہیں ہو پاتے۔

اِسلام کے اصل مسکن سے تعلق رکھنے والے مقاماتِ مقدسہ سے، اُن کی بے پناہ محبت کو ربِّ شکور کی طرف سے قبولیت کی سند، اُسی وقت مل گئی تھی، جب اللہ پاک نے،

بیتِ عتیق کے جوار اور بلدِ امین میں اُن کے خاکی وجود کے لیے بھی جاے رہائش پا جانے کی راہ ہموار کردی اور اُنھیں سعودی نیشنلٹی دلا دی اور وہیں بود و باش اختیار کر لینے کے لیے، اُسی کے تسلسل والے شہر جدہ اور پھر عین مکہ مکرمہ میں روزی روٹی کے حصول کا سامان بہم پہنچا دیا۔

روزِ قیامت آسان حساب کی امید

اِس راقمِ آثم کا تو خیال یہی ہے —— اور اللہ حقیقتِ حال اور اپنی مشیّت سے زیادہ واقف ہے —— کہ اللہ پاک روزِ قیامت اُن کا آسان حساب لینے کا ارادہ کر چکا تھا؛ اِسی لیے اُس نے زندہ اور مردہ دونوں حالتوں میں، اُنھیں اپنے گھر کا پڑوسی بنانا مُقدّر کیا۔ نہ جانے کتنے مسلمان ہیں؛ بل کہ کتنے صالح اور خدا رسیدہ مسلمان ہیں، جو موت کے دن تک؛ بل کہ موت کے لمحے تک مکۂ مکرمہ یا مدینۂ منورہ میں موت اور تدفین کی سعادت پانے کی تمنّا میں مرجاتے ہیں؛ لیکن اُن کی موت وہیں واقع ہوتی ہے، جہاں اللہ نے مُقدّر کر رکھی ہوتی ہے۔ مکہ یا مدینہ میں موت یا تدفین کی سعادت اور حرمِ مُکرّم میں نمازِ جنازہ اور لاکھوں نمازیوں کی دعاؤں کا ارفع مقام حاصل نہیں کر پاتے؛ کیوں کہ یہ سعادت زورِ بازو، کوشش، خواہش اور محض تمناؤں سے حاصل نہیں کی جاسکتی، یہ تو صرف تقدیرِ الٰہی کی دین ہوتی ہے۔ اللہ پاک نے خود فرمایا ہے:

﴿وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ﴾ (لقمان/۳۴)

ترجمہ: اور کسی جی کو خبر نہیں کہ کس زمین میں مرے گا۔ تحقیق اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے۔

مولاناؒ کی خوبیاں

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ مسلم علما و مُحقّقین کے اُس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، جس

کوعلومِ شریعت میں درک کے ساتھ ساتھ عربی اوراردوزبانوں پر یکساں ماہرانہ عبور ہوتا تھا۔مولانا واقعتاً فطری ادیب تھے۔اُن کے قلم سے نکلا ہوا ہرلفظ فصاحت میں ڈھلا ہوا، ہرتعبیر بلاغت میں سجی ہوئی اور ہر جملہ ظاہراً خوب صورت اور باطناً خوب سیرت ہوتا تھا۔اُن کا ہر مضمون اور ہرتحریر، آنکھ سے پہلے دل کے لیے شیریں اورمحبوب ہوتی تھی۔اُن کی عبارت میں صرف آمد ہوتی اوروہ سلاست اورروانی کا فیضان ہوتی۔ اِیمان کی برکت، یقین کی مٹھاس اور دین وعقیدہ ونبی ﷺ وکتاب اللہ وامتِ محمد ﷺ کی محبت کی چاشنی میں لبریز ہوتی تھی۔قاری اُن کی تحریر کو پڑھتا،تو وہ اُس کو پارۂ دل اور قاشِ جگر، یا کم ازکم برادۂ زَر یا اُس سے بھی قیمتی ترکسی ایسی دھات کے ذرّوں کا مجموعہ سمجھتا، جس کا وجود،صرف مومن کے خانۂ خیال اورزاہدِ شب زندہ دار کے ذہن میں ہی ہوتا ہےاوربس۔

اردواورعربی زبانوں پرعبور کے ساتھ ساتھ،اُنھیں انگریزی اورفارسی میں بھی خاصی مہارت تھی؛لیکن اپنی علمی وادبی تخلیقات اورفکری ودعوتی نگارشات کے لیے،اُنھوں نے اول الذکر دونوں زبانوں اورزیادہ تراردوکوہی اساس بنایا،جس کے دامن کواُنھوں نے آخری چند سالوں کے دوران،اپنے گراں بہا علمی ودعوتی وادبی افکاروخیالات سے مالامال کردیا۔شرعی علوم میں سے،علمِ تفسیر اُن کی توجّہ کا مرکز رہا۔دوسری طرف ادبی فنون اور اِصلاحی ودعوتی موضوعات پراُنھوں نے کثرت سے لکھااورخوب ترلکھا۔اُنھوں نے سیرتِ نبوی ﷺ اور تاریخ کوبھی اپنا موضوع بنایا۔اُنھوں نے جوکچھ لکھا (اور بہت کچھ لکھا) وہ اپنے مواد کی گراں مایگی،زبان کی چاشنی،اسلوب کی لذّت،طرزِتحریر کی شوق انگیزی کی وجہ سے،اپنا الگ انداز اورمخصوص امتیاز رکھتا ہے،جس کو باذوق قاری ایسی لذت کے ساتھ پڑھتا ہے، جیسے مزےدارکھانوں کارسیا،لذیذ کھانوں کے دسترخوان پرٹوٹ پڑتا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریادی کا رنگ

اُن کی اردوتحریروں کوپڑھ کر، بسا اوقات یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ البیلے اسلامی ادیب

ومفسرِ قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۹ھ - ۱۳۹۷ھ = ۱۸۹۲-۱۹۷۷ء) کی زبان ہے۔ مولانا عبداللہ عباسؒ نے، طالبِ علمی کے زمانے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجدؒ کو کثرت سے پڑھا ہوگا اور اُن کی طرزِ نگارش اور روحِ تحریر کو جذب کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ مولانا عبداللہؒ کے ہاں کچھ اُسی قسم کی منفرد چاشنی اور ایمانی حلاوت وساحرانہ درس انگیزی ہوتی تھی، جو مولانا عبدالماجدؒ کی تحریر کا وجہ امتیاز تھی۔

لیکن کوئی اہلِ قلم، زبان کی خوبیوں پر بھرپور دسترس رکھنے اور اُس میں اپنا طرزِ خاص بنا لینے کے باوجود بھی، زندگی سے بھرپور ایسا ادب اُس وقت تک تخلیق نہیں کرسکتا، جس سے روح کو غذا، دل کو سکون، فکر کو بالیدگی اور عقیدے کو ایسی پختگی ملتی ہو، جو قاری کے فکری سرچشمے اور اُس کی سرگرمیوں کے سارے دھارے پر کنٹرول رکھتی ہو، جب تک کہ اُس کا دل بادۂ حبِ نبوی ﷺ اور اِس عقیدے سے سرشار نہ ہو کہ آپ ﷺ ہی اِمام الانبیا، سید الرسل اور منیرِ راہ ہائے حیات وکائنات ہیں اور یہ کہ کسی مومن کا اِیمان اُس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا، جب تک اُس کو آپ ﷺ سے، اپنی ذات، اپنی اولاد اور روے زمین کی ساری محبوبات سے زیادہ محبت نہ ہو۔ مولانا عبداللہ عباسؒ کو اِس معززانہ محبت اور شریفانہ عقیدے سے وافر حصّہ ملا تھا، چناں چہ اُنھوں نے ایسا تاب ناک اور بابرکت ادب تخلیق کیا جو ہر باتوفیق اور باذوق قاری کو پڑھنے، استفادہ کرنے اور اُس کی پہنائیوں میں موجود روشن فکر، برگزیدہ سوچ اور بےنظیر خوبی کو اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔

بصیرت مند عالم وداعی

مولانا عبداللہ عباسؒ تدریس کی مکمل لیاقتوں کے حامل کام یاب اور بافیض مدرس ومُعلِّم تھے اور بارآور ترسیل، مفید تر اندازِ عرض اور کارآمد طریقۂ تفہیم کے مالک بھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کہاں اِیجاز کی ضرورت ہے اور کہاں تفصیل کی، کہاں بھرپور شرح کی ضرورت ہے اور کہاں اِشارے کی، چناں چہ مستفید اور طالب علم اُن کی بات

کو خودکار طریقے سے اخذ کر لیتا تھا اور اُن کے پیش کردہ مواد کو لذت اور طیبِ نفس، نیز دعا و شکر وقدردانی کے جذبات کے ساتھ پی جاتا تھا۔ عام گفتگو میں بھی اُن کا یہی طریقہ ہوتا تھا۔ وہ مجلس میں گویا ہوتے تب، کسی جلسے میں بولتے تب، کسی مسئلے میں تبادلۂ خیال کرتے تب، ہر جگہ اُن کا انداز بہت میٹھا، آسان اور تفہیمی عناصر سے بھرپور ہوتا تھا۔ اُن کی گفتگو سے ہمیشہ اُن کی دین داری، نیکی، حضور ﷺ کی محبت، اُمت کو درپیش مسائل کی کسک، قومِ مسلم کے سر پر کھڑے خطرات سے دل گرفتگی، عربوں کی گردن پر سازشوں کی لٹکتی تلوار کی چبھن؛ صاف طور پر محسوس ہوتی اور ساتھ ہی حاضرین کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اُنھیں کس درجہ زندگی کے مسائل کی بصیرت، عربی میں گہرائی اور اردو زبان میں مہارت اور دونوں کے امتیازات کا اِدراک ہے اور دوسری طرف تعلیم وتربیت کے میدان کا کیسا طویل تجربہ ہے اور عالمِ اسلام کی علمی وفکری قیادت کے لیے، مطلوبہ افراد کی تیاری کے لیے کارگر طریقۂ کار کی کیسی جانکاری ہے، نیز وہ کیسی بالغ نظری، دوراندیشی، ضرورت کی حد تک کھلے پن اور ذہانت، بذلہ سنجی اور علمی سنجیدگی کے جامع اہلِ علم ودانش ہیں؟!۔ اِسی لیے مولاناؒ کے پاس بیٹھنے والوں کو تھوڑے وقت میں بھی بہت سارے فائدے حاصل ہو جاتے تھے اور ہم نشینوں کو لذّت اور فائدے کے امتزاج سے غیر معمولی خوشی ہوتی اور کبھی بھی کوئی اکتاہٹ نہ ہوتی تھی۔

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ دعاۃ واُدبا کی اُس نسل کے چند انتہائی برگزیدہ افراد میں سے ایک تھے، جس نے عالی مقام مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (۱۳۳۳-۱۴۲۰ھ = ۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) کی خصوصی تعلیم وتربیت کا بھرپور اور بے اندازہ فیض پایا تھا اور علم وفکر، دعوت ومجاہدے کے باب میں اُنھی کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور اُن کے مے خانے سے اُس نے اِس طرح جام پر جام چڑھایا تھا کہ جس کے پاکیزہ اور مُقدّس نشے نے زندگی کے آخری لمحے تک اُس کو مست رکھا۔ مولانا عبداللہؒ نے زندگی بھر اِس مستی کا گن گایا، مزے لے لے کر اِس کو بیان کیا، اِس موضوع پر بھی بہت

کچھ لکھا اور سرمایۂ افتخار سمجھ کے لکھا، وہ زندگی بھر اِسی کیف و مستی کے داعی رہے اور اپنی تمام سرگرمیوں میں اِسی محوَر پر گردش کرتے رہے۔ مولانا علی میاں ندویؒ کا رنگ و آہنگ اور علمی و فکری ڈھنگ، اُن کی تمام حرکات و سکنات سے چھلکتا تھا؛ کیوں کہ یہ اُن کے اَعصاب پر سوار اور اُن کی سوچ پر چھایا ہوا تھا۔ اللہ دونوں مرحومین استاذ و تلمیذ کو بہتر سے بہتر بدلہ دے، جو وہ اپنے حسنِ عمل والے بندوں کو دیا کرتا ہے۔

شرافتِ نفس و کُشادہ قلبی

مولانا مرحوم، کریم النفس اور شریف الطبع تھے، کشادہ نفسی، سخاوت اور سیر چشمی سے اُن کا خمیر اٹھا تھا۔ اُن کے عام برتاؤ، مہمان نوازی اور قول و فعل، نیز اپنے اور غیروں کے ساتھ زندگی گزارنے کے انداز میں رواداری و کشادہ قلبی کا انعکاس صاف طور پر محسوس ہوتا تھا۔ وہ ہر اُس رویے سے بچتے تھے، جس سے کسی کو قلبی اذیّت پہنچنے کا اندیشہ ہوتا۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں بھی ایسے الفاظ و تعبیرات کا انتخاب کرتے، جن کا ظاہر خوش گوار اور باطن پاکیزہ ہوتا اور جن کا کوئی بھی مصداق باعثِ مسرّت ہی ہوتا۔ قلم اور زبان پر کنٹرول رکھنا، اِس راہ کے راہی اچھی طرح جانتے ہیں کہ بڑا مشکل؛ لیکن بہت مبارک کام ہے۔ مولاناؒ کو تمام تر احتیاط کے باوجود بھی، کسی کی طرف سے ذرا بھی یہ اِشارہ ملتا کہ اُس کو اُن کی کسی بات یا تحریر کے کسی نقطے یا حرف یا لفظ سے کوئی اذیّت ہوئی ہے، تو وہ فوراً اور صاف لفظوں میں معذرت خواہ ہوتے، خواہ یہ اذیّت اُس آدمی کو اپنی غلط فہمی یا کم فہمی کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔ مولاناؒ معذرت خواہی میں کبھی بھی تردّد نہ کرتے۔ یہ بھی اُن کی بڑائی کی دلیل ہے؛ ورنہ بہت سے اہلِ قلم اور اہلِ لسان واضح غلطیوں کی بھی تاویل کر لیتے ہیں؛ لیکن کسی کی دل آزاری پر کبھی معذرت خواہ نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ کسی سچے دین دار اور خداترس کا کبھی نہیں ہوسکتا۔

مولانا مرحوم دل کی گدازی، خدا کی یاد میں رونے والی اور استحضارِ گناہ سے پرنم

ہو جانے والی، سعادت مندانہ آنکھیں رکھتے تھے۔ اُن کے چہرے سے شب بیداری، دن کی تپیدگی، ہمہ وقت محاسبۂ نفس اور اپنے عیوب پر مسلسل نگاہ کی وجہ سے دوسروں کے عیوب سے بے نیازی کا بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ مومن کی شان رکھتے تھے، جو ہر لفظ کو منھ سے نکالنے سے پہلے اچھی طرح تول لیتا ہے اور جو اپنی ذات کو صحیح میزان پر تولتا رہتا ہے اور اپنی ذات کے نقائص کا شغلِ مسلسل، دوسروں کے اچھے بُرے کی طرف مُتوَجِّہ ہونے کی فرصت نہیں دیتا۔ وہ اِس بات کا کام یاب اِدراک رکھتے تھے کہ سوائے اَنبیا اور اَصحابِ اَنبیا کے، نقائص سے کوئی پاک نہیں اور سب سے ضروری کام ایک مومن کے لیے یہی ہے کہ وہ اپنی ذات کی اِصلاح کے لیے ہی فکرمند رہے۔ اُن کے شیخ و مربی مولانا علی میاں ندویؒ فرمایا کرتے تھے: ”جس کو اپنے عیوب میں مشغول رہنے کی توفیق مل گئی، تو اُس کو دنیا و آخرت کی ساری سعادتیں مل گئیں“۔

خدا کے گھر کے پڑوس میں

مولانا کے گھر میں اُن سے یادگار ملاقات

۱۴۱۵ھ یا ۱۴۱۶ھ کے رمضان المبارک کی کسی تاریخ کو، یہ راقم سحری کے اوقات کی ابتدا میں اُن کے دولت کدے واقع مکہ مکرمہ میں اُن کے ہاں ایک بار مہمان ہوا۔ میں نے جدہ سے ٹیلی فون پر اُن سے رابطہ کر کے وقت لے لیا تھا، جیسے ہی اُن کے گیٹ پر پہنچا مرحوم سراپا انتظار کھڑے تھے، بڑی شرمندگی ہوئی کہ میں نے اُنھیں ناحق زحمت دی۔ میں نے اپنے اِحساس کا اظہار اُن سے کیا، تو فرمایا: ”مولانا یہ گھر آپ کا ہے۔ خدا کے پڑوس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ اِس شہرِ مقدس میں رہایش کا یہی تو ہے کہ آپ جیسے بہت سے مخلص احباب کا استقبال و ضیافت کرنے کا، ربِ کریم نے موقع دے رکھا ہے“۔ مولانا نے دسترخوان لگایا اور بہترین ولذیذ کھانوں کے ساتھ پرلطف و چشم کشا باتوں سے بھی محظوظ فرمایا۔ پھر اُس روز ہم دونوں نے ساتھ ہی

حرم شریف میں نماز ادا کی۔ مولاناؒ نے اِتنی عزت دی اور اِس طرح نوازا کہ اُن چند گھنٹوں کا میرے دل پر ایسا تاثُّر نقش ہوا، جو اِن شاء اللہ مرتے دم تک قائم رہے گا۔ جن محسنوں، متعارفین، محبین اور اَساتذہ و داعیوں کے لیے زندگی میں ہمیشہ دعا کی سعادت حاصل رہتی ہے، مولاناؒ بھی اُن میں سے ایک ہیں۔ اللہ ہمارے لیے اپنے فضلِ خاص سے، اِس سعادت کو قائم و دائم رکھے۔

میرے نام مولاناؒ کا مکتوب

مولاناؒ کی کتاب ''ردائے رحمت'' جب پہلی بار ۱۹۸۹ء میں مکتبۂ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ سے شائع ہوئی، جس میں اُنھوں نے عربی زبان کے دو مشہور و مقبول نعتیہ قصیدوں: قصیدۂ بَانَتْ سُعَادُ از کعب بن زُہَیر بن ابی سُلْمی اور قصیدۂ بُردَہ از علامہ محمد بن سعید بوصیری مصری (۶۰۸ھ/ ۱۲۱۲ء — ۶۹۶ھ/ ۱۲۹۶ء)، کی مکمل لفظی و معنوی تشریح کی ہے، تو راقم نے رسالہ ''الداعی'' کے ایک شمارے میں عربی زبان میں اُس کا تعارف پیش کیا، جو مولاناؒ کے علم میں آیا، تو اُن کا جی خوش ہوا اور اُنھوں نے مندرجۂ ذیل مکتوب سے راقم کی حوصلہ افزائی کی:

۲۸/ اگست ۱۹۹۰ء

برادرِ مکرم مولانا نور عالم امینی صاحب! زیدلطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''الداعی'' میں میری کتاب ''ردائے رحمت'' کا جس تحسین کے انداز میں آپ نے تعارف کرایا ہے، اُس کے لیے دل سے شکر گزار اور آپ کے حق میں دعا گو ہوں۔ یہ کوئی دستور نہیں ہے کہ تبصرہ و تحسین لکھنے والے کو شکریے کا خط لکھا جائے، ہاں تنقید اور کم زور پہلو اگر کسی نے نمایاں کیا، تو بعض لوگ اپنی برہمی کا اِظہار کیا کرتے ہیں۔ ہم آپ مدرسے کے لوگ ہیں، احترامِ مُتبادَل کے قائل

ہیں۔ بہ ہرحال أسبغ اللّٰهُ عَلَيْكَ ثَوْبَ الْعَافِيَة، وجزاك عَنّي خيرًا.

میں جون میں لکھنؤ میں تھا، واضح صاحب (۱) نے بتایا کہ ''الداعی'' میں مولانا نورعالم نے تمھاری کتاب پر بہت اچھا لکھا ہے؛ مگر وہاں پرچہ باوجود تلاش کے نہیں مل سکا، دہلی آیا تو ''ذکروفکر'' کے دفتر میں یہ پرچہ (جو تبادلے میں آتا ہے) ملا۔ مکۂ مکرمہ کے پتے پر بھی آیا کرتا ہے، جس کے لیے ہم مزید ودائماً شکر گزار ہیں۔

حجاز تشریف لائیں، تو ملاقات کا مجھے بھی موقع دیں۔

والسلام

عبداللہ عباس ندوی

خوش حالی کے باوجود، سادہ زندگی

میری معلومات کی حد تک مولاناؒ فارغ البال اور خوش حال تھے؛ کیوں کہ اُنھیں سعودی عرب کی نیشنلٹی مل گئی تھی، وہاں وہ عرصے تک مختلف تدریسی، انتظامی ونشریاتی لائقِ ذکر مناصب پر فائز رہے، جامعہ ام القریٰ میں استاذ اور جدہ میں مشرقی نشریات کی ذمے داری کے علاوہ وہ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' مکہ مکرمہ میں اہم عہدوں کے لیے باعثِ زینت رہے؛ لیکن اُنھوں نے ہمیشہ معمولی آدمی کی طرح سادہ زندگی گزاری۔ وہ ظاہر کی آراستگی پر توجُّہ نہ دے کر باطن کی تعمیر میں لگے رہتے تھے۔ ملنے والے کو پہلے سے معلوم نہ ہو، تو اُن سے مل کر وہ یہ قطعاً اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ وقت کے بہت بڑے ادیب، جہاں دیدہ داعی، ماہرِ تعلیم، مشاق مربی، صاحبِ طرزِ انشا پرداز، عاشقِ رسول، محبّ صحابہ، امت کے ایک غم خوار، قدآور مؤلف اور دودرجن سے زیادہ گراں قدر

(۱) مولانا سید واضح رشید ندوی برادر خرد حضرت مولانا سیّد محمد رابع ندوی واستاذ دارالعلوم ندوۃ العلما وایڈیٹر ''البعث الاسلامی''، ''الرائد''، وہمشیرہ زادہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

کتابوں کے مصنف سے مل رہا ہے۔

بہت کام کرنے والے، خصوصاً اہلِ قلم کے روٹینی مشاغل کی وجہ سے، اُس کو اپنے اوقات کی ترتیب میں بڑی نزاکت اور سوچ سے کام لینا پڑتا ہے، ہر کام کے لیے وقت اور ہر وقت کے لیے ایک کام متعین نہ کیا جائے، تو کام نہیں ہو پاتا؛ لیکن مولاناؒ طرح طرح کے مشاغل کے باوجود، اپنا در ہر وقت کھلا رکھتے تھے، ہر آدمی بغیر کسی ذہنی تردّد اور نفسیاتی تیاری کے اُن سے مل سکتا تھا۔ اُن کے ایسے عظیم المرتبہ نہیں؛ بل کہ جو لوگ اُن کے عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتے، اُن سے ہر وقت اور بغیر کسی ذہنی اُلجھن کے ملنا مشکل ہوتا ہے، تواضع اور خاک ساری اُن کی واضح شناخت تھی۔ عالم اور داعیہ کے جسم پر یہی لباس، زیب دیتا بھی ہے۔ اگر کسی عالم کا جسمانی وجود اِس لباسِ جمیل سے عاری ہو، تو وہ بہت مکروہ اور قبیح محسوس ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ اُس سے عالم اور داعی کا رسمی لقب بھی کسی طرح چھین لیا جاتا، تو بہت اچھی بات ہوتی۔

مولاناؒ اِسی کے ساتھ، عالم و داعی کی مکمل شان کے حامل تھے اور اپنے علم کا احترام کرنا جانتے تھے، چناں چہ وہ علم کے تقاضوں پر بہ خوبی عمل کرتے تھے اور کسی بھی بے عملی کے ذریعے، علم کی آبرو کو پامال نہ ہونے دیتے تھے؛ کیوں کہ وہ جانتے تھے، عالم کا علم اُس کو اور دوسروں کو تب ہی فائدہ دیتا ہے، جب وہ اُس پر عمل کرتا ہے، علم بغیر عمل کے ایک پہیلی ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

اللہ اُنھیں جنت الفردوس کا مکین بنائے اور اَنبیا و صلحا کے جوار میں جگہ نصیب کرے، آمین۔ (۱)

---

(۱) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۱-۲، جلد ۳۰، محرم و صفر ۱۴۲۷ھ = فروری و مارچ ۲۰۰۶ء۔
اردو تحریر بہ قلم خود ۳۰:۱۲ بجے، بہ وقتِ اذانِ جمعہ ۲۵ محرم ۱۴۲۷ھ = ۲۴ فروری ۲۰۰۶ء۔

سوانحی نقوش

❁ نام ونسب: مولانا عبداللہ بن ابوالفضل مفتی محمد عباس بن مولانا محمد انس بن مولانا شاہ نور احمد بن مولانا شاہ محمد امام بن مخدوم شاہ نعمت اللہ بن تاج العارفین پیر مجیب اللہ قادری جعفری زینبی پھلواروی قدس سرہ۔

❁ تاریخ پیدائش: ۱۹۲۵ء/۱۳۴۴ھ

❁ جاے پیدائش: پھلواری شریف، پٹنہ(بہار) آباواجداد آٹھ پشتوں سے علم دین سے وابستہ رہے۔

❁ ابتدائی تعلیم: گھر پر حاصل کی، اپنے والد اور اپنے بڑے بھائی مولانا شاہ نعمت امام پھلواری سے بہت اثر قبول کیا۔ شاہ نعمت امام فرنگی محل لکھنؤ کے مدرسہ قدیمہ میں پڑھاتے تھے۔

❁ لکھنؤ آمد: ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ آئے، فرنگی محل مدرسہ قدیمہ میں تین سال تک پڑھا، پھر ندوے میں داخلہ لیا اور وہاں سے فضیلت کی ڈگری حاصل کی، دارالعلوم ندوۃ العلما میں اُن کے اساتذہ میں شاہ حلیم عطاؒ، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ، مفتی محمد سعیدؒ وغیرہ تھے۔

❁ پوسٹ گریجویٹ: ''السنۂ سامیات'' (ممتاز)

❁ ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی: (فلسفۂ لسانیات) یونیورسٹی آف لیڈس۔انگلینڈ

❁ سکونت وشہریت: مکہ مکرمہ

❁ عہدے اور مناصب

● استاذ ادب، ادیب اول دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ، وکیل ادارہ نشریات شرقیہ (سعودی عرب) ● مدیر منظمات اسلامیہ واقلیات، رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) ● ایڈیٹر ماہنامہ رابطہ (انگریزی) ● استاذ جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ (ادب عربی ومعہد عربی برائے غیر عرب) ● معتمد تعلیمات ندوۃ العلما لکھنؤ ● مشیرِ اعزازی رابطہ عالم اسلامی (مکہ مکرمہ) ● ممبر آف لنگوئسٹک سوسائٹی کیمبرج (انگلینڈ)

❁ تصنیفات

(۱) ● چند دن دیارِ غیر میں (سفرنامۂ یورپ) شائع شدہ ''المجیب'' دوراول۔ شائع کردہ: دارالاشاعت

خانقاہ مونگیر، بہار۔

(۲) ● دروس الأطفال (عربی)

(۳) ● آسان فقہ (اردو)۔ یہ دونوں کتابیں ''مکتبۂ دین ودانش لکھنؤ'' نے شائع کی تھی جو تقریباً ہر سال ایک دوبار شائع ہوتی ہے، دروس الاطفال کا ایک ایڈیشن ''مکتبہ نشریات اسلامی'' کراچی نے شائع کیا تھا۔

(۴) ● عربی میں نعتیہ کلام۔ اس پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا مفصل مقدمہ ہے۔ اس کے دو ایڈیشن کراچی میں شائع ہوے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ''مکتبۂ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ'' سے شائع ہوا تھا۔ مزید اِضافوں کے ساتھ نیا ایڈیشن عن قریب ''مکتبۂ اسلام'' سے شائع ہونے والا ہے۔

(۵) ● تفہیم المنطق۔ شائع کردہ: دارالعلوندوۃ العلما لکھنؤ، تین یڈیشن، مجلس نشریات اسلام کراچی ایک ایڈیشن، دارالاشاعت کراچی ایک ایڈیشن۔

(۶) ● پیغمبرِ اخلاق وانسانیت۔ (مجموعہ خطابات سیرۃ النبی) شائع کردہ: دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد۔

(۷) ● قرآن کریم تاریخِ اِنسانیت کا سب سے بڑا معجزہ۔ شائع کردہ: دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔

(۸) ● تاریخِ تدوینِ سیرت۔ شائع کردہ: دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔

(۹) ● آفتابِ نبوت کی چند کرنیں۔ شائع کردہ: کراچی۔ دہلی۔

(۱۰) ● میر کارواں (نقوش سوانح مولانا علی میاںؒ)۔ شائع کردہ: پہلا ایڈیشن پاریک آفسیٹ پریس لکھنؤ۔ شائع کردہ: دوسرا ایڈیشن مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ۔

(۱۱) ● نگارشات (مجموعۂ مقالات) دوایڈیشن۔ شائع کردہ: علمی اکیڈمی دہلی۔

(۱۲) ● مفصل تبصرہ (میں بھی حاضر تھا وہاں کا جواب)۔ شائع کردہ: ندائے ملت ٹرسٹ لکھنؤ۔

(۱۳) ● رِدائے رحمت۔ شائع کردہ: مکتبۂ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ۔

(۱۴) ● اِرشادات نبوی کی روشنی میں نظامِ معاشرت۔ شائع کردہ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ۔

(۱۵) ● روحِ کائنات وفضائلِ درودوسلام۔ شائع کردہ: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

(۱۶) ● سفرنامۂ حیات۔ زیرِ طبع: دارالاشاعت خانقاہِ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

(۱۷) ● ترجمات معاني القرآن وتطور فهمه عند العرب ۔ پہلا ایڈیشن دارالِارشاد، بیروت سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ''رابطہ عالم اِسلامی'' مکہ مکرمہ نے شائع کیا۔

(۱۸) ● المذاهب المنحرفة في التفسير (عربی)۔دارالإرشاد، جدہ۔اِس کے نسخے نہیں مل رہے ہیں، ایک نسخہ ام القریٰ کی لائبریری میں ہے۔

(۱۹) ● نظام اللغة الأردية (عربی)۔شائع کردہ: جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ۔

(۲۰) ● شرح كتاب النكت في إعجاز القرآن للرماني۔ شائع کردہ: دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ۔

(۲۱) ● أساس اللغة العربية أول، ثاني، ثالث۔ شائع کردہ: دارابن کثیر دمشق۔

(۲۲) ● تعلم لغة القرآن الكريم (عربی، انگریزی)۔۸/ایڈیشن، جدہ، بیروت، سنگاپور، کوالالمپور، کراچی۔

(۲۳) ● قاموس ألفاظ القرآن الكريم (عربی، انگریزی)۔۱۰/ایڈیشن جدہ بیروت، سنگاپور، کوالالمپور، کراچی

(۲۴) ● مصائب کامداوا (شرح قصیدہ علامہ نحوی مراکشی) (*)



(*) سوانحی نقوش کے سلسلے میں ''تعمیر حیات'' (پندرہ روزہ ترجمان دارالعلوم ندوۃ العلما) میں شائع شدہ بعض مضامین سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

حضرت مولانا سیّد اسعد مدنیؒ

ایک قد آور قائد

۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء — ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء

کاوشِ دشتِ جنوں ہے، ہمیں اِس درجہ پسند
کبھی تلووں سے جدا، خارِ مغیلاں نہ ہوا

حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ پر، راقم نے اردو میں بہ راہ راست دو مضمون لکھے تھے: پہلا مضمون ہفت روزہ ''عالمی سہارا'' نئی دہلی کے لیے بہ عنوان ''مولانا اسعد مدنی.. ایک ہمہ جہت اور بے مثال قائد کی رحلت'' بہ روز بدھ ۱۶ر محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۵ر فروری ۲۰۰۶ء تحریر ہوا، جو ''عالمی سہارا'' کے شمارہ ۴۱، جلد ۳ میں ۱۸ر فروری ۲۰۰۶ء کو شائع ہوا۔

دوسرا مضمون بہ عنوان ''مولانا سید اسعد مدنی.. مردِ آہن کی موت'' یک شنبہ ۲۰ر محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۹ر فروری ۲۰۰۶ء کو تحریر ہوا اور ''ماہ نامہ دارالعلوم''، ''ندائے شاہی'' اور ''ترجمانِ دیوبند'' وغیرہ میں شائع ہوا۔

یہاں دونوں ہی مضامین نذرِ قارئین کیے جارہے ہیں؛ کیوں کہ دونوں کے نہ صرف رنگ و آہنگ میں خاصا فرق ہے؛ بل کہ دونوں کے مشمولات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

مولاناؒ مرحوم پر راقم نے عربی میں، ان دونوں سے الگ مضمون لکھا تھا جو ''الداعی'' عربی کے شمارہ ۱-۲، جلد ۳۰، محرم وصفر ۱۴۲۷ھ مطابق فروری ومارچ ۲۰۰۶ء میں بہ عنوان "العَالِمُ الدَّاعِيَةُ القَائِدُ الهِنْدِيُّ البَارِزُ فَضِيلَةُ الشَّيخ السَّيِّدُ أَسْعَدُ المَدَنِيُّ" شائع ہوا۔

مولانا پر ایک چوتھا مضمون اردو میں خاصا طویل، بہ عنوان ''حضرت مولانا سید اسعد مدنی اور عالمِ اسلام'' لکھا گیا، جو ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' کے خاص شمارے میں شائع ہوا، جو اِس کتاب میں، شامل نہیں۔

مولانا سید اسعد مدنیؒ، اپولو اسپتال میں مسلسل ۳ ماہ بے ہوشی کی حالت میں زیرِ علاج رہ کر دوشنبہ: ۶ر فروری ۲۰۰۶ء مطابق ۷ر محرم ۱۴۲۷ھ کو پونے چھ بجے شام کو مالکِ حقیقی سے جاملے اور سہ شنبہ کی صبح کو دیوبند کے مقبرۂ قاسمیہ میں، اکابرِ دارالعلوم دیوبند کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوگئے۔ مولاناؒ کی وفات سے، ملتِ اسلامیۂ ہند کو شدید صدمہ ہوا۔ مسلمانوں میں قدآور قیادت کے خلا کے اِس دور میں، اُن کا قد سارے قائدین وزعما میں سب سے اونچا تھا۔ وہ اپنی مجموعی صفات کے حوالے سے سب سے ممتاز اور بااثر تھے۔ اُن کی سیاسی، ملی اور قائدانہ سوجھ بوجھ سے، ہندی مسلمانوں کو موجودہ دورِ بے کسی میں بڑا اسہارا ملا۔ دارالعلوم دیوبند کو اُس کے دورِ جدید میں جس طرح ترقی دی، وہ ہرطرح لائقِ تحسین ہے۔ مسلکِ دیوبند، چوں کہ اعتدال، توازن اور روحِ شریعت کی گہری بصیرت پر مبنی مسلک ہے؛ اِس لیے دائیں اور بائیں رجحان کی ہر انتہا پسندی، اُس سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہی ہے اور بالیقین آیندہ بھی رہے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعتدال اور انتہا پسندی دونوں ایسے فریق ہیں، جس میں کسی طرح کی کوئی صلح کبھی ممکن نہیں؛ کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مولانا مدنیؒ نے ہمیشہ ہر مذہبی اور سیاسی انتہا پسندی سے، کام یابی سے لوہا لیا؛ اِس لیے اِس طرح کے رویّے کے حامل اَفراد اور جماعتیں، سچی بات یہ ہے کہ اُن کے دم قدم سے ہمیشہ خائف رہتی تھیں اور دارالعلوم کے مسلک کے مُعاندِین، اُن سے بہت گھبراتے تھے۔

اُن کی کام رانیوں کا ضامن وصف

مولانا سیّد اسعد مدنی چستی، ہمہ وقت سرگرمِ عمل رہنے اور سستی سے بالکلیہ مُبرَّا شخصیّت کا نام تھا۔ بلند ہمتی، خوداعتمادی اور اِرادے کی پختگی میں وہ اپنے عظیم والد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوَّر اللّٰہُ مرقدہ کا پرتو تھے۔ ہر وہ ہدف جس کی صحت پر اُنھیں یقین ہوتا، ہر طرح کے موانع کو عبور کر کے اُس کو پالینے کی ایسی جتن کرتے کہ

لوگوں کو حیرت ہوتی۔ فریقِ مخالف کے توڑ کی تدبیر تک بہ عجلت ذہنی و عملی رسائی کی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ پیچیدہ مسائل و مشکلات کے حل تک سرعت سے جا پہنچنے کا ہنر، اُن سے بہتر کسی کے پاس نہ تھا۔ مسلم عوام سے ہمہ وقت اور ہر سطح پر مربوط رہنے کے فن میں وہ بہ جا طور پر طاق تھے اور اِس رابطے سے سیاسی، ملی اور دینی مقاصد کی تکمیل کے لیے وسائل جٹا لینے میں وہ بلا کی مہارت رکھتے تھے۔ سخاوت، سیر چشمی (جو اُنھیں اپنے عظیم والد اور اپنے محترم خاندان سے وراثت میں ملی تھی) پر وہ اِس خوب صورتی سے اور اِتنے بھرپور انداز میں کار بند تھے کہ اُنھیں برتنے والا ہر آدمی خاندانِ سادات کی فیاّضی پر از سرِ نو ایمان لے آتا تھا۔ اُنھوں نے اِس وصف کے ذریعے بھی، جہاں نیک نامی اور شکر گزاری حاصل کی، وہیں بڑے بڑے معرکے بھی سر کیے۔ بلاشبہہ یہ صفت اُن کی بہت سی کام رانیوں اور شادکامیوں کی ضامن تھی۔

ہمہ گیر اور بے نظیر مقبولیّت

ہندوستان میں دین کی بقا کے سب سے بڑے رمز: دارالعلوم دیوبند کے اِرد گرد کے خطّوں اور ضلعوں کے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے عظیم والد کی مجاہدانہ و زاہدانہ زندگی کی لاثانی اور لافانی محبت کی تخم ریزی کی نہ صرف ہنرمندانہ نگہ داشت کی؛ بل کہ ملی سرگرمیوں کے ذریعے، اُس کی آب یاری کی اور ملک و ملت کو بہت فائدہ پہنچایا، بالخصوص اُس سے دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علما کو غیر معمولی فائدہ ہوا۔ ہندوستان کے کسی مسلم قائد اور زعیم کو یہ دعویٰ کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی تھی کہ اِس ملک کے کسی خطّے میں بھی، اُس کو مسلمانوں میں وہ ہمہ گیر و ثمر آور مقبولیّت و عقیدت حاصل ہے، جو مولانا اسعد مدنی کو حاصل تھی؛ اِسی لیے دہلی میں اور دیگر مرکزی شہروں میں، کسی بھی تحریک، احتجاج، مظاہرہ اور تاریخ ساز جلسے کے لیے، اُن کی صرف ایک اپیل، ایک آدھ دورے اور عاجلانہ کوششوں کے ذریعے، عوام و خواص کی لاکھوں کی جو بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی، وہ

کسی اور کے بس کی بات تھی نہ ہوسکتی تھی اور نہ اب مُتصوَّر رہے۔

اپنی مُنفرِد، مُتوازِن، دھیمی اور مُستحکم سوچ اور پالیسی، نیز سیکولرزم کے صحیح، شفّاف اور سچے تصوُّر پر غیر مُتزَلزِل ایمان اور عمل کی وجہ سے، برادرانِ وطن کے بڑے طبقے میں اور سارے غیر مسلم زعما و سیاست کاروں کے نزدیک، جو اعتماد، عظمت اور ساکھ، اُن کی تھی کسی اور مسلم قائد اور زعیم کے لیے، اِس مقام تک پہنچنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ہے اور کہنے دیجیے کہ اِس مشکل کو سر کرنے والا کوئی مسلمان قائد و زعیم؛ دور دور تک نظر نہیں آتا۔

وجہِ امتیاز

اُن کا ذہن اور عمل ایک ہی وقت میں کئی مشکل محاذوں پر سوچنے اور اپنا اثر دکھانے کی غیر معمولی طاقت رکھتے تھے۔ عام قائدین و زعما کے لیے، ایک وقت میں کسی ایک ہی سَمتُ میں، سوچنا اور سرگرمِ عمل ہونا ممکن ہوتا ہے۔ مولاناؒ کی اِسی صلاحیت کی وجہ سے یہ ہوا کہ حرکت و عمل کی اُن کی زندگی میں بہت سے لوگ، اِخلاص سے یا کسی مصلحت کے تقاضے سے، اُن کے کارواں سے ٹوٹے اور اُن سے بدگمان ہوکر، اُن کی بزم سے نکلے، جن میں سے متعدد لوگ، اُن سے پہلے ہی اپنی آخرت کی منزل کو جا لیے ——— اللہ اُنھیں بھی اور اِنھیں بھی غریقِ رحمت کرے ——— لیکن اُن میں سے زندہ اور مردہ کسی قائد و زعیم کو، اُن کو مغلوب کر دینے، یا اُن کو اُن کی سَمتِ سفر سے ہٹا دینے کی طاقت مُیسّر نہ آسکی، جو خود ریکارڈ کرنے کی چیز ہے اور اُن کی غیر معمولی تفکیری صلاحیّت، فولادی قوّتِ عمل، دوررس پلاننگ اور غنیم کی ہر چال کے توڑ کے لیے، پہلے سے تیار کردہ یا بروقت سوچی ہوئی ''حیلہ شکن'' اسکیم پر، اُن کے ساحرانہ قابو کی بیّن دلیل ہے۔

جہدِ مسلسل اور یقینِ محکم

مولانا مدنیؒ نے مسلمانوں کے معتد بہٖ طبقوں میں مقبولیّت اور عقیدت کی ایسی زندگی گزاری، جس کی سفیدی کو، ان سے اخلاص سے یا نفاق سے اختلاف رکھنے والے

کی ساری کوششوں کے باوجود، داغ دار نہیں کیا جاسکا۔ اُن کی سرگرمیوں اور جہدِ مسلسل ویقینِ محکم کا سیلِ بے پناہ، اُن کے خلاف اچھالے گئے سارے خس وخاشاک کو بہالے گیا۔ وہ محوِ عمل رہنے کا، ایسا گر جانتے تھے جو بدقسمتی سے شہرت اور عزت کے خواہش مندوں کے ذہن میں عام طور پر نہیں آتا۔ مولاناؒ کام کرنا جانتے تھے، تنقید اور حرف گیری کو، اِس طرح خاطر میں نہ لاتے تھے کہ ہمّت ہار کر بیٹھ جائیں۔ دیگر حوالوں کے ساتھ ساتھ، اِس حوالے سے بھی اُن کی زندگی اور سیرت وکردار اِنتہائی سبق آموز ہے۔ وہ ہر اعتراض کا جواب مُثبت عمل اور سفرِ مسلسل کے ذریعے دینا جانتے تھے۔

مولانا مدنیؒ سے کسی کو اتّفاق رہا ہو یا اختلاف، اِس بات سے کسی کو اختلاف کرنے کا یارا نہیں کہ وہ مُعاصِرین زُعما وعلما میں اپنے مجموعی کردار وعمل سے لاثانی تھے، اُن کے جانے سے ایسا لگتا ہے کہ ملّت کی قیادت کی عمارت کا مرکزی ستون، اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے اور کوئی دوسرا استون اُس کی جگہ فٹ ہوتا نظر نہیں آتا۔

مولاناؒ اپنی عظمت ووجاہت اور قوّتِ کار کی وجہ سے، مسلکِ دیوبند کے سب سے بڑے پاسبان تھے۔ پاسبانی کے اِس محاذ پر بھی اُنھوں نے بہت ٹھوس کارنامے انجام دیے اور اِس حوالے سے کسی صلح، بھید بھاؤ کو قبول نہیں کیا اور کسی ملامت کنندہ کی ملامت کو خاطر میں نہیں لائے۔ وہ حق اور باطل (بالخصوص عقیدہ کے حوالے سے) کو گڈمڈ کرنے کی راہ پر ایک قدم بھی چل نہیں پاتے تھے؛ اِسی لیے، اُن کے بہت سے مُعانِدین یہ تک کہہ بیٹھتے تھے کہ مولانا اسعد ہر جگہ ایک اینٹ کی اپنی الگ مسجد بنانے لگتے ہیں۔ یہ وصف اُن میں واقعتاً اپنے عظیم والد شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نیز اکابرِ دیوبند سے منتقل ہوا تھا، جو حق وباطل کے معجون پر ایمان رکھتے تھے نہ عمل کرتے تھے۔

عظمت کا راز

مولاناؒ نے بیرونِ ملک بھی عظمت وشہرت حاصل کی اور وہاں کے عوام اور حکومتوں

نے اُنھیں اہمیّت دی۔ وہ متعدّد ملکوں کے اِداروں کے صدر اور سر پرست تھے۔ اُنھوں نے دعوتی، ثقافتی اور تربیتی اِتنے دورے بیرون ملک اور اندرونِ ملک کے کیے کہ کئی مرتبہ ذرائع اِبلاغ میں یہ آیا کہ اُن سے زیادہ اَسفار کسی دینی یا دنیوی وسیاسی قائد نے نہیں کیے۔ وہ سیلاب کی رَو کی طرح بے طرح بہنا جانتے تھے۔ ایک ایک روز میں کئی کئی جلسوں اور میٹنگوں کو خطاب کر لیتے تھے۔ تھکاوٹ، گراوٹ، آرام، ٹھہراؤ اور پڑاؤ سے وہ واقف نہ تھے۔ یہی اُن کی عظمت کا راز، اُن کی عزّت کا مرکزی سبب اور اُن کی عقیدت کی محوری وجہ تھی۔ بہت سے دانا یا نادان اُن کی ساری عظمتوں کو، اُن کے عظیم والد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی غیر معمولی محبت وعقیدت کی دین سمجھتے ہیں، جو اللہ پاک نے اُنھیں اُن کی خاکساری، اِخلاص اور للّٰہیت کی وجہ سے عطا کی تھی؛ لیکن میرا مطالعہ مجھے یقین دلاتا ہے کہ اِس کے ساتھ ساتھ، مولانا اسعد مدنیؒ کی ملک گیر عظمت ومقبولیّت کی وجہ اُن کی غیر معمولی فَعّالیت اور اِفادِیّت تھی؛ ورنہ بہت سے عظیم والدوں کی اولادوں کو (جو مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ ہی کی طرح دینی وعلمی سطحوں پر غیر معمولی تھے) مولانا اسعد مدنیؒ کے عُشرِ عشیر بھی عظمت ومقبولیّت مُیَسَّر نہ آسکی، حال آں کہ خواہش، کوشش اور فکر وعمل کا سرمایہ خرچ کرنے میں کسی نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ سچ ہے: ''توفیق بہ اندازۂ ہمّت ہے ازل سے''۔

مولانا کی ایک اہم صفت

مولانا سیّد اسعد مدنیؒ کی ایک اہم صفت اُن کی نماز باجماعت اور قیام اللیل کی پابندی تھی؛ بل کہ نماز کو انتہائی خشوع وخضوع واِطمینان سے ادا کرنے میں وہ ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ ارکان کی ادائیگی اور تمام اَجزائے صلاۃ کو پورا کرنے میں درازی، سکون اور اِنہماک، مَیں نے اُن کی طرح بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ خواہ کتنی عجلت ہو، وہ نماز میں رواروی اور ''کنسیشن'' کے قائل اور عامل نہ تھے۔ لوگوں کو کتنی عجلت ہو، کوئی بڑا لیڈر

آرہا ہو، یا اُنھیں کسی بڑے سے ملنے جانا ہو، گاڑی تیّار ہو، دستر خوان چُن دیا گیا ہو، جلسے کے مُنتظِمین عجلت مچا رہے ہوں؛ مولاناؒ نماز شروع کرنے کے بعد، اُس کو انتہائی اِطمینان ہی سے ادا کرتے تھے۔

مولانا اسعد مدنیؒ میں مردِ ہشیار کی ذہانت، قائد کی دور رسی، سپہ سالار کی جرأت، عالم کا وقار، داعی کی حکمتِ عملی، سیاست داں کی سمجھ داری، سپاہی کی تیز روی، مُصلِح کی فکرمندی، برسرِ جنگ سالارِ لشکر کا اِحساس ذمے داری، مثالی عبادت گزار کا اِنہماک، پیدائشی فیّاض وسخی کی کشادہ دلی اور ہمہ جہت مقابلے کی صلاحیّت رکھنے والے مُحارِب کی چوکسی اور بیداری تھی۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں؛ لیکن اُن کا کام اور نام بہت دنوں تک زندہ اور اُن کے لیے دعا اور جاری ثواب کا ذریعہ بنے رہیں گے۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ (۱)

---

(۱) تاریخ تحریر: بدھ ۱۵/فروری ۲۰۰۶ء = ۱۶/محرم ۱۴۲۷ھ، شائع شدہ ہفت روزہ ''عالمی سہارا'' اردو نئی دہلی، شمارہ ۴۱، جلد ۳، ص ۱۳، بہ تاریخ ۱۸/فروری ۲۰۰۶ء۔

مولانا سید اسعد مدنیؒ.. یعنی مردِ آہن

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا ، بے جُرأتِ رندانہ

عرصہٴ دراز سے (جس میں ۳ ماہ یعنی از شبِ ۵-۶/ نومبر ۲۰۰۵ء تا شام ۶/ فروری ۲۰۰۶ء، مطابق سنیچر- اتوار: ۲-۳/ شوال ۱۴۲۶ھ تا سموار: ۷/ محرم ۱۴۲۷ھ، مستقلاً موت وحیات کی کش مکش سے دوچار رہے) بیماری سے نبرد آزما رہنے کے بعد، بالآخر مردِ آہن مولانا سیّد اسعد مدنیؒ نے، موت کے آگے سپر انداز ہوکر ۶/ فروری ۲۰۰۶ء کی شام کو ۵ بج کر ۳۵ منٹ پر، دہلی کے اپولو ہسپتال میں آخری سانسیں لے لیں اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ اللہ پاک نے اُن کے لیے جتنی زندگی مُقدَّر کررکھی تھی، اُس سے ایک لمحہ بھی زیادہ وہ کیوں کر جی سکتے تھے:

ایک لمحے کی اِجات بھی نہیں ملنے والی
موت آتی ہے تو دستک بھی کہاں دیتی ہے

مولاناؒ کی کمی کا احساس

دنیا میں ہر آن موت وحیات کی پنجہ آزمائی جاری رہتی ہے۔ زندگی پر موت کی یقینی فتح ایک غیر معمولی واقعہ ہے؛ لیکن ہر وقت اور ہر جگہ اور ہر موسم میں پیش آنے کی وجہ سے زندوں کا ایک ہی لمحے میں مردہ ہوجانا اور پھر لوٹ کے کبھی نہ آنا، ایک عام سا واقعہ بن گیا ہے، جس پر کسی کی توجہ مرکوز نہیں ہوتی؛ لیکن جب کوئی ایسا اِنسان دنیا سے منھ موڑ

لیتا ہے، جس کی زندگانی، خود اُس کے لیے اور دوسروں کے لیے مفید تھی، تو اِفادیّت کے بہ قدر، دنیا والوں کو اُس کے چلے جانے کا غم ہوتا ہے اور اُس کو کھو دینے کے بعد، اُس کی قدر و قیمت کا اِحساس زیادہ ہوتا ہے، خصوصاً تب جب اُس کا کوئی جانشیں نظر نہیں آتا اور صلاحیّت و اِفادیّت کے حوالے سے، اُس کے بعد کسی بے جوڑ اِنسان پر مجبوراً انحصار کرنا پڑتا ہے۔ کچھ اِسی طرح کا اِحساس مولانا سید اسعد مدنیؒ کے اٹھ جانے کے بعد ہو رہا ہے۔ مولاناؒ کی کمی پورے ملک میں شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔

موت اُس کی کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

مولاناؒ کے عمل کی مرکزی سمتیں

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کاموں کی بہت سی سمتیں تھیں۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ اُنھوں نے مدینۂ منورہ میں گزارا، جہاں اُن کے خاندان کے لوگ متوطن ہیں۔ پھر دارالعلوم میں مدرس ہوئے۔ اِس عرصے کی کوئی تفصیل مجھے معلوم نہیں؛ اِس لیے اِس حوالے سے میں کوئی گفتگو نہیں کرسکتا۔ تدریس سے از خود سبک دوشی کے بعد، وہ جمعیۃ علما کی قیادت کے میدان میں آگئے، جو اُن کے فکر و عمل کی دوسری سَمْت تھی۔ جمعیۃ علما کی نظامت سے صدارت تک کے دور میں (جس پر وہ وفات تک فائز رہے) ملک و ملّت کی سطح پر دو مرکزی خدمتیں انجام دیں:

(الف) مسلمانوں کے حقوق کی دست یابی اور نا اِنصافیوں کے اِزالے کی ہمہ گیر کوششیں اور اِسلامی اِداروں اور مراکز اور تعلیم گاہوں اور مساجد و مقابر و مزارات کی حفاظت کے لیے زبردست اور جامع جد و جہد، جس میں وقتاً فوقتاً غیر معمولی بھیڑ والے جلسوں، مظاہروں اور طویل المیعاد تحریکوں کے ساتھ ساتھ، صدر جمہوریہ، وزیرِ اعظم اور مُتعلّقہ وزرا و حکام و افسران سے ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعے، ارتباطِ مسلسل

شامل ہوتا۔

(ب) مسلم کش فسادات پر حکومتِ وقت سے پر زور اور مؤثر احتجاج اور ساتھ ہی مُتاثّرین کی تعمیری اور ٹھوس مدد اور اس کے لیے قریہ بہ قریہ اور کو بہ کو مسلسل چکر اور دوڑ دھوپ۔ نیز قدرتی آفات کے موقع سے مصیبت زدگان کی ہمہ جہت مدد اور حکومت کو اُن کی دادرسی کے لیے جھنجھوڑنا۔

مولاناؒ نے دونوں سطحوں پر عمل کے لیے ہمیشہ جمعیۃ علما کی تاسیسی روح اور اُس کے اوّلیں قائدین کے عملی و نظری طرزِ عمل سے روشنی کے حصول کے ساتھ ساتھ، اپنی ہمت و عزیمت، دوررس منصوبہ بندی اور نتیجہ خیز حکمتِ عملی سے فائدہ اُٹھایا۔ نیز ملک کے سیکولر کردار، دستور کے مزاج اور مختلف المذاہب باشندگانِ ملک کے لیے اُس کی شفقت ریز مُلاءَمَت سے نہ صرف استناد کیا؛ بل کہ ہمیشہ، ہر جگہ، ہر موقع سے اُس کی دُہائی دی اور ملک کے سیکولر ضمیر پر، ایسی زبردست دستک دی کہ مسلمانوں کے خلاف عصبیّت، نفرت اور دشمنی سے مسموم فضا میں، جو انتہا پسند اور جارحانہ جذبات رکھنے والی ہندو جماعتوں اور اَفراد نے بنائی ہے، اُن کی بات زیادہ یا کم ضرور سنی گئی اور اُس کا نتیجہ دیر یا سویر، کم یا زیادہ ضرور نکلا۔

اُن کے کام کا انداز

اِسی نقطے کو پیشِ نظر رکھتے ہوے، مولاناؒ نے ہندی مسلمانوں کے مسائل کو ہندوستان کے اَربابِ حَل وعقد کے سامنے کبھی بھی صرف مسلمانوں کے مسائل کی حیثیت سے پیش نہیں کیا؛ بل کہ اُنھیں سرکاری اور عوامی سطحوں پر مرکزِ توجہ بنانے کے لیے، ملک کے سیکولر کردار کے حوالے کو، اِتنی شدّت کے ساتھ اُجاگر کیا کہ بعض اُن برادرانِ وطن زُعَما کو، جو سیکولر زُعَما کی دوسری صف سے تعلّق رکھنے اور صفِ اول کے زُعَما سے تربیت پانے کے باوجود، سیکولرزم کی روح سے کسی غرض یا مرض یا مجبوری کی

وجہ سے، اِغماض کرنے لگے تھے، سیکولرزم کا بھولا ہوا سبق پھر یاد آ گیا۔

اپنے اکابر مجاہدینِ آزادی (خواہ مشائخ دیوبند ہوں یا دگر بانیانِ جمعیّت) کی طرح اُن کا اِیمان تھا کہ آزاد ہندوستان میں، محض مسلم اِکائی کی بات، محض اِکائی ہونے کی حیثیت سے منفردانہ طور پر نہیں سنی جائے گی اور اگر خدا نہ خواستہ بعض نادان مسلم سیاست دانوں کی طرح، مسلم مسائل اور حقوق کی لڑائی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے برادرانِ وطن کی رائے عامہ کو یہ محسوس ہو کہ مسلمان اِس ملک کے سارے ہندوؤں کو (جن کی اکثریت کے ہاتھ میں ہی ملک کی نکیل ہے اور رہے گی) دشمنِ محض ہی تصوّر کرتے ہیں اور اُن سے دو دو ہاتھ کر لینے کے لیے تیار ہیں، تو اِس طرزِ عمل سے آزاد ہندوستان میں کوئی بھلا نہ ہوگا اور نہ کوئی حق حاصل کیا جا سکے گا۔ ہندوستان میں اقلیّت (جس میں مسلمان بھی شامل ہیں) اور اکثریت کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے ہمیشہ یہ مُستحضَر رکھنا ضروری ہے کہ ملک کی تقسیم سے (خواہ اِس کا ذمّے دار کوئی ہو: ہندو یا مسلمان یا دونوں) اور قیامِ پاکستان سے، اکثریّت یعنی ہندوؤں کے ضمیر کو خواہی نہ خواہی چوٹ لگی ہے۔ اکثریّت کے بہت سے نادان اَفراد (جن کی تعداد انتہا پسند اور جارحیّت پیشہ ہندو قائدین وزُعَماَ کی شب و روز کی جہدِ مسلسل کی وجہ سے بھیانک طور پر بڑھتی جا رہی ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ اِسلامی اقلیّت کو پاکستان کی شکل میں ''حق'' یا ''اِنعام'' مل چکا ہے؛ لٰہذا اب جو یہ باقی ماندہ ملک ''ہندوستان'' کے نام سے ہے، صرف اکثریّت کا حق یا اُس کی بلاشرکتِ غیرے ملکیت ہے۔ مسلمانوں کو، اپنا حق لے لینے کے بعد بھی اگر یہیں رہنے پر اِصرار ہے، تو ملک کا دستور سیکولر ہو یا لچک دار، دو نمبر کا شہری بن کے رہنا پڑے گا اور اب تو آئین کو بدلنے، اُس کی سیکولر روح کو ختم کر دینے کی بھی یہ عناصر مانگ کر رہے ہیں، جن کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان دو نمبر کا شہری بن کر رہنا از خود گوارا نہیں کریں گے، تو وطنی حقوق کی تقسیم میں ہم اُن کے ساتھ بے انصافی کرنے کا مکمل حق رکھتے ہیں اور اگر مسلمان زیادہ بے لگام ہوں گے، تو ہمارے پاس فسادات، مسجدوں پر قبضہ کر لینے اور

اُنھیں مندر ثابت کردینے، نیز مسلمانوں کے سرکار سے مدد یافتہ اداروں کا اقلیتی کردار سلب کرلینے، جیسے بہت سے کارگر اسلحے موجود ہیں۔ اِسی کے ساتھ مسلمانوں کے دینی اِداروں اور جماعتوں اور اَفراد کو دہشت گرد قرار دے کر، اُن کے خلاف انسدادِ دہشت گردی کے قانون کی مشق اور ستم اِیجادی کا ہنر بھی ہمیں معلوم ہے۔ سرکاری ملازمتوں، سرکاری حقوق وواجبات کی تقسیم کے اِداروں کے مناصب تک پہنچنے کی راہیں، مسلمانوں پر آہستہ آہستہ اور بالآخر بالکلیّہ بند کردینے کے عمل سے ہمیں کون روک سکے گا؟۔ قانون سازی کے اِداروں اور انتظامیہ میں بھی ہم ہی ہیں، عملی طور پر دو نمبر کی شہریّت کی حامل اقلیت آٹے میں نمک کے برابر ہے؛ لہٰذا عملاً جو ہم چاہیں گے وہی ہوگا۔

تلخ حقیقت کا اِدراک اور حکمتِ عملی

مولانا مدنیؒ مذکورہ تلخ حقیقت کا، اِتنا اِدراک رکھتے تھے، جو واقعہ یہ ہے کہ کسی مُعاصِر قائد کو حاصل نہ تھا؛ اِس لیے وہ مسلمانوں کے سارے مسائل کی ہر لڑائی، اقلیتوں اور مسلمانوں کے تئیں ملک کے دستور کی تصریحات اور تقاضوں کی روشنی میں، سیکولر ہندوؤں کو ساتھ لے کر، ہنر مندی سے لڑتے تھے اور جیت جاتے تھے یا جیتنے کی راہ ہموار کردیتے تھے۔ اللہ نے اُنھیں برادرانِ وطن کے سیکولر مزاج طبقے کو قریب رکھنے کا بڑا سلیقہ دیا تھا اور یہ طبقہ بھی مولاناؒ کی سیکولر مزاجی پر پوری طرح مطمئن تھا۔ بڑے سے بڑے ہندو لیڈر کو مولاناؒ سے کوئی وحشت نہیں ہوتی تھی؛ کیوں کہ اُس کو مولاناؒ کی وطن پرستی پر مکمل اعتماد تھا اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ مسلمانوں کی زیادہ مُعتَبَر نمایندگی کا حق رکھتے ہیں۔

مسلمانوں میں گروہی عصبیّت اور مسلکی تحاسد اور تباغض کی بیماری نہ ہوتی تو دگر زُعَما، مولانا مدنیؒ سے ہر اختلاف کے باوجود، اُن کی اِس کام یاب حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھاکر، اِس ملک میں مسلمانوں کے آیندہ مسلمان باقی رہنے کی راہ، بڑی حد تک آسان بناسکتے تھے؛ لیکن افسوس کہ لوگ موت سے پہلے ہی جیتے جی بھی ایک دوسرے سے

علاحدہ اور ذہنی وجسمانی طور پر دور رہنا چاہتے ہیں، حال آں کہ موت دوری پیدا کرنے کے لیے کافی ہے:

كَفَىٰ بِالْمَمَاتِ فُرْقَةً وَتَنَائِيَا

بل کہ مُتعَدِّد مسلم جماعتوں کے لوگ تو مولاناؒ کی اِس کارگر حکمتِ عملی کو "مُدَاہَنَت" اور "نیم دروں اور نیم بروں" کی پالیسی سے تعبیر کرتے تھے؛ تاکہ اُن کی اپنی ناکردگی پر پردہ پڑا رہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچتے تھے کہ مولاناؒ اپنی تدبیر سے ملّت کے لیے جو کچھ کر لیتے ہیں یہ لوگ اُس کا عشرِ عشیر بھی کیوں نہیں کر پاتے؟

میں سمجھتا ہوں کہ ملک کے غیر مسلم سیکولر زُعَماَ وقائدین بھی، حالیہ زمانے میں مولانا مدنیؒ کو، ملک کے سیکولر کردار کی بقا کی جنگ کے ہراول دستے کا ممتاز سپاہی تصوّر کرتے تھے؛ اِسی لیے اُن کی موت کے بعد ہفتہ عشرہ تک جس طرح قومی اور علاقائی سطح کے بڑے اور چھوٹے مسلمانوں سمیت غیر مسلم زُعَماَ وقائدین کی بڑی تعداد، جمعیۃ کے مرکزی آفس واقع آئی ٹی او دہلی کے علاوہ اُن کے دیوبند کے دولت کدے پر، پارٹی، انتساب اور وفاداری سے اوپر اُٹھ کر آتی رہی اور اُن کی روح کو جذباتی انداز میں والہانہ طور پر خراجِ عقیدت اور اُن کے اہلِ خاندان اور اَفرادِ خاندان کو دلاسا دیتی اور تعزیت کرتی رہی، اُس کی مثال ہندوستان کے کسی اور مسلم زعیم وقائد کے حوالے سے، اِس دورِ آخر میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ لوگوں کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ مولاناؒ سے مسلمانوں و عُلَمَا و دُعاۃ کے علاوہ، غیر مسلم زُعَماَ کی اِتنی بڑی تعداد، اِس درجہ تعلق رکھتی ہے کہ وہ اُن کی وفات کے بعد، اُن کی کمی کو اِس شدت سے محسوس کرے گی کہ اُن کے خاکی دربار میں اُن کا تانتا لگا رہے گا۔

مولانا مدنیؒ نے تین میقاتوں (۱۹۶۸ تا ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۰ تا ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۸ تا ۱۹۹۴ء) میں ۱۸ سال تک، کانگرس کی نامزدگی پر، راجیہ سبھا (ایوانِ بالا) کی رکنیت کی ذمے داری انجام دی اور اِس منصب کو اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے مسائل کی طرف

ملک کے سب سے بڑے مقتدرہ اِدارے کی توجّہ مرکوز کرنے کے لیے اِستعمال کیا۔ یہاں بھی اُنھوں نے ملک کے سیکولر دستور کو ہی اَساس بنایا اور اپنی تقریروں، تجویزوں اور مُباحثوں میں اُسی کو پیشِ نظر رکھا۔ لفظی جذباتیت، بے اَساس و بے فائدہ جوش سے احتراز کیا؛ کیوں کہ اِس سے اکثریت کے اربابِ اختیار اور اصحابِ حلّ وعقد مُتاثّر نہیں ہوتے؛ لیکن ضرورت کے مطابق اُن کی وطنی غیرت اور قومی وفاداری کو بہت بار سلیقے سے للکارا، چناں چہ اُن کی بہت سی باتیں سنی گئیں۔ پارلیامنٹ کی اُن کی تقریریں چھپ چکی ہیں، انھیں پڑھا جاسکتا ہے۔

فتح مند قائد

مولاناؒ نے خدا کی تقدیر کے بہ موجب علمی اَشغال کو اپنا وظیفۂ حیات نہیں بنایا؛ لیکن خدا نے اُنھیں میدانِ قیادت وسیادت میں جو کام کرنے کی توفیق بخشی، اُس میں فتح مندیوں نے بے طرح اُن کے قدم چومے۔ ملک وملت کے عام مفاد کے علاوہ اُنھوں نے جمعیۃ علما اور دارالعلوم دیوبند سے عوام کے رشتوں کو مضبوط تر کیا اور ہماری جماعت کے علما وخواص کو مسائل کے اِحساس، اُبلتے ہوے خطرات کے اِدراک، مشکلات کے حل کے طریقوں کے شعور اور تقاضاہاے زمانہ کی معرفت کے ساتھ ساتھ، کسی لچک کے بغیر اپنے مُعتَدِل، مُتَوازِن اور مستقیم مسلک پر جمنے کے نقطے پر یک جا کرکے، ہمت اور ولولے کے ساتھ سرگرم عمل رہنے کا حوصلہ دیا اور اِس مسلکِ حق کو چیلنج کرنے والے دینِ صحیح کے نام نہاد علم برداروں کو نہ صرف چیلنج دیا؛ بل کہ مُتعَدِد بار اُنھیں رگیدا، دوڑایا اور اُن کی صفوں میں زلزلہ پیدا کردیا۔

اِقدامی حملے کا امتیاز رکھنے والا سپاہی

مولانا مدنیؒ میدانِ عمل کے آدمی تھے، اُن کا ذہنی سانچہ اِسی کے لیے تشکیل ہوا

تھا۔ محض آفس، دفتر اور کسی مرکز میں بیٹھ کر کاغذات کی ورق گردانی کرنا اور کسی پُرسکون کمرے میں بیٹھ کر قرطاس و قلم کا رشتہ جوڑنے کے عمل پر انحصار کرنا، ہے تو اپنی جگہ مفید اور دیرپا اور دوررس عمل اور جو لوگ اِس کے لیے مخلوق ہوے ہیں، اُن کے لیے یہ کام آسان ہے اور میدانِ عمل کی ضربِ کلیمی سے سہل تر ہے؛ مگر بعض دفعہ اِس کا وہ فائدہ مُرَتَّب نہیں ہوتا، جو میدانِ کار میں نکل کر ایک ظالم، ایک بے اِنصاف، ایک بے لگام جابر اور ایک جارحیّت شعار سچائی کے دشمن اور تیرگی کے علم بردار پر، بڑھ کر وار کرنے والے کے ذریعے مُرَتَّب ہوتا ہے۔

مولاناؒ اِقدامی آدمی تھے، وہ آگے بڑھ کے حملہ کرنا جانتے تھے، دفاعی پوزیشن کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے ہم مسلکوں کو بھی یہی راہ دکھائی اور اِس پر چلنے کا گر اُنھیں بتایا۔ کانفرنسوں، سمیناروں اور جلسوں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں اُس کے دورِ نَو میں، متعدد باطل فرقوں اور منحرف جماعتوں کے داؤپیچ کو جاننے کے لیے، محاضرات کا پایدار نظام قائم کروایا جو ہنوز معمول بہٖ ہے۔ اُنھوں نے مسیحی برطانوی استعمار کے کاشت کردہ نبوتِ محمدی کے حریف فرقہ: قادیانیت کی توڑ کے لیے دارالعلوم دیوبند میں باقاعدہ ختمِ نبوت کے شعبے کی تاسیس کا مشورہ دیا، جو اَب پہلے سے زیادہ تازہ دم ہے۔

اِنسان شناسی اور کام لینے کی صلاحیّت

مولانا سید اسعد مدنیؒ کی ایک بڑی صلاحیت، اِنسان شناسی تھی۔ وہ بہت جلد سمجھ جائے تھے کہ مُتَعَارِفِیْن اور لائق افراد میں سے کون کس خوبی اور خرابی کا آدمی ہے۔ جمعیۃ علما کی قیادت کے منبر سے، سال ہا سال جو ملکی و ملی کارنامے اُنھوں نے انجام دیے، اُن میں بہت بڑا رول اُن کی اِنسان شناسی اور لیاقت کے عرفان کا رہا ہے۔ اُنھوں نے اَن گنت کام کے آدمیوں کی دریافت کی اور اُن سے مختلف الانواع کام لیے۔ لائق انسانوں کا حصول جتنا مشکل کام ہے اِس کو اہلِ دانش اچھی طرح جانتے

ہیں اور اِس سے بھی زیادہ مشکل اُن سے کام لینا ہے۔ ہر لائق آدمی میں ایک طرح کی ''نالائقی'' بھی ہوتی ہے، آپ کو ایسا کوئی آدمی اِس روئے زمین پر ہرگز نہیں ملے گا جو صرف لائق ہو۔ صرف لائق فرشتے ہوتے ہیں اور اَنبیا اور اُن کے اصحاب۔ زندگی جینے، برتنے اور کام کرنے سے یہ تجربہ ہوا کہ جو آدمی جتنا لائق ہوتا ہے اُس میں اسی درجہ ایک طرح کی ''نالائقی'' ضرور ہوتی ہے۔ صرف نالائق میں غالبًا اِس طرح کی ''نالائقی'' ہوتی ہی نہیں جو لائق کا وجہِ امتیاز ہوتی ہے۔ کام لینے والا ذمے دار، افسر اور آقا، لائق کی لیاقت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کی ''نالائقی'' کو ہنرمندی کے ساتھ نہ صرف گوارا کرتا ہے؛ بل کہ بعض دفعہ اُس کو (نالائقی کو) اپنا رنگ دکھانے کا موقع بھی دیتا ہے؛ کیوں کہ لائق کی یہ ''نالائقی'' اُس کی شخصیّت کی کلید ہوتی ہے۔ اب اگر اِس کی راہ میں رکاوٹ ڈال دی جائے، تو لائق کے لیے، لیاقت کے حوالے سے اپنا رول ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

میں نے لائق کی جس ''نالائقی'' کی طرف اِشارہ کیا ہے، اُس کی تعبیر آپ کسی لفظ سے کر لیں ''ناز ونخرے'' ''خود اعتمادی'' ''ایک قسم کی دیوانگی'' ''اِحساسِ اِفادیّت'' اور دگر جو موزوں الفاظ ملیں، نالائقی کی جگہ ڈال سکتے ہیں؛ لیکن لائق میں ایسا کچھ ہوتا ضرور ہے۔

مولاناؒ نے بہت مُتنوّع کام کیے؛ لہٰذا مُتنوِّع الاستعداد لوگوں کی ''نالائقی'' سے اُنھیں سابقہ ہوا اور اُنھوں نے ہشیاری کے ساتھ، اُن کی استعداد اور لیاقت سے کام لیا، جو واقعی اُن کی بڑائی کی دلیل ہے۔ مجھے دار العلوم کے ایک لائق اہل کار(۱) نے (جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں) ایک بار بڑی اچھی بات کہی: مولانا! اچھا افسر اور ذمّے دار وہ

(۱) میری مراد دار العلوم کے سابق ہیڈ کلرک ''بابو طاہر'' (محمد طاہر حسین) سے ہے، جو دیوبند کے محلہ قلعہ، دیوبند کے باشندے تھے، انگریزی پر اچھا عبور تھا، بڑے محنتی اور احساسِ ذمے داری کے حامل آدمی تھے، ان کی وفات بہ روز جمعرات ۲۸ رشعبان ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۵ رنومبر ۲۰۰۱ء کو ہوئی۔ اللہ غریقِ رحمت کرے۔

نہیں ہوتا، جو خود بہت کام کرے؛ بل کہ کام یاب اور لائق افسر، وہ ہوتا ہے جو دوسروں سے زیادہ کام لے لے۔ کام لینا زیادہ لیاقت کی دلیل ہے۔ خود محنت کرنا اور بہت کام کرنا اِحساسِ ذمّے داری کی تو دلیل ہے، افسر ہونے کی دلیل نہیں۔ قائد اور افسر کے لیے پہلی صفت کا حامل ہونا ضروری ہے، دوسری صفت کا حامل ہونا ضروری نہیں، ہاں اگر پہلی صفت کے ساتھ دوسری صفت بھی ہو تو یہ سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔

مولاناؒ کاوشِ دشتِ جنوں کے سپاہی اور اِس دشت کے فائز المرام راہی تھے۔ وہ تیز روی سے اِس طرح لپکنا جانتے تھے کہ کسی لمحے کو پیچھے مڑنے کا موقع نہیں ملتا تھا، وہ معاصر قائدین میں اِس امتیاز کی وجہ سے اپنی واضح شناخت رکھتے تھے۔ وہ کسی منزل پر جا کر دم لینے کے قائل نہ تھے اور نہ تلووں سے کانٹوں کے نکالنے کی سوچتے تھے۔ وہ اِس شعر کے مصداق تھے۔

کاوشِ دشتِ جنوں ہے ہمیں اِس درجہ پسند
کبھی تلووں سے جدا خارِ مغیلاں نہ ہوا

جو باتوفیق آدمی اِس قسم کا ہوتا ہے، وہ عموماً تیز روی کی وجہ سے کسی پڑاو، یا وقفے پر اِیمان نہیں رکھتا۔ اِس طرح کا آدمی ایک خاص قسم کا مزاج رکھتا ہے کہ بڑھے چلو اور دائیں بائیں نہ دیکھو چہ جائے کہ پیچھے؛ کیوں کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسا کرنا ہمت شکن ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رُفقائے سفر میں سے بہت سے لوگ، اُس سے بچھڑ جاتے ہیں یا وہ خود اُن سے بچھڑ جاتا ہے، بالآخر بچھڑاو یا بچھڑاو آپسی شکوہ سنجی اور بددلی کا باعث بنتی ہے۔ جو آدمی جس درجہ بڑے کام اور بہت کام کا ہوتا ہے، اُس کی زندگی میں خواہی نہ خواہی بچھڑاو اور بچھڑاو کا مرحلہ ضرور پیش آتا ہے۔ یہ مرحلہ قدرتی طور پر مولاناؒ کو بھی اپنی زندگی میں پیش آیا؛ لیکن یہ اُن کی اعلیٰ ظرفی کی بات ہے کہ اُنھوں نے متعدد بچھڑے ہوؤں کو موت سے پہلے ہی گلے لگا لیا اور بچھڑے ہوؤں کے پاس از خود پہنچ گئے اور یک جائی کے بعد ہی اِس دنیا کو الوداع کہا۔ اُن میں سرِ فہرست ہند میں دورِ آخر میں سرمایۂ

ملت کے نگہ بانوں کے سرخیل امام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پڑپوتے مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ العالی ہیں، جن سے اُن کی صلح صفائی کا تاریخی واقعہ ہزاروں فضلاے دیوبند اور محبانِ دارالعلوم دیوبند کی ایسی مسرت کا باعث بنا، جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مولاناؒ کی زندگی نے مزید وفا کیا ہوتا تو کیا عجب تھا کہ صلح صفائی کی بات اُس منزل تک پہنچ جاتی، جس کے تمام فضلاے دیوبند بہت آرزومند ہیں، یعنی دونوں دارالعلوموں کا مکمل اتحاد اور ایک دوسرے میں انضمام۔

اِس راقم کے لیے بہ طورِ خاص، اِس فانی دنیا میں ایک دائمی مسرّت اُس وقت ہاتھ آجاتی اگر اِسی طرح کی صورتِ حال مولانا مدنیؒ اور حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے درمیان پیش آگئی ہوتی؛ لیکن خدا کی مشیت سے ایسا کچھ نہ ہوسکا؛ ورنہ اِس واقعے سے بھی (اگر یہ روبہ عمل آجاتا) فضلاے دیوبند اور بہی خواہانِ دارالعلوم کو پہلے ہی واقعے جیسی خوشی ہوتی۔ اب اِس دنیا میں نہ مولانا کیرانویؒ ہیں نہ مولانا مدنیؒ کہ اول الذکر تو ثانی الذکر سے دس ۱۰ سال ۶۸ اڑسٹھ دن پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوگئے تھے۔ اللہ دونوں کو اپنی اعلیٰ جنت کا مکین بنائے جہاں لوگ مخلص بھائی ور دوست بن کر ہی رہیں گے، اور اِس مادی دنیا کی کدورتیں، وہاں اُن میں سے کسی کا اَثاثہ نہ ہوں گی، وہاں تو اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقَابِلِیْنَ ہوں گے۔

کام کے آدمی کی خاصیّت

بہ ہر کیف مولانا مدنیؒ بہت کام کے آدمی تھے، کام کے آدمی سے بھول چوک، کوتاہی کسی سے اتفاق، کسی سے اختلاف کے مراحل ضرور پیش آتے ہیں۔ کام کی کثرت اور تنوّع کے بہ قدر راہِ عمل میں اِن مراحل کی کثرت بھی ہوجاتی ہے۔ مولاناؒ نے بہت اور مُتنوِّع کام کیے؛ اِس لیے یہ مراحل دگر فعّال قائدین کی طرح اُنھیں بھی پیش آئے۔ کام کرنے والے اِنسان کے لیے، اصل ضرورت اس بات کی ہوتی ہے

کہ وہ دین وشریعت کے مطابق، اپنی دانست میں صحیح سَمت کا تعین کر کے چلتا رہے۔ جب وہ چلے گا اور مسلسل چلے گا تو ہوسکتا ہے کہ ٹھوکر بھی کھائے اور گر بھی جائے۔ جو چلتا ہی نہیں وہ کیا خاک گرے گا۔ ہم سے غلطی یہاں سے ہوتی ہے کہ ہم ہر داعی، قائد اور عالم کے متعلق یہ باور کر لیتے ہیں کہ اِس کا خمیر ملکوتیت سے اُٹھایا گیا ہے، حال آں کہ وہ ہمارے ہی طرح کا اِنسان ہوتا ہے، جب ہم سے غلطی ہوتی ہے، تو اُس سے غلطی کا صدور کیوں ممکن نہیں؟

شیشہ و آہن کی یک جائی

مولاناؒ کا ایک غیر معمولی کمال یہ بھی ہے کہ سیکولر مزاج زُعَمائے سیاست وقائدینِ حکومت اور اُن کے اہل کاروں اور اُن کے مشیروں سے ضرورت کی حد تک مُؤثّر اور طاقت ور تعلق اور رابطے کے ساتھ ساتھ، نہ صرف ایک عالم باعمل کی شان اور ایک داعی اِلی اللہ کی پہچان کے ساتھ شان دار دین دارانہ زندگی گزاری؛ بل کہ اُن کی شناخت ہی بہت بڑے حلقۂ اِرادت وعقیدت والے شیخ ومربی کی تھی، جو مرتے دم تک قائم رہی۔ عبادت وریاضت کا اُن کا معمول کبھی ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ سیاست کی گلی میں اِتنی کثرت سے آمد ورفت کے باوجود، دین کے سارے تقاضوں کو نمایندہ عالم وداعی کی شناخت کے ساتھ پورا کرتے رہنا مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مُعاصِر علما ومشائخ کے درمیان بڑا امتیاز تھا۔ وہ بہ یک وقت مربی وعالم، سیاست داں وسیاست راں، قائد وزعیم، مصلح ومربی، اجتماعی خدمت گزار، فرقِ باطلہ وجماعات منحرفہ سے فاتحانہ لوہا لینے والے اور اندرونِ ملک وبیرونِ ملک زبردست عوامی و سرکاری مقبولیّت کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ یہ امتیاز مولاناؒ کو ورثے میں ملا تھا اپنے عظیم والد دارالعلوم دیوبند کے فرزندِ جلیل شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ سے۔

مولاناؒ سے راقم کا تعارف

یہ راقم دارالعلوم دیوبند کی طالبِ علمی سے قبل مولانا سید اسعد مدنی کو بالکل ہی جانتا نہ تھا، کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ دارالعلوم میں داخلے کے بعد عربی زبان کے سب سے بڑے عبقری معلم اور باتوفیق خدمت گزار حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کے تعلیم عربی زبان کے حلقے میں شامل ہوگیا۔ چند روز گزرے ہوں گے کہ مولاناؒ کی زبان سے مولانا مدنیؒ کا اتنا اور اِس اِس طرح تذکرہ سنا کہ کان اُن کی عظمت کے قائل ہوگئے۔ جب تک دارالعلوم کا طالبِ علم رہا، مولانا مدنیؒ کی بھرپور، مسلسل اور متنوع سرگرمیوں کے مشاہدے، یا اُس کی سماعت اور تذکرے کا دور رہا: مولانا مدنیؒ آرہے ہیں، جارہے ہیں؛ آنے والے ہیں، جانے والے ہیں؛ فلاں کام چھیڑنے والے ہیں؛ فلاں تحریک برپا کرنے والے ہیں؛ فلاں پروگرام کی اِبتدا کرنے والے ہیں؛ فلاں ملک کے سفیر اور ڈپلومیٹ کو دارالعلوم لانے والے ہیں؛ فلاں ملک کے طویل سفر پر جانے والے ہیں؛ فلاں خطے کے طویل دورے کے بعد آج اُن کی واپسی ہے۔

آج یہ شور یک لخت تھم گیا ہے اور ہمیشہ کے لیے۔ امید اِس پر قائم ہے کہ ہر چھوٹے اور بڑے کو بہ ہر کیف یہاں سے جانا ہے۔ از آدم تا ایں دم اَن گنت لوگ جاچکے ہیں، دنیا اُسی طرح قائم ہے اور جب تک خدا کی مرضی ہے قائم رہے گی۔ ماضی کے مقابلے حاضر میں اور حاضر کے مقابلے مستقبل میں ہمیشہ ہی لائق افراد کو دنیا روتی رہی ہے اور آیندہ بھی روتی رہے گی اور کارگہِ حیات اِسی طرح چلتا رہے گا؛ مگر مولاناؒ کے متعلق بار بار یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے:

بچھڑا کچھ اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اِک شخص سارے ''مُلک'' کو ویران کرگیا

مولانا کی ایک پرلطف صحبت کی یاد

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایک پرلطف صحبت، حرمین شریفین میں اُس وقت ملی جب مکۂ مکرمہ میں رابطۂ عالم اِسلامی کی تاسیس کے ۲۵ سالہ جشن اور گولڈن جوبلی تقریبات میں دارالعلوم دیوبند کے حلقے سے مولاناؒ بہ حیثیت صدر جمعیۃ علمائے ہند اور راقم الحروف بہ حیثیت اِسلامی صحافی اور اہلِ قلم شریک ہوے۔ یہ کانفرنس "الدَّعْوَةُ الإِسْلَامِيَّةُ وَسُبُلُ تَطْوِيرِهَا نَظرةً إِلى الْمُسْتَقْبَل" کے عنوان سے ۱۸-۲۲/صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۱-۱۵/اکتوبر ۱۹۸۷ء کے عرصے میں ہوٹل انٹرکونٹینینٹل مکۂ مکرمہ کے مؤتمر ہال میں ہوئی۔ مولاناؒ کو دو روز قبل اور مجھے دو روز بعد دعوت نامہ، بہ ذریعہ تار ملا؛ اِس لیے مولاناؒ افتتاحی نشست میں پہنچ گئے جو خادم حرمین شریفین مرحوم شاہ فہد (۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۱ء-۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء) کی سرپرستی اور صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ میں دوسرے روز پہنچ سکا۔ اتفاق سے جیسے ہی ہوٹل کی بیرونی گیلری میں راقم نے قدم رکھا، سب سے پہلے مولاناؒ ہی اچانک مل گئے اور مسکراتے ہوے فرمایا کہ کل سے ڈاکٹر عبدالحلیم عویس مصری(۱) تمھیں کئی بار معلوم کر چکے ہیں کہ شیخ نور عالم آرہے ہیں کہ نہیں؟ بڑا اچھا ہوا کہ تم آگئے۔ سامنے ہی بِطَاقَةُ الضَّيْف (گیسٹ کارڈ) کی تیاری کا کاؤنٹر تھا، مولاناؒ ساتھ لے گیے اور نہ صرف کارڈ کی تیاری؛ بل کہ مہمان بہ حیثیت اِسلامی صحافی و اہل قلم کی ساری کارروائیوں کی تکمیل تک ساتھ رہے، پھر اُس وقت کی نشست میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ بعد میں بار بار ملاقات ہوتی رہی اور خبر خیریت دریافت کرتے رہے۔ مدینۂ منوّرہ میں ہوائی اڈّے پر ہی فرمادیا کہ دیکھو تم بہ

(۱) جامعہ اِسلامیہ اِمام محمد بن سعود، ریاض کے سابق پروفیسر مشہور اِسلامی اہلِ قلم، جو ہندوستانی علما و دُعاۃ و مفکرین سے بڑے واقف اور اُن کی علمی و فکری و دعوتی خدمات کے بڑے قدرداں ہیں، راقم الحروف سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اِس وقت اپنے وطن مصر ہی میں علمی و تحریری مشاغل میں مصروف ہیں۔

حیثیت صحافی اور قلم کار مدعو ہو، اِسی لیے تمھیں مکۂ مکرمہ میں بھی، اکیلے کا کمرہ ملا تھا، یہاں بھی یہی ہوگا، ہم چوں کہ محض ''ضیفِ مشارک'' (شرکت کنندہ مہمان) ہیں؛ اِس لیے مکہ مکرمہ میں ہمارے ساتھ ایک چینی یا فلپائنی کو ٹھہرا دیا گیا تھا، مُفاہمَت میں پریشانی ہوتی تھی، یہاں تم اپنے ساتھ ہی ہمارا نام کروالینا، اِس سے ہم دونوں کو سہولت ہوگی۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ مولاناؒ بہت خوش ہوے اور بہت دعائیں دیں۔ اللہ اُنھیں اپنی جنت میں نوازے اور تمام حسنات کو دوچند کرے اور سیئات کو جن سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں، حسنات میں تبدیل کرکے اعلیٰ مقام نصیب کرے، آمین۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

مختصر سوانحی خاکہ

- نام نامی: (مولانا سید) اسعد (مدنی)
- والد ماجد: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔
- تاریخ پیدائش: جمعہ: ۶/ذی قعدہ ۱۳۴۶ھ مطابق ۲۷/اپریل ۱۹۲۸ء
- تعلیم: بالکل ابتدائی اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی جو ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء میں فوت ہوگئیں، اُس وقت مولانا سید اسعد مدنی ۹ سال کے تھے۔ والد صاحب سے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر والد صاحب کے خادمِ خاص قاری اصغر علی سہس پوریؒ نے آپ کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری سنبھالی۔ پھر آپ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوے اور سارے تعلیمی مراحل طے کیے۔ ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوے۔
- عملی زندگی: دارالعلوم سے فراعت کے بعد، آپ نے ایک عرصہ مدینۂ منورہ میں گزارا، جہاں آپ کے خاندان کے اَفراد مُتوطّن ہوگئے تھے۔ پھر آپ ۲۸/شوال ۱۳۷۰ھ = ۵/ جولائی ۱۹۵۱ء کو دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہوگئے، آپ نے یہ خدمت ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء تک انجام دی، اس کے بعد قومی وملّی وملکی خدمات دارالعلوم سے مستعفی ہونے کی متقاضی ہوئیں، چناں چہ آپ مستعفی ہوگئے۔

۞ قائدانہ سفر: ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء میں جمعیۃ علما صوبہ اُتر پردیش کے صدر منتخب ہوئے ● ۹/اگست ۱۹۶۳ء مطابق ۱۶/ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ کو جمعیۃ علمائے ہند کے ناظمِ عمومی منتخب ہوئے ● ۱۹۶۸ء (۱۳۸۸ھ) میں جامعہ ازہر مصر کی اسلامی تحقیقات اکیڈمی کے نمایندے منتخب ہوئے اور ۱۹۶۸ء–۱۹۷۰ء، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء میں اُس کی چوتھی، پانچویں، چھٹی اور ساتویں کانفرنس منعقدہ قاہرہ میں شریک ہوئے ● ۱۱/اگست ۱۹۷۳ء (۱۸/شعبان ۱۳۹۳ھ) میں جمعیۃ علمائے ہند کے صدر منتخب ہوئے ● ۲/نومبر ۱۹۸۶ء (۲۸/ربیع الاول ۱۴۰۷ھ) کو نائب امیرِ شریعتِ ہند منتخب ہوئے ● ۹/مئی ۱۹۹۲ء (۸/ربیع الاول ۱۴۱۳ھ) کو امیرِ شریعتِ ہند مُنتَخَب ہوئے ● ۱۴۰۲ھ (۱۹۸۲ء) میں دارالعلوم دیوبند میں نئی انتظامیہ کی استواری کے کچھ ہی بعد آپ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے ● آپ تاحیات آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے رکنِ تاسیسی رہے ● عملی میدان میں سرگرم کار ہونے کے اولین مرحلے میں ہی آپ نے غیر سودی مسلم فنڈ دیوبند میں قائم کیا، جس کی متعدِد شاخیں ملک کے طول وعرض، بالخصوص مغربی یو پی میں قائم ہو چکی ہیں۔

۞ اسفار: مولانا اسعد مدنیؒ نے دنیا کے کونے کونے کا لاتعداد مرتبہ سفر کیا، ذرائع اِبلاغ کے مطابق کثرتِ اسفار کے حوالے سے برِصغیر کا کوئی عالم اور قائد یا داعی الی اللہ آپ کی ہم سری نہ کر سکا۔ آپ نے اندرونِ ہند و بیرونِ ہند دعوتی، اِصلاحی، ثقافتی اغراض اور سمیناروں، کانفرنسوں اور دینی و سیاسی جلسوں میں شرکت کے لیے، ملک کے گوشے گوشے میں اِتنی بار سفر کیا کہ اخبار نویسوں کے بہ قول آپ نے اپنے مستقر پر قیام کم اور سفر میں اپنی زندگی کے اوقات زیادہ گزارے۔

۞ مرض الموت: ۱۴۲۵ھ میں کعبۂ مُشرَّفہ کے غسل کے موقع سے، سعودی عرب کی دعوت پر آپ مکۂ مکرمہ تشریف لے گئے، جہاں حج و زیارت سے شرف یاب ہوئے۔ مدینۂ منورہ میں قیام کے دوران شدید طور پر بیمار ہوگئے، آپ وہاں ایک ہسپتال میں زیرِ علاج رہے، مرض کی شدت کے کم ہونے کے بعد، آپ وطن لوٹ آئے اور دہلی میں ''اپولو'' ہسپتال میں زیرِ علاج رہ کر ایک مدت کے بعد صحت یاب ہو کر گھر واپس آگئے؛ لیکن صحت کی قدرتی حالت بحال نہ ہو سکی۔

۞ حادثۂ وفات: ۵/نومبر ۲۰۰۵ء (شنبہ ۲/شوال ۱۴۲۶ھ) کو آپ وہیل چیئر پر، دارالعلوم کی مسجدِ رشید سے دیوبند میں اپنے گھر واپس آرہے تھے کہ اُس سے پھسل گئے، جس کے نتیجے میں دماغ میں گہرا زخم آیا، دماغ کی رگیں ناکارہ ہوگئیں اور آپ مفلوج ہوگئے۔ دہلی منتقل کیا گیا اور ''اپولو'' ہسپتال میں دوبارہ

داخل کیے گئے، جہاں اعلیٰ سے اعلیٰ علاج ہوتا رہا؛ لیکن آپ مسلسل تین ماہ تک بیہوش رہے، عیادت کنندوں اور معاشرے کے ہر طبقے کے سیکڑوں لوگوں کی روزانہ آمد ورفت رہی، جو آپ کی خبر خیریت معلوم کرنے کے لیے، ہسپتال کے زیریں ملاقاتی ہال میں بھیڑ لگائے رہتے تھے۔ وقتِ آخر آچکا تھا؛ اِس لیے ساری تدبیریں ناکام ثابت ہوئیں اور آپ نے بہ روز دوشنبہ ۷/محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۶/فروری ۲۰۰۶ء کی شام کو ۵ بج کر ۳۵ منٹ پر جان، جاں آفریں کے سپرد کردی۔ سہ شنبہ ۸/محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۷/فروری ۲۰۰۶ء کو صبح تقریباً ۸ بجے آپ کی نمازِ جنازہ میں، جو دارالعلوم میں ادا کی گئی، ایک لاکھ سے زائد علما، مشائخ، طالبانِ علومِ نبوت اور عام مسلمانوں نے شرکت کی اور مقبرۂ قاسمیہ دیوبند میں سپردِ خاک ہوئے۔

❁ **پس ماندگان:** آپ نے اپنے پیچھے پانچ بیٹے، دو بیٹیاں اور دو بھائی، اُن کی والدۂ محترمہ اور خاندان کے بہت سے افراد کے ساتھ ساتھ مریدوں، معتقدوں، محبین اور اہلِ تعلق کی بہت بڑی تعداد چھوڑی۔(*)

(*) تحریر کردہ در اردو بہ روز یک شنبہ: ۲۰/محرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۹/فروری ۲۰۰۶ء، شائع شدہ در ماہ نامہ ''دارالعلوم'' و ماہ نامہ ''ندائے شاہی'' و ماہ نامہ ''ترجمانِ دیوبند''۔

مردِ صالح مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ

۱۳۵۲-۱۴۲۷ھ=۱۹۳۳-۲۰۰۶ء

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

جمعہ ۱۲/۵/۱۴۲۷ھ=۹/۶/۲۰۰۶ء کو صبح ۵ بجے مولانا محمود حسنی ندوی سلّمہٗ نے، لکھنؤ سے فون پر مجھے یکا یک یہ بتا کے چونکا دیا کہ تقریباً ایک گھنٹہ قبل مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ استاذِ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ حرکتِ قلب بند ہوجانے سے، اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اِنّا للہ واِنّا اِلیہ راجعون۔

چوں کہ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مولانا محمد عارف اِس طرح اچانک داغِ مفارقت دے جائیں گے؛ اِس لیے اُن کے انتقال کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔ اُن سے قلبی تعلّق تھا، جو اُن کی نیکی، خاک ساری اور سادگی کی دین تھا، جو اُن کو بہت سے معاصرین اور رفقائے کار سے ممتاز کرتی تھی۔

وہ میرے دو ایک سال بعد، دار العلوم ندوۃ العلما کے مدرس اور تفسیر واُصول کے اُستاد کی حیثیت سے تشریف لائے اور اپنی تواضع، نیکی، بے ساختگی اور زندگی کے سارے معاملات میں اپنی سادگی کی وجہ سے اَساتذہ وطلبہ کے معاشرے میں خاصے مقبول ومحبوب بن گئے۔ وہ ہر کسی سے اِس طرح ملتے، جیسے فردِ خاندان؛ بل کہ اُس کی ذات کا حصہ ہوں۔ دل سے ملتے، اِخلاص سے خبر خیریت دریافت کرتے، اپنائیت کی وجہ سے دل میں گھر کر جاتے اور اِحساس وجذبات میں شریک ہوجاتے۔

بندۂ مومن

اللہ کی اِس کشادہ دنیا میں، خوش قسمتی سے چند ایسے لوگوں سے ملاقات وتعارف کا موقع ملا، جن کے متعلق دل نے، اپنی خدا کی دی ہوئی، فراستِ ایمانی سے گواہی دی کہ یہ بالیقین اللہ کے مومن بندے ہیں۔ دنیاے فانی میں اُن کی آرزوئیں قلیل اور ہمیشہ کی آخرت کے حوالے سے اُن کے مقاصد جلیل نظر آئے۔ زندگی کی رونقوں اور آسایشِ حیات میں سے، ستر پوشی کے بہ قدر لباس اور بقاے حیات کے بہ قدر خور ونوش کا سامان، اُن کے لیے کافی تھا اور اِن دونوں ضرورتوں کے پوری کرنے سے بھی، اُن کا مقصد اپنے رب کی طاعت وعبادت تھا۔ میں نے اُنھیں پایا کہ وہ دنیا کو صرف آخرت کی کھیتی جانتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ یہاں کا بویا ہوا ہی وہاں کاٹنا ہے —— میں قسم کھا سکتا ہوں کہ مولانا محمد عارف سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً اُن میں سے ایک تھے۔

وہ ہمیشہ انتہائی معمولی کپڑے میں نظر آئے۔ وہ کپڑوں کو پریس کرنے یا کروانے سے بالکل بے پروا تھے۔ کئی بار ندوہ میں اُن کے رہایشی مکان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ بعض دفعہ اپنے وطنِ مالوف سنبھل کے علاقے میں تیار کی جانے والی کھانے کی کسی خاص چیز کے لیے، بہ اِصرار مجھے اور بعض رفقا کو بلا لے جاتے یا چاے کے لیے مدعو کرتے۔ ہم نے ہمیشہ اُن کے ہاں ضرورت کی چیزیں بھی انتہائی ضرورت کے بہ قدر ہی دیکھیں اور ٹھاٹ باٹ کی چیزوں کا تو اُن کے ہاں کوئی گزر ہی نہ تھا۔ وہ زندگی کے سارے گوشوں میں بے ساختگی پر عمل پیرا تھے، تکلف اور تصنع سے اُن کی زندگی کی ڈکشنری نا آشناے محض تھی؛ لہٰذا وہ وقت اور توجّہ کا قیمتی سرمایہ، کسی ایسی چیز پر خرچ نہیں کرتے تھے جس سے دنیا وآخرت میں کوئی بھلائی مُتَصَوَّر نہ ہو۔

دین داری وخوش طبعی

اس کے باوجود وہ خندہ رو، خوش اَخلاق اور اِنتہائی حلیم وکریم تھے، نمایشی زاہدوں

کی طرح ترش رو، بداَخلاق اور اپنے سوا ہر ایک کو ''بے عمل'' سمجھنے والوں کی طرح خشک نہ تھے۔ اِنتہائی ظریف، خوش طبع اور زندہ دل تھے۔ ملنے جلنے والوں سے نہ صرف مذاق کو روا جانتے تھے؛ بل کہ برجستہ مزاحیہ جملوں سے، دل کی مرجھائی ہوئی کلی کو دفعتاً کھل اٹھنے کا ایسا موقع دیتے کہ لوگ عش عش کرنے لگتے۔ غم غلط کرنے میں اُنھیں مہارت تھی اور روتوں کو ہنسانے میں وہ طاق تھے۔ اُن سے جب بھی اچانک ملاقات ہوتی اور وہ مجھے کسی سنجیدگی یا پیچیدگی میں اُلجھا ہوا محسوس کرتے، تو برجستہ ایسے جملے کہہ جاتے، جن سے دل اور ذہن دونوں کا ماحول تبدیل ہو جاتا۔ دراَصل اُن کی طرح کے نیک اور آخرت کو نصب العین بنائے رہنے والے سعادت مند لوگ دنیا، اُس کے غم واَلم اور اُس کے سارے مسائل کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتے؛ اِس لیے دنیا اور اُس کے مسائل کے ساتھ، اُن کا رویہ اِنتہائی لاپروائی کا ہوتا ہے۔ دنیا کو ہنس کھیل کے گزارنے میں آخرت کی فکر کے لیے، اُنھیں وافر وقت مل جاتا ہے۔ مقصد کا اِستحضار اور اُس کی عظمت واہمّیت کا ہمہ وقت اِحساس، دنیاوی غم واَلم کی اہمّیت کو کم کیے رہتا ہے۔

بے تکلّفی اور اپنائیت

مولانا محمد عارفؒ کو اکثر میں دیکھتا کہ بغل میں کوئی کتاب ضرور دبائے ہوتے۔ عموماً تفسیر کی یا کسی بھی اِسلامی موضوع کی، جس کے وہ مطالعے کے درپے ہوتے۔ درجے میں جاتے یا آتے ہوئے یا کینٹین (Canteen) میں داخل ہوتے یا نکلتے ہوئے، یا کسی خالی گھنٹے (Period) میں کہیں بیٹھے ہوئے، وہ کتاب ہاتھ میں ضرور لیے ہوتے۔ جیسے ہی اُن کی نظر میرے ایسے کسی مخلص رفیق پر پڑتی، کسی ایسے مزاحیہ جملے سے تواضع ضرور کرتے، جس سے ہنسی بھی آتی، خوشی بھی ہوتی اور اُن کے لیے دعا بھی نکلتی۔ اُن کے مزاحیہ جملے بھی کسی پرتکلف سوچ کا نتیجہ نہ ہوتے؛ بل کہ وہ ہمیشہ بے تکلفی اور اپنائیت کی دین ہوتے۔ مثلاً وہ کہتے: ''بھئی! آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ میں نے آپ کو دیکھا نہیں

ہے کہ آپ کمرے کی اُور بھاگے چلے جارہے ہیں'' یا ''برادرم! آپ یہ سمجھے نہ بیٹھے رہیں کہ صرف آپ ہی کو عربی زبان آتی ہے، میں نے بھی پڑھنے کے زمانے میں عربی کے بہت سے بہت اچھے اچھے جملے بڑی محنت سے رٹے تھے، بوڑھا ہو جانے کی وجہ سے اُنھیں بھول گیا ہوں؛ ورنہ آپ میرے سامنے کبھی بھی ٹھہر نہیں سکتے تھے'' کبھی کہتے: ''دیکھیے! آپ اِس دھوکے میں نہ رہیے گا کہ صرف آپ ہی مولانا علی میاں مدظلہٗ (۱) کے مقرب ہیں اور عربی جاننے یا حسنِ خط کی وجہ سے اُن کے منظورِ نظر ہیں؛ اِس لیے کہ میں بھی بہت بڑا ''خطیبِ اسلام'' ہوں اور اہلِ بدعت کی تردید میں ''لاجواب'' ہوں؛ اِس لیے مولانا علی میاں؛ مجھے آپ سے زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ اِس حوالے سے، میرے نزدیک کسی کھیت کی مولی نہیں ہیں''۔ ایک دفعہ مولانا عارف نے مجلس کو یہ کہہ کر زعفران زار بنادیا کہ ''خاک سار'' بہت پرانا لفظ ہوچکا ہے، اب ''ڈھیلا سار'' استعمال کرنا چاہیے۔ کئی بار ''ایسی تیسی'' کو ''ایسی کی سوا تیسی'' اور ''ایسی کی سوا چار تیسی'' استعمال کیا۔ دگر جملوں میں اِسی طرح کی دیگر مسرت ریز ترمیمات کے ذریعے، دوستوں کے ہنسنے کے مواقع پیدا کرتے رہتے۔

کئی حیثیتوں سے ممتاز؛ بل کہ بے مثال

مولانا سنبھلیؒ کئی معنوں میں ممتاز؛ بل کہ بے مثال تھے: وہ اپنی ذات میں اتنے مشغول رہتے کہ دوسروں کی طرف توجہ کی اُنھیں فرصت نہ ہوتی۔ یعنی وہ اپنی ذات کے عیوب ونقائص کے شمار سے کبھی فارغ نہیں ہوتے تھے؛ اِس لیے وہ پیہم مشغول رہتے تھے۔ ایسا آدمی کبھی بھی دوسروں کے معایب کے پیچھے نہیں پڑتا؛ چناں چہ مولانا محمد عارفؒ

(۱) اور اُس وقت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ظاہر ہے کہ بہ قیدِ حیات تھے؛ اِس لیے کہ آپ کی وفات بہ روز جمعہ تقریباً ۱۲ بجے بہ تاریخ ۲۲ رمضان ۱۴۲۰ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو پیش آئی اور میں ۱۹۸۱-۱۹۸۲ء سے قبل کے واقعات کی طرف اِشارہ کررہا ہوں، جب میں دار العلوم ندوۃ العلما میں اُستاد تھا۔

کو بھی دوسروں کے عیوب کے تعلق سے بے پروا پایا۔ قرآن پاک سے شغف کے حوالے سے بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔ قرآن کی تلاوت بہت سوز کے ساتھ، سمجھ کر ایک ایک لفظ اور شوشے کو محسوس کر کے؛ کرتے، اُس کے معانی وطالب، الفاظ کے مفاہیم، تعبیروں کی گہرائیوں، اُس کے اعجاز کے رازوں اور بلاغت کے گوشوں اور اسباب پر غور کرتے۔ قرآنی موضوعات کی کتابوں کے حصول کے لیے، کوشاں رہتے۔ علماے اسلام کی اِس حوالے کی کاوشوں سے فائدہ اُٹھاتے۔ تفسیر کی اُمّہات الکتب کے امتیازات سے اِتنے واقف تھے کہ اِتنے واقف کم لوگ ہی ہوتے ہیں۔

اردو تفسیروں میں مرحوم، ادیبِ کبیر مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء ـــ۱۳۹۷ھ/ ۱۹۷۷ء) کی ''تفسیرِ ماجدی'' کے بڑے دل دادہ تھے کہ اُس میں عصرِ حاضر کے مسائل، جدید ذہن کے شکوک وشبہات اور بعض ایسے اعتراضات کو بھی حل کیا گیا ہے، جو ماضی میں بھی تفسیر کے طلبہ کے لیے، اُلجھن کا باعث رہے تھے۔ اِسی طرح وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء ـــ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء) کے مشہور ومقبول اردو ترجمۂ قرآن کے حاشیے پر لکھی گئی علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی ثم الپاکستانیؒ (۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء ـــ ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) کی تفسیرِ عثمانی کے ثنا خواں تھے اور فرماتے تھے کہ تفسیر کی زبان، اُس کا معجزانہ اختصار، حقائق قرآن کی اہلِ سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق کھری، صحیح اور ٹھوس ترجمانی اور تفسیرِ قرآن کے باب میں اُمت کے ثقہ علما کی راہ کی مکمل پیروی میں، یہ تفسیر لاثانی ہے۔ مجھ سے مرحوم نے کئی بار فرمایا کہ ادب کے طلبہ کو زبان وبیان کی نزاکت سے واقفیت کے لیے بھی، اِس تفسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے یہ اردوے معلّی کی بھی بے مثال کتاب ہے۔ بعض جگہ اُنھوں نے حقائقِ قرآن کی ترجمانی کے لیے جو زبان استعمال کی ہے، وہ ادب کا جاوید شہ پارہ ہے۔ ایک اچھے مقرر کے لیے بھی مضامین، طرزِ تکلم اور خیالات کے اِلہام کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں اِس تفسیر کی اہمیت کو مدرسوں کے ماحول نے، مذاقِ ادب سے

عمومی نا آشنائی کی وجہ سے اب تک کماحقہٗ محسوس نہیں کیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء — ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی تفسیر "بیان القرآن" کو ائمہ فن کی تفسیروں کا عطر کہتے تھے اور فرماتے تھے کہ اِس تفسیر میں معانی کی گہرائی اور لطیف اِشاروں کی جو بہتات ہے، اُس کی وجہ سے اُس کا مطالعہ عالم وعامی، طالبِ علم ومدرس: ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ اس کے مطالعے سے فکر ونظر میں گہرائی، عقل وخرد میں کشادگی، بصیرت میں اِضافہ اور کتاب اللہ کے لفظی ومعنوی اِعجاز پر ایمان اور مضبوط ہوتا ہے۔

مولاناؒ کی خوش نصیبی

مولاناؒ کی سعادت کی بات تھی کہ وہ تفسیر کے مضمون کا سال ہا سال درس دیتے رہے۔ قرآنِ پاک کے معانی ومطالب میں غور وخوض سے اُن کو طبعی دل چسپی تھی، اِس مضمون کی تدریس میں، اُن کے لیے اپنے "پیشے" اور اپنی دلچسپی دونوں کی تسکین کا بہترین سامان مُیَسَّر آ گیا تھا۔ یہ کسی آدمی کی بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اُس کے پیشے اور خدمت کے لیے اُس کو اُس کی دل چسپی کی شے ہی مل جائے اور وہ بہ یک وقت اپنی ڈیوٹی بھی انجام دیتا رہے اور اپنے ذوق کی تسکین بھی کرتا رہے۔ تفسیر کا موضوع علومِ شریعت میں سب سے کشادہ ہے؛ بل کہ یہ بحرِ ناپیدا کنار ہے؛ لٰہذا جس کسی کو اِس میں گیرائی حاصل ہو جاتی ہے، اُس کو کئی موضوعات میں از خود دست رس حاصل ہو جاتا ہے اور وہ علومِ شریعت میں ہمہ گیری کا حامل بن کر، اِسلام کی ترجمانی کا اہل ہوتا جاتا ہے، اُس میں اِسلام کے دفاع اور ملحدین ومنحرفینِ راہ سے مقابلے کی بہ خوبی لیاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ مولانا سنبھلیؒ بھی خدا کی توفیق سے اِسی طرح کے وسیع النظر، عمیق العلم اور دقیق الفکر عالم بن گئے تھے؛ اِسی لیے فرقِ ضالّہ اور اور تحریکاتِ باطلہ، بالخصوص بدعتی فرقے سے محاذ آرائی میں وہ پیش پیش رہتے تھے۔ یہ فرقہ اندرونی وبیرونی اسلام دشمن

طاقتوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے برّصغیر میں، ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس ہوکر، اِسلام کی صحیح تعلیمات میں رخنہ اندازی کی ناکام کوشش کرتا رہا ہے۔ مولانا سنبھلیؒ نے اُس کے ایک چرب زبان و تیز قلم عالم کی کتاب ''زلزلہ'' کا جواب ''بریلوی فتنے کا نیا روپ'' کے نام سے دیا۔ یہ کتاب خاصی دنداں شکن ثابت ہوئی اور بہت پڑھی گئی۔ مولاناؒ نے اہلِ بدعت سے مناظرے بھی کیے اور اپنی مکمل و مضبوط تحریروں اور مدلل و مربوط تقریروں میں بھی اُن کو رگیدتے اور للکارتے رہے۔ اُن کی تقریروں کا بنیادی موضوع ہی توحید کا بیان اور بدعت و ضلالت کی تردید ہوا کرتا تھا۔

مرحوم نے ردِّ قادیانیت میں بھی بڑا کردار ادا کیا۔ قادیانیت کا توڑ ہمارے جلیل القدر اور غیرت مند علما کا معزّزانہ کام رہا ہے۔ نبوتِ محمدی کے خلاف جب سے یہ عظیم فتنہ برطانوی استعمار کی سازش سے برپا ہوا، جس نے اسلام ہی کو اپنی توسیع پسندی کی راہ کا سب سے بڑا پتھر محسوس کیا، علمائے اسلام نے اِس فتنے کی خطرناکی کو محسوس کرتے ہوئے، اِس کی سرکوبی پر زبان و قلم اور تبلیغ و دعوت کی راہ سے بہت زور صرف کیا۔ مولانا سنبھلیؒ نے بھی اپنے اکابر کی سنت ادا کی اور زبان و قلم کو ہمیشہ اِس محاذ پر بھرپور طور پر استعمال کیا۔

مولانا محمد عارف مرحوم، ملک کے طول و عرض، بالخصوص لکھنؤ اور اُس کے اَطراف میں ہونے والے دینی و دعوتی جلسوں میں کثرت سے شریک ہوتے اور جم کر تقریر کرتے تھے۔ وہ فنِ تقریر کے میدان کے بھی شہ سوار تھے؛ لیکن وہ پیشہ ور مقرروں کی طرح بامعاوضہ تقریر نہیں کرتے تھے؛ بل کہ وہ اکثر دفعہ آمد و رفت کا صرفہ بھی خود ہی برداشت کرتے تھے، حال آں کہ وہ مالی طور پر بہت کم زور تھے، تدریس کے علاوہ کوئی ذریعۂ معاش نہ تھا؛ لیکن دین و دعوت کی خدمت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی؛ اِس لیے وہ اُس کے لیے ہر طرح کا بار، اُسی طرح برداشت کرتے تھے، جیسے اپنی ذات اور اپنی اولاد کے لیے۔ ہمارے بہت سے نام نہاد علما اور دُعاۃ نے تو تقریر و تحریر کے پیشے کو تعویذ و گنڈوں کے پیشے کی طرح زرکشی کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور عام مسلمانوں کے لیے اُن کی

سیرت اور اُن کا کردار ذریعۂ اذیّت بنا ہوا ہے؛ لیکن مولانا محمد عارف سنبھلی جیسے بھی کچھ علما ہیں جو دین ودعوت کی آبرو کو بچائے ہوے ہیں۔

مولانا کی تقریر کا اَصل موضوع تو وہی توحید اور اُس کے مخالف رجحانات کی شرح وتفصیل اور اُن رجحانات کے رد کے دلائل کا بیان ہوتا تھا؛ لیکن وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کی اِصلاح کے طریقوں پر بھی خوب بولتے تھے۔ شادی بیاہ، موت کے مراسم اور غم والم کو منانے کے غیر اِسلامی طریقوں سے بھی عوام کو واقف کراتے اور اُنھیں کتاب وسنت کی راہ پر لوٹ آنے کی دعوت دیتے تھے۔ اِسی طرح برِّصغیر کے صحیح اِسلامی مسلک یعنی "دیوبندیت" عصرِ حاضر میں اُس کی معنویّت اور مختلف انتہا پسندیوں کے بیچ اُس کی اِفادیت اور اُس کی روح، یعنی اعتدال وتوازن پر بھی اکثر بھرپور روشنی ڈالتے تھے۔

رقیق القلبی

مولانا مرحوم رقیق القلب تھے۔ وعظ ونصیحت کے موقع سے، خصوصاً نماز کے اندر یا باہر ترہیب واِنذار کی آیتوں کی تلاوت خود کرتے یا دوسرے سے سنتے، تو گریہ طاری ہوجاتا اور پھر روتے ہی رہتے تا آں کہ خوف وخشیت کی کیفیت زائل ہوجاتی اور اُس کا دباؤ ختم ہوجاتا۔ کسی کو اپنے کسی رویّے سے تکلیف پہنچ جانے یا اُس کے اِحساس کے مجروح ہوجانے کا ذرا بھی اَندازہ ہوتا، تو فوراً معذرت خواہ ہوتے۔ میں نے ہر اچھے اور نیک میں یہ شیوہ دیکھا اور برتا ہے۔ واقعی نیک آدمی، ضرور دوسرے سے معذرت خواہ ہوتا ہے، بہ تکلف نیکی کا لبادہ اُوڑھ لینے والا البتہ کسی کو اذیّت دے کر، کبھی نادم نہیں ہوتا اور نہ معذرت کا لفظ کبھی زبان پر لاتا ہے؛ کیوں کہ غرورِ نفس، اُس کو اِس سے روکے رکھتا ہے۔ اِسی طرح وہ اپنے رفقا اور متعارفین سے ہمیشہ یہ کہتے: بھئی! میری تحریر یا تقریر یا کسی گفتگو سے آپ میں سے کسی کو ذاتی تکلیف پہنچی ہو یا آپ لوگوں نے اُس میں کوئی دینی، علمی یا دعوتی یا کسی اور قسم کی کوئی غلطی کبھی محسوس کی ہو، تو

بتا دیجیے تا کہ اُس کا اِزالہ کیا جا سکے اور دیگر لوگ اُس سے گم راہ نہ ہوں۔ اُن کے سارے معمولات سے صاف طور پر یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت آخرت کے حساب اور ربِّ قہار کی پکڑ کو مُستحضَر رکھتے تھے۔ دنیا کے جھمیلے اور یہاں کی زینت، اُنھیں وہاں سے کبھی غافل نہیں کر پاتی تھیں۔ وہ واقعی خوش قسمت تھے اور ہم جیسے واقعی بد قسمت ہیں، جو اُن جیسوں کی زندگی سے سبق نہیں لے پاتے۔ اللہ اُنھیں بہت نوازے اور یہاں کی محرومیوں کا، اُنھیں وہاں خوب خوب بدلہ دے۔ اُن کا عمومی برتاؤ بھی اُن کے بھولے پن کا غمّاز ہوتا تھا، اُن کی ہر اَدا سے معصومیت ٹپکتی تھی۔ وہ اِیذا رسانی کی صلاحیّت سے عاری لگتے تھے۔ زندگی کا میرا اپنا تجربہ، جو تجربے کی میری زندگی ہی کے بہ قدر ہے، یہ بتاتا ہے کہ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں؛ لیکن بہت اچھے ہوتے ہیں اور شاید جنتی لوگ دنیاے دنی میں عموماً ایسے ہی ہوتے ہیں اور صحیح علم تو ہر بات کا اللہ عالم الغیب ہی کو ہے۔

اُنھیں نہ علم کا غرور تھا، نہ مطالعے کی وسعت کا دعویٰ تھا، نہ اپنے عالم ہونے کا پندار تھا، نہ مُقَرِّر ہونے کا اِحساس تھا، نہ مُناظِر ہونے کی اہمیت کا گھمنڈ تھا، نہ کام یاب اور مقبول مدرس ہونے پر فخر تھا، نہ دنیوی عزت کی خواہش تھی، نہ ستایش کی تمنا تھی، نہ صلے کی پروا تھی۔ اُن کے سامنے صرف ایک ہدف تھا، خدا کی رضا جوئی کا ہدف، جو اُنھوں نے اللہ کی رحمت کے طفیل ضرور پالیا ہوگا۔

مولانا محمد عارف سنبھلیؒ برِّ صغیر کے مشہور عالم اور داعی و اِسلامی اہل قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۳۲۳-۱۴۱۷ھ = ۱۹۰۵-۱۹۹۷ء) کے حقیقی بھتیجے تھے۔ اُنھوں نے ۲۵-۳۰ سال تک یعنی زندگی کے آخری سالوں میں موت تک دار العلوم ندوۃ العلما میں تفسیر و عقیدے کے ہر دل عزیز استاذ کی حیثیت سے تدریسی فریضہ انجام دیا۔ وہیں اُن کا وقتِ آخر آیا اور اُسی کے میدان میں ندوۃ العلما کے حالیہ ناظم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں بڑی بھیڑ تھی، جو اُن کے مقبول عند اللہ و عند الناس ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری نماز اُن کے صاحب زادے

مولوی حمزہ ندوی سنبھلی نے پڑھائی، بعدہ ''ڈالی گنج'' کے قبرستان میں سپرد خاک ہوے۔

مولاناؒ نے پس ماندگان میں اہلیہ، دو صاحب زادے اور ایک صاحب زادی چھوڑی ہے؛ لیکن اُنھوں نے اِن خاکی پس ماندگان کے علاوہ، اِس دنیا کے لوگوں کے دلوں میں اپنی ناقابلِ فراموش یاد چھوڑی ہے، جس کا نقش اُن کے دلوں میں اِتنا گہرا ہے کہ وہ کبھی نہیں مٹ سکے گا۔ اُن کی اِنسانیت، تواضع، سادہ دلی، یگانگت، سچے زہد اور ساتھ ہی اُن کی علمی لیاقت کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی، وہ لیاقت جس کی وجہ سے ہزاروں زبانیں اُن کی ثناخواں اور درس وإفادے اور وعظ ونصیحت، علمی تبادلے اور دینی مناظرے کے ذریعے فیض بخشی کی وجہ سے، اُن کی شکرگزار اور اُن کے لیے دعا گو تھیں۔

کتنے لوگ اِس دنیا سے روزانہ رختِ سفر باندھ جاتے ہیں اور چند روز بعد لوگ اُنھیں قطعاً فراموش کر دیتے ہیں؛ لیکن اپنی اِنسانیت، تواضع اور بے نفسی کے ذریعے، جو لوگ دلوں میں گھر کر جاتے ہیں، وہ ہمیشہ دلوں میں اور زبانوں پر زندہ رہتے ہیں اور اُن کا ذکرِ خیر بلا انقطاع جاری رہتا ہے۔ اُنھی میں مولانا مرحوم بھی ہیں، جو اپنے علم سے پہلے اپنے اخلاق سے عالی قدر تھے اور اپنی نام آوری سے پہلے اپنی نیکی آمیز گم نامی سے اور اپنی برتری سے پہلے اپنے خاک ساری سے اور اپنے علم سے پہلے اپنی دین داری سے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ۔ (*)

سوانحی نقوش

۞ نام: (مولانا) محمد عارف۔

۞ تاریخ پیدائش: ۱۹۳۵ء (۱۳۵۴ھ)۔

۞ جاے پیدائش: سنبھل، ضلع مراد آباد، یوپی۔

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۸، جلد ۳۰، شعبان ۱۴۲۷ = ستمبر ۲۰۰۶ء، اردو تحریر بہ قلم خود، ۱۰ بجے صبح دوشنبہ ۲۶/رجب ۱۴۲۷ھ = ۲۱/اگست ۲۰۰۶ء۔

۞ **والد کا نام:** حاجی محمود حسین بن صوفی احمد حسین۔ صوفی احمد حسین کے پانچ لڑکے تھے، جن میں سب سے بڑے (مولانا) محمد حسن، دوسرے مولانا غلام اِمام، تیسرے (عالمِ کبیر اور مشہور داعی اِلی اللہ مولانا) محمد منظور (نعمانی) چوتھے محمود حسین (جو مولانا محمد عارف سنبھلی ندوی مرحوم کے والدِ محترم تھے) پانچویں حکیم محمد احسن قاسمی۔

۞ **خاندان:** تُرک۔

۞ **مولانا کے برادران:** مولانا کے سب سے بڑے بھائی حاجی محمد عامر تھے، دوسرے بھائی حاجی محمد عمر۔ مولانا محمد عارف بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی محمد زبیر ہیں اور اُن سے چھوٹی بہن مسلمہ بیگم تھیں۔ سب سے بڑے بھائی حاجی محمد عامر اور بہن مسلمہ بیگم وفات پا چکی ہیں۔

۞ **تعلیم:** ابتدائی تعلیم سبزی منڈی اِسکول سنبھل اور دار العلوم المحمدیہ، روضے والی مسجد، دیپا سرائے، سنبھل میں حاصل کی۔ اُس کے بعد ایک سال مدرسہ فرقانیہ ''گونڈا'' میں زیرِ تعلیم رہے۔ ثانوی اور متوسط و اَعلیٰ تعلیم کے لیے، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کا قصد کیا، جہاں سے ۱۹۵۶ء (۱۳۷۵ھ) میں فارغ ہوئے۔

۞ **تدریسی خدمات:** تدریس کا آغاز دار العلوم المحمدیہ، روضے والی مسجد، سنبھل سے کیا، اُس کے بعد مختلف جگہوں پر تدریسی خدمات انجام دیں، جن میں انجمن معاون الِاسلام سنبھل، مہاراشٹرا کا علاقہ برار، اعظم گڑھ اور ندوۃ العلما لکھنؤ شامل ہیں۔

۞ **تحریری کاوشیں:** اُن کی اہم اور مشہور کتاب ''بریلوی فتنے کا نیا روپ'' ہے، اِس کے علاوہ اُنھوں نے توحید، ردِّ بریلویّت اور ردِّ قادیانیّت کے موضوع پر بہت سے مضامین لکھے، جن میں سے اکثر ''الفرقان'' لکھنؤ اور ''تعمیرِ حیات'' دار العلوم ندوۃ العلما میں شائع ہوئے۔

۞ **پس ماندگان:** مولانا کے پس ماندگان میں اُن کی اہلیہ محترمہ کے علاوہ، اُن کے بڑے لڑکے مولانا محمد حمزہ ندوی ہیں، جو ندوۃ العلما کی ایک شاخ میں مدرس ہیں، دوسرے لڑکے قاری محمد طلحہ ہیں، جو لکھنؤ کے شبابِ اسلام مارکیٹ میں اسکرین پرنٹنگ کا اپنا کام کرتے ہیں۔ اولاد میں سب سے چھوٹی صاحب زادی مریم عفیفہ ہیں۔(*)



(*) سوانحی نقوش کے سلسلے میں برادرِ عزیز مولانا محمد اسعد قاسم سنبھلی کی فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

مفتیِ دارالعلوم دیوبند

مولانا کفیل الرحمٰن نشاؔط عثمانی دیوبندیؒ

۱۳۵۹ھ/ ۱۹۳۹ء — ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

موت برحق ہے اور انسان کو اپنی ساری ترقّی کے باوجود، جس پر اُس کو آج بے طرح اِتراہٹ ہے، موت کی آمد کی جگہ اور وقت کا کوئی اندازہ نہیں۔ اللہ کو ہی اِس کا علم ہے کہ وہ کس پر، کب اور کہاں طاری ہوگی؟ ہمارے سامنے بسا اوقات موت کے واقعات اِس طرح پیش آتے ہیں کہ اُس سے مارنے اور جلِانے کے تعلّق سے اللہ کی قدرتِ کاملہ کا یقین ازسرِ نو تازہ ہو جاتا ہے۔

صحت مندی و چستی و پھرتی

دارالعلوم دیوبند کے مفتی: مفتی کفیل الرحمٰن نشاؔط عثمانی دیوبندیؒ، موت سے ایک روز پہلے تک بہ ظاہر مکمل صحت مند، نشیط اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور تازگی کے مالک نظر آتے تھے۔ وہ ۶۷ سال کے بوڑھے تھے؛ لیکن دارالعلوم کے سارے اساتذہ وملازمین میں اُن کی عمر کے کسی بوڑھے کو چستی، پھرتی اور صحت کا وہ حصۂ وافر نصیب نہیں تھا، جس

سے اللہ نے اُنھیں نوازا تھا۔ وہ چلت پھرت سے ۲۰-۲۵ سال کے نوجوان لگتے تھے۔ میں اُنھیں دارالعلوم جانے کی راہ میں، اِتنی تیز گامی سے جاتے ہوئے دیکھتا کہ مجھے اُن پر رشک آتا۔ دارالعلوم جاتے ہوئے جو طلبہ معمول کے مطابق میرے ساتھ ہوتے، میں ہمیشہ اُن سے کہتا: کاش میں بھی اِنھی جیسا صحت مند، توانا اور چست ہوتا!۔

اِسی لیے منگل: ۶؍رجب ۱۴۲۷ھ = یکم اگست ۲۰۰۶ء کو تقریباً ساڑھے ۱۰ بجے، جب میں نے طلبہ کی زبانی اور پھر دیوبند کی مسجدوں کے مناروں سے اُن کے انتقال کی اچانک خبر سنی تو میں خاصا اَچنبھا ہوا؛ بل کہ اِس خبر کو تسلیم کرنے میں مجھے تردّد سا ہوا؛ لیکن موت کا اِعلان بار بار ہوتا رہا، اور موت کے بعد اُن کی دید کے بعد میرے پاس آنے والے بعض لوگوں نے، اُن کی موت کی تفصیل بتائی، تو بالآخر یہ یقین کرنا پڑا کہ اُدھیڑ عمر کا ''نوجوانِ'' صالح واقعی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ صبح اُٹھے تو اُنھیں معمولی سا بخار تھا، ہاتھوں میں درد تھا جو پھر دونوں رانوں میں اُتر گیا اور اِسی اثنا میں تقریباً سوا دس بجے اُنھوں نے ہارٹ اٹیک کی وجہ سے جان، جاں آفریں کے سپرد کردی، یہ سب کچھ نیند میں آنے والے خیال کی مانند پیش آیا، جس کی دیکھنے والا عموماً تصدیق کرتا ہے نہ تکذیب۔

اِس طرح کے واقعے سے، باتوفیق اور خوش نصیب لوگوں کو، جنھیں زندگانی کے واقعات سے سبق لینے کی توفیق ملا کرتی ہے، دوبارہ سبق ملتا ہے کہ یہ دنیا واقعی فانی اور اِس کی ہر شے آنی جانی ہے۔ ہر زندہ ہر وقت موت کے خطرے سے دوچار ہے اور زندگی واقعی ناپایدار ہے۔ وہ بے وفا ہے، اُس کا پیشہ ہی جفا ہے۔ وہ چند روزہ ہے: کچھ سالوں یا مہینوں یا دنوں یا گھنٹوں سے عبارت ہے۔ دنیا کا فاتح اور اُس کے سارے مال واسباب کی ملکیّت کا مُدّعی بھی موت کے شکنجے سے نہیں بچ پاتا۔ دولت وثروت، اختیار واقتدار، حکم رانی وسرداری، اِمارت وریاست اور نگرانوں ونگہ بانوں وپاس داروں کا لشکرِ جرّار یا نت نئے تباہ کن اسلحوں کا اَنبار بھی موت کی راہ نہیں روک پاتا۔

وقت کی پابندی

مولانا مفتی کفیل الرحمٰن نشاطؔ عثمانیؒ کی موت سے دیو بند کا ہر بچہ و بوڑھا واقعی غم زدہ نظر آیا اور جس کو موقع ملا موت کے بعد اُن کے گھر جا کر، اہلِ خانہ سے تعزیت اور اُن کے آخری دیدار سے بہرہ مند ہو آیا۔ دار العلوم کی پوری فضا خاصی سوگ وار نظر آئی۔ مرحوم یہاں تقریباً ۳۵ سال سے منصب اِفتا پر فائز تھے، اُنھوں نے اِس اثنا میں سیکڑوں مسائل کے جوابات تحریر کیے، نیز زیرِ تعلیم طلبہ کی تدریس و تمرین کا فریضہ بھی اِحساسِ ذمّے داری اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کیا، جس کو طلبہ و ذمے داران بار بار یاد کر رہے ہیں۔ اُن کے چہرے مہرے اور ساری حرکات و سکنات سے دیکھنے والے کو اُن کی دین داری کا یقین ہو جاتا تھا۔ وہ اکثر خاموش رہتے اور کسی ضرورت کے وقت ہی گویا ہوتے اور صرف کام کی بات کر کے خاموش ہو جاتے۔ عالمِ باعمل کا نمونہ تھے اور وقت و وعدے کی پابندی اُن کا شیوہ تھا۔ دار العلوم کا وقت شروع ہوتے ہی وہ آموجود ہوتے یا کچھ پہلے ہی آجاتے۔ وہ چھتہ مسجد کے شرق و جنوب میں واقع ایک چھوٹی سی مسجد کے امام تھے، جہاں اُن کے والد بزرگ وار مولانا قاری جلیل الرحمٰنؒ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء — ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء) نے بھی زندگی بھر امامت کی تھی اور اُن کے دادا حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ (۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء — ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) بھی نماز پڑھتے تھے۔

سنجیدگی و بردباری

مفتی کفیل الرحمٰنؒ کی طویل اور مسلسل خاموشی، جو گفتگو کی کسی ناگزیر ضرورت کے وقت ہی ٹوٹتی تھی، اُن کی گہری فکر، پختہ عقل اور اُن کے طویل تجربے کے ساتھ ساتھ، سطحیّت پر گہرائی کو ترجیح دینے کی اُن کی فطرت کی غمّاز تھی۔ وہ سنجیدگی، بردباری، نرم خوئی، دل جوئی اور پیار اور محبّت کا مجسمہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ سوچ اور فکر میں ڈوبی ہوئی

خاموشی بے ضرورت کی ہمہ وقت کی بکواس اور لایعنی گفتگو سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

اچھا مفتی اور اچھا شاعر

مرحوم اردو زبان کے اچھے نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ، قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اُنھوں نے مختلف اِسلامی موضوعات پر گراں قدر مضامین لکھے، جن میں زبان کی ستھرائی اور مطالعے کی گیرائی نمایاں ہوتی تھی۔ میں نے خود کئی مضامین پڑھے اور اُن کی علمی لیاقت کی داد دی۔ اُن کے اَشعار میں مولانا حالی کی طرح لفّاظیّت سے اجتناب ہوتا تھا؛ لیکن معانی اور خیالات کا انوکھا پن، زندگی کی سچائیوں کی سچی ترجمانی اور انسانوں پر بیت رہے ظلم وستم کی کہانی کا آہنگ بہت اونچا اور اُس کا رنگ بہت شوخ ہوتا تھا۔ اُن کے اشعار بھی اِس راقم نے بہت سے رسالوں میں پڑھے اور اُن کی پختگی وخوش گوئی سے ہر بار نیا لطف ملا۔ بعد میں اُن کے اَشعار کا ایک مجموعہ ''شناسا'' کے نام سے چھپا، جس کے ذریعے لوگوں کو اُن کے کُہنہ مشق شاعر ہونے کی بھی شناسائی ہوئی اور یہ جان کر خوشی اور حیرت ہوئی کہ دار العلوم کا ایک اچھا مفتی ایک اچھا شاعر بھی ہے۔

حمد ونعت کے علاوہ، اُن کے دیوان میں غزل کے ڈھلے ہوئے آب دار اَشعار سے ہر باذوق قاری محظوظ ہوگا۔ اُن کے شعر میں، کہیں کہیں میر کی نزاکت، غالب کی حلاوت، حالی کی سنجیدگی، داغ کے سوز، مومن کی شفّافیت جگر کی روانی، اصغر کی تپیدگی، فانی کے اندازِ اظہارِ غم والم اور کہیں کہیں اِقبال کی بلند آہنگی اور اِحساسِ بلندی کی تراوش بھی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے دیوان پر اگر ''مولانا'' یا ''مفتی'' کا لفظ اُن کے نام کے ساتھ سابقے کے طور پر لکھا نہ جائے، تو عام لوگوں ہی نہیں زبان کی پرکھ رکھنے والوں کو بھی یہ کہنے کی ''جرأت'' نہ ہوسکے گی کہ یہ اشعار کسی ''مولوی'' نے کہے ہیں۔ یہ بات میں نے اِس لیے کہی ہے کہ زبان پر دورِ آخر میں آزاد خیالوں کی ''اِجارہ داری'' کے بعد یہ باور کرایا جانے لگا ہے کہ مولوی لوگ زبان کا صحیح مذاق نہیں رکھتے؛ حال آں کہ اردو کے اساطینِ اربعہ یا خمسہ سب

کے سب مولوی یا دینی تعلیم کے ہی نمایندے اور اِسی کے پرداختہ تھے۔

کفیل الرحمٰن نشاط کے چند اشعار آپ بھی پڑھیے اور زبان کی پختگی کے ساتھ خیالات کی خوب صورتی سے لطف اٹھایئے:

کوہِ غم ٹوٹ پڑے دیدۂ و دل پر کتنے
قافلے درد کے آئے ہیں برابر کتنے
خشک کانٹوں سے ٹپکتا رہا کلیوں کا لہو
قتل گاہوں سے ملے پھول کے پیکر کتنے
ہم ہیں منصور لبِ دار نے چوما ہم کو
ہم ہیں سقراط ملے زہر کے ساغر کتنے

ایک دوسری غزل میں ذیل کے اشعار پڑھیے، استعارے، کنایے اور معانی وبیان کے کتنے رنگ کے پھول اپنی نرالی خش بوؤں سے استقبال کو تیار ملیں گے:

عارض شفق، نگاہ کرن، لب حسیں گلاب
اے دل قسم خدا کی ترا حسنِ انتخاب
روشن ہے ترے دم سے شبستانِ آرزو
اے شاہ کارِ حسنِ ازل، رشکِ ماہ تاب
غم بھی تری عطا ہے خوشی بھی تری عطا
کافی ہے بارگاہِ محبّت سے انتساب
کب تک رہے گی تشنہء دیدارِ چشمِ شوق
کب تک رہے گا چشمِ عنایت سے اِجتناب

انتہائی سادگی میں پُرکاری اور بے ساختہ تعبیر میں تخیّل کی رعنائی، ملاحظہ کیجیے:

عنوانِ سخن کیا کیا، عنوانِ بیاں کیا کیا
ہیں اُن سے تعلّق پر لوگوں کے گماں کیا کیا

پھولوں کے تخیّل سے آباد ہیں ویرانے
کلیوں سے تراشے ہیں سپنوں کے مکاں کیا کیا
جب نطق کو یارائے گفتار نہیں رہتا
کرتی ہے بیاں اکثر اشکوں کی زباں کیا کیا

شاعر نے اپنے ہمت وحوصلے کی تصویر اور کٹھن حالات سے نبرد آزمائی کا زندہ نقشہ کتنے خوب صورت انداز میں کھینچا ہے، آپ بھی پڑھیے اور داد دیجیے:

ہم نے دیکھے ہیں بُرے وقت کے منظر کتنے
پھول بن جاتے ہیں حالات سے پتھر کتنے
حادثہ شرطِ محبت ہے تو تسلیم مگر
حادثے ہوں گے مرے قد کے برابر کتنے
ایک ہم ہیں کہ ہوے آبلہ پا بھی تو چلے
راہ رو بیٹھ گئے راہ میں تھک کر کتنے

شاعر نے اپنے شعر کی معنویت اور محض لفظیات پر زور صرف کرنے سے بچنے کے اپنے رویّے کو بھی بڑی خوب صورت تعبیر دی ہے:

صرف الفاظ کے پیکر نہیں اشعارِ نشاط
فکر ومعنی کے سموئے ہیں سمندر کتنے

ایک غزل میں جگرؔ کی روانی اور اُنھی کی سی بے ساختگی ملاحظہ ہو:

وقت نے آخر یہ سمجھایا — کون ہے اپنا کون پرایا
زیست کی راحت ڈھونڈنے والو — زیست مکمل دھوپ نہ سایا
جب بھی دل نے ٹھوکر کھائی — اُن کے کرم نے ہاتھ بڑھایا

ایک غزل میں اپنی بات محبوب کے دل میں، مشورے اور نصیحت کے خاک سارانہ انداز میں، اُتارنے کی جو خوش انداز کوشش کی ہے، اُس کو پڑھ کے، ہر سخن شناس قاری

جھوم اٹھتا ہے:

ملا کرو کبھی ہم سے تو زندگی کی طرح
یہ کیا کہ دیکھ کے اُٹھ جاؤ اجنبی کی طرح
سمٹ سکو تو سمٹ جاؤ ماہ تاب صفت
بکھر سکو تو بکھر جاؤ چاندنی کی طرح
تمھاری ریشمی زلفیں رخِ حیات کی ضو
سحر کے دوش پہ مانوس تیرگی کی طرح
رہِ حیات کے غم میں نشاط کا پہلو
کسی کے حسنِ لب ورخ کی دل کشی کی طرح

مفتی کفیل الرحمٰن نشاط کے اشعار، رواں دواں اور پیہم جواں زندگی کے نت نئے مسائل کی ترجمانی میں لب ولہجہ، انداز واداا اور رنگ وآہنگ کے تعلق سے اپنی مخصوص طرح رکھتے ہیں۔ زندگی کی کام رانیوں اور فیض بخشیوں اور اُس کی نا قابلِ تلافی نا کامیوں اور محرومیوں دونوں کی نقشہ گری میں، یہ اشعار لاجواب ہیں، اور شاعر کی پا کیزہ نفسی، روح کی شفافیّت، اِحساس کی نزاکت، تخیل کی بلندی، مسائلِ حیات کے اِحاطے اور کائنات کی سچائیوں کی ہمہ گیر تعبیر پر شاہدِ عدل ہیں۔

اُن کی خاموشی اور سراپا کو دیکھ کے
اُن کے اِتنے اچھے شاعر ہونے کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا

مرحوم کی موہنی صورت، سادہ سے سراپے، ہمہ وقت خاموشی اور بڑی حد تک گوشہ نشینی اور جلوت سے احتراز کو دیکھ کے، یہ اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ اتنے اچھے سخن ور ہیں اور زندگی کی کج رفتاری اور مسائل کی ظالمانہ وجارحانہ یورش کا اُنھیں اِس درجہ اِدراک ہے۔ سچ ہے خاموش، بعض دفعہ گویا سے زیادہ گویا ہوتا ہے اور بولنے والا، بعض

دفعہ زندگی کے حقائق، کائنات کے راز، اِنسان کی پیچیدہ گہرائیوں اور تہ داریوں اور دنیا اور اُس کے عجائبات کا ایسا ہمہ گیر مطالعہ نہیں رکھتا جیسا ایک خاموش انسان جو ہمہ وقت وہ اِنھی کی خواندگی میں لگا رہتا ہے۔

سہ شنبہ- چہار شنبہ، ۶-۷/رجب ۱۴۲۷ھ = ۱-۲/اگست ۲۰۰۶ء کی رات میں مغرب بعد، دار العلوم کے مشہور اِحاطۂ مولسری میں، اُن کے برادرِ اکبر مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دیوبندی مفتیِ پنجاب نے، اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں غیر معمولی بھیڑ تھی اور صفیں صدر گیٹ یعنی بابِ قاسم سے آگے تک پھیل گئی تھیں۔ مقبرۂ قاسمیہ میں اُنھیں اپنے عظیم دادا مردِ صالح مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۸ء— ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) کے پہلو میں تہِ خاک کر دیا گیا۔ مفتی کفیل الرحمٰنؒ نے اپنے پس ماندگان میں اہلیہ پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ اللہ پاک اُنھیں اپنے خاندانِ والا شان کی دینی و علمی میراث کو اپنے سینوں سے لگائے رہنے کی توفیق بخشے۔

دین اور علم کی وراثت

مرحوم کو دین اور علم وصلاح، نسلاً بعد نسل ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے پردادا مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء- ۱۳۲۵ھ/ ۱۸۳۱- ۱۹۰۷ء) دار العلوم کی تاسیس کے لیے، اولیں سرمایہ دہندہ چھ ہُما نصیب لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ کچھ عرصے دار العلوم کے مہتمم بھی رہے۔ اُن کے ولی صفت صاحب زادے مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دار العلوم کے مفتیِ اعظم رہے اور اُنھوں نے، دار العلوم کے سابق مہتمم متکلم اسلام و حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء- ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) کے بہ قول، اپنے ہاتھ سے سوا لاکھ سے زیادہ فتوے لکھے، فتاویٰ دار العلوم کی شائع شدہ ۱۲-۱۳ جلدوں میں ابھی اُن کے فتاویٰ میں سے ایک چوتھائی بھی نہیں آسکا ہے۔ اُن کے دوسرے صاحب زادے مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ ثم الپاکستانی (۱۳۰۵ھ/

۱۸۸۷ء-۱۳۶۹ھ/ ۱۹۴۹ء) سے کون واقف نہیں، وہ اپنے دور میں اسلام کی زبانِ ناطق اور اُس کے باتوفیق شارح وترجمان تھے، مشہور ترجمۂ شیخ الہند اُن ہی کی تفسیر عثمانیؒ سے مُزَیَّن ہے۔ اُن کے تیسرے صاحب زادے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۲۹ء) دار العلوم دیوبند کے نہ صرف مہتمم؛ بل کہ تاریخِ دار العلوم میں سب سے بڑے منتظم اور مدبر ذمے دار گزرے ہیں۔ مولانا مفتی کفیل الرحمٰن کے والد مولانا قاری جلیل الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء-۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء) زندگی بھر دار العلوم میں تجوید وقراءت کے استاذ رہے اور سیکڑوں طلبہ اُن سے مستفیض ہوئے۔ مفتی کفیل الرحمٰن نے کم گوئی، کثرتِ کار، نیکی، سلامت روی، وقت اور وعدے کی پابندی، فرائض کی ادائیگی میں تندہی، یہ اور اِس کے علاوہ بہت کچھ اپنے آبا سے وراثت میں پایا تھا۔ اُن کے نزدیک یہ اوصاف اعلیٰ قدر کا درجہ رکھتے تھے، جس پر کاربندی ہی مومن کی سب سے بڑی شناخت ہوتی ہے۔

خانۂ خیال میں اُن کی تصویر کی گردش

میرے خانۂ خیال میں اُن کی تصویر اب تک متحرک ہے اور شاید تاحیات زندہ رہے گی۔ وہ ظہر کی نماز کے معاً بعد اپنے مکان اور اپنی چھوٹی سی مسجد، جس میں وہ امامت کرتے تھے، کی سمت سے سبک خرامی سے آتے ہوتے اور میں چند طلبہ کے ساتھ اِدھر افریقی منزل قدیم سے، دار العلوم کے لیے محوِ خرام ہوتا۔ وہ اکثر مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء-۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء) کے مکان اور چھتہ مسجد کے شمالی نکڑ کے بیچ میں مجھ سے آملتے اور اِس برق رفتاری سے میرے پاس سے گزر جاتے، جیسے کوئی اُنھیں دوڑا رہا ہو، یا اُنھیں کسی ضروری کام سے بروقت پہنچنا ضروری ہو۔ میں طلبہ سے جو میرے ساتھ ہوتے، اکثر کہتا کہ مفتی صاحب اِس تیزی سے میرے پاس سے بھاگ نکلتے ہیں، جیسے کوئی اُن کا وہ پرس جو وہ اپنے سینے سے لگائے اور ہاتھ سے دبائے ہوئے ہیں، چھینے لے رہا ہو، یا اُنھیں خدشہ ہو کہ شاید میں ہی اُن کے ساتھ اِس قسم کی حرکت کر

بیٹھوں گا۔ دارالعلوم کی راہ میں ہی ہمیشہ میری اُن کی اِسی طرح کی عاجلانہ اور سرسری ملاقات رہی؛ لیکن نہ میں کبھی اُن سے مُخاطَبْ ہوا اور نہ اُنھوں نے کبھی رک کے خبر خیریت پوچھی؛ کیوں کہ شاید اُنھیں یہ احساس تھا کہ اُنھیں بہت جلد بہت دور اِس دنیا کی حد کو عبور کر جانا ہے۔ میں جب سے اپنی فیملی کے ساتھ افریقی منزل قدیم کا باسی ہوا، میرے اُن کے درمیان مذکورہ جگہ کے بیچ روزانہ کی ''دوڑ'' کا جو سلسلہ شروع ہوا، اُس میں وہ اِس دنیا میں بھی ''جیتے'' ہوے تھے اور اُس دنیا کی طرف بھی مجھ سے آگے لپک کے جا پہنچے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں کی زندگی میں مجھے پیچھے چھوڑ جانے والا وہاں کا ''ہدف'' بھی پہلے پالے گا، گویا اُن کے لپکنے اور مجھے ''ہرا'' دینے کے لیے کوشاں رہنے کا راز، اب مجھ پر منکشف ہوا۔

میں اُن کی زندگی کے حوالے سے غالباً اِس سے بھی کم جانتا ہوں، جتنی دیر کے دورانیے میں، میں اُنھیں روزانہ چھتے مسجد کے پاس اُنھیں کم عمر بچے کی طرح پھرتی سے چلتے دیکھتا تھا۔ دیکھنے کا دوسرا ذریعہ اُن کی نثر نگاری تھی اور تیسرا واسطہ اُن کے چھپے ہوے اشعار اور چوتھا ذریعہ ایک آدھ آدمی، جس نے دارالعلوم کی ۲۵-۲۶ سالہ ملازمت میں مجھ سے اُن کے حوالے سے ایک آدھ بات کہی ہوگی۔ اِن سارے ذرائع سے میرے خانۂ خیال میں اُن کی جو تصویر بنی وہ خوب صورت ہے اور محبوب بھی، اِتنی کہ اب تا حیات گردش کرتی رہے گی اور ذہن کے اسکرین پر اپنی دل ربائی کے ساتھ اُبھرتی رہے گی۔ یعنی ایک اچھے اور باہمہ و بے ہمہ اور بے ضرر انسان کی تصویر۔ دل کہتا ہے کہ شاید اِس اِنسان نے اپنی زبان اور اپنے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی ہوگی۔ یہ اُن کے سچا مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ روزانہ اُن کا اِسی جگہ ملنا جس کی طرف اِشارہ ہوا، اُن کے پابندِ اوقات اور ذمے داری کے اِحساس اور اپنے فرائض کو بے کم و کاست ادا کرنے کے لیے اُن کی تڑپ کی دلیل ہے، جو اُن کے مومن ہونے کی بھی دلیل ہے اور یہ دونوں باتیں اِن شاء اللہ اُن کے جنتی ہونے کی بھی علامت ہیں؛ کیوں کہ ربِّ کریم کی رحمت

سے اُمید ہے کہ وہ اِن صفات کے حامل افراد کو، اپنی جنت سے محروم نہ کرے گا۔

مفتی کفیل الرحمٰن کی شرافت اور نیکی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اِس آب وگل کی دنیا سے اُن کا رب اُنھیں اِس طرح لے گیا کہ وہ قبل از موت کسی کے لیے، اپنی معذوری، طویل بیماری اور ارذل العمری کی بنا پر، بلا اِرادہ بھی باعثِ زحمت نہ بنے اور اللہ حکیم نے اُنھیں چلتے چلاتے آناً فاناً اٹھالیا۔(*)

سوانحی نقوش

- نام: (مفتی حافظ مولانا) کفیل الرحمٰن
- تخلص: نشاؔط
- رہائش: مکان نمبر ۴۵۰ محلہ ابوالمعالی، دیوبند، سہارنپور، یوپی
- تاریخ پیدائش: ۵/مارچ ۱۹۴۲ء (۴/جمادی الاخری ۱۳۵۸ھ)
- تعلیم گاہِ اول: دارالعلوم دیوبند
- فراغت: ۱۹۶۱ء (۱۳۸۱ھ)
- تعلیم گاہِ ثانی: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (ایم، اے، عربک)
- فراغت: ۱۹۷۵ء (۱۳۹۵ھ)
- وفات: سہ شنبہ: ۶/رجب ۱۴۲۷ھ مطابق یکم اگست ۲۰۰۶ء۔
- اساتذۂ دارالعلوم

● حضرت مولانا سید فخرالدین صاحبؒ ● حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحبؒ ● حضرت مولانا فخرالحسن صاحبؒ ● حضرت مولانا بشیر احمد خان صاحبؒ ● حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ ● حضرت مولانا فخرالحسن صاحبؒ ● حضرت مولانا سید حسن صاحبؒ ● حکیم الاِسلام حضرت مولانا

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۰، رمضان وشوال ۱۴۲۷ھ = اکتوبر ونومبر ۲۰۰۶ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود ۵ بجے شام شنبہ ۲۴/رجب ۱۴۲۷ھ = ۱۹/اگست ۲۰۰۶ء۔

قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند۔

۞ علی گڑھ کے اساتذہ

● پروفیسر مختارالدین احمد آرزو صاحب ● پروفیسر مہدی حسن صاحب ● ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب ● ڈاکٹر عبدالباری ● ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب۔

۞ پس ماندگان

اہلیہ محترمہ (رفیعہ خاتون عرف تسکین دلہن) بنتِ حاجی لطیف احمد۔ چھ لڑکے: ظل الرحمٰن نبیل، معاذ عزیز (پ: ۲۷/ اپریل ۱۹۶۷ء) عمار عزیز (پ: ۲۸/ اپریل ۱۹۷۰ء) سعد عزیز (پ: ۲/ اگست ۱۹۷۲ء) صفوان عزیز (پ: ۲۸/ دسمبر ۱۹۷۷ء) طاہر عزیز (پ: ۱۲/ فروری ۱۹۸۴ء) اور دو لڑکیاں: عروسہ سعدیہ (پ: ۱۹۶۴ء) شگفتہ جبیں (پ: ۱۹۷۵ء)۔

۞ علمی نقوش

عربی تراجم

نام کتب	ناشر
۱- سراج المعانی ترجمہ وشرح اردو شرح جامی	کتب خانہ محمودیہ دیو بند ۱۹۸۰ء
۲- سراج الوقایہ شرح اردو شرح وقایہ	کتب خانہ محمودیہ دیو بند ۱۹۸۲ء
۳- سراج المطالب ترجمہ شرح اردو کافیہ	مکتبہ العزیز
۴- تفہیم المسلم ترجمہ وشرح اردو فتح الملہم	
۵- سراج الایضاح ترجمہ وشرح اردو نورالایضاح	کتب خانہ محمودیہ دیو بند ۱۹۸۴ء
۶- اصول اکبری ترجمہ وشرح اردو فصول اکبری	کتب خانہ محمودیہ دیو بند ۱۹۸۵ء
۷- سراج الطالبین ترجمہ اردو شرح پنج گنج	کتب خانہ محمودیہ دیو بند ۱۹۸۶ء
۸- ترجمہ فتاویٰ عالمگیری	زکریا بک ڈپو دیو بند ۱۹۹۸ء
۹- سراج المنیر ترجمہ الفیۃ الحدیث	
۱۰- سراج النحو شرح ہدایت النحو	مکتبہ العزیز دیو بند

فارسی تراجم

۱- ترجمہ مالا بدمنہ	کتب خانہ محمودیہ دیو بند ۱۹۸۷ء

۲- ترجمہ پندنامہ — کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۸ء
۳- ترجمہ گل زارِ دبستاں — کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۹ء
۴- ترجمہ مسائل اربعین — مکتبہ دانش ۱۹۹۰ء
۵- ترجمہ تحفۃ الموحدین — مکتبہ فیض القرآن ۱۹۹۰ء
۶- ترجمہ رباعیات حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی — عظیم بک ڈپو ۱۹۹۰ء
۷- ترجمہ فارسی کی پہلی — کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۳ء
۸- ترجمہ فارسی کی دوسری — کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۴ء
۹- حاشیہ اردو بوستاں — کتب خانہ محمودیہ دیوبند
۱۰- حاشیہ اردو گلستاں — کتب خانہ محمودیہ دیوبند
۱۱- حاشیہ مالابدمنہ — کتب خانہ محمودیہ دیوبند ۱۹۸۵ء

اردو تصنیفات

۱-زیارت قبور ۲-آئینۂ بدعت ۳-شادی کی رسمیں ۴-اسلامی مہینے ۵-حیات ابوذرؓ ۶-حیات سلمان فارسیؓ ۷-حیات ابوہریرہؓ ۸-حیات ابن عباسؓ۔ ناشر مکتبہ فیض القرآن ۹-نعت حضور، شعری مجموعہ (کتب خانہ محمودیہ دیوبند) ۱۰-کلیاں (بچوں کی نظموں کا مجموعہ) مکتبہ العزیز دیوبند ۱۱- مجموعۂ کلام ''شناسا'' ناشر فیصل پبلیکیشنز جامع مسجد دیوبند۔



عالمِ صالح و بافیض مدرس

مولانا سید محمد شمس الحق ویشالویؒ

۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء — ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء

صراحی روتی اُٹھی، جام اَشک بار اُٹھا
پھر آج مَے کدے سے ایک بادہ خوار اُٹھا

برادرِ عزیز مولوی محمد قمر عالم سلمہ استاذ مدرسہ عالیہ عرفانیہ، عبدالعزیز روڈ، چوک، لکھنؤ کے خط، فون اور مکرر یاددہانی کے ذریعے اِصرار کی وجہ سے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں، ورنہ مولانا سید محمد شمس الحق صاحب مدظلہ (۱) کے تعلق سے مجھے جان کاری نہیں ہے۔ عرصے سے اُن کا ذکرِ خیر سن رہا ہوں اور یہ کہ وہ بہار کے مشہور و معتبر مدرسہ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کے شیخ الحدیث اور وہاں کے بافیض اُستاذ و مُربّی اور سیکڑوں قدآور علما کے روحانی باپ ہیں۔ وہ ۱۹۱۶ء میں مولود ہوے۔ اِس اعتبار سے اُن کی عمر اِس وقت کم و بیش ۹۰ سال ہے۔ ۱۹۳۸ء سے وہ مسلسل درس و اِفادے میں مشغول ہیں۔ اِس طرح اُن کی تدریسی زندگی کا دورانیہ کم و بیش ۶۷-۶۸ سال پر محیط ہے۔ اِس حساب سے وہ ہندوستان کے انتہائی فیض رساں عالم و مدرس ہیں، اِتنی طویل زمانی مسافت تک بہت کم

---

(۱) اور اب رحمۃ اللہ علیہ؛ کیوں کہ یک شنبہ ۱۳/ ذیقعدہ ۱۴۲۸ھ = ۲۵/ نومبر ۲۰۰۷ء کو وہ وفات پا گئے۔

اہلِ تدریس کو فیض بخشی کی توفیق ملتی ہے۔ خداے پاک کا اُن کے ساتھ یہ خصوصی اور امتیازی کرم ہے۔ دینی اِفادے کے ساتھ طویل العمری اور پیہم کارِ خیر میں صرف ہوتی ہوئی سن رسیدگی، اُن کے منتخبِ روزگار علما میں ہونے کی علامت ہے۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک اُنھوں نے دارالعلوم دیوبند میں نابغۂ روزگار علما سے تحصیلِ علم کیا۔ اس کے بعد جب دارالعلوم میں میں تقدیرِ الٰہی سے اُس وقت ایک بڑا انقلاب آیا اور اُس کے جیّد علما و مشائخ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل منتقل ہوگئے، جن میں سرخیلِ علما و محدثین علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور جلیل القدر عالم و محقق و مفکر و قائد علامہ شبیر احمد عثمانی بھی تھے، جس کی وجہ سے مدرسہ تعلیم الدین کو جنوب کا دارالعلوم دیوبند ثانی اور جامعہ اسلامیہ بننے کا اِعزاز حاصل ہوا، تو مولانا سید محمد شمس الحق صاحب، جو اُس وقت دارالعلوم کے طالبِ علم تھے، اپنے مایۂ ناز اساتذۂ کرام کی ڈابھیل منتقلی کی وجہ سے، خود بھی کشاں کشاں تعلیم الدین جا پہنچے اور دسمبر ۱۹۳۶ء یعنی اواخرِ شوال ۱۳۵۵ھ سے وہاں کسبِ علم کا سلسلہ شروع کیا۔ ستمبر ۱۹۳۷ء یعنی شعبان ۱۳۵۶ھ میں اُنھوں نے وہاں سے ہی رسمی فراغت پائی اور علامہ شبیر احمد عثمانی، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی (۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء-۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۹ء) اور مفتیِ اعظمِ ہند علاّمہ مفتی محمد کفایت اللہ (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء -۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲) کے ہاتھوں اُن کے سر پر دستارِ فضیلت بندھی، جو اِس بات کا اِشارۂ غیبی تھا کہ یہ جوان ایک روز، اِس ملک کا یگانۂ روزگار مدرس اور بافیض عالم و مربی بنے گا۔

مولاناؒ کی فیض رسانی

مولانا سید محمد شمس الحق ویشالوی اپنے عظیم استاذ علاّمہ شبیر احمد عثمانی سے بیعت بھی ہوے اور تربیت بھی پائی۔ اُن کی پاکستان منتقلی اور پھر وفات کے بعد، وقت کے عالم و دانش ور اور مُربّی مولانا سید منت اللہ رحمانی سے رجوع ہوے اور اُن سے مشورے اور تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اِس طرح وہ صرف حرفِ علم کے رسمی شناسا اور

خشک عالم نہیں؛ بل کہ طریقت وروحانیت کی راہ کے پرشوق مسافر بھی رہے اور اُن کے شوقِ سفر کو کبھی تسکین نہ ملا کہ یہ مسافر کی تنگ دامانی کی علامت ہوتی ہے۔

مولاناؒ، تدریسی فیض رسانی کے انہماک کی وجہ سے اکثر محنتی مدرسین کی طرح، تصنیف وتالیف کے لیے وقت نہیں نکال سکے؛ لیکن جو تھوڑا بہت کام اِس سلسلے کا سامنے آیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اُنھیں وقت ملا ہوتا، تو وہ کام یاب مُؤلِّف اور پایے کے مُصنِّف ہوتے۔ بدیع الزماں ہمدانی کے دس مقاموں کی "تسہیل المعانی" کے عنوان سے کام یاب اور مقبول شرح لکھی، جو اُن کے ابتدائی زمانۂ درس کے نقشِ اول میں شمار ہوتی ہے۔ عربی زبان کی ریڈنگ بک "تسہیل العربیہ" کے نام سے تصنیف فرمائی یہ بھی تدریس کے اولین دور کی یادگار کتاب ہے۔ علم نحو پر ایک منظوم کتاب ترتیب دی جو "عوامل النحو" کے نام سے مطبوعہ ہے۔ صحیح بخاری کے درسی اِفادے "جهد البهاري في حلّ صحيح البخاري" کے نام سے اور جامع ترمذی کے درسی افادے "غنية المبتدي في حلّ الترمذي" کے عنوان سے مُدَوَّن ہو چکے ہیں۔ پارۂ عم کا منظوم اردو ترجمہ بھی آپ نے اِرقام فرمایا ہے۔ آخر الذکر کتابیں لاسٹ ٹچنگ سے گزر رہی ہیں اور وہ مطبوعہ شکل میں آکر، اِن شاء اللہ طلبہ اور علما کے لیے بڑی کارآمد ہوں گی۔

مولاناؒ نے خدا کی توفیق سے بڑی محنت اور جانفشانی سے پڑھا تھا؛ اِس لیے علم میں گہرائی اور گیرائی دونوں صفات پائی جاتی ہیں۔ وہ پختہ گو اور قادر الکلام شاعر بھی ہیں "یادِ حرم" کے نام سے ایک مجموعۂ کلام بھی طبع ہو چکا ہے۔ فارسی، اردو، عربی تینوں زبانوں پر عبور ہے اور ضرورت کی حد تک ہندی اور انگریزی بھی جانتے ہیں؛ کیوں کہ اسکول کے نظام کے مطابق "بی اے" کا امتحان بھی دے چکے تھے۔ اُنھوں نے ہر مدرسے میں امتیازی نمبرات حاصل کیے اور تدریس کی دنیا میں آئے تو ممتاز مدرس اور بافیض مُعلِّم ثابت ہوئے۔ وہ بہار کے ممتاز ترین علما کی صف میں تاریخ نگاروں کے لیے

بھرپور مضمون کے مواد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہار کے اہلِ علم کا مؤرخ، اُنھیں ممتاز جگہ دینے پر مجبور ہوگا۔ خاموشی، گوشہ نشینی کے ساتھ بغیر کسی انقطاع کے ۶۰-۷۰ سال تک فیض رسانی اور علم و افادے کا جام لنڈھانے میں انہماک کے حوالے سے، اُن کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔

مولاناؒ کی تدریسی خدمات کے تعلق سے خاص بات

خاص بات یہ ہے کہ اُن کا تدریسی و تربیتی عمل سارا کا سارا بہار ہی میں محدود رہا۔ اُنھوں نے اپنا تعلیمی و تدریسی مے خانہ بہار کے چند محدود خطے، جو اُن کے وطن مظفر پور و ویشالی سے مونگیر تک کی مسافت پر پھیلا ہوا ہے، ہی میں تعمیر و آباد کیا اور اُس کو کبھی ویرانی کا شکوہ نہ ہوا؛ ورنہ بہار کے خطّے کو دورِ آخر میں علم خور خطہ باور کیا جانے لگا ہے۔ اِس اِعتبار سے وہ بہار میں اِس دور کے عالی مقام مدرس و مربی ثابت ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی شہرت، علمی چمک، تدریسی بہار، تصنیفی نکھار اور زرکشی کے ذریعے کی تلاش میں، اپنی خاک سے ''بے وفائی'' کی نہیں سوچی اور جس مٹی نے اُن کے خمیر کی تیاری میں اپنا گراں مایہ جو ہر صرف کیا تھا اور جس کی آب و ہوا نے اُنھیں علم و عمل کے ''جراثیم'' عطا کیے تھے، اُس کی بھرپور خدمت کو اصل فریضہ باور کیا اور اُسی سے چمٹے رہے۔ اِس وقت کے نوجوان علما کی حالت سے، اِس مُعزِّ زانہ رویّے کا موازنہ کیجیے، تو آپ کو مولانا سید محمد شمس الحق اِنتہائی قد آور اور منفرد علما و صلحاے وقت کی صف میں، سلفِ عظام کی سیرت پر گام زن نظر آتے ہیں۔ اللہ پاک اُنہیں اُن کی ساری قربانیوں اور ذات فراموشیوں کا بھرپور بدلہ عطا فرمائے۔

مولاناؒ ویشالوی بہار کی مٹی کی زرخیزی کا بہترین نمونہ

بہار کی زمین بلاشبہہ بڑی مردم خیز ہے۔ اِس خطے میں ہمیشہ کی طرح آج بھی

ہر علم وفن کے نامی گرامی اہلِ کمال پورے ہندوستان میں، نیز بیرونِ ملک میں، اپنے علم اور ہنر کا لوہا منوا رہے ہیں۔ ذہانت، جرأت مندی، حق گوئی اور بے باکی اور علم وفن کے اکتساب کی غیر معمولی صلاحیت، اہلِ بہار کی آج بھی بہت بڑی شناخت ہے۔ نفاق سے نفرت، حق پر جماؤ اور اِصرار اور اُس کے لیے قربانی دینے کے لیے، ہمہ وقت تیار رہنا؛ ساکنانِ بہار کا امتیاز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ ہر جگہ کی مٹی کو اللہ نے کچھ خوبیوں اور خرابیوں سے ممتاز بنایا ہے۔

مولانا سیّد محمد شمس الحق ویشالوی بہار کی مٹی کی قابلِ تعریف امتیازی خصوصیات کا مکمل نمونہ ہیں اور موجودہ علما کے لیے علم وعمل کی جامعیّت، کام میں اِنہماک، شہرت سے نفرت، اپنی ذات کو برپا کرنے کی خواہش سے بالکلیہ براءت کے حوالے سے لائقِ تقلید ہیں۔ اُنھوں نے پوری زندگی علم آموزی، تربیت سازی اور اَفراد کی تیاری میں صرف کردی اور اپنی عظمت کی دھاک بٹھانے کی اُنھیں کبھی نہ سوجھی، یہ بہت بڑی بات ہے، جو لائقِ پیروی بھی ہے اور قابل ریکارڈ بھی۔ كَثَّرَ اللّٰهُ أَمْثَالَهٗ.

نہ دیکھنے کے باوجود، وہ میرے لیے دیدہ سے

مولاناؒ کو میں نے دیکھا ہے، نہ برتا ہے، نہ کسی طرح کا اُن سے استفادہ کیا ہے؛ لیکن اُنھیں دیکھنے، اُن کو جینے اور اُن سے ہر طرح کا فیض پانے والوں نے اُن کے حوالے سے اتنا کچھ کہا، بتایا اور سنایا ہے کہ وہ نہ صرف شنیدہ؛ بل کہ دیدہ سے لگتے ہیں۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ آدمی کو دیکھ، برت اور تجربہ کر کے جو کچھ لکھا جاتا ہے، وہ زیادہ اچھا، بھرپور اور وقیع ہوتا ہے۔ یہ سطریں اِس وقت انتہائی عجلت میں مذکور الصدر عزیز کی خواہش پر تحریر کی گئی ہیں۔ اللہ کرے اِس سے زیادہ اطمینان کا کوئی موقع نصیب ہو اور مولاناؒ کی ذات کو قریب سے دیکھنے، یا اُن کی علمی نگارشات سے فائدہ اٹھانے کی سعادت ملے اور میں زیادہ طاقت اور تفصیل کے ساتھ اُن کے سلسلے میں کچھ لکھنے کی

عزّت حاصل کرسکوں۔ واللّٰہُ وحده يُقَدِّر الأعمالَ والآجالَ ويُحقِّق الرغباتِ والآمالَ.(۱)

وفات

یک شنبہ: ۱۳؍ذی قعدہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۵؍نومبر ۲۰۰۷ء کو تقریباً ڈھائی بجے دن میں، سال ہا سال کی بیماری وکم زوری کے بعد اُنھوں نے اپنے وطن ''اَبا بکر پور'' ضلع ''ویشالی'' سابق ضلع ''مظفر پور'' میں آخری سانس لی اور وہیں سپردِ خاک ہوے۔ اُن کے جنازے میں بڑی تعداد میں علما وطلبہ اور صلحا نے شرکت کی۔ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر، جہاں وہ سال ہا سال شیخ الحدیث رہے، کے علما کے ایک موقر وفد نے اُن کی نمازِ جنازہ اور تجہیز و تکفین میں شرکت کی۔

سوانحی نقوش

- نام: سید محمد شمس الحق بن سید محمد ابراہیم
- جاے ولادت: چک اولیا (ویشالی)
- تاریخ ولادت: ۱۹۱۶ء سنداً ۱۹۱۹ء
- ابتدائی تعلیم: اپنے والد محترم سید محمد ابراہیم اور برادرِ مکرم مولوی منظور الحق سے حاصل کی
- اعلیٰ تعلیم: مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور میں (دس سال کی عمر میں) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ، ماہ جولائی ۱۹۳۰ء دارالعلوم دیوبند، ماہ جنوری ۱۹۳۳ء جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات ۲۹؍شوال ۱۳۵۵ھ
- فراغت: جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، گجرات ۹؍شعبان ۱۳۵۶ھ (دستار بندی بہ دست علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ اور مفتی اعظمِ ہند مولانا محمد کفایت اللہؒ)

---

(۱) یہاں تک مرحوم کی حیات میں بہ راہِ راست اردو میں بہ روز یک شنبہ: ۱۶؍شعبان ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۰؍ستمبر ۲۰۰۶ء لکھا گیا۔ اِس کے بعد والا حصّہ پہلے والے حصّے کے ساتھ ملا کر عربی زبان میں تحریر کیا گیا، جو ''الداعی'' عربی کے شمارہ ۱۱-۱۲، جلد ۳۲، ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۴۲۹ھ مطابق نومبر و دسمبر ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔

۞ **اساتذۂ کرام:** دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ: مولانا عبدالسمیع صاحبؒ، مولانا میاں اختر حسین صاحبؒ، مولانا اجتبا صاحبؒ، مولانا محمد جمیلؒ، مولانا نافع گلؒ، مولانا شمس الحقؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد اعزاز علیؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مفتی ریاض الدینؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ، مولانا گل محمد خانؒ۔
شمس الہدیٰ پٹنہ کے اساتذہ: حافظ عبدالرحمٰنؒ، مولانا اقبال حسینؒ، مولانا عبدالماجدؒ، مولانا عبدالرشیدؒ، مولانا محمد قاسمؒ، مولانا عبدالشکورؒ، مولانا دیانت حسینؒ، ملک العلما مولانا ظفر الدین بہاریؒ، مولانا شاہ عبید اللہؒ، مولانا اصغر حسینؒ۔

۞ **رشتۂ ازدواج:** چک نصیر ویشالی ۲۹؍ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ (لاولد) دوسری شادی: رسول پور بکھری، ویشالی ۲۱؍ربیع الاول ۱۳۶۰ھ (ایک لڑکا نام مظاہر عالم سابق پرنسپل مدرسہ احمدیہ ابابکر پور، ویشالی) تیسری شادی: رسول پور بکھری ویشالی ۲۰؍صفر ۱۳۶۶ھ

۞ **اولاد:** مظاہر عالم، قطب عالم، خورشید عالم، نظیر عالم، محبوب عالم، تنویر عالم (لڑکیاں) زینت بیگم، ہاجرہ خاتون، فاطمہ شمسی۔

۞ **درس وتدریس:** مدرسہ احمدیہ ابابکر پور یکم فروری ۱۹۳۸ء تا ۶؍ستمبر ۱۹۴۲ء، باڑھ حق منزل ۸؍نومبر ۱۹۴۲ء (تقریباً ایک سال) کھگویا ۸؍اگست ۱۹۴۳ء تا اپریل ۱۹۴۴ء، باگھی ہائی اسکول مظفر پور، یکم مئی ۱۹۴۴ء (چار سال) مدرسہ احمدیہ ابابکر پور ۱۵؍جنوری ۱۹۴۸ء، جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر ۱۹۶۵ء سے تاحیات۔

۞ **زیارت بیت اللہ:** (حج) ۱۹۷۰ء، ۱۹۸۰ء (عمرہ) ۱۹۸۱ء (حج) ۱۹۸۴ء۔

۞ **مشہور تلامذہ:** مولانا عبدالسبحان رحمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا رضوان القاسمیؒ، مولانا بدرالحسن القاسمی (مقیم کویت)، مولانا نورالحق رحمانی، مولانا فضل الرحمٰن رحمانی، مولانا طفیل احمد رحمانی، مولانا نیاز احمد رحمانیؒ وغیرہم۔

۞ **بیعت:** علامہ شبیر احمد عثمانی نوراللہ مرقدہ۔ (تجدید بیعت) حضرت امیر شریعت رابع مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانیؒ۔

۞ **مشاغل:** شیخ الحدیث جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر، قاضی شریعت مونگیر، رکن مجلس شوریٰ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔

۞ **سرپرست:** مدرسہ اسلامیہ، اماموری پاتے پور، ویشالی؛ بانی وسرپرست مدرسہ اسلامیہ شمسیہ، چک معین الدین، ویشالی اور ان کے علاوہ بہت سے مدرسوں کے بانی وسرپرست۔

۞ **تصنیف:** مقامات بدیع الزماں ہمدانی کے دس مقامات کی شرح بہ نام تسہیل المعانی، تسہیل العربیہ، عوامل النحو (منظوم)، یادِ حرم (غیر مطبوعہ) جهد البهاري في حلّ البخاري، غنية المبتدي في حلّ الترمذي، پارۂ عم (منظوم)

۞ **ان کی تصنیف کی ترتیب:** کا کام مولانا مظاہر عالم شمسی سابق پرنسپل مدرسہ احمدیہ ابابکر پور اور مولانا عبدالقیوم شمسی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ اماموری کے زیر نگرانی ہو رہا ہے۔(*)

(*) سوانحی نقوش کے سلسلے میں مولوی محمد قمر عالم ویشالوی سلمہ کی ارسال کردہ معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

منفرد عالم و مقرر و محدث

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

۱۳۴۷/۱۹۲۸ء — ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء

بجھ گئے کتنے شبستانِ محبت کے چراغ
محفلیں کتنی ہوئی شہرِ خموشاں، کہیے

اوائلِ ربیع الثانی، اواسطِ اپریل میں، میں کچھ ضروری کاموں اور علاج کی غرض سے اپنے وطن ''ہرپور بیشی، اورائی، مظفر پور، بہار'' گیا ہوا تھا۔ شنبہ: ۱۹/ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶/ اپریل ۲۰۰۸ء کو اپنے گھر کی ایک گیلری میں، تقریباً ۱۱/ بجے حسبِ معمول دواؤں کی خوراک لے رہا تھا کہ اچانک موبائل کی گھنٹی بجی، میں نے جلدی میں بٹن دبا کر کان سے لگایا تو مولوی وصی احمد استاذ ''جامعہ امام انور'' دیوبند کی عاجلانہ اور مغموم آواز سنی کہ حضرت! اِس وقت یہ ناچیز آپ کو بڑی غم انگیز خبر دے رہا ہے: ابھی ابھی دہلی سے خبر آئی ہے کہ حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ ساڑھے دس بجے ''گنگا رام ہسپتال'' میں اللہ کو پیارے ہوگئے ''إِنَّا لِلّٰہِ وَإِنَّا إِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' اُنھوں نے فوراً ہی فون کاٹ دیا۔

واقعی اِس خبر کو سن کے جو صدمہ ہوا، اُس کو الفاظ سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ ایک ایسے بڑے اور ممتاز عالمِ جلیل کے انتقال کی خبر سن کے، دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہوگئی، جس نے زندگی بھر برِّ صغیر کے اسلامی حلقوں کو اپنے علمِ نافع، روشن دماغ، لائق ذکر ذہانت، بے حساب سرگرمیوں اور جوانوں کے لیے بھی قابلِ رشک تازگی و زندگی،

ظرافت و طلاقت لسانی، روانیِ قلم، خوش نما تدریس، لذت انگیز و پُر جوش تقریر، نئے رنگ و آہنگ کی تحریر، شیریں زبانی، مزاحیانہ تخاطب، تبسم آمیز سلوک سے، ہمیشہ مشغول و معمور رکھا، جس میں اُن کا وسیع مطالعہ، گہرا تجربہ، بے پناہ معلومات اور ہر موضوع کو پیش کرنے میں غیر معمولی سلیقہ مندی اور نرالا پن مستزاد ہوتا تھا۔

اِس خبر کو سنتے ہی، میں ہر اُس کام سے غافل ہو گیا، جو اُس وقت میرے اوپر طاری تھا اور جس کو انجام دینا میرے لیے انتہائی ناگزیر تھا۔ میرے دماغ کی اسکرین پر ایک سے بڑھ کے ایک خوب صورت یادوں کا نقشہ اُبھرنے لگا اور خیال و فکر پر اس طرح چھا گیا کہ میں صرف اُسی پر غور کرنے لگا۔ اُن کی ممتاز شخصیت، اُن کی منفرد شبیہ، زندگی کی راہوں اور علم و فکر، دین و دعوت کی شاہ راہوں پر اُن کی پیہم دوڑ اور مسلسل سرگرمیوں (جن کا سلسلہ اُسی وقت تھما جب اُن کی نبضِ حیات، ہند کے تہذیبی، ثقافتی و سیاسی اور اسلامی مرکز: دہلی کے ایک ہسپتال کے ایک پُرسکون کمرے میں یکسر رُک گئی) کی انمول تصویریں اُجاگر ہوتی؛ اور دعوتِ نظارہ دیتی رہیں۔

سیرت و صورت

''دارالعلوم دیوبند'' میں میری طالب علمی کے زمانے کی اُن کی ایک خوب صورت تصویر خانۂ خیال میں گردش کرنے لگی کہ وہ ''دارالعلوم'' کی کسی درس گاہ سے سبق پڑھا کر، کسی گیلری سے گزر رہے ہیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے، چہرے پر خوشیوں کی لکیریں اُبھری ہوئی ہیں، وہ تازہ دمی اور چستی کے ساتھ تیز تیز چل رہے ہیں، حسبِ معمول اُن کے گرد طلبہ کی بھیڑ اُن کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے(۱) اور وہ معنی خیز مزاحیہ اور علمی فقروں

(۱) جو ہمہ حال اُن کے ساتھ ضرور رہتی تھی، حتی کہ صبح و شام کی اُن کی اُس تفریح میں بھی، جس کو سفر و حضر، جاڑ و گرمی، خشکی و برسات کے دنوں اور صحت و بیماری میں بھی، اُس وقت تک چھوڑتے نہ تھے، جب تک کسی وجہ سے ڈاکٹر انھیں اس سے منع نہ کر دیتا۔ وہ اپنے معاصر تمام علما میں غالباً اِس حوالے سے بے نظیر تھے کہ وہ صبح و شام کی تفریح کی، مقدس وظیفے کی طرح پابندی کرتے تھے؛ کیوں کہ وہ اُس کو صحت کی بقا و افزائش کا بنیادی عنصر سمجھتے تھے۔

سے طلبہ کو محظوظ کر رہے ہیں۔

یہ تصویر میرے خانۂ ذہن میں رقصاں ہی تھی کہ اُن کی دوسری تصویر ذہن میں اُبھرنے لگی: وہ دارالعلوم کی کسی بڑی درس گاہ میں متعلقہ سبق پڑھا رہے ہیں، وہ علمی گوہر لٹا رہے ہیں، ایک سے بڑھ کے ایک خوب صورت جملوں اور خوش نما نقطوں سے طلبہ عش عش کر رہے ہیں، جوش و خروش اور علم و فکر کی موسلا دھار بارش کی وجہ سے، طلبہ کسی اور طرف تاکنے اور جھانکنے کی ایک لمحے کی فرصت بھی نہیں پا رہے ہیں، وہ اِس طرح جمے بیٹھے ہیں، جیسے اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں، اُنھوں نے ذرا سی حرکت کی نہیں کہ وہ سب یک لخت اُڑ جائیں گے۔ سارے طلبہ اِس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ اُن کا ایک جملہ بھی اُن کی گرفت سے رہ نہ جائے۔ مطالعہ کی وسعت، تدریس کی مہارت، اسلوبِ ادا کی نزاکت، زبان کی فصاحت، لہجے کی گھن گرج، جملوں کی خوب صورت ساخت، کے ساتھ ساتھ اُن کا سارا سبق سنجیدگی و مزاح کی متوازن آمیزش سے بھرپور ہوتا تھا، جس کی وجہ سے طلبہ پر کبھی وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی، جس کو اُکتاہٹ یا ذہنی غفلت کا نام دیا جا سکے، جو عموماً سامعین و حاضرین پر اُس وقت ضرور طاری ہوتی ہے، جب مقرر، مدرِّس، خطیب؛ طرزِ ادا کی ہنرمندی سے مطلوبہ مقدار میں بہرہ ور نہیں ہوتا، جب کہ یہی صفت مولانا کشمیریؒ کا وجہِ امتیاز تھی اور اِسی وجہ سے وہ اپنے بہت سے معاصرین میں اپنی الگ پہچان رکھتے تھے۔ وہ کوئی پیشہ ور مدرس نہ تھے جو روزی روٹی کمانے کے لیے یا کسی خالی جگہ کی خانہ پُری کے لیے کام کرتا ہے؛ لہٰذا وہ توجہ اور دلچسپی سے اپنا کام نہیں کرتا۔ مولانا کشمیریؒ فطری تدریسی ملکہ کے حامل مدرس تھے، وہ واقعتاً مثالی معلِّم تھے۔ وہ درس گاہ جانے سے پہلے ہی تدریسی مواد کا بھرپور مطالعہ کر کے، اُس کے ہر گوشے کو اپنے ذہن اور معلومات کے خانے میں مرتب کر چکے ہوتے تھے۔ اِسی کے ساتھ اللہ نے اُنھیں مخاطب کو مکمل طور پر مطمئن کر دینے اور اُس کے ذہن میں اپنی بات کو اُتار دینے کی عجیب و غریب صلاحیت سے نوازا تھا۔ اُن کا اندازِ تکلم بڑا مزے دار، اُن کی

زبان انتہائی خوب صورت اور اُن کا مطالعہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی اور انسان کے تجربوں سے مالا مال تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بڑے ذہین، بیدار مغز، حاضر جواب اور ذکیُّ الحس تھے، جس کی وجہ سے وہ نہ صرف حقائق گوئی پر بلا کی قدرت رکھتے تھے؛ بل کہ وہ بہ وقتِ ضرورت حقائق سازی بھی کر سکتے تھے؛ لہٰذا دلوں اور عقلوں کو جیت لینے کے فن میں نہ صرف ماہر؛ بل کہ طاق تھے۔

وہ انتہائی معنی خیز، حکمت آمیز اور اِشارہ ریز مزاحیانہ اور بے ساختہ فقروں کے ذریعے؛ مجلسِ درس و مجلسِ گفتگو دونوں کو زعفران زار بنائے رکھتے تھے۔ اُن کے دُور رَس اِشاروں پر مبنی جملوں کی تہ داری کے سامنے متوسط ذہن کے طلبہ بے بس اور لاچار رہ جاتے تھے۔ اِن ساری خوبیوں کی وجہ سے وہ ایک بے بدل، انتہائی مفید اور کثیر الاِفادہ اُستاد تھے۔ طلبہ اُن کے اَسباق کا اِس طرح انتظار کرتے جیسے ایک سچا محبّ اپنے حبیب کا۔ کسی باکمال اور کثیر النفع استاد کے حوالے سے یہی وہ خراجِ عقیدت و محبت ہے، جو باتوفیق طلبہ بہ خوشی ادا کیا کرتے ہیں اور یہی ایک ایسے باتوفیق استاذ کی اصل شناخت ہے، جو فائدے اور اِفادے کے لیے پیدا ہوتا ہے اور خدا کی توفیق سے؛ وہ مکمل اِفادے کی راہ سے بہ خوبی واقف ہوتا ہے۔

منفرد اور باکمال مدرس

سنہ عیسوی کے اعتبار سے ۵۵ سال اور سنہ ہجری کے حساب سے ۵۷ سال اُنھوں نے مسلسل درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا؛ کیوں کہ وہ ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء میں دار العلوم میں شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اِعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء — ۱۳۷۴ھ/۱۹۵۴ء) کی سفارش و کوشش سے مدرِّس منتخب ہوئے۔ دار العلوم دیوبند اور اُس سے منسلک مدرسوں میں پڑھائی جانے والی ساری کتابیں ماسوائے فلسفہ کی کتابوں کے، اُنھوں نے ذوق و شوق سے پڑھائیں۔ طویل تدریسی سفر کی وجہ سے اُن

کی تفہیمی صلاحیتیں دو بالا ہوگئی تھیں۔ مختلف علوم وفنون کی گلیوں میں مسلسل گردش کی وجہ سے وہ اُن کے مزاج آشنا ہوگئے تھے اور اُن کے مضامین، اُن کے خیال وذہن اور فکر کا حصہ بن گئے تھے؛ اِسی لیے اُن کی عام گفتگو میں بھی عالمانہ گہرائی کی چھاپ دکھائی دیتی تھی؛ لیکن وہ اپنے حسنِ گفتار سے، گہرائی کے باوجود پیچیدگی پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ اِنھیں خوبیوں کی وجہ سے، علومِ کتاب وسنت کی اِشاعت میں دارالعلوم کے اُس حقیقت پسندانہ طریقۂ کار کی صحیح ترجمانی کا حق رکھتے تھے، جس میں صرف فعّالیت ہوتی ہے اور قوالیّت اور اِدّعائیت کا کہیں گزر نہیں ہوتا۔

لیکن پچھلے دسیوں سال سے وہ حدیث شریف کی تدریس کے لیے فارغ ہوگئے تھے، خصوصاً صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی تدریس کے لیے۔ حدیث کی تدریس کے دوران، اُن کی وہ عبقریت وہمہ گیریت کھُل کر سامنے آئی جو وقت کے بے مثال محدث اور علامۂ یگانہ ''مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ'' (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء—۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء) کی اولاد ہونے کی وجہ اُنھیں وراثت میں ملی تھی۔ علامہ کشمیریؒ عرب وعجم کے منتخب علماے باکمال کے نزدیک نہ صرف اپنے ہم عصروں میں؛ بل کہ بعض اعتبار سے بہت سے علماے سلف سے بھی بلند پایہ عالمِ دین اور ممتاز محدث تھے۔ مولانا انظر شاہؒ بہت سی خوبیوں میں اپنے عظیم والد کی شبیہ تھے۔ وہ حدیث کی تدریس میں بھرپور تحقیق وتدقیق، زبردست مطالعے اور انتہائی چھان بین کے ہتھیار سے کام لیتے تھے۔ بعض دفعہ وہ ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے، جن کی طرف حدیث کا اشتغال رکھنے والے پرانے لوگوں کا ذہن بھی منتقل نہیں ہو پاتا۔ تدریسِ حدیث میں اُن کی فن سے مناسبت، اُس سے غیر معمولی دلچسپی، اُس کا بے انتہا شوق اور درایت وروایت، متن وسند، الفاظ ومعانی اور عبارت واشارت ودلالت کے حوالے سے؛ اُس پر دست رس ہر طرح عیاں ہوتا تھا۔ وہ اِن خوبیوں کی وجہ سے حدیث کے بھی علماے نام دار میں شمار ہوتے تھے اور اِس تعلق سے اُن کی ہر جگہ بہ جا طور پر شہرت ہوگئی تھی، جیسا کہ وہ اپنے غیر معمولی مختلف

الانواع کمالات کی بناپر برِّصغیر کے ممتاز ترین علما میں تھے۔ بہ ہرصورت، بہ حیثیت محدث اُن کا اُٹھ جانا بھی نا قابلِ تلافی نقصان ہے؛ کیوں کہ برِّصغیر کے یہ بے شمار مدارس، علما کی کھیپ کی کھیپ پیدا کرنے کے باوجود، فنِ تدریس بالخصوص علومِ عالیہ: تفسیر وحدیث اور فقہ کے ہنر منداور پختہ کار اساتذہ کو ہمہ وقت چراغ لے کر ڈھونڈ رہے ہیں، خصوصاً فنِ حدیث پر قابو رکھنے اور صحیح ڈھنگ سے اُس کی تدریس کا ملکہ رکھنے والے علما تو شاذ ونادر ہی ملتے ہیں؛ اِس لیے کہ تدریس میں پختہ کاری کے حصول کے لیے، جس سکون، محویّت، انہماک اور مادی حرص وہوس سے بہ قدرِ ضرورت کنارہ کشی کی ضرورت ہے؛ وہ اِس وقت عَنقَا ہوتی جارہی ہے؛ کیوں کہ مادّیت اِس وقت گویا منھ کھولے کھڑی ہے اور ''مخلصوں'' کو بھی اپنا لقمہ بنائے لے رہی ہے، ریاکار اور وسیع تر اسلامی خدمت کے قافلے سے منسلک غرض پسند افراد کی بات تو جانے ہی دیجیے کہ اِسلامی محاذ کو اصل خطرہ اِسی طرح کے لوگوں سے ہے؛ کیوں کہ کھُلے دشمنوں سے زیادہ خطرہ نہیں ہوا کرتا؛ اِس لیے کہ وہ مرئی ہونے کی وجہ سے بہ آسانی مار کھا جاتے ہیں؛ کیوں کہ اسلامی محاذ کے سپاہیوں کے لیے اُن سے محتاط رہنا اور اُن پر یک بارگی وار کرنا آسان ہوتا ہے۔

پرجوش وولولہ انگیز خطیب

میرے ذہن کے پردے پراُن کی ایک اور تصویر اُبھری کہ وہ کسی بڑے جلسے میں مصروفِ خطابت ہیں اور اپنے پُرجوش خطاب، لذیذ وعزیز شیریں بیانی، پُرکشش اندازِ بیان، منفرد اندازِ گفتار، گونج دار آواز، بھرپور معلومات سے جلسے پر چھائے ہوئے ہیں۔ وہ میری طالب علمی کے زمانے میں نہ صرف دارالعلوم؛ بل کہ برِّصغیر کے یکتائے زمانہ پُرجوش خطیبوں میں سے ایک تھے۔ وہ جس جوش وجذبے سے بے تکلف بولتے، اُسی جوش وجذبے کی حالت میں ہمیشہ اچانک اپنی تقریر؛ کسی تمہید کے بغیر ختم کردیتے۔ اِس

سلسلے میں وہ بالکل یکتا اور بے مثال تھے، میں نے اِس حوالے سے کسی کام یاب اور باتوفیق مقرِر کو اُن جیسا دیکھا نہ سنا۔
اُن کے ہاں بہت سے جملے بالکل نئے اور خود ساختہ ہوتے، لہجے کی انفرادیت، اندازِ تکلم کا نرالا پن، مواد کا نیا رنگ و آہنگ، بات کہنے کا سارا لب ولہجہ؛ بالکل جداگانہ ہونے کی وجہ سے بہت سے طلبہ اُن کے اندازِ خطابت و اِلقا کی نقل کرتے رہتے تھے، ناچیز بھی اُنھی طلبہ میں سے ایک تھا۔ بہت سے طلبہ تو اُن کی اتنی کام یاب نقل اُتار لیتے تھے کہ طلبہ کی ایک تعداد اُن کی ''نقلی تقریریں'' سن کے، کمروں سے نکل پڑتی تھی کہ دیکھیں شاہ صاحب کہاں بول رہے ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔
جس جلسے میں اُن کی شرکت کی خبر مشتہر ہو جاتی، اُس میں سننے والوں کی بھیڑ دیدنی ہوتی تھی، کسی جلسے میں اُن کی شرکت، جلسے کی کام یابی کی یقینی دلیل ہوتی تھی، جب کہ کسی وجہ سے کسی ایسے جلسے میں اُن کی عدمِ شرکت بڑی مایوسی اور اُس کی ناکامی کا سبب ہوتی تھی، جس میں اُن کی شرکت کی خبر گرم ہوتی تھی اور وہ کسی ناگزیر سبب سے اُس میں شرکت نہیں کر پاتے تھے۔
وہ قدرتی مُقرِر تھے، اُن کے ہاں آمد ہی آمد ہوتی تھی، آورد کا دور دور تک گزر نہیں ہوتا تھا۔ اُنھوں نے ریاضت، مشق اور محاکات کے ذریعے تقریر نہیں سیکھی تھی۔ ہاں طویل عرصے تک، جو نوجوانی سے ادھیڑ عمری اور سن رسیدگی کے فاصلے پر پھیلا ہوا ہے، مسلسل اور بے پناہ تقریروں نے اُن کی زبان کو مانجھ کر، اُنھیں انفرادیت کے زیور سے آراستہ کر دیا تھا؛ اِس طرح وہ اِس وسیع و عریض ملک میں اپنے رنگ وڈھنگ کے بے بدل خطیب بن گئے تھے اور علم و ہنر کے بہت سے میدانوں میں اپنے گہرے نقوش کے ساتھ ساتھ، وہ اِس میدان کے بھی نہ صرف شہ سوار تھے؛ بل کہ وہ تا حیات ''محبوب ترین قادر الکلام'' مقرِر کی حیثیت سے ہی مشہور و معروف رہے؛ اِسی لیے وہ اِس میدان میں بھی نہ پُر ہونے والا خلا چھوڑ گئے ہیں، بالخصوص اِس زمانے میں جو دین و عقیدہ اور

دعوت کے حوالے سے عبقریوں سے خالی ہوتے چلے جانے کے تعلق سے ہی جانا جاتا ہے، چناں چہ قد آور علماے گرامی کے مسلسل اُٹھتے جانے کے بعد، دور دور تک اُن کا اپنے اپنے میدان میں کوئی بدل نظر نہیں آتا، گویا اِس وقت اُمتِ مسلمہ آسمان سے گر کر کھجور پر بھی نہیں اٹک رہی؛ بل کہ سیدھی زمین پر گر رہی ہے۔

بلند پایہ اہلِ قلم

نیز وہ اردو کے بلند پایہ اہلِ قلم تھے۔ اُن کی زبان پُر شکوہ ہونے کے ساتھ ساتھ، نئی نئی ترکیبوں اور خوش نما ساختیات سے بھری پُری ہوتی تھی۔ وہ اپنی تحریروں میں زیادہ تر اپنے تراشے ہوے جملے استعمال کرتے، جو روانی، شیرینیّت اور جمال کا پیکر ہوتے تھے۔ وہ زندگی کے اکثر میدانوں میں نقّالی ومحاکات اور ''دوسروں سے مانگنے'' کے رویے سے بے نیاز تھے، اُن کی تحریر میں یہ رنگِ بے نیازی زیادہ نمایاں تھا؛ لہٰذا اُن کی تحریریں اپنے بانک پن کی وجہ سے بڑی پُر کشش اور طرح دار ہوتی تھیں، جیسے سامعین اُن کی تقریروں سے بے پناہ محظوظ ہوتے تھے، اِسی طرح قارئین اُن کی تحریروں سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے، جن میں خیال کی ندرت، زبان کی بلاغت، ترکیبوں کی فصاحت، طرزِ ادا کی سحر کاری اور پیرایۂ بیان کے تنوع اور ہمہ گیریت کی وجہ سے، ہر لمحہ ایک نئی لذّت محسوس ہوتی اور قاری کسی قدم پر اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ہم اِن شاء اللہ، اِس مضمون کے اواخر میں اُن کی کتابوں اور تراجم کی ایک فہرست ثبت کریں گے، جس سے مضامین ومقاصد کے تنوع کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ ان کے متنوع الاغراض مضامین بھی کثرت سے شائع ہوے اور ملک کے اہم اور تعمیری وباوقار رسالوں واخبارات نے اُنھیں شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

مولاناؒ متعدد رسالوں کے سرپرست اور چیف ایڈیٹر بھی رہے، جیسے ماہ نامہ ''ہادی'' جو ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء — ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء کے عرصے میں نکلا اور بند ہوگیا۔ ماہ

نامہ ''نقش'' یہ رسالہ ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء — ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء میں دیوبند سے شائع ہوتا رہا تھا۔ پندرہ روزہ ''یثرب'' جو دیوبند ہی سے ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء — ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء کے درمیان شائع ہوکر بند ہوگیا۔

وہ نہ صرف زود نویس؛ بل کہ زود اِملا بھی تھے۔ خودنویسی میں تو بہت سے اہلِ قلم ماہر اور زود نویس ہوتے ہیں؛ لیکن دوسروں کو بہ سرعت اِملا کرانا مشکل ہوتا ہے اور دونوں پر بہ یک وقت قدرت تو شاذ و نادر ہی کسی کو ہوتی ہے۔ مرحوم برجستہ دوسروں کو مضامین بول کے لکھواتے تو معانی والفاظ اور جملوں کی ساختیات میں ذرا بھی کہیں فرق واقع نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے خیالات و معلومات کو از خود لکھنے اور دوسروں کو اِملا کرانے میں بلا کی مہارت رکھتے تھے۔

بہ حیثیت سیاست داں

علمی وتدریسی مشاغل کے ساتھ ساتھ، اُنھوں نے ضرورت کی حد تک سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور زندگی کے آخری لمحوں تک اِس شغل کو بھی جاری رکھا۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سیاست میں بہ قدرِ ضرورت حصہ لینے کو ناگزیر تصور کرتے تھے؛ کیوں کہ آزادی سے قبل سے ہی عموماً اور آزادی کے بعد خصوصاً ہندی مسلمانوں کو جن پیچیدہ اور گوناگوں مسائل کا سامنا رہا، اُن کے مداوا کے لیے اکثر علما و قائدین کے نزدیک سیاسی راہ پر بہ قدرِ ضرورت چلنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ سیاسی سرگرمیوں کے حوالے سے، اُن کی وابستگی ہمیشہ جمعیۃ علماے ہند سے رہی، جس کا آزادیِ وطن میں زبردست قائدانہ رول رہا تھا؛ لیکن بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے، وہ اِدھر دسیوں سال سے اُس سے اپنی وابستگی ختم کر چکے تھے؛ لیکن رجحان وخیال کے اعتبار سے اُن کا وہی موقف رہا جو جمعیّۃ کا رہا تھا، چناں چہ وہ سیاسی عمل میں بالعموم کانگریس پارٹی کے مؤید اور ہم راے رہے؛ کیوں کہ اُس کا لچک دار سیکولر دستور و موقف ہی ہندوستان جیسے سیکولر

ملک میں، جہاں سیکڑوں مذاہب وخیالات کے لوگ رہتے ہیں اور جہاں کی طاقت ور اکثریت ہندواور صنم پرست ہے، مسلمانوں کے لیے انصاف کی کوئی گنجایش نکل سکتی یا نکالی جاسکتی ہے۔ کانگریس کے دستور کے لچکیلے ہونے کے باوجود ہندی مسلمانوں کواُس کے عملی رویّے اور ہندو اکثریت کے لیے جانب دارانہ اور مسلمانوں کے لیے منافقانہ کرداراور عمل کودیکھتے ہوے، اس سے آزادی کے ۶۰ سالہ دور میں ہمیشہ بڑی شکایت رہی؛ اِسی لیے بہت سے مسلم قائدین، عمل کے بہت سے مرحلوں میں اُس سے اپنی وابستگی برقرار نہیں رکھ سکے، جن میں مولانا انظر شاہ مرحوم بھی تھے، جواُس سے ایک آدھ دفعہ اتنے ناراض ہوے کہ مسلمانوں کی کھلم کھلا دشمن دائیں بازوں کی ہندو سیاسی پارٹی ''بھارتیہ جنتا پارٹی'' ——سابقہ جن سنگھ—— سے وابستہ ہوگئے؛ لیکن یہ بہت اچھا ہوا کہ بہ جلد اُنھیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور دوبارہ کانگریس سے ہی جا ملے۔ کانگریس سے اُن کا تعلّق بالعموم غیر رسمی ہی رہا؛ لیکن زندگی کے آخری مرحلے میں وہ یوپی کانگریس کے نائب صدر مُنتخَب کرلیے گئے اور اِس طرح وہ رسمی طور پر اُس سے ہم رشتہ ہوگئے۔ یہ رشتہ اُن کی موت پر ہی ختم ہوا۔ چناں چہ اُن کے انتقال پر چوٹی کے کانگریسی لیڈروں نے، اُن کے پس ماندگان، بالخصوص اُن کے فرزندِ وحید مولانا احمد شاہ خضر کشمیری سے تعزیت کی اور اپنے دُکھ کا اظہار کیا۔

اُن میں چوں کہ خوش اخلاقی وخوش کلامی دونوں صفتیں بہ درجۂ اُتم تھیں؛ اِس لیے چوٹی کے اربابِ حکومت اور کانگریس کے بلند پایہ زُعما سے، اُن کے اچھے مراسم قائم ہوگئے تھے، جن کو اُنھوں نے مدارسِ اسلامیہ اور خود اپنی ذات کے لیے بہت سلیقے سے استعمال کیا، جس کا ملّت کو بعض دفعہ دور رَس فائدہ ہوا۔ اِدھر کئی سالوں سے صلیبیت وصہیونیت کی گہری دوستی؛ بل کہ دونوں کے شیر وشکر اور یک جان ودو قالب ہوجانے کی وجہ سے پوری دنیا میں بالخصوص ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کے امریکہ کے عالمی تجارتی مرکز کے دھماکے سے اڑائے جانے کے ڈرامے کے بعد، جو اسلام ومسلمانوں کے خلاف سوچی

سمجھی اسکیم کو بہ عجلت و بہ حکمت رو بہ عمل لانے کے لیے، صہیونیوں نے صلیبیوں کے تعاون سے کیے اور کرائے تھے، ہر طرف اِسلام و مسلمانوں کو گھیرنے، اُنھیں ہر سطح پر ستانے اور دہشت گرد قرار دے کر، عبرت ناک سزائیں دینے اور جان و مال، عقیدہ وشعائر کی سطح پر بھرپور نقصان پہنچانے کا جو کھیل کھیلا جارہا ہے، اُس میں عالمِ عربی یقیناً نمبر ایک میدانِ کار ہے؛ لیکن سارے اِسلامی ممالک اور جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی پائی جاتی ہے، وہاں بھی مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیے جانے کا عمل زور شور سے برپا کیا جارہا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں، جہاں ہم نے ایک ہزار سال تک حکومت کی اور خون پسینے کے ساتھ ساتھ عقل وخرد، فکر ونظر کی ساری توانائیوں کو نچوڑ کر، ہم نے اِس کی زلفِ برہم کو سنوارا، ہندو اکثریت کے انتہا پسند اور فرقہ پرست جو حکومت کی ساری مشینری میں، پوری طرح دخیل ہوگئے ہیں، صہیونیوں سے سانٹھ گانٹھ کرکے، مسلمانوں کو ہر سطح پر نقصان پہنچانے کے لیے، یہی دہشت گردی کا ہتھیار لے کر اُٹھ کھڑے ہوے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف حکومت کے زبردست اور بھرپور نظام کو حرکت میں لانے کے لیے، مسجد، مندر اور عوامی جگہوں، نیز اہم حکومتی حسّاس اداروں میں دھماکے کرتے ہیں اور اس کا الزام مسلمانوں کے سر مڈھ کر، مُسلم نوجوانوں کو بلا دلیل پکڑ کر اُنھیں ہمیشہ کے لیے جیل میں ڈال کر، اُن کی ہڈی پسلی توڑتے اور اُنھیں ذہنی اور جسمانی سزائیں دے کر، اپنی موت آپ مرجانے پر آمادہ کرتے ہیں یا پولس سے مصنوعی مقابلہ اور مڈبھیڑ دکھا کر جان سے مار ڈالتے ہیں۔

اِس سلسلے میں مدارسِ اسلامیہ کو زیادہ بدنام کیا جارہا ہے؛ اِس لیے کہ یہی دینی سرچشمے ہیں، دین کے سارے سُوتے یہیں سے اُبلتے ہیں اور دینی اور عقائدی کھیتیوں کو سیراب کرکے اُس کو سرسبز اور پھل دار بنائے رکھتے ہیں؛ اِس لیے صہیونیوں اور صلیبیوں کے اِشارے پر اُنھیں بہ طورِ خاص نشانا بنایا جارہا ہے۔ اِن حالات میں، جہاں دگر قدآور اور ذی اثر علما نے اپنا لائقِ شکر کردار ادا کیا، وہیں مولانا انظر شاہؒ نے بھی اپنی زبان،

اپنے اثر ورسوخ اوراپنی مؤثّر شخصیت سے بعض دفعہ بہت نتیجہ خیز کردار نبھایا۔

بے نظیر خوبیاں

مولاناؒ اپنی اِن ساری خوبیوں کے ساتھ، اِنتہائی ہنس مُکھ، مرنجا مرنج، انسیّت شعار اور مانوس کر لینے والے اِنسان تھے۔ وہ وقت کے دراز قد عالِم تھے؛ لیکن اُن میں علمی طنطنہ، اِحساسِ علم سے پیدا شدہ ایک خاص قسم کا غرور اور اپنے بڑا عالم ہونے کا زائد از ضرورت اِحساس نہیں تھا۔ یہ ایسی خوبی ہے، جو بہت سی خامیوں کو چھپا لیا کرتی ہے اور اِس کے بغیر ساری علمی خوبیوں اور کمالات پر پانی پھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو بھی بہت علم دے؛ لیکن اُس کا بے جا اِحساس نہ دے۔ مولاناؒ کبھی بھی ترش رو نہیں دیکھے گئے، نہ اُنھوں نے کسی پر علمی دھونس جمایا۔ وہ اپنے سے کم علم اور کم عمر کے ساتھ بھی، بڑائی کا رویّہ نہیں اپناتے تھے؛ بل کہ اِس طرح کھل کر ملتے تھے کہ مشاہیر علما عموماً چھوٹوں سے اِس طرح نہیں ملتے۔ اِسی کے ساتھ وہ میزبانی کے آداب کو برتنے کی خاص مہارت رکھتے تھے، وہ مہمانوں سے نہ صرف کھانے کے لیے اِصرار کرتے؛ بل کہ از خود دستر خوان پر چُنے ہوے کھانوں کو اُن کی طرف بڑھاتے اور اُن کی پلیٹوں میں ڈالتے یا ہاتھ سے اُٹھیں دیتے۔ یہ عربوں کا طریقہ ہے، اِس سے مہمانوں کو کھانے میں حجاب نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ مہمان نواز تو ہوتے ہیں کہ دستر خوان پر ڈھیر ساری چیزیں جمع کر دیتے ہیں؛ لیکن مہمان کھائیں نہ کھائیں، وہ اُن سے کوئی اِصرار نہیں کرتے، گویا اُن کا مقصد مہمانوں کے سامنے کھانے کی نمائش تھی، جو ہو چکی، اب وہ کھائیں نہ کھائیں، اُن کی بلا سے۔ مولانا بڑے مجلسی بھی تھے، اُن کی مجلس عشا بعد منعقد ہوتی تھی، جس میں اساتذہ کے علاوہ شہر کے مختلف الخیال لوگ بھی جمع ہوتے اور دین و دنیا کی بے تکلّفانہ باتیں ہوتیں۔ مولاناؒ اپنی بے پناہ معلومات اور تجربے کی روشنی میں اُن میں بھر پور حصہ لیتے اور حاضرین کی معلومات اور تجربے میں اِضافہ کرتے۔

خردوں کی بے مثال حوصلہ افزائی

اُن کے گھر اور ہم لوگوں کی رہائش گاہ "افریقی منزل قدیم" کے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ ہے؛ لیکن اپنے اپنے مشاغل کی وجہ سے، اُن سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہو پاتی تھی؛ لیکن جب بھی اچانک ملاقات ہوتی، تو استاد ہونے کے باوجود، سلام کرنے میں پہل کرنے کی کوشش کرتے اور حسبِ معمول مسکراہٹ کے ساتھ کوئی جملہ چست کرتے ہوئے خبر خیریت دریافت کرتے۔ اُن کے اندازِ گفتگو میں بلا کی شیرینی اور انسیّت ہوتی۔ خشکی، کھردراپن اور نپے تلے انداز سے وہ قطعاً نا آشنا تھے۔ اُن کے خمیر میں الفت اور انسانیت کے بے پناہ عناصر کی آمیزش تھی۔ ظرافت، مزاح، خوش طبعی، حسنِ گفتار، خوش لباسی اور ہر بات میں ذہانت کی تراوش اُن کا امتیاز تھی۔

گذشتہ ۱۵ سال کے عرصے میں اِس راقم نے عربی کے ساتھ ساتھ، اردو میں بھی لکھنا شروع کیا، اِس سے پہلے میں صرف عربی میں لکھتا تھا، اردو کے لیے وقت نہیں نکال پاتا تھا؛ لیکن برِّ صغیر میں عصرِ حاضر کے عربی زبان کے سب سے بڑے خادم و معلّم حضرت الاستاذ حضرت مولانا وحید الزماں صاحب قاسمی کیرانوی نور اللہ مرقدہ (۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء — ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء) کی وفات سے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اُس نے میرے قلم کو اردو میں لکھنے کے لیے بری طرح مجبور کیا اور میں نے اُن پر صرف چند روز بعد "وہ کوہ کن کی بات" کے عنوان سے ایک تاثُّراتی کاوش شائع کی، جو توقع سے زیادہ مقبول ہوئی اور علما و طلبہ نے اتنا پڑھا کہ عصرِ حاضر میں کوئی سوانحی نقش شاید اِتنا نہیں پڑھا گیا ہوگا۔ میں نے دگر علما و اساتذہ کی طرح مولانا کے پاس بھی اپنے بعض عزیزوں کے ذریعے اُس کا ایک نسخہ بھجوایا۔ اُنھوں نے کتاب دیکھ کر نہ صرف بے حد خوشی کا اظہار کیا؛ بل کہ ٹیلیفون پر کتاب کے ظاہر و باطن کی بہت تعریف کی، شان دار طباعت، بہت اچھے کاغذ، معنی خیز ٹائٹل اور مضامینِ کتاب کی خوبیوں کی کھُل کر داد دی۔ بعد میں

میرے شاگردوں نے بتایا کہ کئی مجلسوں میں اُنھوں نے کتاب کے محاسن کو سراہا۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے کسی ''احتیاط'' کو راہ نہ دی؛ ورنہ بڑے لوگ عموماً چھوٹوں کو سراہتے وقت بھی ''احتیاط'' کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

بعد میں، میں نے جتنی ٹوٹی پھوٹی تحریریں شائع کیں، مولاناؒ کو اُن کا ایک ایک نسخہ روانہ کرتا رہا اور اُن کی حوصلہ افزائی واستحسان کا فائدہ اٹھاتا رہا۔ بعض دفعہ اُن کے تبصروں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے مشغول ترین اوقات میں سے، مجھ جیسے خردوں کی تحریریں پڑھنے کے لیے بھی وقت نکال لیا کرتے ہیں اور سرسری نگاہ ڈالنے پر اکتفا نہیں کرتے۔ واقعی وہ بہت سے معنوں میں بڑے تھے؛ ورنہ بڑوں کے پاس چھوٹوں کی چیزوں کے پڑھنے کے لیے ذرا بھی وقت نہیں ہوتا۔ اِس سے اُن کی علم نوازی وعلما نوازی کا اندازہ ہوتا ہے۔

خوداعتمادی

مولاناؒ میں ایک ممتاز خوبی اُن کی خوداعتمادی تھی، جو اُن کے مواقف اور افکار وخیالات میں نمایاں ہوتی رہتی تھی؛ اِس لیے بعض دفعہ اُن کے ہم مسلک علما بھی اُن کی رائے سے اختلاف کرتے تھے؛ کیوں کہ مولاناؒ کسی موقف اور رائے کے حوالے سے، کسی سے بہت زیادہ مشورے اور تادیر تبادلۂ خیال کے قائل نہ تھے، اپنے تجربے اور اپنی سوچ کے مطابق کسی بھی مسئلے میں اپنا موقف اور اپنی رائے قائم اور ظاہر کردیتے تھے۔ اِسی طرح وہ کسی رائے اور موقف کے تعلق سے مفادات واغراض کے غلام نہ تھے: کیوں کہ جو آدمی اپنے مفاد کو پیشِ نظر رکھتا ہے وہ کسی رائے اور موقف کے تعلق سے دائیں بائیں دیکھنے اور اِن کی اُن کی سننے اور اُن کی مرضی کے مطابق رائے قائم کرنے کا عادی ہوتا ہے، مولاناؒ اِس طرح کے نہ تھے، وہ اپنی ذات وافکار پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔ اِسی طرح وہ کسی نظریے اور رائے کو بہت پکانے اور طویل غور وفکر کے بعد کوئی رائے قائم کرنے قائل

نہ تھے، وہ فی البدیہہ بولنے کی طرح فی البدیہہ رائے قائم کر لیتے تھے۔ اِس کی واضح مثال حکومت کی طرف سے ۲۰۰۷ء/ ۱۴۲۸ھ میں ''مدرسہ بورڈ'' قائم کرنے کے اِقدام کی اُن کی طرف سے کھلی ہوئی تایید تھی۔ حکومت نے اِس سلسلے میں ماضی کے دگر اِقدامات کی طرح، اِس حوالے سے بھی خوب سبز باغ دکھائے تھے کہ اِس بورڈ سے مُلحقہ مدارس کے فضلا کو ڈھیر ساری سرکاری سہولتیں ملیں گی اور مدرسوں کو بے شمار فائدے حاصل ہوں گے، جن میں دہشت گردی کے تعلق سے اُن کی براءت کی تصدیق بھی ہوگی؛ اِس لیے مولاناؒ نے اِس کی تایید وتوثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر ہم اپنے تشخص کو باقی رکھتے ہوئے، اِن سہولتوں سے فائدہ اُٹھائیں اور نوجوانوں کے لیے فائدہ اُٹھانے کی راہ ہم وار کردیں تو اِس میں کیا حرج ہے؟ لیکن دگر مسالک کے بہت سے علما اور دیوبندی مکتبۂ فکر کے تقریباً سارے علما نے حکومت کے اِس اِقدام کی نہ صرف مخالفت کی؛ بل کہ مدارس کے معاملات میں دخل اندازی اور اُن کی آزادی کو سلب کرنے کے لیے راستہ وا کرنے کی سازش باور کرتے ہوئے، اِس کو بالکلیہ مسترد کردیا؛ کیوں کہ ان مدارس کا اصل کردار وسیع تر اسلامی محاذ کی پہرہ داری ہے، حکومت اپنے اِس اِقدام کے ذریعے اُن کے اِس کردار کو ختم کردینے کی دوررَس پالیسی پر عمل کررہی ہے؛ کیوں کہ ماضی میں بھی اُس نے مختلف حیلوں بہانوں سے اِسلامی سُوتوں کو خشک کرنے کی کوشش کی ہے، جن سے بہ ظاہر کوئی خطرہ شروع شروع میں محسوس نہیں کیا گیا۔

مولانا سے ایک یادگار ملاقات

جمعہ ۱۸ رشوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۰ رنومبر ۲۰۰۶ء کو دارالعلوم دیوبند کے موقر استاذ مولانا ریاست علی صاحب قاسمی کے صاحب زادۂ خرد مولوی سعدان قاسمی سلمہ کی تھانہ بھون میں شادی کی تقریب کے موقع سے ہم لوگ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ (۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء ــــ ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کے وطن تھانہ بھون

کے ریلوے اسٹیشن سے متصل حضرت تھانویؒ کے مہمانوں کے لیے بنائے ہوئے عارضی مہمان خانے کے لان میں بیٹھے ہوئے تھے، مولانا کشمیری کی نشست کے بغل ہی میں یہ ناچیز بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا، اُن کے گرد بہت سے لوگ اُن سے محوِ گفتگو تھے، جیسے ہی اُن کی نظر میرے اوپر پڑی مسکراتے ہوئے فرمایا: برادرِ عزیز! چلو ہم ایک طرف کو بیٹھ کر کچھ محبت کی باتیں کریں، اُن کی فرمایش کے مطابق ہم دونوں وہیں پڑی کرسیوں پر ایک طرف کو بیٹھ گئے۔ مولانا کے چہرے مُہرے سے نحافت، شیخوخت اور ماہ وسال کی گردشوں کے آثار نمایاں تھے، وہ کسی غم زدہ عندلیب کی طرح اپنے اندرونی غم واَلم اور آہ کو آشکارا کررہے تھے، بہت سی باتوں کے ساتھ فرمایا: برادرم! میں اب زندگی کے بے پناہ بوجھ سے تھک ہار سا گیا ہوں، یہ مسلسل اسفار، تقریروں، ملاقاتوں اور شہروں اور قریوں کی گشت سے بھی اُکتا سا گیا ہوں، جی چاہتا ہے کہ اب بعض اُن علمی کاموں کے لیے فارغ ہو جاؤں جنھیں میں زندگی کے آخری اسٹیشن کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اُن کی بات کے تسلسل کو کاٹتے ہوئے عرض کیا: ''حضرت! آپ سن وسال کی پختگی کو پہنچ چکے ہیں، آپ کے چہرے پر اُس کے اثرات عیاں ہیں، خدوخال سے طبعی تکان چھلکی پڑ رہی ہے، سچ یہ ہے کہ مجھے آپ کے بڑھاپے پر رحم آرہا ہے، میں ایک خرد ہونے کے ناطے آپ سے گزارش کرنا چاہوں گا کہ آپ واقعی دیوبند میں بیٹھ جائیے، جامعہ انور کو اپنی تصنیفی ودعوتی تحریک کا مرکز بنالیجیے، آپ بہت چل پھر چکے، بہت تقریریں کر چکے، شہروں اور قریوں کا کونا کونا چھان چکے، اب ضرورت ہے کہ سانس لینے کو بیٹھ جائیں اور زندگی کی باقی منزلوں کو علمی وتالیفی ودعوتی کاموں کے لیے وقف کردیں، یہ تقریروں اور دَوروں سے زیادہ دیرپا اور تعمیری کام ہے۔ کیا بہتر ہوتا کہ آپ اپنی جامعہ کی مسجد میں رمضان میں اعتکاف وقیام کرتے اور آپ کے ساتھ ایک قافلہ، دین ودعوت کے کام پر محوِ سفر ہوتا۔ بیرونِ ملک واندرونِ ملک کے اسفار کے لیے آپ اپنے خردوں کو مکلّف کردیجیے۔ ماہِ رمضان میں تو آپ سفر سے ضرور ہی

احتراز رکھیں، اس سے لوگوں کو بھی بہت فائدہ ہوگا۔

حضرت نے میری باتوں کو جو ایک خرد کی بزرگ کے تئیں بہت بڑی جرأت تھی، بہت غور سے سنا۔ اُن کی یہ خوبی تھی کہ وہ اچھا بولتے بھی تھے اور دوسروں کو اچھی طرح سنتے بھی تھے؛ ورنہ عموماً قادر الکلام لوگوں میں دوسروں کو سننے کی عادت نہیں ہوتی۔ اُنھوں نے میری بات سننے کے بعد فرمایا: میں خود بھی اِدھر کچھ دنوں سے اِسی طرح کی بات سوچ رہا ہوں، اب میرا فیصلہ ہے کہ مجھے اِسی پر عمل کرنا ہے۔ اُنھوں نے واقعتاً آیندہ رمضان سے اپنی جامعہ کی مسجد میں اعتکاف وقیام اور رمضان میں دیو بند سے کہیں نہ جانے کا قطعی پروگرام بنالیا، جس سے اُن کے محبین وتلامذہ کو بے حد خوشی ہوئی۔

مرض الموت اور وفات

اس کے بعد ہی رمضان میں اُنھوں نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا ہی تھا کہ اُن پر مرض کا شدید حملہ ہوا، بعد میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ جگر اور گردے کی خرابی کا اثر ہے، اُنھوں نے ہر طرح کا علاج ودوا کیا، جس میں انگریزی اور یونانی دونوں طرح کے اچھے سے اچھے معالجین کا مشورہ شامل رہا، وہ دیو بند سے باہر بالخصوص دہلی اور بعض دفعہ بیرونِ ملک بھی علاج کے لیے جاتے رہے۔ اِس اثنا میں عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ دار العلوم وقف کے علاوہ دار العلوم دیو بند کے اساتذہ بھی عیادت کو جاتے رہے، یہ ناچیز بھی کئی بار شرفِ عیادت سے ہم کنار ہوا۔ مولاناؒ اِس زمانے میں بھی لوگوں کی خوب ضیافت کرتے اور دینی وعلمی موضوعات پر تبادلۂ خیال بھی۔

بعض اوقات اُنھیں کچھ اِفاقہ محسوس ہوتا، تو وہ دار العلوم وقف میں تدریس کے لیے بھی تشریف لے جاتے۔ جمعہ یکم محرم ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۱ر جنوری ۲۰۰۸ء کو اُنھوں نے دار العلوم وقف کے کتب خانے کی عمارت کے افتتاح کے موقع سے تقریر بھی کی، جو اُن

کی زندگی کی آخری تقریر ثابت ہوئی؛ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اُن کی طبیعت خاصی بگڑ گئی۔ وفات سے دو ایک ماہ قبل ہی مرض کی شدت کے آثار اُن کے چہرے پر منعکس ہو گئے تھے، رنگ بھی اُن کا تبدیل ہو گیا تھا، نقاہت بھی جسم سے عیاں تھی۔ اُن کی یہ حالت ہم لوگوں کے لیے بڑی افسوس ناک تھی؛ کیوں کہ وہ انتہائی پھرتیلے، چست اور سرگرمی کی فطرت کے حامل تھے؛ لیکن ہم لوگوں کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ وہ کچھ ہی دنوں کے مہمان ہیں اور اُن کی زندگی اچانک ''وقفۂ تامّہ'' کا شکار ہو جائے گی، ایک صاحب نے بہت اچھی بات کہی کہ: ''مولانا کی موت سے ایسا لگا کہ کہ وہ مذاقاً اچانک رخصت ہو گئے''، ایک صاحب نے بہت دل چسپ انداز میں کہا کہ: ''وہ اپنی تقریر کو انتہائی جوش کے وقت ہی اچانک اِس طرح ختم کر دیتے تھے کہ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ وہ تقریر ختم کرنے والے ہیں، اِسی طرح ایسا لگا کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے سفر کو بھی اچانک ختم کر دیا''۔

شنبہ ۵/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ = ۱۲/اپریل ۲۰۰۸ء کو اُن کے مرض نے پھر شدت اختیار کر لی، لہٰذا اُنھیں دہلی لے جایا گیا اور دہلی کے ''گنگارام'' ہسپتال کے سخت نگہ داشت والے یونٹ میں اُنھیں رکھا گیا، ہر طرح کے اچھے سے اچھے علاج کے باوجود، اُن کی طبیعت سنبھل نہ سکی اور بالآخر شنبہ ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ ایک بجے دن میں اُن کی نعش دہلی سے روانہ ہوئی اور ۵ بجے دیوبند پہنچی۔ تجہیز و تکفین کے بعد ۷ ½ بجے دارالعلوم دیوبند کے دارالحدیث تحتانی میں اُن کا جنازہ دیدار کے لے رکھا گیا اور دس بجے شب میں ممتاز و مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتممِ دارالعلوم وقف نے اُن کی نمازِ جنازہ پڑھائی، جس میں ہزاروں لوگوں علما و طلبہ و عوام نے شرکت کی۔ ۱۱ بجے شب میں اپنے عظیم والد علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے پہلو میں آسودۂ خاک ہوے۔

ع   آسماں اُن کی لحد پہ شبنم افشانی کرے۔

مختصر سوانحی نقوش

❁ پیدائش: شنبہ ۱۴ر شعبان ۱۳۴۷ھ - ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۸ء۔

❁ جاے پیدائش: ''شاہ منزل''، محلّہ خانقاہ، دیوبند۔

❁ علمی وتدریسی سفر: پنجاب یونیورسٹی لاہور سے عصری تعلیم کی مختلف قسم کی ڈگریاں حاصل کیں، پھر عربی تعلیم از اوّل تا آخر دیوبند میں حاصل کیا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہویؒ (۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء — ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) جن کی اُن کی دینی تعلیم و تربیت میں خصوصی توجہ رہی تھی کی سفارش سے ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۳ء میں دارالعلوم میں مدرِّس ہوے۔ اس وقت سے ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء تک دارالعلوم میں فلسفہ کے سوا ہر فن کی کتاب پڑھائی۔ دارالعلوم میں تقریباً ۴ سال تک صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی جلد ثانی پڑھائی۔ اسی دوران دارالاقامہ کے ناظمِ اعلیٰ، مددگار ناظمِ تعلیمات پھر ناظمِ تعلیمات اور قائم مقام مہتمم بھی رہے۔ ۲۲ر مارچ ۱۹۸۲ء مطابق ۲۴ر جمادی الاخری ۱۴۰۲ھ کو دارالعلوم میں دوسری انتظامیہ کی عمل داری قائم ہوئی، اِس سے قبل دو سال تک دارالعلوم فتنہ وفساد کے دور سے گزرا، جس میں تعلیمی وانتظامی عمل درہم برہم رہا۔ چوں کہ مولانا کشمیریؒ انتظامیہ کی اس تبدیلی کے مؤید نہ تھے؛ اِس لیے اُنھوں نے شروع سے اس کی مخالفت کی۔ اس کے بعد اُنھوں نے حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مدظلہ کے ساتھ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء — ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء) کی سرپرستی میں جامع مسجد دیوبند میں دارالعلوم وقف کے نام سے دوسرا دارالعلوم قائم کرلیا۔ کئی سال بعد یہ دارالعلوم عیدگاہ دیوبند کے جنوب مغرب میں وسیع قطعۂ اراضی پر نو تعمیر شدہ عمارت میں منتقل ہوگیا، مولانا کشمیریؒ نے اس کی تعمیر وترقی میں بڑی دلچسپی لی، اِس دارالعلوم میں رسمی طور پر وہ شیخ الحدیث تھے؛ لیکن عملاً وہ اِس کے فعّال منتظم بھی تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں اُن سے ۱۶۵۷ طلبہ نے بخاری وترمذی پڑھی، جب کہ دارالعلوم وقف میں ۳۱۸۷ طلبہ نے اُن سے ان کتابوں کا درس لیا۔

❁ ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء میں اُنھوں نے دارالعلوم وقف ہی کے بغل میں ''معہد انور'' کے نام سے (جو بعد میں جامعہ امام انور سے موسوم ہوا) ایک الگ اِدارہ قائم کرلیا؛ لیکن دارالعلوم وقف میں اُن کا شیخ الحدیث کا

عہدہ برقرار رہا، معہدِ انور کو اُنھوں نے بڑی محنت، جستجو اور شوق سے ترقی دی۔ یہاں سے ۲۰۰۱ء سے "محدّثِ عصر" کے نام سے ایک ماہ وار رسالہ بھی جاری کیا، جس کے وہ سرپرست اور عملی مدیر بھی تھے، اداریہ وہ خود لکھتے تھے اور اُن کے اسفار و تقاریر کی رپورٹیں بھی اس میں شائع ہوتی تھیں، اِس مدرسے میں اُنھوں نے ایک خوب صورت مسجد اور ایک ہال بھی تعمیر کیا۔ یہاں کی ابتدائی و متوسط تعلیم کی اچھی شہرت کی وجہ سے، طلبہ کا اس کی طرف رجوعِ عام ہوا۔ اُن کی وفات کے بعد یہ مدرسہ حسبِ سابق سرگرمِ کار ہے اور اُن کے فرزندِ ارجمند مولانا احمد شاہ خضر کشمیری اپنے عظیم خاندان کے موروثی صفات کی وجہ سے خوب صورتی سے اس کو نہ صرف چلا رہے ہیں؛ بل کہ والد کے چھوڑے ہوے سارے کاموں اور اُن کے دیکھے ہوے خوب صورت خوابوں کی تعمیر و تکمیل میں جی جان سے لگے ہوے ہیں۔

❁ تصنیفات

۱:- تقریرِ شاہی (اردو) تفسیر قرآن۔
۲:- اسماے حسنیٰ کی برکات (اردو) قرآن و حدیث۔
۳:- الفیض الجاری (عربی) حدیث۔
۴:- تراجم ابواب (عربی/اردو) حدیث۔
۵:- تفردات کشمیری (اردو) حدیث۔
۶:- لالہٴ و گل (اردو) شخصیات۔
۷:- نقشِ دوام (اردو) سوانح۔
۸:- تذکرۃ الاعزاز (اردو) سوانح۔
۹:- خطبات کشمیری (اردو) تقاریر۔
۱۰:- فروغِ سحر (اردو) تقاریر۔
۱۱:- گل افشانیِ گفتار (اردو) تقاریر۔
۱۲:- ربّنا (عربی/اردو) ادعیہ۔
۱۳:- فردوسِ درود و سلام (اردو) ادعیہ۔
۱۴:- فردوسِ صلاۃ و سلام (عربی/اردو) ادعیہ۔

❁ تراجم از عربی و فارسی در اردو

۱:-	تعلیم المتعلم	(عربی سے اردو)	طریقہٴ درس و تدریس۔
۲:-	تفسیر ابن کثیر	(// //)	تفسیر قرآن۔
۳:-	تفسیر مدارک	(// //)	//
۴:-	تفسیر طنطاوی	(// //)	//
۵:-	تفسیر جلالین	(// //)	//
۶:-	تفسیر مظہری	(// //)	//
۷:-	تشریح و توضیح تفسیر حقانی (اردو)		//

۸:- تکمیل الایمان (فارسی سے اردو) دینیات وعقائد۔

۹:- کشف الحاجہ (عربی سے اردو) تشریح حدیث۔

عہدے واعزازات

۱:- تاسیسی رکن آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔

۲:- سربراہ خیر سگالی وفد برائے حج (از گورنمنٹ آف انڈیا)

۳:- صدر جمہوریہ ایوارڈ (ماہر عربی زبان) برائے سال ۲۰۰۳۔

ازدواجی زندگی

مولانا کشمیریؒ کے تین نکاح ہوے۔ اُن کی پہلی اہلیہ سے ۲ لڑکے اور ۶ لڑکیاں تولد ہوئیں۔ پہلا لڑکا ''شاہین انور'' ۹ ماہ کی عمر میں فوت ہوگیا۔ دوسرا لڑکا مولانا ''سید احمد خضر شاہ مسعودی'' اور دگر صاحب زادیاں صاحبِ اولاد اور حیات ہیں۔ تیسری اہلیہ سے ایک صاحب زادی ''لبنیٰ شاہ'' ہیں۔



پروفیسر ڈاکٹر مولانا سیّد محمد اجتبا ندویؒ

۱۳۱۵ھ/۱۹۳۲ء — ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸ء

جَوہرِ انساں ، عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

امراضِ قلب کے عالمی شہرت کے حامل معالج: ڈاکٹر محمد خلیل اللہ کے ''ہارٹ سینٹر'' میں آپریشن کے بعد، ہارٹ اٹیک کی وجہ سے، عالمِ دین واسلامی اہلِ قلم پروفیسر ڈاکٹر مولانا سیّد محمد اجتبا ندویؒ ،جمعہ کے روز، عین اَذانِ جمعہ کے وقت، ۱۵/ ۶/ ۱۴۲۹ھ = ۲۰/ ۶/ ۲۰۰۸ء کو، ۷۶ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُنھوں نے اپنی پوری زندگی دین وعلم، زبان وادب بالخصوص عربی زبان اور ثقافتِ اسلامی کی بھرپور اورلائقِ ذکر خدمت میں گزاری۔ وہ کئی سال سے دل کی تکلیف میں مبتلا تھے، پچھلے دنوں اُن کے مرض نے شدّت اختیار کی، وقتِ موعود آچکا تھا؛اِس لیے وہ مناسب علاج معالجے کے باوجود بھی جاں بر نہ ہوسکے۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور اپنی اَعلیٰ جنت میں اونچے سے اونچا مقام عنایت کرے۔

شبِ جمعہ وشنبہ: ۱۵-۱۶/ ۶/ ۱۴۲۹ھ = ۲۰-۲۱/ ۶/ ۲۰۰۸ء کو بعد نمازِ مغرب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی جامع مسجد میں، اُن کی نمازِ جنازہ اُن کے فاضل برادرزادے مولانا عبیداللہ اسعدی بن مولانا محمد مرتضی مظاہری (متوفی ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۵ء) نے پڑھائی، جس میں عام مسلمانوں کی بڑی تعداد کے ساتھ بہ طورِ خاص دہلی میں مقیم یا

موجود قاسمی وندوی علما وفضلا، پڑھے لکھے لوگ، مفکرین ودُعاۃ اور اِسلامی خدمت کے میدان میں سرگرم حضرات نے شرکت کی، جیسے مولانا اسرارالحق قاسمی، ڈاکٹر محمد منظور عالم، مولانا عمید الزماں قاسمی کیرانوی، مولانا عبدالحمید نعمانی قاسمی، مولانا امین عثمانی ندوی، پروفیسر مولانا شفیق احمد خاں ندوی، مولانا ڈاکٹر محمد ایوب خاں ندوی، پروفیسر اختر الواسع، مولانا قاری محمد سلیمان قاسمی امام وخطیب جامع مسجد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ اور جامعہ ہی کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوے۔

مرحوم نے پس ماندگان میں ایک لڑکا، تین لڑکیاں اور اہلیہ چھوڑی ہیں۔ اللہ اُنھیں اور سارے افرادِ خاندان کو صبرِ جمیل واَجرِ جزیل عطا کرے اور تمام محبین ومتعارفین کو، اُن کے غم کا بہترین بدلہ دے۔

عربی زبان وادب کا ایک ممتاز عالم

مولانا محمد اجتبا ندویؒ، برِّصغیر میں، عربی زبان وادب کے ممتاز ومنتخب علما میں سے ایک تھے۔ وہ وسیع علم ومطالعے کے ساتھ ساتھ، عالمی حالات وواقعات سے بصیرت مندانہ آگاہی رکھتے تھے۔ وہ اُن چیدہ افراد میں سے تھے، جو ہمہ وقت اِسلامی مسائل کی سوچتے اور اُنھی کے لیے جیتے اور مرتے ہیں۔ مسلمانوں کی بدحالی وکس مپرسی سے بہت دُکھی رہا کرتے تھے۔ اُنھیں عالمِ اِسلام وعالمِ عرب کی خوشیوں اور تکالیف سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُمّتِ مسلمہ کی کم زوری اور اَعدا کے سامنے، اُس کی بے بَسی وہوا خیزی سے دگر سچے داعیوں کی طرح سوختہ جاں وافسردہ دل رہتے تھے۔ اُن کی عربی اور اردو تحریروں میں، اُن کے اِسلامی درد کو صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے عربی اور اردو زبانوں میں بہ راہِ راست بہت کچھ لکھا ہے، مضامین وتحقیقات کے ساتھ ساتھ، دسیوں گراں قدر کتابیں لکھیں، جیسے اِمام ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے علمی کارنامے، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالیؒ اور اُن کے علمی وادبی کارنامے، مولانا

ابوالحسن علی ندویؒ بہ حیثیت ادیب وداعی، تابندہ نقوش، تاریخِ فکرِ اسلامی، شریعتِ اِسلامی میں اِنسانی حقوق، اِسلام میں عورت اور اِن کے علاوہ دِگر بہت سی تالیفات، جواُن کے نام کوزندہ اوریاد کو تازہ وتابندہ رکھیں گی اورعلم وآگہی کے قدردانوں کی زبانوں سے، اُنھیں دعائیں دلواتی رہیں گی، اِن شاءاللہ۔

مولانا اِجتبا، دارالعلوم ندوۃ العلما کے اُن ممتاز فضلا میں تھے، جنھیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ وہ مفکرِ اسلام، داعی اِلی اللہ اور عظیم اِسلامی مؤلّف حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء ـــــ ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) کی علمی وادبی، فکری و دعوتی صحبتوں سے فائدہ اُٹھانے کی سعادت حاصل کرنے والوں میں سے ایک تھے۔ ندوۃ العلما سے فراغت کے بعد، اُنھوں نے دمشق یونیورسٹی میں پانچ سال گزارے اور شام کی علمی وادبی فضا سے خوب خوب استفادہ کیا۔ یہ زمانہ وہاں کے چوٹی کے باکمال علما وفضلا کا تھا، جنھوں نے نہ صرف عالمِ عرب کی علمی وادبی اور دینی ودعوتی فضا کو مُتاَثّر کیا؛ بل کہ عالمِ اِسلام میں اپنے ایسے جاوداں نقوش ثبت کیے، جن کے تذکرے کے بغیر مُعاصِر اسلامی تاریخ کا مطالعہ یکسر نامکمل رہے گا، مولانا اِجتبا نے اُن میں سے مُتعَدِّد حضرات کی صحبتوں کا فیض پایا اور اپنے علمی سفر اور دینی ودعوتی تجربے کو کام یاب اور پختہ تر کیا۔

ہندوستان واپس آکر اُنھوں نے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا، جہاں سے عربی زبان میں امتیازی نمبرات سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا۔ اُس کے بعد اُنھوں نے علمی میدان میں قدم رکھا اور ملک کی کئی ایک مرکزی یونیورسٹیوں میں عربی زبان وادب اور اِسلامی مضامین کے پروفیسر اور متعلقہ شعبوں کے صدر کی حیثیت سے نہ صرف اپنی عظمت کو تسلیم کرایا؛ بل کہ نسلِ نو کی ایک بڑی کھیپ کو فیض یافتہ اور باکمال بنایا۔ اُنھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما، جامعہ ملیہ اسلامیہ، اِلہ آباد یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی کے علاوہ، جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ نیز جدّہ ریڈیو اسٹیشن کے اردو سیکشن کے اِناؤنسر اور مُترجم کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اُنھوں نے ہر جگہ اپنی محبت، نرم خوئی اور دل جوئی کی صفات سے رُفقائے کار اور منتظمین کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ اسی کے ساتھ وہ ''رابطہ ادبِ اِسلامی'' کے نہ صرف تاسیسی رکن؛ بل کہ اُس کے اہم منتظمین میں سے ایک تھے۔ وہ اپنی ممتاز علمی وادبی لیاقت اور رسوخ و تجربے کی شہرت کی وجہ سے بیرونِ ملک، بالخصوص عالمِ عربی کی یونیورسیٹیوں اور علمی وادبی محفلوں میں مُحاضرات کے لیے مدعو ہوتے رہتے تھے۔ اندرونِ ملک وہ عربی زبان وادب کے وسیع تر خاندان کے اہم رکن شمار ہوتے تھے؛ چناں چہ اِس حوالے کی کوئی لائقِ ذکر تقریب، اُن کی شرکت کے بغیر برپا نہیں ہوتی تھی۔

مرحوم سے راقم کی دید وشنید

مرحوم سے راقم السطور کی دید وشنید بہت دیرینہ تھی، یعنی اُس وقت سے تھی، جب جولائی ۱۹۷۲ء (جمادی الاولیٰ ۱۳۹۲ھ) میں، راقم الحروف دارالعلوم ندوۃ العلما میں مدرس ہوا۔ وہ اُس وقت دارالعلوم سے وابستہ تو نہ تھے؛ لیکن اُن کا وہاں کثرت سے آنا جانا ہوا کرتا تھا؛ کیوں کہ وہ نہ صرف وہاں کے فارغ اور فیض یافتہ تھے؛ بل کہ اُنھیں اپنی اِس درس گاہ سے بہت محبت تھی، نیز یہ کہ وہ وہاں کے دِگر باکمال لوگوں سے استفادے کو اپنی ساری لیاقتوں کے باوجود، سعادت سمجھتے تھے۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ اُس وقت ندوۃ العلما کے ناظم اور ملک اور عالمِ اِسلام کے ممتاز ترین عالمِ دین، نگہ بلند وسخن دل نواز وجاں پرسوز کا رختِ سفر رکھنے والے میرِ کارواں و عظیم داعی اِلی اللہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے روحانی وفکری ودعوتی مے خانے میں جام وسبو کا دور اپنے شباب پر تھا اور دِگر بلانوشوں کی طرح، اُنھیں بھی جب بھی موقع ملتا گرتے پڑتے یہاں آ پہنچتے اور مقدور بھر بادہ پیمائی سے نہیں چوکتے تھے۔ پھر یہ کہ اُن کے بڑے بھائی

اور اُن کے مُربّی و سرپرست مولانا محمد مرتضٰی مظاہریؒ اُس وقت دارالعلوم ندوۃ العلما میں ناظمِ کتب خانہ تھے، تو گویا مرحوم کا بھی گھر یہیں تھا؛ لیکن اُس وقت میں اُنھیں دور ہی سے جانتا تھا، اُن سے مُتعارِف ہونے، اُنھیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوئی تقریب کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ خصوصاً اِس لیے کہ میرے روٹینی ''فرائض'' اُس وقت مجھے بُری طرح مشغول کیے رہتے تھے اور ''مستحبّات'' کی طرف توجّہ کی بھی فرصت نہ تھی، چہ جائے کہ اپنے حوالے سے لایعنی اور غیر مُتعلّقہ اُمور کی طرف جھانکنے کا موقع ملتا۔

میں جب دارالعلوم دیوبند میں شوال ۱۴۰۲ھ/ اگست ۱۹۸۲ء میں استاذ و مدیر ''الداعی'' عربی کی حیثیت سے برسرِ عمل ہوا، تو مجھے بار بار دہلی اور دِگر علمی جگہوں میں آنے جانے کی مجبوری لاحق ہوئی اور مولانا اِجتباؒ سے وقفے وقفے سے ملاقات کی صورت نکلتی رہی اور اُنھیں اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا۔ اُن کے اخلاق و کردار، اُن کی سنجیدگی، نرم گوئی، آہستہ روی اور مُتعارِفین کے ساتھ، ہمیشہ خوش دلی و لطیف الطبعی سے پیش آنے کی، اُن کی خوبیوں سے میں بہت مُتاثّر ہوا۔ علم و ادب میں اُن کا مقام اپنی جگہ؛ لیکن میرے لیے اُن کی یہ صفات ہی زیادہ باعثِ کشش رہیں۔ میری افتاد ہی کچھ ایسی ہے کہ میں عموماً لوگوں کے علم و فضل سے کم اور اُن کے حسنِ اخلاق سے زیادہ مُتاثّر ہوتا ہوں۔ میرے نزدیک حسنِ اخلاق، علمِ محض سے زیادہ گراں مایہ ہے، اِس کے بغیر فضلِ بے پایاں کی کوئی قیمت نہیں۔ مولانا اجتباؒ کو جتنا پرکھا وہ اُسی درجہ کُندن ثابت ہوئے، اُن کی عظمت و کمال کی تہیں کُھلتی گئیں اور اُن کی محبت کا نقش دل میں گہرا ہوتا گیا۔

اُن سے آخری طویل اور یادگار ملاقات

اُن سے مسلسل دو روز تک ملنے کا ایک سنہرا موقع، اُس وقت ہاتھ آیا، جب جامعہ ملیہ اِسلامیہ دہلی کے شعبۂ عربی زبان و ادب نے ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء میں ''لسانی مہارتوں کی افزودگی کا طریقہ'' کے موضوع پر خصوصی تربیتی محاضرے کے لیے راقم کو اِصرار کے

ساتھ دعوت دی کہ میں بہ روز جمعہ ۱۸/ شعبان ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۳/ستمبر ۲۰۰۵ء کو یہ مُحاضرہ دوں اور دوسرے دن شنبہ ۱۹/ ۸/ ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۴/ ۹/ ۲۰۰۵ء کو قومی علمی سمینار بہ عنوان ''ہندوستان میں عربی زبان کی تدریس .. مسائل اور توقعات'' میں بھی اپنے تحقیقی مقالے کے ساتھ شرکت کروں۔ ذمے داروں کے اِصرار پر میں نے الحمد للہ دونوں پروگراموں میں مُشارَکت کی۔ خوش قسمتی سے مذکورہ سمینار کے اِفتتاحی جلسے کی صدارت، معروف اِسلامی ادیب واہلِ قلم، دارالعلوم ندوۃ العلما کے مہتمم اور ''البعث الاسلامی'' کے چیف ایڈیٹر مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے کی۔ سمینار کی پہلی علمی نشست میں جو مذکورہ تاریخ کو سہ پہر کے وقت منعقد ہوئی، پہلا قیمتی تحقیقی مقالہ مرحوم مولانا اجتبا ندویؒ نے بہ عنوان ''معاصر دنیا میں عربی زبان کی اہمیت'' کے موضوع پر پیش فرمایا۔ دوسرا مقالہ راقم الحروف نے پڑھا، جس کا عنوان تھا ''عربی زبان .. لغوی تعریف، عالمی اہمیت، عرب وہند کے تعلقات کے استحکام میں اُس کا کردار اور معاشی حالت کی بہتری میں اُس کا رول'' عموماً لوگ، چاہے علم ومعلومات کے کتنے ہی رَسیا ہوں، لکھے ہوے مقالے کو جو لفظاً لفظاً اُن کے سامنے کاغذ میں دیکھ کے پڑھا جائے، بہ غور نہیں سنتے اور بہ عجلت اُکتا کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں اور ایسی صورتِ حال پیدا کردیتے ہیں کہ مقالہ خواں، اپنی مٹی پلید نہ ہونے دینے کے لیے، از خود بہ جلد ہی خواندگی سے باز آجاتا ہے؛ لیکن لوگوں نے الحمد للہ بہت غور اور سکون سے میرے دراز نفس مقالے کو سنا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ کسی مخلص دعا گو کی توجہ اور خداے کریم کی خاص توفیق کی بات ہے۔

میری بڑی خوش قسمتی تھی کہ میرے مقالے کے دوران نہ صرف مولانا محمد اجتباؒ؛ بل کہ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی بھی مسلسل اپنی کرسی پر بیٹھے بہ نظرِ استحسان اور شاباشی میری طرف مُتوجّہ رہے اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ میرے مقالے کے ختم پر ہی دونوں حضرات ہال سے اُٹھ کر آگئے اور دِگر لوگوں کے مقالے نہیں سن سکے؛ کیوں کہ مولانا

سعید کو اُسی وقت اسٹیشن جانا اور لکھنؤ جانے کے لیے گومتی اکسپریس پکڑنا تھا؛ چناں چہ مولانا اجتباؒ، راقم الحروف اور دِگر متعدّد لوگ اُنھیں رخصت کرنے کو اُٹھ آئے۔

مولانا اجتباؒ سے اس کے بعد کئی بار ملنا ہوا، وہ ناچیز کے اِس مقالے سے اتنا متأثر تھے کہ وہ کئی صحبتوں میں یہ دہراتے رہے کہ یہ مقالہ اِس سمینار کے لیے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ وہ زبان، اسلوب، مقالے کی پختگی کو بار بار سراہتے رہے۔ یقیناً اُن کے الفاظِ استحسان سے میرا حوصلہ تو بڑھا؛ لیکن میں اِس کو اُن کی ذاتی شرافت، خاندانی نجابت اور طبعی تواضع پر محمول کرتا ہوں۔ اِس موقع سے اُنھوں نے اپنے اخلاق و کردار کا غیر معمولی اثر اِس راقم کے ذہن پر چھوڑا۔ اُنھوں نے اسی فرصت میں یہ بھی فرمایا کہ میں ''الداعی'' کو شوق سے پڑھتا ہوں؛ لیکن افسوس ہے کہ وہ مجھے نہیں ملتا؛ بل کہ جامعہ ملیہ کے شعبۂ عربی سے ہی کبھی کبھار اُس کا کوئی نسخہ اُٹھا لے جاتا ہوں اور استفادے کے بعد واپس کر جاتا ہوں، اُنھوں نے اپنا ویزیٹنگ کارڈ بھی دیا کہ آپ میرے نام ''الداعی'' ضرور جاری کر دیں۔

اِس کے بعد اُن سے بہ راہِ راست کبھی ملاقات مُقدّر نہ ہو سکی، فون سے اُنھوں نے کئی بار ربط کیا کہ تمھارا فلاں مقالہ ''الداعی'' میں پڑھا، خوب تھا۔ وہ ''الداعی'' کے طریقۂ اِشاعت اور ظاہر و باطن کی خوبیوں کے بھی بہت مَدّاح تھے اور فرماتے تھے کہ اِس رسالے نے دار العلوم کی عظمت کو مزید نکھارنے میں بڑا رول اَدا کیا ہے۔

مولانا اِجتباؒ، اب اِس دنیا میں نہیں رہے، یہاں کس کو ہمیشہ رہنا ہے؛ لیکن وہ اپنے اخلاق و کردار، اپنے علمی و تحریری نقوش اور اپنے تخلیقی و ادبی فیضان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔ میں نے اُنھیں عالم باعمل پایا، وہ توازن، دھیمے پن اور حلم و کرم کا پُتلا تھے، اُنھیں جھوٹی شہرت اور نام و نمود سے نفرت تھی، وہ کام کے آدمی تھے اور اُن کا کام ہی اُن کے نام اور شہرتِ دوام کا ذریعہ تھا۔ یہ اُن کا بہت نمایاں وصف تھا، اِس کے بعد کسی اہلِ قلم، داعی اِلی اللہ اور عالم و فاضل کو کسی اور سہارے کی کوئی

ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ با مقصد اور پیغام کے حامل ادیب واہلِ قلم تھے۔ ایسا آدمی اپنی ذات سے عظیم ہوتا ہے، ہر پروپیگنڈے اور اِبلاغ کے ذرائع سے بے نیاز ہوتا ہے۔ اُن سے کوتاہ قامت اور کہتر قیمت بہت سے لوگ چمکتی ریت کے پُجاری دیکھے گئے ہیں، اگر وہ مولانا اِجتباؒ کی صفت کے ہوتے، تو اُن کے لیے یہی کافی ہوتا اور ہمارے لکھنے اور فخر کرنے کا بڑا سرمایہ ہوتا۔ مولانا اِجتباؒ خاندانی عظمت بھی رکھتے تھے، وہ حسینی سید تھے، اُن کے جدِّ اعلیٰ سید جعفر علی، امام احمد بن عرفان شہید رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۰۱ھ /۱۷۸۶ء ـــ ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱) کی تحریکِ جہاد وحریّت کے سرگرم رکن رہے تھے۔

مولانا اِجتباؒ ۱۹۳۲ء/ ۱۳۵۱ھ میں ضلع ''بستی'' صوبہ ''یوپی'' کے ایک گاؤں ''مجھوامیر'' میں پیدا ہوے۔ ابتدائی تعلیم شہر بستی کے مدرسہ ''ہدایت المسلمین'' میں حاصل کی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخل ہُوے اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد، اُن کا تعلیمی قافلہ آگے کو محوِ سفر ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اُنھوں نے ملک وبیرونِ ملک کی متعدد بڑی جامعات میں تدریسی فرائض انجام دیے، جامعہ اِلٰہ آباد، اُن کی آخری پڑاؤ گاہ ثابت ہوئی، وہ وہیں سے ریٹائر ہوے اور دہلی میں جامعہ نگر، اوکھلا میں رہایش اختیار کی اور بالآخر وہیں کی خاک کا پیوند بنے، رہے نام اللہ۔ قیامِ دہلی کے دوران جامعہ ملیہ کا شعبۂ عربی اور تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا چند سالوں سے قائم کردہ اِدارہ ''معہد اللغۃ العربیۃ'' اُن کی سرگرمیوں کا خاص مرکز بن گیا تھا، اُنھوں نے دِگر رفقائے کار کے ساتھ، یہاں عربی زبان وادب کے شائق نوجوانوں کی راہ نمائی کی اور خاصی تعداد کو کام کا بنایا اور اپنے ذخیرۂ آخرت میں اِضافہ کیا۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۹-۱۰، ماہ رمضان وشوال ۱۴۲۹ھ مطابق ستمبر واکتوبر ۲۰۰۸ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود ساڑھے بارہ بجے بہ وقت جمعہ ۱۲/شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۱۵/اگست ۲۰۰۸ء۔

خدا کا ایک قدرے گُم نام؛ لیکن انتہائی نیک نام بندہ

حافظ محمد اِقبال گونڈویؒ

۱۳۳۱/۱۹۱۳ء — ۱۴۲۹ھ/۲۰۰۸ء

انجمن میں بھی مُیَسَّر رہی خلوت اُس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق

کئی سال سے بڑھاپے کے بہت سارے عوارض اور طرح طرح کے امراض سے لڑتے ہوے، مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے مہتمم و سرپرست، مردِ ربّانی حافظ محمد اقبال گونڈوی، ۹۵-۹۶ سال کی عمر میں اپنے وطن گونڈہ میں، چہار شنبہ: ۲۶/رجب ۱۴۲۹ھ مطابق ۳۰/جولائی ۲۰۰۸ء کو ایک بج کر تقریباً دس منٹ پر ظہر کے وقت، اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ اللہ پاک بال بال مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔

چہار شنبہ و پنج شنبہ کی درمیانی شب میں تقریباً دس بجے اُن کی نمازِ جنازہ ملک کے ممتاز عالمِ دین، مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے ناظم و سرپرست حضرت مولانا محمد رابع حسنی نے پڑھائی۔ نمازِ جنازہ میں بڑی تعداد میں علما، صلحا و طلبہ کے ساتھ ساتھ، بڑی تعداد میں عوام نے شرکت کی، جس میں اُن کے معتقدین و محبین کی خاصی تعداد بھی دور دور سے وقت کی قلت کے باوجود شریک ہوجانے میں کام یاب رہی۔

حافظ محمد اقبالؒ نے عمرِ دراز یعنی ۹۵-۹۶ سال کی زندگی پائی۔ اپنی عمر کے ۷۶ سال اُنھوں نے کتابِ الٰہی: قرآنِ پاک کی تحفیظ و خدمت میں صرف کیے۔ اُن کی زندگی

صلاح وتقویٰ اور زہد وورع کا نمونہ تھی۔ وہ اپنے بہت سے ہم عمروں اور رُفقاے کار ومتعارفین کے لیے بہ جا طور پر اِس حوالے سے قابلِ رشک رہے؛ کیوں کہ اپنی سی کوشش اور چاہت کے باوجود، وہ نیکی و پرہیز گاری میں اُن کی سطح کو نہ پاسکے۔ وہ برِّ صغیر کے صُلَحاے مشاہیر میں شمار نہ ہونے کے باوجود، میرا خیال ہے —— اور شاید میری طرح اُن کے بہت سے متعارفین کا بھی یہی خیال ہوگا —— کہ وہ بہت سے شہرت یافتہ علما وصُلحا سے زہد واتّقا اور سادہ اور کفاف کی زندگی گزارنے میں بالیقین فائق تھے۔

شریعتِ اسلامی نے، کسی آدمی کے واقعی نیک اور خداترس ہونے کا یہ معیار بتایا ہے کہ اُس کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والے کو خدا یاد آجائے اور اُس کی صحبت میں جتنا زیادہ وقت گزارا جائے، صحبت یافتوں کو اُسی درجہ اپنے خدا سے تعلق میں اِضافہ محسوس ہو، دنیا سے اُس کا رشتہ کم زور اور خدا سے اُس کا رشتہ مضبوط تر دکھائی دے۔ میں اللہ کو گواہ بنا کے یہ بات کہتا ہوں کہ حافظ محمد اقبالؒ سے جب جب ملا، ایک عجیب سی ایمانی لذّت اور روحانی کیفیّت محسوس ہوئی، جس کو میں صحیح طور پر اپنے الفاظ میں ادا نہیں کرسکتا۔ میں کہ سکتا ہوں کہ مجھے ایسی ایمانی لذّت، بعض دفعہ بعض معروف علماے صالحین کی صحبت میں بھی محسوس نہ ہوئی، جن کے یہاں اِرادت مندوں، معتقدوں اور دست گرفتوں کی بھیڑ رہا کرتی تھی۔

دین داری سے دمکتا ہوا مُکھڑا

وہ انتہائی منحنی، ہلکے پھلکے بدن کے آدمی تھے، سرخ وسفید، متوسط القامت، چہرے پہ ہلکی سی داڑھی، مگر انتہائی روشن رو تھے۔ اُن کے ہونٹوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ رقصاں رہتی۔ کسی بھی ملنے والے کو اُن کے مختصر وجود سے قبل ہونٹوں پر کھیلتی اُن کی مسکراہٹ سے سامنا ہوتا۔ ہر ملنے والے کو محسوس ہوتا کہ حافظ محمد اقبال اُس کی اپنی جان سے زیادہ اُس سے قریب ہیں۔ نظر پڑتے ہی وہ سلام کرتے اور خیر خیریت دریافت کرتے، تو ملنے

والے کو لگتا کہ اُن کی شخصیت اُس کے اندر سرایت کررہی ہے، اُن کا وجود اُس کے اندر تحلیل ہورہا ہے۔ وہ واقعتاً جذبات واِحساسات کو بانٹتے محسوس ہوتے اور صاف معلوم ہوتا کہ وہ ملاقاتی کی ذات کا حصہ بن گئے ہیں، خواہ ملاقاتی اُن کی ذات کا حصہ نہ بن سکا ہو۔ اُن کی زبان اُن کے ضمیر کی ترجمان تھی، اُن کے ظاہر وباطن میں ایسی یکسانیت تھی، جو کم ہی ہوتی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے اُن کے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں، جن کی زبان دل کی اور دل زبان کا ترجمان ہو۔ اِس کے برعکس میں نے ایسے بہت سے لوگوں کو دیکھا اور تجربہ کیا ہے، جن کی نیکی کی دھوم مچی ہوئی تھی؛ لیکن وہ تجربے کے بعد شہرت کے معیارِ مطلوب پر پورا نہیں اُتر سکے، اُس وقت بہت افسوس ہوا اور دل میں ایسا منفی اثر قائم ہوا کہ اُس کی وجہ سے سارے اُن لوگوں سے بہت بدظنی ہوگئی، جو نیکوں کے لباس میں تو ہوتے ہیں؛ لیکن ذرا بھی نیک نہیں ہوتے۔

بہت سے قد آور علما سے زیادہ قد آور ''حافظ''

حافظ محمد اقبال رسمی طور پر ''عالم'' نہ تھے، اُنھوں نے کسی مشہور یا غیر مشہور مدرسے سے عالمیت وفضیلت کی سند حاصل نہیں کی تھی۔ وہ صرف قرآنِ پاک کے حافظ تھے اور بس۔ وہ غالباً باقاعدہ تجوید وقراءت کی بھی سند نہیں رکھتے تھے؛ اِسی لیے وہ صرف ''حافظ محمد اقبال'' تھے، ''قاری محمد اقبال'' بھی نہ تھے، چہ جائے کہ ''مولانا محمد اقبال'' ہوتے؛ لیکن ''حافظ محمد اقبال'' مشرقی یوپی کے ایک بڑے علاقے میں ایک باوقار وپُر اعتبار نام بن گیا تھا، جس کا مصداق صلاح وتقویٰ، دین داری وپرہیز گاری، دنیائے دنی سے بے رغبتی اور رحمٰن کی چوکھٹ پر پڑے رہنے والے ایک بڑے نیک نام آدمی کی ناقابلِ شمار خوبیوں سے عبارت تھا۔ اُن کی دید وشنید کے دائرے کے مدارس کے ماحول کا کوئی آدمی جب بھی ''حافظ محمد اقبال'' سنتا، تو اُس کا دل اِس یقین سے بھر جاتا کہ یہ وہی ذات ہے، جس سے اللہ نے محبت کی ہے، اللہ نے اُس کو جان لیا ہے اور اُسی نے اُس کو اپنی

مخلوق کی ایک معتد بہ تعداد میں مشہور کر دیا ہے اور اُس کے دل میں اُس کی محبت ڈال دی ہے۔ حافظ محمد اقبال ایک ایسے انسان کا استعارہ تھا، جس کے دل میں ایمان کی بشاشت رچ بس گئی تھی اور اسلام کی عظمت اُس کے رگ و ریشے میں سما گئی تھی۔ یہ انسان بداخلاقی، کج روی، سیرت کے بگاڑ، بدباطنی وغیرہ کی ساری آلودگیوں سے یکسر مُنزّہ تھا۔ میں نے سال ہا سال دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں اُنھیں جیا اور برتا تھا۔ وہاں درجۂ حفظ کی تاسیس ہی اُنھی کے ذریعے عمل میں آئی تھی، وہ عرصہ بیس سال تک وہاں اُس کے روحِ رواں اور سرپرست رہے، کچھ سالوں بعد میں بھی وہاں مدرس ہوا، یہ بیسوی صدی کے آٹھویں دہے کی بات ہے، حفظ و تجوید کے حلقے اُن دنوں زیادہ تر سُلیمانیہ ہاسٹل کی دوسری منزل کے وسطی ہال میں لگا کرتے تھے، ہال کی جانبِ شرق کے کمرے ہی درجۂ حفظ کے طلبہ کی رہایش گاہ تھے، راقم السطور اُن دنوں اُسی دوسری منزل پر جانبِ غرب میں ہال کے بغل کے ایک کمرے میں رہایش پذیر تھا۔ حافظ محمد اِقبال درجۂ حفظ کے طلبہ کے کمروں، ہال میں واقع درجۂ حفظ کے حلقوں، دارالعلوم ندوۃ العلما کی مسجد اور اپنی رہایش گاہ کے درمیان، جو گومتی ندی کے سامنے دارالعلوم کی مرکزی عمارت کے مغرب میں واقع تھی، اَن گنت بار میرے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوے نظر آتے، اُن کی زبان ذکر اللہ سے ہر وقت تر رہتی، اُن کے ہاتھ میں باریک دانوں کی خوب صورت سی تسبیح ہوتی، جیسے ہی کسی سے اُن کی ملاقات ہوتی اُن کی باچھیں کھل جاتیں، وہ سلام میں سبقت کرتے اور اُس سے اُس کی خیر خیریت دریافت کرنے میں پہل کرتے، وہ جیسے ہی ملتے شدید سے شدید غم، غلط ہو جاتا، اچانک ملنے والے کو بھی ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ وہ اپنے سب سے بڑے غم گسار اور ہم درد دیرینہ سے مل رہا ہے۔ ۲۴ گھنٹے میں دسیوں بار اُن سے آتے جاتے ضرور ملاقات ہو جاتی اور ایک آدھ مرتبہ وہ میرے کمرے میں بھی منھ ڈال کے میری خیر خیریت معلوم کرتے، تو لگتا کہ کسی ہم درد حکیم نے زندگی کے میرے زخم ہاے دامن دار پر مرہم ڈال دیا ہے۔ اُن کے ایک

تبسم اور ایک بول سے بھی ایسی حلاوت و برودت محسوس ہوتی، جس کا اِدراک آسان اور اُس کا بیان مشکل ہے۔ اِس حلاوت و برودت کا سرچشمہ اُن کی پختہ ایمانی، قلب کی صفائی، اپنے مولیٰ کی مخلصانہ عبادت، اپنے رب سے سچا تعلق، گناہوں سے اجتناب، معاصی کے محرِّکات سے احتراز اور ہر مسلمان کے ساتھ ہمہ وقت حسنِ ظن تھا۔

علماے صالحین کے محبوب

میں نے کسی لمحہ اُنھیں لایعنی میں مشغول نہیں پایا، وہ اپنے فرائضِ منصبی کو انتہائی ایمان داری، چستی اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرتے یا تسبیح اور اوراد و وظائف میں لگے رہتے، چلتے پھرتے بھی اللہ کا ذکر ہمہ وقت اُن کی زبان پر جاری رہتا، عبادت و تلاوت اُن کا امتیاز تھی، پابندیِ اوقات اُن کی شناخت تھی، وہ قیام اللیل کے، فرائض ہی کی طرح پابند تھے۔ اُن کی آنکھوں اور چہرے بُشرے سے شب بیداری کے اثرات چھلکتے تھے، وہ اپنے درجے کے طلبہ کو عشا کی نماز کے بعد بہ عجلت کِھلا پلا کے سُلا دیتے اور رات کے آخری حصے میں جگا دیتے، ایک گھنٹہ تلاوت اور تذکّر کے بعد ہی صبحِ صادق طلوع ہوتی، وہ طلبہ و مدرسین کو بھی پابندِ وقت بنائے رکھتے۔ وہ تحفیظ کے پختہ نظام کے وضع کرنے، اُس کو برپا کرنے اور اُس پر متعلقہ حُفّاظ و طلبہ کو کاربند رکھنے کے حوالے سے، لائقِ تقلید نمونہ تھے۔ اِس سلسلے میں اُن کی نیکی و دین داری اور ساری سرگرمیوں اور معاملات میں حسنِ اخلاق، نرمی و گدازی اور شفقت و محبت کو بنیاد بنانے کی وجہ سے نہ صرف اُنھیں بڑی آسانی ہوتی؛ بل کہ متعلقہ لوگوں کو بھی کوئی پریشانی محسوس نہ ہوتی۔ وہ اپنے سے وابستہ خدمت گزاروں کو بہ جلد مانوس کر لیتے اور خود بھی اُن سے مانوس ہو جاتے؛ چناں چہ اُنھیں اُن کے تحت کام کرنے میں بڑی سعادت محسوس ہوتی۔ کسی بھی سرپرست، ذمے دار اور مُنتظِم کی یہ سب سے بڑی کام یابی ہے کہ اُس کے ماتحت لوگ کام کو بار نہیں؛ بل کہ سعادت سمجھیں۔

حافظ محمد اقبال، وقت کے چیدہ و برگزیدہ علما و صالحین کے ہاں ہمیشہ محبوب رہے۔ وہ اُن میں سے اکثر کے ہاں آتے جاتے اور اُن کی صحبت و مُجالست سے فائدہ

اٹھاتے اورزادِ آخرت کے حصول کی راہ کی رکاوٹوں کے دور کرنے کا طریقہ اُن سے سیکھتے؛ چناں چہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے لوگوں میں پروفیسر مولانا عبدالباری ندویؒ (متوفی جمعرات: ۳۰/جنوری ۱۹۷۶ء = ۲۶/صفر ۱۳۹۶ھ) کی خدمت میں تقریباً روزانہ ہی حاضر ہوتے، جن کا مکان لکھنؤ میں ڈالی گنج کے علاقے میں سیتاپور روڈ پر واقع تھا اور اُس وقت وہ بسترِ مرض و شیخوخت پر تھے، جو بالآخر بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ مولانا عبدالباری ندویؒ کے ہاں آمد و رفت میں اکثر یہ راقم اُن کے ساتھ ہوتا، اِس طرح دونوں بزرگوں کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا۔ اِسی طرح اکثر اُن کی معیّت میں اسلامی اہلِ قلم، داعی اِلی اللہ اور عمیق العلم عالم و شیخ حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء ـــــ ۱۴۱۷ھ/ ۱۹۹۷ء) کی ملاقات کو بھی جاتا، حافظ صاحب اُنھی کے دست گرفتہ اور اُن کے خلیفہ و مُجاز بھی تھے۔ حافظ محمد اقبال ناظمِ ندوۃ العلما مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ (۱۳۳۳ھ/ ۱۹۱۴ء ـــــ ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء) کے ہاں بھی بڑے محبوب و محترم تھے اور اُن کے شاگردِ رشید و دستِ راست و نائب ناظم ندوۃ العلما مولانا معین اللہ ندویؒ (متوفی ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء) تو اُن کے بہت ہی قدر داں تھے۔ مولانا محمد احمد پرتاپ گڈھی (متوفی ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۱ء) کی خدمت میں بھی وہ کثرت سے حاضر ہوتے اور اُن کے سوزِ دل و تپشِ جگر سے اپنے دل کی بھٹی گرم کرتے۔

اُن کے متقی ہونے کی یقینی علامت

انسان کی نیکی کی غالباً سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ خدا کے نیک بندوں کو اُس سے محبت ہو اور عام مسلمانوں کے دل بھی اُس کی طرف اِس طرح کھنچتے ہوں، جیسے آہن پارے مقناطیس کی طرف اور ہر اِنسان کو اُس کی صحبت سے اُنسیت محسوس ہوتی ہو؛ بل کہ ہر آدمی اُس کو اپنا جگری دوست باور کرتا ہو۔ حافظ محمد اقبالؒ اِس معیار پر مکمل طور پر نہ صرف اُترتے تھے؛ بل کہ وہ اُن صُلحَا میں تھے، جنھیں دیکھ کر ہی یہ معیار

قائم کیا جاسکتا ہے۔ وہ تادمِ حیات اِس معیار پر قائم رہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کے رب نے ہی اُنھیں اِس معیار کا بنایا تھا اور خدائے کریم کے کرم سے امید ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ جنت میں بھی اُنھیں مقامِ اعلیٰ عطا کرے گا اور انبیا وصدیقین، شہدا وصالحین کے جوار میں اُنھیں جگہ دے گا اور یہی لوگ بہترین ساتھی ہیں۔

حافظ محمد اقبالؒ نے مدرسہ فرقانیہ گونڈہ میں حفظِ قرآن پاک کیا اور وہیں تقریباً ۲۰ سال تک مدرسِ حفظ رہے، اِسی اثنا میں مولانا علی میاں ندویؒ کی نظرِ انتخاب اُن پر پڑی اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں درجۂ حفظ کے قیام وانصرام کے لیے اُنھیں اپنے ہاں بلالیا، یہاں بھی اُنھوں نے کم وبیش بیس سال گزارے، پھر وہ اپنی مادرِ علمی ومادرِ وطن مدرسہ فرقانیہ گونڈہ واپس آگئے اور زندگی کا باقی حصہ مدرسے کے انتظام وانصرام اور تحفیظِ قرآن پاک کی خدمت میں گزارا۔ وقت کے ساتھ ساتھ، اُن کی نیک نامی ونیک کامی میں اِضافہ ہوتا گیا اور اِسی سعادت مندانہ حالت میں اُنھوں نے وفات پائی۔ وہ عرصے سے نحیف ونزار اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے، وہیل چیر پر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے تھے؛ لیکن اِس حالت میں بھی وہ تحفیظ کی درس گاہ میں آکر آنکھیں بند کیے بیٹھے رہتے اور طلبہ حفظِ قرآن میں مشغول رہتے، وہ اُن کی مبارک آواز سن کر سکونِ قلب محسوس کرتے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور اُن کی محبت وعقیدت کی برکت سے راقم کو بھی حسنِ خاتمہ کی سعادت سے سرفراز کرے۔ اللہ پاک اُن کے سارے پس ماندگان ومحبین کو صبر وجزا سے نوازے۔ آمین۔ (*)

سوانحی نقوش

۞ نام: (حافظ) محمد اقبال۔

۞ والد کا نام: عبداللہ۔

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۲، بابت ماہ رمضان وشوال ۱۴۲۹ھ مطابق ستمبر واکتوبر ۲۰۰۸ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود نصف شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق نصف اگست ۲۰۰۸ء۔

۞ والدہ کا نام: شہیدہ۔

۞ سنۂ ولادت: تقریباً ۱۹۱۲یا ۱۹۱۳ء، جو اُن کے بعض اہلِ خاندان نے اُن کی عمر کے حساب سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے؛ کیوں کہ اُن پر لکھنے والوں میں سے کسی نے ۱۹۱۱ء، کسی نے ۱۹۱۷ء، کسی نے کچھ اور لکھا ہے۔ اُن کے خاندان میں اُن کا سنۂ ولادت تحریر شدہ موجود نہیں ہے۔

۞ جائے ولادت ووطن: موضوع ''کرم ڈیہہ''، ضلع ''گونڈہ'' یوپی۔

۞ ابتدائی تعلیم: موضع ''ہردھر مئو'' ضلع گونڈہ میں اپنے پھوپھا منشی اسحاق صاحب کی سرپرستی میں حاصل کی۔

۞ تعلیم کا دوسرا مرحلہ: اُس کے بعد کی تعلیم اُنھوں نے موضع ''دھانے پور'' ضلع گونڈہ میں حاصل کی، جہاں مڈل کلاس یعنی آٹھواں درجہ سرکاری عصری اسکول سے پاس کیا، جو اُس زمانے میں لوگوں کے نزدیک بڑے اعزاز کی بات تھی۔

۞ تعلیم کا تیسرا مرحلہ یعنی حفظِ قرآن پاک: قرآن پاک کے حفظ کی تکمیل، مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں کی، وہاں جانے کا سبب اُس مدرسے کے استاذ قاری عبدالوہابؒ بنے، جو اُن کے قدیم رشتہ دار اور نہ صرف انتہائی دین دار تھے؛ بل کہ زہد وتقویٰ کا نمونہ اور مثالی مدرس تھے۔ قاری عبدالوہابؒ، حافظ محمد اقبالؒ کی والدہ محترمہؒ کے حقیقی ماموں تھے۔ اُنھوں نے مدرسہ عالیہ فرقانیہ ہی میں حفظ وقراءت کی تعلیم حاصل کی اور وہیں معین مدرس کی حیثیت سے، تدریسی خدمت انجام دینے لگے۔ لکھنؤ کے سٹی اسٹیشن کے پاس ''گولا گنج'' کی ایک مسجد میں قاری عبدالوہابؒ امامت کرتے تھے، وہیں اُن کا قیام بھی تھا، حافظ محمد اقبالؒ بھی مدرسہ عالیہ فرقانیہ کی طالبِ علمی کے زمانے میں اُنھی کے ساتھ اُسی مسجد میں قیام پذیر رہے۔

۞ تدریسی وعملی زندگی: تقریباً ۱۹۳۴ء (۱۳۵۳ھ) میں قاری عبدالوہاب، اہلِ گونڈہ کے اِصرار پر لکھنؤ سے گونڈہ آگئے اور مسجد منہاران میں مکتب کی شکل میں ایک مدرسے کا آغاز کیا۔ ایک ماہ بعد حافظ محمد اقبالؒ بھی لکھنؤ سے ''گونڈہ'' آگئے اور اسی مکتب میں درجۂ ناظرہ میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کی، دو سال کے بعد درجۂ حفظ کے مدرس مُقرّر ہوئے اور بہت جلد اُن کی تدریسی مہارت ومحنت کی شہرت عام ہوگئی۔

● یہاں مسلسل بیس سال تک تدریسی خدمت انجام دی، اِسی دوران قاری عبدالوہابؒ نے، اپنی اکلوتی ہمشیرہ کی شادی حافظ محمد اقبالؒ سے کردی۔ حافظ محمد اقبال نے اِس مدرسے کی جی جان سے خدمت کی، نہ صرف تدریسی فریضہ، محنت وجاں فشانی سے انجام دیا؛ بل کہ اُس کے لیے چندہ بھی کیا، مطبخ کا نظام بھی سنبھالا، بہ وقتِ ضرورت طلبہ کے لیے، اپنے ہاتھ سے روٹیاں بھی پکائیں، بعض دفعہ اِس طرح کی خدمتیں

طویل طویل عرصے تک انجام دیں۔

● قاری عبدالوہابؒ کے انتقال کے بعد، مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے حالات خاصے تبدیل ہوگئے، جن میں حافظ محمد اِقبالؒ کے لیے وہاں خدمت کرنی مشکل ہوگئی، تو وہ ندوۃ العلما کے نائب ناظم مردِ صالح مولانا معین اللہ ندویؒ (متوفی ۱۱/ جمادی الاخری ۱۴۲۰ھ مطابق ۲۳/ اگست ۱۹۹۹ء) کی تحریک پر دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ چلے گئے، جہاں اُنھوں نے، درجۂ حفظ کی اَساس گزاری کی، یہاں کام کے دوران اُن کی دینی عزت وعظمت میں اِضافہ ہوا اور شہرت ونیک نامی بھی دوچند ہوئی۔

● پھر مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کے دگرگوں ہوتے ہوے حالات نے، اُنھیں ندوۃ العلما سے گونڈہ واپس آجانے پر مجبور کیا اور عمرِ عزیز کا باقی ماندہ عرصہ، جو بیس سال سے زائد پر پھیلا ہوا ہے، اُسی کی خدمت میں گزار دیا۔ اُن کی یہاں آمد سے، اُس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح عود کر آئی، اُس کی شہرت اور تدریسی امتیاز کا غلغلہ دور دور تک بلند ہوگیا۔

● مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کی اُنھوں نے ۵۵-۵۶ سال تک خدمت کی اور دارالعلوم ندوۃ العلما کی ۲۰ سال، اِس طرح ۷۵-۷۶ سال قرآن پاک کی تحفیظ وتدریس میں گزارے، جو بہت بڑی سعادت اور عنداللہ اُن کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

❁ **بیعت وخلافت:** وہ سب سے پہلے شیخ الہندؒ کے خلیفہ مولانا ضرغام الدین فیض آبادی سے نوعمری ہی میں اپنے استاذ ومربی قاری عبدالوہابؒ کی معیّت میں بیعت ہوے، اُن کی صحبت میں دونوں بار بار جاتے رہے، جس سے تہجد، شب بیداری اور اَوراد واَذکار پر کاربندی کا شوق وذوق پیدا ہوا، اُن کی وفات کے بعد مراسلت کے ذریعے، حضرت تھانویؒ سے بھی بیعت ہوے، بعد میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے بیعت ہوکر سلوک کی منزلیں طے کیں اور اُنھی سے اِجازت وخلافت ملی۔

❁ **وفات:** چہارشنبہ: ۲۶/ رجب ۱۴۲۹ھ مطابق ۳۰/ جولائی ۲۰۰۸ء ایک بج کر تقریباً دس منٹ پر۔

❁ **حافظ صاحب کے اہلِ خاندان:** حافظ صاحب کے اُن کے علاوہ دو بھائی تھے، جو وفات پاچکے، تین بہنیں تھیں، جن میں سے ایک زندہ ہیں۔ حافظ صاحب کے دو لڑکیاں ہیں، دونوں زندہ ہیں۔ (۱)



(۱) سوانحی نقوش کی معلومات کے حوالے سے، حافظ محمد اِقبالؒ کے چھوٹے داماد مولانا عبدالحفیظ استاذ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ کی تحریر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

مولانا فضیل احمد قاسمی گورکھپوری

۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء —— ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود

ہندوستان کے طول وعرض میں مسلم برادری، مولانا فضیل احمد قاسمیؒ جنرل سکریٹری مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کی اچانک موت سے، خاصی غم زدہ اور دل گرفتہ نظر آئی۔ تقریباً دس بجے کے قریب ہم لوگوں نے یہ خبر دیوبند میں مسجدوں کے مائک سے سنی، تو دیر تک سکتے کے عالم میں رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دہلی کے مشہور ایمس ہسپتال میں سہ شنبہ ۱۴رصفر ۱۴۳۰ھ = ۱۰رفروری ۲۰۰۹ء کو علی الصباح تقریباً پانچ بجے ہارٹ اٹیک کی وجہ سے راہیِ ملک بقا ہوگئے۔ اُن کی عمر انتقال کے وقت بہ حساب سال ہائے عیسوی کل ۵۷ سال اور بہ حساب سال ہائے ہجری ۵۹ سال تھی۔ اُن کے اچانک انتقال سے ایسا لگا جیسے کوئی گراں بہا دولت ملت کے ہاتھ سے اچانک چھن گئی ہو۔

اُنھیں موٹاپا اور اُس سے پیدا شدہ عوارضِ کثیرہ کی وجہ سے کئی طرح کی پیچیدگیوں کی شکایت تھی؛ لیکن وہ اپنی ہمہ وقت کی سرگرمی، طبعی چستی اور دوڑ بھاگ کی وجہ سے بڑی حد تک اُس پر قابو پائے رہتے تھے۔ اُنھیں ملک کی اعلیٰ قیادت اور مسلمانوں کے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے قائدین وعوام سے جو وسیع تر ربط وتعلق تھا، اُس کو وہ ملک وقوم، دین وملت اور فرزندانِ اِسلام کی خدمت کے لیے ہُنرمندی سے استعمال کرتے تھے۔ عوام وخواص کے دل میں اُن کے لیے جو کشادہ جگہ تھی، وہ بہت سے قد آور قائدین وزُعما

اور پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی باعثِ رشک تھا۔ وہ اپنی نرم خوئی، شیریں گفتاری، بے تکلفانہ برتاؤ اور ساحرانہ رویّے کی وجہ سے، ہر کسی کو صرف پہلی اور ایک ہی ملاقات میں عموماً زندگی بھر کے لیے گرویدہ بنالیا کرتے تھے۔

وفات سے چار پانچ دن پہلے، اُنھیں "آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں" ریڑھ کی ہڈی اور پیشاب کی راہ میں تکلیف کی وجہ سے علاج کے لیے داخل کرایا گیا تھا، اُس وقت اُنھیں یا اُن کے کسی عزیز اور متعلقہ لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ دنیا سے آخری سفر کے لیے یہاں سے ہسپتال جا رہے ہیں۔ جانچ کے دوران ڈاکٹروں نے اُنھیں بے ہوش کیا، تو وہ آخر تک صحیح طور پر ہوش میں نہ آسکے۔ اُن کے بھائی ڈاکٹر عزیر احمد قاسمی نے بتایا کہ اُنھیں پانچ بجے صبح کو ہارٹ اٹیک ہوا اور اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ سہ شنبہ ہی کو ۲ - ۲ ½ بجے دن میں، اُن کی پہلی نمازِ جنازہ "منہدیان" میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء — ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کے مزارِ اقدس کے اِحاطے میں واقع "جامعہ رحیمیہ" میں ادا کی گئی، جہاں اُن کی مرکزی جمعیۃ علماے ہند کا صدر دفتر بھی قیام کے وقت سے قائم ہے، اُس کی اِمامت مدرسہ عربیہ عالیہ فتح پوری کے شیخ الحدیث مولانا عبدالکریم نے کی اور اُس میں عام مسلمانوں، اُن کے بہی خواہوں کے علاوہ علما وطلبہ وخواص واہلِ سیاست وقیادت کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ پھر خصوصی ایمبولینس کے ذریعے، اُن کی نعش اُن کے وطن "بیرواچندن پور" ضلع "مہراج گنج" سابق ضلع "گورکھپور" لے جائی گئی اور اعزا واقربا بھی، جو اُن کے علاج کے دوران گھر سے آگئے تھے، نعش کے ساتھ ہی وطن کے لیے روانہ ہوگئے، چناں چہ دوسرے دن چہار شنبہ ۱۵/۲/۱۴۳۰ھ = ۱۱/فروری ۲۰۰۹ء کو پڑوس کے گاؤں "اڈّابازار" میں (جہاں مولانا فضیل نے اپنا مکان بناکے باقاعدہ وہیں رہائش اختیار کرلی تھی) واقع مدرسہ سعد بن ابی وقاصؓ کے کیمپس میں، اُن کی دوسری نمازِ جنازہ دارالعلوم کے بڑے استاذِ حدیث شریف: حضرت الاستاذ مولانا قمرالدین گورکھپوری

مدظلہ العالی نے پڑھائی، جس میں بڑی تعداد میں علما و صلحا اور سر برآوردہ لوگوں کے ساتھ عوام کی بڑی تعداد اور مولانا کے رشتہ داروں نے شرکت کی اور مدرسے کے پاس ہی اُن کی تدفین عمل میں آئی۔ ''آسماں اُن کی لحد پہ شبنم افشانی کرے''۔

وطن، خاندان اور تعلیمی سفر

مرحوم کی پیدایش اپنی ننھیال ''ٹانڈہ''، ضلع ''فیض آباد'' کے ''حیات گنج'' محلّے میں ہوئی، جہاں اُن کے نانا کا گھر تھا، وہ چہار شنبہ: ۲۸/ ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق یکم اگست ۱۹۵۲ء کو مُتولِّد ہوے۔ اُن کے والد مولانا مجیب اللہ قاسمی (متوفی ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء) جو اپنی دین داری و خاک ساری کی وجہ سے ''صوفی مجیب اللہ'' کے نام سے مشہور تھے، اصلاً ''اونچہرا''، ضلع ''بستی'' کے باسی تھے۔ دین کی سرگرمیاں اُنھیں ضلع ''مہراج گنج'' سابق ضلع ''گورکھپور'' کے موضع ''بیرواچندن پور'' لے گئیں، پھر اُسی کے قریب ''اڈّا بازار'' نام کے چھوٹے سے گاؤں میں معمولی سا گھر بنالیا اور وہیں رہنے لگے۔ کچھ سالوں پہلے اپنی حیات میں، اُنھوں نے وہیں ''مدرسہ سعد بن ابی وقاصؓ'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کرلیا تھا، جو مولانا فضیل اور اُن کے برادران کی کوششوں سے تعلیم و تربیت کے میدان میں سرگرمِ عمل ہے۔

مولانا فضیل نے ابتدائی تعلیم ''بیرواچندن پور'' کے ہی مدرسہ ''بیت العلوم'' میں حاصل کی۔ ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں ابتدائی تعلیم مکمل کرلی۔ ۱۹/ صفر ۱۳۸۲ھ مطابق ۲۳/ جون ۱۹۶۲ء کو قرآن پاک حفظ کرنا شروع کیا۔ حفظ کے دوران اُن کے والد کی فکر مندی کی وجہ سے اُنھیں متعدِّد مدرسوں سے فیض یافتہ ہونے کا موقع ملا، جس کا مقصد جہاں حفظ میں پختگی اور کمال پیدا کرنا تھا، وہیں علما و صُلَحاے دین سے تربیت اور اُن کی صحبت سے فیض اُٹھانا بھی تھا، چناں چہ مدرسہ ''نور العلوم'' بہرائچ، ''مدرسہ اسلامیہ بھٹنی''، ''مدرسہ فرقانیہ'' گونڈا، ''دارالعلوم ندوۃ العلما'' لکھنؤ، ''جامعہ عربیہ اسلامیہ''

ہتھورا، باندہ، مدرسہ ''ہدایت العلوم'' کرہی ضلع ''بستی''، مدرسہ ''کنزالعلوم'' ٹانڈہ ضلع ''فیض آباد'' وغیرہ میں سے ہر ایک میں سال چھ مہینے گزارے اور ''تمتع زہر گوشۂ یافتم'' کا فائدہ اُٹھایا۔

۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں حفظ کی تکمیل کی اور یہیں دور بھی کیا۔ دارالعلوم ہی میں ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء میں فارسی واردو وغیرہ کی تعلیم کے بعد عربی اوّل میں داخل ہوے اور ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء میں فارغ ہوے، بخاری شریف حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب مدظلہ(۱) سے پڑھی۔ اُن کے اساتذہ میں حضرت مولانا فخرالحسنؒ، حضرت مولانا معراج الحق دیوبندیؒ، مولانا عبدالاحدؒ، مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا قمرالدین گورکھپوری، حضرۃ الاستاذ مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ، مولانا سعید احمد پالن پوری حال شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وغیرہ جیسے باکمال اساتذہ تھے۔ مرحوم نے دورانِ تعلیم خوش خطی بھی سیکھی اور پیشے کی حیثیت سے اُس کو کچھ وقتوں کے لیے استعمال بھی کیا۔

خدمتِ خلق کا پیدایشی جذبہ

اجتماعی خدمت، خلقِ خدا سے میل جول، لوگوں کے غم والم اور خوشی ومسرت میں پوری طرح شریک رہنے کا جذبہ اور سلیقہ مولانا فضیل احمدؒ کی گھٹی میں پڑا تھا، وہ پیدایشی طور پر اِس ہُنر کے حامل تھے؛ اِسی لیے طالبِ علمی کے زمانے میں وہ طلبہ کی آرزوؤں اور امنگوں، اُن کی ضرورتوں اور تقاضوں، مدرسی زندگی کی آسانیوں اور پریشانیوں، رہایش وتعلیم ومطالعے کے حوالے سے اُن کے ضروری مطالبوں سے ہر وقت آگاہ رہتے اور

(۱) اور بہ وقتِ لاسٹ ٹچنگ ایں مضمون براے اشاعت بہ شکلِ کتاب بہ اوائل ماہ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ مطابق اواخر اپریل ۲۰۱۰ء ''رحمۃ اللہ علیہ''، اِس لیے کہ چہار شنبہ - پنج شنبہ: ۱۸-۱۹ر صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۳-۲ر فروری ۲۰۱۰ء کی درمیانی شب میں وہ ۲ بج کر ۱۰ منٹ پر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

بڑے اساتذہ اور ذمے داروں سے ربط کر کے اُن کی ساری ضرورتوں کو پوری کروانے کی کوشش کرتے۔ دیوبند آمد کے بعد مولانا فضیل سے جب تعارف ہوا، تو جب بھی میں اُنھیں دیکھتا اور برتتا تو دل یقین کرتا کہ اللہ نے اُنھیں بہ طورِ خاص خلقِ خدا کی خدمت ہی کے لیے پیدا کیا ہے؛ اِسی لیے یہ کام اُن کے لیے اُن خدمتوں کے حوالے سے بھی بہت آسان ہے، جو دوسروں کے لیے علم و تجربے کے باوجود انتہائی مشکل ہوتی ہیں۔ مولانا فضیل کوئی غیر معمولی اہلِ علم نہ تھے؛ لیکن خدمتِ خلق اور ملک وملت کی گراں قدر خدمت اور خدمت سے زیادہ جذبۂ خدمت کے تعلق سے دیکھا جائے، تو وہ بہت سے کثیر العلم لوگوں سے بھی بڑے قد آور تھے۔ جو اُن سے ایک بار بھی مل لیتا وہ اُن کی خوش اخلاقی، ہُنر مندانہ خدمت اور دل میں گھر کر جانے والی اداؤں کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے اُن کی یادوں کا نقشِ جاوداں اپنے دل میں ثبت پاتا۔ وہ عربی اور انگریزی کے ماہر نہ تھے اور دونوں زبانوں میں گفتگو ٹوٹی پھوٹی بھی بہ مشکل ہی کر پاتے تھے؛ لیکن عرب و یورپ و افریقہ کے جس علاقے میں بھی وہ گئے، وہاں لوگوں کو اپنے اخلاق و کردار کا غلام بنا کے آگئے؛ کیوں کہ محض منھ کی زبان ہی اِنسانوں کو غلام بنانے کے لیے کافی نہیں؛ بل کہ دل سے گویا ہونے کی زبان سے واقفیت اور ضمیر کو اپیل کرنے کی طاقت بھی ضروری ہے، جس میں مولانا فضیل بے مثال تھے: کیوں کہ وہ فطری طور پر ترسیل کے فن پر عبور اور لوگوں کے اِحساس و جذبات سے ہم رشتہ ہونے کی عجیب سی صلاحیت رکھتے تھے، وہ جب بھی کسی سے ہم کلام ہوتے تو لگتا کہ اُنھوں نے اُس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ واقعتاً وہ دوست بنانے کے فن میں جتنے ماہر تھے، اُسی قدر وہ دشمن بنانے کے فن سے ناواقف تھے۔

لوگوں کی خدمت کا رسیا ہونے کی وجہ سے وہ بعض دفعہ اتنے لوگوں سے اُن کے کام کر دینے کا وعدہ کر لیتے کہ وہ اُنھیں پورا نہیں کر پاتے تھے؛ کیوں کہ پہلے سے ڈگر ڈھیر سارے کاموں اور وعدوں سے مربوط ہونے کی وجہ سے یا کسی طرح کی ڈگر

رکاوٹوں کی بنا پر وہ بعض لوگوں کے لیے وقت نہیں نکال پاتے تھے۔ ظاہر ہے اِس طرح کے لوگوں کو اُن سے شکایت ہوتی تھی؛ لیکن یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ بالقصد ایسا نہیں کرتے تھے؛ بل کہ مجبوریاں اُن کی راہ میں حائل ہو جاتی تھیں۔

طالبِ علمی کے زمانے میں دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی سب سے بڑی انجمن ''مدنی دارالمطالعہ'' کے صدر، نیز ضلع سہارنپور کی جمعیت علما کے سکریٹری بھی رہے، وہ اپنی خوش گفتاری، اساتذہ کی خدمت، طلبہ سے میل جول اور ہر طرح کے لوگوں سے جلدی گھل مل جانے کی وجہ سے، اساتذہ کے بھی مُقرَّب رہے، کسی استاد کو اُن سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے یہ خصائل اپنے والد مولانا صوفی مجیب اللہ قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۹ء) سے ورثے میں پائے تھے۔ وہ بھی خادمِ علم و دین تھے، اُنھوں نے اپنے وسیع تر علاقے میں تقریباً دو درجن مدرسے قائم کیے اور زندگی بھر اُن کی خدمت، اُنھیں ترقی دینے اور مسلمانوں کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے میں جی جان سے لگے رہے، اُن کی دین داری اور صلاح و تقویٰ کی وجہ سے لوگ اُنھیں — جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا — ''صوفی مجیب اللہ'' ہی کہا کرتے تھے۔

قائدانہ رنگ و آہنگ کا آغاز

۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء میں وہ دارالعلوم سے فارغ ہوے اور ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء میں جمعیۃ علماے ہند کے سکریٹری منتخب ہوے اور اُن کا مستقل قیام مرکزی دفتر مسجد عبدالنبی میں رہنے لگا، وہ شب و روز سرگرمِ کار نظر آتے، جمعیت میں آنے والے مہمان (جو بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں کہ جمعیّت کے علاوہ مسلمانوں کی کوئی ایسی تنظیم نہیں جس کی جڑیں مسلم عوام کے دلوں میں اِتنی پیوست ہوں) مولانا فضیل کے اخلاق و کردار کی وجہ سے اُنھی کی طرف لپکتے اور جو یہاں سے جاتا ہر جگہ اُن کے اخلاق کا گُن گاتا۔ وہ اپنی خادمانہ روش اور منکسرانہ انداز کی وجہ سے اپنے زمانے میں جمعیت

کی پہچان بن گئے تھے، وہ چھوٹے بڑے، نام آور اور گم نام اور معمولی آدمی سے بھی نرم گوئی سے اِس طرح ملتے کہ دل میں گھُس جاتے، ہر ایک کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ اُس کی ذات کا حصہ بن گئے ہیں اور وہ اُس کے لیے اِتنے مخلص ہیں کہ شاید اُس کی ذات بھی اُس کی اِتنی مخلص نہیں۔

لوگوں کے دل کسی کی طرف، اُس کے صلاح وتقوی اور زہد وورع کی وجہ سے بھی کھنچتے ہیں؛ کیوں کہ وہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے، تو وہ لوگوں کا بھی محبوب ہو جاتا ہے؛ لیکن کبھی کبھی لوگ کسی کی طرف اُن صفاتِ حمیدہ کی وجہ سے بھی لپکتے ہیں، جن سے مولانا فضیل احمد قاسمیؒ متصف تھے۔ یہ صفات دین داری، تقوٰی شعاری اور پرہیز گاری سے قطعِ نظر بھی اپنے موصوف کو لوگوں کا محبوب بنا دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اِن صفات میں جادو کی تاثیر، مقناطیس کی کشش، بادِ سحر گاہی کی برودت اور قند کی حلاوت پائی جاتی ہے۔ کوئی بھی اِن صفات کو برت کے میری تصدیق کر سکتا ہے۔

مولانا فضیل کی یافت ودریافت

۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء میں، یہ راقمِ آثم دار العلوم کے استاد اور ''الداعی'' کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے دیوبند آیا۔ اُس کے بعد ہی دہلی کی جو آمد ورفت شروع ہوئی، تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی، اکثر ''الداعی'' کے کاموں سے اور کبھی کبھار اپنے ذاتی کاموں سے بھی۔ جمعیۃ علماے ہند چوں کہ (اگر میری تعبیر صحیح ہو) دار العلوم دیوبند کا غیر رسمی طور پر گویا سیاسی رفاہی بازو ہے؛ اِس لیے دار العلوم کے استاذ اور ملازم کی جو کسی کام سے دہلی جائے، جمعیۃ کے دفتر میں حاضری ناگزیر سی ہوتی ہے، آتے یا جاتے ہوئے وہ وہاں ضرور جاتا ہے اور بہ وقتِ ضرورت قیام بھی کرتا ہے؛ اِس لیے یہ ناچیز بھی بار بار جمعیۃ کے مرکزی دفتر نیز گلی قاسم جان میں واقع اُس کی بلڈنگ میں ضرور جاتا، اُن موقعوں سے مولانا فضیل سے گہری واقفیت ہوئی، جو بے تکلفی اور حد درجہ اپنائیت میں

تبدیل ہوتی چلی گئی، وہ راز کی طرح میرے دل کے گوشوں میں آہستہ آہستہ پیوست ہوتے چلے گئے۔ جب بھی دفترِ جمعیت جاتا، مولانا فضیل کو اپنی مسکراہٹ اور خدمت کے اُسی پُرانے جذبے کے ساتھ مُستعِد پاتا، اگر وہ کبھی نہ ملتے اور کسی پروگرام کے تحت دہلی سے باہر ہوتے، تو ایک اَجنبیّت سی معلوم ہوتی، وہ ہوتے تو لگتا کہ درودیوار میں بھی انسیّت ہے اور ہمارے لیے ہر گوشے میں جگہ ہے۔ وہ خدمت کر کے خوش ہوتے، بھلائی کر کے زندگی پاتے، ضرورت پوری کر کے آرام محسوس کرتے۔

مئی ۱۹۸۳ء/رجب ۱۴۰۳ھ میں، میں سعودی عرب کے اپنے پہلے سفر سے واپس آیا، جہاں ۳ ماہ قیام رہا اور غیر عربوں کو عربی پڑھانے والے اساتذہ کی مختصر سہ ماہی ٹریننگ کے کورس، جامعۃ الملک سعود، ریاض میں شرکت ہوئی۔ واپسی کے بعد چند روز دیوبند میں قیام رہا، پھر دہلی سے بہ ذریعہ ہوائی جہاز پٹنہ اور وہاں سے اپنے وطن مظفر پور جانے کے لیے میں دہلی آیا، چوں کہ مطلوبہ فلائٹ کے وقت اور دوبارہ OK (تاکید حجز) وغیرہ کے قوانین وغیرہ سے ناواقفیت تھی؛ اِس لیے میں نے جمعیۃ کے مرکزی آفس مسجد عبدالنبی نئی دہلی میں قیام کرنا مناسب سمجھا؛ چناں چہ میں وہاں اپنے سامان کے ساتھ جا پہنچا، تو مولانا فضیل اپنی اُسی کریم النفسی، خندہ پیشانی اور بے پناہ اپنائیت کے ساتھ ملے اور مزید کرم یہ کیا کہ اپنے قیام والے کمرے ہی میں مجھے جگہ دی، جو مسجد کی مشرقی دیوار سے متصل تھا اور مسجد سے ہی اُس میں آنے جانے کا راستہ تھا۔ اُنھوں نے میرے سارے کام دو ایک گھنٹے کے اندر کرادیے۔ مجھے علی الصباح بہ وقتِ سحر ہوائی اڈے جانا تھا، میں سونے کے لیے جانے لگا تو مولانا نے کہا کہ آپ اطمینانِ خاطر کے ساتھ سو جائیے میں نے ۳ بجے صبح کے لیے الارم گھڑی لگادی ہے، میں صبح کو چائے کے ساتھ خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ میں چوں کہ بے چین طبیعت کا واقع ہوا ہوں؛ اِس لیے وقتِ مُقرَّر پر کیے جانے والے کاموں کے لیے، وقت سے پہلے تیاری میری عادت ہے، چناں چہ میں رات بھر نیند اور بیداری کے درمیان ہی رہا؛ لیکن مولانا

واقعی ٹھیک ۳ بجے چائے لیے آموجود ہوے اور کہنے لگے: دیکھیے میں نے آپ سے کہانہ تھا کہ میں وقت پر موجود رہوں گا۔ چائے کے بعد کرایے کی گاڑی منگوائی، جو اُس وقت وہیں جمعیۃ آفس کے سامنے سے مل جاتی تھی اور وہ مجھے نیچے خود چھوڑنے آئے، جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوئی، وہ کھڑے باتیں کرتے رہے۔

سعودی عرب کے ایک سفر میں
مولانا کے جذبۂ خدمت سے استفادہ

کسی انسان کو صحیح طور پر جانچنے کا اصل موقع سفر ہوتا ہے، جہاں اونچ نیچ کے پیش آنے کا اِمکان رہتا ہے، مولانا فضیل کو میں نے سفر میں بھی آزمایا ہے، وہ وہاں بھی کندن ثابت ہوے۔ شعبان ۱۴۰۴ھ/ اپریل ۱۹۸۴ء میں، اِس ناچیز کو دوبارہ سعودی عرب جانے کی سعادت حاصل ہوئی، جہاں شعبان اور رمضان کے بیشتر حصے میں نے حرمین شریفین میں گزارے۔ مولانا فضیل میری آمد سے پہلے سے ''جِدّہ'' میں موجود تھے، اُن کے ہم راہ جمعیۃ علما کے پندرہ روزہ عربی ترجمان ''الکفاح'' (۱) کے کارگزار ایڈیٹر مولانا مزمل الحق بھی تھے، اُنھیں جیسے ہی میری ''جِدّہ'' آمد کا علم ہوا، وہ ہوائی اڈے پر میرے استقبال کو پہنچ گئے اور پھر ساتھ ہی اپنی جائے قیام لے آئے، جو مولانا بدرالدین اجمل آسامی قاسمی رکنِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند کی مشہور کمپنی ''اجمل واَولادہ للعطور'' کے آفس میں تھی، جو اُس وقت نئی نئی ''جِدّہ'' میں قائم ہوئی تھی اور مولانا شمشاد مظفرنگری قاسمی (۲) اور مولانا جمیل احمد بجنوری قاسمی (۳) اجمل کمپنی کے تعارف کے لیے سرگرمِ عمل تھے اور وہی دونوں آفس کے انچارج تھے۔ کئی روز مولانا فضیل ساتھ رہے اور ''جِدّہ'' شہر میں اپنے

(۱) جو کئی سال پہلے یعنی یکم دسمبر ۱۹۸۷ء کے شمارے کے شائع ہونے کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔ یہ ۱۹۷۲ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔

(۲) حال مقیم ''جدہ'' جو اَب اپنی ''القاسمی للعطور'' کمپنی قائم کر کے مصروفِ تجارت ہیں۔

(۳) حال مقیم ریاض جو خود بھی اپنی عطر وعود کی کمپنی قائم کر چکے ہیں۔

ساتھ خوب گھمایا پھرایا؛ لیکن اُس وقت بے حد افسوس ہوا، جب اُنھوں نے کئی روز کے بعد یہ کہہ کر داغِ مفارقت دے دیا کہ ہم لوگ بھی چوں کہ جمعیّۃ کے تعارف کے سلسلے میں آئے ہوے ہیں اور یہاں سعودی عرب کا ہمارا مشن ختم ہوگیا ہے؛ اِس لیے اب کویت وغیرہ کا پروگرام ہے۔ اُن کے جاتے ہی ایسا لگا کہ اب میں بے یار و مددگار ہوگیا ہوں۔ بہ ہرکیف پھر عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ اور باقی وقت مدینہ منورہ میں گزرا اور ریاض میں شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ (متوفی بہ روز جمعرات: ۲۶/محرم ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۳/مئی ۱۹۹۹ء) سے ملاقات اور دارالعلوم کے تعارف کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا فضیل کا کسی جگہ ساتھ ہو جاتا تو ایسا لگتا کہ اب ہمیں کچھ سوچنا ہے نہ کرنا ہے؛ کیوں کہ سارے معاملات، حالات اور "نان ونفقہ وسکنیٰ" سے لے کر زندگی کے سارے مسائل کا بار، وہ صرف اپنے سر اوڑھ لیتے اور ساتھ والا بے فکری اور مکمل آرام کے ساتھ صرف وقت گزارتا، یا اُن کے ساتھ ساتھ رہتا اور لطفِ زندگی حاصل کرتا۔

مولانا فضیل کی جمعیتِ علما سے علاحدگی اور نئے سفر کی سمت کی تلاش و تعیّن

مولانا فضیل جمعیّۃ علماے ہند کی ہمہ گیر خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے، تعلّقات کے قیام واستواری کی اپنی ساحرانہ صلاحیّت اور عدیم المثال لیاقت کے ذریعے لوگوں کو جمعیّۃ کا گرویدہ اور وفادار وخدمت گزار بناتے رہے اور اُس کی عوامی مقبولیّت (جو پہلے سے بھی ساری جماعتوں اور تنظیموں سے اُس کو زیادہ حاصل ہے) میں اِضافے کے ذریعے مسلم معاشرے میں اُس کی جڑیں پیوست کرتے رہے۔ اُنھیں مولانا سید اسعد مدنیؒ (صدر جمعیّۃ علما ۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۸ء —— ۱۴۲۷ھ/ ۲۰۰۶ء) سے بڑی عقیدت ومحبت تھی، جو تا حیات قائم رہی۔ کسی جماعت و تنظیم کو اگر مولانا فضیل جیسے دو ایک آدمی مل جائیں، تو اُس کی عوامی مقبولیّت کی ہمہ گیری کی ضمانت کے لیے بالکل کافی ہے اور اِس

کے بعد اُس جماعت اور تنظیم کو پھر کسی کی دشمنی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ۲۷/ستمبر ۱۹۹۱ء مطابق ۱۷/ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ کو ہم لوگوں کو اچانک یہ سننے کو ملا کہ مولانا فضیل احمد قاسمی اپنے ۸-۹ ساتھیوں سمیت، جن میں مولانا اسرارالحق قاسمی (حال صدر ملی و تعلیمی فاؤنڈیشن ورکن ایوانِ زیریں "لوک سبھا") و مولانا صدرالدین صدر انصاری بھوپالیؒ (متوفی جمادی الاخری ۱۴۱۶ھ=نومبر ۱۹۹۵ء) وغیرہ شامل ہیں، جمعیۃ سے مستعفی ہو گئے ہیں، تو بے حد افسوس ہوا اور دل نے کہا کہ یہ اُن لوگوں کے لیے اچھا ہوا یا بُرا، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا؛ لیکن جمعیۃ کے لیے تو یہ بہت بُرا ہوا کہ مولانا فضیل اور مولانا اسرار جیسے لوگ آسانی سے دست یاب نہیں ہوتے؛ بل کہ برسوں کی محنت ودعا کے بعد بہ مشکل تمام صرف توفیقِ الٰہی سے ہی تیار ہو پاتے ہیں۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۹۱ء مطابق ۳/جمادی الاولی ۱۴۱۲ھ کو اِن لوگوں کا استعفا منظور کر لیا گیا۔

مولانا اسرارالحق قاسمی مدظلہ العالی نے کچھ دنوں بعد "ملی و تعلیمی فاؤنڈیشن" قائم کر لی، جس کا مرکز ذاکر نگر اوکھلا میں ہے اور جو ملت کے لیے تعمیری و تعلیمی میدانوں میں ٹھوس سطح پر مصروفِ عمل ہے۔ مولانا فضیل احمد قاسمیؒ نے اپنے محبین کے تعاون واشتراک سے ۲۳/نومبر ۱۹۹۲ء مطابق ۲۵/جمادی الاولی ۱۴۱۳ھ کو مرکزی جمعیۃ علماے ہند کے نام سے دوسری جمعیۃ بنالی؛ لیکن خود اُنھوں نے اُس کی صدارت قبول نہیں کی؛ بل کہ وہ تا حیات جنرل سکریٹری رہے۔ اُس کے پہلے صدر حضرت الاستاذ مولانا وحیدالزماں قاسمی کیرانویؒ (۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ — ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء) رہے، دوسرے صدر مولانا صدرالدین صدر انصاری بھوپالیؒ تھے، جب کہ تیسرے صدر مولانا عبدالحق سملکی گجراتی (متوفی ۹/ربیع الاول ۱۴۱۹ھ مطابق ۴/جولائی ۱۹۹۸ء) اور چوتھے صدر مولانا افضال الحق جوہر قاسمی مدظلہ العالی ہوے، جو اپنی بیماری وپیرانہ سالی کے باوجود اِس وقت بھی ہیں۔

مولانا فضیل نے اپنی جمعیۃ کے مستقر کے طور پر منہدیان میں حضرت الامام شاہ

ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مزارِ مبارک کے کیمپس میں واقع ''جامعہ رحیمیہ'' کی عمارت کے ایک بازو کو منتخب کیا اور اُن کی وفات تک یہی مُستقر رہا۔ ملک کے گوشے گوشے سے ہر طرح کے ضرورت مند آتے اور مولانا فضیل اُن کی ضرورتوں کو نہ صرف پوری کرتے؛ بل کہ اُن کی رہائش اور کھانے پینے کا بہترین انتظام کرتے۔ اُن کی پیشانی پر بَل آتا، نہ اُنھیں کبھی کبیدگی ہوتی، نہ وہ کسی پیچیدہ کام کے لیے آنے والے سے دل برداشتہ ہوتے؛ کیوں کہ وہ خدمتِ خلق ہی کے لیے اپنا اڈہ یہاں جمائے ہوے تھے۔ اُن کی شیریں کلامی، دل رُبا گفتار و کردار کی وجہ سے، بہت سے اہلِ حکومت و سیاست و قیادت سے اُن کے بے تکلفانہ تعلقات تھے، جنھیں وہ ہمیشہ ملک و ملّت کی بھلائی کے لیے سلیقے سے اِستعمال کرتے رہے، اُنھوں نے رفاہی کاموں اور بھلائی کی سرگرمیوں کے ذریعے دعاؤں کی جو سوغات حاصل کی، اُنھی کی طرح کے گنے چنے خوش قسمتوں نے حاصل کی ہوگی۔ میرا دل کہتا ہے کہ مولانا فضیل اور اُن کی طرح کے لوگ خدمت گزاری، نیک نامی اور تذکرۂ حسن کی راہ سے، اللہ کے ہاں اپنی دگر خامیوں کے باوجود، جن سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں، بڑا مقام و مرتبہ حاصل کرلیں گے؛ کیوں کہ حسنِ اخلاق ہمارے غفور رحیم کو اتنا پسند ہے کہ وہ ایمان والوں کو سب سے زیادہ اِسی راہ سے جنّت میں داخل کرے گا۔ اِمام ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اپنی جامع میں ایک روایت درج کی ہے، جس کو اُنھوں نے ''حدیثِ حسنِ صحیح'' قرار دیا ہے، جس میں فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ سے جنّت میں سب سے زیادہ داخل کرنے والے عامل کے متعلق پوچھا گیا، تو آپؐ نے فرمایا: ''خدا ترسی اور حسنِ اخلاق'' پھر آپؐ سے جہنم میں لے جانے والے سب سے بڑے مُحرِّک کی بابت پوچھا گیا، تو آپؐ نے فرمایا: ''منھ اور شرم گاہ''۔

ہر دل عزیز عالمِ دین

اُن سے ہر طرح کے لوگ ملتے، مسلم بھی اور غیر مسلم بھی، طلبہ بھی اور علما بھی،

معاشرے کے عام انسان بھی اور خواص بھی، گم نام، بے نام اور انتہائی نیک نام بھی۔ ہرایک کو یہ یقین ہوتا کہ مولانا فضیل سے ہمارا کام ضرور ہو جائے گا۔ اُن کے پاس آنے والوں کو سب سے زیادہ جو چیز لے کے آتی، وہ اُن کا بے تکلفانہ بے ساختہ اور اپنائیت کا انداز ہوتا۔ بعض دفعہ آدمی کسی کام کے آدمی کے پاس اُس کی اِفادیت کے باوجود، صرف اِس لیے نہیں جاتا ہے کہ اُس کا انداز متکلفانہ ہوتا ہے اور وہ کام تو کرادیتا ہے؛ لیکن اُس کا تصنّع و نستعلیقیت یا ملاقات کی خاص ترتیب اور پیچیدگی یا ایک قسم کی ''بداخلاقی'' اُس کے پاس جانے سے مانع بنتی ہے، ویسے بھی بعض دفعہ بلند بام، تنگ در ثابت ہوتا ہے، جب کہ جھونپڑی میں کشادگی اور راحت محسوس ہوتی ہے۔

مولانا نے اندرونِ ملک کے کونے کونے کا سفر کیا اور ساتھ ہی بیرونِ ملک کے بہت سے ممالک میں بھی اُن کا بار بار آنا جانا ہوا۔ ہر جگہ اُن کے محبّین اور ثنا خوانوں کی ایک معتد بہ تعداد پائی جاتی تھی۔ اُنھوں نے سعودی عرب، کویت، قطر، بحرین، عمان، اِمارات عربیہ متحدہ، انگلینڈ، جنوبی افریقہ، ویسٹنڈیز وغیرہ کا دورہ کیا، انسانوں کی دعاؤں اور اُن کے ذکرِ خیر کا مستحق بنے اور دین وملت کے لیے جو ہوسکتا تھا وہ کیا۔ وہ ایک بار شاہ فہد بن عبدالعزیزؒ (متوفی دوشنبہ: ۲۵/ جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ مطابق یکم اگست ۲۰۰۵ء) کی دعوت پر حج و زیارت سے بھی شرف یاب ہوے۔ رابطہ عالمِ اسلامی کے سابق جنرل سکریٹری شیخ عبداللہ عمر نصیف مدظلہ سے اُن کے بڑے گہرے روابط تھے، ہندوستان کے چند بڑے اہلِ علم وقیادت کے علاوہ کسی کے اتنے گہرے تعلقات اُن سے نہ تھے؛ نیز موجودہ سکریٹری جنرل رابطہ عالمِ اسلامی اور سابق وائس چانسلر اِمام سعود یونیورسٹی عبداللہ عبدالمحسن ترکی مدظلہ سے بھی اُن کا بے تکلفانہ تعلق تھا۔ وہ کئی بار شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملے اور جمعیت علما اور دارالعلوم کے حوالے سے اُنھیں اپنے سے قریب کیا۔

وہ متعدد منصبوں پر اعزازی طور پر فائز رہے: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ

کے ممبر رہے، جامعہ اردو علی گڑھ کی چانسلری پر فائز رہے، کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے عہدے پر بھی کام کیا، آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کی مجلسوں میں خصوصی مدعو کی حیثیت سے بلائے جاتے رہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اُن کی کشادہ نفسی کی وجہ سے، مسلمانوں کی اکثر جماعتیں اور تنظیمیں اُنھیں اپنے سے قریب سمجھتی تھیں؛ کیوں کہ وہ ساری جماعتوں اور تنظیموں کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔

اُنھوں نے اپنی جمعیّۃ کی ایک بڑی، پرشکوہ اور خوب صورت سی عمارت بھی بٹلہ ہاؤس، دہلی میں تعمیر کی، جس سے ایک مسجد بھی ''مسجد تقویٰ'' کے نام سے اٹیچ ہے اور ایک مدرسہ بھی۔ یہ عمارت اُن کا ایک پائے دار کارنامہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو تعجب تھا کہ بے سروسامانی کے باوجود اُنھوں نے اِتنی بڑی، اتنی اچھی اور مہنگی عمارت کیسے بنالی؟۔

اُنھوں نے اپنے ورثا میں اپنی والدہ محترمہ کے علاوہ اہلیہ، ایک لڑکا فاضلِ دیوبند: مولانا محمد سہیل قاسمی، نیز دو لڑکیاں اور ایک بھائی ڈاکٹر عزیر احمد قاسمی چھوڑا ہے۔ اُن کے ایک بھائی شعیب احمد قاسمی کا دو تین سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ اُنھیں اپنی جنت میں اعلیٰ مقام اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل واجرِ جزیل عطا فرمائے۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۴، جلد ۳۳، بابت ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ، مطابق اپریل ۲۰۰۹ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود ۱۲/ بجے دن، جمعہ: ۲۴/ صفر ۱۴۳۰ھ = ۲۱/ فروری ۲۰۰۹ء"

نیک بخت، نیک نام اور نیکوکار تاجر

الحاج محمد اجمل علی آسامیؒ

۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء — ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

وہی ہے صاحبِ اِمروز، جس نے اپنی ہمّت سے
زمانے کے سمندر سے، نکالا گوہرِ فردا

سہ شنبہ: ۲۱/صفر ۱۴۳۰ھ = ۱۷/فروری ۲۰۰۹ء کو صبح تقریباً ۷ بج کر ۵۵ منٹ پر، عطر وعود کے بڑے اور دیانت دار و نیک نام مشہور تاجر الحاج محمد اجمل علی بن عبدالمجید آسامی اپنی رہایش گاہ واقع ''میکر ٹاور'' علاقہ ''کف پریڈ'' ممبئی (سابق بمبئی) میں ۸۶ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

وہ کئی سال سے بڑھاپے کی وجہ سے کئی طرح کے امراض کا شکار تھے۔ اُن کا اعلی پیمانے پر اچھے سے اچھا علاج ہوا، اُن کے سپوت اور ہونہار فرزندوں نے اُن کی خدمت ونگہ داشت کے ذریعے بڑی نیکی کمائی اور اُن کا جی خوش کرنے کے ساتھ ساتھ ربِّ شکور کے ہاں اپنے لیے بہت سا ثواب وجزا اندوختہ کیا۔ اُن کی نمازِ جنازہ ممبئی کے ''وی ٹی'' علاقے کے انجمن اِسلام ہائی اسکول کے میدان میں سہ شنبہ و چہار شنبہ: ۲۱-۲۲/صفر ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۷-۱۸/فروری ۲۰۰۹ء کی درمیانی شب میں تقریباً ۱۰ بجے، دارالعلوم دیوبند کے استادِ حدیث مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ نے پڑھائی، جس میں ممبئی کے بڑے بڑے تُجّار و کاروباری حضرات نیز ملک کے متعدد مسلم قائدین وسیاست داں وعلما وطلبہ

اورعام مسلمانوں کا جمِ غفیر شریک ہوا۔ مرحوم کے فرزندان اور رشتہ دار جو بیرون ملک بالخصوص خلیجی عربی ممالک میں کاروبار کے لیے مقیم ہیں، سبھی آگئے تھے، نیز دارالعلوم دیوبند اور جمعیّۃ علما کے موقر وفود نے بھی نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کی۔ دارالعلوم کے وفد کی سربراہی، دارالعلوم کے نائب مہتمم مولانا عبدالخالق مدراسی نے کی۔ دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن نے اپنی ذاتی نمایندگی کے لیے اپنے صاحب زادے مولانا انوار الرحمٰن قاسمی کو بھیجا۔ دوسری نمازِ جنازہ ''مرین لائن'' کے قبرستان میں، جس میں مرحوم کی تدفین عمل میں آئی، بارہ-ایک بجے شب میں، اُن کے صاحب زادے مولانا بدرالدین اجمل قاسمی رکنِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے پڑھائی۔ ۲ بجے شب میں اُن کی تدفین عمل میں آئی۔ اللہ غریق رحمت کرے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دینی ورفاہی کاموں میں پیش پیش رہنے والے تاجر

چند سال قبل تک وہ عموماً صحت مند تھے، اُس وقت اُن کا حرمین شریفین کی زیارت اور حج وعمرہ کے لیے معمول رہا تھا، وہ کافی وقت حرمین شریفین میں گزارتے رہے تھے۔ وہ بڑے نیک، خداترس، فقیروں اور مسکینوں پر ترس کھانے والے آدمی تھے۔ بیواؤں، یتیموں، مجبوروں پر فراخی سے خرچ کرنا اُن کا معمول تھا۔ دینی ورفاہی کاموں اور اِسلامی علوم کی ترویج واِشاعت کے منصوبوں پر بڑی بڑی رقمیں صرف کرنا اُن کی عادت تھی، وہ مکمل حساب کے ساتھ ایک ایک پائی زکاۃ کی رقم ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ نے صرف اِسی لیے مجھے برکت سے نوازا ہے۔ امانت ودیانت اُن کا کاروباری ستون تھا، اُنھوں نے اپنی تجارت کی بنیاد سچائی اور پاک بازی پر رکھا تھا۔ وہ نوجوانی سے نہ صرف پابندِ صوم وصلاۃ؛ بل کہ تہجد گزار اور شب بیدار رہے تھے۔ اپنی ساری اولاد کو دین اور احکامِ دین کا پابند بنایا، اِس حوالے سے وہ بڑے سخت واقع

ہوے تھے۔ وہ وقت، وعدہ اور نظام وقانون کے بھی بڑے پابند تھے۔ اُن کی اُصول پسندی سے اُن کے سارے ملازمین واقف تھے اور ذرا سا بے اُصولی اُن میں سے کسی سے بھی سرزد ہو جائے ،تو وہ بہت ڈرتا تھا کہ حاجی اجمل اُسے سزا ضرور دیں گے۔ اُنھوں نے اپنی تجارت کے فروغ پر جتنی محنت کی، اُسی قدر یا اُس سے کچھ سوا اپنی اولاد کی تربیت پر توجہ دی، اُن کے لیے علما وصالحین کی تربیت وصحبت سے با قاعدہ فائدہ اُٹھاتے رہنے کا نظام وضع کیا، جس پر اُن سے پابندی سے عمل کرواتے تھے، اپنی ایک اولاد مولانا بدرالدین اجمل قاسمی کو با قاعدہ عالم بنایا، وہ دارالعلوم سے نہ صرف فارغ ہوے؛ بل کہ شروع سے اب تک دارالعلوم کی خدمت، اُن کی سرگرمیِ حیات کا جلی عنوان ہے۔ ہیں۔ وہ نہ صرف عالم بنے؛ بل کہ مولانا سید اسعد مدنیؒ (۱۳۴۶ھ/۱۹۲۸ء — ۱۴۲۷ھ/۲۰۰۶ء) اور مولانا احمد علی آسامی (۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء — ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء) کے با قاعدہ دست گرفتہ اور اُن کے خلیفہ ہوے۔ حاجی محمد اجمل علی کے پاس مال ودولت کی کوئی کمی نہ تھی، وہ چاہتے تو اپنی اولاد واحفاد کے لیے بڑی سے بڑی عصری تعلیم گاہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا، اپنے مصارفِ خاص سے اِنتظام کر سکتے تھے؛ لیکن اُنھوں نے اپنے پوتوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے بھی با قاعدہ دیوبند میں مکان خریدا، اُن کی رہایش کا اِنتظام کیا اور اُنھیں حافظ وقاریِ قرآن پاک کے بعد عالم ومفتی بننے کی راہ ہم وار کی۔ اُن کے تقریباً ایک درجن پوتے دیوبند میں رہایش پذیر ہیں اور علما واَتقیا کی صحبت میں دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو رہے ہیں۔

دیانت دار تاجر

حاجی محمد اجمل علی بن عبدالمجید ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں ایک پس ماندہ علاقے میں (جو "سِلہَٹ" کے نام سے جانا جاتا تھا اور اُس وقت غیر منقسم ہندوستان میں آسام کا حصہ تھا اور اب "بنگلہ دیش" میں ہے) اِس عالمِ آب وگل میں آئے۔ "ہوجائی" کے

قریب ''علی نگر'' گاؤں میں اِبتدائی تعلیم اور ''نیل باغان'' کے ہائی سکنڈری اسکول میں آگے کی تعلیم حاصل کی، وہ اپنے آبائی پیشہ زراعت ہی میں لگے رہے؛ لیکن شروع سے وہ بیماری کی وجہ سے قدرے کم زور ہو گئے تھے؛ اِس لیے اُن کا میلان تجارت کی طرف ہوا، اُنھوں نے ''ہوجائی'' میں عطر وعود کا چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا۔ ۱۳۷۱ھ/ ۱۹۵۲ء میں وہ ''ہوجائی'' سے ''ممبئ'' (بمبئ) آ گئے، یہاں اُنھوں نے معمولی پیمانے پر یہی کاروبار جاری رکھا۔ ''الحافظ ٹریڈرس'' کمپنی کے ساتھ اشتراک کر لیا، وہ آسام سے سامان لاتے اور اِس کے اشتراک میں کام کرتے۔ محنت، سچائی، دیانت داری اور دین داری کے ساتھ شبانہ روز کی محنت کی وجہ سے اللہ نے اُنھیں برکت دی، آج اُن کی اولاد کے پاس دنیا کے مختلف ملکوں اور ہندوستان میں ایک سو سے زائد شوروم ہیں۔ اُن کی اجمل کمپنی عطر وعود کے حوالے سے دنیا بھر میں اپنا اِمتیاز ووقار رکھتی ہے اور اجمل کا مطلب ہی مال کے اصلی ہونے کی علامت ہے۔ اُن کے کاروبار میں اِتنی وسعت وترقی کا راز صرف یہ ہے کہ اُن کے ہاں دیانت وسچائی اور زکاۃ کے مکمل طور پر ادا کرنے کا جس درجہ اہتمام ہے، وہ کم تاجروں کے ہاں ہوگا۔ آج حاجی محمد اجمل علی دنیا سے اِس حال میں گئے ہیں کہ اُن کی اولاد صاحبِ ثروت ہے، اُن کے ہاتھ اونچے ہیں کہ وہ خوب لوگوں میں داد ودہش کیا کرتے ہیں۔

علمائے صالحین کے دست گرفتہ وصحبت یافتہ

مرحوم ہمیشہ نیکوں اور علمائے متقین سے جڑے رہے، اُن کی صحبت میں جانا، اُن کے نفسِ گرم کی تاثیر سے اپنی ذات کو مُنوّر کرنا اور باطن کو سنوارنا، اُن کا مستقل رویّہ رہا۔ دارالعلوم دیوبند اور جمعیّتِ علمائے ہند، تو اُن کے گھر اور خاندان کی طرح تھے۔ وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء —— ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء) سے بیعت ہوئے، اُن کے اِنتقال کے بعد وہ حضرت مولانا احمد علی آسامی

رحمۃ اللہ علیہ کے دست گرفتہ ہوے۔ اُنھوں نے دِگر بہت سے رفاہی کاموں کے ساتھ ''ہوجائی'' میں ایک بڑا ہسپتال ''حاجی عبدالمجید میموریل ہوسپٹل اینڈ ریسرچ سینٹر'' (Haji Abdulmajeed Memorial Hospital & Reserch center) قائم کیا، جس میں ۳۵۰ بیڈ کی گنجایش ہے، اُن کے فرزندوں نے اسے ۵۰۰ بیڈ تک وسعت دینے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ نیز اُنھوں نے ''گوالپاڑہ'' اور ''ڈبری'' ضلعوں میں فساد سے مُتاَثِّر یتیموں کے لیے دو ہاسٹل قائم کیے، جن میں سے ایک میں ۷۵۰ اور دوسرے میں ۳۵۰ بچوں کی گنجایش ہے، نیز انگریزی اور عصری تعلیم کے لیے ۱۲ اسکول قائم کیے گئے ہیں اور مزید کے لیے سرگرمی جاری ہے۔ اِسی کے ساتھ ٹیکنیکل تعلیم کے لیے بھی اِدارہ قائم کیا گیا ہے۔ ایک بڑا اور اہم کام ''مرکز المعارف'' کے نام سے دینی مدارس کے طلبہ کے لیے انگریزی تعلیم کے اِدارے کا قیام ہے، جس کا مرکز ممبئی میں ہے، جس میں اعلیٰ پیمانے پر انگریزی تعلیم دو سالہ نصاب کے تحت دی جاتی ہے، نیز کمپیوٹر میں بھی اکسپرٹ بنایا جاتا ہے۔ اِس اِدارے سے بڑی تعداد میں فارغینِ مدارس نے انگریزی سیکھی اور وہ دین و دنیا سے متعلق مختلف میدان ہاے حیات میں عزت وآبرو اور وقار کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں۔ تحقیق و ریسرچ کے شعبے کے ساتھ ساتھ، اُس سے ایک ماہ وار ہمہ گیر انگریزی رسالہ بھی شائع ہوتا ہے، جو گویا زیرِ تعلیم طلبہ کے لیے مضمون نویسی کا بہترین پلیٹ فارم ہے۔

حاجی محمد اجمل علی مرحوم نے اپنے پیچھے پانچ باتوفیق بچے: امیر الدین اجمل، فخر الدین اجمل، مولانا بدر الدین اجمل قاسمی، سراج الدین اجمل اور نذیر الدین اجمل، نیز دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ سبھی صاحبِ اولاد ہیں اور مجموعی طور پر سبھی دینی مزاج کے حامل ہیں۔ اُن کے لڑکے مولانا بدر الدین اجمل قاسمی جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، دار العلوم دیوبند سے فارغ اور دار العلوم کی شوریٰ کے سرگرم رکن ہیں۔ وہ دینی میدانوں کے علاوہ پچھلے کچھ سالوں سے میدانِ سیاست میں بھی فعّال ہیں، اُنھوں نے ''آسام

یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ'' (یوڈی ایف) کے نام سے مستقل سیاسی پارٹی ترتیب دی، پہلے اپنے صوبے آسام میں اُس کو سرگرم کیا، وہاں اُس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں، اب ملک کے دوسرے صوبوں میں اُس کی توسیع کے لیے تگ ودو کی جارہی ہے۔

دین دار تاجر کی قابل تقلید مثال

مرحوم الحاج محمد اجمل علی آسامی دین دار و امانت دار تاجر کی قابلِ تقلید مثال تھے۔ اللہ نے اُنھیں جہاں بے پناہ مال و دولت سے نوازا تھا، وہیں اُنھیں نیک سیرت و فرماں بردار اولاد بھی عطا کی، ساتھ ہی اُنھیں اپنی اِس توفیقِ خاص سے بھی نوازا کہ اُنھوں نے اپنی دولت کا قابلِ لحاظ حصّہ، دین، دینی تعلیم، اِسلامی مدارس و جامعات، بالخصوص دارالعلوم دیوبند و جمعیّتِ علماے ہند پر فیّاضی کے ساتھ خرچ کیا اور ضرورت مندوں، مسکینوں، بیواؤں اور بیماروں کے علاج معالجے کے لیے، اپنی پاک کمائی کا معتد بہ ٹکڑا مخصوص کیا اور اپنے بعد اپنی اولاد کو تاکیداً نصیحت کی کہ وہ مذکورہ شریفانہ مقاصد کے لیے اُنھی کی طرح کوشاں رہیں اور آمدنی کے بڑے جزو کو مستقلاً اُن کے لیے مخصوص رکھیں۔ وہ اپنی اولاد کو ہمیشہ کہتے تھے کہ ہماری تجارت میں برکت کا راز محض زکاۃ کی مکمل ادائیگی اور کارِ خیر میں خرچ میں پوشیدہ رہا ہے، وہ اُنھیں بتاتے تھے کہ قرآنِ پاک اور حدیثِ رسول ﷺ میں صاف لفظوں میں وارد ہوا ہے کہ ہمارے مالوں میں زکاۃ کے علاوہ بھی فقرا و محرومین کے کچھ حصّے ہوا کرتے ہیں، جنھیں نکالنے میں ہمیں دریغ نہیں ہونا چاہیے۔

حاجی صاحبؒ کے ساتھ راقم کا مدینہ منورہ کا یادگار و پُر بہار سفر

رمضان ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء میں، یہ راقم آثم ''جدّہ'' میں تھا، ''مرکز الفیصلیہ'' نام کی مشہور عمارت میں حاجی اجملؒ ہی کے شوروم کے ملازمین کی قیام گاہ میں رکا ہوا تھا؛

کیوں کہ علما و صلحا بالخصوص دار العلوم دیوبند اور جمعیۃ علماے ہند سے متعلق علما کے لیے یہ قیام گاہ شروع سے اُن کی ہدایت کے مطابق مہمان خانہ بھی رہا، جہاں ہر ایک کو ہمیشہ حج و عمرے کی ادائیگی، یا کسی اور ضرورت سے سعودی عرب آمد کے موقع سے، گھر کی سی سہولت اور آرام مُیسّر رہتا تھا، میں عمرے کی سعادت کے بعد یہاں مقیم تھا، مجھے مدینۂ منورہ جانا تھا اور وہاں سے واپسی پر ''جدہ'' سے ریاض ہوتے ہوے ہندوستان واپس ہونا تھا، ہر جگہ آمد و رفت کا ٹکٹ مجھے اُس وقت سعودی عرب کے سفیر براے ہند جناب فؤاد صادق مفتی نے عنایت فرمایا تھا۔ میں پابہ رکاب تھا کہ شوروم کے ملازمین نے بتایا کہ آج الحاج محمد اجمل علی آرہے ہیں اور وہ آج ہی یا کل مدینۂ منورہ جانے کو ہیں۔ مجھے اُن لوگوں نے کہا کہ آپ آج رُک جائیں، اُن سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور تعارف بھی ہو جائے گا، اُنھیں یقیناً آپ سے دِگر اساتذۂ دار العلوم کی طرح مل کے خوشی ہوگی۔ چناں چہ وہ تشریف لائے تو اُن سے ملاقات و تعارف ہوا۔ میں نے اُنھیں اپنا پروگرام بتایا کہ میرا آج شام کے وقت کا مدینۂ منورہ کے لیے OK اوکے تھا؛ لیکن اِن لوگوں نے مجھے آپ کی آمد کا بتایا تو میں شرفِ ملاقات کے لیے رُک گیا تھا، اب آپ اجازت دیجیے تاکہ میں سفر کے لیے تیاری کرسکوں۔ اُنھوں نے سنتے ہی فرمایا: تمھیں مدینۂ منورہ جانا ہے تو میرے ساتھ چلو، میں گاڑی سے جاؤں گا، بڑی اور آرام دہ گاڑی ہے، راستے کے منظر سے ہم لطف اندوز ہوں گے اور حضورؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی یاد سے ہمیں سعادت حاصل ہوگی، کیا عجب کے اِس صحرا میں کسی ایسی جگہ پر بھی ہماری نگاہیں پڑجائیں، جہاں سے کبھی اُن قدسی صفات اِنسانوں کا گزر ہوا ہوگا۔ ہوائی جہاز کا Ok اوکے ختم کروادو، ٹکٹ تمھارا اوپن ہے، یہ واپس ہو جائے گا اور تمھاری رقم بچ جائے گی، ساتھ رہو گے باتیں کرتے چلیں گے اور مجھے تم سے اُنسیت بھی ہوگی۔

چناں چہ دوسرے دن ہم لوگ ظہر کی نماز کے بعد دو ڈھائی بجے کے قریب روانہ ہوے، اُن کے ساتھ کئی خدام اور جدہ کے شوروم کے کئی ملازمین تھے۔ راستے میں نبی

ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی جاں فشانی اور اِسلام کے لیے اُن کی قربانی کا تذکرہ رہا۔ بدر واُحد کے معرکوں کے واقعات یاد کیے جاتے رہے۔ ہم ٹھیک اذانِ مغرب کے وقت مسجدِ قبا پہنچ گئے، ہم نے سیکڑوں روزہ داروں کے ساتھ اِفطار کیا اور نمازِ مغرب کے بعد فوراً مدینۂ منورہ روانہ ہوئے۔ جنت البقیع قبرستان کے شمال میں ایک بلڈنگ میں حاجی صاحب کے خدام نے کئی کمروں پر مشتمل ایک ''شقّہ'' لے رکھا تھا، ہم جیسے ہی اُس میں داخل ہوئے اور اُن کا سامان سیٹ ہوگیا، تو ہم نے حاجی صاحبؒ سے اجازت لے لی کہ یہاں ہم بلا تکلف رہنا چاہتے ہیں، آپ کی درازیِ عمر اور اُس کے عوارض کی وجہ سے، آپ کی ترتیبات دوسری ہوں گی اور میری دوسری؛ اِس لیے یہاں کی مبارک ساعتوں میں، میں آپ کے لیے خلل اندازی کا باعث ہونا مناسب نہیں سمجھتا، آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں بعض دوستوں کے ساتھ، جنھیں پہلے سے کہہ رکھا ہے، وقت گزاروں۔ اُنھوں نے میری ''مدلل تقریر'' کے بعد بادلِ ناخواستہ اجازت دے دی؛ لیکن فرمایا کہ تم ساتھ رہتے تو اچھا تھا، مجھے کوئی خلل نہ ہوتا؛ لیکن مجھے تمھارے آرام میں آرام ہے۔

حاجی اجمل رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ، اِس سے پہلے یا اِس کے بعد اِتنی دیر تک اِس طرح بے تکلفی کی صحبت تو کیا ملاقات کا بھی موقع نہیں ملا تھا، اِس تفصیلی ملاقات میں، جو مبارک شہر کے مبارک سفر کے دوران، مجھے اُن کے ساتھ حاصل ہوئی، وہ انتہائی متواضع، بے نفس، سادہ مزاج، دینی فکر سے سرشار نظر آئے۔ اُن میں علما وصالحین سے بڑی محبت محسوس ہوئی۔

اُنھوں نے پورے سفر میں دنیا کی کوئی بات نہیں کی، وہ صرف دینی باتیں کرتے اور سنتے رہے، اُن پر دینی فکر غالب نظر آئی اور آخرت کے متعلق سوچنا ہی اُن کا شیوہ محسوس ہوا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ خاص توفیقِ الٰہی کی بات ہے کہ بہت سارے مال ودولت کے باوجود، اُن کے ذہن اور دل پر دنیا کا تسلّط نہیں ہے؛ ورنہ اُن

کے ایسے اکثر لوگ مال و دولت کی فراوانی کی وجہ سے فخر و مباہات، بے وجہ کی شہرت اور ریاکاری و مکّاری ہی میں مبتلا رہتے ہیں اور نیکی کا کام بھی دینی شہرت اور دُنیوی نام آوری کے لیے کیا کرتے ہیں؛ کیوں کہ ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں۔(*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ "الداعی" عربی شمارہ ۴، جلد ۳۳، بابت ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ مطابق اپریل ۲۰۰۹ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود، اواخر صفر ۱۴۳۰ھ = اواخر فروری ۲۰۰۹ء۔

مولانا عبدالحنّان قاسمی مظفر پوری سیتامڑھویؒ

۱۳۵۲ھ/۱۹۳۴ء — ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کرگئی میری کم آمیزی

چہار شنبہ: ۱۷/۵/۱۴۳۰ھ مطابق ۱۳/۵/۲۰۰۹ء کو تقریباً ۲ بجے، شدید بخار اور دائیں پاؤں کے ٹخنے کے زخم، نیز شکر کے مرض سے پیدا شدہ نئے عوارض کی وجہ سے، بے چینی کے عالم میں بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ میں اچنبھا ہوا کہ اِس وقت عموماً مجھے کوئی فون نہیں کرتا یہ کون صاحب ہیں، جو اِس وقت فون کررہے ہیں، یہی سوچتے ہوے میں نے بٹن دبایا، تو ایک صاحب کو غمگین لہجے میں یہ کہتے ہوے سنا کہ حضرت! ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ حضرت مولانا عبدالحنان قاسمی بالاساتھوی، اِس دنیا میں اب نہیں رہے۔ ایک بج کر ۲۰ منٹ پر وہ اپنے رب جا ملے۔ میں نے "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کا ورد کرتے ہوے، خبر دینے والے کو دعا دیتے ہوے، مرحوم کے لیے دعاے مغفرت و بلندیِ درجات کے کلمات کہے۔ چند منٹ بعد ملک و بیرونِ ملک سے کئی آدمیوں نے فون کیا، جن میں سے کچھ اِس خبر کی تصدیق چاہ رہے تھے اور کچھ یہ سمجھ کر خبر دے رہے تھے کہ شاید مجھے ابھی اِس کا علم نہ ہوا ہوگا، جس سے اندازہ ہوا کہ آناً فاناً یہ خبر ملک اور بیرونِ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی ہے۔

مولانا کی وفات سے طبعی طور پر تو شدید رنج وغم ہوا؛ لیکن اُن کا انتقال میرے

لیے اور اُن ہزاروں آدمیوں کے لیے کوئی اچانک واقعہ نہ تھا، جو پہلے سے جانتے تھے کہ مرحوم سال ہا سال سے طرح طرح کے شدید اَمراض کا شکار تھے اور شکر کے مرض کی وجہ سے آخری سالوں میں خاصی پیچیدگیوں اور ایسے عوارض کی زد میں آ گئے تھے کہ اُن کے لیے چلنا پھرنا اور اِنسانی ضرورتوں کو پوری کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وہ مفلوج اور بے دست و پا ہو گئے تھے۔

مرض الوفات میں مولاناؒ سے ملاقات

مارچ ۲۰۰۹ء (ربیع الاول ۱۴۳۰ھ) کے وسط میں، اِس ناچیز کو اپنے علاج اور دِگر ضروریات کی وجہ سے گھر جانا ہوا۔ دیوبند سے چلتے وقت ہی یہ سوچ کے چلا تھا کہ گھر جاتے ہی پہلے مولاناؒ کی عیادت کرنی ہے؛ کیوں کہ اُن کی بیماری اور صحت کی بڑھتی ہوئی ناہمواریوں کی مجھے مسلسل اطلاع مل رہی تھی۔ اُن کا گاؤں ''بالا ساتھ'' میرے گاؤں ''ہرپور بیشی'' سے صرف چند کلو میٹر کے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع ہے، میں نے دوسرے ہی دن کرایے کی گاڑی لی اور اپنے فرزندِ اوسط ''عمارہ نور'' سلمہ نیز گاؤں کے چند اَفراد کے ساتھ، اُن کے گھر پہنچا۔ گاڑی کی آواز سن کر مولانا مرحوم کے بھائی جناب عبد السلام صاحب باہر کو آئے، علیک سلیک کے بعد فوراً اندر گئے، پردہ وغیرہ کرا کے واپس آئے اور ہم لوگوں کو اندر آ جانے کا اِشارہ کیا۔ وہ ہمیں سیدھے مولاناؒ کی چارپائی کے پاس لے گئے۔ مولاناؒ اپنے مکان کی مغربی گیلری میں ساکت وصامت لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے مکان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، تو مجھے یہ مکان بھی ایک بڑا مدرسہ یا اسکول نظر آیا، اِس سے پہلے کئی بار مولاناؒ سے ملنے آنا ہوا؛ لیکن مکان کے اندر آنے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ اِس کی ضرورت ہوئی تھی۔

میں نے مولاناؒ کو بہ آوازِ بلند سلام کیا، تو اُنھوں نے فوراً آنکھیں کھول لیں اور میری طرف دیکھنے لگے؛ لیکن زبان یا ہاتھ سے کوئی اِشارہ نہ کر سکے۔ اُن کے بھائی عبد السلام

صاحب نے بتایا کہ ابھی کل تک وہ بولتے رہے تھے اور سلام کرنے والوں کا جواب دے دیا کرتے تھے؛ لیکن آج گویائی پر قادر نہیں۔ ویسے بات مکمل طور پر سنتے ہیں؛ اِسی لیے آپ کے سلام کے ساتھ ہی اُن کی آنکھیں فوراً کُھل گئی تھیں۔ عبدالسلام صاحب نے بار بار بہت زور زور سے مولانا کو آواز دی کہ یہ مولانا نور عالم رائے پوری، بیشوی، استاذ دارالعلوم دیوبند آپ کی عیادت کو آئے ہیں اور آپ کو سلام کہہ رہے ہیں، آپ نے پہچانا؟ لیکن مولانا خاموش رہے اور لب ہلا سکے نہ ہاتھ کو جنبش دے سکے۔ مجھے بتایا گیا کہ دماغ بھی پورا مفلوج ہو چکا ہے، صرف چوتھائی حصہ محفوظ ہے، جس کی وجہ سے آنکھیں کھلتی ہیں اور باتیں ساری سن لیا کرتے ہیں۔

میں اُن کے پاس تقریباً بیس منٹ تک رہا، اِتنے میں عبدالسلام صاحب چائے لے آئے، میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ زحمت کیوں کی، میں اور میرے ساتھی اِس وقت مہمانی کرنے نہیں، صرف عیادت کو آئے ہیں اور آپ لوگ اِس وقت ذہناً اور جسماً شدید طور پر مشغول ہیں؛ لیکن اُنھوں نے اِصرار کیا اور کہا کہ اِس کا انتظام رہتا ہے؛ اِس لیے کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ میں جتنی دیر مولاناؒ کے پاس بیٹھا رہا اللہ کی قدرت اور اِنسان کی بے بسی پر غور کرتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ ابھی کل کی بات ہے کہ مولاناؒ اپنی خطیبانہ صلاحیت، متکلمانہ قدرت کی مثال سمجھے جاتے تھے۔ ہر وقت بولتے رہتے، الفاظ اُن کی زبان پر آبِ سیلاب کی طرح بہتے، اُن کے حلق سے اُبلتے، اُن کے ہونٹوں پر کھیلتے اور مچلتے رہتے تھے، وہ اُنھیں بے ساختہ بہنے کے لیے چھوڑ دیتے، نہ اُن پر روک لگاتے، نہ کسی قید و بند کے لیے رضا مند ہوتے۔ آج محض ایک لفظ کی ادائگی بھی اُن کے بس میں نہیں۔

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

وہ ہمہ وقت ملاقاتوں اور گشتوں میں لگے رہتے، قریوں اور شہروں میں پھرتے،

کہیں رات کرتے تو کہیں صبح اور صبح وشام کے عرصے میں طویل فاصلے طے کر لیتے۔
کہیں قیام اُنھیں اچھا لگتا، نہ ٹھہراؤ اُنھیں پسند آتا، نہ جمود اُنھیں بھاتا، نہ جماؤ پر اُن کی
طبیعت آمادہ ہوتی۔ وہ اسفار کے رسیا تھے، ملاقاتوں اور زیارتوں سے اُنھیں راحت ملتی
تھی، جلسوں اور تقریبوں میں شرکت اُن کی غذا اور دوا تھی؛ لیکن آج لیٹے لیٹے بھی اپنے
پاؤں کو پھیلا سکتے ہیں نہ سمیٹ سکتے ہیں، ہاتھوں کو حرکت دے سکتے ہیں نہ سر کو جنبش۔
اِنسان کتنا ضعیف البنیان ہے؟ وہ کم زور پیدا ہوتا ہے، پھر بچپن سے گزر کر طاقت ور
جوانی کو پہنچتا ہے، پھر بھر پور طاقت کا حامل مرد بن جاتا ہے، پھر کم زوری کی طرف مائل
ادھیڑ عمری کی دہلیز پر جا پہنچتا ہے، پھر بوڑھا اور پیرِ فرتوت ہو جاتا ہے اور اِسی دنیا میں نو
مولود بچے کی طرح دوبارہ سہاروں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

باتوفیق عالم اور خوش گفتار مُقرِّر

مولانا عبد الحنان صاحبؒ اپنے عصر کے باتوفیق علما میں تھے، اللّٰہ نے اُن سے
بہت کام لیا، اُن کی تعلیمی وتربیتی فتوحات واکتسابات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اُنھوں نے
تقریباً ۴۰ سال تک درس وتدریس کا جام لنڈھایا، اُن سے ہزاروں طلبۂ علوم دین نے
استفادہ کیا۔ اُنھوں نے تقریباً ۴۵ سال تک تقریر ووعظ کا جادو جگایا اور اُن کے بے شمار
بیانات وخطابات ومواعظِ حسنہ سے اَن گنت لوگوں کو توبہ کی توفیق ملی، شریعت کے
سانچے میں زندگی کو ڈھالنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُنھوں نے ہزاروں دینی وعلمی
جلسوں میں اپنی شیریں بیانی اور حسنِ گفتار کی جوت جگائی اور عوام وخواص کے ہزاروں
کے مجمعوں میں اُن کی واعظانہ گھن گرج اور دینی وتبلیغی دعوت کی للکار اور اِصلاحی وتربیتی
للک آمیز وولوہ خیز تقریروں سے دل کی دنیا کے کتنے خرابات آباد ہو گئے۔ اُن کی واعظانہ
شوخیوں سے اڑوس پڑوس کے بدعت پرستوں اور خرافات واَوہام کے پجاریوں کو بھی
ہمہ لحہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب خرمنِ بدعت وتوہّم، چھاگل وکاکل، دیگ ومرغ،

عرس ومزار اور تعویز وکرامات کی ساحری خاکستر ہوجائے۔

وہ جہاں مدرسے میں مدرس تھے، میں نے دیکھا کہ عصر بعد نکل جاتے، رات کو جلسے یا تقریب میں تقریر کرتے، شب کے آخری حصے میں پھر مدرسے پہنچتے، ذرا بہت آرام کرتے، پھر تہجد کے لیے مسجد میں آجاتے اور صبح کی اذان تک محوِ عبادت ومناجات رہتے۔ فجر بعد ناشتہ کرتے اور وقت پر درس گاہ میں حاضر رہتے اور متعلقہ کتابوں کا درس دیتے۔

اُن کی تقریریں بہت مقبول تھیں، وہ خوش گفتار تھے، وہ ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کرتے، عوامی ذہن کو پیشِ نظر رکھ کر بولتے، اندازِ کلام پیارا ہوتا، آواز پاٹ دار ہوتی، تقریروں اور اَسباق میں توازن کے ساتھ سنجیدہ انداز اپناتے؛ لیکن ضرورت کے وقت مزاحیانہ انداز بھی اختیار کرتے۔ وہ ظریف الطبع اور حاضر جواب تھے۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے، نرم خوئی، شریف الطبعی اُن کا امتیاز تھی، وہ پاک سیرت، خوب صورت اور باوقار شخصیّت کے حامل تھے۔ عالمانہ وقار، خطیبانہ انداز، واعظانہ طرز، اُن کی شخصیت کو چار چاند لگاتا تھا۔ وہ برجستہ بولنے کی بھرپور قدرت رکھتے تھے؛ اِس لیے حاضرین کبھی بے مزہ ہوتے نہ سامعین کو کوئی تکان محسوس ہوتی؛ کیوں کہ وہ عوام کے مقرر تھے، عوام کی زبان میں، عوام کی دینی واصلاحی ضرورتوں کی بات ہی کہتے تھے۔ یہ کسی مقرر کا بڑا امتیاز ہوتا ہے کہ سننے والوں کو یہ محسوس ہو کہ یہ ہماری زبان میں، ہماری باتیں کہہ رہا ہے۔ جس مقرر کا یہ انداز ہو کہ سننے والوں کو یہ محسوس ہو کہ یہ عالمِ بالا یا ماروائے بشریّت دنیا کے لوگوں کی باتیں کررہا ہے، ہمیں اِس سے کیا لینا دینا؟ یہ اُس کا بڑا عیب ہوتا ہے۔

خوش اوقات عالمِ دین

میں مولاناؒ کے ساتھ باقاعدہ ہفتہ عشرہ بھی کبھی نہیں رہا؛ لیکن جہاں جہاں اُن کے مدرسوں میں اُنھیں دیکھا، اُنھیں تہجد اور نمازِ باجماعت کا پابند پایا۔ اُن کے چہرے سے راتوں کو جاگنے اور دن میں تگ ودو میں لگے رہنے کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ خوش اوقات عالم

تھے، ذکر وتلاوت سے اپنے لمحات کو معمور رکھتے، یا علمی مسائل میں اپنے اُن ساتھیوں اور طلبہ سے باتیں کرتے، جو اُن کے پاس اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ کچھ مدرسین اُن کی بذلہ سنجی اور خوش مزاجی کی وجہ سے اُن سے زیادہ ہی مانوس تھے، جو اُن کے پاس بہت آتے جاتے تھے۔

مولاناؒ کا سراپا

اُن کے جسم پر قدرے بڑا سا سر بہت اچھا لگتا تھا، اُن کی آنکھیں فراخ، اُن کی بھنویں گہری، اُن کا رنگ سرخ وسفید، اُن کا قد متوسط تھا۔ اُن کے سر پر تاج کی طرح کھڑی دوپلی ٹوپی بہت جچتی تھی، جس کی اِیستادگی کے لیے وہ بہت اہتمام کرتے تھے۔ اُن میں علما کا وقار اور صلحا کی سنجیدگی تھی۔ وہ نصف ساق تک لمبا اور ڈھیلا ڈھالا کرتا اِستعمال کرتے اور وقتِ ضرورت اُس سے بڑی اور ڈھیلی شیروانی زیبِ تن کرتے تھے۔ اِن چیزوں کی وجہ سے وہ خاصے پُر رعب لگتے تھے؛ لیکن فطرتاً وہ رعب داب کے آدمی نہ تھے، انتہائی مرنجا مرنج، گھل مل جانے والے اور عام اِنسانوں سے آسانی سے مانوس ہوجانے والے اور اُنھیں مانوس کرلینے والے تھے۔ ادھیڑ عمری کے بعد اُن کا جسم خاصا بھاری بھرکم ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے شکر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے اور نتیجتاً طرح طرح کے امراض کا شکار ہوکر رہینِ فراش بن گئے تھے۔

مولانا عبدالحنان کا تعلیمی کارنامہ

مولانا عبدالحنان رحمۃ اللہ علیہ بڑے علم والے اور کتاب وسنت میں گہرائی کی شناخت رکھنے والے علما میں نہ تھے، جن کا اوڑھنا بچھونا لکھنا پڑھنا، تصنیف وتالیف اور مطالعہ وتحقیق ہوتا ہے اور اِسی میدان میں وہ شانِ امتیاز کے حامل بن کر جبینِ کائنات پر اپنی عظمت کا نقش کندہ کرجاتے ہیں اور اُن کی بلند قامتی کا سارے معاصرین لوہا مانتے ہیں —— لیکن مولانا عبدالحنان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خدا کے فیصلے اور اپنے

سلسلے میں اللہ کی تقدیر کے مطابق، تعلیمی وتربیتی میدان میں دوسرے انداز میں اپنی صلاحیت کا خوب اِستعمال کیا؛ چناں چہ اُنھوں نے اپنے وطن کے ایک بڑے علاقے میں بہت سے مکاتب ومدارس قائم کیے اور خاص اپنے گاؤں ''بالا ساتھ'' ضلع ''سیتامڑھی'' سابق ضلع ''مظفر پور'' بہار میں دینی تعلیم کا ایک بڑا مدرسہ قائم کیا اور اپنی محنت، شب وروز کی تگ وتاز اور سعیِ مسلسل کے ذریعے، اُس کو اِتنی ترقی دی کہ وہ اِس وقت بہار کے ممتاز مدرسوں میں سے ایک ہے۔ اب وہاں درجۂ حفظ وتجوید وابتدائی دینیات کے ساتھ ساتھ دورۂ حدیث شریف تک تعلیم ہے، ساتھ ہی اُنھوں نے موت سے ذرا پہلے اُسی کے ماتحت ایک عصری اسکول بھی، سکنڈری سطح تک کی تعلیم کے لیے، اِقامت گاہ کے ساتھ قائم کیا۔ اُنھوں نے دونوں طرح کی تعلیم کے لیے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی، آرام دہ درس گاہیں، کشادہ رہایش گاہیں، خوب صورت سی کشادہ مسجد، کتب خانہ اور ایک ایسا صاف ستھرا اور نستعلیق مہمان خانہ تعمیر کروایا، جس میں بیرونِ ملک کے آرام آشنا مہمان بھی قیام کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔

لائقِ ذکر ہے کہ مولاناؒ نے اپنی علمی زندگی کا تقریباً پورا دورانیہ علاقۂ گجرات میں گزارا، جہاں کے مسلمانوں کو خدائے حکیم نے دینی کاموں اور رفاہی منصوبوں میں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی بہ نسبت، سب سے زیادہ حصہ لینے اور حصہ لے کر بے پناہ خوش ہونے اور اپنی جزا صرف اپنے رب سے پانے اور بندوں پر قطعاً اِحسان نہ جتانے کی توفیقِ خاص سے نوازا ہے۔ مولاناؒ کی دل پذیر تقریر اور مؤثر وعظوں کی وجہ سے وہاں کے نہ صرف مقیم باشندوں؛ بل کہ بیرون ملک رہنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اُن سے بہت مُتأثّر ہوگئی تھی؛ اِس لیے جب اُنھوں نے مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا، اُسی وقت سے اُن لوگوں نے دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے اُنھیں مدد دی، جو کم از کم بہار کے شاید ہی کسی عالم کو ملی ہوگی؛ اِس لیے اُنھیں اپنے مدرسے کو ترقی دینے، اچھے مدرسین کو لانے، زمین جایداد خریدنے، اُن پر بڑی بڑی پُر شکوہ عمارتیں کھڑی کرنے اور شہر اور دیہات میں

مدرسے کے لیے بہت سے منصوبوں کو بروے کار لانے اور اپنے پروگراموں کو، اپنی خواہش سے بڑھ کر پورا کرنے میں؛ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ کبھی پیش نہیں آئی۔

مولاناؒ دنیا سے اِس حال میں گئے ہیں کہ اُن کے مدرسے اور دِگر دینی منصوبوں کے لیے مالی آمدنی کے ذرائع تقریباً یقینی بن گئے ہیں۔ توقع ہے کہ کسی خرخشے کے بغیر اُن کے بعد، اُن کے منصوبوں کے نقشوں میں اُن کی خواہش کے مطابق رنگ بھرتا رہے گا۔ اُنھوں نے اپنی اولاد بالخصوص اپنے بڑے صاحب زادے عزیز گرامی مولوی قاری حفظ الرحمٰن سلمہ کی تربیت اِس طرح کی کہ وہ اُن کے بعد؛ بل کہ اُن کی زندگی ہی میں — اُن کی بیماری و معذوری کے دوران — اُن کے مدرسے اور سارے چھیڑے اور چھوڑے ہوے منصوبوں کا بوجھ سنبھالنے کی بھرپور لیاقت اور استحقاق کا ثبوت پیش کر چکے ہیں۔ وہ اچھے مُقرر، کام یاب واعظ اور اپنی اہلیتوں کی وجہ سے لوگوں بالخصوص مولاناؒ کے مُحبّین و معتقدین اور اُن کے کاموں کے لیے مادی تعاون دینے والوں کے لیے باعثِ کشش بن گئے ہیں۔ مولاناؒ نے یہ اچھا کیا کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے اِس لائق صاحب زادے کا، اُن مُحبّین و متعاونین سے اچھی طرح تعارف کرادیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مولوی حفظ الرحمٰن سلمہ میں وہ ساری صلاحیتیں موجود ہیں، جو آج کسی دینی و رفاہی اِدارے کو چلانے کے لیے ناگزیر ہیں، جن میں سرِ فہرست مالیہ کی فراہمی کی صلاحیت ہے کہ کسی اِدارے کی رفتارِ مسلسل کے لیے مالیہ ہی آج ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولاناؒ سے وابستہ ناقابلِ فراموش یادیں

میں اُس وقت بھی طالب علم ہی تھا، جب مولاناؒ ایک کام یاب مدرس اور کہنہ مشق واعظ کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ وہ اُس وقت جواں سالی اور اُدھیڑ عمری کے درمیان تھے، لحیم و جسیم نہ تھے؛ بل کہ قدرے دبلے پتلے اور چھریرے بدن اور

تراشیدہ قد کے آدمی تھے۔ دور دراز کے گاؤں میں بھی سائکل پر آتے جاتے تھے، جسے ہم بچے بھی استعمال کرتے تھے۔ وہ اُن دنوں بھی تقریر و وعظ کے بڑے دل دادہ تھے، گاؤں گاؤں میں دینی محفلوں اور جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ مرحوم بہت سے جلسوں میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں اُس وقت اپنی طالب علمانہ تقریروں، جلسوں اور دینی محفلوں کو تلاوتِ کلام پاک اور نعتِ نبوی کی خواندگی کے ذریعے، شروع کرنے کی لیاقت کے حوالے سے، اپنے ہم عصروں میں مشہور تھا۔ میں دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن میں زیرِ تعلیم تھا، وہاں درجہ سوم عربی تک تجوید کے ساتھ قرآنی سورتوں کی مشق ضروری ہے، اِس سے ہم لوگوں کو فائدہ ہوا کہ قرآنِ پاک کو صحت کے ساتھ پڑھنے کی خاصی مشق ہوگئی۔ بچپن کی آواز عموماً رسیلی اور خوب صورت ہوتی ہی ہے؛ اِس لیے قرآنِ پاک کی تلاوت اور نعت کا میرا پڑھنا، لوگوں کو بھلا لگتا تھا اور جلسے کو جمانے کے لیے ابتدا میں، میں خاصا بول لیتا تھا؛ اِس لیے رمضان کی طویل چھٹیوں کے زمانے میں، جو وسطِ شعبان سے ہی عموماً شروع ہو کر وسطِ شوال تک جاری رہتی ہیں، مولاناؒ کی خواہش ہوتی کہ میں مُیسّر رہوں، تو اچھا ہے، وہ کسی کو بھیج کے مجھے بلوا لیتے اور دینی اجتماعات میں ساتھ لے جاتے۔ اُن صحبتوں میں مَیں نے اُنھیں ایک اچھا انسان پایا۔ وہ حلیم، کریم، شفیق، چھوٹوں پر کرم کرنے والے اور بڑوں کا ادب کرنے والے تھے، اُن کی آواز گرج دار تھی۔ وہ خود اعتمادی سے بولتے، عقیدۂ صحیحہ کا دفاع کرتے، بدعات و خرافات کے خلاف گرجتے، معاشرتی خرابیوں کی نشان دہی کرتے۔ بدعت کے خلاف وہ اِس لیے بھی شمشیرِ برہنہ تھے کہ وہ اِس کی زہرناکی سے بہ راہِ راست واقف تھے۔ اُن کے گاؤں سے جڑے ہوئے بعض گاؤں مکمل طور پر بدعتیوں اور کٹر رضاخانیوں کے گاؤں تھے اور ہیں۔

میں نے اُس وقت بھی دیکھا کہ وہ تقریر میں گہرے، معنی دار، علمی الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرتے، مشکل طرزِ کلام سے بالکلیہ بچتے، علمی اصطلاحات کو کبھی ہاتھ نہ لگاتے، آسان، ہلکے پھلکے اسلوب میں بولتے، جو دیہاتیوں، عام لوگوں، اَن پڑھوں کو بھی بہ

آسانی سمجھ میں آجاتا؛ اِس لیے جب وہ گجرات کے خطّے میں مدرس ہوے، تو وہاں بھی ممتاز اور بڑے عوامی مقرر ثابت ہوے، حتی کہ لوگ اُنھیں اپنے گجراتی علما و مقررین پر بھی ترجیح دیتے تھے، جب کہ یہ علما و مقررین گجراتی بھی جانتے تھے اور اپنے علاقے کی اصطلاحوں اور روز مرہ سے واقف ہونے کی وجہ سے بہ ظاہر اُن کے لیے زیادہ سود مند تھے؛ لیکن مولاناؒ اپنی سہل گوئی، شیریں بیانی اور عام فہم زبان کی وجہ سے؛ وہاں کے لوگوں کے لیے بھی ہر دل عزیز مقرر بن گئے۔

مولاناؒ کی ہمارے گاؤں ''بیشی'' کے جڑواں گاؤں ''نیا گاؤں'' ٹولہ اسری میں رشتہ داری تھی، اُن کی اپنی پھوپھی یہیں بستی تھیں، وہ جب بھی اُن کے ہاں آتے، سب سے پہلے مجھے یاد کرتے اور جب تک ہمارے گاؤں میں رہتے ہمیں اپنے ساتھ رکھتے۔

دارالعلوم مئو کی طالب علمی ہی کے دور میں، میں نے اپنے گاؤں میں کئی بار دینی اجتماعات کا اہتمام کیا۔ اپنے ہم عمروں کے ساتھ گاؤں کی خواتین اور نوجوانوں سے چندے کرتا اور جلسے کے لیے ضروری مصارف بہم پہنچا، اُن جلسوں میں مولانا عبدالحنان صاحبؒ ہی عموماً مدعو ہوتے، جلسوں کو میں اپنی تلاوت، نعت شریف اور تمہیدی تقریر سے شروع کرتا، پھر مولاناؒ کے تعارف کے بعد مولاناؒ کو دعوتِ خطاب دیتا۔ ہمارے گاؤں کے لوگ اُس زمانے میں انگریزی عصری تعلیم کے اِس درجہ دل دادہ تھے کہ دینی عربی تعلیم کو اس کے بالمقابل حقارت کی حد تک غیر مفید تصور کرتے تھے۔ اُن جلسوں اور دِگر دینی اجتماعات اور علما کی چلت پھرت سے بڑا دیرپا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو مسجد کی راہ معلوم ہوگئی، اُن کا اللہ سے کچھ نہ کچھ تعلق قائم ہوگیا، اُن میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں اُن جلسوں نے ایسا دینی بیج بویا، جو بعد میں تناور اور ہر موسم میں پھل لانے والا درخت ثابت ہوا، اُن میں دینی جذبے کی آبیاری ہوئی، جس نے اُن میں انقلاب برپا کیا اور اپنی اولاد و احفاد کو دینی تعلیم دلانے، اُنھیں عالم و فاضل بنانے پر آمادہ کیا۔ آج ہمارے گاؤں میں دسیوں فضلاے دیوبند ہیں اور بہت سے دارالعلوم دیوبند میں اور دِگر

مدرسوں میں زیرِ تعلیم ہیں، جب کہ اُس وقت یہ راقم اور ایک دو صاحب ہی مدرسہ آشنا تھے۔ اب لوگوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ مدرسے کی تعلیم بھی نہ صرف دینی طور پر؛ بل کہ دنیا کی سطح پر بھی عصری تعلیم ہی کی طرح مفیدِ طلب ہے، پہلے لوگوں کا اِیمان تھا کہ مدرسے میں پڑھ کے ہماری اولاد کی زندگی ان کے دوشِ ناتواں پر بارِ ثابت ہوگی۔

مولاناؒ کو قریب سے دیکھنے کی تقریبیں

دار العلوم دیوبند کے بعد میں نے اپنے وقت کے بڑے محقق عالم، فقیہ و محدث واہلِ قلم حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلوی (۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء - ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) سے بہ راہِ راست اِستفادے کی غرض سے مدرسہ امینیہ دہلی کشمیری گیٹ میں ایک سال گزارا۔ اُس زمانے میں مولانا عبدالحنان صاحبؒ چھاپی، گجرات میں مدرس تھے، وہاں آتے جاتے ہوئے، وہ ہمارے پاس تشریف لاتے اور حسبِ موقع ایک آدھ روز گزار کر اپنا آگے کا سفر جاری رکھتے۔ میں حسبِ استطاعت اُن کی مہمان نوازی کرتا اور انتہائی احترام واِکرام کے ساتھ پیش آتا۔ مولانا مرحوم میری ضیافتی سلیقہ مندی، اندازِ اِکرام واحترام سے بہت مُتاثّر ہوتے اور فرماتے: تم نوعمری کے باوجود جس سلیقے، نستعلیقیت اور تہذیب وشائستگی سے پیش آتے ہو، اُس کی روشنی میں میرا دل کہتا ہے کہ میری نسل کے علمائے بہار کے بعد، تم اپنی نسل کے شانِ امتیاز کے حامل عالم بنوگے، اللہ تمھیں کام یاب اور بامراد کرے۔

جمعرات ۱۰؍دسمبر ۱۹۸۷ء (۱۷؍ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ) کو مجھے دار العلوم ماٹلی والا بھروچ —— جہاں مولانا مرحوم استاذِ حدیث وفقہ وتفسیر تھے —— کی دعوت پر علاقۂ گجرات کی پہلی بار زیارت کا موقع ملا۔ وہاں طلبہ کے ایک ادبی وثقافتی پروگرام کی جو ''اسلام اور اُس کا معاشرتی نظام'' کے موضوع پر منعقد ہوا، صدارت کی گئی اور حکم کا فریضہ انجام دیا گیا؛ بل کہ یہ شرکت اور یہ سفر دونوں تاریخی اور یادگار ثابت ہوئے۔

میرے نام اِس دعوت کے محرک برادرِ مکرم، فاضلِ محترم مولانا رشید احمد سلوڈی بھروچی تھے، جو اُس وقت وہاں سرگرم استاد، طلبہ کے مربی اور مدرسے کی تعلیمی ترقی کے لیے ساری توانائیوں اور علمی صلاحیتوں کے ساتھ محوِ عمل تھے۔ اِس وقت وہ گجرات کے ''دارالعلوم دیوبند'' یعنی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں بڑے اساتذہ میں سے ایک ہیں۔

اِس سفر سے جہاں علاقۂ گجرات کی اولین جان کاری حاصل ہوئی، وہیں مولانا عبدالحنانؒ سے عرصے کے بعد طویل ملاقات، اُنھیں قریب سے دیکھنے، عمر اور سال کے اُن کے طویل سفر کے بعد اُنھیں برتنے اور اُن کے اخلاق و کردار اور سلوک اور رویّے کی تہ تک پہنچنے کا موقع ملا، بالخصوص اُس وقت جب کہ میری سمجھ بوجھ کے بھی بال و پر نکل آئے تھے اور زندگی، زمانہ اور اِنسانوں کی شناخت کی کسی قدر اہلیت سے یہ ناچیز بہرہ ور ہو چکا تھا۔ وہاں اِس موقع سے ہفتہ عشرہ قیام رہا۔ تینوں وقت دستر خوان پر، پانچوں وقت نمازِ باجماعت میں، نمازِ فجر کے بعد تفریح میں، نمازِ عصر اور عشا کے بعد درس گاہ سے اُن کی روٹینی پابندی سے آزادی کے اوقات میں، اُن سے بار بار ملنے اور اُن کی سیرت و اخلاق کی تہوں میں جھانکنے کی فرصت مُیسّر آئی، جس سے اُن کے ساتھ میری محبت و عقیدت میں اور اِضافہ ہوا اور بچپن سے جو تعلق اُن سے تھا، وہ اور پختہ تر ہو گیا۔ اِس کے بعد کئی بار ''دارالعلوم ماٹلی والا'' بھروچ ہی کی دعوت پر اور بعض دفعہ اُس علاقے کے دِگر مدرسوں کی تحریک پر وہاں کا سفر ہوا۔ عموماً میری آمد و رفت کے وقت اسٹیشن پر لینے اور رخصت کرنے کے لیے آنے والے دِگر علمائے محترمین کے ساتھ مولانا عبدالحنانؒ بھی تشریف فرما ہوتے، تو میں شرمندگی سے پانی پانی ہو جاتا۔ وہ میرے اس تاثر کے اِظہار پر فرماتے: بھئی! کچھ دیر اور تمھارے ساتھ گزارنے کا موقع مل جاتا ہے، زندگیِ ناپایدار کا کیا بھروسہ کہ کب ہم تم سے اور تم ہم سے نہ مل سکو۔ میں عرض کرتا: حضرت! اللہ آپ سے درازیِ عمر و صحت کے ساتھ اور کام لینے والا ہے؛ اِس لیے آپ پُر اعتماد رہیں۔ فرماتے: لیکن اللہ کے رسول کے ارشادات سے یہی یقین جمتا ہے کہ

زندگی کی بے وفائی اور ناپائیداری کو ہمہ وقت مُستحضر رکھنا چاہیے۔ اُن کے اِس جواب پر میں خاموش رہتا۔

میں نے گجرات کے سفر کے دوران اُنھیں دستر خوان پر پایا کہ ہر جگہ عموماً اور دار العلوم ماٹلی والا بھروچ کے اُس وقت کے مہتمم مولانا محمد یعقوب ولنویؒ (متوفی ۱۱ر رجب ۱۴۲۴ھ مطابق ۸ر اکتوبر ۲۰۰۳ء) کے ہاں خصوصاً جب بھی کسی ڈش کو پسند کرتے، تو بے اختیار سبحان اللہ، سبحان اللہ کی رٹ کے ساتھ پکانے والیوں، پکانے میں معاونت کرنے والیوں اور اُن تمام مرد و خواتین کو بے پناہ دعائیں دیتے، جن کا اُس کھانے کی تیاری میں کوئی کردار ہوتا۔ اُن کے انداز سے ایسا لگتا کہ وہ کسی بہت خوب صورت شعر یا بے مثال وشان دار ادبی شہ پارے کی داد دے رہے ہوں، اُن کے اِس انداز سے سارے گجراتی بہت خوش ہوتے اور عموماً خواتین اُن کی مزید دعائیں لینے کے لیے، اندرونِ خانہ سے پھر کوئی پیالہ یا کھانے سے بھرا اٹرے بھیج دیتیں۔ کھانے کے دستر خوان پر دعا کا یہ عجیب وغریب اور خوش منظر انداز میرے لیے نیا بھی تھا اور باعثِ تعجب بھی، میں نے وہاں دوستوں سے اپنے اِس استعجاب کا اظہار کیا، تو اُنھوں نے بتایا کہ مولاناؒ کے اِس انداز سے گجرات کا یہ سارا علاقہ واقف ہے اور لوگ دعائیں لینے کے لیے، اِسی طرح پیالوں پر پیالے اور پلیٹوں پر پلیٹیں بھیجتے رہتے ہیں اور وہ خوب خوب دعائیں دیتے اور ہر لقمے پر سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے جاتے ہیں۔

لذیذ یادوں کا تسلسل

اپریل ۱۹۸۹ء (رمضان ۱۴۰۹ھ) میں، اِس ناچیز نے لوگوں کے اِصرار اور اہلِ قریہ کی طلب پر اپنے گاؤں ''ہر پور بیشی''، ضلع ''مظفر پور'' بہار کی بوسیدہ و دیرینہ مسجد کی، جو مسلسل سیلاب کی وجہ سے بے حد خستہ حال ہو چکی تھی، تعمیرِ نو شروع کی، جس کا نام بعد میں ''جامع ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ'' تجویز کیا گیا، تو اُس کی اَساس

گزاری کے لیے مولاناؒ کو دعوت دی، جو اُنھوں نے بہ خوشی نہ صرف قبول کیا؛ بل کہ ایک روز اپنی گاڑی سے اپنے قافلے کے ساتھ فجر بعد ہی تشریف لاکر یہ سعادت مندانہ کام انجام دیا اور اس کے اِتمام کے لیے بڑے مجمع میں دعائیں کیں۔ مولاناؒ کا گاؤں ''بالا ساتھ'' ہمارے ہاں سے صرف ۶-۷ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے؛ لیکن ہمارا گاؤں تاریخ کے نامعلوم وقتوں سے، ہمالیائی نیپالی ندیوں کے پانی کی گزرگاہ ہونے کی وجہ سے، ہمیشہ شدید سیلاب کی زد میں رہا؛ اِس لیے آج بھی وہاں ناپختہ سڑکیں بھی ایسی نہیں کہ صحیح طور پر گاڑی لے کر کوئی انجان آدمی وہاں آسکے؛ لیکن اُنھی ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے مولاناؒ تشریف لائے اور خاصی دیر تک ہمارے ساتھ رہے اور مشقت سے کسی طرح کبیدہ خاطر نہ ہوے۔

ترقی کے اِس دورِ سُرعت وتنُّور میں اِس طرح کی بستی کا انگریز کے مرکزِ توجہ قصبہ ''اَوْ رائی''، ضلع ''مظفر پور'' سے صرف ۲ کلومیٹر پچھّم میں، اِس طرح پچھڑا ہوا پڑا رہنا، ہماری ''ترقی پسند'' حکومت، ''حوصلہ مند'' حکم راں اور چین وروس کو پیچھے چھوڑ کر امریکہ کے مدِّ مقابل کھڑے ہونے کے لیے بے تاب ناخدایانِ ملک کا منھ چڑانے کے لیے کافی ہے؛ لیکن اِحساسِ ذمہ داری ودیانت کے فقدان، وطن سے سچی محبت سے محرومی اور ''دیش بھگتی'' کی جھوٹی دعوے داری کے اِس دورِ نفاق میں کسی طرح کی بھلائی کی امید رکھنا محض کارِ عبث ہے۔

''دار العلوم دیوبند'' میں جب یہ ناچیز خادمِ تدریس اور چیف ایڈیٹر ماہ نامہ ''الداعی'' عربی کی حیثیت سے برسرِ عمل ہونے کی سعادت سے سرفراز ہوا، تو اِس اِثنا میں کئی بار مولانا عبد الحنانؒ اپنے مدرسے ''دار العلوم ماٹلی والا'' بھروچ کے نمایندے کی حیثیت سے دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور ہر بار میری رہایش گاہ ''افریقی منزل قدیم'' نزد چھتہ مسجد، دیوبند، میرے اِصرار پر ناشتے یا کھانے میں آنے کی زحمت گوارا کیا اور میری دیرینہ نیاز مندی، جس کو وہ ''سلیقہ مندی'' کا نام دیا کرتے تھے، حسبِ

سابق بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔

جمعرات - جمعہ: ۲۰-۲۱/محرم ۱۴۲۳ھ = ۴-۵/اپریل ۲۰۰۲ء کی شب میں دہلی میں ہندوستان کے سب سے بڑے فقیہ اور جلیل القدر عالمِ دین اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے کچھ عرصے بعد اواخرِ اپریل ۲۰۰۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے دفتر واقع ''اوکھلا'' نئی دہلی میں ایک تعزیتی جلسہ کیا گیا، جس میں امیرِ شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین مدظلہ نے اِس ناچیز کو بھی مدعو کیا۔ میں اُس وقت شدید بیمار تھا؛ لیکن مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے غیر معمولی تعلق ومحبت کی وجہ سے ٹیکسی کے ذریعے دیوبند سے دہلی پہنچ کر، اُس میں حاضری کی سعادت حاصل کی۔ اتفاق سے اُس میں مولانا عبدالحنان صاحبؒ بھی شریک تھے، میں جلسے کے اختتام پر آنے لگا، تو اُنھوں نے کان میں کہا کہ تمھارے یہاں رابطہ مدارسِ عربیہ کی مجلسِ عمومی کا اِجلاس ہے، میں اُس میں آرہا ہوں، شکر کے عوارض کی وجہ سے اب طبیعت نڈھال رہتی ہے؛ اِس لیے قیام جتنے دنوں رہے گا، تمھارے ہاں رہے گا۔ میں نے عرض کیا: حضرت! یہ تو میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے۔ سہ شنبہ ۳۰/اپریل ۲۰۰۲ء (۱۶/صفر ۱۴۲۳ھ) کو یہ اِجلاس دارالعلوم دیوبند کی مسجد رشید میں ہوا۔ مولاناؒ ایک روز قبل تشریف لے آئے، ۴-۵ روز میرے یہاں ہی قیام فرمایا۔ مجھ سے اُن کی اور اُن سے ملنے آنے والے طلبہ ومحبّین کی جو ٹوٹی پھوٹی خدمت ہوسکی، اُس پر اُنھوں نے بہت دعائیں دیں اور میرے ہر بچے کو بلا بلا کے ملاقات کی اور اُنھیں ''اِنعام'' دیا اور اُن کے سروں پر ہاتھ رکھ کر اُن کی بلائیں لیں۔

اس کے دو تین سال بعد جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ/ جولائی ۲۰۰۶ء میں بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ ونیپال کے طلبہ کی انجمن ''سجاد لائبریری'' نے، اُنھیں سالانہ جلسے میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا۔ مجھے طلبہ نے رات میں اچانک اِس کی اطلاع دی، میں فوراً مہمان خانۂ دارالعلوم دیوبند پہنچا اور مولاناؒ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی، تو فرمایا کہ میرے

عزیز! مجھے یہیں زیادہ آرام ملے گا؛ لیکن صبح کو فجر بعد فوراً ناشتے میں تمہارے ہاں آؤں گا۔ اُن کے ساتھ بہار ہی کے دو تین آدمی اور تھے، جو دہلی سے اُن کے ہم راہ ہو گئے تھے۔ اُن سبھوں کے ساتھ صبح کو ہمارے ہاں تشریف لائے اور ناشتہ کر کے بہت دعا دی اور فرمایا: تمہاری دیرینہ نستعلیقیت اور سلیقہ مندی ہمہ وقت مجھے مستحضر رہتی ہے اور تا زیست رہے گی۔ دیو بند میں؛ بل کہ ہوش کی حالت میں یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔ رہے نام اللہ کا۔

جس وقت مولاناؒ ہماری رہائش گاہ سے جانے کے لیے اپنے جوتے پاؤں میں ڈال رہے تھے، حالی کا یہ شعر بار بار میرے دل کی زبان پر آتا رہا:

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں، جہاں میں

اللہ تعالیٰ مولانا عبد الحنانؒ صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اُن کی خطاؤں اور لغزشوں سے، جن سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں، درگزر فرمائے، اُن کے پس ماندگان واہلِ خاندان ومحبّین ومعتقدین کو صبرِ جمیل واجرِ جزیل عطا کرے اور اُنھیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے اور اُن کے اخلاقِ حسنہ پر کار بند رہنے اور اُن کے وضع کردہ نقشوں میں خوب صورت رنگ بھرنے کی توفیق ارزانی کرے، آمین۔

سوانحی نقوش

❁ مولانا عبد الحنانؒ ۳؍ جنوری ۱۹۳۴ء (۱۶؍ یا ۱۷؍ رمضان ۱۳۵۲ھ) کو اپنے گاؤں "بالاساتھ" ضلع "سیتامڑھی" سابق ضلع "مظفر پور" صوبہ "بہار" میں اِس عالمِ رنگ وبو میں آئے، اُن کے والد ماجد کا نام "حسن توحید" تھا۔

❁ قرآنِ پاک ناظرہ اور ابتدائی اردو وفارسی تعلیم اپنے والد سے گھر ہی پر حاصل کی۔ اس کے بعد کی تعلیم مدرسہ "محمود العلوم" موضع "دملہ" ضلع "مدھوبنی" سابق ضلع "دربھنگہ" نیز "مدرسہ امدادیہ" لہریا سرائے دربھنگہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے برِّ صغیر کی مادرِ مدارس وجامعات دار العلوم دیو بند میں داخل ہوے، جہاں سے ۱۹۵۷ء (۱۳۷۷ھ) میں فارغ ہوئے، مولاناؒ نے دورۂ حدیث شریف شیخ

الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء= ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) سے پڑھا۔ دارالعلوم دیوبند کے آپ کے دِگر اساتذہ میں حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا فخرالحسن مرادآبادیؒ، حضرت مولانا سید فخرالدین احمد ہاپوڑی ثم المرادآبادیؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ، حضرت مولانا معراج الحقؒ دیوبندیؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندیؒ ہیں۔

❁ فراغت کے بعد مولاناؒ شیخ الاسلام حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ کے دست گرفتہ ہوگئے تھے، پھر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا بن یحییٰ کاندھلویؒ سے بیعت ہوے اور حضرت مولانا شاہ ابرارالحقؒ سے بھی اِصلاحی تعلق قائم رہا۔

❁ ۱۹۵۶ء (۱۳۷۵ھ) میں مولاناؒ ''جالہ'' ضلع ''دربھنگہ'' میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوے، اُن کے خسر کا نام حاجی عبدالشکور مرحوم تھا۔

❁ تدریسی زندگی کا آغاز مولاناؒ نے ضلع ''مظفرنگر'' یوپی کے قصبہ ''مورنا'' سے کیا، یہاں ایک ابتدائی مدرسہ قائم فرمایا، دوسال تک اس کی ترقی واستحکام کے لیے سرگرداں رہے۔ اُس کے بعد اپنے مشفق استاذ مولانا فخرالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء--۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء) کے حکم سے اُنھی کے آبائی وطن قصبہ ''عمری کلاں'' مرادآباد، یوپی تشریف لے گئے، جہاں دومدرسوں کے درمیان نااتفاقی اور خلفشار تھا۔ آپ نے اپنی حکمت وتدبر سے دونوں کو ضم کرکے ایک متحدہ مدرسہ اور مضبوط درس گاہ بنادیا۔ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۱ھ) میں عالمِ بے بدل، قائدِ ملت اور رجال ساز عبقری عالم امیر شریعت رابع حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانی قدس سرہ العزیز (۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۳ء-۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء) کے حکم پر امارتِ شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں ایک سال تک اُس کی تنظیم وترقی کے لیے ہنرمندانہ کارنامہ انجام دیا؛ لیکن بہ وجوہ یہاں ایک سال سے زیادہ قیام نہ کرسکے۔

❁ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) اور ۱۹۷۳ء (۱۳۹۳ھ) کے عرصے میں مولاناؒ نے کم وبیش ۱۲سال تک دارالعلوم چھاپی صوبہ گجرات میں تدریسی فرائض انجام دیے، یہاں اُنھوں نے فقہ وحدیث وتفسیر وغیرہ علوم پڑھائے اور شہرت اور قبولیت حاصل کی۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء (ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ) میں وہاں سے مستعفی ہوگئے۔

نومبر ۱۹۷۳ء (ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ) سے شنبہ ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ء (یکم شعبان ۱۴۱۹ھ) تک مولاناؒ نے ''دارالعلوم ماٹلی والا'' شہر ''بھروچ'' (صوبہ گجرات کی مشہور درس گاہ) میں استاذِ حدیث وتفسیر وفقہ کی حیثیت سے نہ صرف تدریسی فرائض انجام دیے؛ بل کہ اُس کی شہرت اور تعمیری وتعلیمی ترقی میں بنیادی اور ٹھوس کردار ادا کیا۔ یہاں کے قیام کے دوران علاقۂ گجرات میں اُن کے محبین ومعتقدین کی تعداد میں بے شمار اضافہ ہوا، مولاناؒ کی تقریروں اور مواعظ حسنہ سے لوگوں کو بے انتہا فائدہ ہوا، شہر ودیہات کا کوئی چپہ ایسا نہیں، جہاں کا اُنھوں نے

دورہ نہ کیا ہو، گاؤں اور شہر کے سارے خواص وعوام اُن کے کام اور نام سے واقف ہو گئے تھے۔

''دار العلوم ماٹلی والا'' سے مستعفی ہونے کے بعد، مولاناؒ اپنے مدرسہ ''جامعہ اسلامیہ قاسمیہ'' بالا ساتھ کی خدمت کے لیے ہمہ تن فارغ ہو گئے۔ اُنھوں نے یہ مدرسہ ۶؍جون ۱۹۸۰ء (۹؍رجب ۱۴۰۰ھ) میں قائم فرمایا، اپنی جانفشانی، تقریری لیاقت، دلوں میں گھر کر جانے کی صلاحیت، کے ذریعے، بہت جلد اِس مدرسے کو بامِ عروج تک پہنچا دیا اور وفات پہلے ہی اس مدرسے کی قرب وجوار میں بہت سی شاخیں قائم ہو گئیں، جن میں ابتدائی عربی وفارسی واردو کے ساتھ ساتھ قرآنِ پاک ناظرہ اور بنیادی تعلیم کا نظم قائم ہوا۔ مرکزی مدرسہ جامعہ قاسمیہ میں دو تین سال سے دورۂ حدیث شریف کی تعلیم کا نظم بھی ہو چکا ہے۔ اِس کے ساتھ اِسی مدرسے سے ملحق وسیع قطعۂ اراضی میں انگلش میڈیم اسکول کی عمارت اور ہاسٹل بھی تعمیر کروایا، جو اُن کی زندگی میں ہی مصروفِ کار ہو چکا تھا۔ مولاناؒ کے بعض مواعظ وخطبات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، چھوٹے چھوٹے رسائل بھی اُنھوں نے اصلاحِ معاشرہ سے متعلق آسان اردو میں تالیف کیے تھے، جو اپنے وقت پر شائع ہوتے رہے ہیں۔

❁ امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ، مسلم پرسنل لا بورڈ اور علاقے کے کئی ایک مدرسوں کے ذمے دار ورکن کی حیثیت سے مولاناؒ نے اپنا ذمہ دارانہ کردار ادا کیا۔

❁ مولاناؒ کے پس ماندگان میں اہلیہ محترمہ کے علاوہ ۵ بیٹیاں اور ۲ بیٹے نیز ۳ بھائی ہیں۔ مولاناؒ نے بہت سے ملکوں کا بار بار دورہ کیا اور کئی بار حج وعمرہ سے شرف یاب ہوے، اُن ملکوں میں سعودی عرب، یوکے، امریکا، کناڈا، پناما، باربدوز، ویسٹ انڈیز، فیجی، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، ری یونین، زامبیا، موریشیش، ملاوی، پاکستان اور نیپال سرفہرست ہیں۔

❁ مولاناؒ کی وفات اپنے وطن ''بالا ساتھ'' میں ۱۷؍جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ = ۱۲؍مئی ۲۰۰۹ء کو ایک بج کر ۲۰ منٹ پر واقع ہوئی اور تدفین دوسرے روز تقریباً دس بجے دن میں بہ روز جمعرات ۱۸؍جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ = ۱۴؍مئی ۲۰۰۹ء کو عام قبرستان میں عمل میں آئی، نمازِ جنازہ مولاناؒ کے بڑے صاحب زادے مولوی قاری حفظ الرحمٰن نے پڑھائی، علما وفضلا وطلبہ اور عام مسلمانوں کے جمِ غفیر نے نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ (*)



(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی شمارہ ۷، جلد ۳۳، رجب ۱۴۳۰ھ = جولائی ۲۰۰۹ء۔ اردو تحریر بہ قلم خود بہ روز بدھ ۱۲ بجے دن، ۹؍جمادی الاخری ۱۴۳۰ھ = ۳؍جون ۲۰۰۹ء جو اردو ٹائمز ممبئی اور دگر متعدد رسالوں اور اخبارات میں شائع ہوئی۔

جامع مسجد دہلی کے شاہی امام

مولانا سید عبداللہ بخاریؒ

۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء - ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

چوٹ کھائی نئی نئی؛ لیکن
بات ہم نے وہی پرانی کی

سال ہا سال کی بیماری اور بڑھاپے کے بہت سارے عوارض کے ساتھ طویل کش مکش کے بعد چہار شنبہ: ۱۴؍رجب ۱۴۳۰ھ مطابق ۸؍جولائی ۲۰۰۹ء کی صبح کو، آل انڈیا میڈیکل سائنسز انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی میں، شاہ جہانی جامع مسجد دہلی کے شاہی امام: مولانا سید عبداللہ بخاریؒ نے آخری سانسیں لیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. انتقال کے وقتِ تقویمِ ہجری کے اعتبار سے اُن کی عمر ۹۰ سال اور تقویمِ عیسوی کے حساب سے ۸۷ سال تھی۔ اُن کا سالِ پیدائش ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء تھا۔

وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، کئی بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا، اُنھیں برین ہیمبرج بھی ہو چکا تھا، اُنھیں شدید تنفّس کی شکایت تھی، سن رسیدگی کی وجہ سے وہ ویسے بھی خاصے نحیف و نزار رہتے تھے۔ انتقال سے ایک ماہ قبل اُن کی حالت خاصی دگر گوں ہو گئی تھی، جس کے بعد اُنھیں یک شنبہ: ۱۳؍جمادی الاُخری ۱۴۳۰ھ مطابق ۷؍جون ۲۰۰۹ء کو آل انڈیا میڈیکل سائنسز انسٹی ٹیوٹ میں داخل کیا گیا جہاں اُن کی بڑی دیکھ ریکھ ہوئی اور چنیدہ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اُن کے علاج پر مامور رہی؛ لیکن وقتِ آخر آ چکا تھا؛ اِس

لیے کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوسکی اور بالآخر وہ وہاں چلے گئے جہاں ہر فردِ بشر کو جانا ہے۔

چہار شنبہ-پنج شنبہ: ۱۴-۱۵؍رجب ۱۴۳۰ھ مطابق ۸-۹؍جولائی ۲۰۰۹ء کی درمیانی شب میں، عشا کی نماز کے بعد اُن کی نمازِ جنازہ، اُن کے فرزندِ اکبر مولانا سید احمد بخاری حال شاہی اِمام جامع مسجد دہلی نے پڑھائی اور ہزاروں غم زدہ عام مسلمانوں، قائدین، علما اور شہر و بیرون شہر سے آئے ہوے سوگواروں کی موجودگی میں جامع مسجد کی مغربی جانب اُن کے خاندانی مقبرے میں اُنھیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

مرحوم کے پس ماندگان میں، اُن کی اہلیہ محترمہ، دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں: مولانا سید احمد بخاری، سید یحییٰ بخاری، سید طارق بخاری، سید حسن بخاری۔

مولانا سید عبداللہ بخاری نے پیہم ۲۷ سال امامت و خطابت کا فریضہ انجام دیا، اُنھیں اُن کے والد بزرگوار مولانا سید عبدالحمید بخاریؒ(۱) نے بہ روز یک شنبہ: ۶؍رجب ۱۳۹۳ھ مطابق ۸؍جولائی ۱۹۷۳ء کو علما و منتخب اعیانِ شہر کی موجودگی میں باقاعدہ طور پر امامت و خطابت کے عہدے سے سرفراز کیا تھا۔ مرحوم جامع مسجد کے ۱۲ویں شاہی امام تھے، وہ اپنے اِس عہدے سے اپنے بڑے لڑکے مولانا سید احمد بخاری کے حق میں رسمی طور پر بہ روز شنبہ: ۱۵؍رجب ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۴؍اکتوبر ۲۰۰۰ء کو سبک دوش ہو گئے تھے۔ اِس تقریب میں، حرم مکی کے امام و خطیب اور اُمورِ حرمین کے صدر نشین شیخ محمد بن عبداللہ سبیّل کے نمایندے شیخ محمد عبدالرحمٰن المرشد، سفراے بلادِ عربیہ اور بہت سے علما اور اِسلامی انجمنوں و تنظیموں کے قائدین نے شرکت کی تھی۔

جامع مسجد کے اولیں شاہی امام مرحوم کے جدِّ اعلیٰ سید عبدالغفور بخاری تھے، جو "بخارا" سے تشریف لائے تھے اور شاہ جہاں نے اُنھیں اِس عظیم مسجد کا امام مقرر کیا تھا۔ ۱۶۵۶ء/۱۰۶۶ھ میں جب یہ جامع مسجد مغل شہنشاہ شاہ جہاں (۱۰۰۱ھ/۱۵۹۳ء-

(۱) پیدائش: ۱۳؍ربیع الاول ۱۳۱۰ھ مطابق ۵؍اکتوبر ۱۸۹۲ء بہ روز چہار شنبہ، وفات: ۵؍صفر ۱۳۹۶ھ مطابق ۶؍فروری ۱۹۷۶ء بہ روز جمعہ، پونے دو بجے دوپہر، اُنھوں نے تقریباً ۶۵ سال امامت کی۔

۱۰۷۷ھ/ ۱۶۶۶ء) کے حکم سے دس لاکھ روپے کی لاگت سے ۶ سال کی مدت میں بن کر تیار ہوئی، جس کے دوران ۵۰۰۰ اعلیٰ پایے کے معمار و مزدور شب و روز اُس کی تعمیر میں لگے رہے، تو شاہ جہاں نے (جن کا دورِ حکومت ۱۰۳۶ھ/ ۱۶۲۷ء تا ۱۰۶۸ھ/ ۱۶۵۸ء رہا تھا) شاہِ ''بخارا'' کے پاس قاصد بھیجا کہ ہمیں ایک نجیب الطرفین، عمیق العلم، متقی و خدا ترس امام چاہیے۔ اُنھوں نے اِس کے لیے مولانا سید عبدالغفور بخاری کا انتخاب کیا۔ مولانا سید عبدالغفور بخاری نے یکم شوال ۱۰۶۶ھ/ ۲۴ جولائی ۱۶۵۶ء کو جامع مسجد میں شاہ جہاں، اُن کے وزرا اور اُمرائے سلطنت کو عید الفطر کی نماز پڑھائی۔ بادشاہ نے اُنھیں اِنعام و اِکرام سے نوازا اور ''شاہی امام'' کے لقب سے سرفراز کیا۔

جرأت و بے باکی میں یکتائے روزگار

مولانا سید عبداللہ بخاری اپنی جرأت و بے باکی کے لیے مشہور تھے۔ وہ چند سال قبل تک مسلمانوں کی مظلومیّت اور اُن کی حق تلفی کے خلاف اُٹھنے والی واضح اور نمایاں آواز کی حیثیت رکھتے تھے؛ اِسی لیے تمام مسالک و نقطہ ہائے نظر کے مسلمان، اُن کی بے پناہ عزت کرتے تھے؛ چناں چہ جیسے ہی اُن کی وفات کی خبر عام ہوئی دہلی کے سارے مسلم علاقوں، بالخصوص جامع مسجد کے وسیع تر اطراف پر غم و الم کا بادل چھا گیا، دکانیں اور اسکول بند ہوگئے، تجارتی سرگرمیاں موقوف ہوگئیں، سارے قابلِ ذکر قائدین وسیاست داں اور مسلم تنظیموں کے ذمے داروں کا رخ جامع مسجد کی طرف تھا، جو اُن کے پس ماندگان، بالخصوص اُن کے جانشیں مولانا سید احمد بخاری سے تعزیت کرنے کے لیے بڑی تعداد میں آتے رہے، جس سے اُن کی غیر معمولی عوامی مقبولیّت کا اندازہ ہوتا تھا۔ میرے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں وہ مسلمانوں کے تنہا قائد تھے، جن کی وفات پر تعزیت کے لیے دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، شیعہ اور دگر مسالک کے قائدین کسی تکلف کے بغیر جامع مسجد آئے اور یکے بعد دیگرے، اُن کے پس ماندگان سے ملے اور

شریکِ غم ہوے۔ یہ بات بہ طورِ خاص نوٹ کرنے کی ہے؛ کیوں کہ عموماً بڑے سے بڑے آدمی کی وفات پر کسی ایک ہی مسلک کے مسلمان یا سیاسی پس منظر رکھنے کی صورت میں غیر مسلم حضرات پُرسا کے لیے آتے ہیں، دوسرے مسلک کے لوگ شاذ و نادر ہی آتے ہیں اور اخبار و رسائل میں بھی تعزیتی پیغام نہیں دیتے۔

۱۹۷۱-۱۹۷۲ء میں، یہ راقم الحروف دہلی میں طالبِ علم تھا، اُس وقت با قاعدہ امام تو مولانا سید عبداللہ بخاری کے والدِ بزرگ وار مولانا سید عبدالحمید بخاری (۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء - ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) تھے، جن کی نیکی، سادگی اور بے نفسی، زبان زدِ خاص و عام تھی۔ لاتعداد نمازیں اُن کے پیچھے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، جن میں جمعہ کی نمازیں بہ طورِ خاص لائقِ ذکر ہیں۔ عصر و مغرب کی اکثر نمازیں ہم جامع مسجد ہی میں ادا کرتے تھے۔ مولانا سید عبداللہ بخاری بھی با قاعدہ امام نہ ہونے کے باوجود وقتاً فوقتاً امامت کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں یہ ناچیز دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں، مدرس ہوگیا۔ ۱۹۷۳ء میں، مولانا بخاری جامع مسجد کے باضابطہ اِمام مُنتخَب ہوے اور دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف وہ جامع مسجد کے منبر و محراب پر؛ بل کہ ملک کی مسلم قیادت کے منبر پر بھی چھا گئے۔ میں لکھنؤ میں بیٹھا حالات و واقعات کی اِسکرین پر اُن کی تیز رفتار شہرت و اعتبار کی تصویریں مسلسل دیکھتا رہتا تھا۔ اُن کی بے باکانہ تقریریں، مسلمانوں اور دبے کچلے طبقوں کے خلاف، حکومت کے ظلم و نااِنصافی کے رویّوں پر اُن کے پُرزور احتجاج اور اُن کے گرجنے و چنگھاڑنے کی صدا نہ صرف پوری دہلی، بل کہ ملک کے اطراف و اکناف میں سنائی دیتی تھی۔ اِحساسِ مظلومیّت کے بے طرح دباؤ میں جینے والے مسلمان، مولانا بخاری کی طاقت ور آواز اور پاٹ دار احتجاج سے اپنے اندر غیر معمولی طاقت محسوس کرتے تھے۔ اُن کے پُرزور احتجاج کی صدائیں حکومتِ وقت کی اعلیٰ قیادت اور اَربابِ سیاست و اقتدار کے کانوں سے بھی بار بار ٹکراتی اور اُنھیں جھنجھلاہٹ پر آمادہ کرتی تھیں، بالخصوص خاتونِ آہن ''اِندرا گاندھی'' (پ: ۱۹ر نومبر

1917ء مطابق ۳؍ربیع الاول ۱۳۳۶ھ، م ۳۱؍اکتوبر ۱۹۸۴ء مطابق ۴؍صفر ۱۴۰۵ھ) کے لیے وہ سوہانِ روح ثابت ہوتی تھیں۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں کے دفاع، اُن کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج اور اُنھیں آزادی کے بعد سے مسلسل لگنے والے کچوکوں کے تعلّق سے فریاد چاہنے والی سب سے زیادہ پُرزور اور پُرشور اور کسی بھی ذاتی مصلحت سے سب سے زیادہ بے پرواہانہ آواز، امام صاحب ہی کی آواز بن گئی اور بہت جلد اُن کی آواز نے خاصا اعتبار و وقار حاصل کرلیا اور اُن کی عوامی مقبولیّت کے ساتھ وہ خاصی وزن دار بن گئی۔ اب وہ محض کسی منبر و محراب میں گونجنے والی آواز کے مالک نہ تھے؛ بل کہ ملک کے گوشے گوشے میں سنی جانے والی للکار والے قائد بن گئے جس کا مسلمانوں، بالخصوص مسلم عوام کے دلوں میں اِتنا احترام تھا کہ بعض اُن قائدین کا بھی نہ تھا، جو امام سید عبداللہ بخاری کی بہ نسبت بہ درجہا علم و فکر، سیاسی پختہ کاری، قائدانہ تجربہ اور اجتماعی خدمت کے میدان میں طویل تجربے کے مالک تھے یا سمجھے جاتے تھے؛ کیوں کہ وہ مصلحت کوشی کے بغیر، جس جرأتِ رندانہ کے ساتھ، مسلم مسائل کے لیے گرجتے تھے، اُس کی وجہ سے نہ صرف مسلم عوام کے نزدیک؛ بل کہ حکومتِ وقت کے نزدیک بھی بلند قامت، باوقار شخصیت، ''خوف ناک'' آواز اور ناقابلِ نظر انداز احتجاج کے حامل قائد بن گئے تھے، حال آں کہ علم و تجربہ، فکری گہرائی، سیاسی بصیرت اور قائدانہ حکمت کے حوالے سے، وہ اب بھی بہت سے لوگوں کے نزدیک کوتاہ قامت ہی شمار کیے جاتے تھے۔

مسلمانوں کی تکلیف کو دیکھ کر تڑپ اٹھنے والے

مولانا بخاری کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ مسلمانوں کو لگنے والے کسی زخم کو دیکھیں اور بے تابانہ تڑپ نہ اُٹھیں۔ وہ ظلم و ناانصافی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تو بہت ہی بُری

طرح گرجتے تھے، اُس وقت اُن کا غصّہ دیدنی ہوتا تھا۔ وہ اِس سلسلے میں اپنے ذاتی مفادات کا خیال کرتے تھے، نہ حکومتِ وقت کی داروگیر سے ڈرتے تھے، نہ فوج و پولس کے ذریعے گرفتاری سے گھبراتے تھے۔ حکومت کے تئیں اُن کا انداز، ہمیشہ چیلنج کرنے اور اپنے خاص اندازِ خطابت سے مشتعل کرنے اور اپنے نرالے ''فریاد کناں'' انداز سے اُس کی اَنا کو ٹھیس پہنچانے کا ہوتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا بے باکانہ اور مصلحت سے بے پرواہانہ انداز کسی قائد یا سیاست داں کا نہیں دیکھا۔ بعض دفعہ مفادات کا خیال رکھنے والے اور حکومت کی طرف سے پیش آنے والی گرفتاری کے خطرات کو پیشِ نظر رکھنے والے قائدین، بخاری صاحب کی جرأتِ بے باکانہ کو ناعاقبت اندیشی، سیاسی غباوت، زندگی اور اُس کے مسائل سے نمٹنے کے طریقوں سے حد درجہ ناواقفیت اور مسلمانوں کے مفادات کے تئیں احمقانہ رویّے سے تعبیر کرتے تھے۔ میں عام لوگوں کی زبان سے، اِس قسم کے تبصرے بہت سنتا تھا، اخبارات میں بھی بعض دفعہ اُن پر سخت تنقیدیں کی جاتی تھیں؛ لیکن ذاتی طور پر مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مولانا بخاری نہ تو بے وقوف تھے اور نہ ہی سیاسی آگہی اور قائدانہ بصیرت سے عاری اور نہ ''فریاد کرنے'' کے موقع و محل سے ناآشنا؛ لیکن وہ صاف دل آدمی تھے، اُن میں حالات اور ظلم و ناانصافی پر چیخ اُٹھنے کے حوالے سے بچوں کی سی معصومیّت تھی، عوام کی سادگی تھی اور پیچیدگیوں کی فطرت پر نہ پیدا ہونے والے لوگوں کا سا عام انداز تھا؛ اِسی لیے وہ مسلمانوں کو درپیش ظلم و جور کے تئیں بے ساختہ طور پر بے چین ہو جاتے تھے۔ جب کہ ''عقل مند'' سیاست داں اور قیادت راں حضرات ''فریاد'' کرنے میں بھی موقع و محل کا خیال رکھتے ہیں۔ مولانا بخاری کو اِس کا بہت اِحساس تھا کہ آزادی کے بعد سے حکومت میں رہنے والوں کے چہرے تو بدل جاتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے تعلق سے اُن میں سے کسی کا رویّہ تبدیل نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ رویّہ تبدیل ہو، ورنہ کم از کم ہم تبدیل کرنے کے لیے اُنھیں اِس طرح تو ضرور مجبور کرتے رہیں کہ وہ ایک نہ

ایک دن اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

مولانا بخاری کی یکتائی کا راز و آغاز

۲۶/جون ۱۹۷۵ء (۱۵/رجب ۱۳۹۵ھ) کو ہندوستان کی وزیر اعظم ''اندرا گاندھی'' نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کر کے بڑے بڑے قائدین و سیاست دانوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا اور فیملی پلاننگ کے سخت احکامات جاری کر کے مرد و خواتین کی طاقت کے بل پر، بلا استثنا نس بندی کرنے کا استبدادی حکم دیا۔ ہندوستان کے باشندے اپنی زندگی میں شاید ایسے تجربے سے کبھی گزرے تھے، نہ اِس کے متعلق سنا تھا۔ ملک میں یہ ایسی صورتِ حال تھی، جو آزادی کے بعد کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہ اندازِ سیاست و حکومت سامراجی دور کی یاد تازہ کرتا تھا اور دورِ غلامی کا بھیانک نقشہ ہر شہری کی آنکھوں کے سامنے ہمہ وقت پھرتا رہتا تھا۔ ملک کے پہلے وزیرِ اعظم اور سیکولر ہندوستان کی بنیادیں استوار کرنے والے پنڈت نہرو (۱۸۸۹-۱۹۶۴ء) کی بیٹی نے ظلم و جبر کا ایسا کھیل کھیلا کہ لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ عزیزوں کو ذلیل کرنے کی ایسی طرح ڈالی گئی کہ ہر شہری اپنی جگہ بلا اختلافِ مذہب و ملت کانپ اٹھا، لوگ پولس والوں کی پکڑ کے ڈر سے راتوں کو کھیتوں اور اپنی کھلیانوں میں چھپے دبکے رہتے تھے، بہت سے لوگوں کی زمینیں اور جایداد بلا کسی قانون کے ناجائز طور پر ہڑپ کر لی گئی، دہلی میں بالخصوص متعدد مسلم علاقوں کو اجاڑ کے، ساری جایداد کو بہ حقِ سرکار ضبط کر کے، اُس پر سرکاری کالونیاں تعمیر کر لی گئیں، مسلم نوجوان بہ طورِ خاص نشانہ بنے ہوئے تھے، پولس اور فوج کی طاقت کے ذریعے حکومت چلائی جا رہی تھی، کس کو کب اٹھا کے کہاں اور کتنے دنوں کے لیے بند کر دیا جائے گا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ پورے ملک پر خوف و ہراس طاری کر دیا گیا، بڑے بڑے رہ نماؤں کے اعصاب جواب دے گئے۔ چوں کہ قابلِ ذکر سارے رہ نماؤں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو جیل میں بند کر دیا گیا تھا؛ اِس لیے

کوئی فریاد کرنے والا اور فریاد سننے والا بھی نہ تھا؛ اِس لیے عوام بے حد سراسیمہ تھے۔

پولس والوں کا آہنی ہاتھ مولانا بخاری مرحوم پر بھی دراز ہوا اور اُنھیں بھی دہلی کی تہاڑ جیل میں ڈال دیا گیا اور اُنھیں بُری طرح زدوکوب کرکے، اُن کے کپڑے تک پھاڑ دیے گئے؛ کیوں کہ یہ شیر کی طرح جامع مسجد کے منبر سے آخر دم تک چنگھاڑنے والی خوف ناک آواز تھے، جس سے ''اندرا گاندھی'' کا پِتّا پانی ہو رہا تھا۔

اُن کی گرفتاری، اندرا گاندھی کے بڑھتے ہوئے ظالمانہ وجارحانہ اندازِ کار میں آخری کیل ثابت ہوئی، نہ صرف پوری دہلی؛ بل کہ سارا ملک اُن کی گرفتاری کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان اور کیا بڑی ذات اور کیا چھوٹی ذات، ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگوں نے متحد ہوکر حکومت پر ایسا زبردست دباؤ ڈالا کہ اُس کے پاؤں اُکھڑ گئے، دو ہفتے کے بعد اُنھیں بالآخر رہا کر دیا گیا۔ اب اُن کی آواز پہلے سے زیادہ گھن گرج بن گئی اور اُس میں پہلے سے زیادہ طاقت وقوت پیدا ہوگئی، اب اُس کو ہندو اور مسلمان مشترک طور پر سننے لگے؛ کیوں کہ اب وہ ظلم وجبر کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں کے نمایندے بن گئے تھے۔

ایمرجنسی کی سختیوں نے ہندو مسلمان کو ایسا متحد کر دیا تھا کہ اُس کی نظیر اِس ملک میں پہلے دیکھی گئی نہ بعد میں، سارا ملک اندرا گاندھی کے خلاف بہ یک زبان احتجاج بن کر کھڑا ہوگیا، جس کی وجہ سے ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کا حکم واپس لینا پڑا اور عوام کے مطالبے کے مطابق انتخابات کا اعلان کرنا پڑا۔ ساری سیاسی پارٹیاں ''جنتا پارٹی'' کے نام سے متحدہ محاذ بنا کر کانگرس کے خلاف انتخابات میں اُتریں۔ اندرا کے خلاف طاقت ور دلت رہ نما جو ہمیشہ کانگرس کے خادم رہے تھے اور اندرا کے بڑے وفادار سمجھے جاتے تھے یعنی ''بابو جگ جیون رام'' (۱۹۰۸-۱۹۸۶ء) بھی بغاوت پر آمادہ ہوگئے، اُنھوں نے اپنی سرکاری رہائش گاہ پر پرہجوم پریس کانفرنس کی، جس میں بہت سے قائدین کے ساتھ ساتھ ایک بڑے سابق کانگریسی رہ نما ''ہیم وتی نندن بہوگنا'' (۱۹۱۹-۱۹۸۹ء) بھی شریک ہوئے نیز اندرا

کی حقیقی پھوپھی اور جواہر لال نہرو کی ہمشیرہ ''وجے لکشمی پنڈت'' (۱۹۰۰-۱۹۹۰ء) نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ الغرض ''جنتا پارٹی'' نے پورے جوش وخروش سے انتخابات لڑا۔ مولانا بخاری نے پورے ملک کا اُس کی تائید وحمایت کے لیے دورہ کیا، ہر جگہ اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اُنھوں نے بڑے بڑے عوامی انتخابی جلسوں کو خطاب کیا، پورا ملک ایک دھاگے میں پرویا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اُس وقت لکھنؤ میں تھا اور بڑے جذبے کے ساتھ اِن جلسوں میں شریک ہوتا تھا، بڑا اچھا منظر تھا، میں نوجوان تھا اور بار بار میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ کاش یہ اتحاد ویگانگت پایدار ثابت ہو، تو اِس ملک سے سارے فرقہ وارانہ جھگڑے اور رگڑے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گے اور یہ ملک یہاں کے ہر مذہب کے شہریوں کے لیے جنت نما ثابت ہوگا۔

جنتا پارٹی بھاری اکثریّت سے کام یاب ہوئی اور کانگریس کو اِس ملک میں پہلی بار ذلت آمیز ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ ''مرارجی ڈیسائی'' (۱۸۹۶-۱۹۹۵ء) ملک کے وزیر اعظم مُنتخَب ہوے اور اُن کی قیادت میں جنتا پارٹی نے دہلی کے ''رام لیلا'' میدان میں اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے زبردست تاریخی جلسہ کیا، جو انسانوں سے کھچا کھچ بھر گیا، ساری جماعتوں اور فرقوں کے رہ نماؤں نے اِس جلسے میں شرکت کی اور خوشی ومسرت اور جذباتِ فتح مندی کے ساتھ تقریریں کیں، جن میں وزراے وقت نے بڑے بڑے وعدے کیے اور عوام کو سنہرے وشیریں خواب دکھائے اور یہ بتایا کہ اب اِس ملک کی قسمت بدلنے والی ہے، ظلم وجور کا یکسر خاتمہ ہو چکا ہے اور اندرا گاندھی کا جارحانہ دور اب کبھی عود نہیں کرنے کا۔

اِس جلسے میں مولانا بخاری بھی شریک ہوے، وہ جس وقت اسٹیج پر تشریف لا رہے تھے، اتفاق سے جنتا پارٹی کی حکومت میں وزارتِ خارجہ کا عہدہ سنبھالنے والے اٹل بہاری واجپائی صاحب (جو بعد میں ابھی چند سال قبل ملک کے وزیر اعظم بھی رہے) محوِ خطاب تھے، جیسے ہی بخاری صاحب پر نظر پڑی، فرمایا کہ اب بخاری صاحب تشریف

لا چکے ہیں اِن کے بعد اب میری چنداں ضرورت نہیں، اب آپ اِنھیں سنیے۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے فوراً اپنی بات ختم کر دی۔

مولانا بخاری کی تاریخی تقریر

مولانا بخاری صاحب نے اِس تاریخی جلسے میں، تاریخی انداز میں اپنے خطاب میں ''مرار جی ڈیسائی'' وزیرِ اعظمِ ہند کو مخاطب کرتے ہوے فرمایا کہ اندرا گاندھی کے خلاف متحدہ انقلاب کے نتیجے میں آج ''جنتا پارٹی'' برسرِ اقتدار آ چکی ہے؛ کیوں کہ ظلم و جارحیت نے اُن کا تختہ پلٹ دیا۔ ہندوستانی عوام کے مثالی اتحاد اور ہم سبھوں کی متحدہ طاقت و رکوششوں کے طفیل یہ سب کچھ ممکن ہوا؛ لہٰذا اربابِ اقتدار کان کھول کر سن لیں کہ اگر اُنھوں نے کج روی اختیار کی اور اندرا گاندھی کی روش پر ذرا بھی چلنے کی کوشش کی، تو جیسے ہم نے اُنھیں الٹ دیا ہے، اِنھیں بھی پلٹ دیں گے۔ دیکھیے ہم آپ سے اپنا حق مانگتے ہیں، بھیک نہیں مانگتے، مسلمانوں کو بہ طورِ خاص کچلا گیا ہے، آپ اُنھیں اُن کا مارا ہوا سارا نہ سہی ضروری حق ضرور دیجیے، ہم شہری کی حیثیت سے حقوق و واجبات میں مساوی ہیں؛ لیکن ہمارے ساتھ دوہرا پیمانہ اختیار کیا گیا؛ لیکن اب اِس حکومت میں، جس کے قیام میں، میں ذاتی طور پر بھی شریک رہا ہوں کوئی ظلم ہمیں گوارا نہ ہوگا۔

مولانا بخاری کی للکار سن کر سارے زُعَما، جو اسٹیج پر موجود تھے، سناٹے میں آ گئے اور اُنھیں لگا جیسے کسی نے اُن کی زبردست گوش مالی کر دی ہو؛ کیوں کہ اُنھیں اندازہ نہ تھا کہ بخاری صاحب اِس بڑے مجمع میں کھلے طور پر اُنھیں کھری کھری سنا دیں گے اور اپنی مثالی اور روایتی صاف گوئی و بے باکی کا انداز اِس وقت بھی زبان انداز نہیں کریں گے۔ وہ واقعی بے لاگ اور بے داغ سیرت کے حامل قائد تھے اور ''عقلِ عیّار'' کی کسی بات کو کسی وقت ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے؛ کیوں کہ ضمیر کی پاکیزگی اور جراحتِ دل کا گہرا احساس اُنھیں جنونِ بے خطر کے اِشاروں پر چلنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

اور واقعتاً وہی خطرہ درپیش ہوا، جس کا مولانا بخاری کو اِحساس تھا کہ جنتا پارٹی کی حکومت نے بالخصوص مسلمانوں کے تئیں اپنے وعدے پورے نہیں کیے۔ ایک تو یہ ہر طرح کے خیال کے زُعما کا اتحاد تھی جس میں جن سنگھ پارٹی اور آر ایس ایس کے لوگ بھی شامل تھے اور مسلمانوں کی تایید وشراکت بھی تھی، چناں چہ مولانا بخاری کو اِس حکومت کے خلاف بھی بہت جلد اپنی آواز بلند کرنی پڑی، جیسے وہ اندرا کی حکومت کے خلاف کرتے رہتے تھے، حتیٰ کہ بعض ذمے دارانِ حکومت سے اُنھیں سخت کلامی بھی کرنی پڑی، بعض ذمے داروں پر خاص انداز میں اپنا ڈنڈا بھی اُٹھالیا؛ کیوں کہ اُنھوں نے اندرا کی حکومت کو گرانے اور اِس حکومت کو بنانے میں بہ طورِ خاص مثالی کردار انجام دیا تھا۔ اُنھوں نے بعض اربابِ حکومت کو صاف صاف کہہ دیا کہ تمھاری حکومت بہت جلد جانے کو ہے؛ کیوں کہ ہندوستانی سیاست کی خاک میں تمھاری کوئی مستحکم جڑ نہیں ہے، اِس کے باوجود تم اپنی من مانی کرنے پر بہت جلد اتر آئے ہو، قانون کا خیال ہے، نہ دستور کا۔ جب اندرا گاندھی کو مضبوط اور مستحکم سیاسی پس منظر کے باوجود، حکومت سے بے دست کیا جاسکتا ہے، تو تم کس کھیت کی مولی ہو؟!۔

قیادت سازی میں مولانا کا تاریخی رول

اور وہی ہوا جو مولانا بخاری نے کہا چناں چہ اپنی میعاد پوری کیے بغیر جنتا پارٹی کی حکومت کو عام انتخابات کا اعلان کرنا پڑا، ۱۹۸۰ء میں یہ انتخابات منعقد ہوے۔ اندرا گاندھی کو مولانا بخاری کی طاقت اور عوامی مقبولیّت کا اندازہ ہو چکا تھا؛ اِس لیے وہ اُن سے رجوع ہوئیں اور اِس یقین دہانی کے ساتھ اُن سے تایید وحمایت کی طالب ہوئیں کہ سابقہ غلطیوں کو وہ ہرگز نہیں دہرائیں گی اور اگر وہ دوبارہ برسرِ اقتدار آتی ہیں تو غلطیوں کی تلافی اپنے مثبت اور تعمیری ومنصفانہ اِقدامات سے کریں گی۔ اندرا گاندھی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھیں، شدّتِ غم سے اُن کا برا حال ہو چکا تھا کہ باپ دادا سے وراثت میں

ملی ہوئی حکومت اُن کے ہاتھ سے چلی گئی تھی، جس کو وہ مطلق العنان بادشاہ کی طرح چلایا کرتی تھیں اور اُنھیں یہ فراموش ہوگیا تھا کہ وہ عوام کی مُنتخَب نمایندہ ہیں۔

بہ ہر کیف اندرا گاندھی نے ملک کے طول وعرض کا سفر کیا، ہر جگہ وہ عوام کے ہر طبقے سے ملتیں اور گذشتہ غلطیوں پر معذرت خواہ ہوتیں اور اِس انتخاب میں جِتانے کی درخواست کرتیں۔ مولانا بخاری نے بھی، ان کے لیے بہت سی جگہوں کا دورہ کیا اور دہلی میں بھی اپنی تقریروں میں عوام کو اندرا کا ساتھ دینے کی اپیل کی، دگر مسلمان قائدین اور غیر مسلم سیکولر زُعَما نے بھی اُن کا اِس انتخاب میں ساتھ دیا، چناں چہ وہ جیتیں اور اُن کی کانگرس پارٹی کی حکومت بنی۔ کچھ دنوں تو اُنھوں نے مسلمانوں کے حق میں اچھا رویّہ اپنایا؛ لیکن جلد ہی وہ بیچ راہ سے لوٹ آئیں اور اب اُنھوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلم اقلیّت کو خوش کرنے کی بہ جائے حکومت کے استحکام کی راہ یہ ہے کہ اکثریّت ہی کو ہر طرح نوازا جائے؛ کیوں کہ یہ غالب اکثریت جو ۸۰ فی صد ہے اگر خوش رہی، تو میری حکومت کا کوئی بال بیکا نہ کرسکے گا۔ اب اُنھوں نے بابری مسجد اور اجودھیا کی طرف دیکھا اور رام مندر کے مسئلے کو اکثریّت کی خوشی کا طاقت ور ذریعہ باور کرکے ہندو زُعَما کو اُکسایا کہ تم اِس کے لیے احتجاج کرو اور ملک کے طول وعرض میں مظاہرے کرو، چناں چہ ایسا ہی ہوا اور ہر جگہ فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے، جن میں مسلمانوں کی حسبِ سابق خوب خوب ''تواضع'' کی گئی۔ ساتھ ہی اندرا نے اِس سے بڑی اور بہت بُری ایک اور حماقت یہ کی کہ سکھوں کی ''خالصتان'' کی تحریک کو کچلنے کے لیے، اُن کے مقدس شہر اور اُن کی سب سے مقدس عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل پر فوج کشی کردی اور اُس کو یکسر مسمار کردیا۔ سکھوں نے متحدہ طور پر اُسی دن یہ طے کرلیا کہ دیر یا سویر اندرا گاندھی سے، اِس کا بدلہ لینا ہے۔ چناں چہ ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اُن کے محافظ دستے کے ایک سکھ سپاہی نے قریب سے اُن پر گولیوں کی بوچھار کردی اور اُن کی رہایش گاہ ان کا مقتل بن گئی۔

سارے ملک کے ہندو، سکھوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوے اور اُنھیں نہ صرف

یہ کہ چُن چُن کے قتل کیا؛ بل کہ اُن کی اَملاک کو لوٹا، مکانات کو نذرِ آتش کیا اور اُنھیں ہر طرح ستایا۔ مجھے یاد ہے کہ پورے ملک کی زمین سکھوں کے لیے، اُس وقت بُری طرح تنگ ہوگئی تھی اور اُس وقت دونوں فرقے: ہندو اور سکھ مسلمانوں کو بہت اچھا سمجھنے لگے تھے؛ کیوں کہ دونوں یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اُس میں مسلمان کسی طرح بھی شریک نہیں ہیں۔ چوں کہ اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے اُن کے خاندان کے لیے ہمدردی کی عام لہر پیدا ہوگئی تھی؛ اِس لیے اُن کے بڑے لڑکے ''راجیو گاندھی'' (۱۹۴۴ - ۱۹۹۱ء) بھاری اکثریّت سے جیتے اور ایک بار پھر کانگریس کی حکومت برسرِ اقتدار آ گئی۔

''راجیو گاندھی'' نے اپنی حکومت میں بہت سے فتنے کھڑے کیے، جن سے مسلمانوں کی توانائیاں بُری طرح ضائع ہوئیں۔ ''شاہ بانو'' کا مشہور مسئلہ اُنھیں کے دور میں پیدا کیا گیا؛ تا کہ گدلے پانی میں شکار کیا جا سکے۔ اُس میں مسلمانوں کو کچھ ''چارا'' دے دیا گیا، تو دوسری طرف اُنھی ''راجیو گاندھی'' نے یکم فروری ۱۹۸۶ء کو بابری مسجد کا ہندوؤں کے لیے تالا کھلوا دیا، جو دونوں فرقوں: ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بند تھی کہ نہ مسلمان اُس میں نماز پڑھ سکتے تھے نہ ہندو پوجا کر سکتے تھے۔ اب ہندوؤں نے کھلے عام اُس میں پوجا پاٹ شروع کر دی۔

اِن ساری ناانصافیوں اور فتنہ سامانیوں کے خلاف، مولانا بخاری حسبِ سابق گرجتے اور اپنے مخصوص انداز میں اپنا احتجاج درج کراتے رہے۔ جب بابری مسجد کو ہندوؤں کے لیے کھول دیا گیا، تو مسلمانوں نے دہلی کے ''بوٹ کلب'' میں زبردست مظاہرہ کیا، جس میں ۵ لاکھ مسلمان شریک ہوے۔ اُس کی قیادت سید شہاب الدین کے ساتھ مولانا بخاری نے بھی کی اور اُن کی وہاں بھی زبردست تقریر ہوئی، جس کا حکومت پر خاصا اثر پڑا اور جو کچھ وہ غالبًا اُسی وقت کر لینا چاہتی تھی، وہ نہ کر سکی۔

۱۹۸۹ء کے انتخابات میں مسلمانوں کی عام ناراضگی اور مولانا بخاری کی مخالفت

اور دگر قائدین کے آڑے آنے کی وجہ سے ''راجیو گاندھی'' کو زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی اور ''وشوناتھ پرتاپ سنگھ'' (۱۹۳۱-۲۰۰۸ء) وزیر اعظم بنے، جنھیں مولانا بخاری کا آشیرواد حاصل تھا۔ اُنھوں نے مولانا بخاری کے کئی مطالبے پورے کیے اور متعدد ایسے اقدامات کیے، جن سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی مسماری کے بعد پورے ملک میں فسادات برپا کر کے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا تو باوجودے کہ بخاری صاحبؒ خاصے بوڑھے اور کمزور ہوگئے تھے؛ لیکن وہ حسبِ سابق نہ صرف گرجے؛ بل کہ بہت سے مظاہروں کی قیادت کی اور دگر قائدین کے ساتھ ظلم و جبر کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔

مولانا بخاری مَرے بعد زندہ رہیں گے

دسیوں سال سے مولانا بخاریؒ اپنی سن رسیدگی اور امراض کی وجہ سے گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے تھے؛ لیکن وہ اِس حالت میں بھی مسلمانوں کو پہنچنے والی کسی تکلیف کو سن کر تڑپ اٹھتے تھے اور اُس کے مداوا کے لیے اُن سے جو بن پڑتا تھا، کرتے رہتے تھے۔

مولانا بخاریؒ اب اِس دنیا میں نہیں رہے اور کس کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے، لیکن یہ اُن کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد بھی اپنی جرأتِ گفتار اور اپنی عوامی مقبولیّت کے طفیل تادیر زندہ رہیں گے۔ مرنے کے بعد وہی لوگ زندہ رہتے ہیں، جو زندہ رہتے ہوے، مرنے کے بعد زندہ رہنے کا سامان کر جاتے ہیں اور اپنے بعد زندہ رہنے والوں کے دلوں میں یادوں کے بہت سے نقوش ثبت کر جاتے ہیں۔(*)

یاد رکھے گا تمھیں بھی یہ زمانہ اخترؔ
شرط لیکن یہ ہے کچھ کام نرالے تو کرو

(*) عربی تحریر شائع شدہ ''الداعی'' عربی، شمارہ ۹-۱۰، جلد ۳۳، بابت ماہ رمضان وشوال ۱۴۳۰ھ = ستمبر و اکتوبر ۲۰۰۹ء، اردو تحریر بہ قلم خود ۵ ½ بجے شام بہ روز شنبہ: ۲/شعبان ۱۴۳۰ھ = ۲۵/جولائی ۲۰۰۹ء۔

سوانحی نقوش

۞ نام: (مولانا) سید عبداللہ بخاری۔

۞ والد: مولانا سید عبدالحمید بخاری مرحوم (گیارہویں شاہی امام ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء-۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء)

۞ پیدائش: ۱۹۲۲ء (۱۳۴۰ھ)

۞ جاے پیدائش: سانبھر (راجستھان)

۞ تعلیم: عصری تعلیم، سینئر کیمبرج، نئی دہلی۔ درس نظامی (مذہبی تعلیم) مدرسہ عبدالرب، دہلی سے فراغت حاصل کی۔

۞ شادی: 1951ء میں رام پور (اترپردیش) کے مشہور مذہبی مجددی گھرانے میں ہوئی۔

۞ اولاد: چار لڑکے دو لڑکیاں۔

۞ امامت: دسویں شاہی امام شمس العلما حضرت مولانا سید احمد بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۴۶ء میں نائب شاہی امام مقرر کیا۔

۞ شاہی امام: ۸/جولائی ۱۹۷۳ء (۶/رجب ۱۳۹۳ھ) کو گیارہویں شاہی امام مولانا سید عبدالحمید بخاری نے، حسبِ روایتِ قدیم اپنے فرزند (مولانا سید عبداللہ بخاری) کو عمائدین، علماے کرام اور نمازیوں کے ایک اجتماع میں منصبِ اِمامت پر فائز کیا۔

۞ حالاتِ زندگی: شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاری نے ظلم، ناانصافی اور ظالم کے خلاف ہمیشہ پوری قوت کے ساتھ آواز بلند کی اور بلالحاظِ مذہب وملت مظلوموں کا ساتھ دیا۔

● ملک کی تقسیم کے بعد دہلی کے مختلف علاقوں میں، فسادیوں کے نرغے میں پھنسے مسلمانوں کو اپنی جان، خطرہ میں ڈال کر جامع مسجد لائے اور اُن کی اِمداد اور باز آبادی کاری کا انتظام کیا۔ اِس کے علاوہ بے سہارا اور پریشان حال لوگوں کی خدمت میں شب و روز مصروف رہے۔

● مئی ۱۹۷۴ء میں دہلی کے ''کشن گنج'' علاقہ میں بھیانک فرقہ وارانہ فساد اور پولس مظالم کے خلاف، پہلی احتجاجی تقریر کی اور حکومتِ وقت وفرقہ پرستوں کو کھل کر للکارا اور اِس کے بعد اُنھوں نے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم اور حکومتِ وقت کے مُتَعَصِّبانہ رویّے کے خلاف جدوجہد کو مشن بنالیا۔

● شاہی اِمام کے بے باکانہ اور جُرأت مندانہ اِحتجاج سے گھبرا کر، حکومتِ وقت نے ہندوستانی مسلمانوں کے اِس عظیم مرکز کو توڑنے، اِمامت کے ساڑھے تین سو سالہ اِس سلسلے کو ختم کرنے اور شاہی امام کی بے باکانہ آواز کو کچلنے کے لیے سازش تیار کی، شاہی اِمام نے اِس سازش کو بہ طورِ چیلنج قبول کیا۔

● ۲ر فروری ۱۹۷۵ء ہندوستانی مسلمانوں، جامع مسجد اور خود شاہی امام کی زندگی کے لیے اہم موڑ (Turning Point) ثابت ہوا۔ اُس روز شاہی اِمام کو ختم کرنے کی سازش کو انجام دینے کے لیے پولس نے اُنھیں بُری طرح زدوکوب کیا اور جیل میں ڈال دیا؛ لیکن حکومت کے لیے یہ سودا مہنگا ثابت ہوا۔ ہندوستان میں کسی اِمام کے ساتھ کی گئی بدسلوکی پر پہلی بار مسلمانوں نے شدید اِحتجاج کیا اور پولس نے نہ صرف جامع مسجد پر گولیاں برسائیں؛ بل کہ متعدد مسلمانوں کو بھی شہید کر دیا۔

● شاہی اِمام کو اٹھارہ روز جیل میں رکھا گیا، اِس دوران شہر میں مسلسل احتجاج جاری رہا اور شاہی اِمام کی رہائی کے بعد ہی، اُن کی کوششوں سے امن قائم ہوا۔

● جون ۱۹۷۵ء میں ملک بھر میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی، تمام اپوزیشن لیڈروں کو چن چن کر جیلوں میں ڈال دیا گیا، اُس وقت شاہی اِمام اپوزیشن کی واحد مضبوط آواز بن کر اُبھرے۔ اُنھوں نے حکومتِ وقت کے ہر جابرانہ اِقدام کی پوری قوت سے مخالفت کی، چاہے وہ نسبندی کے نام سے مسلمانوں کو نشانہ بنانے کا معاملہ ہو یا صفائی کے نام پر ترکمان گیٹ دہلی اور مظفر نگر کے کھالہ پار کا سانحہ ہو، اِمام صاحب کی پرزور مخالفت اور احتجاج کی وجہ سے مسلم بستیوں کو اُجاڑنے اور مسلمانوں کو برباد کرنے کا گھناؤنا منصوبہ کام یاب نہیں ہو سکا۔

● ۱۸ر ماہ کے ایمرجنسی کے بعد، جب ملک میں عام انتخابات کا اِعلان کیا گیا، تو جے پرکاش نرائن، مرار جی ڈیسائی، کے ساتھ شاہی امام صفِ اول کے اُن اپوزیشن لیڈروں میں شامل رہے، جنھوں نے کانگریس کو ۳۰ سال بعد اقتدار سے بے دخل کرنے میں اہم رول ادا کیا اور ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کے بعد مرکز میں وجود میں آنے والی، پہلی غیر کانگریسی سرکار کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ملاقاتیں

❁ سربراہانِ مملکت:

● ملک سعود بن عبدالعزیز، سعودی عربیہ ● سعود بن فیصل بن عبدالعزیز آل سعود، سعودی عربیہ

● مارشل ٹیٹو، صدر یوگوسلاویہ ● جمال عبدالناصر، صدر جمہوریہ مصر ● کرنل معمر قذافی، لیبیا ● ملک عبداللہ بن عبدالعزیز، سعودی عربیہ ● مامون عبدالقیوم، صدر مالدیپ ● جنرل محمد ضیاء الحق، صدر پاکستان ● میاں نواز شریف، وزیر اعظم پاکستان ● سید ہاشمی رفسنجانی، سابق صدر جمہوریہ اسلامی ایران ● صدام حسین، صدر جمہوریہ عراق۔

❁ سرکردہ مذہبی شخصیات:

● شیخ محمد بن عبداللہ السبیل، اِمام کعبہ، مکۃ المکرّمۃ ● امام آیت اللہ خمینی، اِیران۔

مولانا حکیم عزیز الرحمٰن مئویؒ

۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء-۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء

ذرا بولتے رہو اے ہم صفیرو!
میں آواز دوں، تم بھی آواز دینا

جمعرات: ۱۹؍رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۰؍ستمبر ۲۰۰۹ء کو صبح تقریباً ۱۰؍بجے، مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب مئوی سابق استاذ جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند و پسرِ اکبر حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمیؒ (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء-۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء) سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، و برادرِ اکبر مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب اعظمی ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ و چیف ایڈیٹر ''البعث الاسلامی'' لکھنؤ، اپنے وطن ''مئوناتھ بھنجن'' کے محلّہ ''اِلٰہ داد پورہ'' میں جس کے وہ باسی تھے، تقریباً ۹۱ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ اُنھیں غریقِ رحمت کرے، جنت الفردوس کا مکین بنائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل واجرِ جزیل عطا فرمائے۔

وہ خاصے بڑھاپے کے باوجود، بڑی حد تک صحت مند تھے، انتقال سے تقریباً ایک ماہ قبل اپنے گھر میں زینے سے پھسل گئے، جس سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور کمر میں شدید چوٹ آئی، گھر ہی میں ڈاکٹروں کی نگرانی میں علاج ہو رہا تھا کہ وقتِ آخر آپہنچا اور وہ وہاں چلے گئے جہاں ہر انسان کو جانا ہے۔

حکیم صاحب کا امتیاز

حکیم صاحبؒ پختہ علم عالمِ دین، لدنی نبّاض اور ذی استعداد حکیم اور عربی کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور انگریزی پر خاصا عبور رکھتے تھے۔ وہ شستہ و برجستہ اور خوب صورت اردو لکھتے تھے اور فارسی و انگریزی سے اردو میں اِتنا ماہرانہ اور رواں ترجمہ کرتے تھے کہ کہیں سے ترجمے پن کا اِحساس نہیں ہوتا تھا؛ بل کہ لگتا تھا کہ کسی اچھے اہلِ قلم اور اردو کے ماہرِ اِنشا پرداز نے بہ راہ راست اردو نویسی کی ہے۔ وہ فارسی اور اردو میں مشقِ سخن بھی کر لیتے تھے اور شعر و نثر کا پاکیزہ اور لائقِ ذکر ذوق رکھتے تھے۔ وہ بڑے ذہین اور اخّاذ طبیعت کے مالک تھے، کسی علم وفن کے سیکھنے میں، ذرا سی توجّہ اُن کے لیے کافی ہوتی تھی۔

یوں تو وہ علم وفن کی دنیا میں کچھ زیادہ مشہور نہ تھے، جیسے بہت سے علما و فضلا، اللہ کی مشیت و توفیق سے، نام ور ہو جاتے ہیں، حال آں کہ ہر مشہور و نام ور شہرت کا واقعی مستحق نہیں ہوتا؛ لیکن حکیم عزیز الرحمٰن صاحبؒ میں بڑائی و عظمت کے بہت سے عناصر پائے جاتے تھے: وہ بڑے خلیق تھے، اُن کا دل آئینے کی طرح شفّاف تھا، ساتھ ہی بڑے ذہین، خوش مزاج و پُر مذاق تھے، چھوٹے بڑے سے انتہائی خندہ روئی سے ملتے تھے، اُن سے ٹوٹ کے محبت کرنے کو جی چاہتا تھا، وہ ہر ایک کے لیے اِنتہائی دیرینہ شناسا محسوس ہوتے تھے۔ اُنھوں نے جو علم و ہنر حاصل کیا، اُس میں تعلیم گاہ سے زیادہ، اُن کی اخّاذ طبیعت اور قدرتی ذہانت کا دخل صاف طور پر محسوس ہوتا تھا، وہ علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اُن کے عظیم والد مولانا محمد ایوب صاحبؒ بلند پایہ محدث، بڑے متقی اور علمائے سلف کی سیرت کے حامل تھے، اُنھوں نے اپنی اولاد کی اِس طرح تربیت کی کہ ہر ایک لعل و گہر بن کر اپنی اپنی جگہ منفرد مقام کا حامل بن گیا۔ حکیم صاحبؒ کے برادرِ اوسط مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی برِّصغیر کے معدودے چند عالی قدر اُدبا و اہلِ قلم میں سے ایک اور عربی کے صاحبِ طرز ادیب ہیں، اُن کے منفرد اُسلوب میں جاحظ کی استاذیّت، ابن المقفع کی

سلاست، عبد الحمید الکاتب کے نرالے پن، عبد القاہر جرجانی کی بلاغت اور اُن کے عظیم استاذ و مربی اور برِ صغیر کے عظیم داعی و مُفکّر و مؤلّف و ادیب حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی پُرسوز زبان کا اثر صاف طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اُن کے برادرِ خرد جناب ڈاکٹر مسیح الرحمٰن صاحب اعلیٰ درجے کے عصری تعلیم یافتہ اور پروفیسر ہیں۔

حصولِ علم

اُن کا سنہ پیدایش ۱۹۱۸ء (۱۳۳۶ھ) ہے۔ اُنھوں نے بیشتر تعلیم اپنے وطن "مئو" اور زیادہ تر "مفتاح العلوم" مئو میں حاصل کیا، جس کی تعمیر و ترقی میں اُن کے والد مولانا محمد ایوبؒ کا بھی بڑا رول رہا تھا۔ مولانا محمد ایوب عرصے تک وہاں اعلیٰ درجوں کے استاذ بھی رہے۔ حکیم عزیز الرحمٰن صاحب نے اپنے والد صاحب کی نگرانی میں تعلیمی سفر طے کیا۔ اُن کے اساتذہ میں مُحدِّثِ کبیر و عالمِ شہیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء- ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) نیز عالمِ بے باک وقائدِ ہوش مند حضرت مولانا عبد اللطیف نعمانی مئوی (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۹ء-۱۳۹۲ھ/۱۹۷۳ء) جیسے اہلِ علم و فضل ہیں۔ اُنھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ء) میں ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درس گاہ دار العلوم دیوبند کا رخ کیا، ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء میں اُنھوں نے یہاں دورۂ حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں۔ اُن کے دورے کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۹ء- ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء)، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اِعزاز علی امروہویؒ (۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء-۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) اور علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ (۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۶ء- ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) وغیرہم جیسے اعلامِ علم و فضل تھے۔

عملی زندگی

دار العلوم سے فراغت کے بعد اُنھوں نے پرائیوٹ طور پر (B.A) کا یوپی کے

بعض سرکاری اسکولوں سے امتحان دیا اور اچھے نمبرات سے کام یاب ہوئے۔ ۱۹۴۴ء (۱۳۶۳ھ) میں مئو کے (D.A.V) کالج میں فارسی زبان کے استاذ رہے۔ اُن کے برادرِ اوسط مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ نے اِس ناچیز کو بتایا کہ اُنھوں نے کچھ عرصے تجارت کا مشغلہ اختیار کیا، پھر انگریزی دواخانہ قائم کیا، جس میں کلینک کا نظم بھی کیا اور باکمال ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں وہ خود بھی مریضوں کو دیکھنے کی خدمت انجام دیتے تھے، اِسی لیے اُن کا دواخانہ خوب چلا اور مئو کے ممتاز دواخانوں میں شمار ہونے لگا؛ لیکن اُن کی علمی و دینی افتاد نے اُنھیں اِس راہ کا تادیر مسافر بننے رہنے سے باز رکھا، وہ اِس کے بعد وقت کے عالی مقام اہلِ دل حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری الہ آبادیؒ (۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۵ء-۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) کے دست گرفتہ ہوگئے، جو علم و معرفت کے امامِ وقت حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ (۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء-۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) کے اجلّ خلفا میں تھے۔ وہ کئی سال تک اُن کی صحبت سے مستفیض ہوتے رہے اور اُن کے نفسِ گرم کی تاثیر سے اپنے قلب و روح کو گرماتے رہے۔

جامعہ طبیہ دار العلوم دیو بند میں بہ حیثیت اُستاذ آمد کی تقریب

اِسی اثنا میں ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ دار العلوم دیو بند نے علمِ طب کی تعلیم کے لیے باقاعدہ ایک اِدارہ "جامعہ طبیہ" کے نام سے قائم کیا ہے۔ جامعہ طبیہ کے قیام کے دو سال بعد شاہ صاحبؒ کو معلوم ہوا کہ وہاں متعدد اچھے اساتذۂ طب کی ضرورت ہے، شاہ صاحبؒ نے حکیم صاحبؒ کو حکم فرمایا کہ آپ وہاں تدریسی خدمات کے لیے درخواست دے دیں، حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں نے باقاعدہ علمِ طب نہیں پڑھا ہے، صرف ذرا بہت مطالعہ اور تجربہ ہے، بھلا میں وہاں تدریس کی کیسے جرأت کرسکتا ہوں؟ شاہ صاحب نے فرمایا: تم

درخواست گزار دو اور علمِ طب کی کتابوں کا مطالعہ کرلو، مجھے یقین ہے کہ تم وہاں مشکل سے مشکل کتابیں دیگر اساتذہ سے اچھی پڑھاؤ گے، چناں چہ حکیم صاحب نے تدریس کے لیے درخواست دی، وہاں استاذ ہوے اور خدا کی توفیق اور شاہ صاحب کی دعا و توجہ کی برکت سے اِنتہائی کام یاب استاذ ثابت ہوے۔

جامعہ طبیہ میں بہ حیثیت اُستاذ تقرر

حکیم صاحبؒ نے "جامعہ طبیہ" دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے لیے درخواست دی اور اُنھیں دارالعلوم میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا، انٹرویو کے بعد جامعہ طبیہ کے پرنسپل حکیم محمد عمرؒ (متوفی شنبہ: ۳۰؍ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ مطابق ۱۷؍جولائی ۱۹۹۹ء) نے اہتمام کو جو رپورٹ ۱۹؍ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کو پیش کی اُس میں تحریر فرمایا کہ 13/5/1963

"جو اَطبا انٹرویو میں شریک تھے، اُن میں سے مولوی حکیم عزیز الرحمٰن صاحب ہیں، جو اِلہٰ آباد سے آئے تھے، دین داری اور قابلیت کے اعتبار سے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ جناب والا (۱) نیز حضرت علامہ مدظلہ (۲) نے بھی اُن کو پسند فرمایا تھا۔" 14/5/1963

اہتمام کی طرف سے ۲۰؍ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ کو حکیم صاحب کو اِلہٰ آباد خط لکھ کے استفسار کیا گیا کہ کیا وہ دارالعلوم کے عربی طبی نصاب کی مندرجہ ذیل کتابیں پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟: قانون چہ سدیدی فن ثانی، شرحِ اسباب مکمل، نفیسی کلیات، قانون شیخ کلیات و حیات، کامل الصناعۃ مقالہ ثانیہ و ثالثہ و تاسعہ۔ نیز طلبہ کو نسخہ نویسی کی مشق بھی کرا سکیں گے کہ نہیں؟

اس کے جواب میں حکیم صاحبؒ نے مہتمم صاحب نور اللہ مرقدہ کے نام ذیل

(۱) یعنی حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند۔
(۲) یعنی علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ۔

کا مکتوب اِرسال فرمایا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی توفیق، اپنی ذاتی محنت و ذہانت، اپنے عظیم والد اور اپنے شیخ و مربی کی دعاؤں کے طفیل، اُن میں کتنی خود اعتمادی اور استعدادِ کامل پیدا ہو گیا تھا:

"ذوالمجد والکرم ! مَتَّعَنَا اللّٰهُ بِطُوْلِ بَقَائِهٖ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

14/5/1963

گرامی نامہ مؤرخہ ۱۳۸۲/۱۲/۲۰ھ شرفِ صدور لایا، مسرّت ہوئی، سوالات مندرجہ مکتوبِ گرامی کے جواب میں گزارش ہے کہ بعونِ اللہ تعالیٰ میں جناب کے طبیہ کالج کے جملہ مضامین وفنونِ طب پڑھانے کی پوری قدرت رکھتا ہوں۔ اگر طلبہ عربی زبان میں چاہیں تو عربی میں بھی بہ احسنِ وجوہ تقریر کرسکتا ہوں اور اگر فارسی واردو میں چاہیں تو اُن دونوں زبانوں میں، اہلِ زبان کی طرح تعلیم وتقریر کرسکتا ہوں۔ نسخہ نویسی وطبِّ جدید کے مضامین خواہ وہ انگریزی زبان ہی میں کیوں نہ ہوں، نہایت آسانی سے سمجھنے اور سمجھانے کی قدرت رکھتا ہوں۔

الحمدللہ کہ اِس سلسلے میں کسی اِعانت ورہ نمائی کا محتاج ثابت نہ ہوسکوں گا۔

عزیز الرحمٰن

۱۹۶۳/۵/۲۲ء" = 28/12/1382

6/6/1963 اِس کے بعد اہتمام دارالعلوم نے، اُنھیں دارالعلوم حاضر ہونے کو کہا، حکیم صاحبؒ ۱۳/محرم ۱۳۸۳ھ کو دارالعلوم حاضر ہوے اور اپنی حاضری اور کارِ مطلوبہ کی تفویض کی درخواست اِن الفاظ میں دی:

"گرامی مرتبت حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیو بند!

1/1/1383

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ حسب الحکم مؤرخہ ۱۹۶۳/۵/۲۵ء آج بہ تاریخ ۶/جون ۱۹۶۳ء حاضر ہورہا ہوں، مجھ سے جو خدمات متعلق ہوں، اُن کی تفویض کا حکم صادر فرمادیا جائے، ممنونِ کرم ہوں گا، اطلاعاً گزارش ہے۔ 13/1/1383

عزیز الرحمٰن

پنج شنبہ

۱۳ر محرم ۱۳۸۳ھ 6/6/1963

اِس درخواست کو حکیم محمد عمر صاحبؒ پرنسپل جامعہ طبیہ نے، اُسی دن شام کو ۴ بجے دفترِ اہتمام میں بھیج دیا۔ جس پر کارروائی کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحبؒ نے بہ روز منگل ۱۸ر محرم ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۱ر جون ۱۹۶۳ء کو حکیم صاحب کا تقرر فرماتے ہوئے، یہ الفاظ تحریر فرمائے:

"حکیم عبدالکریم صاحب کے استعفا دے کر چلے جانے سے، اِدارۂ طبیہ کی تدریس میں جو خلا واقع ہوگیا تھا، اُس کے جلد سے جلد پُر کرنے کی ضرورت تھی؛ ورنہ تعلیم کا نقصان تھا اور آغازِ سال میں یہ نقصان نا قابلِ تلافی ہوتا؛ اِس لیے جناب مولوی حکیم عزیز الرحمٰن کو اِس خدمت کے لیے بلایا گیا۔ ممدوح انٹرویو میں شریک تھے، اُن کی صفات کو قابلِ اعتماد سمجھا گیا تھا: لٰہذا ممدوح کا تقرر جامعہ طبیہ میں کیا جاتا ہے"۔ محمد طیب

۱۸/۱/۱۳۸۳ھ

حکیم صاحبؒ نے جامعہ طبیہ دار العلوم دیو بند میں فنِ طب کی عربی و فارسی کی مشکل ترین کتابیں، جنھیں پڑھانا دگر اساتذہ کے لیے عموماً دشوار گزار تھا، کم و بیش ۲۳ سال تک ماہرانہ انداز میں پڑھائیں، اُن کے بہت سے تلامذۂ طب اور رفقائے تدریس اُنھیں "حکیم لدنی" بھی کہتے تھے؛ کیوں کہ اُنھوں نے فنِ طب کو با قاعدہ نہ پڑھنے کے باوجود، جس لیاقت کے ساتھ مشکل کتابوں کا درس دیا اور طلبہ و اساتذہ و ذمے داروں کی محبت و اعتماد حاصل کیا، اُس کو اُن کی ذہانت کے ساتھ ساتھ، خدا کی توفیقِ خاص اور اُن کے والدِ تقویٰ شعار حضرت مولانا محمد ایوبؒ اور اُن کے مقبولِ بارگاہِ اِلٰہی شیخ شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی دعاؤں کا خاص ثمرہ ہی باور کیا جاسکتا ہے۔

جامعہ طبیہ بند ہو جانے کے بعد

۱۰/مارچ ۱۹۸۶ء (۲۷/جمادی الاخریٰ ۱۴۰۶ھ) کو حکومتِ ہند کی طرف سے عائد کردہ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ جامعہ طبیہ کو بند کردے؛ کیوں کہ گورنمنٹ کی ناقابلِ عمل قانونی پابندیوں پر عمل کرنا اور سخت شرطوں کو پوری کرنا دارالعلوم کے بس میں نہ تھا؛ کیوں کہ دارالعلوم ایک اقلیتی تعلیمی اِدارہ ہے جو مسلمانوں کی دینی تعلیم وتربیت، کتاب وسنت کے علوم کی ترویج، سیکولر ہندوستان میں اِسلامی وجود کی حفاظت اور حسّاس اِسلامی سرحد پر ذمّے دارانہ مورچہ بندی کے لیے معرضِ وجود میں آیا تھا اور الحمدللہ اِس سلسلے میں وہ قائدانہ رول، ذمہ داری سے ادا کررہا ہے۔

جامعہ طبیہ کے بند ہو جانے کے بعد، دارالعلوم نے اُس کے اساتذہ اور ملازمین کو مختلف قسم کی ذمّے داریاں سپرد کیں، جو اُن کی علمی صلاحیت اور تعلیمی تجربے سے میل کھاتی تھیں۔ حکیم عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے حصّے میں یہ آیا کہ وہ "شیخ الہند اکیڈمی" کے قلمی اور تحقیقی رفیق بن جائیں اور اپنی پسند کے موضوعات پر کتابیں اور مقالات لکھیں۔ حکیم صاحبؒ نے اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اردو زبان میں اپنی گراں قدر کتاب "مناقبِ اِمامِ اعظم ابوحنیفہ" لکھی؛ لیکن دو تین سال کے بعد ہی دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ صفر ۱۴۰۹ھ میں اُن کی سن رسیدگی اور بڑھاپے کی وجہ سے اُنھیں علامتی ماہوار وظیفے پر ریٹائر کیے جانے کا فیصلہ کیا، جسے دارالعلوم کے مہتمم "مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے ۲۲ صفر ۱۴۰۹ھ (۶/ستمبر ۱۹۸۸ء) کو نافذ کرتے ہوئے، اُنھیں یکم ربیع الاول ۱۴۰۹ھ سے ۴۰۰ روپے ماہوار وظیفہ دیے جانے کی اطلاع دی، جو اُن کی وفات تک اُنھیں دیا جاتا رہا۔

اُن کی وفات، رمضان کے مبارک مہینے میں ہوئی جس میں حدیث شریف کے

مطابق جنت کے دروازے کھول اور جہنم کے دروازے بند کردیے جاتے ہیں اور سرکش شیاطین کو قید کردیا جاتا ہے؛ اِس لیے اللہ کریم کے فضل سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اُنھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے گا اور اُن کی اُن تمام خطاؤں اور لغزشوں سے، جن سے کوئی فردِ بشر خالی نہیں، درگزر فرمائے گا۔

حکیم صاحبؒ، جامعہ طبیہ کے محبوب ترین اُستاذ تھے۔ میں نے اُن کے تلامذہ کو اُن کا بے حد ثنا خواں پایا، وہ ہر مجلس میں اُن کی تدریسی صلاحیت، تعلیمی لیاقت اور مطلوبہ مضامین کو اِنتہائی سہل اور شیریں انداز میں طلبہ کے سامنے پیش کرنے کے اُن کے مَلکے کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ وہ فنِ تدریس میں اِس لیے بھی کام یاب تھے کہ اُن کی مجلسِ درس سنجیدگی اور مذاق، خوش مزاجی اور ظرافتِ طبعی کا آمیزہ ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اُن کی ذہانت، اُن کے لیے زندگی کے ہر مشن کو حددرجہ آسان کردیتی تھی۔

حکیم صاحبؒ کی تالیفی خدمات

مرحوم تصنیف وتالیف کے حوالے سے قدرتی صلاحیت کے حامل تھے۔ اُن کا قلم بہت رواں تھا۔ وہ تدریسی کمال کے ساتھ ساتھ تالیفی میدان کے بھی شہ سَوار تھے۔ اُن کی مندرجۂ ذیل تصنیفات شائع ہوچکی ہیں:

میڈیکل انگلش اردو ڈکشنری جس کا اصل نام حکیم صاحب نے شاہ وصی اللہؒ کی طرف نسبت کرکے وصی میڈیکل ڈکشنری (Wasi Medical Dictionary) رکھا تھا، سنگم سہ لِسانی (اردو، عربی، انگلش) ڈکشنری، یہ تین جلدوں میں ہے اور انگریزی میں اس کا نام Thri Lingual Dictionary ہے۔ اُن کی بہت سی کتابوں اور تراجم کے مُسوَّدات مُنتظرِ اِشاعت ہیں، جن کی تعداد شائع شدہ کتابوں سے زیادہ ہے۔ اُن کی موت کے بعد اُن کے یہ علمی سرمایے اور تصنیفی وتالیفی کارنامے، اُن کے لیے صدقۂ جاریہ ثابت ہوں گے اور اُن کے لیے اَجرِ مسلسل کا ذریعہ بنیں گے۔

حکیم صاحب سے تعارف و تعلق

اُن سے طالبِ علمی کے زمانے میں، اِس ناچیز کے متعارف ہونے کی تقریب یہ ہوئی کہ دارالعلوم کے مشہور ہاسٹل ''دارِ جدید'' کے کیمپس میں، جس کے ایک بالائی کمرے ۳۲ میں میری اور میرے ہم قریہ طلبہ کی رہائش تھی، جمعہ کے دنوں میں غسل خانوں میں بڑی بھیڑ ہوجاتی تھی، چناں چہ میں اور میرے کئی رفقاے درس عموماً جمعہ کے دنوں میں ''جامعہ طبّیہ'' کی عمارت کے کیمپس کے ایک گوشے میں نصب کردہ ہینڈ پائپ پر جا پہنچتے اور اُسی پائپ پر غسل کرتے اور اپنے کپڑے صاف کرتے۔ یہ ہینڈ پائپ ''جامعہ طبیہ'' کے اِحاطے میں حکیم صاحبؒ کے کمرے کے پاس واقع تھا۔ ہم جب بھی وہاں جاتے، تو وہ ہم سے خیر خیریت معلوم کرتے، ہمارے درجوں کا اَحوال، ہمارے وطن اور خاندان کی بابت پوچھتے، بسا اوقات وہ اپنی خدمت پر مامور طالبِ علم کو ہمیں چائے وغیرہ پیش کرنے کا حکم دیتے۔ اِس طرح حکیم صاحبؒ سے ہماری خوب جان پہچان ہوگئی اور وہ ہمارے لیے رفتہ رفتہ ولیُّ الامر کا درجہ اختیار کرگئے، وہ ہمیں نصیحتیں کرتے، مشورے دیتے اور ہماری بھلائی کی سوچتے۔ اُنھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ہمیں پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہے، ہم لوگ پڑھائی لکھائی میں محنت کرتے ہیں، اُنھیں ہمارے طور طریقے سے یہ خوش گمانی ہوگئی تھی کہ ہم سوجھ بوجھ کے طالبِ علم ہیں؛ اِس لیے وہ ہماری خبر گیری اور تعلیم و تربیت پر خصوصی توجّہ دینے لگے؛ کیوں کہ اُنھیں ذہین طلبہ اور محنتی نوجوانوں سے ہمیشہ محبت رہی۔

اُنھیں کسی طرح ایک روز یہ بات معلوم ہوگئی کہ ہم دارالعلوم سے مفت دیا جانے والا کھانا کھایا کرتے ہیں، ایک دن کی بات ہے کہ ہم اپنے کمروں سے اُتر مدنی گیٹ کے زینوں سے نیچے آکر درس گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ حکیم صاحبؒ سے ملاقات ہوگئی، وہ دارالعلوم سے مدنی گیٹ کی طرف جا رہے تھے، اُن کا رخ اپنی ''جامعہ طبیہ'' کی

طرف تھا، اُنھوں نے ہمیں روک لیا اور فرمایا: ہمیں تم لوگوں سے ایک بات کہنی ہے: تم لوگ محنتی اور ذہین طالبِ علم ہو، ہماری رائے ہے کہ دار العلوم کی طرف سے مفت دی جانے والی خوراک استعمال نہ کرو، کیوں کہ یہ خوراک عموماً اُن عوامی چندوں سے پیش کی جاتی ہے، جن کا بڑا حصہ زکاۃ پر مشتمل ہوتا ہے۔ زکاۃ مال دار مسلمانوں کے مالوں کا میل کچیل ہوتی ہے۔ جس سے فکری تاریکی اور قلبی ظلمت پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، کیا اچھا ہوتا کہ اگر تمھارے بس میں ہو تو تم لوگ اِس سے پرہیز کرتے۔ ہم نے کہا: ہم لوگ نادار طالبِ علم ہیں، ہمارے گھروں پر بھی کوئی کشادگی نہیں اور یہاں تو ہم وطن سے دور دینی علوم کی طلب میں، طالبِ علمانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ حکیم صاحبؒ نے فرمایا: تب تم لوگوں کے لیے دار العلوم کے مفت کھانے میں کوئی مُضَایقَہ نہیں، مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم لوگوں کو ایسا مشورہ دیا جس پر عمل کرنا تمھارے بس میں نہیں۔

حکیم صاحبؒ کی ہم لوگوں کے ساتھ یہ مخلصانہ شفقت و محبت صرف اُسی وقت تک قائم نہیں رہی جب تک ہم لوگ دار العلوم میں طالبِ علم رہے؛ بل کہ دار العلوم سے ہماری جدائی کے بعد بھی وہ برابر ہماری خبر خیرت، مراسلت اور آنے جانے والوں کے ذریعے معلوم کرتے رہے۔ ایسے مخلص اور ہم درد "بڑے" بہت کم ہوتے ہیں، جو کسی غرض کے بغیر "اجنبی لوگوں" اور دور افتادہ انسانوں سے ہمہ دم تعلق رکھیں۔ اللہ اُنھیں بہت نوازے اور اُن کی ساری شفقتوں کا بدلہ وہاں عطا کرے، جہاں اِس بدلے کی اُنھیں بہت ضرورت ہوگی۔

حکیم صاحب نے کچھ سال امارتِ عربیہ متحدہ کی مشہور امارت دبی میں بھی گزارے ہیں جہاں اُن کے صاحب زادے مولانا محی الدین طیب قاسمی مقیم تھے، جو شیخ سالمؒ کی مسجد میں امام و خطیب رہے۔ ایک بار راقم کا امارات کا، دوستوں کی دعوت پر سفر ہوا، حکیم صاحب سے بھی اُن کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی۔ وہ وہاں بھی بڑی محبت، خوش اخلاقی اور اپنائیت سے ملے اور ایسا لگا کہ ہم دیوبند میں اُن کی رہائش گاہ پر اُن کی

ضیافت اور شرافتِ نفسی سے محظوظ ہورہے ہیں۔ وہاں بھی اُن کے محبّین اور اہل تعلق کا بڑا حلقہ نظر آیا، ہمہ وقت ملنے جلنے والے آتے رہتے اور حکیم صاحب ہر ایک کے ساتھ فیاضی اور سیر چشمی سے پیش آتے۔ اُنھوں نے وہاں قیام کے دوران بھی حکیمی دواؤں اور علاج معالجے کا تھوڑا بہت سلسلہ قائم کرلیا تھا، جس سے اُن کا جی بھی بہلتا تھا اور خلقِ خدا کو فائدہ بھی پہنچتا تھا۔

دار العلوم دیوبند میں بہ حیثیت اُستاذ راقم کی آمد اور حکیم صاحب کی مسرّت

شوال ۱۴۰۲ھ/ اگست ۱۹۸۲ء میں یہ راقم بہ حیثیت استاذِ دار العلوم و چیف ایڈیٹر الداعی عربی دار العلوم آیا، تو وہ بہت خوش ہوئے، جیسے کوئی شفیق باپ اپنے بیٹے سے اُس وقت خوش ہوتا ہے جب وہ اپنی دنیا یا آخرت سے متعلق کوئی بڑا مقصد حاصل کرلیتا ہے۔ یہاں آنے کے بعد ''جامعہ طبیّہ'' کی عمارت کے اِحاطے میں اُن کے کمرے میں پہلے کی طرح مجلسیں جمنے لگیں، یہ مجلسیں بسا اوقات مخدومِ گرامی حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی (۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء - ۰۰۰۰/ ۰۰۰۰) سابق مفتی دار العلوم دیوبند یا استاذِ محترم علاّمہ محمد حسین بہاریؒ (۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء - ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء) سابق استاذِ حدیث کے کمروں میں بھی جما کرتی تھیں، جن میں طرح طرح کی باتیں ہوتیں اور علمی و دینی مباحثوں کے علاوہ حالاتِ حاضرہ پر بصیرت مندانہ تبصرے بھی ہوتے تھے، حکیم صاحب کو سیکڑوں شعر، لطیفے، کہانیاں اور قدآور پڑھے لکھے لوگوں، علُما و فقُہا و صُلَحا اور اُدبا و شعرا کے دلچسپ واقعات یاد تھے، جنھیں وہ اپنی ذہانت، بذلہ سنجی اور ظرافت کی بنا پر رنگ آمیزی کے ساتھ سنایا کرتے تھے، جس سے یہ مجلسیں زعفران زار بن جایا کرتی تھیں۔ اب نہ مجلس والے رہے اور نہ یہ مجلسیں، جب بھی اِن مجلسوں کی یاد آتی ہے تو کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے، کیا خوب دن تھے اور کتنے اچھے لوگ۔ رہے نام اللہ کا۔

دارالعلوم کی پرانی انتظامیہ جس کے سربراہ ہندوستان کے منفرد عالم، اسلام کے اپنے وقت کے بڑے ترجمان اور برِّصغیر ہندوپاک میں اُس کی بلیغ زبان کی حیثیت رکھنے والی شخصیت، یعنی برصغیر میں دورِ آخر میں اسلام کے بہت بڑے پاسبان امامِ ہمام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء-۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے پوتے حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ تھے، کو برخاست کرکے جب نئی انتظامیہ دارالعلوم میں برسرِ کار آئی، تو ہم خادموں کو دعوتِ خدمتِ تدریس وتحریر دی گئی۔ ہم یہاں شوق کے پروں سے اُڑ کے آئے؛ لیکن چوں کہ اُس وقت تک اختلاف کی گرد بیٹھی نہ تھی اور حالات کا اونٹ صحیح کروٹ بیٹھ نہ سکا تھا، اِس لیے یہاں غیریقینی کی صورتِ حال باقی تھی، جس کی وجہ سے نہ صرف بے کیفی تھی؛ بل کہ کام کرنے والوں کو بڑی حد تک اپنے کاموں میں جی بھی نہیں لگتا تھا۔ اِس راقم کی طبیعت تو اور بھی بہت اچاٹ اچاٹ سی رہتی تھی؛ کیوں کہ اُس کو اس طرح کے حالات کا کبھی سابقہ نہیں ہوا تھا۔ اِن حالات میں حکیم صاحبؒ نے ہم لوگوں کو ذہنی طور پر یہاں خاطر جمع رکھنے اور اپنے کام میں ہمہ تن مشغول رہنے کے لیے بہت تیار کیا؛ ورنہ شاید ہم اِن حالات میں یہاں جم نہ پاتے۔

صورت وسیرت

حکیم صاحبؒ گورے چٹے مائل بہ گندمی اور متوسط القامت تھے، بڑی حد تک مضبوط کاٹھی کے تھے، اُن کی بھنویں گھنیری تھیں؛ لیکن داڑھی کے بال قدرتی طور پر شکستہ تھے، اُن کی آنکھیں ذہانت سے چمکتی تھیں اور طبعی زیرکی کا پتہ دیتی تھیں۔ پیشانی کشادہ اور ناک کھڑی تھی۔ وہ قدرے جھومتے ہوئے چلتے، وہ ہمہ وقت خندہ رُو رہتے، اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی؛ لیکن جب کوئی اہم معاملہ پیش آجاتا، تو وہ گہری خاموشی اور طویل غور وفکر میں غرق ہوجاتے، وہ حالاتِ حاضرہ سے باخبر رہتے، تازہ خبروں پر تبصرے اور تجزیے کرتے، وہ لوگوں کی طبیعتوں اور زندگی میں اُن کے سلوک،

لوگوں کے ساتھ اُن کے برتاؤ اور عام گفتگو میں اُن کے لب ولہجے کے ذریعے، اُن کی اندرونی کیفیات اور بڑی حد تک اُن کی نیتوں کا اِدراک کر لیتے تھے۔ وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں کے خیر خواہ اور اُن کی بھلائی کے طالب رہا کرتے تھے، وہ نہ صرف نماز باجماعت کے پابند؛ بل کہ دین کے آداب واحکام کے بھی پابند تھے، وہ نماز میں صفِ اوّل میں حاضری کا اہتمام کرتے، اُن کی تکبیرِ تحریمہ کبھی فوت نہ ہوتی، وہ بے فائدہ لوگوں سے اختلاط نہ رکھتے تھے، دنیا اور آخرت کی کوئی بھلائی اگر اُن سے متقاضی نہ ہوتی تو وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے؛ لیکن وہ کسی سے دشمنی کرتے نہ اُسے ناپسند کرتے اور نہ اُن کے دل میں کسی کی طرف سے کوئی غبار ہوتا۔ وہ بڑھاپے کے باوجود جامعہ طبیہ کے اِحاطے سے سڑک کو پار کر کے پانچوں نمازیں دارالعلوم کی مسجدِ قدیم ہی میں ادا کرنے آتے تھے۔ جاڑا ہو، گرمی ہو یا برسات، اُن کے اس معمول میں کبھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔

حکیم صاحب بڑے مجلسی آدمی تھے، اُن کی صحبت میں بہت دل لگتا تھا، اُن کی مجلس میں علم وادب، شعر ونثر، فکری روشنی، عالمانہ نکتہ سنجی، ادیبانہ ضلع جگت، مُبصِّرانہ تجزیے، ذہانت وفطانت کی گل کاریاں اور غم غلط کرنے والے ایسے اور اِتنے برجستہ اور رس بھرے فقروں کی بھرمار ہوتی تھی کہ کسی باذوق کو وقت کی طوالت کا اِحساس ہوتا تھا نہ ضروری معمولات میں خلل اندازی پر افسوس۔

اُنھیں برتنے والے کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ تنگ نظر اور کم علم عالم دین نہیں؛ بل کہ وسیع النظر، روشن فکر، مُتَنَوِّعُ الثقافہ اور کھلے دل ودماغ کے آدمی ہیں۔

مرحوم بڑے سخی، کشادہ نفس اور سنتِ نبوی پر عمل پیرا تھے، بالخصوص اپنا کام اپنے ہاتھوں انجام دینے کے حوالے سے۔ وہ سِن رسیدگی اور کم زوری کے باوجود اپنے سارے کام خود انجام دیتے تھے، حتیٰ کہ مرض الموت میں وہ لیٹے لیٹے اپنی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ نہ صرف صوم وصلاۃ کے انتہائی پابند؛ بل کہ حدود

اللہ کی بے حد رعایت کرنے والے اور جوانی کے زمانے سے تہجد گزار اور شب بیدار تھے، جس پر وہ تا حیات قائم رہے، وہ بہت جلدی مانوس ہو جانے والے اور مانوس کر لینے والے تھے، وہ دوسروں کو محبوب رکھتے تھے؛ اِس لیے وہ دوسروں کے محبوب تھے۔ اُن سے ہر ملنے جلنے والا، اُن سے مانوس ہو جانے، اُن کی طرف مائل ہو جانے، اُن سے محبت کرنے اور اُن کی محبت پر باقی رہنے پر مجبور ہوتا تھا؛ کیوں کہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں کے دلوں میں نا قابلِ زوال خوب صورت تأثر چھوڑ دیتے تھے۔

پس ماندگان

اُنھوں نے اپنے پیچھے دو بھائی چھوڑے: یعنی برادرِ اوسط مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور ڈاکٹر مسیح الرحمٰن اعظمی اور ایک لڑکا یعنی نیک خو عالم مولانا محی الدین طیب اور ایک لڑکی، یہ دونوں صاحبِ اولاد ہیں اور بھائیوں اور اُن کے صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کا بھی بھرا پُرا خاندان ہے۔ اللہ سبھوں کو صحت و عافیت اور توفیقِ کارِ خیر کے ساتھ عمرِ دراز نصیب کرے۔

دنیا سے جانے والے اور دل سے نہ جانے والے

حکیم صاحبؒ آج ہماری اِس دنیا میں نہیں اور اِس دنیا میں ہر آنے والے کو جانا ہے؛ لیکن وہ ہمارے دلوں کی دنیا سے ہرگز جدا نہ ہوں گے؛ کیوں کہ اُنھوں نے ہمارے دلوں کو اپنے حسنِ سیرت، شفّاف طینت، کریم الاخلاقی، خوش باطنی، خوش مزاجی، بے پناہ ہم دردی، طبعی سخاوت، کشادہ نفسی اور اُس غیر معمولی ذہانت کے ذریعے گرویدہ کر لیا تھا، جو اُن کی شخصیّت کا امتیاز تھی۔

اُس انسان کی عظمت اور سعادت مندی کا کیا پوچھنا جو موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے؛ کیوں کہ موت اُسے نہیں مار پاتی، موت اُس کے حوالے سے اپنی معنویّت اور

حقیقت کھو دیتی ہے؛ کیوں کہ اُس کے جسم کو تو فنا کر دیتی ہے؛ لیکن اُس کی یاد کو نہیں مٹا پاتی، اُس کے ڈھانچے کو تو معدوم کر دیتی ہے؛ لیکن اُس کی رُوح کو ختم نہیں کر پاتی؛ لہٰذا وہ انسانوں کی زبانوں پر پایدار ترانہ بن کر باقی رہتا ہے، تاریخ کی پیشانی پر اُس کا نقش کندہ رہتا ہے اور وہ اُن لوگوں کے دلوں میں ناقابلِ فراموش یاد بن کر باقی رہتا ہے جن میں وہ اپنی اُس محبت کا بیج بو چکا ہوتا ہے جس کو کائنات کی کوئی طاقت مٹا نہیں پاتی۔

مجھے اُن کی وفات کی اِطّلاع بعض رسائل کے ذریعے ملی تو میرے خانۂ خیال میں یہ لذیذ اور عزیز یادیں گردش کرنے لگیں۔ اِن سطروں کے لکھتے وقت مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ مرحوم میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، میری آنکھیں اُنھیں دیکھ رہی ہیں، وہ اپنے مزاحیہ جملوں کے ذریعے ہمیں ہنسا رہے ہیں، جو بڑے معنی خیز، مسرّت انگیز اور طرب ریز ہوتے تھے، اُن میں بلا کی لطافت ہوتی تھی، جس سے حاضرین دیر تک مزے لیتے رہتے تھے۔

موت سے نہ مرنے والے

ہر انسان کو موت کی کارروائی سے دوچار ہونا ہے، موت کی سنگ دلی اور اُس کے جبر و اِکراہ سے کسی اِنسان کو مفر نہیں؛ لیکن اُس انسان کا استثنا ہے جو اپنی سیرت و کردار، اپنے غیر معمولی کیریکٹر اور اُن خوشیوں کے ذریعے زندہ رہتا ہے، جنھیں وہ مفت سارے انسانوں میں بانٹا کرتا تھا اور اُن غموں کے ذریعے وہ زندہ رہتا ہے، جنھیں وہ اِس سے پہلے اپنی موت مرنے پر مجبور کر دیتا تھا کہ وہ اُس کے جان پہچان کے لوگوں اور محبّین اور متعلقین کے لیے، کسی تکلیف کا باعث بنیں اور اُن نیکیوں کے ذریعے زندہ رہتا ہے، جن سے وہ بہت سارے حقوق ادا کرتا، دلوں کو جیتتا اور خرچ کے ساتھ بڑھنے والی بھلائیاں انجام دیا کرتا تھا۔

مرحوم حکیم عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ وہی انسان تھے جو موت کے بعد زندہ، غائب

ہونے کے بعد موجود اور نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ اللہ اُنھیں ہر اُس بھلائی کا بدلہ دے، جو اُنھوں نے زندگی میں کسی کے ساتھ کی اور ہر اُس نیکی کا ثواب عطا کرے، جو اُنھوں نے اپنے رب کی رضا و خوشنودی کے لیے انجام دی۔ اللہ اُنھیں اپنی کشادہ جنت میں بلند مقام عطا کرے۔ اور ساری تعریف تو صرف سارے جہان کے پروردگار کے لیے ہے۔ (*)

سوانحی نقوش

- اسم گرامی: (مولانا حکیم) عزیز الرحمٰن بن (مولانا) محمد ایوب بن محمد صابر۔
- ولادت: ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء۔
- جاے ولادت: محلّہ ''اِلٰہ داد پورہ'' مئوناتھ بھنجن، ضلع ''مئو'' سابق ضلع ''اعظم گڑھ'' یوپی۔
- تعلیم: ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، متوسط و ثانوی تعلیم کے مراحل درس نظامی کے نصاب کے مطابق (فارسی و عربی) جامعہ مفتاح العلوم مئو میں طے کیے۔ یہاں آپ کے اساتذہ میں محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مئویؒ (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء - ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء) اور عالم و قائد مولانا عبداللطیف نعمانیؒ (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۹ء - ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۳ء) جیسے اساطینِ علم و فضل تھے۔

۱۹۳۶ء (۱۳۵۵ھ) میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم دیوبند میں داخل ہوے اور ۱۹۴۰ء (۱۳۵۹ھ) میں فارغ ہوے، یہاں آپ نے وقت کے جلیل القدر علما و صلحا کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، جن میں شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ، علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ ثم الپاکستانی (۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۶ء - ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء) اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء) شامل ہیں۔ فلسفۂ ولی اللّٰہی کے اس زمانے کے امام مولانا عبید اللہ

(*) عربی تحریر جو یک شنبہ: ۱۴ر شوال ۱۴۳۰ھ مطابق ۴ر اکتوبر ۲۰۰۹ء کو ۱۱ر بجے دن میں لکھی گئی اور ''الداعی'' عربی کے شمارہ ۱۱، جلد ۳۳، ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ = نومبر ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ ترجمہ از عربی بہ قلم خود ۱۱ر بجے دن شنبہ: ۲۰ر شوال ۱۴۳۰ھ = ۱۰ر اکتوبر ۲۰۰۹ء۔

سندھیؒ (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء-۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) سے بھی دو تین اسباق پڑھے۔

❁ **تدریسی و عملی زندگی:** فراغت کے بعد رنگون (برما) میں ڈیڑھ ماہ تدریسی خدمت انجام دی، ۱۹۴۳ء (۱۳۶۲ھ) مدرسہ رحمانیہ "رسڑا" میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں آپ نے بخاری شریف کا درس دیا۔ ۱۹۴۴ء (۱۳۶۳ھ) سے ۱۹۵۱ء (۱۳۷۰ھ) تک ڈی، اے، وی (D.A.V.) انٹر کالج مئو میں بہ حیثیت اردو لکچرر خدمات انجام دیں۔ اِسی دوران ۱۹۵۰ء (۱۳۶۹ھ) میں ہائی اسکول اور ۱۹۵۲ء (۱۳۷۱ھ) میں اِنٹر میڈیٹ (Intermediate) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۲ء (۱۳۷۱ھ) تا ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ) ڈسٹرکٹ کوآپریٹیو سوسائٹی میں دو سال کام کیا۔ ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ) میں کالج چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کیا، پہلے سوت کی دکان کی، پھر انگریزی دواخانہ قائم کیا، جس کا سلسلہ ۱۹۵۹ء (۱۳۷۹ھ) سے ۱۹۶۱ء (۱۳۸۱ھ) تک رہا؛ لیکن اِس کام میں دلی اطمینان نہیں تھا، روح کی بے تابی اُنھیں وقت کے پایے کے شیخ ومربی مولانا شاہ وصی اللہ آبادیؒ (۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۵ء-۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء) خلیفۂ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ (۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء-۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کی خدمت میں لے گئی، جہاں پہلے سے ہی آنا جانا ہوتا رہا تھا۔ ۱۹۶۲ء (۱۳۸۲ھ) تک آپ کے آستانے سے ہی وابستہ رہے اور اِلٰہ آباد ہی میں مستقل قیام رہا۔ شاہ صاحب کے حکم سے از خود طب کی امہات الکتب کا نہ صرف مطالعہ کیا؛ بل کہ اِلٰہ آباد بورڈ سے فاضلِ طب کا اعلیٰ نمبرات سے امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۳۸۳ھ/۱۹۸۳ء سے جامعہ طبیہ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دینی شروع کیں اور اُس کے اختتام ۱۹۸۶ء (۱۴۰۶ھ) تک طب کی دشوار گزار کتابیں پڑھائیں، اس کے بعد بہ حیثیت رفیقِ تالیف ۱۴۰۹ھ (۱۹۸۸ء) تک شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند میں تصنیفی وتحقیقی خدمت پر مامور رہے۔ اِسی کے ساتھ ذاتی طور پر بھی تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔

دیوبند سے آنے کے بعد اپنے صاحب زادی مولوی محمد طیب قاسمی کے پاس دُبَی آتے جاتے رہے، بعض دفعہ طویل قیام بھی فرمایا، وہاں بھی مریضوں کے علاج ومعالجے کا سلسلہ جاری رکھا، جو خاصا مقبول ہوا۔

❁ **تالیفات:** ● اردو انگلش میڈیکل ڈکشنری دو جلدوں اور ۱۲ سو صفحات میں ● امراضِ صدر ● کتاب الرحمت (طب) ● سوانح عمری فراہی ● سوانح عطّار ● سوانح ابوہریرہؓ ● شاداب افریقہ ترجمہ کتاب "افریقیا الخضراء" مؤلف شیخ محمد ناصر العبودی ● شہبازِ رہ گزر ● ترجمہ قصیدہ بانت سعاد

● خاتم النّبیین ترجمہ کتاب علامہ کشمیری جو فارسی میں ہے ● اسلام عقیدہ وشریعت کی روشنی میں ● انگریزی عربی اردو ڈکشنری ● مآثر امام اعظم ابوحنیفہ ● مسک الختام ● سائنسی اعجاز کی بنیادیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا علمی ترکہ چھوڑا ہے، جس میں ۳ ہزار صفحات میں حدیث شریف کے الفاظ کی تشریح پر مشتمل ڈکشنری بھی ہے۔

❁ وفات: اپنے وطن مئو میں جمعرات: ۱۹ر رمضان ۱۴۳۰ھ = ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو صبح تقریباً ۱۰ بجے۔(۱)

(۱) سوانحی نقوش کے سلسلے میں زمیلِ محترم مولانا مفتی سعید الحق قاسمی مئوی کی تحریر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

نیک دل عالم، سہل نگار اہلِ قلم اور بہت اچھے انسان

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مدظلہ

۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء — ۰۰۰۰ھ/ ۰۰۰۰ء

مِری مَشّاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بہ خود کرتی ہے لالے کی حِنا بندی

اِن سطروں کے لکھنے کی تقریب

بہار، اڑیسہ، جھارکھنڈ اور نیپال کی متحدہ عظیم انجمن معروف بہ "سجاد لائبریری" کے ذمے دار طلبہ عرصہ دو ماہ پہلے (۱) مجھ سے ملے اور بتایا کہ حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی، مفتی دار العلوم دیوبند، کی دار العلوم کی خدمت سے وابستگی پر عرصہ پچاس سال مکمل ہونے کے موقع سے، ہم ذمے دارانِ انجمن خصوصاً اور طلبۂ صوبہ جات مذکورہ عموماً اور طلبۂ دار العلوم دیوبند بالاَعَم، حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے تعارف اور تعریف وتوصیف اور اُن کی خدمات وتالیفات اور مقام ومرتبے کے تذکرے پر مشتمل ایک یادگاری مجلّہ شائع کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ نسلِ نو کو اِس کے مطالعے سے پڑھنے لکھنے اور حصولِ کمال وامتیاز میں، جی جان سے لگنے کا حوصلہ اور مفتی صاحب کے لیے ہمارے جذبۂ عقیدت واحترام کو تسکین ملے۔

---

(۱) یہ سطریں جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ = اگست ۲۰۰۵ء میں لکھی جا رہی ہیں۔

یہ طلبہ میرے سر ہوے کہ آپ بھی — اپنے مشاغل و اَعذار سے وقت نکال کر، ہم لوگوں پر شفقت فرماتے ہوے — اِس مجلّے کے لیے کوئی تحریر عنایت فرما دیں، تو ہمارے لیے بڑے فائدے کی چیز ہوگی۔ میں اُن طلبہ کے خلوص اور مفتی صاحب کے حوالے سے اُن کی قدر دانی پر مبنی محبت کی وجہ سے، اُن کی درخواست کو رد نہ کر سکا؛ لیکن اپنے پاس سے اُن کے چلے جانے کے بعد، میں یہ سوچنے لگا کہ میں کب اور کیا لکھ سکوں گا؟ کب کا تعلق وقت کی تنگی سے ہے کہ اِس کے گراں قدر سرمایے کو بیماری اور اُس کے مُتَنَوِّع عوارض نے تتر بتر کر کے رکھ دیا ہے اور جن لمحات کو اُن کی دست برد سے میں بچا لینے میں کام یاب رہتا ہوں، وہ تحریری اور تدریسی فرائض کی ادائیگی اور اُن کے لیے نہ ختم ہونے والی فکر کی نذر ہو جاتے ہیں؛ لہٰذا ''مُستحَبَّات و نوافل'' کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ اِس پر مُستزَاد یہ کہ زود نویس نہیں؛ بل کہ انتہائی ''سست نویس'' واقع ہوا ہوں، شکر کی بیماری اور اُس کے نتائجِ بد کی وجہ سے عقل کی شادابی، فکر و نظر کی زرخیزی اور فطری ملکے کا بانک پن یا تخلیقی صلاحیت، بُری طرح مجروح ہوگئی ہے اور عائد کردہ کسی مضمون کا لکھنا تو میرے لیے اور بھی دشوار ہوتا ہے؛ لہٰذا وقت نہ جانے کب اِس موضوع پر لکھنے کا موقع دے گا یا نہ دے گا؟

اہلِ قلم کے زندوں پر لکھنے سے احتراز کی عمومی وجہ

کیا لکھ سکوں گا کا تعلق اِس بات سے ہے کہ مفتی صاحب مدظلہ بلاشبہہ انتہائی بافیض عالمِ دین ہیں؛ لیکن کسی زندہ پر لکھنا ہم جیسوں کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے؛ حال آں کہ زندہ باکمالوں کی قدر و قیمت سے اِنسانوں کو مُتعارِف کرانا، زیادہ مفید ہے؛ اِس لیے کہ اُن سے استفادے اور فیض یاب ہونے کی راہ کھلی ہوئی ہوتی ہے، جب کہ مردہ اصحابِ کمال سے استفادے کا اِس کے سوا کوئی اِمکان نہیں رہتا کہ اُن کی سیرت و سوانح — بہ شرطے کہ لکھ دی گئی ہو — کا مطالعہ کر کے اُن کے باکمال ہونے کے

مِنہاج کو اپنا کر، باکمال بننے کی کوشش کی جائے اور دین و دنیا کے اُن اکتسابات سے اپنا دامن بھرنے کی سعی کی جائے، جن کی وجہ سے کسی کو باکمال کہا جاتا اور لائقِ رشک سمجھا جاتا ہے؛ لیکن زندہ شخصیتیں ایسا لگتا ہے کہ قلم اور زبان کی راہ روک کے کھڑی ہوجاتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ عظیم کی عظمت، باکمال کا کمال اور باصلاحیت کی صلاحیت کا حتمی نتیجہ یعنی غیرت، خودداری اور شرافت، اہلِ زبان اور اہلِ قلم کو ملامت اور عتاب کے لہجے میں کہتی ہیں کہ تمھیں کیسے یہ ہمت ہوئی کہ تم میرے حامل کے جیتے جی — اور بعض دفعہ اُس کے منہ پر — اُس کی ثنا خوانی کرسکو؟۔ اُس کی قدردانی اور توقیر واحترام کے اور بھی طریقے اور دن ہوسکتے ہیں؟!۔

غالباً اِسی وجہ سے زندہ اہلِ علم وفضل کو تحریر وتقریر کا موضوع بنانے کا عام رواج نہیں؛ بل کہ صرف مُردوں کے کارناموں کو زندہ کرنے کی روِش عام ہے اور معمول بہ۔ اِس کی وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ مُردوں کے حوالے سے لکھنے بولنے والا بے تکلف جتنا اور جیسا چاہتا ہے لکھتا اور بولتا ہے؛ کیوں کہ کسی روکنے ٹوکنے والے کی روک ٹوک کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا؛ اِس لیے بے تکلفی، بے ساختگی، آمد اور خلوص کے عناصر کی بھرپور مدد، اُس کو حاصل رہتی ہے، جب کہ زندوں کی ''حضوری'' کا حجاب طرح طرح کے مسائل کے ساتھ، لکھنے بولنے والے کے سامنے حائل ہوجاتا ہے اور ''احتیاط''، مصلحت بینی اور پسند وناپسند کے جذبات کو پیشِ نظر رکھنے کی وجہ سے وہ ''آزادیِ رائے'' سے کماحقُّہ کام نہیں لے پاتا۔

زندوں پر لکھنا، بعض وجوہ سے زیادہ مفید

لیکن میری رائے میں زندوں کو، اُن کی زندگی میں اچھی طرح جاننے اور سمجھنے، خراجِ تحسین پیش کرنے اور اُن کے کارناموں کو اِنعاموں اور تمغوں کے ذریعے اُجاگر کرکے، اُن کا مزید حوصلہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ، نسلِ حاضر کو اُن کے نقشِ قدم پر

چلنے کی تلقین کی جو طرح یورپ میں قائم ہے اور جس کو اب دیارِ مشرق میں بھی برتا جانے لگا ہے؛ وہ بہت خوب اور لائقِ صد تقلید ہے کہ زندوں کے زندہ رہتے ہوئے، اُن کے کمال اور ہنر کی صحیح معرفت کے بعد، اُن سے بلاواسطہ اور بروقت فائدہ اٹھا کر اُن کی نکالی ہوئی راہ، انجام دیے ہوئے کارناموں اور روشن کی ہوئی شمع سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاسکتا اور دین و دنیا کی ترقّی کی منزلیں زیادہ آسانی اور تیزی سے طے کی جاسکتی ہیں؛ کیوں کہ زندوں کے حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ''نظریہ'' اور ''نمونۂ عمل'' دونوں موجود ہوتے ہیں۔ جب کہ مُردوں کے حوالے سے سچ یہ ہے کہ اُن کی سیرت و کردار کا ریکارڈ صرف ''نظریہ'' تو دیتا ہے؛ لیکن متحرک ''نمونۂ عمل'' نہیں دیتا؛ اِس لیے اُن کی سیرت و کردار کا مطالعہ کنندہ، یہ کہہ سکتا ہے کہ اِس سیرت اور کردار کو کس طرح برپا کیا جائے؟ یہ ہمیں کون بتائے گا؟ مشین (Machine) کے ساتھ راہ نما کتاب (Guidebook) اور ''کتابِ مبین'' کے ساتھ ''نورِ عظیم'' ایسا قانونِ فطرت ہے، جس کو خود خدائے ذوالجلال نے وضع کیا اور اُس کی راہ دکھائی اور خلق کو اُس پر چلایا ہے اور اُس کے بندوں نے اِس کو طبعی طور پر قبول کر کے اِس پر عمل کیا ہے۔

سجاد لائبریری کے طلبہ کا شکریہ

میں ''سجاد لائبریری'' کے باتوفیق طلبہ کو، مبارک باد دیتا ہوں کہ اُنھوں نے حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ کو تحریری طور پر خراجِ تحسین پیش کرنے اور طلبۂ عزیز کے لیے اُن کے علمی و عملی کارناموں سے، اُن کی زندگی ہی میں متعارف ہونے اور پھر اُن سے فائدہ اٹھانے اور اُن کی شخصیّت کو غنیمت جان کر، اُن سے بہ راہِ راست اکتسابِ علم اور ہنر کرنے کی ہمارے دارالعلوم میں طرح ڈالنے کی کوشش کی۔ اللہ اُن کی کوشش کو بارآور کرے اور اُنھیں اِس کا بہترین صلہ اور حضرت مفتی صاحب کو صحت و عافیت کے ساتھ توفیقِ مزید سے بھرپور عمر عطا کرے؛ تاکہ وہ اور زیادہ سے زیادہ نیکیوں

اور کام رانیوں کا ذخیرہ اکٹھا کر کے دونوں جہان میں خوب خوب سرخ رو ہوں۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے زیادہ گھل مل جانے کی وجہ

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب سے — بہاری ہونے کے حوالے سے ہم وطن اور ''مئوناتھ بھنجن'' میں تعلیم پانے اور وہیں کے ایک مدرسہ ''مفتاح العلوم'' میں کسبِ علم وکمال کرنے کے حوالے سے، تعلیمی ہم وطنی کے باوجود؛ کیوں کہ اِس ناچیز نے بھی وہیں کے دوسرے مدرسے ''دار العلوم'' میں متوسطات تک کی تعلیم حاصل کی — راقم الحروف کو دار العلوم دیوبند ہی میں داخلہ لینے کے بعد مُتَعارِفْ ہونے کا موقع ملا، نہ صرف مُتَعارِفْ ہونے؛ بل کہ دگر محنتی اور ذوقِ تعلّم ومطالعہ سے سرشار اپنے کئی مُعاصِرْ دوستوں اور ہم درس ساتھیوں کے ہم راہ بہت زیادہ گھلنے ملنے اور بے شمار علمی فائدہ اٹھانے کی سعادت حاصل رہی۔

مفتی صاحب سے جس چیز نے ہم لوگوں کو، اُس وقت اور بہت سارے طلبہ کو ہمیشہ، بہت زیادہ قریب ہوجانے اور بہت بہت فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، وہ اُن کی مثالی سادگی، مومنانہ اُنسیّت، پدرانہ اپنائیّت، بزرگانہ شفقت، اِسلامیانہ ہمدردی: ہر ایک کے لیے خلوص اور ظاہر وباطن کی یکسانیّت تھی اور ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر، اُن سے کوئی مشورہ کر کے، کسی طرح کی طالبِ علمانہ گفتگو، یا کسی موضوع پر استفادے کے لیے تبادلۂ خیال کر کے، کبھی بھی بے مزہ نہ ہوا، نہ یہ خدشہ ہوا کہ فلاں لفظ یا جملہ اُن کی علمی شان، بزرگانہ مقام اور راہِ علم وآگہی پر اُن کے طویل تجربہ کارانہ سفر کے حوالے سے، اُن کی عظمت کے خلاف تھا؛ اِس لیے خدانہ خواستہ، اب وہ دوسری ملاقات میں مجھے منھ نہ لگائیں گے۔

اُن کی اِس اُفتاد کی وجہ سے — جس پر خالق نے مصلحت اور حکمت ہی کے

تحت اُن کو پیدا کیا ہے — اُن کی طرف ہر ملنے والے کا دل کھِنچتا ہے اور وہ بار بار ملنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کا یہ وصف میرے نزدیک، اُن کے سارے علمی و عملی اوصاف پر بھاری ہے؛ کیوں کہ یہ نبوی وصف ہے۔ حضور ﷺ — فداہ اَبی و اُمّی — کے پیارے ساتھی بھی اِسی وصف کے حامل تھے، اِسلام میں علم و عمل کے قافلے نے اِسی ہتھیار سے جہاں گیری و جہاں داری و جہاں بانی کی ہے۔ خود اِسلام نے دلوں کو نرم خوئی و دل جوئی، اخلاقِ کریمانہ اور خلوصِ دل برانہ کے ذریعے ہی فتح کیا ہے۔ اسلام کے سارے اکتسابات کا سہرا ''فاتحِ عالم'' محبت و خلوص اور مُسخِرِ عقل و قلب ہم دردی و غم گساری کے سر جاتا ہے۔

مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے بہت زیادہ گھلنے ملنے کی اصل وجہ یہی تھی۔ کسی وقت، کسی بھی حال میں اُن کے پاس چلے جایئے، وہ آپ کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہیں گے اور اِس طرح خوش ہوں گے جیسے وہ آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ اگر لکھنے پڑھنے میں لگے ہوں، تب بھی وہ آپ کے آدھمکنے سے ذرا بھی کبیدہ نہ ہوں گے؛ بل کہ وہ انتہائی ضروری مشغلے کو، جس کو وہ چھیڑے بیٹھے ہوں گے، ایک طرف کو ڈال، اب صرف آپ کے لیے خالی ہو جائیں گے۔ اُن کے رہن سہن، رفتار و گفتار، زندگی کے سارے جھمیلوں اور شب و روز کے سارے کاموں میں یہی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی نظر آئے گی۔ نَستعلیقیّت، تہذیب، متانت، نفاست، رکھ رکھاؤ اور ترتیب و تنظیم، ہے تو اپنی جگہ اچھی چیز اور جو لوگ اِن اوصاف کو سلیقے سے برتنا جانتے ہیں، وہ واقعی قابلِ تعریف ہیں؛ لیکن بہ ہر کیف اُن کے برتنے میں ذرا سی ''بدسلیقگی'' اور ''بے ڈھنگے پن'' کے در آنے سے، دوسروں کے ساتھ ساتھ، برتنے والے کو بھی اذیّت ہوتی ہے، خواہ وہ اِس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ مفتی صاحب کو آپ اپنی ذات کی طرح برت سکتے ہیں، فطرت کی عام بخششوں کی طرح استعمال کر سکتے ہیں، جہاں چاہیے بیٹھا دیجیے، جو چاہیے کھلا دیجیے، جس سواری پر چاہیے سفر کرا دیجیے، اچھے بُرے جس انداز میں پیش

آیئے، وہ اپنی بے نفسی اور پیدائشی سادگی کی وجہ سے، ذرا بھی بُرا نہ مانیں گے۔

شخصیّت کی طرح تحریر وتقریر میں سادگی

اُن کی یہی سادگی، بے ساختگی، نرمی اور گدازی؛ اُن کی تحریر وتقریر میں بھی نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے عام فہم مُفرَدات ومُرکّبات سے اُن کی تحریر وتقریر کے جملے اِس طرح ڈھلے ہوتے ہیں کہ آپ کو، اُن کے جیسے کسی بھی کثیر التصانیف عالم اور اہلِ قلم کی تحریر میں یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ وہ نہ لفظیّات کی شوخی سے قاری کے لیے باعثِ تکان ہوتے ہیں، نہ اُسلوب کی شوکت کے باعثِ مرعوبیّت، نہ ساختیات کے بناؤ سنگار سے باعثِ اُلجھن، نہ فصاحت وبلاغت کی بے جا زور آوری سے باعثِ اذیّت، نہ جملوں کی درازی اور پُر پیچ ہونے کی وجہ سے ہمت شکن۔ آپ پڑھتے اور سنتے جایئے، آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کو، آپ ہی کی بات، آپ ہی کی زبان میں، کہی جا رہی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُنھوں نے طالبِ علمی کے زمانے میں ہم لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ میں نے لکھنے کے لیے کسی تکلف کو راہ نما نہیں بنایا۔ بس بلا اِرادہ اور بے تکلف، اپنی بات کو اپنی زبان میں، کسی آورد اور گہری سوچ کے بغیر، لکھنے کا میں نے اپنے آپ کو عادی بنایا۔ لفظوں اور ترکیبوں کی تحسین وتزیین کی کبھی نہیں سوچی، نہ اِس پر توجّہ دی، نہ اِس کو مسئلہ بنایا۔ غالبًا اچھا اور سچّا اور کھرا لکھنے کے لیے، یہ بنیادی اُصول ہے۔ اِس اصول کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے والا کسی بھی مرحلے میں اپنے کو تھکاتا ہے، نہ قاری کو۔ اِس کے سوا جتنے طریقے ہیں، بے شمار خوبیوں کے باوجود، بے شمار خرابیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کا اُصول طبعی ہے، بے ساختہ ہے، سہل العمل ہے، سہل التقلید ہے۔ نوآموز اور نو واردِ بساطِ تحریر کو، آپ اِس سے زیادہ سیدھی، فطری، سچّی اور حقیقت سے سو فی صد ہم آہنگ راہ کی راہ نمائی کر بھی نہیں سکتے؛ اِسی لیے مفتی صاحب کی تحریر میں، طوالت ہے نہ تکرار، الفاظ کا الجھاؤ ہے نہ جملوں کا، ترادف کی

بھرمار ہے نہ الفاظ وتعبیرات کا اِسرافِ بے جا۔

مفتی صاحب کا تحریری امتیاز

اُن کی طبعی نرمی وگدازی، سادگی وخوش اَخلاقی ہی کا اثر، اُن کی طرزِ تحریر پر بھی ہے: وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور خوب صورت حروف میں اپنی بات لکھتے ہیں۔ سطریں بالکل سیدھی جیسے اسکیل سے لکیر ڈال کر لکھی گئی ہوں، ہر لفظ؛ بل کہ ہر حرف سے جیسے ندا آرہی ہو کہ یہ سادہ مزاج اور تکلف نا آشنا عالم کی تحریر ہے۔ مفتی صاحب بہت سے علما اور ''تعلیم یافتہ'' کہے جانے والے بدسلیقہ لوگوں کی طرح اپنی تحریر کے بھدّے پن، شکستگی، سطروں کی کجی، حروف کی نامانوس صورت گری، یا اُن کے بھاری بھرکم پن اور بڑے ''ڈیل ڈول'' کے ذریعے یا بہت باریک اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قراءت ہونے کی بناپر؛ آپ کے لیے باعث اذیّت نہ ہوں گے۔ وہ کوئی خط لکھیں، درخواست لکھیں، مضمون تحریر کریں، کسی کتاب کی تالیف کریں؛ ہمیشہ اُن کی تحریر قلم برداشتہ، کاٹ چھانٹ سے پاک اور تبییض کی ضرورت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ میں نے جن مُعاصِر اہلِ علم وکمال اور صاحبِ تالیف کو دیکھا ہے اور اُن کی صحبت سے فیض پایا ہے، اُن میں تحریر کی صفائی؛ بل کہ خوش خطی کے حوالے سے علامہ، مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری، ثم الدہلویؒ (متوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء) کے صاحب زادے، ادیب وشاعر وعالم وفقیہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصف (متوفی ۱۴۰۷ھ/۱۹۸۷ء) کے بعد حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ ہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر تو اپنے علمی کمالات کے ساتھ ساتھ باقاعدہ خطّاط اور خوش خطی کے ماہرین میں تھے؛ لیکن مفتی صاحب نے خوش خطی کے فن پر شاید کبھی بھی توجہ نہ دی ہوگی، مگر طبعی طور پر اُن کی تحریریں، اُن تمام خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں، جن کی کسی باذوق قاری کو نہ صرف تلاش ہوتی ہے؛ بل کہ جن سے، ہر قاری کا جی خوش ہوتا ہے؛ کیوں کہ

اُس کے قلب وذہن کو پڑھتے وقت راحت محسوس ہوتی ہے اور دعا دیتا ہے کہ اللہ صاحبِ تحریر کو جزاے خیر دے کہ اُس نے راحت بخش طرزِ تحریر سے بھی فائدہ پہنچایا۔

مفتی صاحب کے تحریری وتالیفی کارنامے

مفتی صاحب نے مُتَنَوِّع موضوعات پر لکھا اور کام کیا، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن بن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) کے فتاویٰ کی تدوین وترتیب کا اہم کام انجام دیا، جو ۱۲ جلدوں میں ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے ہمیشہ شائع ہوتا رہتا ہے۔ اِس کے علاوہ تعارفِ مخطوطات دارالعلوم دیوبند حصہ اول ودوم جیسا مشقّت طلب کام بھی کیا۔ اُنھوں نے نظامِ عفت وعصمت، نظامِ مساجد، نظامِ تربیت، نظامِ تعمیر سیرت، اسوۂ حسنہ، تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگری، تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ، مشاہیر علماے دیوبند، حکیم الاسلام اور اُن کی مجالس، حیاتِ مولانا گیلانیؒ، جرم وسزا کتاب وسنت کی روشنی میں، اِسلامی حکومت کے نقش ونگار، دارالعلوم کا قیام اور اُس کا پس منظر، وغیرہ بہت سی کارآمد کتابوں سے اِسلامی کتب خانے کو مالا مال کیا ہے۔

مفتی صاحب نے اچھا کیا کہ اپنی سوانح بھی، اپنی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ سے ''زندگی کا علمی سفر'' کے نام سے لکھ کر علما، طلبہ، اہلِ قلم اور تاریخ کے شائقین کو علمی تحفے سے نواز کر، اُن پر بڑا اِحسان کیا۔ آدمی اپنے حوالے سے جتنی سچی بات خود کہہ سکتا ہے، دوسرا آدمی نہیں کہہ سکتا۔ بنیادی اور اصل معلومات بھی جن کے بغیر کسی تاریخ، سوانح اور سیرت کی اَساس قائم نہیں ہوسکتی، آدمی اپنے حوالے سے خود ہی فراہم کرسکتا ہے۔ دوسروں کی فراہم کردہ معلومات اِتنی لائقِ اعتماد نہیں ہوسکتیں، جتنی خود کی فراہم کردہ، نیز دوسروں کے لیے کسی کے متعلق اَساسی معلومات تک پہنچنا مشکل بھی ہوتا ہے؛ اِسی لیے آج کل ''بایوڈاٹا'' (ذاتی بنیادی معلومات) کا جو سلسلہ چلا ہوا ہے، بہت مفید ہے۔

مفتی صاحب کے یگانۂ روزگار اساتذہ

مفتی صاحب نے ہندوستان کے عصرِ حاضر کے سب سے بڑے مُحدّث اور اَسماء الرجال کے فاضلِ یگانہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی متوفی ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء جیسے استاذ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، مولانا علامہ سید سلیمان ندویؒ متوفی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء، امیرِ شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ متوفی ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء، مولانا عبدالرحمٰن امیرِ شریعت بہار واڑیسہ متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ متوفی ۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ متوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ متوفی ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، مولانا شاہ فضل اللہؒ متوفی ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، کی صحبت سے نہ صرف فیض پایا؛ بل کہ اُن سے خوب خوب روحانی، علمی اور فکری پیاس بجھائی؛ اِسی لیے نہ صرف یہ کہ اُن کا علمِ شریعت ٹھوس ہے؛ بل کہ اُن کے ہاں فکری استقامت، تجربے کی پختگی اور زبان وقلم کی راست روی کا جو امتیاز نظر آتا ہے، وہ اُنھی اساطینِ علم وکمال وطریقت کا فیضان ہے، جو مفتی صاحب نے خدا کی توفیق سے اچھی طرح جذب کیا تھا۔

مفتی صاحب کے پاس چند منٹ بیٹھیے، آپ اُن کی گفتگو سنیے، چھوٹے چھوٹے اور سادہ جملوں میں آپ کو زندگی کی ایسی ایسی حقیقتوں سے روشناس کرادیں گے کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی اور آپ عَش عَش کرتے رہ جائیں گے اور حیرت ہوگی کہ دیکھنے میں ایسا سیدھا سادہ بوڑھا زندگی، انسان اور کائنات کا اتنا کچھ تجربہ کیوں کر رکھتا ہے۔ اِس کے بعد اپنی زندگی میں جتنا کچھ تجربہ کریں گے آپ کے نزدیک مفتی صاحب کی کہی ہوئی بات کی سچائی کی تہیں ایک ایک کرکے کھلتی چلی جائیں گی اور یقین ہوجائے گا کہ جس حوالے سے، اُنھوں نے جو بات کہی تھی، وہ حرفِ آخر یا پتھر کی لکیر تھی، اب اُس سے آگے یا اُس کے سوا کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

ظاہر و باطن کی یکسانیت

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مفتی صاحب، صرف ظاہر کے سادہ اور نرم خو ہی نہیں، وہ دل کے بھی بہت صاف اور اُس کی بیماریوں سے میرے تجربے کے مطابق خاصے پاک ہیں، کینہ، بغض، دشمنی کے جذبات کی پرورش اور انسانوں سے نفرت کا اُن کے ہاں کوئی گزر نہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اگر کسی سے، کوئی تکلیف پہنچتی ہوگی، تو میرا دل کہتا ہے کہ اُس کی وجہ سے بھی اُن کے دل میں پیدا ہونے والا تأثُّر، آنے اور گزر جانے والے خیال کی طرح آتا اور گزر جاتا ہوگا۔ اِنسان کا چہرہ اُس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے، مفتی صاحب کے چہرے کو پڑھنے والا ہر آدمی میری بات کی تصدیق کرسکتا ہے۔

یہ وہ صفت ہے جو تھوڑے علم، علمی تحقیقات اور علمی اِفادے اور فکری نفع رسانی سے تہی دامنی؛ بل کہ بالکل جہل کے ساتھ بھی انتہائی محبوب ہوتی ہے؛ لیکن اگر یہ مفتی صاحب جیسے علمی، فکری، تالیفی اور تدریسی خدمات کے بڑے سرمایے کے حامل میں پائی جائے، تو اور بھی لائقِ محبت اور قدر دانی ہے؛ کیوں کہ عموماً ان سے بہت چھوٹے قد کے، بہت سے لوگ علمی پندار کی وجہ سے دل کے میلے، ظاہر کے برّاق اور باطن کے انتہائی تاریک ہوتے ہیں۔ آپ یقین جانیے کہ اکثر ''اہلِ علم'' اور ''باکمال'' سے مل کر جی خوش نہ ہوا۔ اُنھیں برَت کر، اُنھیں سمجھ کر، دل نے کہا کہ واقعی دور کا ڈھول سہانا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر، اُن کے پاس بیٹھ کر، اُن سے گفتگو کر کے، اُن سے فائدہ اٹھا کر، کبھی بھی کوئی کدورت نہ ہوئی۔

مخلص و تجربہ کار مُشیر

مفتی صاحب کا ایک اور وصف بھی بہت قدر کے لائق ہے کہ آپ اُن سے کسی مسئلے میں مشورہ کیجیے، تو بہت صحیح اور ٹھوس مشورہ دیں گے۔ مشورے کے حوالے سے یہ

بتایا گیا ہے مشورہ مخلص، صالح اور سن رسیدہ و تجربے کار سے کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب میں یہ سارے اوصاف بہ تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ اُن سے جب بھی کوئی مشورہ کیا اور مشورے کے بعد اٹھا، تو دل میں انشراح محسوس ہوا اور بعد میں اُس پر عمل کیا، تو خیر ہی خیر نظر آیا اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ اپنے اِس بندے کو بہت نوازے کہ اِس نے مجھے میرے مطلب اور مفاد کی صحیح راہ دکھائی۔

خُرد وں کی کام یابی کو اپنی کام یابی تصور کرنے والے

مفتی صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ خُردوں کی کام یابی اور ترقی سے بہت خوش ہوتے ہیں؛ کیوں کہ اُن کی کام یابی کو وہ اپنی ہی کام یابی تصور کرتے ہیں، یہ بھی اُن کے مخلص ہونے کی دلیلوں میں سے ایک ہے اور صحیح انسان، سچا مسلمان اور حقیقی معنی میں مُربّی ہونے کی ٹھوس شہادت بھی۔ جب کہ بہت سے ”بڑے“ چھوٹوں کی ترقی کو اپنی تنزلی سمجھ کر بے حد رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اِس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ بہت سے خرد اور واقعتاً ناچیز قسم کے لوگ بھی نہ صرف اپنے ہم عمروں اور ہم سفروں کے آگے بڑھنے سے مَلُول ہوتے ہیں؛ بل کہ اپنے بڑوں کے اکتسابات سے بھی بہت افسردہ ہوتے ہیں، جیسے اِن بڑوں نے اُن کا کوئی حق مار لیا ہو، یا اِن کی راہ روک کے بیٹھ گئے ہوں۔

دار العلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی کی طالبِ علمی سے، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کی تدریس کے دوران، حضرت مفتی صاحب سے میں اور میرے بہت سے ساتھی اِس طرح جُڑے رہے، جیسے ایک بیٹا شفیق باپ سے اور ایک سچی طلب رکھنے والا مُرید اپنے حلیم و کریم و تجربے کار و خلوص شعار شیخ سے۔ اُن سے غیبوبت کے دوران خط و کتابت بھی رہی اور انھوں نے خطوط کے ذریعے بھی ہمیشہ ایسے خلوص و محبت کا ثبوت دیا، جس کا اب کسی سے تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ تھے، جو زمانے کی خُرد برد سے محفوظ نہ رہ سکے، اب چند خطوط رہ گئے ہیں، طوالت

کے خوف سے صرف ایک دو خطوط پر اکتفا کیا جاتا ہے، زندگی نے وفا کیا اور خدائے کریم کی توفیق نے ساتھ دیا، تو اِن شاء اللہ اپنی خودنوشت میں اُن کے باقی ماندہ خطوط بھی درج کیے جائیں گے۔

دارالعلوم ندوۃ العلما میں میری تدریس کے اولیں دنوں میں اُنھوں نے اپنے ایک شفقت نامے کے ذریعے، ناچیز کا حوصلہ بڑھایا اور اپنے تعلقِ خاطر کا اِس طرح اِظہار فرمایا:

عزیز مکرم! أیّدکم اللہ تعالی بروح منه

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ محبت نامہ ملا، دلی مسرت ہوئی، آپ نے فراموش نہیں کیا، یاد رکھا۔ یہ آپ کے انتہائی خلوص ومحبت کا نتیجہ ہے۔ آپ کے پہلے خط کا جواب لکھا تھا، حیرت ہے نہیں ملا۔ یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ آپ کا خط آتا اور اِس کے باوجود میں خاموش رہ جاتا۔ یقیناً آپ کو اِس سے تکلیف پہنچی ہوگی۔ مگر اِس میں میری کیا کوتاہی ہے؟۔ میں تو ہر تذکرے کے بعد، خود ہی سوچتا ہوں کہ کب آپ کا خط آئے گا؟ اِس صورت میں ناراضی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟۔ بہ ہر حال اس کا اِحساس ہے کہ آپ کے قلب میں اِس خاک سار کی محبّت ہے۔ آپ کے خط سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ آپ پڑھانے بھی لگے ہیں، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور اسے ترقی کا زینہ بنائے۔ اِن شاء اللہ آپ کی طلب ومحنت رائے گاں نہ جائے گی، ثمرہ مل کر رہے گا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ میں ہیں تو ابھی میں ۸؍دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ سے گزرتا ہوا دیوبند آیا ہوں ضرور لکھنؤ اُتر کر ملتا، میں نے سمجھا کہ جب آپ رمضان میں دہلی اور دیوبند نہیں آئے، تو گھر گئے ہوں گے۔ آپ یقین کریں جس قدر خواہش آپ کو ملنے کی ہے، اُس سے زیادہ قلبی طلب اِدھر بھی ہے اور اِسی کا غالباً نتیجہ ہے کہ جواب نہ پہنچنے کے بعد بھی آپ نے پھر یاد کیا۔

1/11/1392ھ

عزیزم سجاد احمد سلمہ (۱) فراغت کے بعد گھر گئے تھے، ابھی شوال میں اُن کو ''سانحہ'' بھیج کر آیا ہوں، وہاں وہ میٹرک کی تیاری میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں کام یاب فرمائے اور میاں حماد سلمہ (۲) کو جامعہ رحمانی مونگیر بھجوا دیا ہے؛ اِس لیے کہ ''سانحہ'' سے قریب ہے۔ میاں احمد سجاد اُس کی نگرانی بھی کریں گے۔ البتہ عبّاد سلمہ (۳) کو اپنے ساتھ یہاں لایا۔ وہ یہاں حفظ کررہے ہیں۔

مولانا علی میاں مدظلہ (۴)، مولانا سعید الرحمٰن سلمہ (۵) اور مولانا شمس تبریز (۶) سے سلام مسنون عرض ہے۔ اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے رہیں۔ میرا علمی تعلق ندوہ سے بھی ہے؛ اِس لیے کہ میں وہاں کچھ دنوں طالبِ علم رہ چکا ہوں، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب رحمہ اللہ اور مولانا محمد ناظم صاحبؒ اور مولانا اسحاق صاحب دامت برکاتہم (۷)، یہ سب ہمارے اساتذہ رہے ہیں، گو ندوہ والے یہ نہیں جانتے۔

طالبِ دعا

محمد ظفیر الدین، دار العلوم دیوبند

شبِ ۶/ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ 12/12/1972

۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۵ء میں حضرت الاستاذ مولانا وحید الزماں کیرانوی پر، اُن کے

(۱) مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے، جو اِس وقت اپنے وطن ''پورہ نوڈیہا'' کے جوار میں ہی کسی گاؤں کے ہائی اِسکول میں بڑے ٹیچر ہیں اور مفتی صاحب کی خدمت میں جی جان سے لگے رہ کر اپنے لیے ذخیرۂ آخرت اکٹھا کررہے ہیں۔ اللہ ہمیشہ باتوفیق رکھے۔

(۲) مفتی صاحب کے دوسرے صاحب زادے۔

(۳) مفتی صاحب کے تیسرے صاحب زادے۔

(۴) بہ وقتِ اشاعت ایں مضمون بہ شکل کتاب ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰۱۰ء رحمۃ اللہ علیہ۔

(۵) حال مہتمم دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔

(۶) مولانا شمسِ تبریز قاسمی مشہور اَدیب واہلِ قلم، سابق رفیقِ مجلسِ تحقیقات ونشریاتِ اِسلام لکھنؤ وحال پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی۔

(۷) متوفی ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء۔

انتقال کے چند ماہ بعد راقم نے اُن پر تاثُّراتی کتاب لکھی، تو مفتی صاحب نے اپنا برجستہ تاثر اُس پر ذیل کے الفاظ میں، بہ صورتِ مکتوب میرے پاس ایک طالب علم کے ہاتھ کتاب بھیجنے کے دوسرے دن ارسال فرمایا، جو راقم کے لیے ایک وقیع سند کا درجہ رکھتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادرِ عزیز (مولانا امینی) سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کی تازہ تصنیف لطیف ''وہ کوہ کن کی بات'' ابھی ایک صاحب سے ملی، سرسری طور پر دیکھ گیا، پسند آئی، خاک سار پر جو حاشیہ لکھا ہے، وہ بھی پڑھا؛ بل کہ پڑھ کر اپنے عزیز طلبہ کو سنایا۔ سبھوں نے پسند کیا اور مجھ پر تو آپ کا شکریہ واجب ہو گیا کہ آپ نے ایک بے مایہ کی عزت افزائی اور قدر دانی کا ثبوت دیا، یہ آپ کی محبت کا زندہ وتابندہ ثبوت رہے گا، حماك الله عن شر النوائب. جزاك الله في الدارين خيرًا.

آپ کی کتاب کا لب ولہجہ اور بے ساختگی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اگر میرا کوئی ایسا شاگرد ہوتا، تو مرجانے میں فائدہ تھا— جو بھی آپ کی کتاب پڑھے گا اور اہلِ دل ہوگا، تو وہ ایسے تلمیذِ رشید کی سعادت مندی پر لازماً فخر کرے گا اور کہے گا کاش ایسا ہونہار شاگرد مجھے بھی مل جاتا اور میں مرجاتا— اللہ تعالیٰ آپ کی یہ خدمت قبول فرمائے اور اِس کے ثمرے میں کوئی ویسا ہی شاگرد آپ کو بھی عطا کردے۔ آمین

ہمارے طلبہ کہتے ہیں کہ اِنھوں نے ایک نسخہ (کتاب کا) آپ تک بھیج کر بخل کیا، معلوم ہوتا ہے، یہی حال اِن کی کتاب کا تو نہیں ہے کہ تحریر ہی تحریر ہے دل میں نقش نہیں، میں کہتا ہوں ایسی بات نہیں۔ اِس کتاب کا ایک ایک جملہ بولتا ہے کہ دل میں اُن کے اُستاذِ محترم کا جو نقش ہے، وہ اس سے

بہت زیادہ گہرا ہے، میں استاذ نہیں؛ لیکن میں اُن کو غیر مخلص نہیں جانتا، میرے تو صرف عزیز ہیں۔

والسلام

محمد ظفیرالدین، مفتی دارالعلوم دیوبند

۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ

یہ سطریں کل کے مؤرخ اور سوانح نگار کے لیے قیمتی سرمایہ

اِن سطروں میں مفتی صاحب کی خوبیوں کا اِحاطہ ممکن ہے نہ مقصود، یہ چند باتیں برجستہ قلم کی زبان پر آگئیں، تو میں نے دستورِ زبان بندی پر عمل نہ کرکے، قلم کو اپنی باتیں بہ عجلت اِس لیے کہنے دی ہیں؛ تاکہ ہمارے طلبہ اور تحصیلِ علم کے راہ رو، اپنے ذوق وشوق کو مہمیز کرسکیں اور مفتی صاحب کی قدر کرنے کی، اُنھیں مزید توفیق ہو؛ تاکہ اُن کی شیخوخت سے لبریز زندگی کو غنیمت جان کر، اُن سے زیادہ سے زیادہ استفادے کے لیے کوشاں ہوں۔ واللہ وحدہ الموفق لکل خیر۔

نیز کل کے سوانح نویس اور تاریخ نگار کے لیے بھی، یہ باتیں ریکارڈ ہوجائیں؛ تاکہ اُنھیں اپنے کام میں سہولت ہو اور مفتی صاحب کے ساتھ ساتھ اس گنہ گار کو بھی دعا دے کر اپنے رب سے اپنا بدلہ پاسکیں۔

وہ کوہ کن کی بات میں، ص ۱۲۰-۱۲۱ پر حاشیے پر، اِس راقم نے مفتی صاحب کے متعلق کئی سال قبل جو بات کہی تھی، جی چاہتا ہے کہ اِس مضمون کو اُسی پر ختم کیا جائے؛ اِس لیے ذیل میں وہ ہدیۂ ناظرین ہے:

> مولانا مفتی ظفیرالدین صاحب مفتاحی: مفتی دارالعلوم دیوبند: جہاں دیدہ، نرم وگرم چشیدہ، صائب الرائے، بے تکلف، رحم دل، بات میں سادہ، معانی میں دقیق، اردو کے بے ساختہ اہلِ قلم، بیسیوں کتابوں کے مصنف، خط ایسا پاکیزہ، جیسے موتیوں کی لڑی۔ تاریخِ ولادت ۱۳۴۴ھ-۱۹۲۶ء ہے، اُن کا

وطن ''پورہ نوڈیہا'' ضلع دربھنگہ (بہار) ہے۔ ۱۹۴۴ء میں مفتاح العلوم مئو سے فارغ ہوئے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی (محدث جلیل) (متوفی ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء) کے اخص تلامذہ میں ہیں۔ دینی، تاریخی اور سیرت وسوانح کے موضوعات پر بیس سے زائد گراں قدر کتابوں کے مصنف ہیں، تحقیقی مقالات ومضامین اِن کے علاوہ ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ جن چند لوگوں کا میرے اوپر جو گراں قدر احسان ہے، اُن میں سے ایک ہیں۔ راقم الحروف کے اردو کے مذاق کی تخلیق میں، عجب نہیں کہ کچھ حصہ اُن کا بھی ہو۔ زمانۂ طالب علمی میں اُن کی وساطت سے پاکستان سے آمدہ اردو کے ادبی رسالے، اپنے کمرے لے جاتا اور اُن سے بہت فائدے اٹھاتا۔ ہم محبانِ ادب طلبہ، روزانہ دن یا رات میں ایک مرتبہ، اُن کے پاس ضرور بیٹھتے اور شوقِ زبانِ اردو کو بالیدہ کرنے کے ساتھ ساتھ، عقل وخرد کو بھی پختہ کرتے۔

دارالعلوم سے جانے کے بعد، مراسلت کے ذریعے ہمیشہ راہ نمائی کرتے رہے اور مادی ومعنوی ہر طرح کی دست گیری سے، زندگی کے کسی بھی مرحلے میں دریغ نہیں فرمایا۔ رسمی طور پر میرے استاذ نہ ہونے کے باوجود، اُستاذ سے زیادہ کچھ جَزَاهُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ .(۱)

سوانحی خاکہ

❁ پیدائش: ۲۱ (۲۲) رشعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ۷رمارچ ۱۹۲۶ء، والد صاحب کا نام محمد شمس الدین تھا، جو ریلوے میں ملازم تھے، اُن کی وفات ۱۹۴۶ھ/۱۳۶۵ء میں ہوئی۔

❁ وطن: موضع پورہ نوڈیہا، ضلع دربھنگہ، بہار، جو دربھنگہ سے جانب شرق میں ۵ کلومیٹر کی دوری پر ''کملا

(۱) جائے تحریر ایں مضمون: افریقی منزل قدیم، نزدِ چھتہ مسجد، دیوبند، سہارن پور، یوپی۔ بہ وقت ۱۰ ربجے شب شنبہ، بہ تاریخ: ۱۴۲۶/۶/۳۰ھ مطابق ۲۰۰۵/۸/۶ء۔ (۱۴۲۶/۶/۲۹)

ندی‘‘ کے کنارے واقع ہے۔

❁ تعلیم ابتدائی و متوسط: ابتدائی تعلیم گھر پر، پھر مدرسہ محمودیہ، راج پور، ترائی نیپال میں۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۰ء تک مدرسہ وارث العلوم چھپرا (بہار) میں جہاں اُن کے چچازاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ (متوفی ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء) امیرِ شریعت، پڑھاتے تھے۔ یہاں اُنھوں نے فارسی اور عربی کی کتابیں متوسطات تک پڑھیں۔

❁ اعلیٰ تعلیم: ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک آپ نے اعلیٰ تعلیم جامعہ مفتاح العلوم مئو میں حاصل کی۔ آپ کے یہاں کے اساتذۂ گرامی میں محدِثِ کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء — ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء) اور عالم و قائد مولانا عبداللطیف نعمانی مئویؒ (۱۳۱۵ھ/۱۸۹۹ء — ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۳ء) مولانا محمد یحیٰ اعظمیؒ، مولانا شمس الدین مئویؒ وغیرہم تھے۔

❁ تدریسی و علمی خدمات: ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء میں فراغت کے بعد ایک سال مفتاح العلوم مئو میں مُدَرِّس رہے، اُس کے بعد ستمبر ۱۹۴۵ء سے دسمبر ۱۹۴۷ء تک مدرسہ معدن العلوم، نگرام، ضلع لکھنؤ میں تین سال تدریسی خدمت انجام دی، جنوری ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم معینیہ موضع ’’سانحہ‘‘ ضلع مونگیر (حال ضلع بیگوسرائے) میں مدرس ہوئے، یہاں ۱۹۵۶ء تک درس و تدریس میں مشغول رہے، درمیان میں ایک سال از محرم ۱۳۶۸ھ تا اَواخرِ ۱۳۶۸ء جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل وسملک، سابق ضلع سورت حال ضلع نوساری، میں تدریسی خدمتیں انجام دیں، وہاں بیمار ہوگئے؛ اِس لیے واپس دارالعلوم معینیہ سانحہ آ گئے۔

● ندوۃ العلماء لکھنؤ میں: قابلِ ذکر ہے کہ مفتی صاحب مدظلہ نے علامہ سید سلیمان ندوی کی تشویق و ترغیب پر شوال ۱۳۶۴ھ میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں پڑھنے کے لیے داخلہ لیا؛ لیکن وہاں کچھ مہینے ہی گزار سکے پھر ’’نگرام‘‘، ضلع لکھنؤ کے مدرسہ معدن العلوم میں حضرت مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کی ذہن سازی کی وجہ سے مدرس ہوگئے۔ اُن کے ندوہ کے اساتذہ میں مولانا حلیم عطا شاہؒ، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ اور مولانا حمید الدینؒ وغیرہ تھے۔

● دارالعلوم دیوبند میں: (۹ ستمبر ۱۹۵۶ء) ۳ر صفر ۱۳۷۶ھ کو دارالعلوم میں شعبۂ تصنیف و تالیف سے منسلک ہوئے۔ ۱۳۸۳ھ میں مُرَتِّبِ کتب خانہ کے عہدے پر فائز ہوئے، اِسی دوران فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب کا عظیم الشان کام انجام دیا، جو ۱۲ جلدوں میں مسلسل شائع ہورہا ہے، یہ سارے فتاویٰ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی دیوبندیؒ کے ہیں۔ آپ کے مزید فتووں کی ترتیب کے سلسلے میں اب

دارالعلوم میں پیش رفت ہورہی ہے۔ اِس وقت (۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء) میں ۱۳ویں اور ۱۴ویں جلدیں بعض اساتذۂ دارالعلوم کی نگرانی میں چھپ چکی ہیں۔

● **مطالعۂ علومِ قرآنی کی نگرانی وسرپرستی:** ۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم میں ایک خصوصی شعبہ ''مطالعۂ علومِ قرآنی'' کے نام سے قائم کیا گیا جس کی سرپرستی، نگرانی اور رہ نمائی کے لیے مجلسِ شوریٰ نے حضرت مفتی صاحب ہی کو منتخب کیا۔ یہ ۱۳۸۸ھ تک قائم رہا، اُس کے بعد بعض ذمّہ داروں کے ایما سے اِس کو بند کردیا گیا۔ یہ شعبہ بہت کام یاب اور دارالعلوم کے ذہین طلبہ اور باصلاحیت فُضلا کے لیے، اپنی علمی اور تحریری لیاقت کو پختہ کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔

۞ **اِداریہ رسالۂ ''دارالعلوم'' کے لیے انتخاب:** صفر ۱۳۸۵ھ میں مجلسِ شوریٰ نے رسالہ دارالعلوم کے اداریے کی تحریر کے لیے مفتی صاحب کو منتخب کیا اور اُنھیں باقاعدہ رکنِ ادارت قرار دیا۔ ماہِ ربیع الاوّل ۱۳۸۵ھ سے اُنھوں نے اداریہ لکھنا شروع کیا، یہ سلسلہ تقریباً ۱۷سال تک جاری رہا، ۱۴۰۲ھ میں موقوف ہوا۔

● **دارالافتا میں مفتی:** ۱۹۹۳ء میں آپ دارالافتاء میں مفتیِ دارالعلوم کے منصب کے لیے منتخب کیے گئے۔ ۱۹رشعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۱راگست ۲۰۰۸ء بہ روزِ جمعرات تک اِس منصب پر فائز رہے۔

● ۲۰رشعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۲راگست ۲۰۰۸ء بہ روزِ جمعہ کو خود سے سبک دوشی لے کر گھر چلے گئے، کیوں کہ کم زوری اور پیرانہ سالی کی وجہ سے، بہت سے اَعذار پیدا ہوگئے تھے۔ دارالعلوم سے ۲۰۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ تاحیات کا اِجرا عمل میں آیا۔ اللہ صحت کے ساتھ اُن کی عمر دراز کرے۔

۞ **تصنیفات:** مفتی صاحبؒ میں تالیف واِنشا کا فطری ذوق ہے، زبان سادہ اور رواں لکھتے ہیں، اُن کی تحریر ہرطرح کے تکلف سے پاک ہوتی ہے، اُنھوں نے بہت سی کتابیں اور سیکڑوں مقالات لکھے، جو ملک کے طول وعرض میں مختلف رسائل میں چھپے، اُنھیں جمع کردیا جائے تو دسیوں کتابیں تیار ہوجائیں گی۔

اُن کی مشہور کتابوں میں ذیل کی کتابیں ہیں:

۱-جماعتِ اسلامی کے دینی رجحانات۔ ۲-اسلام کا نظامِ مساجد۔ ۳-نظامِ عفت وعصمت۔ ۴-نظامِ امن۔ ۵-نظامِ تعلیم وتربیت۔ ۶-نظامِ تعمیرِ سیرت۔ ۷-اسلامی حکومت کے نقش ونگار۔ ۸-تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی۔ ۹-تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگری۔ ۱۰-دینی جدوجہد کا روشن باب: اِمارتِ شرعیہ۔ ۱۱-حکیم الاسلام اور اُن کی مجالس۔ ۱۲-تعارف مخطوطات کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند، دو جلدیں۔ ۱۳-مشاہیر علماے دیوبند۔ ۱۴-دارالعلوم کا قیام اور اُس کا پس منظر۔ ۱۵-حیاتِ مولانا گیلانی۔

۱۶-اسلامی نظامِ معیشت۔ ۱۷-تاریخ المساجد۔ ۱۸-فتاویٰ دار العلوم دیوبند، بارہ جلدیں۔ ۱۹-جرم وسزا کتاب وسنت کی روشنی میں۔ ۲۰-اسوۂ حسنہ مصائب سرکار دوعالم (ﷺ) ۲۱-زندگی کا علمی سفر (خود نوشت)۔ ۲۲-ترجمہ درمختار از ابتدا تا ختم کتاب الطلاق۔ ۲۳-درسِ قرآن۔ ۲۴-مسائلِ حج وعمرہ۔

❁ **بیعت وخلافت:** مفتی صاحب شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے، اُن کے انتقال کے بعد حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیبؒ کے دست گرفتہ ہوئے۔ آخر الذکر نے بیعت کرنے کی اِجازت مرحمت فرمائی تھی؛ لیکن مفتی صاحبؒ اپنی سادگی اور بے نفسی کی وجہ سے اِرشاد وہدایت سے مجتنب رہے۔ (مزید معلومات کے لیے دیکھیے اُن کی خودنوشت ''زندگی کا علمی سفر'' شائع کردہ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارن پور، یوپی)

مختصر تعارف مؤلّفِ کتاب

- **نام**: (مولانا) نور عالم خلیل امینی
- **کنیت**: ابواسامہ نور
- **تاریخ پیدایش**: جمعرات بہ وقتِ فجر ۱۸/۱۲/۱۹۵۲ء (۲۸/۲/۱۳۷۲ھ)
- **جائے پیدایش**: (اپنی ننھیال) موضع "ہرپوربیشی" ضلع مظفر پور (بہار) جہاں اس وقت بھی رہائش ہے۔
- **وطن اصلی وددھیال**: "رائے پور" ضلع "سیتامڑھی" (سابق ضلع مظفر پور) بہار
- **موجودہ اقامت**: افریقی منزل قدیم، نزد چھتہ مسجد، دیو بند ۲۴۷۵۵۴، یو پی
- **تعلیمی لیاقت**: (الف) فاضل

  (ب) تخصص در عربی زبان وادب

  (ج) عربی زبان کی تدریس کی مہارت از کنگ سعودی یونیورسٹی، ریاض
- **موجودہ ذمے داریاں**: (الف) استاذ ادب عربی دار العلوم دیو بند

  (ب) چیف ایڈیٹر ماہ نامہ عربی رسالہ "الداعی" دار العلوم دیو بند
- **عربی تالیفات**: الصحابة ومكانتهم في الإسلام؛ مجتمعاتنا المعاصرة والطريق إلى الإسلام؛ المسلمون في الهند؛ الدعوة الإسلامية بين الأمس واليوم؛ مفتاح العربية؛ (دوجلدیں)؛ العالم الهندي الفريد: الشيخ المقرئ محمد طيب؛ فلسطين في انتظار صلاح دين.
- **اردو تالیفات**: وہ کوہ کن کی بات؛ حرف شیریں؛ خط رقعہ کیوں اور کیسے سیکھیں؛ صحابۂ رسول اسلام کی نظر میں؛ موجودہ صلیبی صہیونی جنگ.. حقائق اور دلائل؛ عالم اسلام کے خلاف حالیہ جنگ.. کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟؛ فلسطین کسی صلاح الدین کے انتظار میں۔
- **تراجم**: اردو سے عربی میں تقریباً ۲۵ کتابوں کا ترجمہ، یہ سبھی کتابیں چھپ چکی ہیں؛ نیز زائد از دو سو مقالات کا عربی ترجمہ جو مختلف عربی رسالوں میں ہند و بیرون ہند چھپ چکے ہیں۔
- **مضامین ومقالات**: علمی، فکری، دعوتی، لسانی، اجتماعی، سوانحی موضوعات اور مختلف ملی مسائل پر اردو اور عربی زبان میں پانچ سو سے زائد مضامین ہند و بیرون ہند کے رسالوں اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے الداعی دیو بند؛ البعث الاسلامی لکھنؤ؛ الرائد لکھنؤ؛ رسالہ دار العلوم دیو بند؛ آئینہ دار العلوم دیو بند؛ الدعوۃ ریاض؛ الحرس الوطنی ریاض؛ الفیصل ریاض؛ الجزیرہ ریاض؛ الجمعیۃ نئی دہلی؛ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ؛ الندوۃ مکہ مکرمہ؛ تعمیر حیات لکھنؤ؛ الفرقان لکھنؤ؛ ترجمان دار العلوم جدید دہلی؛ رسالہ الحق پاکستان؛ اذانِ بلال آگرہ؛ ریاض الجنہ گورینی جونپور؛ ماہ نامہ ہدایت جے پور؛ البدر کاکوری؛ سہ روزہ دعوت نئی دہلی؛ اخبار مشرق کلکتہ؛ نقیب پٹنہ؛ راشٹریہ سہارا اردو نئی دہلی؛ نئی دنیا دہلی؛ منصف حیدرآباد؛ انقلاب ممبئی؛ اردو ٹائمز ممبئی؛ عالمی سہارا نئی دہلی۔
- **کانفرنسیں اور سمینار**: ہند و بیرون ہند دسیوں کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی، جن میں سعودی عرب، کویت، مصر، امارات عربیہ متحدہ کی کانفرنسیں سرفہرست ہیں، ان ملکوں میں بار بار جانے کا اتفاق ہوا، جہاں علمی، ادبی، فکری ودعوتی شخصیات سے ملنے کا موقع ملا۔

لآلئ منثورة

في التعبيرات الحكيمة عن قضايا الدين والأخلاق والاجتماع

المربي الكبير الشيخ الجليل العلامة «أشرف علي التهانوي»
المعروف بـ «حكيم الأمة» المتوفى ١٣٦٢هـ

تعريب: فضيلة الشيخ الأستاذ نور عالم خليل الأميني
أستاذ الأدب العربي ورئيس تحرير مجلة الداعي بالجامعة

نشر: أكاديمية شيخ الهند
الجامعة الإسلامية دارالعلوم، ديوبند ، يوبي (الهند)



علماء ديوبند

اتجاههم الديني و مزاجهم المذهبي

تأليف

العالم الهندي الكبير الشيخ المقرئ محمد طيب رحمه الله

المعروف بـ « حكيم الإسلام »

الرئيس السابق للجامعة الإسلامية دارالعلوم / ديوبند (الهند)

١٣١٥ - ١٤٠٣هـ / ١٨٩٧ - ١٩٨٣م

تعريب :

نور عالم خليل الأميني

رئيس تحرير مجلّة « الداعي » العربية الشهرية

وأستاذ الأدب العربي بالجامعة الإسلامية دارالعلوم/ ديوبند (الهند)

قام بالنشر والتوزيع

الجامعة الإسلامية : دارالعلوم ، ديوبند ، الهند

العالم الهندي الفريد

الشيخ المقرئ محمد طيب

رئيس الجامعة الإسلامية دار العلوم / ديوبند سابقا

تأليف

نور عالم خليل الأميني

رئيس تحرير مجلة «الداعي» العربية الشهرية

وأستاذ الأدب العربي بالجامعة الإسلامية دار العلوم/ ديوبند

ديوبند ، يوبي ، الهند



مؤسسة العلم والأدب ، أفريقي منزل قديم ، ديوبند ، الهند

اس کتاب میں

''اس کتاب کے مضامین، مُتعلِّقہ شخصیّتوں کے سوانح بھی ہیں، اُن کے سلسلے میں بھرپور تأثُّرات بھی اور اُن کے مکمل یا نامکمل خاکے بھی اور اُن کے عہد اور ماحول کے تذکرے بھی؛ اِس لیے یہ ہر طرح کے قارئین کے لیے، اپنے اندر دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ زبان کی چاشنی، شخصیّتوں کے پیش کرنے کا خوب صورت انداز اور اُن کے حوالے سے سچائی نگاری، تحلیل و تجزیے میں دقیقہ رسی، فکر انگیزی اور خیال آفرینی کے اُسلوبِ جمیل کی وجہ سے، یہ کتاب تذکرہ نویسی کے فن میں، اپنی مثال آپ بن گئی ہے۔ مُصنِّف کی سابقہ تحریروں کی طرح یہ کتاب بھی اِن شاء اللہ قاری کے حسنِ ظن کے معیار پر نہ صرف مکمل اُترے گی؛ بل کہ اُس سے سوا ثابت ہوگی''۔


FBD

فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ
FARID BOOK DEPOT (PVT.) LTD.
Corp. Off.:2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi-2
Phone : 23289786, 23289159, Fax : 23279998, Resi. : 23262486
E-mail : farid@ndf.vsnl.net.in Website :faridexport.com faridbook.com

Rs 350/-